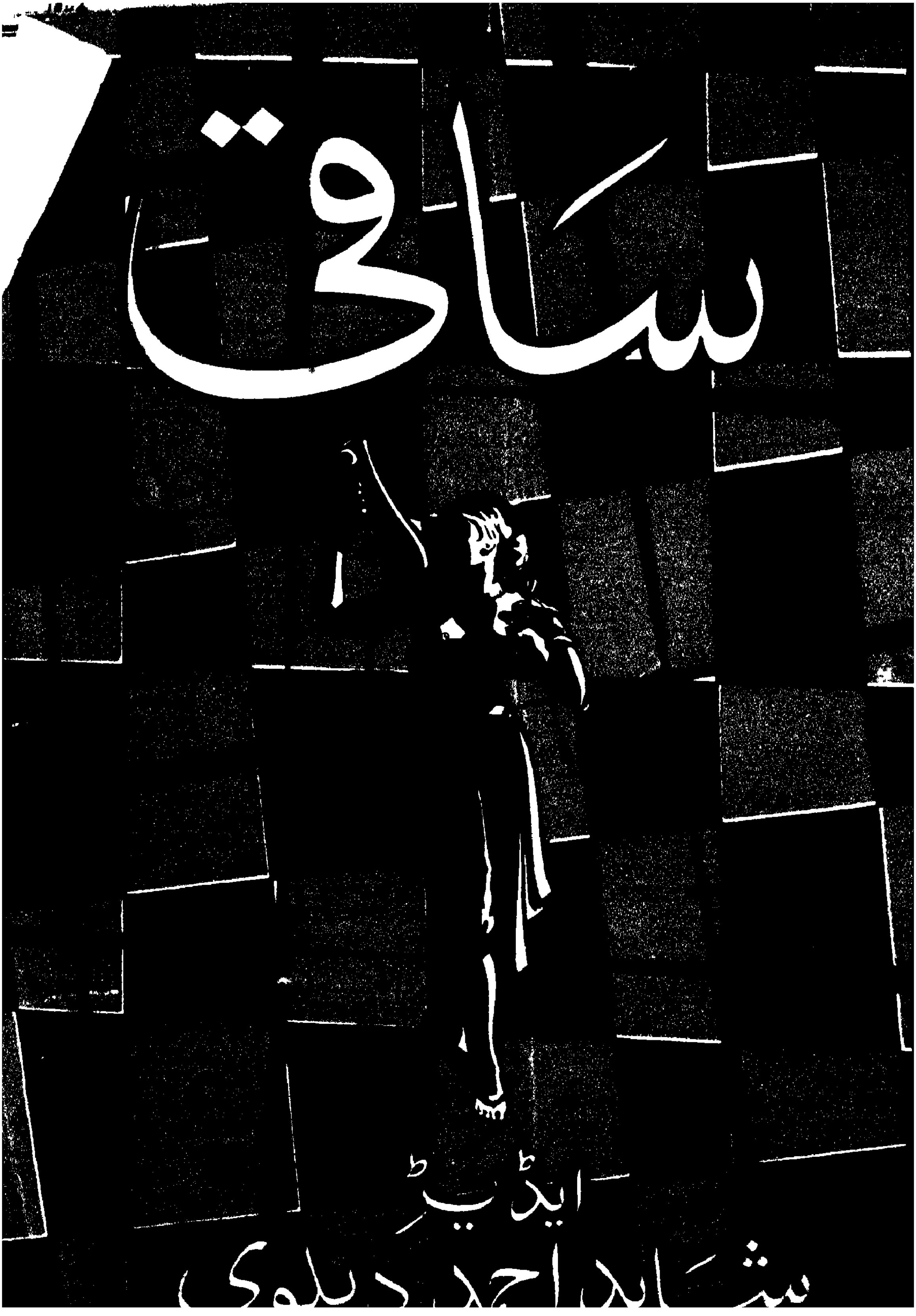

ساقی
ایڈیٹر
شاہد احمد دہلوی


کھلے جو موسم سرما میں
ایسا پھول بنو !
تبت سنو اور تبت کولڈ کریم آپ کی جلد کو موسم سرما کی خشک اور
سرد ہواؤں سے محفوظ رکھتی ہیں۔ ان کا باقاعدہ استعمال
چہرے کو نیا حسن اور پھولوں کی سی تازگی بخشتا ہے۔
ایشیا کی
مشہور ترین
بیوٹی کریم
سنو
کولڈ کریم
تبت
سنو اور کولڈ کریم
کوہ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ - کراچی - ڈھاکہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(چھتیسواں سالِ اشاعت)

مُدیر
شاھد احمد دھلوی
معاون
عاصمہ بیگم

سالانہ

مع خاص نمبر
پاک و ہند دس روپے
قیمت فی پرچہ ۵۰ پیسے

ساقی

جلد (۱۷) | ساقی، کراچی، بابت جنوری ۱۹۶۵ء | نمبر (۱)

ناشر عاصمہ بیگم نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر پی - آئی - بی کالونی - کراچی ۵ سے شائع کیا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شاہد احمد دہلوی

نگاہِ اوّلین

الحمدللہ، ساقی نے اپنی زندگی کے ۳۵ سال پورے کرلئے۔ اِس پرچے کے ساتھ چھتیسواں (۳۶) سال شروع ہو رہا ہے۔ سالگرہ کے موقع پر سالگرہ نمبر شائع کرنے کی رسم چلی آتی ہے مگر ۱۹۶۴ء میں ساقی کے مالی حالات کچھ اس قدر ابتر رہے کہ ماہ بماہ معمولی پرچہ بھی شائع نہیں ہو سکا۔ اس کی تلافی یوں کی گئی ہے کہ میعادِ خریداری میں چھ ماہ کا اضافہ کردیا گیا ہے۔ کچھ ساقی ہی پر موقوف نہیں ہمارے تمام ادبی رسائل مالی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ انہی سے پریشان ہوکر انجمن ادبی رسائل پاکستان کا ایک وفد پچھلے سال حکومت کے اربابِ اختیار کو متوجہ کرنے پنڈی گیا تھا۔ وفد میں مولانا رازق الخیری، مدیرِ عصمت، کراچی۔ حکیم محمد یوسف حسن، مدیر نیرنگِ خیال، پنڈی۔ محمد طفیل، مدیرِ نقوش، لاہور۔ عشرت رحمانی، مدیر تہذیب، لاہور۔ صہبا لکھنوی، مدیر افکار، کراچی۔ اور مدیر ساقی، کراچی شامل تھے۔ اِس وفد نے جناب محمد شعیب وزیرِ مالیات۔ جناب اے۔ بی۔ ایم مصطفےٰ، وزیرِ تعلیم۔ ڈاکٹر محمد شریف، ناظم و مشیرِ تعلیم۔ جناب الطاف گوہر، سکریٹری وزارتِ اطلاعات و نشریات، اور جناب قاسم رضوی، وزارتِ اطلاعات و نشریات سے ملاقات کی اور اپنی مشکلات اُن سے بیان کیں اور اُن قرار دادوں کا محضر پیش کیا جو انجمن کے سالانہ اجلاس میں منظور کی گئی تھیں۔ ان سب حضرات نے حوصلہ افزائی فرمائی اور وفد کو یقین دلایا کہ ادبی رسائل کو جاری رکھنے کے لئے ہر ممکن تدبیر کی جائے گی۔ الطاف گوہر صاحب چونکہ خود بھی ادیب اور شاعر ہیں اس لئے انھوں نے ازراہِ ادب دوستی اپنے اختیار کے احکام فوراً جاری کردئے اور ادبی رسائل کے معاملات کی پیروی اپنے ذمّے لے لی۔ وفد نے صدرِ پاکستان کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت بھی چاہی تھی مگر ایوانِ صدر سے اطلاع ملی کہ سکریٹری اطلاعات و نشریات نے چونکہ ادبی رسائل کا کیس ٹیک اَپ کرلیا ہے اِس لئے جنابِ صدر سے وفد کے ملنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

پنڈی سے واپسی پر وفد سکریٹری تعلیمات، مغربی پاکستان، نورالٰہی صاحب سے بھی ملا۔ اِن کے علاوہ کراچی میں مُنیر حسین صاحب سکریٹری اور ڈائریکٹر صاحب پبلسٹی مغربی پاکستان اور پروفیسر شیخ چاند، ڈپٹی سکریٹری وزارتِ تعلیمات اور جمیل الدین عالی، ناظمِ گلڈ سے بھی ملا۔

اِن سب حضرات نے بھی ہمدردانہ امداد کا وعدہ فرمایا، اور یقیناً یہ سب حضرات کچھ نہ کچھ کر رہے ہوں گے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ادبی رسائل کا معاملہ سُرخ فیتے کی لپیٹ میں آگیا ہے

(بقیہ مضمون صفحہ ۲۹ پر)

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

ادب اور انفرادیت

جذبات اور تخیل دونوں آفاقی چیزیں ہیں یعنی یہ ہر انسان کا ورثہ ہیں، ہر انسان چاہے وہ کسی ملک یا زمانے کا ہو دوسرے انسان کے جذبات میں حصّہ لے سکتا ہے اور تخیل کی دُنیا میں شامل ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر ادب کو آفاقی اور دائمی چیز کہا جاتا ہے۔ مگر جب ہم بڑے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہر فرد اپنے جذبات میں بالکل الگ اور اپنی تخیل میں بھی بالکل الگ نظر آتا ہے۔ اصل میں کسی ادیب کو ہم جب ہی اہمیت دیتے ہیں اور اوّل درجہ کا ادیب گنتے ہیں جبکہ وہ دوسروں سے بالکل مختلف اور اپنی انفرادیت میں بالکل فرد ہوتا ہے۔ یوں تو جذبات کی جو اقسام ہم نے پیش کیں وہ تمام جذبات کو گھیر لیتی ہیں مگر ہر قسم کے جذبے کی نوعیت ہر فرد شاعر میں مختلف ہوتی ہے اس طرح ہر جذبہ کی اتنی ہی قسمیں ہیں جتنے گوناگوں لوگ اسکو برت چکے ہیں اور تخیل کی بھی اتنی ہی مختلف قسمیں ہیں جتنے اس کے برتنے والے دُنیا میں ہوئے۔ ادب کو حصول انفرادیت کہا گیا ہے اور ادب سے ہم خاص طور پر متاثر اسی وقت ہوتے ہیں جب ہمیں اس میں کوئی انفرادیت نظر آئے ہم اسے جدّت کہتے ہیں۔ یعنی بات جیسی پہلے کبھی نہیں نظر آئی۔ غور کیا جائے تو اسی نئی بات میں نیاپن یہی ہوتا ہے کہ ادیب نے اسے بالکل اپنے طریقے پر محسوس کیا ہے اور اپنے طریقہ ہی پر ادا کیا ہے۔

انگریزی شاعری میں رومانی شاعری کا دور خاص طور پر حصول انفرادیت کا دَور تھا۔ اس دور کا ہر شاعر زندگی کو بالکل اپنی طرح محسوس کرتا اور ایسے تصوّرات کے ذریعہ ادا کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے جو اسکے سوا اور کسی کے نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ورڈسورتھ اور شیلی دونوں نے ایک چڑیا اسکائیلارک پر نظمیں لکھی ہیں۔ موضوع ایک ہی دور کے ہیں اور ایک ہی نظریہ رکھتے ہیں مگر ورڈسورتھ چڑیا کو اپنی طرح تصوّر کرتا ہے اور شیلی اپنی طرح پر۔ چڑیا بہت اُونچی اُڑتی ہے اور پھر ایکدم سے زمین پر آجاتی ہے۔ ورڈسورتھ اس کی صفت میں آسمانی اور مادی قدروں کو اعتدال سے ملا دینے کی مثال دیکھتا ہے۔ شیلی کا دھیان صرف چڑیا کی اُڑان پر ہے اور وہ اسے ایک خوشی کی روح سمجھتا ہے جو آسمان ہی پر یا اُسکے قریب رہتی ہے۔ ان دو مختلف تصوّر کے ماتحت دونوں شاعروں کے تصوّرات ([illegible]) بھی مختلف ہو گئے ہیں اور دونوں نظموں کا راگ بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دو متضاد قابلیتوں کے شاعر اپنی اپنی طرح پر ایک ہی چیز بنا رہے ہیں۔ عام طور پر شاعر روایاتی طریقوں سے الگ نہیں جاتے مگر جب وہ بڑے شاعر کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں تو اُن کے جذبات اور تصوّرات بالکل اپنے اور الگ ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی کچھ شاعر ہیں جن کی انفرادیت اس طرح نمایاں ہو جاتی ہے۔ مثلاً سورج نکلنے کا بیان میر انیس یوں دیتے ہیں ؎

تھا چرخ اخضری پہ وہ رنگ آفتاب کا
کھِلتا ہے جیسے پھُول چمن میں گلاب کا

اور مرزا دبیر یوں :-

فرعون شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب دن تھا کلیم اور یدِ بیضا تھا آفتاب

میر انیس کو قدرتی منظر میں ایک مصور کی سی دلچسپی ہے۔ وہ قدرت کے رنگوں میں خاص طور پر محو ہیں۔ آسمان پر سورج نکلتا ہوا دیکھ کر انہیں چمن یاد آتا ہے۔ چمن گھاس سے سبز ہے آسمان بھی سبزی مائل ہے سورج سُرخ ہے اور گلاب کا پھول بھی سُرخ ہے چنانچہ انکی تخیل ان رنگوں کو اخذ کر لیتی ہے اور ایسا کرنے میں وہ اُردو کے تمام شاعروں کی تخیل سے مختلف نظر آتی ہے۔ مرزا دبیر کی توجہ پُرانے قصّوں کی طرف ہے، انہیں حضرت موسیٰ اور فرعون کا قصّہ یاد آتا ہے۔ شب کی سیاہی فرعون کے کفر سے مناسبت رکھتی ہے اور دن کی روشنی موسیٰ کے ایمان سے۔ سورج یدِ بیضا ہو جاتا ہے جو موسیٰ کے ہاتھ میں تھا۔ لہٰذا صبح کا منظر ان کے ذہن میں ایک تلمیحی چیز ہو جاتا ہے اور یہ بھی انکی انفرادیت ہے۔ یہاں مولانا شبلی کا موازنہ میر انیس اور دبیر یاد آتا ہے اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ مولانا ان دونوں شاعروں کی انفرادیت تک نہ پہونچ سکے۔ اور مولانا کیا ہمارے یہاں اب تک تمام نقاد آمد اور آورد کے پھندے ہی سے باہر نہیں آتے ہیں۔ یہ اچھا یہ بُرا یہ سچا یہ جھوٹا اس سے آگے نہیں بڑھتے۔ یہ بڑے ہی ابتدائی درجہ کا نظریہ ہے۔ بڑے شاعر اس سے بالاتر ہو جاتے ہیں۔ میر انیس اور مرزا دبیر دونوں سچے شاعر ہیں اور اپنے اپنے ذاتی رجحان کے موافق دُنیا کو دیکھتے ہیں اگر ایک کا ذہن قدرت کی طرف اور دوسرے کا کتاب کی طرف جاتا ہے تو ایک کو سچا اور دوسرے کو بناوٹی کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مرزا دبیر علمی امور میں ویسے ہی خلوص سے منہمک ہیں جیسے میر انیس قدرتی مناظر میں اسلئے ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ دونوں الگ الگ فرد ہیں۔

اس وقت ایک واقعہ یاد آیا جو انفرادیت کو نُمایاں کرنے کے سلسلے میں بہت مفید ثابت ہوگا۔ ایک اُردو اور فارسی کے پروفیسر ایک دفعہ یہ شعر سُنا کر ؎

خدا جانے یہ دُنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

بولے یہ خیال شاعر نے عرفی سے سرقہ کیا ہے اور عرفی کا یہ شعر پڑھا ؎

گماں مبر کہ چو تو بگزری جہاں بگزشت
ہزار شمع فروزند و انجمن باقیست

میں نے یہ مانا کہ دونوں شاعر ایک ہی خیال دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر دونوں کے اس بات کو ظاہر کرنے میں نمایاں انفرادی فرق ہے۔ دُنیا باقی ہے اور باقی رہے گی فرد آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ یہ واقعہ ہے، مگر پہلا شاعر اس کو دیکھ کر تعجب کے عالم میں آ جاتا ہے۔ محفل سے جو جو لوگ اُٹھتے جاتے ہیں وہ وہ محفل کی رونق کم ہوتی جاتی ہے مگر یہ دُنیا عجیب محفل ہے جس کی رونق باوجود ہر لمحہ ہزاروں اُٹھ جانے والوں کے کم نہیں ہوتی۔ اس کا دھیان اس معشوق کی طرف جاتا ہے جس کے جلوہ ناز کا یہ محفل اور اس کی رونق کرشمہ ہے اور اس معشوق کے معجز نما وصف محفل آرائی سے وہ متاثر ہو کر دم بخود ہو گیا ہے اور ہمیں بھی اپنے عالم میں داخل کرتا ہے۔ برخلاف اسکے عرفی ہماری توجہ ہماری ذات اور ہمارے احساس خودی کی طرف لاتا ہے۔ ہم اپنے کو اہم سمجھتے ہیں یہاں تک کہ زندگی کی رونق کو اپنی زندگی کی بنا پر اہم قرار دیتے ہیں مگر شاعر ہمیں یہ دکھانا چاہتا ہے کہ اس ہستی میں کوئی فرد اہم نہیں ہے۔ محفل میں شمعوں کے بعد شمعیں جلتی رہتی ہیں اور محفل قائم رہتی ہے۔ شمع کچھ نہیں ہے محفل سب کچھ ہے۔ دونوں شعر دو مختلف بلکہ متضاد منظر سامنے لاتے ہیں۔ پہلا شعر معشوق حقیقی کے جلوہ ناز کی طرف دوسرا ہمارے غلط گمان خودی کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ پہلا جذبہ تعجب کو

اُبھارتا ہے دوسرا خود فریبی کی نفی کرتا ہے دونوں شاعر الگ الگ چیزوں میں دلچسپی رکھتے ہیں اور الگ الگ جذبات کے حامل ہیں۔ دوسرے شعر کو پہلے کا سرقہ کہہ کر رہ جانا ظاہر کرتا ہے کہ دونوں شاعروں کی الگ الگ انفرادیت کی طرف توجہ نہیں گئی۔

ہر بڑا شاعر منفرد ہوتا ہے اور تنقید کا اہم کام یہ ہے کہ وہ اس انفرادیت کی وضاحت کرے۔ اُردو میں یہ کام کہیں کہیں اتفاق ہی سے ہو گیا ہے ورنہ سب شاعروں کے یہاں ہمہ صفات یا تمام مناسبات دکھانے کے آگے اگر کوئی جاتا ہے تو پیدائشی اور غیر پیدائشی یا پھر یہ اس سے بہتر اور وہ اس سے بدتر کا معاملہ اٹھا کر قصہ ختم کر دیتا ہے۔ اصل میں ہر فرد ادیب اُمور وہی لیتا ہے جو تمام ادیب لیتے آئے ہیں، مگر اُنکو اپنے مخصوص طرزِ تخیل سے یا جذبات کی مخصوص نوعیت سے ایسے پیش کر دیتا ہے کہ بات نئی معلوم ہوتی ہے۔ ایک جذبے کو ہر فرد شاعر ایسے سامنے لاتا ہے کہ اُس کی انفرادیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ مثلاً غم کی تصویر اقبال یوں کھینچتے ہیں ؎

سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری　　ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے

اور میر یوں فرماتے ہیں ؎

ہر روز کے رونے کو کہاں سے جگر آئے　　اک روز کا رونا ہو تو رو کر صبر آئے

دونوں شاعر رو رہے ہیں مگر کتنے مختلف طریقے سے۔ اقبال اپنے غم میں نہ اکیلے ہیں اور نہ مجبور، شمع کو آنسو بنا کر پروانے کی آنکھوں سے ٹپکاتے ہیں جو باریک اور مشکل تصوّر کی مثال ہے۔ میر بھی سراپا درد ہیں مگر مجبور اور درد سے بیزار ہو کر چیخ اُٹھتے ہیں کہ رونے کو کہاں سے جگر آئے۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ دو مختلف ہی نہیں بلکہ متضاد قسم کے لوگ رو رہے ہیں۔ اسی طرح ہر جذبہ کو ہر بڑے شاعر کے یہاں اُسکے انفرادی طریقے پر ادا کرنے کی مثال دی جا سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ادیب کے پاس ہم اسی لئے جاتے ہیں کہ وہ کوئی نئی بات پیدا کریگا اور نئی بات کی نوعیت اسی میں ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے وہ اپنی طرح پر کہتا ہے۔ انفرادیت میں بہت سے امور مضمر ہوتے ہیں جن کی تشریح نفسیات نگاروں نے کی ہے۔ یہ تشریح زیادہ تر عام لوگوں کے نفسیات سے تعلق رکھتی ہے۔ ادبی ہستی کی انفرادیت کے سلسلے میں جو اہم بات ہمارے سامنے لائی جاتی ہے وہ یہی ہے کہ اکثر لوگوں کے تخیلات اور احساسات ایسی نوعیت اختیار کر لیتے ہیں کہ وہ عجیب عالم میں چلے جاتے ہیں۔ یہ لوگ غیر معمولی ہوتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ان میں اپنے غیر معمولی رُجحان کو مناسب الفاظ میں ادا کرنے کی بھی صلاحیت ہوتی ہے۔ اکثر ہم کو ایسے لوگ نظر آتے ہیں جو عام حرکات میں غیر معمولی ہوتے ہیں مگر ہم اُنکو پاگل ہی کہہ کر رہ جاتے ہیں۔ شاعر یا ادیب بھی پاگل ضرور ہوتا ہے مگر وہ اپنے پاگل پن کو ادا کر دینے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے اور اس صلاحیت کا جتنا اچھا اظہار وہ پیش کرتا ہے اتنا ہی اچھا اس کا ادب ہوتا ہے۔ شعر سے ہٹ کر افسانوی ادب کی طرف آئیے تو دکھائی دیتا ہے کہ ہر ناول نگار کا کام تو یہی ہے کہ وہ قصے بیان کرے اور اس میں سے کردار اُبھارے۔ مگر کسی ناول کی قصہ بیان کرنے کی نوعیت دوسرے کی ناول نگاری کی طرح نہیں ہوتی ہے مثلاً جین آسٹن کو لیجئے اُس کے یہاں ایک یا دو گھروں میں جوان لڑکیوں کے مناسب شوہر پا لینے کے قصے ہیں۔ ہارڈی کے یہاں دیہات کے کسی زور دار قوت ارادہ رکھنے والے فرد کے قصے ہیں۔ ہمارے یہاں سرشار نے لکھنؤ کی زندگی کے واقعات پر اپنی طویل تصنیف کو مبنی کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے یہاں کسی درسگاہ سے متعلق چند پڑھے لکھے لڑکے اور لڑکیوں کے

قصے ہیں ناول نگار کی انفرادیت اس زندگی کے دائرے سے ظاہر ہوتی ہے جس پر اس کی توجہ ہوتی ہے اور جس پر وہ قاری کی توجہ مبذول کراتا ہے پھر کردار کی ساخت میں بھی وہ نہ صرف ایک دائرے اور ایک طبقہ کے کردار ہی کو خوبی سے دکھانے میں کامیاب ہوتا ہے بلکہ اس کے تخلیق کئے ہوئے تمام کردار اُس کی مخصوص طرزِ تخیل اور طرزِ فکر کا آئینہ ہوتے ہیں۔ مثلاً ڈکنس کے کردار عجیب بے ڈھنگے اور بےکار نظر آتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے کردار کی شکل صورت ہی نہیں بلکہ نفسیاتی خصوصیات کو بھی بگاڑ کر پیش کر دینا چاہتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسکے کردار حد سے زیادہ مضحک ہو جاتے ہیں مضحک بنانے ہی کے لئے اُس نے کردار کو بگاڑ کر پیش کرنا ضروری سمجھا ہے اور اس بگاڑنے سے جو مزاح پیدا ہوتا ہے وہی اس کا انفرادی مزاح ہے۔ اسی طرح دوستوفسکی بھی کردار کو بگاڑ کر پیش کرتا ہے مگر اس کا مطلب اس سے یہ ہوتا ہے کہ ہم کو کردار کی نفسیاتی گہرائی میں لے جائے۔ ہم اس کے کردار کی حرکات سے عجیب تعجب کے عالم میں آجاتے ہیں اور آفاقی قدروں سے ہم کنار ہو جاتے ہیں۔

انفرادی خصوصیات ہی ہمیں ادیب کے مقام کا پتہ دیتی ہیں۔ ہر فرد ادیب کے حسیات دو معنوں میں مختلف ہوتے ہیں اول یہ کہ کسی میں کوئی حس زیادہ زور دار ہوتا ہے اور کسی میں دوسرا کسی شاعر کے یہاں بصری تاثرات پر زیادہ زور ہوتا ہے تو کسی کے یہاں صوتی پر۔ جدید نفسیاتی تنقید نگار فرد کے حسیاتی آلہ (Sense apparatus) کے مطالعہ پر توجہ دیتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ مثلاً ملٹن کا بیان صوتی اثرات کی فراوانی ہے اور ورڈسورتھ کے بیان بصری اور عینی نظریہ یہ قائم کرتے ہیں کہ شاعر جتنے زیادہ حسیات کو متاثر کر سکے اتنا ہی بڑا اور سچا شاعر کہلانے کے لائق ہوتا ہے۔ مثلاً کیٹس کی نظموں میں ہر حس کو متحرک کرنے کا سامان ملتا ہے اور اس صفت میں اسکا شیکسپیر سے مقابلہ کر کے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے دور کے تمام شعرا سے زیادہ سچا شاعر تھا اسی سلسلے میں اس کی زبان کے استعمال کا مسئلہ بھی آجاتا ہے۔ صنائع کا استعمال انفرادی حسیاتی رجحان کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یعنی حسیات کا کمزور شاعر زیادہ تر سادی زبان استعمال کرتا ہے۔ پھر ہر شاعر اپنے حسیاتی رجحان کے مطابق کچھ صنائع اپنے سے مخصوص کر لیتا ہے اور انہیں کا استعمال کثرت سے کرتا نظر آتا ہے۔ مثلاً ٹینی سن صنعت تکرار کے انفرادی طریقہ کا دلدادہ ہے کیٹس تراکیب کے استعمال کا خاص ملکہ رکھتا ہے۔ غالب نے بھی نئی تراکیب کی طرف مخصوص رجحان دکھایا ہے مثلاً ؎

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہاں "تیرِ نیم کش" کی ترکیب کو غالب کا حق کہا جاتا ہے۔ یہ چند صورتیں ہیں جن سے مخصوص حسیاتی رجحان نمایاں ہوتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے حسیاتی رجحان میں بھی ہر فرد کچھ ایسی انفرادیت نمایاں کرتا ہے جو محسوس تو کی جا سکتی ہے مگر جس کے بیان کے لئے الفاظ ملنا مشکل ہیں۔ جو شاعر اس درجۂ انفرادیت پر پہونچے نظر آتے ہیں اور ہر جگہ اس درجہ کی مثال پیش کرتے ہیں ان ہی کو اوّل درجہ کا شاعر شمار کیا جاتا ہے۔

ادیب کی انفرادیت اُس کی نفسیاتی انفرادیت پر مبنی ہوتی ہے جسکو ہم ادبی چیز نہیں کہیں گے مگر جس کا ادب پر اثر اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ ہر فرد انسان کی پسند اور ناپسند ہوتی ہے جس پر اُس کی زندگی کی دلچسپی یا غیر دلچسپی مبنی ہوتی ہے۔ ادیب کے سلسلے میں یہ صفت اسکے موضوعات کے انتخاب پر اثر ڈالتی ہے۔ حالانکہ ہم یہ نہیں کہیں گے کہ ادبا

اس لئے بڑے شاعر ہیں کہ وہ شاعر اسلام ہے۔ مگر اسلام کی طرف مخصوص رجحان اُنکی شاعری کی انفرادی صفت ضرور نہیں تھے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں اسلام کو بھی اُنہوں نے ایک ایسے نئے معنے دیدیئے ہیں جو اُن سے پہلے کسی کے یہاں نہیں ملتے۔ "خودی اور عمل" کے تصورات کو اُنہوں نے خود مشاہیر اسلام کے تصورات سے ملایا ہے مگر اسلام کو وہ وسیع معنے دینا کہ یورپ کے فلسفیوں جیسے نٹشے کے نظریات بھی اس کا جزو ہو جائیں انکی اپنی چیز ہے انکا یہ انفرادی کارنامہ اُن کی ادبی سے زیادہ فلسفیانہ حیثیت کا تعین کرتا ہے مگر کیونکہ اُنہوں نے تمام فلسفی خیالات کو تخیلی رنگ دیکر اور جذبات کی گرمی سے زندہ کر کے پیش کیا ہے لہذا اُن کی شاعری میں ایک انفرادی صفت آگئی ہے جسکو ہم "مفکرانہ شعلہ مقالی" (Philosophic Incandescence) کہیں۔ ہماری روایات میں رومی اور عرفی ایسے شاعر ہوئے جن میں یہ صفت تھی اور یورپ کی شاعری میں گوئٹے کے بعد سے اسے بھی اعلیٰ شاعری کا جزو لاینفک مانا گیا اور اقبال کے معاصر انگریزی شاعر رابرٹ براؤننگ کے یہاں اس کا زور مثالی ہے چنانچہ جو فقرہ ہم نے استعمال کیا وہ اُس کی شاعری کی انفرادی صفت کی تعریف ہے۔ مگر گوئٹے براؤننگ اور اقبال کی مفکری کو بھی جب ہم ساتھ رکھکر دیکھتے ہیں تو اُن میں بھی ہمیں اختلاف نظر آتا ہے جو اُن کی الگ الگ انفرادیت کا پتہ دیتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ اُنکے فلسفوں کے اصولوں میں اختلاف ہیں اور ایسے اختلافات کوئی خاص اہم نہیں ہیں کیونکہ آفاقی درجہ پر آکر ان سب کے فلسفے ایک ہو جاتے ہیں اور یہ سب اُن کو آفاقی درجہ پر لے بھی آتے ہیں بلکہ خاص اختلاف یہ ہے ہر ایک کی انفرادی تخیلی قوت اُس کی مخصوص فکر کو ایک ایسی نوعیت عطا کردیتی ہے کہ ایک ہمیں دوسرے کی تکمیل کرتا دکھائی دیتا ہے یا ایک کی بات ہمارے اُوپر زیادہ اثر کرتی ہے جبکہ دوسرے کی اسی بات تک ہم نہیں پہونچ پاتے۔

عام طور پر لوگ ادیبوں اصناف ادب یا ادب پاروں کو انکی انفرادیت کی بنا پر قبول کرتے ہیں جو عموماً ادبی انفرادیت نہیں ہوتی کیونکہ جیسے ادبی انفرادیت تک پہونچنے کے بہت کم ادیب اہل ہوتے ہیں ویسے ادبی انفرادیت کو محسوس کرنے کے اہل بھی کم ہی نکلتے ہیں۔ عام لوگ جن انفرادی صفات کو اپنے مقبول ادیبوں میں سراہتے ہیں وہ صرف ذاتی پسند یا ناپسند سے تعلق رکھتی ہیں مگر ان کے انفرادی ہونے میں کوئی شک نہیں۔ یہ بھی ادیب کی انفرادیت ہی ہوئی کہ وہ کسی خاص مذہب اور اُس کے خاص فرقے میں کسی خاص سیاسی نظریہ اور اُس کے رائج الوقت پہلو کو ہی اپنے ادب پاروں کا موضوع بنائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پڑھنے والے اقبال کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ شاعر اسلام ہے اور جوش سے اس لئے نفرت کرتے ہیں کہ وہ مُرتد ہیں۔ ترقی پسند قارئین ان لوگوں ہی کو ادیب گنتے تھے جو اُن کے مسلک کا پروپیگنڈہ کرتے۔ ایک صاحب ڈکنس سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں کیونکہ انہیں ہنسانے والی کتابوں کا شوق ہے۔ دوسرے صاحب ہارڈی کو اپنا مقبول ناول نگار بتاتے ہیں۔ کیونکہ انہیں حزنیہ جذبات میں کھو جانا اچھا لگتا ہے۔ کچھ لوگ اس لئے بھی کسی ادیب کی تعریف کرتے ہیں کہ انہیں اس کا طرز پسند ہے۔ ادیب کی ذات کا پڑھنے والے کی ذات سے تعلق دونوں کے انفرادی رجحانات کی یکسانی پر مبنی ہوتا ہے۔ اس لئے اعلیٰ ذوق رکھنے والے بھی پہلے پہلے اسی قسم کی انفرادیت سے رجوع ہوتے ہیں۔ مگر آگے چل کر معلوم ہوتا ہے کہ ادیب کے کسی موضوع سے تعلق میں بھی ایک انفرادیت ہوتی ہے جو اُس کی بالکل اپنی چیز ہوتی ہے اور جو اُس کے ادب کو بھی ایک ادبی نوعیت دیدیتی ہے اور یہ ادبی نوعیت ہی وہ انفرادیت ہے جو صاحب ذوق کے لئے آخر میں اہم ٹھہرتی ہے۔

یہ انفرادیت فرد فرد شاعر یا ادیب میں ہی نہیں بلکہ فرد فرد ادب پارے میں بھی الگ اور اچھوتی چیز ہوتی ہے۔ اس ڈکنس کی ناول نگاری کی انفرادیت کو ہم اُس کی کردار نگاری میں بتا چکے اسکو تفصیل سے دیکھئے تو ڈکنس کی انفرادیت پر پوری روشنی پڑتی ہے، اس کی فطری یا فلسفی رُجحان کے مطابق انفرادیت یہ ہے کہ وہ مصلح اخلاق ہے اور عام لوگ اسے اسی بنا پر پسند کرسکتے ہیں کہ وہ ہمارے اخلاق پر مفید اثر ڈالتا ہے۔ مگر جو لوگ اخلاق کو اسی وقت اہمیت دیتے ہیں جبکہ وہ ادب پر نمایاں طور سے اثر انداز ہو، وہ دیکھتے ہیں کہ اُس کی کردار نگاری اخلاقی ہما ہمی کی وجہ سے خاص طور پر مبالغہ آمیز ہوگئی ہے۔ یعنی اس کے بڑے لوگ مستقل برے اور برے ہی ہیں اور اس کے اچھے لوگ کمال کے حد تک نیک ہیں، اس لئے وہ پورے کردار نہیں رہے بلکہ کیریکیچر ہوگئے ہیں۔ ان میں ڈکنس کی انفرادیت نے ایک عجیب رُوح پھونک دی اور اُس کی ہر ناول میں یہ زندہ کیریکچر ایک ایسا انفرادی اثر رکھتے ہیں جو کسی اور ناول نگار کے یہاں نہیں ملتا۔ اس معنی میں اس کی سب ناولیں ایک ہی دائرے میں آتی ہیں۔ مگر اس کی چار عظیم ناولوں کو لیجئے تو ہر ایک میں عام مخصوص انفرادیت کے ساتھ ایک اور انفرادیت نظر آتی ہے جو اس ناول ہی سے مخصوص ہے، مثلاً پکوک پیپرز" (Pickwick Papers) میں ہنسانے والے مزاح کا رنگ نہایت پُر تنوع اور خالص ہے۔ "ڈیوڈ کاپر فیلڈ" (David Copperfield) میں اسے ایک خاص قسم کی داخلیت اور گہرائی آگئی ہے جو اُسے ڈکنس کی سب ناولوں سے ممتاز کرتی ہے۔ "ڈومبے اینڈ سن" (Dombey and Son) میں ایک معنویت اور اشاریت ہے اور کردار کا ارتقاء ہے جو اور کسی ناول میں نہیں ہے۔ "ایکسپک ٹیشنز" (Great Expectations) میں ایک فنکارانہ توازن اور فطری حالات سے گہری دلچسپی ہے جو اسے ممتاز کرتی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے انفرادیت والے لوگ اپنے ہر شاہکار میں الگ انفرادیت دکھلاتے ہیں جو عوام کے لئے بھی توجہ کا مرکز ہوتی ہے اور صاحبانِ ذوق کے لئے بھی انفرادیت کا مظہر۔

کسی ادیب کی انفرادیت کی عظمت اس امر میں بھی ہے کہ وہ اپنی طرف کتنے مختلف قسم کے لوگوں کو متوجہ کرتی ہے۔ یہ معاملہ انفرادیت کی گیرائی اور گہرائی دونوں سے تعلق رکھتا ہے شیکسپیر ہر قسم کے اثرات قائم کرتا اور ہر قسم میں اُس کی انفرادیت اس طرح نمایاں ہے کہ اُس کے ڈراموں کو ایک ہی شخص کے لکھے ہوئے ہونے سے کسی کو انکار نہیں ہوتا اس طرح دُنیا کے ہر شخص کو اس میں دلچسپی ضرور ہو جاتی ہے۔ برخلاف اسکے دوستوفسکی ایک ہی قسم کے اثر کا مالک نظر آتا ہے مگر اس اثر کی وہ گہرائی ہے کہ اُس کا جادو ہر شخص پر چل جاتا ہے۔ یہ معاملہ بہت سی چیزوں میں برابر یا کچھ چیزوں میں حد بھر دلچسپی کا نہیں ہے بلکہ ادبی انفرادیت کے عظیم درجہ پر پہونچ جاتا ہے۔ تخلیقی قوت جسکو سمانا جاسکتا ہے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ بالکل اسی طرح کی چیز ہے جیسے کہ زندگی میں ہمیں اکثر لوگ ملتے ہیں جن کے اندر ہم مقناطیسی قوت بتاتے ہیں۔ وہ جہاں بیٹھ جائیں معلوم ہوتا ہے کہ محفل کو روشن کر گئے یا جدھر نکل گئے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عجیب جادو کھیل گئے۔ ان میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو محض ایک دائرے کو متاثر کرتے ہیں اور ایسے بھی جن کا وجود ہر شخص کے لئے فرحت بخش ہوتا ہے اسی طرح ادب یا ادب پارے ہوتے ہیں جو ہر شخص کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتے۔ ہومر کی "ایلیڈ" میں تمام ہیرو ایک جگہ جمع ہو کر یہ نتیجہ نکالتے ہوئے دکھائے گئے ہیں کہ وہ محض ایک عورت کے لئے فضول جنگ کر رہے ہیں اور اپنے ملک اور وہاں کے لوگوں کو فضول تباہ کر رہے ہیں، مگر اسی درمیان میں ہیلن اُنکے قریب گزر جاتی ہے،

وہ اس کو دیکھتے تک جاتے ہیں اور یکدم سے اپنی رائے کو بدلتے ہوئے کہتے ہیں "مگر اس عورت کے لئے تو ضرور لڑیں گے چاہے سب ہی تباہ ہو جائیں۔" ادیب کی انفرادیت بھی ایسا ہی کرشمہ ہے جو عجیب پُراسرار طریقے پر اپنے کو منوا لیتی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ اکثر لوگوں نے کسی شاعر یا ادیب کا اس خیال سے مطالعہ کرنا شروع کیا کہ اس کو مطعون کریں گے مگر مطالعہ کے درمیان ہی وہ بدل گئے اور حد سے زیادہ تعریفیں کرنے میں مصروف ہوگئے۔ اکثر تصانیف ایسی ہیں کہ جنکی ہر شخص تعریف کرتا ہے اور ان میں ہم وہ انفرادیت دیکھتے ہیں جو انفرادیت کا اعلےٰ ترین درجہ ہے۔ ایسی ہی تصانیف کلاسک ہو جاتی ہیں اور ادب کے لافانی سرمائے میں شامل ہو جاتی ہیں۔

ادبی انفرادیت بھی اقبال کی فلسفی یا نفسیاتی "خودی" کی طرح وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے۔ مگر یہ مرتبہ اپنے اپنے اعلیٰ ترین درجہ پر حاصل ہوتا ہے ورنہ وہ زیادہ تر آ بجو ہوتی ہے اور عام شخص اس کے وجود کو دیکھ نہیں پاتا۔ ویسے ہی جیسے کہ عام شخص کسی کی مخصوص فطرت کا اندازہ نہیں کر پاتا بلکہ ہر شخص کے بابت کچھ ٹکی بندھی باتیں کر کے رہ جاتا ہے۔ ابھی خدیجہ مستور کی ناول "آنگن" شائع ہوئی اس پر ایک ناول نگار نے زبانی یہ رائے دی کہ اس میں کوئی انفرادیت نہیں ہے۔ میں نے "آنگن" کو پڑھا تو دیکھا کہ وہ اس دور کی ہی نہیں بلکہ اردو کی تمام ناولوں میں اُن چند ناولوں میں آجاتی ہے جو مخصوص انفرادیت کی مالک ہیں۔ اس کی انفرادیت کی ایک صفت بے پناہ سادگی ہے جس کی وجہ سے یہ انفرادیت عام نگاہوں سے پنہاں ہو جاتی ہے۔ جن صاحب نے اس میں انفرادیت نہیں دیکھی وہ ترقی پسند قسم کے افسانہ نگار ہیں اور اُن کا مقصد میری سمجھ میں یہ آیا کہ وہ کچھ خاص خیالات کی ٹھونس ٹھانس چاہتے تھے۔ اکثر زندگی میں بھی لوگ اپنے کو الگ دکھانے کے لئے لباس چال ڈھال باتیں کرنے کے طریقہ وغیرہ میں اپنے اوپر کچھ "خاص طریقے" عائد کر لیتے ہیں اور اس طرح اپنے کو منفرد دکھلاتے ہیں۔ مثلاً کچھ لوگ مذہبی بننے کے لئے ڈاڑھی بڑھا لیتے ہیں اور اونٹنگا پجامہ پہن لیتے ہیں اور بات بات حدیثیں بیان کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح ادب میں بھی اپنے کو منفرد دکھلانے کے لئے کچھ لوگ خاص طریقے اپنے اوپر عائد کر لیتے ہیں۔ اس وقت ناول نگاری میں شعور کی رو کا طریقہ چلا ہے جو جدید یورپ کی زندگی اور کچھ مخصوص انفرادیت کے لوگوں کے لئے ضرور موزوں ہے مگر جب کوئی اسے صرف اس لئے برتتا ہے کہ وہ دوسرے ناول نگاروں سے منفرد ہو جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ اترا رہا ہے۔ انفرادیت بنائی جا سکتی ہے مگر بنانے سے وہ بناوٹی ہو کر مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ ہمارے یہاں آزاد نظم لکھنے والوں اور شعور کی رو کے طریقہ پر افسانے یا ناول لکھنے والوں نے اکثر اپنے کو اس طرح مضحک بنا دیا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے شعور کی رو کے طریقے پر جب اپنا پہلا ناول پیش کیا تو اُسکو پڑھکر لوگوں نے یہی کہا کہ اترا رہی ہیں اس طرح لکھ رہی ہیں۔ مجھے بھی ایسے لوگوں کی رائے سے اتفاق ہوا مگر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور اُن کے اس طریقے پر عمل کی مثالیں سامنے آتی گئیں وہ یہ محسوس ہوتا رہا کہ اُن کی فطرت کو اس سے مناسبت ضرور ہے یہاں تک کہ "آگ کے دریا" سے یہ ثابت ہو گیا کہ اُن کی فطرت اس سے پورے طور پر ہم آہنگ ہے۔ اس قسم کی مثالیں ادب میں بہت ملتی ہیں کہ پہلے کسی ادیب نے اپنی انفرادیت دکھلانے کے لئے کوئی طریقہ اپنے اوپر عائد کیا اور پھر مشق کے بعد ثابت ہو گیا کہ یہی اسکی انفرادیت کو نمایاں کرنے کے لئے مناسب ترین طریقہ ہے۔

اس سلسلے میں عموماً دو قسم کے ادیب ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنکی منفرد فطرت ایسے طریقے ایجاد کرتی ہے جو پہلے کسی کی سمجھ ہی میں نہ آئے ہوں اور دوسری وہ جو کسی کے ایجاد کردہ نیم کامیاب طریقے کو اپنا کر اُسے چار چاند لگا دیتے ہیں۔ اس

شعور کی رو کے طریقے ہی کو لے لیجئے۔ اسکو ڈوروتھی رچارڈسن (Dorothy Richardson) نے ایجاد کیا۔ اس سے پہلے اس کے امکان کی طرف کسی کی توجہ نہیں تھی۔ اب دیکھا جاتا ہے کہ اس کے طریقہ کی مثالیں جابجا پرانے ناول نگاروں میں بھی ملتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کوئی چیز بالکل نئی نہیں ہے مگر اس طریقے کو جیسے مثلاً جین آسٹن نے اپنی ناول "ایما" (Emma) میں مس بیٹس (Miss Bates) کے سے کردار کو نمایاں کرنے ہی کے لئے برتا۔ تو ایک طویل ناول میں شروع سے آخر تک استعمال کرنے کی رسم ڈوروتھی رچارڈسن ہی نے شروع کی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو کسی کی نظر بھی اس طریقے کی طرف نہ جاتی اور اسے کوئی الگ طریقہ مانا بھی نہ جاتا۔ اسے اس کا موجد کہنا لازمی ہو جاتا ہے اس کے بعد جیمس جوائس اور ورجینا ولف نے اس طریقہ کو اسی طرح اٹھایا جیسے ہمارے یہاں قرۃ العین نے ورجینا ولف کے بابت اب بھی لوگوں کی رائے ہے کہ یہ طریقہ (stream of consciousness) ہو جاتا ہے یعنی زیادہ تر اتر دنا پن ہی اس کی انفرادیت کا ضروری جامہ ہے۔ مگر بہرحال ایسے اس کے یہاں ایسے مقامات پر ہی ہے جہاں اس کو ناکامیاب کہا جائے ورنہ اس کی بہترین ناولوں میں جیسے "ٹو دی لائٹ ہاؤس" (To the Lighthouse) ہمیں اس طریقے کی اس کی فطرت سے پورے طور پر ہم آہنگ ہو جانے کی مثال ملتی ہے اور وہ اس قسم کے انفرادی فنکاروں کی مثال ہو جاتی ہے جو دوسروں کے طریقوں پر چل کر انکو اپنا لینے میں پورے کامیاب ہوتے ہیں اور اس طرح اپنی انفرادیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ اگر ڈوروتھی رچارڈسن اور ورجینا ولف کی ناولوں کو ساتھ ساتھ رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آخر الذکر نے اول الذکر کے طریقہ کو زیادہ فنکارانہ صلاحیت سے برتا ہے اور اسمیں ایسے اضافے کئے ہیں جو داد دینے کے قابل ہیں حقیقت یہ ہے کہ اول الذکر کی مثال محض ایجاد بندہ اور بے وقعت سی چیز رہ جاتی اگر آخر الذکر اسپر اپنی جان قربان نہ کر دیتی اسی طرح قرۃ العین کا اس طریقہ کو ہماری ناول نگاری میں جواب تک بالکل ابتدائی درجہ سے آگے نہیں بڑھی ہے اس قسم کی زیادتی ضرور معلوم ہوتا ہے جو کسی کے پلے نہیں پڑتی مگر موصوفہ کے اسپر متواتر عمل اور نمایاں کامیابی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جدید زندگی جسکے اندر الدم سے گھسٹ کر ہماری قوم بھی آ ہی گئی اور جدید حالات جو تقسیم کے بعد ہمارا دبرلوٹ ہی پڑے ہیں بہترین طور پر اسی طریقہ سے ادا ہو سکتے ہیں۔

کسی ادب پارے کی انفرادیت عام لوگوں سے جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں چھپی رہتی ہے مگر اسکا اثر کئی صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے روایتی لوگ اسے بے ڈھنگا پن سمجھتے ہیں اور مطعون کرنے لگتے ہیں جیسا کہ انگلستان کے رومانی شاعروں کے ساتھ ہوا یا ہمارے یہاں پہلے پہلے اقبال کے ساتھ ہوا۔ دوسری طرف ایک انفرادی چیز کا وجود ایک سنسنی سی پھیلا دیتا ہے اور عام لوگ چونک پڑتے ہیں کچھ تعریف کرتے ہوئے اور کچھ مذمت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں حالانکہ سمجھتا کوئی نہیں۔ منفرد ادیب کی غیر ادبی بنیادوں پر ٹانگ کھینچی جاتی ہے مثلاً ہمارے یہاں اگر کوئی منفرد ناول ظہور میں آتی ہے تو اس کے فن کی انفرادیت کو دیکھنے کے بجائے اسکے جملے پکڑ کر اسے غیر اسلامی یا غیر پاکستانی کہا جاتا ہے اور اس پر پابندی لگا دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انفرادیت خالص ادبی نہیں رہتی بلکہ وہ خیالات اور نظریات پر یہ اثر ڈالتی ہے کہ انہیں کچھ نہ کچھ موڑ کر ضرور نئی صورت دیدیتی ہے۔ یہ عام ذہن کیلئے جاہے وہ عام قاری کا ہو یا عام نقاد کا برداشت کے قابل نہیں ہوتا۔ یہ لوگ اپنی وحشت زدہ رایوں سے اس کی شہرت کے بانی ہوتے ہیں اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ متوازن رائے کے لوگ اسکی انفرادیت کو پہچان لیتے ہیں اور وہ اعلیٰ ادب پاروں میں جگہ پاتا ہے۔

حسرت کاسگنجوی

"وفا ڈھونڈتے رہے"

نیلے آسمان پر بے شمار ننھے ننھے ستارے جھلملا رہے تھے۔ فضا میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چاندنی دُور دُور تک ہری ہری گھاس پر پھیلی ہوئی تھی۔ جمال نہ جانے کب سے تنہا باغ میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ریحانہ ضرور آئیگی لیکن ریحانہ نہیں آئی جمال کو بہت افسوس ہوا۔ وہ بنچ پر لیٹا ہوا آسمان پر چمکنے والے ستاروں کو دیکھ رہا تھا اور جب کوئی ستارہ ٹوٹ کر ایک لمبی سی تیز روشنی چھوڑتا ہوا فضا میں گم ہو جاتا تو وہ اپنے دل میں ایک انجانا سا غم محسوس کرتا۔ پھر اُس کے ذہن میں بے شمار تلخ یادیں اُبھر آتیں۔ ثریا، سلمیٰ، شکیلہ نہ جانے کتنی لڑکیوں سے اس نے محبت کی اور ہر ایک سے توقع کی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ اُس کے ساتھ رہ کر اس کی بے انتہا محبت کی قدر کریگی۔ اُس کی یہ تمنا کبھی پوری نہیں ہوئی یہ بات نہیں کہ اسے کبھی کسی لڑکی نے لفٹ نہیں دی۔ یونیورسٹی میں وہ ہیرو مشہور تھا۔ کوئی فنکشن کوئی جلسہ کوئی تحریک ایسی نہ تھی جہاں جمال نہ ہوتا۔ ٹیڈی لباس اور دلیپ کمار ہیئر کٹ اُسکی شخصیت کو ہمیشہ نمایاں رکھتے۔ جمال کبھی بھی بغیر اسٹائل کے نہیں مسکرایا۔ اس کے خوبصورت چہرے پر ہر وقت شادابی ہی نظر آتی۔ اکثر اوقات وہ لڑکیوں کے جھرمٹ میں ہوتا اس کے جملے بڑے چبھتے ہوئے ہوتے تھے۔ لڑکیوں پر فقرے کسنا اس کی خاص عادت تھی لیکن یہ ریمارکس نہ تو فحش ہوتے تھے اور نہ بھونڈے۔ اس لئے لڑکیاں ان فقروں سے اور بھی زیادہ لطف اندوز ہوتیں۔ یہ سب کچھ تھا لیکن جمال وہ نہیں تھا جو اوپر سے نظر آتا تھا۔ وہ فطری طور پر حُسن پرست تھا بعض اوقات تو اسکی یہ حُسن پرستی حد سے بڑھ جاتی۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی بہت ہی خوبصورت لڑکی جس پر حور ہونے کا گمان ہو اُس کو دل سے چاہے اس کی پوجا کرے اس کے دل میں تڑپ ہو جو صرف اس کے لئے ہو اور جب کبھی اُس نے اپنی اس خواہش کا ذکر اپنے قریب سے قریب دوست سے بھی کیا تو اُس کا مذاق ہی اُڑایا گیا۔ نہ جانے لوگ کیوں اُس کی بات ماننے سے انکار کرتے تھے۔ جمال خود ہی اپنا مذاق اُڑاتا اور کہتا نجانے میرے دل کو کیا ہو جاتا ہے کہ ایسی ایسی باتیں سوچنے لگتا ہے جو بہت ہی عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ اُسے اچھی طرح یاد ہے جب وہ ثریا سے ملا تھا۔ وہ ثریا کے حُسن سے بے انتہا متاثر ہوا تھا۔ ثریا عمر میں شاید اس سے بڑی ہی تھی مگر ناک نقشے کی بہتر تھی صرف بہتر ہی نہیں تھی بلکہ بہت ہی خوبصورت تھی اُس کے چمپئی رنگ میں بڑی جاذبیت تھی۔ ہونٹوں پر سنہری ریشم کے سے ہلکا ہلکا رُواں تھا۔ اور رُخساروں پر جب سُرخی دوڑ جاتی تو وہ ڈوبتی ہوئی شفق سے بھی زیادہ حسین نظر آتے۔ جمال کے دل میں ثریا کی محبت طوفان اور آندھی کی طرح آئی۔ جب کبھی ثریا مسکراتی تو جمال پر بجلیاں سی گرتیں۔ اکثر ملاقات رہتی کبھی کیفے میں کبھی یونیورسٹی کے لان میں کبھی لائبریری میں کبھی کلاس میں۔ اس عرصے میں کئی اور لڑکیاں جمال کی طرف

مخاطب ہوتیں اور جمال نے ہر ایک کا خیر مقدم کیا۔ ثریا نے اس کا برا نہیں مانا بلکہ وہ اور بھی خوش تھی۔ جمال کو ثریا کی یہ بات بہت پسند آئی کہ وہ کتنی وسیع القلب ہے ورنہ عام لڑکیاں جل بھن کر خاک ہو جاتی ہیں۔ پکنک، لیکچرز، نمائش غرض ہر جگہ جمال ہوتا اور لڑکیاں ہوتیں، خوش گپیاں ہوتیں، لطائف ہوتے، پروفیسروں پر عجیب و غریب قسم کے ریمارکس کسے جاتے، یونین اور ان کے فنکشن کا تذکرہ ہوتا۔ یونیورسٹی کے سٹوڈنٹس پالٹیکس پر تبصرہ ہوتا۔ انگریزی فلموں کی تعریف ہوتی اور پاکستانی فلموں پر ناپسندیدگی کا اظہار ہوتا لیکن ایک دن جبکہ ثریا تجمل سے ہنس ہنس کر لگاوٹ کی باتیں کر رہی تھی جمال کے دل پر ایک دھکا سا لگا اُسے یوں محسوس ہوا کہ ثریا نے اُس سے بہت بڑی بیوفائی کی ہے۔ ایسی بیوفائی جس کی اُسے قطعی اُمید نہیں تھی لیکن جمال نے یہ ظاہر نہ کیا کہ اُسے یہ بات بُری لگی ہے وہ بھی ہنسنے لگا۔ لیکن اُس کا دل رو رہا تھا اس کے بعد بھی وہ ثریا سے ملتا رہا۔ لیکن ایک چبھن اس کے دل میں تھی، ایک خلش سی تھی اور جب بھی یہ خیالات اس کے ذہن میں اُبھرنے لگتے تو وہ بے چین ہو جاتا۔ لیکن اس نے کبھی بھی اپنی بے چینی کا اظہار ثریا پر نہ کیا۔ اسی طرح ملتا رہا، قہقہے لگاتا رہا۔ پھر یکایک اس کی زندگی میں سلمیٰ داخل ہو گئی جس کے چہرے پر جنسی کشش بہت زیادہ تھی اور جب وہ مسکراتی تو اُس کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے، رخسار پر سُرخی دوڑ جاتی۔ جمال کئی دفعہ اُسکے ساتھ پکچر دیکھنے گیا۔ کیفے میں بیٹھا۔ ہر جگہ سلمیٰ کی میٹھی باتوں نے جمال پر اپنے اثرات چھوڑے اور سلمیٰ کے نازک گلاب کے پنکھڑیوں جیسے ہونٹ مسکرانے کے لئے پھیلتے تو جمال کا دل اُس کے پہلو میں دھڑکنے لگتا۔ سلمیٰ کے چہرے پہ جنسی کشش اور بھی اُبھر آتی۔ جمال خود پر قابو پا لیتا اور پھر دل ہی دل میں خوش ہوتا کہ سلمیٰ اُس پر جان دیتی ہے،

اُس کی مسکراہٹوں سے اُس کے دل میں عجیب سی گدگدی ہوتی ہے۔ جب سلمیٰ کی بڑی بڑی روشن آنکھوں سے خوشی جھانکتی تو جمال کا دل چاہتا کہ وہ خوشی سے ناچے۔ یہ سلسلہ بھی کافی دن چلا لیکن ایک دن اسے معلوم ہوا کہ سلمیٰ کے تعلقات ایک اور لڑکے سے ہیں تو جمال کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا دُنیا اسے گھومتی ہوئی نظر آنے لگی۔ دل ایک انجانے غم کے بوجھ تلے دبنے لگا۔ جمال کی روح کو دھکا سا لگا۔ لیکن اخلاقی طور پر اسے مسکرانا ضروری تھا اس نے سلمیٰ کے تصور سے ایک دُنیا آباد کی تھی لیکن اب تو سلمیٰ اسے ایک زہریلی ناگن سے زیادہ خطرناک نظر آتی تھی یہ سب کچھ تھا لیکن جمال نے اپنی نفرت کا اظہار نہیں کیا اور جب سلمیٰ اس کے سامنے آئی تو نہ جانے کیسے جمال کے ہونٹ پھیل گئے، وہ اسی انداز سے ملا جس طرح کہ ملتا رہتا تھا۔

ان تلخ تجربوں نے جمال میں کافی تبدیلی پیدا کر دی تھی لیکن یہ تبدیلی ایسی نہ تھی کہ اسے کوئی محسوس کر پاتا، بس ایک تبدیلی تھی جس کا احساس جمال کو اکثر اوقات تنہائی میں ہوتا لیکن اس کے حُسن پرستی کے جذبات آہستہ آہستہ غالب آنے لگتے اور وہ ایک انجانے جذبہ کے تحت ان تلخ حادثوں کو محض اتفاق سمجھتا پھر وہ داغ کے رنگین قسم کے اشعار گنگنانے لگتا پھر اس کے ذہن پر بے شمار سوئے ہوئے لطیف جذبے بیدار ہونے لگتے۔ خوبصورت خوبصورت لڑکیاں ہوں، گورے گورے جسم ہوں، بڑی بڑی روشن آنکھیں ہوں جن میں شراب کی سی مستی ہو، رنگین لہراتے ہوئے آنچل ہوں، بکھرے بکھرے گیسو ہوں۔ آسمان پر چاروں طرف بدلیاں چھائی ہوں ٹھنڈی اور فرحت بخش ہوا چل رہی ہو۔ فضا رومان پرور ہو۔ کیاریوں میں گلاب کے پھول ہوا کے تند جھونکوں سے جھولا جھول رہے ہوں۔ تمام عالم میں حُسن ہی حُسن بکھرا ہو۔

خوشیاں ہی خوشیاں ہوں، قہقہے ہوں مسرتیں ہوں۔ جمال ایک دم چونک پڑا۔ اُسے لیٹے لیٹے کافی دیر ہوگئی تھی وہ اُٹھا اور گھر چلا آیا۔

صبح جب جمال اُٹھا تو اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ریڈیو آرٹسٹ کوثر سے محبت کریگا کوثر بہت حسین تھی اور کئی دفعہ مشہور ہوا تھا کہ وہ فلاں سے محبت کرتی ہے۔ جمال کے نزدیک یہ سب افواہیں تھیں اسے کوثر سے دوستی کرنے میں زیادہ دقت نہیں اُٹھانا پڑی وہ اسی کلب کی ممبر تھی جس کا کہ جمال تھا ایک شام دونوں کی ملاقات ہوئی اور دوسرے ہی دن یہ ملاقات بے تکلفی میں بدل گئی، کوثر سے مل کر جمال نے پھر اپنی ایک دُنیا آباد کی جو کہ بیحد حسین تھی لیکن یہ محبت جس قدر جلد وجود میں آئی تھی اُس سے زیادہ جلد اُس کی پایہ داری ختم ہوگئی، کوثر ایک فلم پروڈیوسر کی طرف زیادہ مائل ہوگئی جس نے وعدہ کیا تھا کہ اپنی نئی فلم میں وہ اُسے ہیروئن کا درجہ دیگا۔ کبھی کبھی کوثر سے جمال کی ملاقات ہوتی بھی تو کوثر فلمی پروڈیوسر کے سامنے جمال سے اِس قدر بے رُخی سے ملتی جیسے زندگی میں پہلی بار اُس سے مل رہی ہے۔ وہ محل جو جمال نے اپنے ذہن میں بسا رکھے تھے ریت کے گھروندے کی طرح گر پڑے۔ جمال کو اس ناکامی کا بھی بڑا افسوس تھا لیکن حسبِ عادت وہ اس حادثے کو بھی برداشت کر گیا۔ ثریا، سلمیٰ، شکیلہ غرض ہر لڑکی سے اسی جوش و خروش سے ملتا رہا جو کہ اُس کا دستور تھا اور جب کبھی جمال تنہا ہوتا تو اُس کا دل چٹکیاں لیتا اور بہت سارے انجانے غم اُس کے دل پر مسلط ہو جاتے اس کا دل چاہتا کہ وہ روئے لیکن رونا تو جیسے اُس کی فطرت میں داخل ہی نہیں تھا وہ ایسے وقت زور زور سے قہقہے لگایا کرتا تاکہ غم کے بادل چھٹ جائیں اگر کوئی اُسے تنہائی میں دیکھتا تو پاگل ہی سمجھتا۔

کچھ دنوں کے بعد جمال نے اپنے اصولوں میں کچھ ترمیم کردی، یہ ترمیم اخلاقی پستی کی طرف مائل تھی وہ ہر حسین لڑکی سے فلرٹ کرنا چاہتا تھا کبھی کبھی اُس کے ذہن میں یہ بھی خیال آتا کہ وہ اپنی اس حُسن پرستی کو جنسی آسودگی کے لئے استعمال کرے اور اپنی دولت کے سہارے وہ حُسن خریدے، یہ غلط خیال جب اُس کے ذہن میں آتا تو وہ ایک لمحے کے لئے سوچتا جمال تو کتنا پست ہوگیا ہے۔ کیا یہ خیال تیری حُسن پرستی پر ضرب نہیں پھر بہت سے خیال گڈمڈ ہو کر اس کے ذہن میں ایک اُلجھن کی سی صورت اختیار کر لیتے۔

اور پھر کچھ دنوں کے بعد ریحانہ میں دلچسپی لے رہا تھا۔ ریحانہ اس کی ساتھ والی کوٹھی میں رہتی تھی۔ ریحانہ کی محبت سلمیٰ کی محبت سے بھی زیادہ تھی، اسے اپنی خوبصورتی پر بڑا ناز تھا۔ اور وہ جمال کی فطرت سے واقف تھی۔ دونوں کی محبت میں بڑا جوش و خروش تھا لیکن کبھی کبھی ریحانہ بجھی بجھی سی نظر آتی، جمال جب معلوم کرتا تو وہ ٹال جاتی۔ جمال بھی کچھ سوچ کر خاموش ہو جاتا۔ ایک دن ریحانہ کا موڈ سنجیدہ تھا۔

"جمال!"

"ہوں۔"

"ہمارا یہ ملنا اچھا نہیں۔"

"کیا پُرانی باتیں لے کر بیٹھی ہو۔"

"ہم شادی کیوں نہ کرلیں،" ریحانہ نے نجانے کیسے بے خوف ہو کر کہا۔

"شادی،" جمال کچھ حیران ہوا۔

"ہاں شادی۔ تم چونکے کیوں۔ کیا شادی بُری بات ہے میں سمجھتی ہوں ہماری شادی محبت کا زینہ ثابت ہوگی۔"

"تم مذاق کر رہی ہو؟"

"میں مذاق کرنے کی عادی تو ہوں مگر اس وقت سنجیدہ ہوں۔"

جمال نے ایک لمحہ کے لئے سوچا پھر اُس کی نگاہیں ریحانہ کے پتلے پتلے یاقوتی ہونٹوں پر آکر رک گئیں جذبات اس پر غالب آرہے تھے۔

"اگر تم مذاق نہیں کر رہی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں"۔

ریحانہ ایک اچھوتے انداز سے مسکرائی اور جمال پر جیسے بجلی گر پڑی۔

ایک ہفتے کے اندر اندر شادی بھی ہوگئی، سب لوگ حیرت میں تھے کہ یہ شادی اس قدر جلد کیسے ہو رہی ہے ریحانہ اور بھی زیادہ خوش رہنے لگی اور جمال بھی خوش تھا اُس کا ایک بہت ہی دیرینہ ارمان پورا ہوگیا تھا۔ ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ریحانہ کا ایک خالہ زاد بھائی لندن سے آیا اور اتفاق کی بات تھی کہ ان دنوں جمال کچھ بیمار تھا لیکن ریحانہ نے کبھی بھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ جمال بیمار ہے، وہ اکثر اوقات اپنے خالہ زاد بھائی کے ساتھ کلب چلی جاتی اور کافی رات گئے واپس آتی دو چار دن تو جمال نے آزادی کے نام پر یہ چیز برداشت کی لیکن وہ ایسا نہ تھا جیسا کہ نظر آتا تھا اُس لئے ریحانہ کا آنا جانا اسے سخت ناگوار تھا۔ لیکن جو آزادی کی کھال اُس نے اوڑھ رکھی تھی اُسے ایکدم اُتارتے ہوئے وہ خود بھی خوف کھاتا تھا اسی کشمکش میں اس کا ذہن ہر وقت گھومتا رہتا تھا، بیماری اور کمزوری نے اسے چڑچڑا بھی کر دیا تھا۔ ایک شام جب ریحانہ ٹینس کھیلنے جا رہی تھی تو جمال نے آواز دی۔ ریحانہ آواز پر رک گئی لیکن اُسے یہ آواز انتہائی ناخوشگوار محسوس ہوئی۔

"کیا ہے؟"

"کہاں جا رہی ہو۔؟"

"آج میچ ہے" یہ کہہ کر ریحانہ بغیر کچھ سُنے ہوئے چلی گئی۔ اس کے بعد کئی ایسے موقعے آئے اور ہر دفعہ ریحانہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیئے جمال کو بے انتہا افسوس ہوا اُس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے دل رونے کو چاہتا۔ لیکن یہ تو اُس کا پُرانا دستور تھا جب اُس کا دل رونے کو چاہتا وہ قہقہے لگاتا۔ نجانے ایسے کتنے قہقہے جمال نے لگائے اور جب جمال تندرست ہوگیا تو اُسے معلوم ہوا ریحانہ ریحانہ نہیں رہی ہے، وہ کٹ چکی تھی اور اپنے خالہ زاد بھائی کے بچے کی ماں بننے والی تھی جمال کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ لیکن یہ صدمہ اتنا بڑا تھا کہ وہ قہقہہ نہ لگا سکا۔ صبح اُٹھتے ہی اُس نے ریحانہ کو طلاق دے دی۔ گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ عزیزوں اور دوستوں نے کچھ پوچھا لیکن اس نے کچھ نہ بتایا اور یہی کہا کہ ہم آزاد خیال ہیں اور اب جبکہ ہماری آزاد خیالی پر حرف آنے لگا تو ہم نے علیحدگی اختیار کر لی۔

جمال بہت اُداس اُداس رہنے لگا۔ یونیورسٹی میں جب بھی آتا لوگ ہیرو ہیرو کہہ کر اس کی طرف دوڑتے لیکن اس کے دل کی کلی نہ کھلی۔ وہ حسب معمول مسکراتا ضرور تھا مگر اُس مسکراہٹ میں بھی جدائی کے رنج تھے اُس کی عادتوں میں ذرا سا بھی تو فرق نہیں آیا تھا۔ ثریا۔ سلمیٰ۔ شکیلہ، کوثر غرض ہر لڑکی سے وہ اسی طرح ملتا تھا اس لئے اُسے کسی نے نہیں سمجھا، وہ تو ایک معمہ تھا ایک حسین اور دلفریب معمہ!

نجانے کہاں سے ایک خیال رینگتا ہوا جمال کے ذہن میں آیا۔ حُسن فانی ہے حسین مغرور ہوتے ہیں اور یہی غرور انہیں تباہی کے کنارے تک لیجاتا ہے حسین کھلے ہوئے گلاب کی طرح تو ہوتے ہیں لیکن ان میں پائیداری نہیں، شاخ سے جُدا ہوتے ہی مُرجھا جاتے ہیں اُن کا حسن ختم ہو جاتا ہے، تو پھر کیوں نہ ایسی چیز سے محبت کی جائے جو مُرجھانے والی نہ ہو، اور پھر یکایک اُسکے ذہن

میں ایک بات آئی کیوں نہ کسی بدصورت لڑکی سے محبت کرے کم ازکم اس بدصورت لڑکی کو یہ تو احساس ہوگا کہ اُس کا شوہر خوبصورت ہے اور وہ اسی وجہ سے اپنے شوہر سے بے انتہا محبت کرے گی یہ اس کی خوش نصیبی ہوگی کہ اُسے خوبصورت شوہر ملے گا۔ یہ خوبصورتی اُس پر ایک عظیم احسان ہوگی۔ ایک ایسا احسان جس کے تلے وہ ہمیشہ دبی رہیگی اور غرور یا تکبر یا بیوفائی کا شائبہ بھی اُس کے ذہن میں نہیں آئیگا ٹھیک ہے جمال خود ہی بڑبڑایا "ایسا ہی ہوگا" لیکن نہ معلوم کیوں اس کا دل ایک بدصورت لڑکی کے تصور سے ہی بیٹھا جا رہا تھا، وہ ہمیشہ سے حُسن پرست واقع ہوا تھا حسن پرستی کا جذبہ وقتی طور پر جذبات کے پردوں میں چھُپ گیا۔ اور جمال کو اب ایک بدصورت لڑکی کی تلاش تھی جو اُس سے شادی کرسکے۔ لیکن جلد ہی جمال کو احساس ہوا کہ بدصورت لڑکی حاصل کرلینا کوئی معمولی بات نہیں۔ لڑکیاں تو بہت سی بدصورت تھیں لیکن جمال کی ان سے بات کرنے کی جراءت نہیں ہوتی تھی، وہ بہت سے ایسے محلوں میں گیا جہاں اُس کے خیال کے مطابق بدصورت لڑکیاں ہوسکتی تھیں لیکن اُسے سخت ناکامی ہوئی اس لئے کہ اُن میں کوئی بھی تو ریحانہ نہ تھی جسے اپنے متعلق غلط فہمی ہوتی، کوئی بھی تو سلمیٰ نہیں تھی جسے اپنے چہرے کی جنسی کشش پر ناز ہوتا۔ اور جمال کو جب سخت ناکامی ہوئی تو اُس کا یہ جذبہ اور بھی جوان ہوگیا۔ ایک دن اُس نے ایک کالی بدصورت لڑکی دیکھی جو کہ اتفاق سے نوجوان بھی تھی لیکن جمال کی اتنی جراءت نہ ہوسکی کہ وہ اُسے روک کر ایک بات ہی کرلیتا۔ البتہ اتنا ضرور کیا کہ لڑکی کے پیچھے ایک پالتو کتے کی طرح چلتا رہا اور مکان دیکھ آیا۔ اور پھر کئی ماہ تک یہی دستور رہا لڑکی شاید کسی اسکول میں پڑھتی تھی اور برقعہ استعمال نہیں کرتی تھی اور نہ اُسے اپنی صورت پر ناز تھا اور نہ ہی شاید اُس نے کبھی اس سلسلے میں سوچا تھا۔ ایک دن ہمت کرکے جمال نے پُوچھا۔ "تم کون سی جماعت میں پڑھتی ہو؟" لڑکی نے بات سنی اَن سنی کردی۔ دوسرے دن پھر جمال نے اس کا نام پُوچھا لڑکی اُس دن بھی خاموش رہی اور پھر یہ سلسلہ چلتا ہی رہا تو اُس نے بغیر کسی خوف کے نام اور کلاس بھی بتادی۔ بات بڑھتی رہی، جمال لڑکی کی اُلٹی سیدھی تعریفیں بھی کرتا، لڑکی خاموش ہوجاتی۔ اُسے اچھی طرح علم تھا جیسی کہ وہ تھی لیکن یہ روز روز کی باتوں نے اُسے کچھ سوچنے پر مجبور کردیا لڑکی کا نام حمیدہ تھا۔ حمیدہ اب جب بھی گھر میں تنہائی میں آئینہ دیکھتی تو اُسے معلوم ہوتا اس کا رنگ سانولا سلونا ہوگیا ہے آنکھیں ستاروں کی طرح روشن ہوگئی ہیں، وہ خوشی سے جھوم جاتی۔ اب اُسے جمال کی باتوں پر اعتبار سا آنے لگا تھا اور پھر ایکدن جمال نے حمیدہ کے والد کو پیغام بھیجا کہ وہ شادی کرنا چاہتا ہے حمیدہ کے والد نے پہلے تو اُسے مذاق ہی سمجھا اور اسے اپنی بے عزتی بھی تصور کیا لیکن جب اُسے معلوم ہوا کہ جمال کا یہ پیغام سنجیدگی کے ساتھ ہے تو وہ خوش ہوا اور حمیدہ دُلہن بن کر جمال کی خوبصورت کوٹھی میں آگئی۔ جمال نے یہ سب کچھ ایک انجانے سے جذبے کے تحت کرلیا تھا لیکن اس کے دل کے اندر حُسن پرستی کا جو مادّہ بھرا ہوا تھا اُس پر کوئی اثر نہیں آیا تھا۔ وہ اب بھی دل کی گہرائیوں سے حُسن پر جان دیتا تھا، یہ تو اُس کی فطرت تھی آخر وہ اسے کیسے بدل دیتا؟ اس بات کا احساس اُسے شدّت کے ساتھ اُس وقت ہوا جبکہ حمیدہ دُلہن بن کر آگئی تھی۔ وہ پھولوں کی سیج پر شرمائی لجائی ہوئی گٹھڑی بنی بیٹھی تھی جمال آیا لیکن اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ دل میں ایک انجانا سا خوف تھا، آنکھوں میں پریشانی کی سی جھلک تھی۔ پلنگ پر بیٹھتے ہی جمال کو اپنے سارے جسم میں عجیب سی سنسنی محسوس ہوئی حمیدہ کو وہ ہزاروں

دفعہ دیکھ چکا تھا۔ پھر بھی یونہی دیکھنے کی تمنا سی ہوئی اور جب اُس نے گھونگھٹ اُٹھا کر دیکھا تو اُسکے دل پر سخت چوٹ لگی، سیاہ فام چہرے پر پوڈر کی تہہ جمی ہوئی تھی، موٹے موٹے ہونٹ سُرخی سے لتھڑے ہوئے تھے چھوٹی چھوٹی آنکھیں تنگ پیشانی تھی قریب تھا کہ جمال کی چیخ نکل جائے مگر اُس نے خود پر قابو پا لیا۔ جمال۔ اس کا دل جیسے خود سے کہہ رہا تھا یہ حمیدہ ہے حمیدہ۔ جس کا تم نے خود ہی انتخاب کیا تھا جس کا تم نے عرصے تک پیچھا کیا اور آج جب معصوم تمہاری بیوی بن کر آگئی ہے تم نفرت کا اظہار کر رہے ہو یہ ریحانہ نہیں سلمیٰ نہیں، ثریا نہیں، حمیدہ ہے حمیدہ سے حمیدہ ہونے کا خیال ہی ذہن میں رکھو اور اسے اُس کا حق دو۔ ورنہ یہ ایک عظیم ترین گناہ ہوگا۔ کسی معصوم کے خیالوں اور ارمانوں سے مذاق کرنا کتنا سنگین جُرم ہے۔ یہ ریحانہ کی طرح خوبصورت تو نہیں لیکن یہ اُس کی طرح مغرور اور بے وفا بھی تو نہیں، اور اس وقت تجھے ایک خوبصورت عورت کی ضرورت نہیں ایک با وفا اور مخلص عورت کی ضرورت ہے اور وہ اس وقت حمیدہ کے رُوپ میں تیرے سامنے ہے۔

اُس رات جمال نے دل کی بات مان لی۔

لیکن وہ اپنی فطرت پر قابو نہ پا سکا۔ نجانے کیوں اسے حمیدہ اور بھی زیادہ کالی نظر آنے لگی۔ اُس کی بدصورتی بڑھتی ہی گئی۔ وہ ہزار کوشش کرتا کہ اپنے ذہن سے حُسن پرستی کے خیالات نکال دے، وہ سارا سارا دن بڑے بڑے پلان بناتا لیکن جوں ہی حمیدہ کی صورت دیکھتا تو تمام خیالات ایکدم ریت کے گھروندے کی طرح دھم سے گر پڑتے، اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اُس کا سر گھوم رہا ہے۔ ہزاروں ریحانائیں اور حمیدائیں چکر لگا رہی ہیں، وہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا اور پھر ایک دم دیوانگی کے سے عالم میں اپنی چھوٹی سی کار میں بیٹھ کر باہر نکل جاتا اور کافی رات گئے گھر آتا۔ اور جب آتا تو حمیدہ حسب معمول جاگی ہوئی ملتی تو اُسے اور بھی کوفت ہوتی لیکن وہ کبھی بھی اپنی زبان سے کچھ کہہ نہیں سکا۔ حمیدہ کو بڑی خواہش تھی کہ جمال اُس کے حُسن کی تعریف کرے، اُس کی آنکھوں میں جھانکے، اُسے سینے سے لگائے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ جمال کے دل کی خلش بڑھتی ہی رہی، وہ بے چین ہو کر تڑپتا ہی رہا۔ اور حمیدہ آنسو بہاتی رہی، یونہی ایک سال بیت گیا۔ لیکن جمال اپنی فطرت میں تبدیلی پیدا نہ کر سکا۔

حمیدہ نے بہت انتظار کیا کہ جمال اُسے اپنی بیوی سمجھے اور پھر ایک دن جمال کے جوان مالی نے حمیدہ کو بتایا کہ وہ تو خوبصورتی کے رسیا ہیں، یہ شادی تو اُنہوں نے یونہی کر لی ہے، تو مالی کی باتیں حمیدہ کو بہت اجنبی لگیں لیکن جلد ہی اُسے اُس کی صداقت پر یقین آگیا۔ اور جب اس جوان مالی نے حمیدہ کو اپنے مخصوص انداز سے تعریف کی تو اُس کے سوتے ہوئے احساسات جاگ گئے پھر اُسے مالی میں بڑی کشش نظر آنے لگی اور پھر ایک تاریک رات میں حمیدہ مالی کے ساتھ فرار ہو گئی۔

جمال نے جب یہ خبر سُنی تو دیوار میں بڑے زور سے سر مارا اور جب گرم گرم خون نکلا تو ایک لمحے کے لئے اُسے ایک انجانا سا سکون محسوس ہوا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اُس کی رُوح تک لرز اُٹھی۔

اعتذار

ہمیں افسوس ہے کہ چند پریشانیوں کی وجہ سے ۱۹۶۴ء میں ساقی باقاعدگی سے شائع نہیں ہو سکا۔ توقع ہے کہ ۱۹۶۵ء میں پرچہ وقت پر شائع ہوتا رہے گا۔

منیجر "ساقی"



پی آئی اے کا ہر پانچواں مسافر — نیا مسافر

جہاں پچھلے پانچ سال میں دوسری تمام ایرلائنوں پر مسافروں کی آمد و رفت میں اوسطاً ۱۱ فیصدی اضافہ ہوا ہے وہاں پی آئی اے کے نیلے ۵۵ فیصدی کے ریٹ کے ساتھ مسافروں نے سفر کیا ہے۔ صرف پی آئی اے کی حیرت انگیز نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ پی آئی اے کی عملی متاعی کے اعلیٰ معیار کا بھی اظہار ہوتا ہے جو ایک مرتبہ پھر صنعت ہوابازی کی اوسط سے خاصا بلند ہے۔ اسی زبردست ترقی اور خیال انگیز منصوبہ بندی کی بدولت پچھلے سال پی آئی اے سے سفر کرنے والوں کی تعداد ۳۰ فیصد سے بھی زیادہ بڑھ گئی ہے اس طرح یہ ایرلائن پہلے سے بھی زیادہ منفعت بخش ثابت ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ پی آئی اے کے مسافر یہ کہتے ہیں کہ پی آئی اے واقعی باکمال لوگ اور ان کی پرواز واقعی لاجواب پرواز ہے۔

شنگھائی۔ کینٹن۔ ڈھاکہ۔ کراچی۔ تہران۔ بیروت۔ روم۔ جنیوا۔ ماسکو۔ فرینکفرٹ۔ لندن



پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز

باکمال لوگ
لاجواب پرواز

سید شمیم زاہدی

بہار میں اُردو شعر و ادب کا عہدِ زریں

موجودہ صدی کا پہلا ربع بہار اُردو شاعری کا عہدِ زریں کہا جا سکتا ہے۔ شاہ اکبر داناپوری صفیر بلگرامی اور حضرت شوق کا آخر زمانہ تھا۔ اسی زمانے میں شاد اور احقر کا طوطی بول رہا تھا۔ کچھ جواں سال شعرا بھی میدان میں آ چکے تھے جنہوں نے بعد میں اساتذہ کا درجہ حاصل کیا۔ بیرونی اساتذہ میں وحید الہ آبادی اور ازل لکھنوی کے بعد مضطر خیرآبادی کے بھائی کوثر خیرآبادی اور حفیظ جونپوری پہنچے۔ پٹنہ۔ بہار شریف اور گیا شعر وسخن کے بڑے مراکز تھے۔ دوسرے شہروں اور قصبوں میں بھی علم وادب کا اچھا خاصا چرچا تھا۔ متعدد ماہوار اور ہفتہ وار رسائل شائع ہو رہے تھے۔ شاعروں کے گلدستے شائع کئے جاتے۔ پٹنہ میں مشاعروں کی محفلیں اور محرم کی مجلسیں خوب جمی ہوئی تھیں۔ جن میں انیس، دبیر اور داغ اور پیارے صاحب رشید بھی شریک ہوتے تھے۔ پٹنہ میں شاد اور فضل حق آزاد، بہار میں احقر اور عطا۔ گیا میں عشرت گیاوی اور کوثر خیرآبادی چمنستانِ سخن کی آبیاری کر رہے تھے۔ شیخ پورہ میں شاہ ہاشم بہار تھے۔ اس دور میں غزل۔ مراثی، قطعات رباعیات نظم، مسدس اور دوسرے اصناف پر طبع آزمائی کی گئی۔ احقر۔ شاد۔ فضل حق آزاد۔ شوق نیموی۔ عطا بہاری۔ بہار شیخ پوری امداد امام اثر۔ عشرت گیاوی۔ عرش گیاوی، صف اوّل کے اساتذہ تھے۔ ان کے بعد مبارک عظیم آبادی۔ محمود عظیم آبادی شفق عماد پوری۔ نسیم ہسوی۔ سخن بہاری، مقصود گیاوی، ساغر ماروی۔ بیتاب عظیم آبادی۔ ضیا عظیم آبادی شاغل فریدی۔ وغیرہ جواں سال شعرا کا نام آتا ہے۔ شفیع فردوسی۔ یاس بہاری، مظفر مظفر پوری، تمنا عمادی۔ حمید عظیم آبادی۔ ڈاکٹر عظیم۔ سریر کابری بھی میدان میں آ چکے تھے۔

شوق نیموی:- مولانا ظہیر حسن شوق نیموی متوفی سنہ ۱۹۲۲ء زبردست عالم اور حدیث کے اسکالر تھے۔ ان کی تالیف "آثار السنن" حدیث کی مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ شوق ایک شاعر کی حیثیت سے بھی اونچا مقام رکھتے ہیں۔ امیراللہ تسلیم لکھنوی کے شاگرد تھے۔ شوق کے ہاں زبان کی صحت وصفائی کا بہت خیال رکھا گیا ہے۔ ابتدائی کلام میں اثر بھی ہے۔ آخر میں جب عروض وفن اور زبان کی صحت پر زیادہ توجہ دینے لگے تو شعریت جاتی رہی اور پہلا سا حسن نہیں رہا۔ شوق کا دیوان سنہ ۱۳۲۶ھ میں شائع ہو چکا ہے۔ ایک زمانہ میں ان کی وہ غزل جس کا مطلع ہے ؎

دل شوق حسینوں سے لگانا نہیں اچھا　　ہو جاؤ گے بدنام زمانہ نہیں اچھا

ہر جگہ گونج رہی تھی۔ اس کے چند اشعار اور بھی ملاحظہ فرمایئے ؎

رہتے ہو جو دل میں تو جگر کو نہ جلاؤ　　ہمسائے کے گھر آگ لگانا نہیں اچھا

چڑھ جاؤ گے نظروں پہ کھٹک جاؤ گے دل سے　　ہر روز کسی بزم میں جانا نہیں اچھا

دامن کبھی جھٹکتے ہیں وہ ملتے ہیں کبھی ہاتھ ــــ اے شوقؔ ابھی ہوش میں آنا نہیں اچھا

امداد امام اثرؔ:- نواب امداد امام اثرؔ جن کا اصل مکان نیورہ تھا، بہار کے مشاہیر میں تھے، وہ سر علی امام اور حسن امام کے والد تھے۔ خان بہادر کا خطاب تھا۔ شاعری کا اچھا مذاق رکھتے تھے اور مشہور بھی تھے۔ لیکن وہ شاعر سے زیادہ محقق اور ادیب تھے۔ ان کی تصنیف "کاشف الحقائق" ان کی عالمانہ استعداد اور تحقیقی و تنقیدی صلاحیت کی مظہر ہے۔

بہارؔ شیخ پوروی:- شیخ پورہ صوبہ کے قدیم ترین مقامات میں سے ہے اور یہ قصبہ آٹھویں صدی ہجری سے مسلم تہذیب و ثقافت سے وابستہ ہے۔ مخدوم شاہ شعیب کی وجہ سے یہ مقام زیادہ تعارف کا محتاج نہیں۔ شاہ محمد ہاشم بہارؔ شیخ پورہ کے عمائدین میں تھے۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر عبور تھا۔ ایک شاعر کی حیثیت سے بہارؔ کا احترام تمام اساتذہ معاصرین کرتے تھے۔ نظم۔ غزل۔ سلام۔ مراثی سب کہتے تھے۔ مرثیہ اور سلام کہنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ یہی حال رباعیات کا تھا بہارؔ کی رباعیات نہایت نفیس ہیں۔ بہار میں رباعی گو کی حیثیت سے سب سے زیادہ شہرت عشرتؔ گیاوی کو حاصل تھی۔ وہ بہار میں رباعیات کے بادشاہ کہے جاتے تھے۔ اس کے بعد اس صنف میں بہارؔ ہی کا نام آتا ہے۔ چند رباعیات ملاحظہ ہوں ؎

بدبیں کی آنکھیں بہار بدبیں کی ہیں ــــ تذلیل بشر میں ذلتیں اپنی ہیں
اک انگلی اٹھا کے دیکھ اوروں کی طرف ــــ تین انگلیاں خود اپنی طرف اٹھتی ہیں

ــــــــ

دنیا میں مرا قیام بیکار ہوا ــــ کوئی عمل خیر نہ زنہار ہوا
طفلی گزری گئی جوانی کی بہار ــــ پیری کا شباب اب نمودار ہوا

ــــــــ

پیری دل بریاں پہ نمک ریز ہوئی ــــ توسن عمر کو اک اور بھی مہمیز ہوئی
رعشہ تھا ہی ہوا تنفس بھی شروع ــــ بیٹھے ہو بہارؔ! اٹھو ہوا تیز ہوئی

ــــــــ

پیری کی نہ کچھ ہم سے مدارات ہوئی ــــ ہونے والی تھی بلا آخر جو وہی بات ہوئی
وہ جو آئی تو ہم چلے زمانے سے بہارؔ ــــ کہنے کو اک سرسری سی ملاقات ہوئی

ــــــــ

موت آئے گی مر جائیں گے ڈرنا کیا ہے ــــ خالق کی یہی رضا ہے تو کرنا کیا ہے
اب تک نہ ہوئی جس کی حقیقت معلوم ــــ وہ بھید تو کھل جائے گا مرنا کیا ہے

ــــــــ

شادؔ عظیم آبادی:- سید الشعرا شادؔ عظیم آبادی نے جو شہرت حاصل کی وہ ان کے معاصرین میں کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ جعفر بہاری۔ شوقؔ نیموی اور فضل حق آزادؔ کا بھی ایک زمانے میں طوطی بول رہا تھا۔ لیکن زمانے نے انہیں رفتہ رفتہ فراموش کرنا

شروع کر دیا۔ ممکن ہے کہ معاصرین میں بعض شاؔد سے بلند مرتبہ کے شاعر ہوں لیکن جہانتک شہرت و مقبولیت کا تعلق ہے شاؔد سب سے آگے نکل گئے۔ زندگی میں شاؔد کے کلام پر زبردست اعتراضات کئے گئے، جو ایک حد تک دُرست بھی تھے لیکن اس مخالفت اور نکتہ چینی نے انہیں مشہور بھی کر دیا اور انہیں اپنی کمزوریوں کی تلافی کا بھی موقع مِل گیا ؎

خدا بھلا کرے اے شاؔد نکتہ چینوں کا
سکھا دیا مجھے بچ بچ کے راستہ چلنا

یہ فطرتی امر ہے کہ جب کسی کی مخالفت کی جاتی ہے تو اُس کی طرف لوگوں کی توجہ بھی بڑھ جاتی ہے۔ جب مشاعروں، محفلوں اور جرائد میں شاؔد پر نکتہ چینی شروع ہوئی تو لوگوں کو اُن کے کلام کے مطالعہ کا شوق بڑھا اور خود انہیں اپنی کمزوریوں کی اصلاح کا موقع ملا۔ شاؔد کو کچھ ہمدرد بھی مل گئے ہم انہوں نے سرکار کے ہاں اُن کی رسائی کرائی۔ خان بہادری کا خطاب اور وظیفہ ملا۔ ۳۲ سال تک اعزازی مجسٹریٹ رہے۔ شاؔد کے زمانے میں پٹنہ میں محرّم کی مجلسوں کا کافی رواج تھا۔ جن میں شرکت کے لئے لکھنؤ سے ذاکرین آیا کرتے تھے۔ اس طرح ماہرین میں بھی شاؔد کا شہرہ بڑھا۔

شاؔد نے ویسے مرثیہ، رُباعی بھی کہی مگر وہ پہلے غزل گو تھے۔ وہ اس صنف میں خوب چمکے۔ شاؔد کی غزلوں میں جدت اور بلند خیالی ہے۔ عارفانہ مضامین بھی انہوں نے سلیقے سے بیان کئے ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے شاؔد کو میرؔ کا مقلد لکھا ہے۔ ان کے مشہور شاگرد اور جانشین حمیدؔ عظیم آبادی مرحوم نے بھی سید سلیمان ندوی کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ شاؔد کے سلسلے میں عطاؔ کاکوی کا خیال ہے کہ "میر کا تتبع وہ یہاں تک کرتے ہیں کہ اکثر میرؔ کے اشعار ردو بدل کر کے اپنی غزلوں میں شامل کر لیتے ہیں اور ان پر سرقہ کا الزام عائد ہوتا ہے"۔ عطاؔ کاکوی صاحب مزید فرماتے ہیں کہ "شاؔد نے غاؔلب کا بھی تتبع کیا ہے" اور اس طرح شاؔد نے داؔغ کی تقلید کی ہے یا یوں کہئے کہ داؔغ کے رنگ سے متاثر ہوئے ہیں۔ غرض کہ شاؔد نے میرؔ۔ غاؔلب اور داؔغ کا تتبع کیا ہے"۔ شاؔد کے سلسلے میں علامہ سید سلیمان ندوی۔ حمیدؔ عظیم آبادی اور عطاؔ کاکوی کی رائیں صحیح نہیں معلوم ہوتیں، اگر شاؔد کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ وہ کسی کے مقلد نہیں۔ البتہ مُتاثر ہوتے ہیں اور وہ میرؔ۔ غاؔلب یا داؔغ سے نہیں بلکہ آتشؔ اور ذوقؔ سے زیادہ متاثر ہیں۔ ان کے ہاں آتشؔ کا آہنگ اور ذوقؔ جیسی مایوسی اور رنج و کلفت کا اظہار ہے۔ معاصرین میں شاؔد داؔغ کی بجائے امیرؔ مینائی سے زیادہ قریب ہیں۔ بہرحال شاؔد کے ہاں تغزل کا عمدہ نمونہ ملتا ہے۔ ان کے آہنگ و خیالات دونوں اعلیٰ ہیں۔ شوخی اور رنگینی بھی ہے۔ ان کی وہ غزل جس کی ردیف "اُف ری جوانی ہائے زمانے" ہے نہایت حسین غزل ہے اور بہت مشہور ہے۔ یہ غزل جدید تغزل کے صف میں ممتاز مقام کی حامل ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے

سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

قمار خانہ ہے بزمِ دُنیا بڑے کھلاڑی کا سامنا ہے
گرہ سے پونجی گنوائی اُس نے یہاں ذرا جو بھی چال چُوکا

ستم ہے آدمی کیواسطے مجبور ہوجانا
زمیں کا سخت ہوجانا فلک کا دُور ہوجانا

کہاں سے لاؤں صبر حضرتِ ایوب اے ساقی
خُم آئے گا صراحی آئے گی تب جام آئے گا

مزہ برسات کا چاہو تو ان آنکھوں میں آ بیٹھو
سیاہی ہے سفیدی ہے شفق ہے ابرِ باراں ہے

اب اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا
زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے
بھری محفل سے اُٹھوایا گیا ہوں

بتاؤ کون سنبھالے گا شادؔ مستی میں
اگر حواس بجا ہمنشیں کہیں بھی نہ رہے

ترے جہاں میں جہاں بٹھا سرِ عرش ہو یا زمیں سہی
مجھے بیٹھ رہنے سے کام ہے کوئی جا نہیں تو نہیں سہی

صفِ اولیں ہے تو خاص صف وہاں پاؤں گا میں کہاں گزر
صفِ آخری بھی ہے دور ہی جو اشارا ہو تو وہی سہی

ہم باغ میں ناحق آئے تھے بلبل کی حکایت کیا کہیئے
منقار کو رکھ کر کلیوں پر کچھ اپنی زباں میں کہہ جانا

دے کے تہی سبو مجھے صبر کا حوصلہ دیا
جس کی طلب تھی ساقیا اُس سے کہیں سوا دیا

دل اپنی طلب میں صادق تھا گھبرا کے سوئے مطلوب گیا
دریا سے یہ موتی نکلا تھا دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

چند نالے شبِ غم لب پہ مرے آئے تو کیا
چند قطرے مری آنکھوں نے جو برسائے تو کیا

تکلیف اُٹھالی دل نے کہ آرام سے کٹی
ہر طرح شادؔ دونوں زمانے گزر گئے

اس بزم میں کوئی نہ ہرا بار نا حیف ‏ نالے بھی جو گئے وہ سب ہی بے اثر گئے

زمانہ آرزو کا جا چکا اب آرزو کیسی ‏ خزاں سے دل لگا اے دل تلاش رنگ و بو کیسی

یہ سب درست کہ تم بت بھی ہو خدا بھی ہو ‏ مگر نیاز کے قابل یہ دل رہا بھی ہو

جواب خط کا نہ بھیجیں جو وہ تو شکوہ کیا ‏ اگر یہی مری تقدیر کا لکھا بھی ہو

نظر اٹھانے میں ہوتا ہے بازپرس کا ڈر ‏ جھکائے رکھتے ہیں گردن کو سرفرازاں کے

بھرے ہوں آنکھ میں آنسو خمیدہ ہو گردن ‏ تو خامشی کو بھی اظہار مدعا کہئے

ہنستے ہنستے رو دیا کرتے تھے سب بے اختیار ‏ اک نئی ترکیب کا درد اپنے افسانے میں تھا

ایک ستم اور لاکھ ادائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے ‏ ترچھی نگاہیں تنگ قبائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے
ہجر میں اپنا اور یہی عالم ابر بہاراں دیدۂ پُرنم ‏ ضد کہ ہمیں وہ آپ بلائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے
اپنی ادا سے آپ کھٹکنا اپنی ہوا سے آپ جھجکنا ‏ چال میں لغزش مُنہ پہ حیائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے
ہاتھ میں آڑی تیغ پکڑنا تاکہ لگے بھی زخم تو اوچھا ‏ قصد کہ پھر جی بھر کے ستائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے
کالی گھٹائیں باغ میں جھولے دھانی دوپٹے لٹ چھٹکائے ‏ مجھ پہ یہ قدغن آپ نہ آئیں اُف ری جوانی ہائے زمانے
پچھلے پہر اٹھ اٹھ کے نمازیں ناک رگڑنی سجدے پہ سجدے ‏ جو نہیں جائز اس کی دعائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے
شاد نہ وہ دیدار پرستی اور نہ وہ بے نشّے کی مستی ‏ تجھکو کہاں سے ڈھونڈ کے لائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

انہیں شعروں پہ حال آتے ہیں مے خانہ میں رندوں کو ‏ انہیں شعروں کو واعظ نعرۂ مستانہ کہتے ہیں

احقر بہاری:- حضرت بشارت حسین احقر بہاری بہار کے عظیم المرتبت شاعر تھے اور جب تک زندہ رہے بہار کی انجمن شعر و سخن میں بلبل ہزار داستاں کی طرح چہکتے رہے۔ بہار میں آتش کے رنگ سخن کو مقبول بنانے میں احقر کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ انہیں وہی طرز پسند تھا اور ان کی مقبولیت دیکھکر دوسرے اساتذہ معاصرین نے بھی آتش کی روش اختیار کی۔

آورد میں لذت خاک نہیں کیا مزا ہے اے احقر ‏ وہ چال نہ چل جو لوگ کہیں آتش کے چلن کو چھوڑ دیا

علامہ اَثل لکھنوی کے شاگرد تھے۔ ایک مدت تک وہ لکھنؤ میں جاکر رہے اور وہاں کے زبان و محاورات اور بول چال کا نزدیک سے مطالعہ کرتے رہے۔ اس لئے وہ لکھنؤ کی زبان کے بڑے دلدادہ تھے اور بہار میں آتش اور لکھنؤ اسکول کے نمائندہ سمجھے جاتے تھے۔ اس پر انہیں فخر بھی تھا ؎

سُن لیا آج تم نے احقر کو ‌ ‌ ‌ ‌ لکھنؤ کی زبان ہے کہ نہیں

پروفیسر معین الدین دردائی "بہار اور اُردو شاعری" میں لکھتے ہیں کہ "آپ اپنے زمانہ میں بہار کے سب سے پُرانے اور پُرگو شاعر شمار ہوتے تھے۔ آپکے لاتعداد شاگرد آج بھی آسمان شعر و شاعری پر جگمگا رہے ہیں"۔ احقر کو تمام اصناف سخن پر قدرت حاصل تھی۔ غزل کے تو بادشاہ تھے۔ رُباعیات بھی اعلیٰ درجہ کی کہیں، واسوخت اور نظمیں بھی خوب کہیں۔ مُشاعرے میں کلام پڑھنے کا خاص انداز تھا جس مُشاعرے میں وہ ہوتے وہاں کسی کی نہیں جمتی تھی۔ احقر ایک فطری شاعر تھے، ان کے کلام میں آمد ہے۔ گرچہ لکھنؤ کے قیام اور اساتذہ لکھنؤ کے ساتھ میل جول کی وجہ سے لکھنؤ کے دبستان سخن کی خصوصیات پائی جاتی ہیں لیکن اُنہوں نے آنکھ بند کرکے کسی کی تقلید نہیں کی۔ صرف ان کا سہارا لیکر کلام میں حسن و نکھار پیدا کیا۔ احقر کی شاعری ذاتی محسوسات اور مشاہدات کی مظہر ہے۔ ان کے کلام میں نزاکت معنیٰ آفرینی۔ سادگی سلامت روی کے ساتھ روانی، غنائیت اور آہنگ کا دریا بہتا نظر آتا ہے۔ ان کی غزلوں میں زورِ بیان۔ روانی۔ غنائیت۔ تاثر کیف اور زبان کی صحت کا لُطف ہے۔ تغزل میں احقر قدیم اور جدید غزل گوئی کے دوراہے پر کھڑے ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ اسکول کا امتزاج احقر کی غزلوں میں عجیب دلکشی اور حُسن پیدا کر دیتا ہے اور آتش کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ احقر نے کئی قومی نظمیں بھی کہیں جو ضبط بھی ہوئیں، ایک نظم مسجد کانپور کی شہادت کے واقعہ سے متاثر ہوکر کہی تھی۔ یہ نظم اُس وقت کے تقریباً تمام جرائد و اخبارات میں شائع ہوئی۔ حکومت کی طرف سے نظم کی ضبطی کا حکم صادر ہوا۔ احقر پر ایک عرصے تک مقدمہ چلتا رہا۔ احقر کی رُباعیات بھی فکر و فن کے اعلیٰ معیار پر اُترتی ہیں۔ احقر کے کلام کا کافی حصہ کمیاب ہے اور مختلف عزیزوں کے پاس چھپا ہوا ہے۔ کافی کلام ضائع بھی ہوگیا ہے۔

اس وقت احقر کی شہرت نہیں لیکن ایک زمانے میں ان کی شاعری کی ہر جگہ دھوم تھی۔ ان کی غزلیں مُشاعرے سے لے کر مجلس سماع تک میں گائی جاتی تھیں، قوال احقر کی غزلیں سُنا کر اہل وجد سے داد و انعامات وصول کرتے تھے ان کی کئی غزلوں کا ریکارڈ بھی تیار ہوا۔ ان کی وہ غزل جس کی ردیف ہے "چھوڑ دیا" بہت مشہور ہے۔ نمونہ کے طور پر کچھ کلام حاضر ہے ؎

بے خبر ہو جو خانۂ دل سے ‌ ‌ ‌ ‌ کعبہ و دیر کی وہ کیا جانے

تکرار کچھ نہیں ہے آجاؤ یا بُلا لو ‌ ‌ ‌ ‌ قصہ بڑھا رہے ہیں یہ درمیان والے

بے طلب اُٹھ کے در پہ جاتے ہیں ‌ ‌ ‌ ‌ آج تقدیر آزماتے ہیں

روز احقر سراتے دُنیا میں
چار آتے ہیں چار جاتے ہیں

اُن سے بھی اپنا شباب نہیں دیکھا جاتا
آئینہ ہاتھ سے رکھ دیتے ہیں حیراں ہوکر

سرمہ آنکھوں میں دہن میں پان ہے
کہئیے کس کے قتل کا سامان ہے

غیر کو بلوائیے یا جائیے
ہر طرح سے آپ کا نقصان ہے

بخش دو احقر کو اب بندہ نواز
ہوگئی اس سے خطا انسان ہے

یہ کیا رقیبوں کا ذکر اکثر اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے
ہمیں ستاؤ نہ بندہ پرور اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے

کڑی ہے یہ منزل محبت نہ کر تو اے بوالہوس تمنّا
لگے گی ہر ہر قدم پہ ٹھوکر اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے

ہمیں تو تیری گلی کی دُھن تھی اِدھر اُدھر پھر کے دیکھتے کیا
کنشت و کعبہ ملے تو اکثر اِدھر سے جاتے اُدھر سے آتے

کچھ بات ہی ایسی ہے جس سے دم بھر بھی اُسے آرام نہیں
اب حال تو یہ ہے احقر کا گر صبح رہا تو شام نہیں

قربان کروں کیا چیز ہے یہ ہو دل جو پسند اے جان تمہیں
مُفلس کا سمجھ لو مال اسکو کہ دام اسکا کچھ دام نہیں

یہ کافر و مومن دیر و حرم اسرار ہیں اُسکی حکمت کے
جو واقف ہے سو واقف ہی ہیں خاص یہ باتیں عام نہیں

پُوچھے جو کوئی احوال مرا بس بیچ کی باتیں کہہ گزروں
ایسا ہی فسانہ ہے جس کا آغاز نہیں انجام نہیں

گالیاں کھا کے چپکے ہوں کب تک
میرے مُنہ میں زباں ہے کہ نہیں

غزل

پُوچھا جو کسی نے احقر سے کیوں شغل سخن کو چھوڑ دیا
بولے کہ گیا جب موسم گُل بُلبُل نے چمن کو چھوڑ دیا

جب باغ جہاں میں بُو تیری لے رونق گلشن پھیل گئی
بُلبُل نے گلوں سے مُنہ موڑا پھولوں نے چمن کو چھوڑ دیا

اے حبِ وطن، اللہ سے ڈر بھولی ہوئی باتیں یاد نہ کر
اب تیری بلا سے بُوم بسے جب تُو نے چمن کو چھوڑ دیا

آتے ہیں عجب انداز سے وہ ڈالے ہوئے رُخ پر بالوں کو
زُلفیں جو ہٹیں اک شور ہوا مو بیچ نے گُہن کو چھوڑ دیا

اب آنکھ کسی پر کیا ڈالیں نظروں میں کوئی جچتا ہی نہیں
آنکھوں پہ مری صدقہ کر کے جنگل میں ہرن کو چھوڑ دیا

دل پھنس کے کسی کی زلفوں میں کس طرح الٰہی چھوٹ گیا
معلوم نہیں کیا پیچ پڑا کالے نے جو من کو چھوڑ دیا

چونکے نہ کبھی دن خواب سے ہم غفلت میں بسر کی عمر اپنی
اے وائے غضب کب آنکھ کھلی جب روح نے تن کو چھوڑ دیا

تھے آسرے جتنے ٹوٹ گئے یارانِ وطن سب چھوٹ گئے
اے وادیٔ غربت تو ہی سُنا کر ہم نے وطن کو چھوڑ دیا

آورد میں لذت خاک نہیں آمد کا مزا ہے اے احقر
وہ چال نہ چل کہ لوگ کہیں آتش کے چلن کو چھوڑ دیا

یہ حُسن کی سے سرکار احقر غصہ بھی یہاں ہی پیار بھی ہے
ہر زخم جگر کے پھائے میں کافور بھی ہی زنگار بھی ہے

اک روز جناب احقر جا پہونچے جو کبھی بت خانے میں
کیا دیکھ لیا جو چیخ اُٹھے ایمان گیا! ایمان گیا!

آنکھیں کھلی ہوئی ہیں جو احقر پسِ فنا
اب تک کسی کا آپ کو ہے انتظار کیا

بہارِ بلوغِ شباب کو جب خزاں سے غافل پڑیگا پالا
نہ سر میں جوشِ جنوں رہیگا نہ دل میں یادِ بتاں رہے گی

وصل میں ہجر کا خیال بھی ہے
دل کو شادی بھی ہے ملال بھی ہے

خوش نہ ہو دل لگا کے اے احقر
عشق آساں بھی ہے محال بھی ہے

شبِ وصال ہے کچھ دل پہ اختیار نہیں
عجب نہیں ہے جو کوئی قصور ہو جائے

احقر کے کلام میں کوئی عمیق فلسفہ نہیں عشق و حُسن اور وصال و فراق یا تصوف و معرفت کے عام مضامین ہیں لیکن انہیں وہ اس حُسن و نزاکت سے بیان کرتے ہیں کہ شاعرانہ لطافت کی جُملہ خوبیاں سامنے آجاتی ہیں۔ ان کا کلام جس طرح ضائع ہوا اور گمنامی میں جا پڑا ہے اس کا گمان ان کی زندگی میں کسی کو نہ تھا لیکن مرحوم شاعر نے اس کے بارے میں پہلے ہی پیشن گوئی کر دی تھی۔ اس سلسلے میں ان کی دو رُباعیاں سُنیئے ؎

احقر مرے بعد جب شعر سُنیئے گا
آجاؤں گا یاد تو سر دُھنیئے گا
کھلنے کو کھلیں گے رنگ گل ہائے سخن
دامن میں پھر ایسے پھول کم چُنیئے گا

جب ہم نہ رہے دلِ تپاں بھی نہ رہا یوسف نہ رہا تو کارواں بھی نہ رہا
کس طرح مٹا ہے نامِ احقر توبہ تربت کا عزیز کی نشاں بھی نہ رہا

~~~

آزاد:- علامہ حافظ فضلِ حق آزاد کا نام آتے ہی ذہن شبلی اور حالی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کیونکہ بہار میں ان کی وہی حیثیت ہے۔ علامہ آزاد اپنے صوبے میں جدید شاعری کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ وہ بڑی ہمہ گیر شخصیت کے آدمی تھے۔ بیک وقت عالم۔ ادیب۔ صحافی۔ نقاد اور شاعر سب ہی کچھ تھے۔ مزاج بحث و مناظرہ کے لئے بہت موزوں پایا تھا۔ رہنے والے ضلع گیا کی ایک بستی شاہو بگہ کے تھے۔ مگر قیام پٹنہ ہی میں رہتا تھا۔ تقسیم سے تین سال قبل ۱۹۴۴ء میں طویل عمر پاکر انتقال کیا۔ آزاد کی تنقید سے شاد بہت گھبراتے تھے۔ دونوں میں کبھی نہیں بنی۔ شاد ان سے جتنا گھبراتے تھے اس وقت کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا ہے۔ جس مشاعرے میں آزاد پہونچ جاتے شاد کا برا حال رہتا۔ آزاد کے ساتھ شاد کے مخالفین کا ایک گروپ تھا۔ شاد نے کئی اشعار میں اس طرف اشارہ کیا ہے ؎

خدا بھلا کرے اے شاد نکتہ چینوں کا بتا دیا مجھے بچ بچ کے راستہ چلنا

~~~

مشقت کے سوا کیا مل گیا مشقِ سخن کر کے عدو چاروں طرف پیدا کئے ہم نے یہ فن کر کے

~~~

حریفوں نے کہا سب کچھ ادھر روئے سخن کر کے مگر بیٹھے ہیں خاموشی کو ہم قفلِ دہن کر کے

~~~

آزاد کی تنقیدی صلاحیت بڑی زبردست تھی۔ لیکن وہ بسا اوقات اپنے پر قابو نہیں رکھ سکتے، اور تنقید کے دائرے سے آگے بڑھکر تنقیص پر اتر آتے تھے۔ اور شعر و سخن کی دنیا میں بھی مناظرہ و مباحثہ جیسا ہنگامہ برپا کر دیتے۔ اگر وہ صحت مند تنقید کی طرف توجہ دیتے اور مخالفت برائے مخالفت ترک کر دیتے تو شعر و ادب کی دنیا میں اہم و تعمیری کام کر سکتے تھے۔ شاعری کا ذوق بھی نہیں پایا تھا۔ مولانا سلیمان ندوی نے آزاد کو صوبہ بہار میں جدید اردو کا بانی قرار دیا ہے۔ آزاد زیادہ کامیاب قومی و ملی نظموں میں نظر آتے ہیں۔ تغزل میں وہ کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتے تھے۔

عطا بہاری:- تغزل کے اعتبار سے شاد اور احقر کے بعد شاہ عطا الکریم عطا کا نام لیا جا سکتا ہے۔ مراد پور بہار شریف وطن تھا۔ ۱۹۳۲ء میں انتقال کیا۔ بڑے پرگو شاعر تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ عطا کا کلام خانقاہ اسلام پور کے کتب خانے میں غیر مطبوعہ محفوظ ہے۔ اس کے دیگر شعرا میں عشرت گیاوی۔ عرش گیاوی۔ رنجور عظیم آبادی۔ شاہ نذر الرحمان حفیظ تلمیذ علامہ آزل لکھنوی۔ رسا بہاری۔ عاصی بہاری۔ کوثر خیر آبادی اور اقبال علی حال وفا بہاری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان اساتذہ کے ساتھ ہی جواں سال شعرا کی بھی ایک بڑی تعداد تھی۔ جن میں بیتاب عظیم آبادی۔ ضیا عظیم آبادی۔ مبارک عظیم آبادی۔ محمود عظیم آبادی۔ ساغر باروی۔ شفیع بہاری۔ یاس بہاری۔ سخن بہاری۔ حبیب بہاری۔ رضا بہاری۔ شاغل فریدی۔ مقصود گیاوی۔ اوج گیاوی۔ نسیم ہلسوی۔ مظفر مظفر پوری۔ تمنا عمادی۔ حمید عظیم آبادی۔ شاہ اکرام الدین عرفان اسلام پوری۔ سعادت علی سعادت دربھنگوی عظیم عظیم آبادی

وغیرہ صاحب دیوان، با اثر، صاحب تلامذہ اور ممتاز شعرا تھے۔

اساتذہ متاخرین اور دورِ حاضرہ

احقر اور شاد کے بعد بہار میں اردو شعر و ادب کا چرچا عام ہو گیا جدید شعرا کا ایک بڑا گروہ بھی سامنے آیا۔ اور اساتذہ متاخرین کے ساتھ جواں سال شعرا کی ایک ٹولی بھی سرگرم رہی جو بعد میں اساتذہ کی خالی صف کو پُر کرتی رہی۔ شاد کے معاصرین میں عطا بہاری نے ۱۹۳۲ء میں انتقال کیا۔ علامہ آزاد اس کے بعد بھی کافی دنوں تک زندہ رہے لیکن ان کی شاعری کا دور سچ پوچھیے تو ہے معاصرین شاد متوفی ۱۹۲۷ء احقر متوفی ۱۹۳۰ء اور عطا متوفی ۱۹۳۲ء کے ساتھ ختم ہو گیا گویا موجودہ دور یا اساتذہ متاخرین کا عہد ۱۹۳۰ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے، اس دور کے شعرا میں مبارک عظیم آبادی، شفیع بہاری، یاس بہاری، تمنا عمادی، مضطر مظفر پوری، حمید عظیم آبادی اور عظیم عظیم آبادی کا شمار معمر کہنہ مشق اور ممتاز اساتذہ میں ہوتا تھا، ان کا حلقہ تلامذہ بھی کافی وسیع رہا۔ ویسے سخن بہاری، محمود عظیم آبادی، مقصود گیاوی اور ساغر باروی اور رشد فریدی کی شاعرانہ عظمت اپنی جگہ مُسلّم ہے۔ لیکن انہیں زیادہ شہرت حاصل نہ ہو سکی۔ سخن بہاری نے بہت جلد ہی جگہ چھوڑ دی ۱۹۳۶ء میں انتقال کر گئے۔ سید محمود عالم محمود عظیم آبادی اور ساغر باروی مشاعرہ اور شعر و ادب کی مجلسوں میں شریک ہی کم ہوتے تھے ورنہ ان کا کلام اپنے معاصرین میں متعدد دیر بہاری ہیں۔ اس دور کے اساتذہ میں حضرت مبارک عظیم آبادی کی حیثیت سب سے بلند رہی۔ شاد و احقر کے دور کے جواں سال شعرا میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، بعد میں تو وہ مردِ میدان ہی بنے رہے۔ مبارک داغ کے شاگرد تھے۔ بہار میں داغ کے تلامذہ کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ جن میں اقبال علی خاں وفا، نسیم ہلسوی، سعادت علی سعادت اور مبارک کا نام زیادہ مشہور ہے۔ نسیم ہلسوی ممتاز شاعر تھے۔ بہار میں داغ کے نمائندہ سمجھے جاتے تھے۔ قصبہ ہلسہ کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے ڈھاکہ چلے آئے، نواب سر سلیم اللہ بہادر کے سکریٹری ہوئے اور ڈھاکہ ہی میں انتقال کیا۔ نسیم کا کلام اُن کے اعزہ کے پاس ڈھاکہ میں موجود ہے۔ اقبال علی خاں وفا داغ کے ابتدائی دور کے شاگردوں میں تھے۔ وہ شاد کے دور کے کہنہ مشق شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ سعادت کا دیوان بڑے اہتمام سے شائع ہوا تھا۔ اس کے کچھ نسخے کہیں کہیں ملتے ہیں۔ راقم الحروف کے پاس بھی ایک نسخہ تھا جو ہاتھ سے نکل گیا۔ حضرت مبارک نے کافی عمر پا کر ۱۹۵۱ء میں انتقال فرمایا۔ داغ کے رنگ میں خوب کہتے تھے۔ اپنے اُستاد سے بڑی عقیدت رکھتے تھے شفق عماد پوری امیر مینائی اور کوثر فرید آبادی کے شاگرد تھے۔ عروض و فن میں کمال حاصل تھا۔ حضرت شاہ شفیع بہاری بہار کے اساتذہ غزل میں بڑی ممتاز جگہ پر فائز تھے۔ نہایت سنجیدہ اور پاکیزہ فکر و خیال کے بزرگ تھے۔ حضرت شاہ امین احمد شباب کے صاحبزادے تھے، حضرت احقر کے جانشین تھے۔ آپ کا حلقہ تلامذہ بہت وسیع تھا۔ تقسیم کے بعد ڈھاکہ چلے آئے اور یہیں ۱۹۵۹ء میں انتقال فرمایا۔ آپ کے ہاں فن کے ساتھ تغزل بھی پایا جاتا ہے۔ علامہ تمنا عمادی کے ہاں فن و عروض کا تجربہ بدرجہ اتم ہے اور بڑے زود گو اور بسیار گو شاعر ہیں، مگر شاعرانہ حسن و تاثر سے علامہ کا کلام عاری ہے۔ جہاں تک فن و عروض کا تعلق ہے صفیر بلگرامی کے بعد علامہ تمنا ہی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ تقسیم کے بعد ڈھاکہ چلے آئے۔ حمید عظیم آبادی نے ۵ نومبر ۱۹۶۳ء کو انتقال کیا۔ شاد کے جانشین تھے۔

صوبہ کے پرانے اساتذہ میں شمار ہوتا تھا، شاد اور ان کے شاگرد بیتاب کے کلام کو شائع کرنا اور ضائع ہونے سے بچانا حضرت حمید کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اُستاد کے لئے زندگی وقف کردی تھی اور جانشینی کے فرائض بخوبی پورا کئے۔ تقسیم کے بعد پاکستان چلے آئے، سکھر سے ایک معیاری علمی و ادبی رسالہ "جام جم" نکال رہے تھے، لیکن وطن کی مٹی تھی، پٹنہ گئے اور وہیں انتقال فرمایا۔

یاس بہاری:- حضرت شاہ حکیم الیاس یاس بہاری متوفی ستمبر ۱۹۶۰ء کی عظمت کا اعتراف تمام اساتذہ کو رہا۔ ان کے ہاں شعر و فن کا اعلیٰ نمونہ ملتا ہے۔ شاہ شفیع کے چھوٹے بھائی تھے۔ حضرت یاس ابتدا میں عشرت گیاوی سے اصلاح لیتے تھے اس کے بعد لکھنؤ گئے اور وہاں جلال لکھنوی کے شاگرد رُعب شاہ آبادی سے مشورہ کرنے لگے۔ یاس بہاری کو زبان و فن پر پوری قدرت حاصل تھی۔ اُردو کے ساتھ فارسی میں بھی کمال حاصل تھا۔ یاس کے تغزل میں لکھنویت غالب ہے۔ کلام میں دبدبہ، گہرائی اور اُستادانہ رنگ صاف نمایاں ہے۔ آپ کی شاعری کے بارے میں جناب فصیح الدین بلخی مرحوم اپنے ایک مضمون مطبوعہ ماہنامہ "سہیل" گیا کے شمارہ مارچ ۱۹۵۹ء میں لکھتے ہیں:-

"میرے خیال میں اُن کی زبان پر لکھنؤ کا اثر زیادہ ہے اور اشعار میں وزیر اور صبا کا رنگ جھلکتا ہے۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے۔ دوسرے لوگ ان کو جلال کا مقلد فرض کرتے ہیں۔ بہرکیف ان کو زبان اور تمام اصناف سخن پر قدرت حاصل ہے۔" حضرت یاس نے نام و نمود سے ہمیشہ پرہیز کیا، لیکن اس کے باوجود وہ مشہور ہو کر رہے۔ اور بہار کے تمام اساتذہ اُن کی قدر کرتے رہے اور ان شعری کمال و محاسن کا اعتراف کیا۔ حضرت یاس کا رنگ یہ ہے ؎

خلوت گہِ خیال میں صورت ہے آپ کی — آئینۂ نگاہ میں جلوہ ہے آپ کا

ضبطِ فغاں وفورِ قلق پر جناب یاس — یہ دل ہے آپ کا یہ کلیجہ ہے آپ کا

اللہ رے حسنِ جلوہ بتانِ مجاز کا — پردہ اُلٹ نہ جائے حقیقت کے راز کا

ہمیشہ ہم نے دیکھا اُنکو محوِ خود فراموشی — خدا جانے جناب یاس کس کو یاد کرتے ہیں

ہائے ناکامیٔ اُلفت وائے مجبوریٔ عشق — غیر سے کرنی پڑی ہے التجا تیرے لئے

لے کے نامہ شوخیِ طرزِ تجاہل دیکھئے — نامہ بر سے پوچھتے ہیں یاس کس کا نام ہے

اک لطفِ زندگی کی ازل سے تلاش تھی — لبریز دردِ غم سے مجھے دل عطا ہوا

تیر جاتی ہے رگ و پے میں جو بجلی کی طرح — وہ کوئی شے اور ہوتی ہے نظر ہوتی نہیں

جذبۂ دل سے وہ اک دن آپ کھنچ آئیں گے یاسؔ | میرا ایماں ہے محبت بے اثر ہوتی نہیں

ہوئی مدت کہ دیکھا تھا کرشمہ ان نگاہوں کا | دیا ہے وہ سبق تم نے کہ اب تک یاد کرتے ہیں

سب کرشمے ہیں یاسؔ قسمت کے | زور سے ہاتھ زر نہیں آتا

دل کا جو غنی ہے وہی دراصل غنی ہے | دولت سے کوئی یاسؔ تونگر نہیں ہوتا

دیر و حرم کے پھیرے میں دل پہ نہ کی نگاہ | تھا دیکھنا کدھر کو کدھر دیکھتے رہے

حضرت یاسؔ نظمیں بھی کہتے تھے۔ انہوں نے وقتاً فوقتاً قومی و ملی نظمیں بھی کہیں، لیکن وہ دراصل غزل کے شاعر تھے۔ اور ایک غزل گو کی حیثیت سے وہ اساتذہ معاصرین میں شفیعؔ۔ مبارکؔ۔ یاسؔ اور مضطرؔ مظفرپوری نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں۔

عظیم، عظیم آبادی:۔ حالیؔ اور شبلیؔ نے اردو شاعری میں جو روش نکالی تھی بہار میں اس کو علامہ فضل حق آزادؔ نے مقبول بنایا اور دوسرے شعرا کی توجہ نظم اور جدید شاعری کی طرف مبذول کرائی۔ ویسے احقرؔ، شفقؔ اور دوسرے شعرا نے بھی نظمیں کہیں مگر دراصل وہ اساتذہ غزل تھے۔ آزادؔ کے بعد عظیم الدین عظیمؔ مرحوم نے اس طرف زور لگایا اور وہ اپنے دور میں جدید شاعری کے بلاشبہ نمائندہ کہے جا سکتے ہیں۔ عظیمؔ صاحب نے انگریزی صنف سانیٹ کا اردو میں کامیاب تجربہ کیا۔ ان کا مجموعہ کلام "گل نغمہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس مجموعہ میں قومی، ملی، رومانی، فکری اور احساساتی شاعری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ عظیمؔ کی فلسفیانہ شاعری میں ایک خاص نظریہ ہے۔ عظیمؔ مرحوم علامہ اقبال سے بھی متاثر تھے مگر وہ ان کے مقلد نہیں تھے۔ بہت سے مقام پر ان سے اختلاف کیا ہے۔ اقبالؔ کی نظم "تصویر درد" کے جواب میں اسی وزن اور طرز پر انہوں نے "تاثیر درد" کہی۔ یہ اقبالؔ کی تصویر درد جیسی تو نہ ہو سکی مگر پھر بھی خوب ہے۔ عظیمؔ صاحب کی وہ نظمیں جو انہوں نے ذاتی محسوسات و تجربات سے متاثر ہو کر کہی ہیں، بڑی عمدہ اور اعلیٰ ہیں، لیکن جہاں انہوں نے کسی کی تقلید کی یا جواب میں کچھ کہنے کی کوشش کی وہاں ناکام رہے ہیں۔ عظیمؔ کی شاعری کے بارے میں کلیم الدین احمد صاحب نے "گل نغمہ" کے دیباچہ میں جو رائے ظاہر کی ہے جس مقام کا مستحق عظیمؔ صاحب کو قرار دیا ہے اُس سے کوئی اتفاق نہیں کر سکتا۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہار کے نظم گو شعرا میں عظیمؔ مرحوم کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

حضرت یاسؔ اور عظیمؔ کے دور کے دوسرے شعرا میں رسا ہمدانی۔ کشتہ گیاوی اور نجم گیلانی بھی ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ جدید نظم و غزل کے عمدہ نمونے ان کے ہاں ملتے ہیں۔ تغزل میں سریر کابری تلمیذ شفقؔ عمادی اور جگر بہاری بھی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ سریرؔ کابری کے ہاں سوز و آہنگ ہے۔ پہلے وہ قدیم رنگ میں کہتے تھے لیکن زمانے کی رفتار دیکھتے ہوئے بدل گئے۔ جگرؔ بہاری تلمیذ شاہ شفیع کے ہاں تغزل کا عمدہ نمونہ ملتا ہے۔ اس مجذوب و سراپا درد

شاعر کی ناقدری بہار کی شاعری کے ساتھ ظلم عظیم ہے۔ درد و اثر اور کیف کے اعتبار سے جگر کا کلام اپنے دور کے تمام اساتذہ پر بھاری ہے۔ یہی کیفیت ہجو سرامی کے ساتھ ہے دوسرے ممتاز اور قابل ذکر شعرا میں شاہ نجم الدین نجم بہاری زار عظیم آبادی۔ شاہ قائم قتیل داناپوری۔ شاہ مسعود احمد داناپوری۔ شمس منیری۔ ولی کاکوی۔ مسلم عظیم آبادی۔ شاہ حبیب بسمل۔ عزیز عظیم آبادی خلف علامہ آزاد۔ عبدالمنان بیدل۔ بسمل ہنسا روی۔ شوق جھیبردی وغیرہ۔ وغیرہ بھی کہنہ مشق گزرے ہیں۔ اور اساتذہ میں شمار کئے گئے۔ اس وقت جمیل مظہری بہار کے سربرآوردہ شاعر ہیں۔ جمیل کی شاعری کا بہترین دور کلکتہ میں گزرا۔ علامہ وحشت کلکتوی سے شرف تلمیذ تھا۔ علامہ وحشت کے تلامذہ میں جمیل۔ بیدل۔ شاکر۔ الطف اور عصری کی حیثیت اساتذہ کی ہوتی ہے۔ جمیل نے جدید شاعری میں بڑا کمال حاصل کیا۔ ان کی نظمیں اردو کی بہترین نظموں میں شمار کی جاتی ہیں۔ جمیل کے بعد اجتبیٰ رضوی۔ اختر قادری اور وفا براہی موجودہ دور کے ممتاز بہاری شعرا ہیں۔ وفا اس وقت ڈھاکہ میں ہیں۔ غزلیں پرکیف اور بڑی نفیس کہتے ہیں۔ اختر اور نہوی بھی خوش فکر شاعر ہیں لیکن اب شاعری تقریباً ترک کر چکے ہیں۔ دوسرے شعرا میں رخشاں ابدالی۔ علی شطاری۔ عطا کاکوی۔ قسیم بہاری۔ ذابیع بہاری۔ گرد بہاری۔ اختر کاکوی۔ شرف بہاری۔ حسن بہاری قادر بہاری۔ نعیم صبا۔ کلیم عاجز۔ واہی۔ وغیرہ بہار کے نغز گو شعرا میں ہیں۔ اختر کاکوی اور شرف بہاری شاد کے تلامذہ میں ہیں۔ گرد کہنہ مشق مزاحیہ کہنے والے ہیں۔ ویسے مزاحیہ شاعری میں واہی نے آجکل اچھا مقام حاصل کر لیا ہے۔ قادر حسن اور عاجز ابھی جوان ہیں اور ان کے کلام میں ایام جوانی کے اُمنگ و حوصلے اور للکار کی گونج ہے۔ تقسیم کے بعد علامہ تمنا عمادی۔ حمید عظیم آبادی۔ شفیع بہاری۔ شاغل فریدی۔ ماہر فریدی۔ کامل رزاقی۔ عزیز بہاری جیسے اساتذہ اور کہنہ مشق شعرا کے علاوہ وفا براہی اور اختر پیامی جیسے جواں سال شعرا بھی ہجرت کر گئے۔ اختر پیامی تو شاعری سے کنارہ کش ہو چکے ہیں۔ لیکن وفا براہی کی مشق سخن جاری ہے۔

بہرحال اس وقت بہار کا ادبی و شعری ماحول بہت اچھا ہو گیا ہے۔ پٹنہ بہار شریف، جمشید پور اور دوسرے مقامات سے متعدد نوجوان شعرا اُبھر رہے ہیں۔ جن کے کلام وقتاً فوقتاً ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اور مجموعی اعتبار سے بہار کا شاعرانہ ماحول اطمینان بخش ہے۔

"نگاہِ اوّلیں" (صفحہ ۲ کا بقیہ مضمون)

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن ۔۔۔ خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

یہ کسی غیر ملکی امداد کا معاملہ نہیں ہے کہ ہم اس پر شرمندہ ہوں۔ حکومت ہماری اپنی ہے اس لئے حکومت سے اِس نازک مرحلے پر امداد طلب کرنے میں ہم حق بجانب ہیں۔ ادبی رسائل کو حکومت سے غیر مشروط امداد ملنی چاہیئے۔ جس طرح حکومت ادیبوں کی سرپرستی کر رہی ہے اُسی طرح ادبی رسائل اور ان کے مدیرین کو بھی معقول امدادی وظائف ملنے چاہئیں۔ یہ ان کی دیرینہ خدمات کے اعتراف کا ایک موزوں پیرایہ بھی ہوگا۔

❖ ❖ ❖

سید حرمت الاکرام

"زخمِ تمنّا"

"اب حافظہ ساتھ نہیں دیتا، وہ کون سا جذبہ، کون سی اضطراری کیفیت تھی جس نے مجھے پہلے پہل شعر گوئی پر آمادہ کیا اور وہ پہلا شعر کون سا تھا جو ذہن کے کسی تاریک گوشے سے اچانک وجود کے اُجالے میں آ گیا۔ دھندلی سی یاد باقی ہے کہ جس زمانے میں شعر گوئی سے رغبت پیدا ہوئی، رُوح نامعلوم ہیجان کی آگ میں تپ رہی تھی۔ شاید میں قبل از وقت ہی اس التہابِ اضطراب سے آشنا ہو چکا تھا جو عموماً آمدِ شباب کا عطیہ ہوتا ہے۔ جہاں اپنے قدامت پسند خاندان و ماحول کے چند اوصاف کو سینے سے چمٹائے رہنے کو جی چاہتا تھا، وہاں اس ماحول کے تاریک پہلوؤں نے کچھ اتنی بیزاری پیدا کر دی تھی کہ اس فضا میں اپنا وجود ایک آزارِ مستقل، ایک حبسِ دوام بن گیا تھا۔"

یہ الفاظ خود مظہر امام کے ہیں جو اُن کے مجموعۂ کلام "زخمِ تمنّا" کے خود نوشت پیش لفظ "اعتراف" سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس اضطراری کیفیت نے انہیں شعر گوئی پر آمادہ یا مہر سخیال میں مجبور کیا، اس کی نوعیت کیا تھی، اُن کی یادداشت اِس کی گرہ کشائی نہیں کر سکتی تو یہ مقامِ حیرت نہیں کیونکہ شعر گوئی کی شکل میں جس سفر کا آغاز ہوتا ہے، وہ ابتدائی مراحل کی گوناگوں کیفیات سے آگے بڑھنے اور ماہ و سال کے ایک مخصوص وقفے سے گزرنے کے بعد جب اُس منزل سے روشناس ہوتا ہے جہاں شاعر اپنے کو "شاعر" سمجھ سکے تو نجانے کتنی باتیں جنہیں بعض معنوں میں بڑی اہمیت دی جاتی ہے، ذہن اور وقت کی پہنائیوں میں گم ہو چکی ہوتی ہیں اور انہیں ڈھونڈ ھ نکالنا یا ان مبہم نقوش کی صورت گری کرنا سہل نہیں ہوتا۔

شباب، حیاتِ انسانی کی وہ منزل ہے جہاں سے زندگی اور اس کے مستقبل کی تشکیل و تعمیر کے راستے بھی پھوٹتے ہیں اور اُس پیچ و خم کا بھی آغاز ہوتا ہے جو ذہن کو اندھیروں میں بھٹکاتا ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کے بعد انسان کو ذہنی اور جسمانی دونوں طریقوں سے ایک ایسے سفر کے لئے تیار ہونا پڑتا ہے جس سے زندگی کی رعنائیاں، توانائیاں اور پہنائیاں عبارت ہیں، یہ ایسا موڑ ہے جو بیک وقت پُر خار صحراؤں اور رنگ و نور کی وادیوں کی جانب لے جاتا ہے۔ مظہر امام کے ذہن کو وقت سے پہلے ہی یہ سفر شروع کرنا پڑا حالانکہ ان کی عمر ہمقدمی کے لئے آمادہ نہیں تھی اور پھر انہیں اس التہابِ اضطراب سے متصادم ہونا پڑا جس کی دلداریاں اور دل سوزیاں دونوں صبر آزما ہوتی ہیں۔

یہ کیفیت شعلہ بن کر بھڑکی اور ذہن و خیال کی وسعتوں میں مچلنے لگی، اس کے جلو میں ایک طوفانی کارواں تھا جو ہر بلند و پست سے گزرتا چلا گیا۔ مظہر امام اس کارواں کے ہمراہ تھے اور ان کے لبوں پر وہ نغمائی مد و جزر تھا جو کسی کو "شاعر" بناتا ہے، اُن کے دل کے نازک گوشوں میں مترنم لہروں کی وہ تلاطم انگیزیاں تھیں جو جنبشِ لب اور پھر جنبشِ قلم تک پہنچ کر شعر کے پیکر میں ڈھل جاتی ہیں۔ یہ کیفیت ذہن کو تپاتی اور کندن بناتی ہے۔ التہابِ اضطراب کا یہ قافلہ مظہر امام کو

ساتھ لے کر مرحلہ بہ مرحلہ بڑھنے لگا۔ ان کی نگاہیں گرد و پیش سے ٹکراتی رہیں۔ انہوں نے جس دَور میں آنکھیں کھولی تھیں، وہ سیاسی کشاکش اور انقلاب کا دَور تھا اور ان کا شعور اس کی اندرونی تہوں سے ناخن آزمائی میں مصروف تھا لیکن دوسری جانب ان کے اپنے ماحول کے تقاضے قدرے مختلف نوعیت رکھتے تھے جن کی پشت پر خاندانی اور نسبی روایات کا بوجھ تھا۔ قدیم تہذیب بھی اپنے دامن میں متعدد اوصاف کے لعل و گوہر رکھتی تھی جن سے دستکش ہونا قرینِ دانشمندی نہ تھا لیکن رُخ بدلتے ہوئے حالات اور نئے میلانات کا شبخوں بڑا تیز و تند تھا۔ سماجی، سیاسی اور تہذیبی قدریں بڑی سرعت سے بدل رہی تھیں اور ان تغیرات کو محسوس نہ کرنا یا ان سے تجاہل برتنا نئی پود کے لئے ممکن نہیں تھا کیونکہ خواہ کوئی دور ہو، انقلاب کا پرچم بلند کرنے اور ان کو پروان چڑھانے والے ہاتھ نئی نسل ہی کے ہوتے ہیں۔ اسی لئے مظہر امام کے شاعرانہ سرمائے میں یہ دو عناصر کافی نمایاں ہیں، شباب کا التہاب و اضطراب نیز فرسودہ اقدار سے ایک باغیانہ بیزاری جنہیں ایک طور پر ان کی شاعری کا محور بھی کہا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی ان کی شاعری میں بہت کچھ ہے لیکن "حکایت مہر و وفا" کا پلّہ بھاری ہے۔ خود مظہر امام نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ انہیں "قصۂ سکندر و دارا" سے کوئی دلچسپی نہیں رہی لیکن قومی اور بین الاقوامی انتشار نے ایقان و اعتماد کی دیوار کو متزلزل کر دیا اور ایک شاعر—ایک حساس و باشعور شاعر کی حیثیت سے وہ حالات کی پیچیدگیوں اور تلخیوں کو اپنے ذہن و دل میں سمونے پر مجبور تھے۔ یہ پیچیدگیاں اور تلخیاں جس قدر فزوں ہوتی گئیں، اُن کا شاعرانہ لہجہ کرب و حزن اور سوز و یاس کی کیفیات سے اتنا ہی معمور ہوتا گیا۔ انہوں نے خود کہا ہے:۔

"دراصل میری شاعری یاس و رجا اور محرومی و آسودگی کی کشمکش سے عبارت ہے۔ محتسبانِ ادب اسے ذہنی تضاد اور شعور کی ناپختگی سے تعبیر کریں گے، مگر میں اس تضاد سے شرمندہ نہیں ہوں، کیونکہ مجھے اطمینان ہے کہ میں اپنے محسوسات کی جانب مخلص رہا ہوں۔"

مظہر امام کا اور کوئی عذر قابلِ تسلیم ہو یا نہ ہو لیکن اس بات کو ماننا پڑتا ہے کہ وہ اپنے محسوسات کے باب میں یقیناً مخلص رہے ہیں اور اگر ادب، زندگی کا ترجمان ہوتا ہے تو وہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے قلم نے سب سے پہلے اپنی زندگی کی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے جو رفتہ رفتہ حدیثِ دیگراں کی حدود تک پہنچ گیا۔ البتہ اس سوال سے آنکھیں نہیں چُرائی جا سکتیں کہ اُن کی شاعری میں اپنے غم کا بیان زیادہ کیوں ہے؟ اس کے جواب میں وہ اپنی زندگی کی ان ساعتوں کی جانب اشارہ کر سکتے ہیں جو بچپن کے زمانے سے شباب کے دَور تک پھیلی ہوئی ہیں اور جن کے دامن میں کانٹوں کے علاوہ اور کچھ نہیں، وہ خوابوں اور سرابوں سے اُلجھتے رہے اور آفات و حوادث کا یہ تسلسل ان کے نازک احساسات کو برماتا رہا۔ یہ ذہنی پسپائی معمولی نہ تھی جو اُن کے لئے ایک زبردست نفسیاتی تغیر کا پیش خیمہ بنتی رہی۔ شاعر کو ایک شاعر کے علاوہ عام آدمی کی زندگی بھی گذارنی پڑتی ہے اور معاشرہ کے مختلف شعبوں میں کبھی کبھی فکر کی عظیم الشان بلندیوں سے اتر کر عام آدمی کی سطح پر بھی آنا پڑتا ہے اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ بعض افراد حوادث و آلام کی اذیت کوشیوں سے اثر لینے میں بڑی انتہا پسندانہ طبیعت رکھتے ہیں نیز ان کا ذہن اپنے دُکھوں کو ایک ایسے جال کی شکل دے دیتا ہے جس کے پھندوں میں خود ان کی ذات اسیر ہو جاتی ہے۔ مظہر امام کی المناکیوں نے بھی ان کے گرد مایوسیوں اور محرومیوں کا ایک جال بُن دیا جس کے پھندوں کو توڑنے کی جد و جہد اُنہوں نے ضرور کی لیکن خود ان کی سادہ دلی سدِ راہ ہوئی اور نتیجۃً بے بسی و غمِ زندگی کے زہریلے نشتران کی زندگی میں دور تک پیوستہ ہوتے چلے گئے۔

چنانچہ نقاد کو اپنے فرض کی تکمیل کے ساتھ ساتھ ان کوائف کو بھی ملحوظ رکھنا پڑے گا۔

مظہر امام کی شاعری کیا ہے اور کیسی ہے؟ ان امور کا تجزیہ کرنے کے لئے یہ جان لینا بہتر ہوگا کہ جو نفاست، شائستگی اور خوش ادائی ان کی شخصی زندگی کا خاصہ ہے اس سے ان کی شاعری بھی متصف ہے۔ وہ کوئی چونکا دینے والی بات نہیں کہتے اور نہ اچھا یا بڑا شاعر کہلانے کے لئے یہ ضروری ہے کیونکہ بڑی شاعری اس سے مطلقاً جداگانہ نہیں تو بالاتر ضرور ہوتی ہے اور اس میں جو خاص کیفیات ہوتی ہیں وہ ذہن کو صرف چونکاتی نہیں بلکہ پورے طور پر بیدار کر دیتی ہیں۔ محض چونکانا کسی شاعر کو زیب نہیں دیتا، اس کا منصب اس سے افضل و ارفع ہے۔ مظہر امام نے شعبدہ بازی سے کہیں بھی کام نہیں لیا ہے بلکہ شاعری کی متین و جمیل قدروں کے علمبردار رہے ہیں۔

مظہر امام نئی نسل کے ایک معتبر اور ہوشمند شاعر ہیں۔ گذشتہ دس بارہ سال کے اثناء میں یہ حادثے اکثر اور عموماً گذرتے رہے ہیں کہ ادب کی نئی وادیوں سے کوئی فسوں طراز لے اچانک ابھری، انتہائی سرعت کے ساتھ ذہنوں سے ٹکرائی اور کچھ دنوں تک فردوسِ گوش بننے کے بعد ہمیشہ کے لئے سکوت کی آغوش میں محوِ خواب ہو گئی لیکن مظہر امام کی آواز نہ دفعتاً ابھری اور نہ اس کے ساتھ ایسا کوئی حادثہ گذرا۔ ان کی شاعری نے بتدریج آگے بڑھ کر ذہنوں پر بڑی نرمی کے ساتھ دستک دی اور پھر دلوں پر اپنے نقوش مرتسم کئے جن کی رنگا رنگ تابناکی برابر زیادہ گہری ہوتی گئی اور اس ثابت قدمی نے انہیں "معتبر" بنا دیا لیکن یہ ضرور ہے کہ "زخمِ تمنا" کی اشاعت کے بعد سے ان پر ایسی کیفیت کا تسلط معلوم ہوتا ہے جسے "تعطل" یا "جمود" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان کی شعرگوئی کی رفتار یقیناً سست رہی لیکن اس قدر سست نہیں جتنی فی الوقت ہے۔

"زخمِ تمنا" کے دامن میں زخم اور پھول دونوں ہیں، یہ اور بات ہے کہ ان کی شاعری میں زخموں کی خلش آفرینی نہایت گہری ہے اور یہی کیفیت تاثیر و تاثر کے پہلوؤں کو بھی عمیق تر بناتی ہے۔ وہ اپنے غم پر مسکراہٹوں کی نظر فریب نقاب ڈالنے کے قائل نہیں لیکن ان کے غم میں وہ زہرناکی یا تیزابیت نہیں پائی جاتی جو زندگی کے منفی اور تاریک پہلوؤں کی نمائندہ ہوتی ہے۔ ان کا غم ان کا اپنا غم ضرور ہے لیکن اس کی حدود کسی دائرہ کی اسیر یا پابند نہیں، یہ غم پورے معاشرے کا غم ہے اور اپنے آئینہ میں ان تمام پرچھائیوں کو سمیٹ لیتا ہے جو اجتماعی غموں کے اُفق سے ابھرتی ہیں۔

ان کی شاعری پر "دل" کا غلبہ ہے لیکن فکر و فن کی جادہ پیمائی میں ان کا دل تنہا نہیں بلکہ اسے شعور کی ہمسفری حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ "قنوطیت و نشاطِ غم" کے عناصر رکھنے کے باوجود ان کے لہجہ میں بڑا خوشگوار توازن اور بڑی رعنائی و توانائی ہے۔ "نیکی، حق پسندی اور انسان دوستی کے نعروں میں پہلی سی حرارت" نہ پانے کے باوجود انسان اور حیاتِ انسانی کے روشن مستقبل پر ان کا عقیدہ بڑا مستحکم ہے لیکن اپنے دوسرے ہم عصروں کی طرح وہ زوال پذیر انسانی اقدار کی جانب سے آنکھیں بند کر لینا پسند نہیں کرتے۔

"زخمِ تمنا" میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی، نیز غزلوں کی تعداد مقابلتہً بڑھی ہوئی ہے لیکن یہ فیصلہ کرنا قدرے مشکل ہے کہ وہ نظم کے شاعر ہیں یا غزل کے۔ انہوں نے نہ صرف دونوں اصناف کو اپنی مساوات پسندی سے نوازا ہے بلکہ ان کی فکر نے دونوں میدانوں میں بڑی سلامت روی دکھائی ہے لیکن بعض ایسے مقامات ضرور آئے ہیں جو نظم گوئی سے ان کے ترجیحی شغف کا اعلان کرتے اور یقین دلاتے ہیں۔ غزل کے باب میں وہ کوئی باغیانہ طرزِ فکر:

طرزِ عمل اختیار نہیں کرتے لیکن ان کی غزلوں میں تسلسل کا سا انداز ضرور پایا جاتا ہے اور ان کی اس نوع کی غزلیں عددی اعتبار سے بھی قابلِ لحاظ ہیں۔ ممکن ہے، یہ جوش کا اثر ہو، اگرچہ ان کی شاعری کے اور پہلوؤں پر جوش کا اثر تقریباً ناپید ہے۔ بایں ہمہ یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے غزل کے حسن کو مجروح نہیں کیا ہے۔

مظہر امام کو ترقی پسند تحریک سے جو نسبت رہی ہے اسے "باضابطہ" ہی کہا جائے گا جو ان کی پوری شاعری سے نمایاں ہے۔ اس تحریک کے موثرات ان کی ذہنی و نظریاتی زندگی نیز اس کے عملی رُخوں پر کہاں تک کارفرما رہے ہیں؟ یہ ایک جداگانہ مبحث ہے لیکن یہ بات نہایت وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ترقی پسندی کو انہوں نے اپنی زندگی کے لئے "فیشن" اور شاعری کے لئے "لیبل" کی حیثیت کبھی نہیں دی۔ رسم و روایت سے بیزاری اور بغاوت کے باوجود "گمراہ" نہیں ہوئے اور اگر انہوں نے "دینِ بزرگان" کو بہ تمام و کمال قبول کرنے کی سعادت حاصل نہیں کی تو اس کی تحقیر و تضحیک کو بھی مستحسن نہیں تصور کیا۔

انھوں نے نظم کی نئی اصناف آزاد اور معریٰ دونوں کا خیر مقدم کیا لیکن اردو سے ان اصناف کو روشناس کرانے والے مجتہدوں کا اتباع کرنے کے بجائے اپنے مذاقِ سلیم کی فطری میانہ روی کو چراغِ راہ بنایا۔ ان پیش روؤں کے ناہموار فکری عمل نے ان دونوں اصناف کی رسوائی و خواری کی جو صورتیں پیدا کر دی تھیں دوسروں کی طرح مظہر امام نے بھی انہیں بہ شدت محسوس کیا جو کورانہ تقلید کی وبائے عام نیز اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کے جواز میں طرح طرح کے کھُردرے "فلسفوں" کا سہارا لینے اور اس طرح دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرنے والوں کے طوفانی اژدہام میں کوئی معمولی بات نہ تھی جبکہ مظہر امام خود بھی بعض نئے شعراء سے متاثر تھے۔ انہوں نے ایک جگہ کہا ہے:

> "یہ وہ وقت تھا جب جوش میرے اعصاب پر چھائے تھے۔ ان کے سحر سے چھوٹا تو پہلے راشد، فیض اور یوسف ظفر اور پھر فراق اور اختر الایمان سے نیاز حاصل ہوا۔ ۱۹۴۶ء تک کی میری شاعری میں ان سب کے ملے جلے اثرات کسی نہ کسی حد تک موجود ہیں۔"

جوش کا اثر ان کے یہاں کس معنی میں ہے؟ اس کا ذکر آ چکا ہے۔ فراق اور راشد سے متاثر ہونے کا ثبوت "زخمِ تمنا" کے صفحات سے کسی ایسی شکل میں نہیں ملتا جو غور طلب ہو۔ ممکن ہے یہ اثر محض ذہن تک محدود رہا ہو یا ان کی جن نظموں اور غزلوں میں یہ رنگ نمایاں انداز میں سامنے آیا ہو، وہ اس مجموعہ میں بار نہ پا سکی ہوں لیکن فیض، یوسف ظفر اور اختر الایمان کے مشترکہ اثرات کی جھلکیاں زیادہ نمایاں ہیں جو کہیں گہری ہیں اور کہیں ہلکی۔ یہ اثر لہجہ کا بھی ہے اور درد، کسک، سوز اور یاس کی ان کیفیتوں کا بھی جو کسی نہ کسی نہج سے ان تینوں شعراء کے یہاں موجود ہیں۔ فیض، اختر الایمان اور یوسف ظفر — یہ تینوں شعراء اپنے سفر کا آغاز "کوئے یار" سے کرتے ہیں مگر متعدد مرحلوں اور مختلف منزلوں سے گذرنے کے بعد ان کا رُخ "سوئے دار" ہو جاتا ہے، اگر اس عالم میں بھی ان کے چہروں اور ان کے دامنوں سے کوئے یار کی گرد نہیں چھوٹتی اور نہ دل سے حزن و یاس کی وہ کیفیت جدا ہوتی ہے جو دار و رسن سے کھیلنے والے سرفروشوں میں عموماً نہیں ملتی۔ مقصد یہ نہیں کہ انہیں ہم آواز قرار دیا جائے یا یہ کہا جائے کہ ان پر ذہنی ہمسفری کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ بلکہ مقصد محض یہ ظاہر کرنا ہے کہ یہ تینوں اپنے دور کی نمائندگی کا ادعا رکھتے ہیں اور اس پر اصرار کرتے ہیں۔

بہرحال ان شعراء سے مظہر امام کے متاثر ہونے کی ایک وجہ اُفتادِ طبع کی یکسانیت یا مشابہت بھی ہو سکتی ہے۔ مظہر امام کی شاعری میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ کی جو کیفیات ہیں، وہ بھی غالباً اسی اُفتادِ طبع کی دین ہیں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی، مظہر امام کی شاعری کے متعلق کہتے ہیں:۔

"ان کے شعری مزاج کے بارے میں جب بھی میں نے سوچا ہے، مجھے اس دریا کا خیال آیا ہے جو میدانوں میں بہتا ہے اور اس کی چال میں سکون اور ٹھہراؤ ہوتا ہے۔"

اس کی تصدیق کے لئے ان کی غزلوں اور نظموں کے بعض اقتباسات سے مدد لینا بے محل نہ ہوگا ؎

دل کا سیلاب ہے یہ کون اسے روکے گا امام
کبھی چڑھتی ہوئی ندی کا یہ دھارا تو نہیں

شاخِ گل سے لپٹ کے روتی ہے
اس چمن کی ہوا کو کیا کہیئے

شوق کو بھی جھجک سی ہوتی ہے
جلوۂ خود نما کو کیا کہیئے

تری نظر میں حیا نے جو لی اک انگڑائی
مری نگاہ میں میرا سوال فرمایا

آیا ہے اگر ذکر کبھی دار و رسن کا
گیسو و قدِ یار کی بات آ ہی گئی ہے

دل بیٹھے ہیں زنداں میں اگر شام کو احباب
تیرے در و دیوار کی بات آ ہی گئی ہے

ہر لمحہ ایک خالِ رُخِ ماہ و سال ہے
کتنا حسین تسلسلِ ماضی و حال ہے

احسانِ التفات سے مجروح ہو گئی
مغرور کس قدر مری چشمِ سوال ہے

اے کاش ترے سایۂ گیسو میں کٹے عمر
آرام ترے سر کی قسم یوں تو بہت ہے

دردِ ہر دل کا مرے دل میں سمٹ آیا ہے
مجھکو احساس کی دولت بھی گراں گزری ہے

دل خوددار کی ہے وضع نرالی اے دوست
اپنے غم میں تری شرکت بھی گراں گزری ہے

بنالیں اسے پہچان نئی تیرگی میں
کھلی ہوئی تھی حقیقت مرے فسانے کی

سمیٹ لے مہِ خورشید روشنی اپنی
صلاحیت ہے زمیں میں بھی جگمگانے کی

محو ہوتی ہی نہیں یاد تری
کوئی بچپن کا سبق ہو جیسے

پوچھیں تو ذرا پیچ و خمِ راہ کی باتیں
کچھ لوگ ابھی لوٹ کے آئے ہیں سفر سے

لوگو! مری آشفتہ سری پر نہ کرو طنز
الزام اُتارو کوئی ارضِ نجف کے سر سے

آپ ہی کے گیسوؤں کا سلسلہ سمجھا تھا میں
زندگی کو ایک زنجیرِ وفا سمجھا تھا میں

رہنماؤں نے اسی پر منزلیں تعمیر کیں
جس کو اپنی گمرہی کا نقشِ پا سمجھا تھا میں

ابھی سے کانپتا ہے شمع کا دل
ابھی اس نے نقاب اُلٹی نہیں ہے

چلو، ہم بھی وفا سے باز آئے
محبت کوئی مجبوری نہیں ہے

دشمنی احتیاط سے کیجے
دوستی کی ادا نہ آ جائے

کھڑکیاں دل کی بند کر اے زیست
آرزو کی ہوا نہ آ جائے

پینے والو بقدرِ ظرف پیو
زندگی کا نشہ نہ آ جائے

نیند آئے کہ نہ آئے شبِ غم — کم سے کم آنکھ جھپکتے رہیے
فن ہو مجروح نہ چیخوں سے امام — ہاں، اسی طرح سسکتے رہیے

مظہر امام کہنے کو تو یہ کہہ جاتے ہیں کہ ؎

چلو، ہم بھی وفا سے باز آئے — محبت کوئی مجبوری نہیں ہے

لیکن ان کی شاعری کی شہادت اس کے خلاف ہے جو بتاتی ہے کہ محبت ان کی سب سے بڑی مجبوری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کو زنجیرِ وفا تصور کرتے ہیں اور محبوب کی یاد ان کے دل سے بچپن کے سبق کی طرح چپکی ہوئی ہے۔ ان کی تمنا ہے کہ ؎

اے کاش! ترے سایۂ گیسو میں کٹے عمر — آرام ترے سر کی قسم یوں تو بہت ہے

اور یہ اُن کے دل کی گہرائیوں سے ابھرنے والی آواز ہے جس میں نیرنگئ شوق کی کھنک اور کسک ہے۔ اس آواز میں تجربات کا امرت بھی ہے اور زہرآب بھی یہ ضرور ہے کہ ان کے لبوں تک امرت کے پیالے کم پہنچے ہیں اور انہیں زہراب کے تلخ گھونٹ زیادہ چکھنے پڑے ہیں جسے متفکر ان کے خلوصِ فکر نے امرت بنانے کی کوشش کی ہے لیکن یہ تلخی جو ان کے پورے وجود پر چھائی ہوئی بلکہ ان کے دل میں پیوست ہے آسانی سے دبائی اور چھپائی نہیں جا سکتی۔

بلا شبہ، دل کا سیلاب کسی چڑھتی ہوئی ندی کا دھارا نہیں جسے روکا جا سکے لیکن جب ماحول کی سفاکیاں اتنی بڑھ جائیں کہ موجِ ہوا، شاخِ گل سے لپٹ کر رونے پر مجبور ہو تو احساس کی دولت واقعی گراں گذرنے لگتی ہے۔ مظہر امام کے شعور نے ہر موڑ پر اپنے دَور کا ساتھ دیا ہے اور اس سفر میں ایسے مقامات بھی آئے ہیں جہاں ہونٹوں پر بے اختیار چیخ کا آجانا آہوں کا فریاد کی شورشوں میں ڈھل جانا کوئی حیرت کی بات نہیں لیکن ان کی فطری متانت نے ہر مقام پر نالوں کو تھامنے کی سعی کی ہے جسے سعئ رائیگاں نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی شاعرانہ سرشت میں خوش وضعی اور وضعداری دونوں عناصر شامل ہیں اور کاروبارِ شوق ہو یا کاروبارِ حیات ان کی یہ صفات ہمیشہ شریکِ کار رہتی ہیں۔ انہیں ایک طرف گردشِ پیش کی نحوستوں کا احساس ہے تو ساتھ ہی فن کی عظمتوں کی پاسداری بھی ان کے شعار و شعور کا جزوِ لازم ہے۔ اسی لئے وہ چیخنے پر سسکتے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

ان کی شاعری میں حالات کی جانگدازیوں اور ماحول کی صبرآزمائیوں کا شکوہ ضرور ہے آنسو بھی ہیں اور آہیں بھی ہیں لیکن چیخیں کہیں نہیں ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ شاعری چیخوں کا نہیں، دبی دبی آہوں کا نام ہے، وہ آہیں جو جہدِ حیات کے حوصلوں کو پست نہیں کرتیں بلکہ ان کے لئے مہمیز کا کام کرتی ہیں۔

ان کی نظم "خواب سچ بھی ہوتے ہیں" کا آخری بند ملاحظہ ہو ؎

خاردار راہوں پر — خوفناک راتوں میں
فوجِ تشنہ کاموں کی — ہم شکستہ جاموں کی
آگے بڑھتی جاتی ہے — ٹھوکریں بھی کھاتی ہے
پھر سنبھل بھی جاتی ہے — تشنہ کام ہونٹوں کو
اعتبارِ صہبا ہے — خنکی بہاروں کی

نوعروس شاخوں کے   آنچلوں سے لپٹی ہے
دل کے خشک عارض پر   تازگی کا غازہ ہے
صبح ہونے والی ہے   صبح ہونے والی ہے

ان کی نظم میں تضادوں کا یہ جہان ایک حسین مالا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس کے دامن میں ساز اور شعلے ہوا اور خاردونوں ہیں نیز انہیں تضادوں سے زندگی اُبھرتی اور ارتقا کے زینوں پر چڑھتی ہے اور اسی لئے آنے والی صبح پر ان کا ایقان بنا گہرا ہے جسے ظلمتوں کی یلغار دُھندلا نہیں کر سکتی۔

وہ اپنی نظم "سفر ہے شرط" میں کتنے اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں ؎

تمام شباب ہو گر آندھیوں سے گرم ستیز   دل و نظر کے گلستاں مہک بھی سکتے ہیں
اگر یہ غازۂ برق و شرار سے کھیلیں   تری حیات کے عارض چمک بھی سکتے ہیں!

ان کی نظم "نوعروس!" کا آخری بند ؎

وقت کے آنچل کو بھی پرچم بنا لیتی ہے زیست
دار پر چڑھتے ہوئے بھی گیت گا لیتی ہے زیست
تیز رو لمحات کے شہپر کو جا لیتی ہے زیست
اپنا مقصد کوششوں سے اپنی پا لیتی ہے زیست
کر دے صحرا کو چمن اندھے چمن اپنی طرح
زندگی کو بھی بنا دے تو دُلہن اپنی طرح

اُس آرزومندی کا امین ہے جو تزئین حیات کے عمل کو تیز تر اور پختہ تر کرتی ہے۔ زندگی کو سجانے اور سنوارنے کی جو تمنا مظہر امام کے دل میں جاگزیں ہے، وہ بحرِ حیات کی پُرسکون موجوں کو کسی طوفان سے آشنا کرنے کے خواب دکھاتی اور ان خوابوں کو تعبیر کی حُسن سامانیوں تک لے جاتی ہے۔ زندگی، دلِ زندہ کی بیدار و بیتاب دھڑکنوں کے علاوہ اور کوئی شے نہیں۔ وہ دھڑکنیں جنہیں اپنے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لئے سوز و سازِ آرزومندی کی ضرورت ہوتی ہے یہی سوز و سازِ آرزومندی مظہر امام کو آئندہ ان تابناک رفعتوں پر پہنچائے گا جن کے نقوش "زخم تمنا" کے صفحات پر ابھی سے اپنی جھلملاہٹیں بکھیر رہے ہیں۔

شیر افضل جعفری

غم

غم غزل کی جان ہے
غم بھی اک وجدان ہے

غم ہے کشمیرِ حیات
غم ازل کا دان ہے

غم شرابِ خاکیاں
غم مئے عرفان ہے

غم جہاں گیرِ قلوب
غم شۂ رومان ہے

غم ہے تمہیدِ نشاط
غم پہ دل قربان ہے

غم بہارِ فلسفہ
غم حسیں جُزدان ہے

غم دیارِ عاشقاں
غم نگارستان ہے

غم عروجِ آدمی
غم بشر کی شان ہے

غم سے سینے داغ داغ
غم چراغستان ہے

غم جنوں کا ارغنوں
غم جنوں کی تان ہے

غم عزیزِ مصرِ دل
غم مۂ کنعان ہے

غم شمیمِ کربلا
غم گُلِ ایمان ہے

فرحت انوار

"بگھرا"

"ہائے بیٹا، کھان صاحب کے موڑے کو بگھرا کر دھیل لے گیا۔" مدّن نے حویلی میں داخل ہوتے ہی یہ وحشت ناک خبر سنائی۔

"کون خان صاحب"؟ خالہ نے گھبرا کر پوچھا۔ میں بھی چپل گھسیٹتی مدّن کے قریب پہنچ گئی۔ مدّن اب حویلی کی تنہا باورچن ہیں۔ اس کام کے علاوہ سارے قصبے کی خبریں حویلی میں پہنچانا بھی اُن کے ذمّے ہے۔ یہ کام وہ بلامعاوضہ انجام دیتی ہیں۔ مثلاً کس دن کتنے بچّے پیدا ہوئے؟ کتنے قصبے کی پُرانی دائی جمیا کے ہاتھوں اور کتنے بلاک کی مِڈ وائف کے ہاتھوں؟ ان میں سے کتنے جائز ہیں اور کتنے ناجائز؟ کتنی اموات ہوئیں اور کس کس مرض سے؟ کس کی شادی اور کس کی طلاق ہوئی؟ کون سی لڑکی اغوا کرلی گئی اور کس لڑکی نے کس مرد کو اُڑا لیا؟ کس کے ہاں نقب لگی کس کے ہاں ڈاکہ پڑا؟ بلاک میں پچھلی رات کون آیا کون گیا یا بازار میں گندم مل رہا ہے یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ مگر ہم لوگ اتنے بے قدرے ہیں کہ عموماً ان کی بات پہ کان ہی نہیں دھرتے اور اگر خبر سُنی بھی تو یقین مشکل سے کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ زوردار قسمیں کھاتی ہیں "اللہ رسول کی کسم"۔ "آنکھی دیدے کی کسم"۔ مگر ہم یہی کہتے ہیں "ارے اس کا کیا اعتبار؟ نہ کبھی نماز پڑھے نہ روزہ رکھے۔ اللہ رسول کا کوئی خوف تو ہے نہیں اس کے دل میں یہ ہی آنکھی دیدے کی بات تو یہ تو ہیں ہی واحد الدیدہ۔ اس کی ہی قسم کھا لیتی ہے۔" تب خالو میاں ٹھیٹھ مولویانہ لہجے میں فرماتے ہیں "جھوٹی مکّارہ۔ فاسقہ فاجرہ۔ اس کے تو شدید ضربیں لگنی چاہئیں، مگر تم لوگ تو اس کو اپنی مصاحبہ سمجھتی ہو اور اس کی لائی ہوئی ہر خبر پہ ایمان لے آتی ہو۔ بات یہ ہے کہ ایک آنکھ اور ڈیڑھ ٹانگ ہونے کے باوجود مدّن کی جوانی قصبے کے من چلے مردوں کے لئے قیامت سے کم نہ تھی۔ جوانی بھر مدّن کی مجال نہ تھی کہ حویلی میں قدم رکھ سکیں۔ حویلی والیاں ان سے پردہ کرتی تھیں مگر اب وہ تائب ہو چکی ہیں اس لئے ان کو حویلی میں داخلے کی اجازت دیدی گئی ہے۔ اور وہ بلا شرکت غیرے باورچی خانے پر قابض ہیں، مگر خالو میاں کو یہ بات پسند نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس نجس ناپاک کے ہاتھ کا پانی بھی نہ پینا چاہیئے۔ وہ تو کہیئے خالہ نے کرارے لہجے میں صاف صاف کہدیا "تم جو یہ چاہو کہ میں پانچ سیر آٹے کی روٹیاں تھوپوں اور بڑے بڑے پتیلے اُتاروں تو بندی یہ کرنے سے رہی۔ کھانا مدّن ہی پکائے گی، کھاؤ چاہے مت کھاؤ۔" وہ بھی اپنی جگہ پر صحیح ہیں، زمینداری چلی گئی مگر عادت تو بگڑی ہوئی ہے۔ کھانا پکانا مذاق تھوڑی ہے! اس گرانی کے زمانے میں زمینداری جانے کے بعد باورچی رکاب دار نہ سہی مدّن ہی سہی۔ ہاں تو میں یہ عرض کر رہی تھی کہ خالو میاں مدّن کی طرف دیکھنے کے بھی روادار نہ تھے۔ مگر اس دن اُنھوں نے بھی گھبرا کر مدّن کو اشارے سے تخت کے قریب بلایا۔ قصّہ یہ تھا کہ قرب و جوار سے برابر یہ خبریں آرہی تھیں کہ بگھرا فلاں اہیر کے بچّے کو اُٹھا لے گیا اور ڈھمک کوری کی بچّی کو کھا گیا۔ ہمارے قصبے کی عورتوں نے حفظ ماتقدم پر سخت گرمی کے باوجود بند کمروں

اور کوٹھریوں میں بچّوں کو لیکر سونا شروع کر دیا تھا کیونکہ بگھرا صحن کی دیواریں آسانی سے پھاند جاتا تھا۔ مگر دن دھاڑے خان صاحب کے لڑکے کو کھینچ لے جانا تعجب انگیز اور تشویشناک تھا۔ خالو میاں بولے: "ابھی ابھی خان صاحب میرے ساتھ " نمازِ جمعہ ادا کرکے گئے ہیں۔ بلکہ اُنھوں نے کہا تھا، "میر صاحب آپ چند حفاظتی تعویذ لکھ دیں جو میں بچّوں کے گلے میں ڈال دوں، اور آج شب میں آپ قصبے کا حصار کھینچ دیں تاکہ بگھرا ہمارے قصبے میں داخل ہی نہ ہو سکے۔"

عدّن باغ باغ ہوگئیں کہ خالو میاں نے ان کو استفسار کے لئے بلایا۔ وہ خاص ادا سے ٹھمکتی ہوئی تخت کے قریب پہنچیں۔

"اری نیک بخت کچھ تو بتا قصّہ کیا ہوا؟" خالو میاں نے عدّن کو نیک بخت کے خطاب سے نواز دیا۔

"کہاں صاحب کا بڑا موڑا پڑھن گیا تھا" عدّن نے فخر سے داستان شروع کی۔

"مطلب کی بات کر، پڑھنے تو وہ روز ہی جاتا تھا" خالو میاں نے ٹوکا۔

"پڑھ کے لوٹا تو بولا امّاں بھوک لگی ہے"

"اری تو تو کہہ رہی تھی بگھرا لے گیا" یہ بھوک کہاں سے بیچ میں آگئی؟"

"اُف فوّ! تم نہ خود سنتے ہو نہ کسی کو سُننے دیتے ہو" خالہ نے خالو میاں کی بات کاٹی۔ پھر کہا "ہاں عدّن"۔

خالو میاں نے بھُنّا کر زور سے ہوں کہہ کر کروٹ بدل لی۔

"امّاں بولیں کہ بیٹیا" ——

"حد ہوگئی عدّن یہ کیا داستان امیر حمزہ چھیڑی ہے بات ختم بھی کر چکو" میں نے جل کر کہا۔

"بڑو بیٹا تم تو بن محک کا گستہ ہو گئیں"

"اچھا چلو غصّہ نہیں کرتی، اب اللہ کے واسطے جلدی بتاؤ کیا ہوا؟"

"امّاں بولیں بیٹا کھیت سے بھٹّے توڑ لا میں بھون دوں گی، وہ کھا لینا۔ لڑکا گیا ایک بھٹّا توڑا تھا کہ کرنا خدا کا کیا ہوا" ——

"خدا کا کرنا نہیں یہ کہو کہ شیطان کا کرنا یہ ہوا کہ لڑکے کو بگھرا گھسیٹ لے گیا" میں نے جلدی سے بات پوری کی۔

"لیئو بیٹیا تم کا تو سب ملوم تھا" عدّن نے مایوس ہو کر کہا۔ ان کی داستان گوئی پر اوس پڑ گئی میری مداخلت بے جا سے۔ وہ باورچی خانہ کی طرف چل دیں۔

"غضب خدا کا، دن کا وقت اور اتنا بڑا لڑکا!" خالہ نے تعجب سے کہا۔

خالو میاں یہ بگھرا کیسا ہوتا ہے؟ میں نے تو اس سے پہلے یہ نام سُنا نہیں۔"

"تمہارے پاکستان میں بگھرا نہیں ہوتا؟" خالہ نے تعجب سے کہا۔

"جی نہیں اللہ کا شکر ہے، ہمارے ہاں یہ بلا نہیں ہے۔ جی خالو میاں" میں خالہ کو جواب دے کر پھر خالو سے مخاطب ہوگئی۔

"نصف لکڑ بگھا اور نصف تیندوا"

"یہ نصف نصف کا کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے لکڑ بگھے اور تیندوے کا کراس۔ تم ہمیشہ کی کودن ہو" خالو میاں نے میری کم عقلی کا ماتم کیا۔

"دو غلہ ہے، جب ہی تو اتنا خطرناک ہے" میں نے قابلیت بگھاری۔

مجھے خاں صاحب کے ہاں تعزیت کے لئے جانا چاہیئے"

خالو میاں شانے پر رومال ڈال کر تشریف لے گئے۔

ان کے جانے کے بعد گیتی (بھنگن) دو وقتی کے لئے آتی نظر آئیں۔

"ارے گیتی ذرا بچ کے رہنا، بگھرا یہاں بھی آنے لگا ہے،

کہیں تمہیں اُٹھا لے گیا تو دوسری بہو جی تلاش کرنی پڑے گی" گتی ہے تو مہترانی مگر قصبہ کا دستور ہے کہ سب بڑوں سے بھی کوئی نہ کوئی رشتہ نکال کر کسی کو بہو جی کسی کو خالہ کسی کو تائی کہا جاتا ہے۔ گتی مجھے اپنی نند کہتی ہیں۔ اسی لئے ان کا میرا مذاق چلتا ہے۔

"آپا جی، یہ بگھرا نا ہے؟" گتی اس وقت بہت سنجیدہ ہو رہی تھیں ان کو میرا مذاق قطعی نہ بھایا۔

"بگھرا نہیں تو پھر کیا ہے؟" میں نے گھبرا کر سوال کیا۔

"یہ کوئی "شے" ہے۔ وہ میرے قریب آکر چپکے سے بولیں۔

"سُنا آپ نے خالہ، یہ گتی تو کہتی ہے کہ بگھرا نہیں کوئی "شے" ہے"

"ان لوگوں کو ہر جگہ "شے" نظر آتی ہے، لگیں اُڑانے پر کتی"

"لوگوں کی باتیں۔ سچ ہے اور سچ کھیت سے ہے" گتی اپنی بات پر اَڑ گئیں۔

"کیسے معلوم کہ شے ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"شیخ جی کے یہاں بڑی بھاوج بتاتی ہیں"

"کیا بتاتی ہیں؟"

"گوری کے ایک چمار کی موڑی کو بگھرا اُٹھا لے گیا۔ ماملتا کی ماری اُوکی متیا بگھرے کے پیچھے بھاگی۔ بگھرا جنگل کی بگیا ماں گھس گوا۔ تلاؤ کے کنارے موڑی کو ڈال منئی کا بھیس بدل دجو بڑا نماج پڑھن لگا۔ جیسے اُن نے موڑ جُھکایا مہرا نے پیٹھ پر دو ہتھڑ مارے "داڑھی جار" تورے اُوپر گاج گرے۔ تو کو ڈھائی گھڑی کھا لے جا۔ موری موڑی میکھو"۔ "سے نے نماج پڑھ کر الٹی سیدھی طرف موڑ گھمایا"

"سلام پھیرا" میں نے لقمہ دیا۔

"موکو کا پتہ" ۔ گتی نے معذرت کی۔ "پھر سے نے کہا،

"بی بی سرکار کہتی ہے بچے کم پیدا کرو، اپنے دیس میں کھانا کم ہے مگر تم لوگ مانتے نہیں۔ تمہارے سات بچے ہیں جبکہ سرکار صرف دو بچے پیدا کرنے کو کہتی ہے۔ میں اگر بچوں کا خون نہ چوسوں تو یہ بچے بڑے ہو کر بھوک سے مریں گے" یہ کہہ کر پھر بگھرا بن کے میری موڑی کو لیکر یہ جا وہ جا"

"خوب تو وہ "شے" گورنمنٹ کی طرف سے مقرر کی گئی ہے بچوں کا خون چوسنے کے لئے بھارت کے بنئے مہاجن کیا کم ہیں عوام کا خون چوسنے کے لئے۔ جواب شاستری جی نے "شے" بھی خون چوسنے پر تعینات کر دی؟" میں نے جھٹ بھارتی گورنمنٹ پر طنز کیا۔ اور "شے" بھی مسلمان جو غریب یوں ہی پٹ رہے ہیں۔ اب یہ مشہور کر دو تاکہ اچھی طرح ٹھکائی ہو جائے" خالہ نے بگڑ کر کہا۔

"ہائے بوا تم رسیا گئیں، یہ بات تو بڑی بھاوج نے کہی، وہی مسہوری کر رہی ہیں، موکو کا پتہ؟" گتی نے صفائی پیش کی۔

"میں ابھی شیخ جی کے ہاں کہلواتی ہوں، یہ کیا حرکت ہے ان کی بہو کی" خالہ نے بگڑ کر کہا۔

"جی ہاں مسلمان خود ہی مسلمانوں کے گلے کٹواتے ہیں" میں نے بھی جلتی پر تیل ڈالا تاکہ خالہ شیخانی کی اچھی خبر لیں۔ گتی بیچاری بات بگڑتے دیکھ کر ہوا ہو گئیں۔

"نماز والی بات تو میں نے نہیں سُنی مگر کہتے سب یہی ہیں کہ یہ بگھرا نہیں کچھ اور ہے" نانی صحن سے ہر کے گھڑے اندر رکھتے ہوئے بولیں۔

"کیا سُنا ہے؟" میں نے جھٹ سوال کیا۔

"یہی کہ بگھرا بچوں کو لے جاتا ہے، اگر بچے نہ ملیں مردوں کو بھی لے جاتا ہے، مگر کسی عورت کو آج تک نہیں لے گیا"

"خوب تو بگھرے صاحب صنفِ نازک کے قدر دان ہیں" میں نے ہنس کر کہا۔

"اتفاق کی بات ہے اور پھر عورتیں باہر سوتی ہی کب

(بقیہ مضمون صفحہ ...)

عبدالغنی

ادب میں علاقائیت

ایک زمانے میں دلی کو معیاری زبان کا واحد مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد لکھنؤ بھی اس دعوے میں شریک ہو گیا۔ نتیجۃً دونوں کے درمیان ایک عرصے تک رقابت اور چشمک ہوتی رہی یہاں تک کہ ایک تیسری بساط عظیم آباد میں بچھ گئی۔ پھر حیدرآباد اور لاہور نے بھی اپنے اپنے مکاتب کھول لئے۔ اس طرح رفتہ رفتہ مرکز پر مرکز قائم ہوتے چلے گئے۔ غیر منقسم ہندوستان کا شاید ہی کوئی متمدن علاقہ یا بڑا شہر ہو جہاں اردو کا ایک نیا مرکز کسی نہ کسی سطح پر قائم نہ ہو گیا ہو۔ چنانچہ مرکز کے نام پر فی الواقع اردو کے بہت سے بڑے چھوٹے علاقے پیدا ہو گئے۔

آزادی سے قبل تک تو بات اتنی ہی رہی۔ اس کے بعد جب تقسیم عمل میں آئی اور سرحد کے دونوں جانب آزاد ثقافتی سرگرمیاں شروع ہوئیں، ساتھ ہی سیاسی داؤ پیچ شروع ہو گئے تو زبان اور ادب کا مسئلہ بھی، دوسرے سارے مسائل کی طرح، چند در چند تعصبات میں الجھنے لگا۔ مشترک دشمن کے چلے جانے کے بعد قومی جوش نے اپنے اظہار کے لئے بہت ساری عصبیتیں نکال لیں۔ ان عصبیتوں میں سب سے قوی، لسانی نقطۂ نظر سے علاقائیت ہے۔ مختلف علاقوں کے لوگوں کو شدت سے محسوس ہونے لگا کہ ملکی تہذیب کے اندر وہ ایک مستقل اور دوسروں سے مختلف ثقافتی دائرہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بڑی تن دہی سے اپنے قدیم ورثے کی تفتیش شروع کی۔ ناچ کے مقامی انداز، سنگیت کی مقامی لے، نقاشی کی مقامی تراش، بول چال کے مقامی محاورے وغیرہ ڈھونڈ نکالے اپنی ان دریافتوں کے بل پر انہوں نے اپنے علاقائی مزاج کی جداگانہ خصوصیت کا دعوی کیا۔ ہر معاملے میں مقامی رنگ کے تحفظ کا مطالبہ ہونے لگا۔

مقامیت کی اس علاقائی تحریک سے اردو زبان کو بھی سابقہ پڑا ہے۔ لوک سنگیت، لوک ناچ، لوک بھاشا اور اس طرح کے دوسرے ثقافتی مظاہر سے اثر قبول کرنے کا مشورہ اسے بھی دیا جا رہا ہے۔ یہ آواز اب سرگوشی سے بڑھ کر نعرہ بنتی جا رہی ہے کہ زبان کو اگر زندہ رہنا اور آگے بڑھنا ہے تو مختلف علاقوں میں اسے پنجابی، سندھی، بنگالی، پشتو، بھوجپوری، میتھلی، گجراتی، مرہٹی وغیرہ بولیوں اور دوسرے ثقافتی وسائل سے بہتیری ادائیں مستعار لینی ہی ہوں گی۔ اس لئے کہ زبان میں تازگی اور عمدگی اسی طرح آئے گی۔ اسی طریقے سے زبان کی تاریخی روایت کا ارتقا فطری تسلسل کے ساتھ ہوگا۔ ورنہ خدشہ ہے کہ یا تو زبان سوکھ کر فنا ہو جائے گی یا پھر زبان میں ایسا انقلاب برپا ہو جائے گا کہ ماضی و حال ایک دوسرے سے کٹ کر اجنبی ہو جائیں گے بلکہ جہاں تک اجنبیت کا تعلق ہے یہ تو علاقائیت کے زیر سایہ ارتقا کی صورت میں بھی ہو کر رہے گی کیوں کہ مستقبل ہمیں تیزی کے ساتھ پیچھے چھوڑتا جا رہا ہے،

اُردو زبان اب وسعت کے اس نقطے پر آپہنچی ہے کہ ایک دوسرے سے بعید مختلف خطوں میں اس کا روپ بہر بہر گر یکسر بدل جائے گا۔

یہ واقعہ نہیں بلکہ خطرہ ہے اور یہ خطرہ خود علاقائیت کا پیدا کیا ہوا ہے ؎

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی (اقبال)

اس سے نہ مقام کی نفی مقصود ہے اور نہ وطن کی تردید۔ ہر آدمِ خاکی آب و گِل کے ایک محدود جغرافیے میں پرورش پاتا ہے اس کے جسم کا خمیر ہی مقامی مٹی سے اٹھتا ہے اور اس کا ذہن گرد و پیش کی آب ہوا میں ہی بنتا ہے جنانچہ اس کی شخصیت کا ہر اظہار ماحول کا رنگ و بو لئے ہوگا۔ ایک ادیب کا اسلوب بھی اس کے علاقۂ تربیت کے نقوش کا یقیناً حامل ہوگا، بشرطیکہ یہ علاقہ واقعی کوئی مستقل تہذیبی روایت رکھتا ہو۔ یہ ایک عمومی اثر ہے قدرتی فضا کا افراد کی حرکتوں پر۔

لیکن یہ تو کائنات کا ایک خاموش عمل ہے جو نامعلوم صدیوں سے خود بخود ہوتا چلا آرہا ہے۔ یہ اسی طرح فطری ہے جیسے عصا کا تناسب اور جسم کا رنگ اور لہجے کا خم۔ تغیر بسی کے کہے سنے یہاں تک کہ ہو جائے تو جیسے مختلف علاقوں کے افراد ادب (اور دوسرے فنون) میں اپنی اپنی خصوصیتوں کا اظہار کرتے رہے ہیں اور ان میں بعض زود آور شخصیتوں نے اپنی انفرادی خاصیتوں کا مستقل اضافہ بھی کیا ہے۔ گلہائے رنگ رنگ کے یہ مختلف اضافے ہی ہیں جن کے تسلسل سے ہمیشہ چمنِ ادب کی زینت برقرار رہی، بلکہ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوا ہے کہ پرانے مرکزوں میں ادب خستہ و فرسودہ ہو کر زائل ہونے لگا ہے،

تو ایک دور افتادہ خطے سے نئی آواز اُبھری ہے اور اس کی تازہ قوت نے پورے ادب کی تجدید کر دی ہے پوری ادبی روایت کو نیا رُخ اور نئی حرکت، تازہ ولولے اور تازہ عزائم عطا کر دئے ہیں۔ اُردو ادب کی تو یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب دلی، لکھنؤ، حیدر آباد اور عظیم آباد شعر و سخن کے تمام آتشکدے سرد ہوتے جا رہے تھے تو لاہور سے ایک نیا شعلہ اٹھا اور اس نے آنے والی کئی صدیوں کے لئے گرمی اور روشنی کا سامان کر دیا۔

مرکز کو علاقے سے یہ تقویت ظاہر ہے کہ علاقائیت سے نہیں پہنچ سکتی۔ لوک سنسکرتی اور لوک کلا کے نام پر علاقائی تحریکیں برپا کرنا ایک سادہ سی بات کو خواہ مخواہ پیچیدہ بنانا ہے۔ یہ ایک فطری عمل کو مسخ کر کے سراسر مصنوعی بنا دینا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے سانس ناک کے بجائے منہ سے لینے کی کوشش کی جائے۔ دراصل یہ معاملہ سرے سے علاقائیت بمقابلہ مرکزیت کا ہے ہی نہیں۔ عمرانی نقطۂ نظر سے یہ انفرادیت اور اجتماعیت کے تعاون کا مسئلہ ہے اور ادبی اعتبار سے اس کو روایت اور انفرادیت کے توازن کی بات کہیں گے بہر حال یہ ایک بالکل شخصی معاملہ ہے کوئی سماجی مسئلہ نہیں۔ یہ رنگ بوئے گل کی طرح خود رو بکار ہوگا، اس کو حل کرنے کے لئے کسی تنظیم کی حاجت نہیں۔ نفسیات کی اصطلاح میں کہنا چاہئیے کہ اس کا تعلق لاشعور سے ہے نہ کہ شعور سے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جس کو ایک شخص ورثے میں پاتا ہے۔ چنانچہ اگر جز کو اپنی جُداگانہ نوعیت کا زعم ہو گیا تو اس کے اندر کل کے ساتھ تعاون کی بجائے علیحدگی پسندی کا رُجحان پیدا ہو جائے گا۔ دوسری طرف کل بھی ایسے شوریدہ سر جز کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوگا،

نتیجتہً دونوں کے درمیان کچھ ویسی کش مکش برپا ہو جائیگی جیسی زمین اور چاند کے درمیان سائنس داں بتاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسی کش مکش کا انجام بھی تفریق کے سوا کچھ نہیں۔

کسی ملک اور قوم کی تہذیب کے مظہر فنون لطیفہ ایک کل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کل کے تحت قبیلوں اور علاقوں کے بہتیرے اجزا ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کل اپنے اجزا سے ہی مرکب ہوتا ہے، لیکن دوسری طرف اجزا بھی کل سے الگ اپنا کوئی تشخص نہیں رکھتے، کل اور اجزا کی باہمی نسبت ایک جسمِ واحد کے اعضا کی ہے۔ ہر عضو کی حرکت علیحدہ ہونے کے باوجود دوسرے اعضا کی جنبش سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ کوئی ایک عضو ہلتا ہے تو اسی لمحے اہتزاز کی رو پورے نظام جسمانی میں دوڑ جاتی ہے۔ پوری شخصیت منظم طریقے پر مربوط ہوتی ہے اور متعدد حصے الگ الگ کام کرنے کی بجائے ایک وقت میں ایک ساتھ عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اس مرتب ارتباط کا تقاضا ہے کہ علاقہ مقامی تفصیلات کو چھوڑ کر صرف اپنے عام جوہر کو مرکزی نظام میں بغیر کسی تکلف کے نافذ کر دیں۔ یہ عمومی توسیع اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب نظر ایک مرکزی کل پر مرکوز رہے، نہ کہ علاقائی اجزا میں آوارہ ہو۔ ہر ادیب خواہ کسی خطے کا ہو، اپنا واحد شعوری مقصود کلی نظام کی خدمت کو بنائے اور تمام جزوی عناصر کو بھول کر اسی میں جذب ہو جائے تب ہی ممکن ہو گا کہ وہ اپنی علاقائی خصوصیت کو بھی منوا سکے، جس کے لئے تحریک، نعرہ اور کوشش کی کوئی ضرورت نہیں۔ ورنہ ع: موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں۔

معاملے کی تہ میں نکتہ یہ ہے کہ ہر نئے ادیب کے سامنے ماضی کی مستحکم روایت پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ خواہ مخواہ اس کو اپنے حال کی لکیر اسی روایت کے نقشے میں بنانی ہوتی ہے۔ اگر وہ واقعی اپنے ادب کو کوئی نئی چیز دینے کی صلاحیت رکھتا ہے تو اس کی انفرادیت روایت کے مقابل کھڑی ہو جاتی ہے۔ دونوں کے درمیان ابتدائی آویزش بھی متصور ہے۔ لیکن اگر روایت کو تازہ ہونا اور انفرادیت کو روایت بننا مقدر ہے تو قدیم اور جدید کے درمیان مفاہمت اور آخر کار ہم آہنگی لازمی ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ منفرد ادیب اپنے مزاج کی خاصیتوں کو از خود ادب میں تحلیل کر دیتا ہے اور یہ خاصیتیں ورثے، ماحول اور اپج کے بے شمار ناقابل تقسیم اجزا سے مرکب ہوتی ہیں۔ ادیب کی زندگی چند در چند عناصر کا ظہور ترتیب ہے اور جب وہ ادب میں فنا ہو جاتا ہے تو یہی اجزا پریشان ہو کر جزوِ ادب بن جاتے ہیں۔ اقبال کی مثال ہمارے سامنے ہے جس زمانے میں انہوں نے اپنا کام شروع کیا دلی اور لکھنؤ کی نزاکت شاعری پر طاری تھی۔ وہ داغ دہلوی کی تجدید پنجاب سے کرنے والے تھے، اس خطے کے دلچسپ اساطیر و اسالیب دامنگیر بھی تھے، مگر ان کے ہمہ گیر ذہن نے ایک محدود دائرے میں اسیر ہو کر شاہ عبد اللطیف بھٹائی ہو کر رہ جانا گوارا نہیں کیا۔ انہوں نے اردو شاعری کی وسیع علامات ہی کو اپنا وسیلہ اظہار بنایا، بلکہ اپنی جانب سے جو کچھ اضافہ بھی کیا تو اردو کے اصل سرچشموں ہی سے، اِدھر اُدھر کے ندی نالوں سے نہیں۔ ان کے اسلوب پر بھی علاقائی محاورے کی کوئی چھاپ نہ پڑی۔ لیکن اس سب کے باوجود ان کا تیور پنجابی ہے۔ اقبال کے کلام سے اردو ادب بالخصوص شاعری کو جو صلابت، شوکت، شوخی اور تندی ملی، اس کو اگر چھانا جائے تو سرزمین پنجاب کی مٹی کے ریزے ضرور ملیں گے۔ یہ ہے علاقائی مزاج کے رنگ کی فطری، سلیقہ مندانہ اور نتیجہ خیز گل کاری!

اور یہ وہ حقائق ہیں جن سے انکار معقول نہیں، لیکن ادھر کچھ عرصے سے مختلف خطوں میں اُردو پر یہ دباؤ پڑ رہا ہے کہ وہ مقامی بولیوں، ان کے لسانی محاوروں اور لہجوں، اور تہذیبی اشاروں کو اپنے اندر جذب کرلے جہاں تک اخذ و جذب کے اصول کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ مسلّم ہے، اور اس اصول پر خاطر خواہ عمل بھی اُردو زبان کی تعمیر اور ارتقا کی تاریخ کا سرِعنوان ہے۔ اس اعتبار سے تو اُردو خاتم الالسنہ ہے۔ اس کے حروفِ تہجی کا موازنہ اگر دُنیا کی تمام بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی زبانوں سے کیا جائے تو انکشاف ہوگا کہ اُردو دنیا کی واحد زبان ہے جس میں ایک جاندار کے مُنہ سے نکلنے والی تمام آوازوں کے لئے مُستقل حروف ہیں۔ لسانی اعتبار سے اُردو کی یہ کاملیت صرف اس لئے ہے کہ ملکی و علاقائی زبانوں سنسکرت اور بھاشا کے علاوہ غیر ملکی زبانوں عربی، فارسی، پُرتگالی، ترکی اور انگریزی وغیرہ کسی سے موزوں اثر قبول کرنے میں اُردو نے کبھی دریغ نہیں کیا۔ یہ مانع کبھی کی نہ ہوئی، جامع سب کی رہی۔ اُردو کے سانچے میں یہ لچک آج تک موجود ہے۔ اس کا ارتقائی عمل بھی ہنوز جاری ہے۔ اب اس کو تاثیر و تاثر کا سابقہ ہندوستان میں ہندی، بنگالی، تلگو اور مراٹھی وغیرہ اور پاکستان میں پنجابی، بنگالی، سندھی اور پشتو وغیرہ سے درپیش ہے۔ پچھلے تجربات پر اعتماد کرکے پُوری توقع ہے کہ اُردو اس نئی آزمائش میں بھی کامیاب ثابت ہوگی۔ ناکامی کا جو کچھ اندیشہ ہوتا ہے وہ اس اضطراب سے جس نے اُردو کے چند دوستوں کو ایک معمولی بات کو غیر معمولی مسئلہ بنا دینے پر مائل کر دیا ہے، خدشہ ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ کی تشویش اب تک کے توازن کو برہم نہ کر دے۔ (جب کہ پس منظر میں اُردو کے قاتل دشمن رسم خط تک بدل دینے کی سازش کر رہے ہیں۔!)

بہرحال، علاقائیت کے علم برداروں کی طرف سے ایک سنگین سوال زمانے کے تغیرات کا اُٹھایا جاتا ہے۔ یعنی اگر اُردو کو شعوری طور پر ترقی دینے کی کوشش نہیں کی گئی تو زمانے کی رفتار خود بخود اس میں ایسی تبدیلیاں پیدا کردے گی کہ چند برسوں کے بعد صورت بجز کلمہ پہچانی نہیں جائے گی یا پھر یوں کہیئے کہ آج کی اُردو اور کل کی اُردو میں کوئی مشابہت نہیں رہ جائے گی۔ زمانہ اُردو کی موجودہ صورت کو عجائب گھر میں ڈال کر آگے بڑھ جائے گا اور اس کے بچے کھچے آثار سے ایک بالکل نئی زبان تخلیق کردے گا، ماضی کی صدیوں پر محیط روایت کے ساتھ مُستقبل کا کوئی زندہ ربط نہیں رہ جائے گا، قدیم اور جدید کے درمیان کامل تفریق اور مکمل اجنبیت پیدا ہو جائے گی۔ آج کی اُردو کل والوں کے لئے ویسی ہی ناقابلِ فہم ہو جائے گی جیسے مثال کے طور پر قدمائے دکن کے نمونے ہمارے لئے ہیں اس خرابی سے بچنے کا واحد طریقہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اُردو مختلف لسانی علاقوں میں وہاں کی بولیوں سے بیش از بیش ہم آہنگ ہو جائے۔ خاص کر پاکستان میں یہ تحریک اُٹھائی گئی ہے کہ اُردو ایک طرف پنجابی و سندھی اور دوسری جانب بنگالی سے گھری ہوئی ہے، مغربی حصّے کی زندہ عوامی بولیاں پنجابی اور سندھی ہیں اور مشرقی حصّے میں بنگلہ کا راج ہے، لہٰذا اگر اُردو کو جینا ہے تو ان علاقائی بولیوں کے لسانی و ثقافتی اشاروں کو جذب کرنا ہی ہوگا۔ اس کے علاوہ خود اُردو ہی میں مقامی بول چال کے اطوار کو ادب میں اپنانا ہی ہوگا، خواہ یہ اطوار

زبان کے مسلم قاعدوں اور مروج محاوروں کے کتنے ہی خلاف ہوں، اس لئے کہ یہ اطوار علاقائی مزاج کا اشاریہ ہیں۔

علاقائیت کے لئے اس ساری دلیل بازی میں سب سے بنیادی نکتے کو فراموش کر دیا جاتا ہے یا شاید اس سے واقفیت ہی نہیں۔ وہ یہ کہ اُردو زبان اب تعمیر کے عبوری دَور میں نہیں۔ قریب ایک صدی بیت گئی اس کو ایک باضابطہ زبان اور ادب بنے۔ اس کا ایک سانچہ مقرر ہو چکا ہے اس کے قواعد منضبط ہو چکے ہیں، اس کی عبارت معیّن ہو چکی ہے۔ اس کا ایک خاص الخاص لسانی مزاج اور ادبی کردار مُتشکل ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب زبان اور اس کے ادب میں دوسری زبانوں سے لئے ہوئے عناصر کو روشناس کرانا آسان کام نہیں۔ اب اس کام میں بڑی نزاکتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اب ایسی جو کوشش بھی ہوگی اندرونی جذبے سے ہوگی، نہ کہ بیرونی تحریک سے۔ اجنبی نقوش کو خارج سے عاید نہیں کیا جا سکتا باطن ہی میں نافذ کرنا ہوگا۔ اُردو ادب کی ایک روایت قائم ہو گئی ہے کوئی اضافہ اِس روایت سے بغاوت کر کے ممکن نہیں، زبان جیسے جیسے وسیع ہوتی جائے گی اس کو ہر قدم پر نئے نئے عناصر سے سابقہ پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ سب کو تو قبول نہیں کر سکتی، اگر اس کی اپنی کوئی ہستی ہے اور جس کو وہ قبول بھی کرے گی تو اپنے معیار پر پرکھ کر اپنے مزاج سے ہم آہنگ کرے گی۔

یہ ہے ایک تاریخی حقیقت موجودہ اُردو زبان و ادب کے بارے میں۔ اسی کی بدولت اس عاجز کو کوئی اندیشہ نہیں کہ آج سے پچاس سو یا پانچ سو برس بعد اُردو کی ہیئت بدل جائے گی اور آج کی اُردو کو لوگ قلی قطب شاہ کی تخلیقات کے مانند تشریحات کے ذریعہ سمجھ پائیں گے۔ قلی قطب شاہ کے زمانے میں اُردو کا ہیولا بن ہی رہا تھا۔ آج اُردو کی ہیئت معیّن اور مستحکم ہو چکی ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ جب حالی سے حفیظ تک نصف صدی کے طویل عرصے میں اُردو شاعری کی زبان بالکل یکساں رہی تو چند اور صدیوں کے بعد یہ اس درجہ دگرگوں کیسے ہو جائے گی کہ پہچاننا مشکل ہوگا؟ اِس سلسلے میں دُنیا کے دوسرے ادبوں، مثلاً انگریزی کا مطالعہ کریں تو مسئلہ قطعی واضح ہو جاتا ہے۔ سوئیفٹ اور شا کے درمیان دو سو سال سے زیادہ کا فاصلہ ہے لیکن انگریزی نثر کا ڈھانچہ بیسویں صدی میں بھی وہی رہا جو اٹھارویں صدی میں تھا۔

میں تو کہوں گا کہ اب اُردو وسعت کے اس مقام پر پہنچ گئی ہے کہ اس کے انضباط کے لئے فرانسیسی اکیڈمی جیسے ایک نگراں ادارے کی ضرورت ہے جو اس کو زیادہ سے زیادہ حدود کا پابند کرے نہ کہ بے مہار چھوڑ دے۔ اگر ایسی کوئی تنظیم بروئے کار نہیں لائی جا سکی تو سخت افراتفری کا خدشہ ہے۔ اِس وقت ضرورت ارتکاز کی ہے انتشار تو پہلے ہی پیدا ہو رہی ہے! (ہماری زبان)

محمد عبداللہ

نذرالاسلام پر ایک طائرانہ نظر

خُدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جسکو خُدا کے بندوں سے پیار ہوگا
(اقبال)

نذرالاسلام کا نام نامی محتاجِ بیان نہیں۔ ان کا نام پاک و ہند کے ہر اہلِ علم کو بخوبی معلوم ہے۔ مشرقی پاکستان میں تو ان کا نام بچے بچے کی زبان پر ہے۔ وہ ہندو، مُسلم دونوں کے محبوب ہیں۔ دونوں فرقے یکساں انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ وہ بیک وقت چوٹی کے شاعر بھی ہیں اور صاحبِ طرز ادیب بھی۔ گیت اور غزلوں کے خالق بھی ہیں اور موسیقی کے ماہر بھی۔ صحافی بھی ہیں اور محبِ وطن بھی۔ باغی بھی ہیں اور عاشقِ سرمست بھی۔ مگر سب سے بڑھ کر ایک انسان دوست ہیں۔

نذرالاسلام ذات پات کی تنگ نظریوں اور کم ظرفیوں سے بالاتر تھے۔ اُن کے دل میں آدمیت کا بڑا احترام تھا۔ وہ زندگی بھر انسانیت کا علمبردار رہے۔ اور اسی کے لئے اپنی شاعری وقف کردی۔ وہ ہندو اور مُسلمان دونوں کے بہی خواہ اور دونوں کے تہذیب و تمدن کے ترجمان تھے۔ انہوں نے "اسلامی سنگیت" بھی گائے اور "شیام سنگیت" بھی۔ اُن کے پہلو میں ایک حساس اور دردمند دل تھا۔ وہ دُکھ درد کی گود میں پل کر جوان ہوئے اِس لئے لوگوں کے دُکھ درد کو دل سے محسوس کر سکے۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد مُلک ایک نازک حالت سے گزر رہا تھا۔ مُلک کے عوام بدیسی حکومت اور ملوکیت کی غلامی اور چیرہ دستیوں کے باعث کراہ رہے تھے سرمایہ دار طبقہ غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کا خون چوس رہا تھا۔ ہندو اور مسلمان فرقہ وارانہ فسادات میں اُلجھ کر اپنے ملک کے اقتدار کی بیخ کنی کر رہے تھے۔ ان نامساعد حالات میں نذرالاسلام "دھوم کیتو" (دُمدار ستارہ) بن کر ان میں غیر متوقع طور پر نمودار ہوئے۔

شاعر نذرالاسلام کو خاکِ وطن سے والہانہ محبت اور مظلوم انسانیت سے گہری ہمدردی تھی اُن کو مُلک اور عوام کی ابتری و زبوں حالی ایک آنکھ نہ بھائی۔ اُنہوں نے عام شاعروں کی طرح زندگی کی ہماہمی اور سرگرمیوں سے مُنہ موڑ کر گل و بُلبل کی شاعری نہیں کی۔ وہ "ادب برائے ادب" کے قائل نہ تھے بلکہ "ادب برائے زندگی" کے حامی تھے۔ ان کے یہاں مستیٔ احوال نہیں مستیٔ کردار ہے۔ اُنہوں نے شاعری سے دماغی عیاشی نہیں کی۔ ساحل سے طوفان کا تماشہ دیکھنا گوارا نہیں کیا۔ اُنہوں نے اس دور میں جب "رخِ سحری کی لگن؟ کچھ نمایاں نہ تھی، اپنی آگ ہی بھڑکا آتیں

بین باجہ) اٹھوائی اور اس سے ملک بھر میں آگ لگا دی۔ ایک ایسا صور پھونکا، جس سے ہر دل میں حصولِ آزادی کی ایک نئی روح، ایک نئی تڑپ اور ایک نئی ہلچل پیدا ہو گئی۔ انہوں نے "بشیر بانشی" (زہریلی بانسری) بجا کر ظلم کی طاقتوں کو مبہوت کر دیا۔ باغی بن کر غلامی اور نا انصافی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ آتش بیانی اور شعلہ مقالی سے جبر دستوں اور جفا کاروں کے دل میں تھرتھراہٹ اور زمین و آسمان میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ آتش فشاں اخبار "دھوم کیتو" شائع کر کے (۱۲ اگست ۱۹۲۲ء) اپنی للکار اور غیظ و غضب سے حکومت میں کھلبلی پیدا کر دی۔ وہ سامراج کے بدترین دشمن تھے۔ آخر "دھوم کیتو" کی اشاعت سے وہ خود بھی حکومت کے بدترین دشمن بن گئے۔ نتیجے میں قیدِ بامشقت کی سزا جھیلی۔ پھر بھی باطل کے آگے سر نہیں جھکایا۔ "لانگل" (کلکتہ، ۱۶ دسمبر ۱۹۲۵ء) میں نظمیں اور گانے شائع کر کے انسانی مساوات کی تعلیم دی۔ مزدوروں اور کسانوں کو صورِ اسرافیل پھونک کر جھنجھوڑ دیا اور انہیں خوابِ غفلت سے چونکا کر اپنے حقوق حاصل کرنے کی دعوت دی۔ ایک روشن مستقبل کا مژدہ سنایا۔ خود موجِ بلا کے تھپیڑے کھا کھا کر مصیبت زدوں کو قعرِ مذلت سے نکالنے کی کوشش کی۔ در در پھر کر عوام کی رگِ حمیت میں خون دوڑا دیا۔ ہندو مسلم اتحاد کا راگ الاپا اور ہندو مسلم کے پیارے بھی بنے۔ شباب کے ترانے گائے اور نوجوانوں کو لے کر ایک ایسے جہانِ رنگ و بو کی داغ بیل ڈالنا چاہی جہاں انسان، انسان کا دشمن نہ ہو، بڑے اور چھوٹے کا فرق اور دولت کی غیر مساوی تقسیم نہ ہو، جہاں مساوات کے گیت گائے جائیں، جہاں ہر فردِ بشر کو یکساں حقوق حاصل ہوں۔ انہوں نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔

نذرالاسلام کی سعی مشکور ہوئی۔ ان کی رجائی شاعری نے لوگوں میں خود اعتمادی کا جذبہ اور آزادی کا ولولہ پیدا کیا۔ انہیں جبر و استبداد کے خلاف سینہ سپر بنا کر میدانِ جنگ میں لا کھڑا کیا۔ "خلافت" اور "ترکِ موالات" کی تحریکیں (۱۹۱۹ء۔ ۱۹۲۲ء) گو وقتی طور پر ناکام ہوئیں، تاہم ان کی روحیں فنا نہیں ہوئیں۔ وہ آئے دن مختلف شکلوں میں رونما ہوتی رہیں۔ شاعرِ نذرالاسلام نے تحریکِ "خلافت" اور "ترکِ موالات" کے وقت اپنی شاعری میں جس انقلاب کا بیج بویا تھا، آخر اس کا ثمرہ مرتب ہو کر رہا۔ ملک آزاد ہوا۔ پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔

نذرالاسلام کی ہنگامی نظموں اور گیتوں کی ادبی قدر و منزلت کیا ہو گی، اس کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اس کا فیصلہ زمانے کی عدالت میں ہو گا۔ ہاں جب تک قوم اور ملک ہر طرح کے ظلم و ستم سے پاک نہ ہو، ان کی انقلابی شاعری کی ضرورت یقیناً باقی رہے گی۔ زمانے کو نذرالاسلام ہمیشہ یاد آئیں گے۔ قوم ہمیشہ ان کی ممنون رہے گی۔

نذرالاسلام کی شاعری بنگلہ زبان و ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے جس وقت سرزمین بنگال میں رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری کا دور دورہ تھا، چاروں طرف ان کا طوطی بول رہا تھا، بجز چند گنی چنی ہستیوں کے تمام شعراء ان کی کورانہ تقلید کر رہے تھے اور ان کے طرزِ شاعری کو اپنے لئے باعثِ صد افتخار سمجھ رہے تھے اسی وقت نذرالاسلام ایک غیر معمولی جودت و ذہانت اور زبردست شخصیت لئے ہوئے زبان و ادب کے

اُفق پر طلوع ہوئے۔ گو شروع شروع میں اُنہوں نے ٹیگور کے طرزِ شاعری سے بھی فائدہ اُٹھایا، مگر تھوڑے ہی عرصے میں ان کی انفرادیت پسند طبیعت نے خیالات و بیانات کی عام ڈگر سے ہٹ کر اپنے لئے ایک الگ راستہ ڈھونڈھ نکالا۔ بنگلہ زبان و ادب کو نئے جذبات و احساسات، جدید طرزِ نگارش اور اسلوبِ بیان سے روشناس کرایا۔ مظلوم، کسان، مزدور، ماہی گیر، چور، گدا کو غرض ہر طبقۂ انسان کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی۔ "بورژوا ادب" محلوں میں پیدا ہونے والے ادب اور دولتمندوں کے ادب کو اونچے محلوں سے اُتار کر عوامی ادب بنایا۔ معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی حالات کا نقشہ کھینچ کر ادب کو حیات سے قریب تر کر دیا۔ رابندرناتھ اور ان کے متبعین کی شیریں اور سُریلی آواز اور نیاز مندانہ رُجحانات لئے ہوئے ادب کو صورِ اسرافیل اور برقِ میکائیل سے آشنا کیا۔ اس میں رعد کی گرج، بجلی کی تڑپ، طوفان کی تُندی اور تلوار کی جھنکار پیدا کی۔ اس کو جراتِ مندانہ لب و لہجہ اور فولاد کی سیرت بخشی۔ نئی نئی راگ راگنیوں سے باغِ ادب کو سجایا۔ سنسکرت آمیز الفاظ کے پہلو بہ پہلو سینکڑوں عربی، فارسی اور اُردو الفاظ کے حسین امتزاج اور برمحل استعمال سے بنگلہ زبان و ادب کو ایک نیا رنگ و آہنگ بخشا۔ بنگلہ ادب کو جو اب تک اسلامی رنگ رُوپ، اسلامی تعلیمات و پیغامات سے قریب قریب بے بہرہ تھا، لفظی و معنوی حیثیت سے اسلامی سانچے میں ڈھالا۔

نذرالاسلام، رابندرناتھ کے رُعب و دبدبے سے نہیں دبے۔ اُنہوں نے رسم و رواج کی بندشوں سے بالاتر ہو کر اپنی انفرادیت کا ثبوت دیا۔ ان کی بلند شخصیت، انوکھے طرزِ فکر، دلکش اور اچھوتے اسلوبِ بیان نے ان کے بہت سے ہم عصر شعراء پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ شہابِ ثاقب کی طرح بنگلہ ادب کے افق میں رُونما ہوئے۔ ان کی روشنی کچھ اتنی تیز تھی کہ آنکھیں چوندھیا گئیں۔ خود ٹیگور کا آفتابِ شہرت جو اُس وقت نصف النہار پر تھا گہن میں آ گیا۔ آخر ٹیگور کو بھی ان کا لوہا ماننا پڑا۔ جب نذرالاسلام نے اپنا ہنگامہ خیز اخبار "دھوم کیتو" شائع کیا تو شاعر رابندرناتھ نے ان کی آتش بیانی اور شعلہ باری سے متاثر ہو کر اس کے پہلے ہی نمبر میں ذیل کے الفاظ میں ان کی پذیرائی کی:-

" اے "دھوم کیتو" آ، چلا آ
اندھیرے میں آگ کا پُل باندھ دے۔
ان بُرے دنوں میں قلعے کی چوٹی پر
تو اپنی فتح کا پرچم لہرا دے۔
نحوست کے تلک کو رات کی پیشانی پر
ثبت ہونے دے۔ کوئی پروا نہیں۔
خوابِ غفلت میں پڑے ہوؤں کو
جھنجھوڑ کر جگا دے "

نذرالاسلام صرف "اگنی بینا"، "بشیر بانشی"، "بھانگار گان" (توڑ پھوڑ کے گانے) "پرلئے شکھا" (تباہی کا شعلہ) ہی کے شاعر نہیں، "چوکھیر چاتک" (آنکھ کا پپیہا) "دولن چانپا" (پھول کا ایک خاص درخت) "گل باغیچہ" اور "ذوالفقار" جیسی کتابوں کے بھی خالق ہیں۔ ان کے یہاں شعلوں کے ساتھ ساتھ گلدستے بھی ہیں۔ شمشیر و سناں کے پہلو بہ پہلو طاؤس و رُباب بھی ہے۔ لہو ترنگ کے مقابلے میں جل ترنگ بھی موجود ہے۔ وہ بیک وقت شاعرِ انقلاب بھی ہیں اور قدرتی مناظر کے بہتر نقاش بھی۔

اسلام کی عظمتوں کے پُرخلوص مبلغ بھی۔ ایک طرف طبلِ جنگ بجاتے ہیں تو دوسری طرف حُسن و عشق کا راگ الاپتے ہیں۔

ممکن ہے کہ ان کی بیشتر نظمیں جو ہنگامی تقاضوں کی بنا پر وجود میں آئیں "ادب برائے ادب" کے قائل حضرات اور سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والوں کو خوش نہ کرسکیں، مگر یہ فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ ان کی غنائی شاعری کا ایک معتدبہ حصّہ ایسا ضرور ہے جو حُسنِ فطرت اور قلبی واردات کی صحیح کاسّی کرتا ہے۔ یہ وہ ادبی سرمایہ ہے، جو جمالیاتی قدرِ کا ذوق رکھنے والوں کو بھی تسکین بخشتا ہے۔ ان کی یہ شاعری ایسی سدا بہار ہے، جس پر کبھی خزاں نہیں آئے گی۔ انہوں نے اسلامی نظموں، گیتوں اور غزلوں کا ایسا کافی ذخیرہ چھوڑا ہے جس کا چرچا ہمیشہ مذہبی اور کیف و سرور کی محفلوں میں یکساں ہوتا رہے گا۔ یہ ادب ہمیشہ مسلمانوں کا خون گرماتا رہے گا اور اُن کا دل تڑپاتا رہے گا۔

صد افسوس! تقدیر کے ظالم ہاتھوں نے ہمیں اپنے محبوب شاعر سے قبل از وقت محروم کر رکھا ہے وہ ہم سے دُور (کلکتہ میں) پڑے ہوتے ہیں اور انتہائی نازک حالت میں زندگی کی آخری گھڑیاں گذار رہے ہیں۔ مگر جتنے ہی وہ ہم سے دُور ہیں، اُس سے کہیں زیادہ قریب ہیں کیونکہ انکی شاعری ہماری زندگی کے ہر مرحلے میں مشعلِ راہ کا کام دیتی ہے۔ وہ قومی اور عہد آفریں شاعر ہیں۔ بنگلہ ادب کے چوٹی کے شاعر ہیں۔ قوم کے دل میں ہمیشہ ان کیلئے ایک معزز جگہ محفوظ رہے گی۔ ان کو خدا کے بندوں سے پیار تھا۔ اس لئے وہ بھی بندوں کے پیارے بنے ہوئے ہیں۔ اُن کے کارناموں نے اُنہیں حیاتِ جاوید بخشی ہے۔ اُمراء کے ایوانوں سے لے کر

نصیر پرواز

غزل

خیال و خواب کو لفظوں کا ساز بخشا ہے
مرے لبوں پہ تری آرزو کا نغمہ ہے!

ترس رہی ہیں نگاہیں اُسی نظارے کو
جو میں نے بارہا تیری نظر سے دیکھا ہے

وہی ہجوم تمنّا، وہی شبِ ظلمت
نہ جانے کیوں دلِ وحشی اُداس رہتا ہے

تُو خود بھی دیکھ شبِ تار اور مجھکو بتا
یہ چاند کتنے ستاروں کے ساتھ ہنستا ہے

ترے خلوص کی باہوں میں سو گیا ہوں میں
یہ خواب خواب سہی پھر بھی کتنا اچھا ہے

گھُلی ہے جامِ الم میں ترے لبوں کی مٹھاس
ترا ہی عکس مئے زندگی میں اُبھرا ہے

سمٹ رہا ہے زمانہ سنور رہی ہے حیات
مگر وہ فاصلہ جو دل کے بیچ پھیلا ہے

اُبھر کے ڈوب گئی ضبط درد کی آواز
یہ حال ہے کہ دلِ زار اب تڑپتا ہے

بہت حسین سہی آرزو مگر پرواز
دلِ غریب کہیں آرزو سے بہلا ہے

"غریبوں کے جھونپڑوں تک میں اُنکی نظموں اور غزلوں کا چرچا ہوتا ہے اور اُن کی یاد تازہ رہتی ہے۔"

ش۔ د۔ شارق

غزل

جس کے سر پر ہنستی ہوئی تقدیر کا سہرا ہوتا ہے
کیسا چمکتا کیسا دمکتا اُس کا چہرہ ہوتا ہے

عشق کی ضربت، درد کی لذّت جس نے کبھی محسوس نہ کی
لاکھ وہ بہرہ ور ہو جہاں میں پھر بے بہرہ ہوتا ہے

اِس کے نقش اُبھرتے ہیں پھر مٹتے مِٹتے مٹتے ہیں
پہلے تو زخمِ ناکامیِ اُلفت گہرا ہوتا ہے

فکر کی آزادی کیسی، اب فکر کہاں آزاد رہی
کیسی کیسی مصلحتوں کا اِس پر پہرہ ہوتا ہے

کیا دیکھے فطرت کی ادا اور کیسے سُنے قدرت کی صدا
آنکھ وہ جو بینا نہ ہوئی، وہ کان جو بہرا ہوتا ہے

محفلِ شب کا رنگ تو دیکھو وقت کا ہوتا ہے ساقی
جُوں جُوں رات گزرتی ہے رنگ اور بھی گہرا ہوتا ہے

دل کا دیا مت بجھنے دو تم، تاریکی چھا جائے گی
اِس کے روشن رہنے سے ماحول سُنہرا ہوتا ہے

کیا کہیں کیا کیا دیکھتی ہیں تنہائی میں اپنی آنکھیں
دُور خلا میں یادوں کا اِک قافلہ ٹھہرا ہوتا ہے

دُھوپ کڑی ہے گو غمِ دوراں کی جھلسا دینے والی
سایہ غمِ جاناں کا شارق پھر بھی لہرا ہوتا ہے

شوکت صدیقی

شامِ اودھ

بسنت پنچمی کا تہوار تھا اور نوچندی جمعرات! پت جھڑ کے دن تھے، درختوں کے نیچے خشک پتے کھڑکھڑا رہے تھے۔ بیچ کے آسمان پر خاکستری غبار کا جال پھیلا ہوا تھا اور پھاگن کی تیز ہوا بلبلوں کی طرح غرا رہی تھی۔ شام کو شاہ مینا مخدوم کے مزار پر دھوم دھام سے گاگر چڑھے گی۔ دور دور سے قوالوں کی چوکیاں آئی تھیں۔ تین روز تک محفل سماع گرم رہے گی۔ درگاہ کے احاطے کے اندر دکانیں سج رہی تھیں۔ حجروں میں مضافات سے آئے ہوئے صوفیوں کا جمگھٹا تھا۔ چوک کے بالاخانوں پر چہل پہل بڑھتی جا رہی تھی۔ طوائفیں نوچندی کے میلے کے لئے بناؤ سنگھار کر رہی تھیں بسنتی دوپٹوں کے آنچل لہرا رہے تھے۔ دروازوں پر تھموں کے طور پر گیندے کے ہار جھول رہے تھے۔ لکھنؤ میں ہر طرف بسنت کی بہار تھی۔

سہ پہر کی مضمحل خاموشی میں طویل دالانوں والی بارہ دری سنسان نظر آ رہی تھی۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ساتھ بھینی بھینی تمباکو کی مہک آ رہی تھی۔ دھوپ اوپر منڈیر پر پہنچ چکی تھی۔ بیگماتیں ابھی تک اپنی کوٹھڑیوں میں بے خبر سو رہی تھیں۔ صحنچی میں مغلانی جی بڑی دیر سے بیٹھی ہوئی پانچے کی کلیاں ترپ رہی تھیں۔ کبھی کبھار وہ اونچی آواز سے نادرہ کو پکار لیتیں اور پھر پائنچے کی ادھیڑ بن میں کھو جاتیں۔

نادرہ نے ایک بار بھی اُن کی آواز پر جواب نہ دیا۔ چپ چاپ کھڑی ڈیوڑھی میں دروازے کی آڑ سے باہر جھانک رہی۔ اس وقت گلی میں چہل پہل تھی۔ باقر نواب کے نوبت خانے پر شہنائی بج رہی تھی۔ اُن کی منجھلی بیٹی کا بیاہ تھا۔ برات رات ہی کو آ گئی تھی اور دیوان خانے میں اتری تھی۔ جس کو ہفتہ بھر سے سجایا جا رہا تھا۔

دونوں گھرانوں میں مدتوں سے اَن بن چلی آ رہی تھی۔ اس لئے دعوت نامہ آنے پر بھی بارہ دری سے کوئی بھی شادی میں شریک نہیں ہوا۔

نکاح کی رسم تو فجر کے وقت ہی ادا ہو گئی تھی مگر ابھی تک برات کو رخصت نہیں کیا گیا تھا۔ البتہ باراتیوں کی دوڑ دھوپ دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ رخصتی کا وقت آ گیا ہے۔ دلہن کی پینس بھی آ چکی ہے اور کہار باہر گلی میں بیٹھے مزے سے چلم پر دم لگا رہے تھے۔ شہدوں کو ابھی تک نچھاور نہیں ملا تھا۔ وہ دیوان کے پھاٹک پر اکٹھا ہو کر شور مچا رہے تھے۔

سہ پہر کے سائے طویل ہوتے جا رہے تھے اور آسمان پر خاکستری غبار کا جال گہرا ہو گیا تھا۔ ایکا ایکی شہنائی کے سُر مدھم پڑ گئے اور ساری آوازیں سمٹ کر مکھیوں کی بھن بھناہٹ معلوم ہونے لگیں۔ پھر ان ڈوبتی ہوئی آوازوں میں سارنگیے نے سارنگی کے تاروں کو چھیڑا، اور دیوان خانے کے اندر بھانڈوں نے منڈھا گانا شروع کر دیا ؎

بابل مورا نیہر چھوٹو جائے

اے بابل مورا ....

منڈھے کے بول دھیرے دھیرے اونچے ہوتے گئے۔ چہروں پر گہرے سائے لہرانے لگے۔ کتنی ہی آنکھیں چھلک پڑیں

نادرہ بھی آبدیدہ ہوگئی۔ اُس نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے سوچا، ہائے ذرا دیر بعد مہر عالم پرائے گھر کی ہو جائے گی۔ ماں، باپ، بھائی، بہن، گھر بار، پاس پڑوس سب پرائے ہو جائیں گے۔ اُس نے ایک آہ سی سانس بھری، اور گردن بڑھا کر باہر گلی میں دیکھنے لگی۔ وہ مہر عالم کے دولہا کو دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر وہ ابھی تک باہر نہیں آیا تھا۔ اسی شوق میں تو وہ اتنی دیر سے ڈیوڑھی میں کھڑی تھی کہ اب اُس کی ٹانگیں بھی دُکھنے لگی تھیں۔

اُسی وقت صحن میں آہٹ ہوئی۔ طلعت آرا غسل خانے کا دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ اُس کے بھیگے ہوئے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے، گلے میں بسنتی دوپٹہ لٹک رہا تھا جس نے رُخساروں پر گیندے کے پھول کھلا دیئے تھے۔

طلعت آرا آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آنگن میں آگئی اُس کے پیروں تلے مولسری کے سوکھے پتّے کھڑکھڑاہٹ پیدا کر رہے تھے۔ بڑے دالان میں ابابیل کا ایک جوڑا تیزی سے ہوا کو کاٹ رہا تھا۔ طلعت آرا نے چاروں طرف ایک نظر دوڑائی۔ بارہ دری کے سنّاٹے میں اس کو فوراً اندازہ ہوگیا کہ امّاں جان ملکہ زمانی کو کربلا لے جائیں گی اور اب تو امام باڑے سے تابوت نکل چکا ہوگا، جسے وہ قتل گاہ کے قریب ماتم کر رہی ہوں گی۔

باہر گلی میں ابھی تک بابل کے الوداعی نغمے گونج رہے تھے۔ طلعت آرا نے صحنچی میں بیٹھی ہوئی مغلانی کی جانب دیکھا اور دبے پاؤں سے چلتی ہوئی ڈیوڑھی میں چلی گئی۔

نادرہ نے پشت پر قدموں کی آہٹ سن کر جلدی سے پلٹ کر دیکھا اور آنکھیں پھاڑ کر بولی "ہائے اللہ آپ یہاں کیسے آگئیں" (طلعت آرا کو ڈیوڑھی میں آنے کی اجازت نہ تھی) وہ کھسیانی ہو کر بولی "تو اس میں کیا ہوا؟ ذرا ہم بھی برات دیکھ لیں۔"

نادرہ گھبرا کر کہنے لگی "نہیں چھوٹی بیگم! میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں، آپ اندر چلی جائیں۔ بڑی سرکار کے کان میں ذرا بھی بھنک پڑ گئی تو میرے اوپر آفت آجائیگی۔"

اس بات سے طلعت آرا کچھ خائف ہوگئی لیکن برات دیکھنے کا اشتیاق کم نہ ہوا۔ آہستہ سے بولی:-

"اچھا تو آؤ کوٹھے پر چلیں۔ دُھوپ میں ذرا بال بھی سکھا لیں گے اور برات بھی وہاں سے خوب دکھائی دے گی۔"

نادرہ نے جلدی سے کہا "ہائے اللہ آج آپ کو کیا ہو گیا ہے۔"

پھر اُس نے دونوں کان پکڑ کر انکار میں گردن ہلائی "بھلا کوٹھے پر کوئی جاتا بھی ہے، پھر آج تو نوچندی جمعرات کا دن ہے۔"

نادرہ واقعی خوفزدہ ہوگئی تھی، اُس کی آنکھیں سہمی ہوئی تھیں، بات بھی کچھ ایسی تھی، گھر بھر میں سب ہی کوٹھے کے نام سے تھرّاتے تھے۔ اوپر کی منزل میں دو کشادہ کمرے تھے، اُن کے آگے شہ نشین تھی جس پر مختصر سا لکڑی کا سائبان تھا۔ سائبان میں ابابیلوں نے گھونسلے لگا لئے تھے اور کام دن اس کے گرد منڈلایا کرتیں۔ دُور دُور تک سپاٹ چھتیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کمروں کے اندر ابھی تک بڑے نواب صاحب کا سامان رکھا تھا، گرمی کے موسم میں رات کیوقت وہ اوپر کی منزل پر استراحت کرتے تھے۔ سر شام ہی چھتوں پر چھڑکاؤ ہو جاتا، پھر چھپر کھٹ باہر نکالا جاتا اور خاصدان میں پان کی گلوریاں بنا کر سرہانے رکھدی جاتیں جب پہر رات گزر جاتی تو نواب صاحب آرام کرنے کی غرض سے کوٹھے پر چلے جاتے۔

پچھلے سال کا ذکر ہے گرمیوں کی رات تھی، ہر طرف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ نواب صاحب ابھی تک سوئے نہیں تھے، البتہ آنکھوں پر غنودگی طاری تھی، یکایک اُن کو اپنے سرہانے قدموں کی چاپ سنائی دی، اُنھوں نے فوراً

آنکھیں کھول دیں۔ سائبان کے نیچے اُن کو ایک انسانی سایہ لرزتا ہوا نظر آیا۔ ہر طرف کافور کی تیز بُو پھیلی تھی۔ گھبرا کر وہ اُٹھ بیٹھے اور زیرِ لب "نادِ علی" پڑھنے لگے، اُنہوں نے دیکھا کہ دیوار کے سائے میں کوئی سفید کفن میں لپٹا ہوا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ پھر وہ مُنڈیر کے پاس جا کر اندھیرے میں غائب ہو گیا، خوف کے مارے وہ سکتے کے عالم میں آ گئے۔ اُنہوں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر کچھ اس قدر دہشت طاری ہوئی کہ دل بیٹھنے لگا، ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی کلیجہ مسل رہا ہے، رہ رہ کر ٹیس اُٹھتی۔ کسی پہلو قرار نہ تھا، وہ اُونچی آواز سے کراہنے لگے۔ ان کی آواز سُن کر حضور بیگم گھبرائی ہوئی اُوپر پہونچیں۔ دم کے دم میں سارے گھر کے افراد اُن کے چھپر کھٹ کے چاروں طرف اکٹھا ہو گئے۔ نواب صاحب کی حالت دم بدم غیر ہوتی گئی۔ سویرا ہوتے ہوتے خون کی ایک قے ہوئی اور اس کے ساتھ ہی نبضیں چھوٹ گئیں، آنکھیں پتھرا گئیں۔ گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔

اُس وقت سے کسی نے کوٹھے پر جھانک کر بھی نہ دیکھا، وہاں ہر وقت ہُو کا عالم رہتا۔ حضور بیگم کا خیال ہے کہ اُدھر کی مرل پر جنوں کا گُزر ہے، نواب صاحب سے کوئی بے ادبی ہو گئی ہوگی، جناتوں نے جلال میں آ کر کلیجہ چبا ڈالا۔ اب اکثر راتا گئے چھت پر قدموں کی آہٹ سُنائی دیتی۔ تاریک راتوں میں قہقہے اُبھرتے اور گھر بھر میں لوبان کی خوشبو پھیل جاتی، عام طور سے یہ سب کچھ نوچندی جمعرات کے دن ہوتا تھا۔

نادرہ جس قدر خوف زدہ نظر آ رہی تھی، طلعت آرا کے انداز سے اسی قدر اطمینان جھلک رہا تھا، وہ اکہرے جسم کی بڑی نازک سی لڑکی تھی، چہرے پر پھولوں کی سی شگفتگی، بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں موہوم سا خوف۔ حضور بیگم نے اس کو بڑے ناز و نعم میں پالا تھا۔ پل بھر کے لئے آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتیں۔ طلعت آرا اب سولھویں برس میں لگ چکی تھی۔ مگر وہ اُسے بچوں کی طرح رکھتی تھیں۔ کسی نے نظر بھر کر دیکھا اور اُنہوں نے فوراً نظر اُتروائی۔ ذرا اس کی طبیعت مضمحل ہوئی وہ فوراً منت مانتیں، صدقہ اُترواتیں، حضرت عباس علمدار کی درگاہ جا کر اپنے ہاتھ سے چلہ چڑھاتیں۔ غیر عورتوں تک سے وہ اُس کا پردہ کراتیں، کیا مجال کہ سر ڈھکے بغیر وہ آنگن میں چلی جائے، قیامت برپا کر دیتی تھیں، کہتی تھیں "کھلے آسمان پر ہر وقت بلائیں گھوما کرتی ہیں، خدانخواستہ کسی کا سایہ پڑ گیا تو میری بچی ہاتھوں پر آ جائے گی۔ ذرا سی بات پر تو وہ پھول کی طرح کمُلا جاتی ہے۔" مگر طلعت آرا کو ان حرکتوں سے بڑی اُلجھن ہوتی۔ وہ بات بات پر جھنجھلا جاتی اور جب کوئی بس نہ چلتا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی، اس کے مزاج میں سرکشی اور ضد پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ اپنی بات پر اڑ گئی اور کہنے لگی۔

"نہیں، ہم تو کوٹھے پر ضرور جائینگے۔"

نادرہ نے گھبرا کر کہا "چھوٹی بیگم خدا کے لئے اُوپر نہ جائیے گا، آپکو میری جان کی قسم وہاں جناتوں کا سایہ ہے اور آج تو نوچندی جمعرات ہے اُن کا پھیرا ہو گا۔ آپ کو ڈر بھی نہیں معلوم ہوتا۔"

طلعت آرا لمحہ بھر کے لئے سہم گئی، مگر وہ باز نہ آئی، کہنے لگی:۔

"ابھی تو دن نکلا ہوا ہے۔ ان کا پھیرا تو رات کو ہوتا ہے۔ بس ذرا دیر بعد لوٹ آئیں گے۔" پھر اُس نے خوشامد کرنے کے انداز میں کہا "خدا کی قسم وہاں زیادہ نہ ٹھہرونگی۔ یہاں سے تو خاک بھی نظر نہ آئے گا۔ اُوپر جھروکے سے ساری برات اچھی طرح نظر آئے گی۔ سُنا ہے تہر کا دولھا بڑا خوبصورت ہے۔ اے ذرا دیکھیں تو کیسا ہے۔"

دولھا کو دیکھنے کا ارمان نادرہ کو بھی تھا، اُس کے

دل کا چور فوراً بول اٹھا کہنے لگی "شمو کی ماں سویرے دولھا کو دیکھ آئی تھی۔ کہتی تھی بالکل شہزادہ لگتا ہے ایسا خوبصورت ہے کہ چہرے پر نظر نہیں ٹھہرتی۔"

طلعت آرا نے پوچھا "کیا واقعی بڑا خوبصورت ہے؟"

نادرہ نے جواب دیا "میں نے تو دیکھا نہیں۔ وہی شمو کی ماں تعریفوں کے پُل باندھ رہی تھی۔" پھر ذرا مسکرا کر اُس نے طلعت آرا کو چھیڑا "اللہ نے چاہا تو ہماری چھوٹی بیگم کو اس سے بھی زیادہ خوبصورت دولھا ملے گا۔ ایسا بانکا سجیلا۔"

طلعت آرا نے آنکھیں نکال کر اس کو ڈانٹا "چل ہٹ بدتمیز کہیں کی۔"

نادرہ مسکراتی رہی "مہر علم کا تو نصیبہ جاگ اُٹھا۔ اے اتنی چیاں سی تو آنکھیں ہیں، نہ ناک نہ نقشہ، بس رنگ ہی رنگ ہے۔ خدا کی قسم مجھ کو تو وہ ذرا بھی اچھی نہیں لگتیں۔"

طلعت آرا نے جلدی سے کہا "تو پھر آؤ چلیں، برات اب رخصت ہی ہونے والی ہے۔"

نادرہ جھجکتے ہوئے بولی "اور جو کہیں بڑی سرکار آگئیں تو؟"

"وہ ابھی سے کیسے آجائیں گی، وہ تو چراغ جلے آئیں گی۔"

نادرہ نے ایک بار پھر اس سے وعدہ لیا۔ "دیکھئے جلدی سے لوٹ آیئے گا نہیں تو میں نہیں جاؤں گی۔"

"بس برات دیکھتے ہی چپکے سے لوٹ آئیں گے، اتنی دیر میں کون سی قیامت ہو جائے گی۔"

دونوں نے وہیں کھڑے کھڑے کوٹھے پر جانے کی سکیم بنائی اور ڈیوڑھی سے نکل کر صحن میں آ گئیں۔ نادرہ مغلانی کے سامنے اس طرح آڑ کر کے کھڑی ہو گئی کہ طلعت آرا پنجوں کے بل چلتی ہوئی صحنچی کے سامنے سے گزر کر زینے کے اندر داخل ہو گئی۔ نادرہ مغلانی کے سامنے چپ چاپ کھڑی رہی، مگر وہ اپنی دُھن میں اس قدر محو تھیں کہ انہوں نے اُس کی جانب نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ نظر بچا کر نادرہ بھی لپک کر زینے میں گھس گئی۔

زینے کے اندر ابھی سے اندھیرا پھیل گیا تھا۔ نادرہ سنبھل سنبھل کر سیڑھیوں پر قدم رکھتی ہوئی اوپر جا رہی تھی، ابھی اُس نے آدھا زینہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ ایکا ایکی چھت پر طلعت آرا کی گھٹی ہوئی چیخیں سنائی دیں۔ نادرہ کے قدم رُک گئے۔ اُس کا سارا بدن خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ چند ہی لمحہ بعد طلعت آرا کی چیخیں بند ہو گئیں، ہر طرف آسیب زدہ سکوت چھا گیا۔

نادرہ کا یہ عالم تھا کہ ایک پیر اوپر کی سیڑھی پر اور دوسرا نچلی سیڑھی پر، تمام جسم پر سکتہ تھا اور نظریں اوپر زینے کے دروازے کی جانب اُٹھی تھیں۔ پھر گہری خاموشی میں کوئی مردانی آواز میں آہستہ سے کھنکارا۔ چھت پر قدموں کی چاپ اُبھری اور زینے کا دروازہ چرچراتا ہوا آہستہ سے بند ہو گیا۔

اس کی گھگھی بندھ گئی، سارا بدن پسینے سے شرابور ہو گیا۔ زینے کے اندر پھیلا ہوا اندھیرا اور گہرا ہو گیا، اور اس اندھیرے میں دیواروں پر دھندلی دھندلی پرچھائیاں جھومنے لگیں، نادرہ ایک بارگی سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے بھاگی۔

صحن میں آ کر اُس نے وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ صحنچی میں مغلانی جی کا تخت خالی پڑا تھا۔ غسل خانے سے اُن کے وضو کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ پہلے تو اُس نے سوچا تھا کہ ساری بات جا کر اُن کو بتا دے۔ مگر حضور بیگم کے ڈر سے اُس کی ہمت نہ پڑی۔ ذرا دیر تک وہ بڑے دالان کے ستون کے پاس سہمی ہوئی کھڑی رہی پھر چپ چاپ اپنی کوٹھڑی میں جا کر پلنگ پر لیٹ گئی

کوٹھڑی کے اندر کسی قدر تاریکی تھی۔ نادرہ کا دل ریل کے انجن کی طرح دھک دھک کر رہا تھا، اُس کو رہ رہ کر طلعت آرا کا خیال آ رہا تھا۔ اُس کے چاروں طرف دبی دبی چیخیں سرسرا رہی تھیں۔ اُس نے بڑے دُکھ کے ساتھ سوچا ہائے اللہ یہ کیا ہو گیا۔ نہ جانے بے چاری چھوٹی بیگم پہ کیا گذری ہو گی۔ کیسی بُری طرح چیخی تھیں جیسے ذبح ہونے سے پہلے بکرے کے حلق سے آواز نکلتی ہے۔ یہ سوچتے سوچتے وہ بے اختیار رو پڑی اور دم بخود پڑی ہوئی چھت کی کڑیوں کو تکتی رہی۔

سہ پہر کے سائے گہرے ہو گئے۔ دن ڈھلنے لگا تھا، سہ دری سے ماماؤں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مولسری کے خشک پتے صحن میں کھڑکھڑا رہے تھے۔ نادرہ اسی طرح دم بخود پڑی تھی، ایک بار مُغلانی جی اُس کے پاس آئی تھیں۔ وہ ان سے دردِ سر کا بہانہ کر گئی تھی۔ وہ مغلانی کو اماں کہتی تھی۔ ویسے رشتے میں وہ اُن کی بھانجی تھی، ماں باپ بچپن ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے اس لئے مغلانی ہی نے اس کی پرورش کی تھی اس کا جسم مچھلی کی طرح سڈول تھا۔ کام کاج میں بڑی پُھرتیلی تھی۔ چلبلا پن اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ بات بات پر ہنس پڑتی۔ وہ جس وقت بارہ دری میں آئی تھی ذرا سی بچی تھی اور اب قد و قامت میں طلعت آرا کے برابر ہو گئی تھی، یوں اس کا سن طلعت آرا سے کم تھا۔ دونوں میں بہت اچھی نبھتی تھی۔ مگر حضور بیگم کو اس کا ہنسوڑ پن ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اسی بات پر کئی بار اس کو بارہ دری سے باہر نکل جانے کا حکم مل چکا تھا۔ حضور بیگم کی مار تو اکثر اس کو کھانا پڑتی تھی اور ان کی ہر وقت کی تنبیہہ اس کے لئے اب ایک عام بات ہو گئی تھی۔

شام کا دھندلکا چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ دیوار گیریوں میں ماماؤں نے کنول روشن کر دیئے۔ فانوسوں میں کافوری شمعیں جھلملانے لگیں۔ بارہ دری میں روشنی اور سایوں کا جال پھیل گیا۔ باہر گلی میں بچے شور مچا رہے تھے اس شور میں ملی جلی کہاروں کی آواز اُبھری، مامائیں سارے کام چھوڑ کر ڈیوڑھی کی جانب دوڑیں۔ حضور بیگم جو پہلے سے اُتر کر تھکی ہوئی سی آ کر گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھ گئیں۔

حضور بیگم کو شدت سے پیاس لگی تھی، بیٹھتے ہی پانی مانگا خادمہ نے فوراً پانی کا گلاس پیش کیا اُنہوں نے گلاس لے کر ہونٹوں سے لگایا مگر چند گھونٹ پیتے ہی اُن کے گلے میں پھندا لگا۔ ایک دم اُن کو طلعت آرا یاد آئی، گلاس اُنہوں نے فوراً رکھ دیا اور طلعت آرا کو آوازیں دینے لگیں :۔

”طلعت آرا بیگم! اے طلعت آرا بھئی ذرا یہاں تو آؤ۔“

مگر حضور بیگم کو کوئی جواب نہ ملا اُنہوں نے پھر آواز دی۔ ”طلعت آرا بیگم! اب باہر آ جاؤ دونوں وقت مل رہے ہیں اس وقت لیٹنا اچھا نہیں فرشتے بیماروں میں نام لکھ لیتے ہیں۔“ وہ اپنی دُھن میں کہتی چلی گئیں، لیکن جب طلعت آرا کی جانب سے جواب ہی نہ ملا تو گھبرا کر وہ خود ہی اُس کے کمرے کی جانب چل دیں۔

وہاں جا کر اُنہوں نے دیکھا خالی کمرہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ وہ ایک دم سناٹے میں آ گئیں۔

نادرہ کوٹھڑی میں لیٹی حضور بیگم کی بھاری بھرکم آوازیں سُن رہی تھی۔ اُس نے سوچا کہ طلعت آرا کے کمرے سے نکل کر وہ سیدھی اسی کی طرف آئیں گی اُس نے جلدی سے اُٹھ کر دوپٹے کو ٹھیک سے اوڑھا اور کوٹھڑی سے نکل کر دالان میں آ گئی، اُس کا اندازہ غلط نہ نکلا حضور بیگم اسی طرف آ رہی تھیں۔ نادرہ کو دیکھتے ہی اُنہوں نے پوچھا۔

"اری نادرہ! یہ طلعت آرا کہاں ہے؟"

اُس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا" سرکار! میں نے انکو سہ پہر سے نہیں دیکھا میرے سر میں تو آج بڑا درد ہو رہا ہے۔ میں تو دن بھر پلنگ پر پڑی رہی"

وہ ایکدم سے بپھر گئیں" تیرے سر کے درد پر پڑے خاک اکم بخت! تو اسی طرح ہر وقت فیل مچایا کرتی ہے مُجا! ذرا دیکھ تو چھوٹی بیگم کہاں ہیں"

اب مُغلانی بھی وہاں آگئیں تھیں۔ حضور بیگم ان پر برسنے لگیں" مُغلانی جی! میں تم کو گھر پر اس لئے چھوڑ کے جاتی ہوں کہ تم چھوٹی بیگم کا خیال رکھو گی۔ مگر تم کو کسی بات کا ہوش نہیں"

وہ گھبرا کے پُوچھنے لگیں" سرکار بات کیا ہوئی"

حضور بیگم بولیں" طلعت آرا کہاں ہے؟"

مُغلانی نے فوراً کہا" اے سرکار! آپ تو ذرا کے ذرا میں اپنے کو ہلکان کر لیتی ہیں۔ وہ ہوں گی کہاں اپنے کمرے میں ہوں گی"

میں خود طلعت آرا کے کمرے سے آ رہی ہوں وہاں تو وہ ہے نہیں" لمحہ بھر کے لئے وہ رُکیں اور بیقرار ہو کر کہنے لگیں" یا اللہ خیر کرنا' نہ جانے کیوں میرا دل بُری طرح دھڑک رہا ہے"

مُغلانی مزاج شناس عورت تھی' اُس نے فوراً اُنکو ڈھارس دی۔ کہنے لگی" سرکار! آپ بعض وقت تو بچوں کی سی حرکتیں کرنے لگتی ہیں۔ چھوٹی بیگم اپنے کمرے میں نہیں ہوں گی تو یہیں کہیں گھر میں ہوں گی۔ وہ جائیں گی کہاں۔ آپ بغیر سوچے سمجھے مُنہ سے بات نکال دیتی ہیں"

مُغلانی کی باتوں سے حضور بیگم کو کسی قدر تسلّی ملی' وہ گھبرائی ہوئی سی چھپر کھٹ پر جا کر لیٹ گئیں۔ ایک خادمہ پائینتی بیٹھ کر اُن کے تلوے سہلانے لگی۔ دوسری مورچھل لے کر آہستہ آہستہ اُن کے چہرے کو ہوا دینے لگی۔ حضور بیگم چُپ چاپ لیٹی لمبی لمبی سانسیں بھر رہی تھیں۔

مُغلانی جی اور بارہ دری کی تمام خدمتگاروں نے چپّہ چپّہ چھان مارا مگر طلعت آرا کا کہیں پتہ نہ چلا۔ کئی بار نادرہ نے سوچا کہ وہ جی کڑا کر کے سب کچھ بڑی سرکار سے بتا دے۔ مگر اُن کی مار کے ڈر سے ہر بار اسکی ہمت نے جواب دے دیا۔ وہ خواہ مخواہ سہ دریوں' کمروں اور صحنچیوں میں طلعت آرا کو تلاش کرتی پھر رہی تھی۔

جب طلعت آرا کا کوئی سراغ نہ لگا تو بارہ دری پر ایکبارگی سنّاٹا چھا گیا۔ حضور بیگم دونوں ہاتھوں سے دل دبوچ کر بے حال ہو کر گر پڑیں۔ سرہانے پر کھڑی ہوئی خادمہ نے مورچھل تیزی سے جھلنا شروع کر دیا۔ ہر ایک کے چہرے پر خوف تھا' استعجاب تھا۔ حضور بیگم خاموش لیٹی ہوئی گہری گہری سانسیں بھر رہی تھیں جوان جہان لڑکی کا معاملہ تھا' وہ زبان سے اُف بھی نہ کر سکتی تھیں۔

بہت دیر تک وہ اسی عالم میں پڑی رہیں۔ پھر انہوں نے اُٹھ کر وضو کیا' مصلّے پر آئیں' اور سجدے میں گر پڑیں۔ روتے روتے آنسوؤں سے اُن کا چہرہ بھیگ گیا تھا۔ بارہ دری پر موت کی سی ویرانی طاری تھی' سب خاموش تھے' کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا' نہ کہیں آہٹ تھی' نہ آواز!

رات گہری ہوتی گئی۔ ڈوبتے چاند کی اُداس چاندنی مولسری کی اُونچی اُونچی شاخوں پر لرز رہی تھی' پھاگن کی ہوائیں سسکیاں بھرتی معلوم ہو رہی تھیں' صحن میں خزاں کے مارے ہوئے خشک پتّے کھڑکھڑا رہے تھے۔

حضور بیگم نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ صبح کی آمد آمد تھی۔ ستاروں کی جبینیں دُھندلا گئی تھیں' کافوری روشنی آہستہ آہستہ آسمان کے کناروں پر پھیلتی جا رہی تھی۔ ہوا میں خُنکی آ گئی تھی۔ صحن میں بکھرے ہوئے مولسری کے پھول مہک رہے تھے' کہیں قریب ہی مُرغ نے بانگ دی' اُس وقت زینے میں قدموں (بقیہ صفحہ ۹۴ پر)

"بگھرا" (صفحہ ۴۰ کا بقیہ مضمون)

ہیں جو بگھرا ان پر حملہ کرے" خالہ نے اس بات کو مطلق اہمیت نہ دی۔

"نہیں بٹیا یہ بات نہیں" ناون نے جواب دیا۔

"پھر کیا بات ہے؟"

"اب میں کیا کہوں آپ دونوں میری بیٹیاں ہیں"

"ارے نہیں ناون ممانی ضرور بتاؤ۔ بیٹیوں کو تو ہر اچھی بری بات بتانی چاہیئے۔"

میں نے لجاجت سے کہا۔

"شرم آتی ہے کیسے کہوں" پھر انھوں نے خالہ کے قریب کھسک کر کچھ کھس سے کہا۔

"کیا بات ہے خالہ؟" میں نے بیتاب ہو کر پوچھا۔ مجھے ناون کی یہ حرکت بہت ناگوار گزری۔ داستان سننے کی میں مشتاق اور وہ بتائیں خالہ کو!

"ان ہی سے پوچھو"۔

"بتاؤ نا؟"

"کنواری باری بٹیا سے ایسی بات"—— ناؤن نے جملہ بھی پورا نہ کیا۔

"بھاڑ میں جائے کنوارا پن۔ میں عمر میں خالہ سے بڑی ہوں تم نے ان کو تو بتا دیا" میں نے جل کر کہا۔

"لو وہ خود ہی آگئیں، ان ہی سے پوچھ لینا جن کی بات ہے" خالہ نے صحن کی طرف اشارہ کیا۔ دھوبن کپڑوں کا گٹھر سر پر لئے خراماں خراماں چلی آ رہی تھیں۔

"ارے بھوجی کیا بات ہے؟" میں نے جھٹ سے سوال کیا۔

"کیسی بات بٹیا؟"

"بھئی یہ ناؤن کہہ رہی ہیں کہ رات تمہارے گھر بگھرا آیا تھا" خالہ نے بتایا۔

"ہاں بٹیا آیا تھا۔ آپ کے دھوبی کی آنکھ کھل گئی، اس نے للکارا تو بھاگ گیا"

"سن لیا آپ نے" ناون نے فخر سے کہا۔

"کیا سن لیا"؟ دھوبن نے چونک کر کہا۔

"یہی کہ بگھرا تمہارے ہاں آیا تھا" ناؤن نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں آیا تو تھا" دھوبن نے بھولے پن سے اقرار کیا۔

"مگر ناؤن تو یہ کہتی ہیں کہ"—— خالہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کیا کہتی ہیں"؟

"جو میں نے سنا وہ کہا"

"کیا سنا؟ مجھے بھی تو معلوم ہو؟"

"مجھے کیا پتہ، بڑی ناؤن کہہ رہی تھی"

"کیا کہہ رہی تھی؟"

"بڑی ناؤن سے پوچھ لینا"

"جب تم بٹیا کو بتا چکیں تو مجھے کیوں نہیں بتاتیں؟" ناؤن نے مجبور ہو کر کچھ چپکے سے کہا۔

"ہائے رام! بڑھاپے میں لکھا پھوٹا۔ ناؤن تم کب کی دشمنی نکال رہی ہو؟"

"میری کیا خطا؟ جو بڑی ناؤن نے کہا وہ میں نے کہہ دیا"

"بڑی ناؤن کہہ دے چھوٹی تمہاری ناک کوا لے گیا تو تم مان جاؤ گی"؟

"واہ! میری ناک کیوں کوا لے جاتا؟"

"اب اپنی بات پر مرچ لگی"؟

"ارے بھوجی یہ سب ہے کیا؟ اگر بگھرا تمہارے ہاں آگیا تو اس میں لکھا پھوٹنے کی کیا بات ہے؟" میں کچھ کچھ سمجھ کر بھی بھولی بن گئی۔

"ناؤن کہہ رہی ہے کہ رات بگھرا میرے پلنگ پر

لیٹا سو رہا تھا۔ جب دھوبی اُٹھا تو وہ بھاگا۔ حالانکہ میں کل اندر سو رہی تھی، بگھرا باہر گدھے کے پاس کھڑا تھا۔ دھوبی نے للکارا تو وہ بھاگ گیا۔ اتنی سی بات تھی جس کو ناؤن نے یہ بنا دیا۔" یہ کہہ کر دھوبن اپنا ماتھا پیٹ کر رونے لگی۔

"ارے بھوجی! تو رونے کی کیا بات ہے؟ کوئی ہو تو ایسا جو اتنے خونخوار جانور کو رام کرے۔ سب ہماری بھوجی سے جلتے ہیں۔" میں نے مسکا پالش کی۔

"لاحول ولا قوۃ الا باللہ ——— استغفراللہ! خداوند کریم رحم فرمائے اس قصبے پر۔" خالو میاں توبہ کرتے ہوئے حویلی میں داخل ہوئے۔

"ہاں اور کیا اللہ تعالیٰ اپنا رحم کرے۔ بگھرے کی صورت میں جو بلا ہم پر نازل ہوئی ہے اس کو دفع کرے۔" خالہ نے بھی آمین کہی۔

"میں بگھرے کے لئے نہیں کہہ رہا۔" خالو میاں نے بگڑ کر کہا۔

"پھر؟" خالہ مجسّم سوال بن گئیں۔

"اس قصبے کے لوگ کذّاب ہیں، ان پر بلا نازل ہی ہونی چاہیئے۔" یہ کہہ کر وہ مغرب کی نماز کے لئے مسجد تشریف لے گئے۔

"معلوم ہوتا ہے کہ ایسے ہی جھوٹے قصّے تمہارے خالو خان صاحب کے ہاں سُنکر آئے ہیں۔ جب ہی بگڑ رہے ہیں۔ ہائے بیچارے خان صاحب کا لڑکا"! خالہ نے افسوس کیا۔

"ایک لڑکا گیا مگر کتنے قصّے بن گئے۔ اگر قصبے کی خواتین افسانے لکھنے لگیں تو ان کا شمار چوٹی کے افسانہ نگاروں میں ہو سکتا ہے، اور ناؤن کے افسانے کا تو فلم بھی بن سکتا ہے۔ بگھرا ہیرو ہماری دھوبن ہیروئن۔" میں نے ہنس کر کہا:

"مذاق کی بات نہیں، ہو سکتا ہے کوئی مُجرم آدم خور آدمی بگھرے کی کھال اوڑھ کر آتا ہو۔"

خالہ دور کی کوڑی لائیں۔

"واہ خالہ آپ کا جواب نہیں، یہ جاسوسی ناولز پڑھ کر آپ کہاں سے کہاں پہنچ گئیں۔" یہ کہکر ہم دونوں بھی نماز کے لئے اُٹھ گئے۔

"افسوس کہ بگھرا بھی قرب و جوار میں آتا ہے یہاں نہیں۔" خالو میاں نماز سے فارغ ہو کر آگئے۔

"توبہ کرو، کیوں بدفال بولتے ہو۔ بددعا دینا گناہ ہے۔" خالہ نے ٹوکا۔

"مجھ سے توبہ کرنے کو کہتی ہو مگر اس عدّن جھوٹی لپاٹن سے توبہ نہیں کرواتیں؟ اس کی بات پر فوراً ایمان لے آتی ہو۔ فضول ہی مجھے شرمندہ ہونا پڑا۔"

"ہوا کیا جو اتنا بگڑ رہے ہو"؟

"بگڑ اِس لئے رہا ہوں کہ کچھ نہیں ہوا۔"

"اے واہ! مجھ سے تو ایسی تیکھی باتیں کرنا مت میں کہے دیتی ہوں ہاں۔ خود ہی کہیں مجھے شرمندہ ہونا پڑے اور خود ہی کہیں کچھ نہیں ہوا۔"

"بتا دیجیئے خالو میاں۔" میں نے منّت کی۔ کیونکہ اصل واقعہ جاننے کو میں بیتاب تھی۔

"خان صاحب کا بیٹا ماشاء اللہ اچھا بھلا موجود اور میں پہنچ گیا اس کا پرسا دینے۔"

"اچھا تو بگھرے والی بات غلط ہے"؟

میں تعجب سے اُچھل پڑی۔

"بالکل غلط۔ بات صرف اتنی ہے کہ برابر کے گاؤں میں بگھرا آیا تھا، کسان لاٹھیاں اور بلّم لے کر اس کے پیچھے دوڑے۔ لینا۔ پکڑنا۔ بگھرا ہے۔ یہ آوازیں سُن کر خان صاحب کا بیٹا ڈر گیا اور بگھرا بگھرا پکارتا اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ اتنی سی بات تھی اور عدّن فرماتی ہیں:

" بگھرا کر میل لے گیا" بدبخت کاذبہ "

" مگر خالو میاں، مدّن بیچاری کو تو اب ناون اور گنّی نے مات دیدی، اس لئے اب آپ اپنے دئے ہوئے خطاب واپس لے لیں "

" ہوں "!

" اور ہاں آپ نے کچھ اور سُنا ؟"

" کیا ؟"

" ہماری خالہ کا خیال ہے کہ کوئی آدمی بگھرے کے بھیس میں آتا ہے "

" جی ہاں، جاسوسی ناول پڑھ کر جاسوسہ بننے کی خوش فہمی میں مبتلا ہیں تمہاری خالہ صاحبہ "

" آپ گھر میں جاسوسی ناول پر پابندی لگائیے۔ لکھنے والے خود تو لکھتے لکھتے سڑی ہو ہی گئے ہیں۔ پڑھنے والوں کو بھی پاگل بنائیں گے۔"

* * *

* *

وفا براہی

غزل

ساقیا دے وہ بادۂ سر جوش ۔۔۔ جس سے سارا جہان ہو مدہوش

سازِ غم میں بھرا ہوا ہے جوش ۔۔۔ کس نے چھیڑا ہے نغمۂ خاموش

ہے یہ اعجازِ پیرِ مے خانہ ۔۔۔ کوئی سرمست ہے کوئی بیہوش

سر پٹکتا رہا میں اُس در پر ۔۔۔ اور دُنیا کھڑی رہی خاموش

کس نے دیکھا ہے مست آنکھوں سے ۔۔۔ بے پیئے ہو رہا ہوں، میں مدہوش

جس میں پنہاں سکونِ دائم ہو ۔۔۔ اصل میں وہ ہے موت کی آغوش

کیوں دکھا کر وہ جلوۂ تاباں ۔۔۔ ہو گیا ہے نگاہ سے روپوش

دے رہے ہیں ہوا، وہ دامن کی ۔۔۔ یا خدا اب نہ آئے مجھ کو ہوش

باعثِ فخر تھا جو دُنیا میں ۔۔۔ اب وہی سر ہوا وبالِ دوش

پارسا تھا وفا۔ مگر ساقی
تیری نظروں نے کر دیا مے نوش

کرشن موہن

فقط الفاظ کا بُت گر ....

"الف" گرتا ہے "یا" بھی دب رہی ہے دیکھئے صاحب
مگر پہچان اچھے شعر کی یہ کب رہی ہے دیکھئے صاحب
پڑھے جائیں اگر پوری طرح سب حرف تو بہتر
وگرنہ ایک اچھا شعر ہو سکتا نہیں کہتر
کہ اچھائی برائی منحصر معنی پہ ہوتی ہے
بسا اوقات یہ دیکھا
زباں ہنستی ہے جن اشعار میں، تخئیل روتی ہے
اگر احساس سے عاری ہے فن پارہ
تو ہے بے رنگ و ناکارہ
اگر تخئیل سے محروم ہے شاعر
تو ہے بے بال و پر طائر
مزا جب ہے کہ ہوں اشعار ڈوبے کیف و مستی میں
وگرنہ نثر پژمردہ کی پستی میں
اترتے ہیں، سنبھل پاتے نہیں الفاظ کے بل پر

....

ادب کو حُسنِ معنی سے مزیّن کر
فرو تر ہے فقط الفاظ کا بُت گر

تعارفِ کتب

جگن ناتھ آزاد اور اُنکی شاعری :- از حمیدہ سلطان احمد۔ ناشر مکتبۂ شاہراہ دلی۔ قیمت پانچ روپے۔

یہ تصنیف جگن ناتھ آزاد پر تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس کو حمیدہ سلطان احمد نے جمع کیا اور اپنے پیش نامے کے ساتھ شائع کیا۔ پیش نامے میں محترمہ نے لکھا ہے کہ آزاد کی شاعری جدید ہے اور ارتقا پسند۔ اس ادبی آشوب کے زمانے میں اُن گنتی کے شعرا میں آزاد کا شمار کیا جاتا ہے جن کی قادر الکلامی کا سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔" پیش نامے میں بہت سے چھوٹے چھوٹے اقتباسات ہیں جو ہندوستان کے معروف جرائد سے جمع کئے گئے ہیں۔ مجموعے کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلا حصّہ شخصیت اور شاعری کا ہے جس میں مضامین ہیں جو فراق گورکھپوری کے "ابتدائیہ" سے شروع ہوتا ہے اور یہی مضمون اس حصّے میں شامل ہے۔ دوسرا حصّہ تصانیف کی سُرخی کے تحت آزاد کے مجموعہ "بیکراں" اور "ستاروں سے ذرّوں تک" پر مختلف مضامین کو ایک جگہ جمع کرتا ہے۔ "بیکراں" پر خواجہ احمد عباس اور مخمور جالندھری کے مضامین اور "ستاروں سے ذرّوں تک" پر وقار عظیم اور آل احمد سرور کے تبصرے خاص طور پر توجہ کے قابل ہیں۔ مجموعے میں چھ تصویریں بھی ہیں جن میں آزاد ہند و پاکستان کے بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ پوری کتاب کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ آزاد اردو کے شعرا میں جو تقسیم کے بعد اُبھرے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اصل میں تقسیم سے جو اُن کے دل پر چوٹ لگی اُسی نے اُنکو بڑا شاعر بنا دیا۔ وطن کی یادوں نے جس درد و غم کو اُبھارا وہ غزلوں کے قالب میں ڈھل کر اعلیٰ شاعری بن گیا۔ اُردو کی غنائی شاعری کی روایت میں میر کا غم بڑی اہمیت رکھتا ہے مگر آزاد کا غم غمِ دوراں ہے جو غمِ جاناں کا جامہ پہن کر سامنے آتا ہے۔ اُن کا تیسرا مجموعہ "وطن میں اجنبی" ہے جس پر زیرِ نظر تصنیف میں عبدالمجید سالک کا ریویوان کے اِس غم کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔ سالک صاحب لکھتے ہیں :-

" جگن ناتھ آزاد کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت درد و اثر ہے جو خلوصِ احساس کے بغیر ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔" آزاد اسم با مسمیٰ ہیں، لگی لپٹی نہیں رکھتے، کھُل کر اور بے باکی سے کہتے ہیں۔ یہ بھی اُن کا ایک وصفِ خاص ہے۔"

۱۹۶۳ء کے منتخب افسانے۔ نقد و نظر اور پرکھ۔ از ڈاکٹر احراز نقوی۔ ناشر میری لائبریری، لاہور۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے۔

یہ بھی "ہماری لائبریری" کی سستی کتابوں میں ایک نیا اضافہ ہے۔ مُرتّب جن کی تصویر اور سوانح سے ٹائٹل کی پُشت مُزیّن ہے ابھی سرشار کی ناول نگاری پر لکھنؤ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری لے کر آئے ہیں اور اس مجموعے سے اپنی نظر اور پرکھ کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے بہترین کے بجائے منتخب کا لفظ

سُرخی میں استعمال کرنے کی بہت معقول وجوہ بتائی ہیں۔ ۱۹۶۳ء کے کئی ایسے افسانے جو ہر انتخاب میں جا ہے وہ کسی قسم کا ہو "نا ضروری تھے جن کی طرف کسی وجہ سے توجہ نہیں کی گئی۔ برخلاف اس کے کچھ ایسے افسانے بھی شامل کر لئے گئے ہیں جو چاہے اچھے کہے جا سکیں مگر کسی سال کے منتخب افسانوں میں جگہ پانے کے قابل نہیں کہے جائیں گے۔ بہرحال احرار صاحب کی یہ دکھانے کی کوشش کہ اردو افسانہ نہ جمود کا شکار ہے اور نہ مرا ہے پورے طور پر مقدمہ اور انتخاب دونوں سے کامیاب ہو گئی ہے۔ احرار صاحب کے مقدمہ کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ان افسانوں پر بھی فرداً فرداً تبصرہ کیا ہے جو انتخاب میں شامل ہے۔ افسانوں کی تعداد بارہ ہے۔ ان میں آٹھ افسانے تو اُن کے ہیں جو افسانہ نگاری میں نام پیدا کر چکے ہیں اور جن کا نام ہی ان کے افسانے کے اچھے ہونے کی ضمانت ہے، باقی چار ایسے لوگوں کے ہیں جو ابھی اُبھر ہی رہے ہیں۔ آخری افسانہ نگار خاتون کے بابت احرار صاحب نے لکھا ہے کہ "خالدہ ابھی بالکل نئی ہیں۔ گنتی کے ابھی چند افسانے لکھے ہیں، فکر و فن کی مبتدیانہ اور غیر مبتدیانہ معائب سے قطع نظر تیور اور انداز اس اُبھرتی ہوئی فن کار کی مبارک پیشین گوئیاں کر رہے ہیں۔ ان کے تمام افسانوں میں خامیوں سے زیادہ خوبیوں کے اعتبار سے "شہر پناہ" خود ان کے افسانوں میں اور ۱۹۶۳ء کے منتخب افسانوں میں بھی بڑی نُدرتوں کا حامل ہے۔"

"۱۹۶۳ء کے منتخب افسانے" پڑھنے کے بعد ہمیں یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ اردو افسانہ برابر ترقی کر رہا ہے۔

"پیاسی بیل":۔ از مانک ٹالہ۔ ناشر جیو پیٹر پبلشرز بمبئی۔ قیمت چار روپے۔

یہ مانک ٹالہ صاحب کے اٹھارہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے، جو ہندوستان کے مختلف رسالوں اور انتخابوں میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ مثلاً "معجزہ" ایک بڑی گہری حقیقت کا بڑے نفیس پیرائے میں نقشہ کھینچتا ہے۔ دوسرے افسانے بھی جیسے "کھوکھلے انسان" حقیقت بیں نظر کی مثال پیش کرتے ہیں۔ فنکاری کے سلسلے میں بھی مانک ٹالہ صاحب نے بڑی چابکدستی کا ثبوت دیا ہے۔ اگر کوئی افسانہ فن کے اعلیٰ مدارج تک نہیں پہونچتا تو کوئی فن کے اوسط درجے سے گرتا بھی نہیں۔ ہر افسانہ شعور سے لکھا گیا ہے اور اتحادِ تاثر سے معمور ہے۔ کہیں بھرتی یا محض سنسنی خیزی نہیں ہے۔ ان افسانوں کی سب سے نمایاں صفت واقعیت ہے مُصنّف نے اپنے گوناگوں تجربوں کو بہت دلچسپ طریقے پر نمایاں کیا ہے۔ ہندوستان کی معاشرت کے وہ وہ پہلو سامنے آئے ہیں جو اب تک عام نظر سے اوجھل تھے اور جن پر دوسرے مُصنّفین نے اب تک توجہ نہیں دی تھی "حرفِ اوّل" مشہور مُصنّف جوگندر پال نے لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں "مانک ٹالہ شروع سے ہی حقیقت پسند رہا ہے اور ایک ادیب کی حیثیت سے اس کی اولین وفاداری ہمیشہ ادب سے وابستہ رہی ہے یعنی کسی انسانی جماعت سے وابستہ ہونے کی بجائے انسانی فطرت سے متعلق ہے" مُصنّف نے خود "اپنی کہانی" کے عنوان سے اپنے حالات کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری کے سلسلے میں اپنے نظریات کا بھی اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں "میں کہانی برائے راست زندگی سے حاصل کرتا ہوں اور کہانی جب تک میرے دل و دماغ کی گہرائیوں میں رچ بس نہ جائے میں اُسے صفحۂ قرطاس پر قلم بند نہیں کر سکتا، یہی وجہ ہے کہ اپنی انگنت

سیاحتوں کی گوناگوں دلچسپیوں اور تجربوں کے بحرِ بیکراں کی وسعتوں اور گہرائیوں سے صرف چند گوہرِ نایاب ہی نکال سکا۔ پھر فرماتے ہیں" میں کہانی کو صرف دماغی تعیش پسندی کا ذریعہ نہیں سمجھتا بلکہ ادب میں مقصدیت کا قائل ہوں لیکن میری مقصدیت کا راستہ کسی ازم کی قربان گاہ سے ہوکر نہیں گزرتا اور اگر کہیں سے ہوکر گزرتا بھی ہے تو وہ ہے انسان دوستی اور انسانیت کی ارفع و اعلیٰ اقدار کا صنم کدہ"۔ ان جملوں سے ان کے فنی شعور اور طرزِ ادا دونوں کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

~~~

"مینا بازار": قیمت ۳ روپے ۵۰ پیسے۔ ناشر: کتاب نما۔ ۱۷۰، انارکلی۔ لاہور۔

کرشن چندر ہمارے ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن کے افسانوں کا ہمیں انتظار رہتا ہے۔ اُن کے ہر افسانے میں کوئی انوکھی بات ضرور ہوتی ہے۔ روزمرّہ کی زندگی میں اُن کی آنکھیں اُن باتوں کو دیکھ لیتی ہیں جو یا تو ہمیں نظر نہیں آتیں یا جنھیں ہم دیکھکر بھی کوئی اثر قبول نہیں کرتے۔ اِنہی چھوٹی چھوٹی باتوں کو کرشن چندر کچھ اس خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں کہ اُن کی بدنمائی مکمل و مجسّم ہوکر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اُن کے بارہ افسانوں کا مجموعہ" مینا بازار"کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ہر افسانہ پڑھنے کے لائق ہے۔ کتاب بہت خوبصورت شائع ہوئی ہے۔ مجلد ہے اور جلد پوش سے آراستہ۔

"شام اور سائے": قیمت دو روپے۔ ناشر: جدید ناشرین، چوک اُردو بازار لاہور۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی پہلودار شخصیت ادبِ جدید میں ایک اہم حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے طنز و ظرافت پہ ایک ضخیم کتاب لکھکر ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا۔ نہایت شائستہ ادب پارے لکھکر ایک کمیاب صنفِ ادب کو فروغ دیا۔ تنقید و تبصرہ میں ایک نیا ڈھنگ وضع کیا اور شعر و شاعری میں ایک نیا اسلوب اختیار کیا۔ اُردو کی جدید تر شاعری کے بڑھتے ہوئے ابہام نے شاعری کو ایک معمّہ بنا دیا ہے۔ وزیر آغا کی نظموں میں ابہام نہیں ہے بلکہ بلیغ اشارے ہیں۔ مادّی وجودوں اور خارجی مظاہر کو زندگی کے محسوس جذبوں سے متّصف کرنا اِن کا وصفِ خاص ہے۔ اِس نُدرت نے ان کی منظومات کو ایک لذیذ انفرادیت بخش دی ہے۔ "شام اور سائے" میں وزیر آغا کی ایسی ہی (۶۲) نظمیں شامل ہیں۔ جتنا دلکش اِس کتاب کا باطن ہے اُتنا ہی اس کا ظاہر بھی ہے۔

"چراغِ دیر و حرم": قیمت چار روپے۔ ناشر: بارگاہِ ادب۔ $\frac{\text{۵}}{\text{۱۳۰۲}}$ ڈرگ کالونی کراچی (۲۵)

ڈاکٹر صفدر حسین کی جدّت طراز شخصیت کا پہلا مجموعۂ منظومات "رقصِ طاؤس" کے نام سے شائع ہوکر مشہور و مقبول ہو چکا ہے۔ اب اُن کا مجموعۂ غزلیات "چراغِ دیر و حرم" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں پاکیزگی کو بڑا دخل ہے۔ یہی پاکیزگی ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ آجکل کی یاوہ گوئی سے ان کا کلام پاک ہے۔ حُسن و عشق کے معاملات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ثقہ طبیعتیں ان سے نفور نہیں ہوتیں۔ غزل کی شاعری اور بھی زیادہ احتیاط کا مطالبہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر صفدر کی پیشِ نظر غزلیات میں یہی محتاط اور سنبھلی ہوئی کیفیت پائی جاتی ہے۔ غزل گوئی میں ڈاکٹر صاحب روایت کی پابندی بھی کرتے ہیں مگر درایت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ان کی غزل میں مومن و غالب سے لیکر حسرت و فانی تک ہر اُستاد کا رنگ جھلکتا ہے۔ لو سے لو چراغ سے چراغ جلتا ہے اور تنویر بڑھتی رہتی ہے۔ یہ مجموعہ تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصّہ ۱۹۴۲ء سے
~~~

۱۹۶۲ء تک کی غزلوں پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۳ء تک کی غزلیں ہیں، اور تیسرے حصے میں متفرق اشعار ہیں۔ ان کے مطالعہ سے شاعر کے ذہنی ارتقا کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خوش اسلوبی ابتدائی اشعار میں بھی پائی جاتی ہے مگر بعد کے اشعار میں سنجیدگی اور بُردباری فلسفیانہ نکتہ سنجی کی حد کو پہونچ گئی ہے۔ اس مجموعہ میں ایک باب کا اضافہ اور ہونا چاہیئے تھا جس میں ۱۹۶۲ء کے بعد کا کلام شامل ہوتا۔

"راگ رنگ":- قیمت ڈھائی روپے۔ ناشر:- کتاب نما۔ ۱۷۰، انارکلی - لاہور۔

ہماری موسیقی ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت کم لکھا گیا ہے، اور جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اس قدر اُلجھا ہوا ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے آدمی ان کتابوں سے مستفیض نہیں ہو سکتے۔ جن کے پاس یہ فن ہے اُن کے پاس اس کا علم نہیں ہے۔ یا جنھوں نے کتابوں یا سُنی سُنائی باتوں سے اس کا علم حاصل کر لیا ہے وہ اس کے عملی پہلو سے واقف نہیں ہیں۔ اور اگر حسنِ اتفاق سے کسی نے علم و فن دونوں پر عبور حاصل کر لیا تو وہ اسے کنجوس کے مال کی طرح چھپا کر رکھتا ہے۔ ان نادروں نے اپنی لاعلمی سے اِسے بہت کچھ مسخ کر دیا اور اس فنِ لطیف کو بازی گری میں تبدیل کر دیا۔

ہمارے ملک میں موسیقی کی کوئی درس گاہ بھی نہیں ہے، لہٰذا ہمارا یہ بیش قیمت ثقافتی ورثہ ناقدری کے ہاتھوں برباد ہوتا چلا جا رہا ہے۔ خوشی کا مقام ہے کہ عنایت الٰہی ملک صاحب نے دو سال ہوئے ایک کتاب "سُر سنگیت" کے نام سے ہماری موسیقی پر لکھی اور اب اُن کے دستیٰ مضامین کا مجموعہ "راگ رنگ" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یقین ہے کہ ملک صاحب کی اِن دو کتابوں سے اس دَم توڑتے ہوئے فن کو زندہ رہنے میں مدد ملے گی۔ ملک صاحب نے عام فہم پیرایہ اور آسان زبان میں موسیقی کی تاریخ، جمالیاتی اقدار، علم و فن، سبھی پر بہت مفید معلومات مُہیّا کر دی ہے۔ اُمید ہے کہ ان کی یہ دونوں کتابیں شوق سے پڑھی جائیں گی اور ملک صاحب کا مفید سلسلۂ نگارش جاری رہے گا۔

شامِ اودھ (بقیہ سلسلۂ صفحہ ۵۶)

کی چاپ سنائی دی۔ کوئی آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہا تھا۔ حضور بیگم ابھی تک جاگ رہی تھیں روتے روتے اُنکی آنکھیں سُوج گئی تھیں، اُنہوں نے اپنے کمرے سے جھانک کر صحنچی کی جانب دیکھا۔ طلعت آرا زینے سے نکل کر باہر آگئی اُس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں، چہرے پر پہلی رات کی دُلہنوں کا نکھار تھا، وہ لباس عروسی پہنے تھی گردن میں مرجھایا ہوا پھولوں کا گجرا پڑا تھا۔ گہرے سُرخ لباس میں اُس کے رُخسار تمتما رہے تھے، طلعت آرا کچھ دیر کیلئے ٹھٹکی، پھر گردن جُھکاتے ہوئے خاموشی سے اُن کے کمرے میں چلی گئی۔

حضور بیگم نے اُس کی یہ سج دھج دیکھی تو دم بخود رہ گئیں، اُن کے دل پر گہری چوٹ لگی۔ بہت دیر تک وہ گُم سُم بیٹھی رہیں۔ پھر ممتا نے جوش مارا تو وہ اُٹھ کر طلعت آرا کے کمرے میں پہنچ گئیں۔ لمحہ بھر اُسکے قریب خاموش کھڑی رہیں، اسکے بعد اُنہوں نے اُسکو اپنے سینے سے چمٹا لیا اور بے اختیار رو پڑیں۔ طلعت آرا کا سارا جسم عطرِ سہاگ سے مہک رہا تھا۔ نہ اُسکی آنکھ سے آنسو ٹپکا نہ اُس نے زبان سے کوئی بات کی کھوئی کھوئی سی چپ چاپ بیٹھی رہی۔ حضور بیگم نے بھی اُس سے ایک لفظ نہ پوچھا اُنہوں نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں خشک کیں طلعت آرا کی پیشانی پر

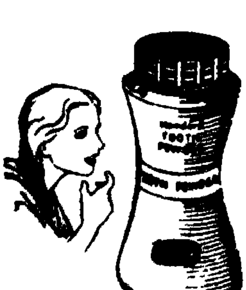


احمد
کراچی حلوہ مرچنٹ
اسپشلسٹ
کراچی حلوہ
سوھن حلوہ اور حبشی حلوہ
سربند ڈبوں میں
پاکستان کے علاوہ غیر ممالک
میں بھی پسند کیجاتی ھیں
KARACHI HALWA
KEEP IN A COOL PLACE
Halwa Sohan
SOHAN HALWA, KARACHI
HABSHI Halwa SPECIAL
1 lb. No 11.



تجربہ شاہد ہے

آپ کے دانت اور مسوڑے آبگینوں
کی طرح نازک ہوتے ہیں۔ ذرا سی
لاپروائی اُن میں کیڑا لگنے اور پائریا
جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو جانے کا
سبب بن سکتی ہے۔ اس حقیقت سے
کبھی غافل نہیں ہونا چاہیے
کہ معمولی صفائی اور خالی خولی چمک
اُن کو گلنے سڑنے سے نہیں بچا سکتی۔ اس کا تو
ایک ہی علاج ہے، وہ یہ کہ مسوڑھوں کو برابر طاقتور اور
صحت مند رکھا جائے اور مُنہ میں پرورش پانے والے ان زہریلے
عناصر کا قلع قمع کیا جائے جو دانتوں کے جوہر کے لئے سم قاتل ہیں۔ اس غرض
کے لئے ہمدرد [illegible] استعمال کیجئے جسے ہمدرد دواخانے نے سالہا سال کے تجربوں
کے بعد مکمل کیا ہے۔ یہ دانتوں کی مضبوطی اور مسوڑھوں کی صحت کے لئے اکسیر ہے۔
ہمدرد منجن دانتوں کو قدرتی طور پر چمکاتا ہے اور اُن تیزابی مادوں کو ختم کر دیتا ہے جن سے
زہریلے جراثیم مُنہ میں پرورش پاتے ہیں۔

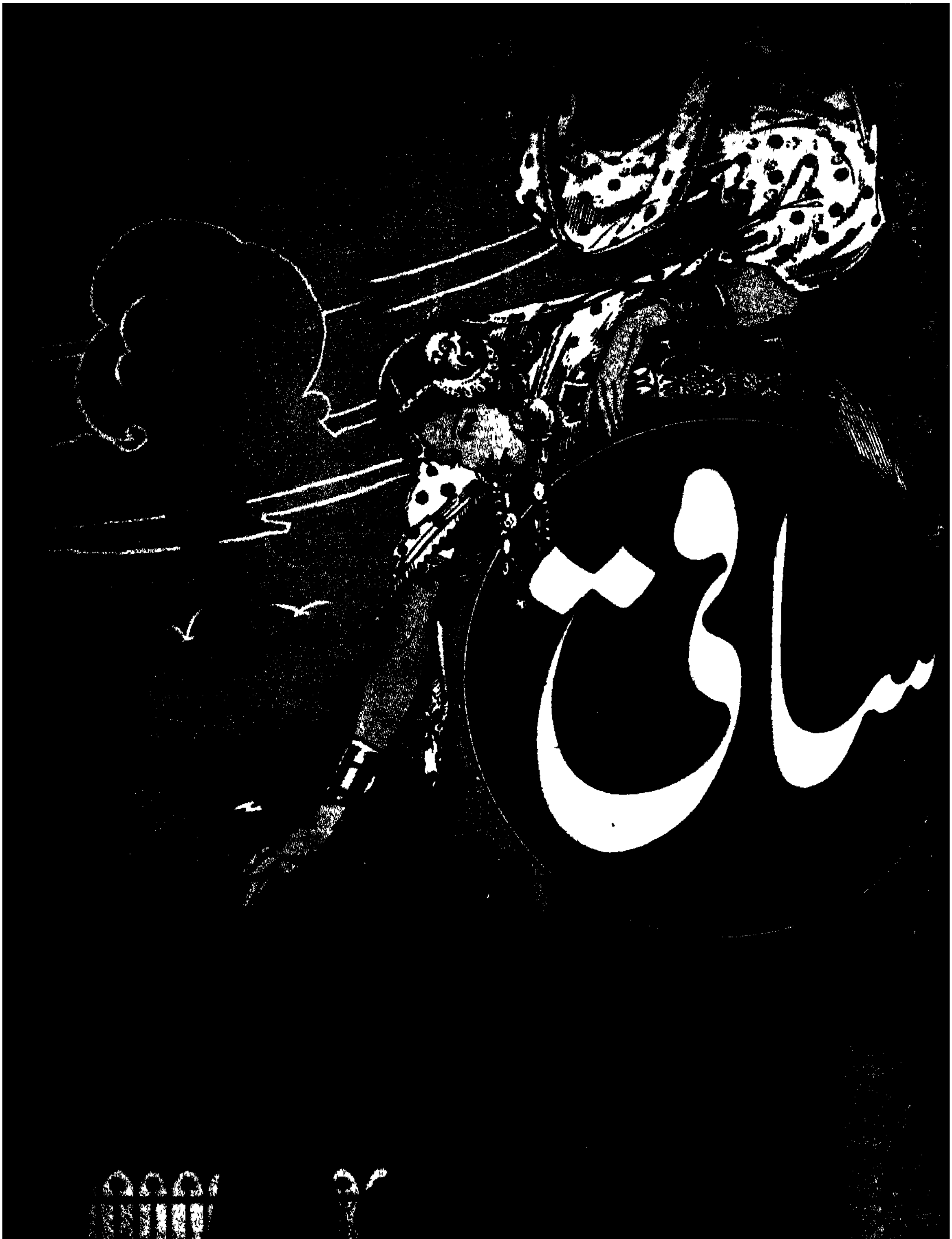


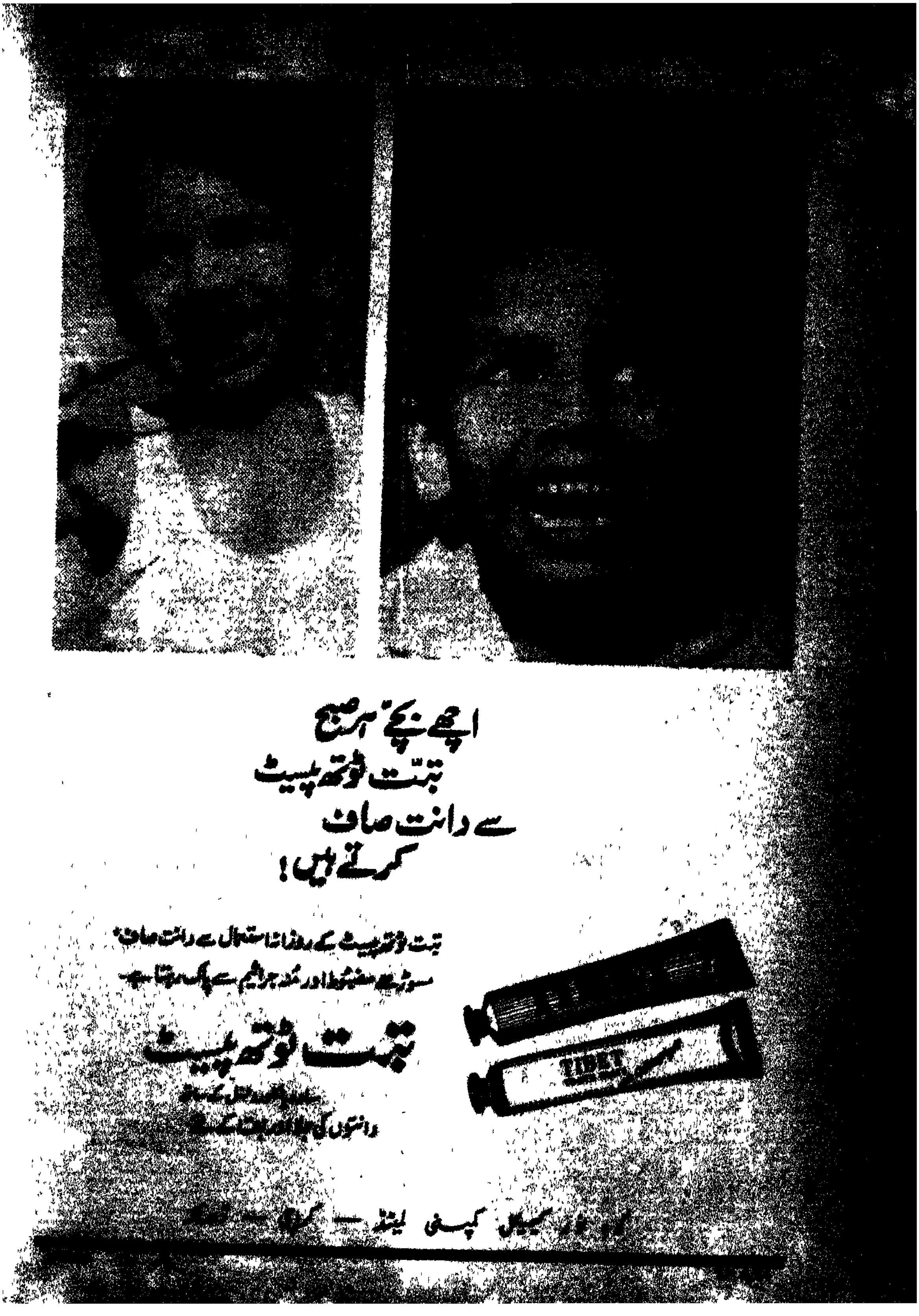
ہمدرد منجن

مسکراہٹ میں کشش اور دانتوں میں سچے موتیوں کی چمک پیدا کرتا ہے

ہمدرد

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی۔ لاہور۔ ڈھاکہ۔ چٹاگانگ


ساقی



اچھے بچے ہر صبح
تبت ٹوتھ پیسٹ
سے دانت صاف
کرتے ہیں!
تبت ٹوتھ پیسٹ کے روزانہ استعمال سے دانت صاف،
سوڑھے مضبوط اور منہ جراثیم سے پاک رہتا ہے
تبت ٹوتھ پیسٹ
TIBET
کیمیکل کمپنی لمیٹڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(چھتیسواں سال اشاعت)

مدیر
شاہد احمد دھلوی

معاون
عاصمہ بیگم

سالانہ چندہ
مع خاص نمبر
پاک و ہند دس روپے
قیمت فی پرچہ ۵۰ پیسے

جرعات

جلد ۷۱ | ساقی - کراچی - بابت فروری ۱۹۶۵ء | نمبر ۲

بھارت میں ساقی کا چندہ بھیجنے کا پتہ:- عظیم کتاب گھر ۲۴۶۳ زنگ محل خورد - پھاٹک حبش خاں، دھلی۔

(ناشر عاصمہ بیگم نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر پی-آئی-بی کالونی کراچی ۵ سے شائع کیا)

محمد احسن فاروقی

ادب اور عصریت

ہر ادب دوسرے دَور کے ادب سے مختلف ہوتا ہے اور اپنے دَور کا نمائندہ ہوتا ہے۔ یوں تو حیات اور کائنات ایک ہے اور منفرد ہستی ہر دَور سے بالاتر ہوتی ہے مگر یہ مسلّم ہے کہ ہر دَور میں وہی ادب سب سے زیادہ مقبول ہوتا ہے جو اس دَور کا نمائندہ ہو اور پھر آگے چل کر بھی اس میں اس کے دَور کی خصوصیات نمایاں رہتی ہیں۔ آجکل ادب کی عصری خصوصیات پر یہاں تک زور دیا گیا ہے کہ ادب بھی سوشل تاریخ کی ایک شاخ ہو گیا ہے۔ یہ صورت ہمارے طریقہ تعلیم کی وجہ سے ظہور میں آئی ہے۔ آجکل ادب کی تعلیم کے سلسلے میں کسی ملک کے ادب کو ادوار میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور ہر دَور کا ایک الگ پرچہ مقرر ہو جاتا ہے۔ اسکو پڑھانے کے سلسلے میں معلمین سب سے زیادہ زور دور کی خصوصیات پر دیتے ہیں اور جب فرد ادیبوں پر آتے ہیں تو انہیں ان کے دَور کی خصوصیات ہی کا سب سے زیادہ ذکر کرتے چلتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ادب کو اپنے دَور کے نمائندے کی حیثیت ہی سے دیکھا جا رہا ہے۔ ادب پر تنقیدی نظر حاصل کرنے کے لئے ادب کی تاریخوں کا مطالعہ عام ہے اور کیونکہ یہ تاریخیں ہیں یہ ادب کے تاریخی پہلو پر زیادہ زور دیتی ہیں اور ان کا پڑھنے والا اسی حد تک پہونچتا ہے کہ عصری عناصر ہی کو تمام ادب سمجھنے لگتا ہے۔ پھر جدید ترین رجحانات نے سیاسیات و ادب کو ایک دوسرے کا لازم و ملزوم ٹھہرا کر ادب پاروں کو محض عصر کی تاریخ کے نمونے قرار دیدیا ہے یہاں تک کہ ادیب کی انفرادیت کی طرف توجہ بالکل بے معنی ہو گئی ہے اور ادب کی دائمی قیمت کا سوال پس منظر میں آ گیا ہے اور جب کہیں ادب پر باتیں ہوتی ہیں اور کسی ادیب کا نام آ جاتا ہے تو اس کے عہد ہی پر گفتگو ہونے لگتی ہے۔ امریکہ سے تنقیدی کتابیں جو آ رہی ہیں اُن میں جو ادیب بھی موضوع ہوتا ہے اُسے اس کے دَور کے واقعات سے اسقدر جزئیات سے وابستہ دکھایا جاتا ہے کہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ جب تک ہم پُورے طور پر اس کے عہد میں نہ پہونچ جائیں اُسے سمجھ ہی نہیں سکتے اور اُس کے ماحول کے جتنے زیادہ باریک سے باریک امور سے ہماری واقفیت ہو گی اتنا ہی اچھا ہم اُسکو سمجھیں گے۔ جدید شاعروں اور ادیبوں کا مطالعہ بھی اسی طرح ہوتا ہے کہ جدید دَور کے رُجحانات کو وہ کہاں تک ادا کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں بحثیں بھی ہوتی ہیں جن سے متضاد نظریئے ظہور میں آئے ہیں۔ ایک حد یہ ہے کہ لوگ فن کی دائمی خصوصیت ہی کو اہم قرار دینے کے سلسلے میں عصری خصوصیات سے منحرف ہو گئے ہیں اور دوسری حد پر لوگ عصری خصوصیات ہی کو سب کچھ کہہ کر انفرادیت اور دوام کو بھی عصریت کی ایک نوعیت بتانے لگے ہیں ہمیں یہاں اس قسم کی بحثوں سے سروکار نہیں ہے۔ ہمیں صرف یہ واضح کرنا ہے کہ عصری خصوصیات بھی ادب کا اہم حصہ ہوتی ہیں۔

عصر کا رُجحان اپنی جگہ پر ایک مسلّم حالانکہ پُر اسرار حقیقت ہے۔ یہ ایسی زبردست طاقت ہوتا ہے جو زندگی کو

مکمل طور پر یعنی اس کے ہر پہلو کو گہرے طریقے پر متاثر کرتا ہے اور ادب بھی اُس کی رو میں آکر مخصوص نوعیت اختیار کئے بغیر نہیں رہتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سولہویں صدی میں یورپ میں ایک دور شروع ہوا جسکو نشاۃ الثانیہ کہا جاتا ہے اُس کے بہت سے اسباب بتائے جاتے ہیں۔ اُس کی خصوصیات کی تشریح ہوتی ہے اور سب سے خاص طور پر اس کے ادب پر اثرات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس دور نے یورپ کے ہر ملک میں ایک نئی روشنی پھیلا دی اور وہ وہ ادبی ہستیاں اُبھاریں جو دائمی طور پر اہم ہیں اور جن کے مقابلے میں مابعد کی کوئی ہستیاں نہیں لائی جا سکتیں۔ اٹلی کے مصوروں اور سنگ تراشوں سے قطع نظر اسپین میں سروانٹیس (   ) فرانس میں مونتین (   ) اور ربیلا (   ) انگلستان میں شیکسپیئر (   ) اور بیکن (.   ) کو اس کے اہم ترین نمائندے کہا جاتا ہے۔ اس عہد میں ادب کو ایک نئی راہ پر لگانے کی تحریک ہوئی جو فرانس میں تین شاعروں نے شروع کی جنکو پلی ایڈ (   ) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہوں نے قرون وسطیٰ کی روایات پر مبنی مردہ شاعری کو ختم کر کے قدما کی روایات اور قومی خصوصیات کے امتزاج سے شاعری میں ایک نئی رُوح پھونک دی۔ انکی تقلید میں انگلستان میں اسپنسر (   ) نے انگریزی شاعری کو ایک نئی زندگی دی۔ اس وقت جب ہم ان تمام مشاہیر ادب اور انکے اُن سے کم درجہ کے معاصروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اُن میں نشاۃ الثانیہ کی خصوصیات ہی سے زیادہ تر سروکار رکھتے ہیں۔ انکی ہر خوبی اور خامی کو انکے دور ہی سے متعلق کر کے دیکھتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی ادبیت یہی ہے کہ وہ اپنے عصر کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ انکی عصریت ہمارے دور کے لئے معنی خیز اور رہنما ضرور ہے مگر یہ بعد کی بات ہے پہلی بات یہ ہے کہ اُن کے ادب کا ذکر آتے ہی ہم ادبیت اور عصریت کو ہم معنی کر دیتے ہیں۔

ہمارے یہاں بھی انگریزی حکومت قائم ہو جانے کے بعد سے ایک نئی روشنی پھیلی جس کا اثر ادب پر اس وقت تک جاری ہے۔ سر سید احمد خاں اس رُجحان کے لیڈر رہے اور حالی نے اس کے اثر کے ماتحت اردو شاعری کو ایک نیا ادراک دیدیا۔ اسی ادراک کا کمال ہمیں اقبال کے یہاں ملتا ہے۔ میں نے کہیں اور اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ اقبال کی ہر طبقے اور ہر مدرسۂ خیال کے لوگوں میں اس قدر اور روز افزوں مقبولیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ ہمارے دور کے مکمل ترین نمائندے ہیں۔ خیالات کی دُنیا میں جن جن قدیم اور جدید خیالات کو ہم اہمیت دیتے ہیں اور طرز کے سلسلے میں جن جن روایتی اور جدید چیزوں کو ہم قبول کرتے ہیں وہ انکے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی محفل ہو اور کسی بھی قسم کی ہو اُن کے اشعار کو کام میں لائے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ اسلام اور مغربیت کا جو امتزاج ہم چاہتے ہیں اور جس طرح سے چاہتے ہیں وہ انکے یہاں ہی ملتا ہے۔ وہ بھی ہر اُس مرحلے سے گزرے جس سے آجکل کا ہندوستانی مسلمان ہم کنار رہا۔ وہ بھی پہلے ہندوستانی قومیت کے دلدادہ تھے اور "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کا گیت گاتے تھے مگر وہ بھی اس قومیت میں مسلمانوں کے لئے جو خطرہ تھا اُسکو دیکھ کر بدل گئے۔ اور "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" کے راگ پر آ گئے۔ اسی طرح دکھایا جا سکتا ہے کہ وہ یورپ کے تمام فلسفوں کی راہ سے آخر کو اسلام پر پہونچے جو آجکل کا ہر مسلمان چاہتا ہے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کی شاعری کی اہم ترین خصوصیت اس وقت ہمارے لئے اُس کی بے پناہ عصریت ہے۔

ان کے بعد ہمارے یہاں ایک گروہ ابھرا جس نے عصریت کو یہاں تک اہمیت دی کہ ادب کا معیار یہ بنایا کہ وہ بدلتی ہوئی اور ہنگامی قدروں کا ساتھ دے۔ تاکہ وقعت کے قابل ہو، یہ لوگ زیادہ تر اشتراکیت کے پروپیگنڈسٹ تھے اور جس طرح روس میں ادب کو اشتراکیت کے عام کرنے کا ذریعہ بنایا گیا تھا ویسے ہی اُردو ادب کو بھی یہ لوگ استعمال کرنا چاہتے تھے، مگر انکا عصریت پر یہ زور اس زمانے کی ایک عالمگیر ادبی خصوصیت سے ہمکنار ضرور تھا اور اس لئے انکو پورے طور پر رد نہیں کیا جا سکا۔ اُنیسویں صدی کے آخر سے ایک خاص قسم کا ادب اُبھرا جس کی نمائندہ صورتیں سوشل ڈرامے اور ناول ہیں، ایسے مصنفین نے جدید دور کے اہم مسائل کو اپنا موضوع بنایا، اپنے قصّوں اور کردار کو اس طرح ڈھالا کہ وہ خیالات کے نمائندے اور اشارے پہلے ہوں اور جیتی جاگتی زندگی کے ترجمان بعد میں۔ اقبال نے بھی شاعر کو دیدۂ بینائے قوم کہا اور اس رُجحان سے آگے بڑھ کر اس کلیہ پر آجاتا کہ ادب اپنے دَور کی ترجمانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے کچھ زیادہ مبالغہ نہ نظر آیا۔ ساتھ ہی ساتھ ہماری صدی میں ایک ادب نما چیز اُبھری جسکو ادب سے مختلف کرنے کے لئے صحافت کہا جاتا ہے۔ عام پڑھے لکھے لوگوں سے یہ چیز ادب سے بہت زیادہ قریب تھی کیونکہ اس کی سب سے زیادہ عالمگیر صورت یعنی روزانہ اخبار نے ہر پڑھے لکھے فرد کے لئے ورد سحر گاہی کی جگہ لے لی تھی۔ چنانچہ وہی ادب مقبول ہوا جو عصریت سے معمور تھا۔ کرشن چندر کی اُردو ادب میں مقبولیت اس بات کا ثبوت ہے کہ عصریت بلکہ محض ہنگامی اور وقتی عصریت کو رُوحِ ادب مانا جانے لگا کیونکہ کرشن چندر کے افسانے اسی لئے ہاتھوں ہاتھ بکے کہ ان میں بنگال کے قحط اور ہندوستان کی تقسیم اور کشمیر کے مسئلہ کے پہلو دلچسپ کر کے دکھائے گئے تھے۔ اس سلسلے میں جب میں نے نگار لکھنؤ میں ایک مضمون اس عنوان کا شائع کیا کہ "ترقی پسند ادب ادب نہیں صحافت ہے"، تو میرے لتّے لے ڈالے گئے اور وہ عام گالی جو ترقی پسند اپنے مخالفین کو دیا کرتے تھے یعنی رجعت پسند کہہ دیا۔ دشنام طرازی کے علاوہ مجھے ادب سے بالکل بے بہرہ ثابت کر دیا گیا۔ میں ثابت کر چکا ہوں کہ ہمارا قومی ادراک شدید طور پر مبالغہ آمیز ہے اور یہ اُس ادراک کی حد تھی۔

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ ادیب اپنے عصر کا ہی ایک فرد ہوتا ہے، اپنے چاروں طرف کی زندگی سے متاثر ہوتا ہے اور اسی کی ترجمانی کرتا ہے۔ مگر اسکی عصریت ادبی دائرے میں محض اس لئے نہیں آتی کہ وہ ہنگامی واقعات اور وقتی قدروں کو اپنا موضوع بناتا ہے، عصر ادب کے رُخ کو موڑ دیتا ہے۔ وقتی قدریں ادبی صفات میں جلوہ فگن ہوتی ہیں، تب ہی عصریت ادبی ہو جاتی ہے مثلاً اٹھارویں صدی کے انگلستان میں صنعتی ترقی کے زور اور اوسط طبقہ کے ورود نے شہروں کی زندگی کو اہم بنا دیا۔ ادب کا موضوع شہر کی تہذیب یافتہ زندگی ہوا اور اس کا مقصد اوسط طبقہ کے اخلاق کو ایک معیار دینا ٹھہرا۔ شاعر نے اس دَور کی زندگی کو طنزیہ نظر سے دیکھا اور طنزیات اس دَور کے نظم اور نثر دونوں میں اس قدر اہم ہوئے کہ یہی اس دَور کی نمایاں ترین ادبی عصری چیزیں ہیں۔ اس جذباتی رُجحان نے طرزِ تخیل کو بھی بدل دیا۔ قدما میں طنزیہ نگار ماڈل ہوئے۔ ان کی بہترین مثالیں لاطینی ادب میں تھیں اور اسی لئے لاطینی ادب کی پیروی کی گئی اور اس پیروی ہی کو صحیح ادبی رُجحان مانا گیا۔ ہورس نے جو ادب کے اصول بنا دئیے تھے انہی کے مطابق انگریزی شاعری کے طرز کو بھی ڈھالا گیا۔ تہذیب یافتہ ادب جیسی زبان کے قاعدے طرزِ ادا کے

قاعدے اور عروض کے قاعدے اٹل ہو گئے۔ وجود میں آگیا اور پوپ کی شاعری میں کمال پر پہونچا۔ اس وقت جب ہم اس ادب کو دیکھتے ہیں تو وہ اپنے عصر کا مکمل آئینہ دکھائی دیتا ہے۔ مگر ایک صدی کے بعد ہی رُجحانات بدلے۔ انقلاب فرانس نے تہذیب یافتہ طبقہ کو ختم کر دیا۔ عوام کی قدرتی زندگی اہم ہو گئی۔ ادب کا موضوع قدرت ہوئی، طنز کی جگہ حسن اور عظمت نے لے لی۔ شاعری خارجی کے بجائے داخلی ہوئی اور غنائیت کے عروج کمال پر شیلی کے کلام میں پہونچی۔ زبان لاطینی سے دُور اور عوام کی بولی سے قریب آتی گئی۔ طرز اور عروض کے ٹکے بندھے اصولوں کی جگہ جذبات سے ہم آہنگ رنگ اور راگ پیدا کیا گیا۔ یہ ادب اصول سے تمام تر آزاد تھا اور اس لئے جب جودت طبع کا زور کم ہوا تو ایک قسم کی بے راہ روی وقتی سنسنی خیزی اور جذباتیت رہ گیا۔ بیسویں صدی میں جنگ عظیم کے بعد توازن لانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور ادب وہ خصوصیات دکھا رہا ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں۔ عصر بڑی پُراسرار حقیقت ہے اور یہ زندگی کو بدلتا چلتا ہے جس کے ساتھ ادب بھی بدلے بغیر نہیں رہتا۔ عصری خصوصیات ادب کی اہم ترین خصوصیات نہ سہی مگر ان کو سمجھے بغیر ادب کو سمجھنا اسی طرح مُشکل ہے جیسے زندگی کو بغیر تاریخ کی مدد کے نہیں سمجھا جا سکتا۔

مگر عصریت ہی سب کچھ نہیں ہے۔ جو لوگ محض عصری خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں وہ عصر کے بعد یاد بھی نہیں کئے جاتے۔ سابق عصر کے اسی ادب کو ہم قابلِ توجہ سمجھتے ہیں جو اپنے عصر کی تصویر تمام عصروں کے لئے پیش کرتا ہے۔ اس بات کو یوں کہیئے کہ عصری خصوصیات جب دائمی نوعیت سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں تب ہی عظیم و رفیع ادب وجود میں آتا ہے۔ اقبال نے کہا ہے ؎

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

کم نظری یا سطحی نگاہ کو محض عصری خصوصیات دکھائی دیتی ہیں ورنہ گہری نگاہ رکھنے والے دیکھتے ہیں کہ عصری خصوصیات کی تہ میں وہ دائمی خصوصیات ہیں جو کسی ادب کے دوام کی ضامن ہیں۔ آدمی ایک ہے یہ مختلف ادوار میں مختلف کپڑے پہنتا آیا ہے اور مختلف طریقہ پر رہتا آیا ہے۔ یہ بھی اُس کی فطری خصوصیات میں سے ہے اور جو ادب وہ وجود میں لاتا ہے اُسکو بھی وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے مگر وقتی چیزوں میں کچھ ایسی ضرور ہوتی ہیں جو اُس کی دوامی زندگی کا جزو بنتی جاتی ہیں اور اس طرح وہ ترقی کرتا جاتا ہے۔ ادب کی عصری خصوصیات میں جو عصری رہ کر بھی دوامی خصوصیات کا حصّہ ہو جاتی ہیں وہی آخر میں زندہ رہتی ہیں اور اُن کی وجہ سے ایک عصر کا ادب ہر عصر کا ادب ہو جاتا ہے۔

عظیم ترین ادیب وہ ہیں جنکو ہر عصر اپنی طرح پر دیکھتا ہے اور وہ ہر عصر میں ایک مخصوص نوعیت اختیار کر لیتے ہیں۔ جون بیلی نے اپنی ملٹن پر کتاب کو ایک استعارے سے شروع کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بڑی ہستیاں پہاڑوں کی طرح ہوتی ہیں جنکو جس رُخ سے دیکھو بالکل مختلف معلوم ہوتے ہیں اور ملٹن ایسے ادیبوں پر یہ استعارہ پورا اُترتا ہے۔ ملٹن سے اب تک انگریزی ادب کے قریب قریب چار دَور گزرے ہیں اور ہر دور کی اس پر نمائندہ تنقیدوں کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر دَور اسے اپنی طرح دیکھ رہا ہے مگر اس کی عظمت تک ضرور پہونچ جاتا ہے۔ ملٹن کی دائمی عظمت مسلم ہے اور اسکی خصوصیات ایسی بُنیادی ہیں کہ ان سے کوئی دَور انکار نہیں کر سکتا۔ پھر بھی ہر دَور کچھ خصوصیات کو قبول کرتا ہے اور کچھ کو رد کر دیتا۔ اس سلسلے کی سب سے دلچسپ مثال کلاسیکی دَور میں شیکسپیئر کے

کی پیداوار تھا سے کی تصحیح ہے۔ بشپ موصوف کا یہ نظریہ تھا کیونکہ ملٹن اندھا تھا اور یہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اُس نے جو کچھ املا دیا وہ صحیح لکھا گیا یا نہیں اس لئے لکھنے والوں نے الفاظ اور تراکیب بدل دیں جنکو صحیح کرنے کی ضرورت ہے۔ ملکہ این نے اسے تصحیح پر مقرر کیا اور اب جب ہم دیکھتے ہیں کہ اُس نے کون کون سے فقرے کاٹ دئے تو ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ ملٹن کو مکمل اپنے دَور کا شاعر بنانا چاہتا تھا جو فقرے اُس نے کاٹ دئے ہیں وہ آنے والے رومانی دور کے لئے ملٹن کی شاعری کی جان ٹھہرے کیونکہ وہ رومانیت کی بہترین مثالیں ہیں۔ اس طرح ملٹن کے بابت اور نظریات کو چھوڑ کر اُس کے طرزِ ادا ہی کا ایک پہلو ایک دَور کے لئے اور دوسرا دوسرے دَور کے لئے اہم ہوا۔ ہر دَور روایات کی عظیم ہستیوں کے کلام کا پھر سے جائزہ لیتا ہے اور اپنے حساب سے انکو ایک نئی نوعیت دیدیتا ہے اس سلسلے میں عجیب عجیب تماشے دکھائی دیتے ہیں۔ آخری دَور کے کچھ ادیب بالکل رد کر دئے جاتے کبھی پرانے دَور کے بھولے بسرے ادیب پھر سے زندہ کر دئے جاتے ہیں۔ مثلاً ڈون کو دو سَو برس تک لوگ بے راہ روی کہتے رہے مگر اب بیسویں صدی کے شاعروں نے دیکھا کہ ڈون کا طرزِ تخیل ہی جدید دَور کے تاثرات ادا کرنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اس طرح سولہویں صدی کا ایک نمائندہ شاعر جس کا ایک پورا مدرسہ بن گیا تھا۔ بیسویں صدی کی عصریت کا علمبردار ٹھہرتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر عصر کچھ ادبی رسموں کے ذریعہ اپنے کو ادا کیا کرتا ہے ان رسموں میں سے زیادہ تر اس عصر کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہیں اور جو لوگ ان کو برتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں اُن کے نام مٹ جاتے ہیں۔ مگر ان ہی رسموں میں سے کچھ ایسی ہوتی ہیں جو کئی دَور آگے چل کر پھر سے زندہ کی جاتی ہیں اور کچھ ایسی ہوتی ہیں جو دوامی ادبی رسموں میں اضافہ کرتی ہیں اور ادب کو ارتقاء کی منزلیں طے کرتی ہوا دکھاتی ہے کسی دَور کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے ہر قسم کے رُجحانات ہر دَور میں موجود رہتے ہیں اس لئے ایک حد پر پہونچ کر کچھ لوگوں کی یہ رائے ہے کہ ادوار کی تقسیم بے معنی ہے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ زیادہ ہر ادوار کو بدلتے ہوئے (   ) کہا جاتا ہے اور اُن کی خصوصیات ملی جلی بتائی جاتی ہیں۔ آخر کار ہم کسی دَور کو دوسرے سے مختلف صرف اسی وجہ سے کہہ سکتے ہیں کہ ایک دَور کی چند مقبول ترین ہستیاں دوسرے دَور کی چند مقبول ترین ہستیوں سے مختلف رُجحانات کی حامل ہوتی ہے۔ سارا کھیل چند لیڈروں کا ہے ورنہ باقی لوگ لکھنے والے اور پڑھنے والے ایک سے ہی رہتے ہیں اور اُنکو جس ادب سے سروکار ہوتا ہے وہ ان عام خصوصیات کا حامل ہوتا ہے جس کو نہ انفرادیت سے تعلق ہوتا ہے اور نہ عصریت سے۔

ادب کو عصر کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کا طریقہ مسئلہ ارتقاء (   ) کے عام ہونے کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ دیکھا یہ گیا کہ انسان ترقی کر رہا ہے اور اس کا علم بھی ترقی کر رہا ہے۔ خاص طور پر وہ علم جسے سائنس کہتے ہیں صاف طور پر ترقی کر رہا ہے کیونکہ اُس کا ہر نظریہ کچھ ہی عرصے میں بدل کر بہتر نظریہ ہو جاتا ہے اور سائنسی اصولوں کے مطابق بنائی ہوئی مشینیں بہتر سے بہتر ہوتی جا رہی ہے۔ اس لئے ہر علم کے مطالعہ کے لئے تاریخی طریقہ استعمال کیا گیا۔ ادب کے مطالعہ کے لئے بھی تاریخ ادب کا درس بنیادی سمجھا گیا۔ سائنس کے سلسلے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدید ترین نظریہ یا جدید ترین ایجادات سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔

کیا ادب کے سلسلے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب ایک حد تک اثبات میں دیا جا سکتا ہے۔ ہر بڑا فرد ادیب پرانے ادیبوں سے منسلک نظر آتا ہے جن کی خصوصیات اس کے یہاں سب سے زیادہ ترقی یافتہ درجہ پر پہونچی نظر آتی ہیں مثلاً شیکسپیر انگریزی ڈرامہ نگاری کے کئی صدی کے ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ مگر شیکسپیر کے بعد سے اب تک جو ڈرامہ نگار ہوئے اُن کو اس سے زیادہ ترقی یافتہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے بعد ڈرامے کا بالکل زوال ہو گیا۔ اسی طرح فیلڈنگ سے ٹالسٹائے تک ناول مدارج ارتقاء طے کرتی نظر آتی ہے اس کے بعد سے اس پر زوال آ جاتا ہے۔ ادب میں اس قسم کا ارتقاء جیسا سائنس میں کارفرما ہے بس ایک ہی چلتا دکھائی دیتا ہے۔ پھر یہ بھی کہنا مشکل ہے کہ ارتقاء کے مختلف درجے اسی طرح بیکار ہوتے جا رہے ہیں جیسے سائنس میں پُرانے نظریہ یا پرانی مشینیں بیکار ہو جاتی ہیں۔ ہر کامیاب ادب پارہ یا ادیب اپنی جگہ پہ آخری درجہ بھی ہے اور ابتدائی بھی۔ اس میں جو کچھ ہے وہ بالکل اچھوتا ہے اور آگے پیچھے سے تعلق پر اس کی زندگی اور اہمیت کا مدار ہرگز نہیں ہے۔ شیکسپیر کے ڈرامے مارلو کے ڈراموں سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں مگر وہ مارلو کے ڈراموں کی اہمیت یا کیفیت کو ختم نہیں کرتے۔ مارلو اپنی ذات اور اپنی انفرادیت کی بنا پر ہمیشہ کے لئے ایک آخری چیز کی طرح اہم رہیگا۔ برنارڈ شا نے شیکسپیر کے چار سو برس کے بعد ڈرامہ نگاری کی تو اس کے ڈراموں کے بابت یہ کہہ دینا کہ شیکسپیر کے ڈراموں کے بعد اُن کے پڑھنے کی ضرورت نہیں غلط ہے۔ کیونکہ اس کے ڈرامے اپنی جگہ پر منفرد ہیں اور اپنی جگہ پر آخری ہیں۔ ادب ارتقاء کے قانون میں نہیں آتا کیونکہ اس میں عصریت کے ساتھ انفرادیت بھی اہم ہے جبکہ سائنس میں انفرادیت کا کوئی مقام نہیں ہے۔ ادب کو تاریخ سے وابستہ کرنا اور عصریت کو اس میں اہم گردانا ایک حد تک ہی جائز معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ زندگی کی طرح اس قدر مکمل اور پہلو دار ہے کہ محض عصری قدریں اسے نہیں گھیر سکتیں۔ ادب عصر کا آئینہ دار ہوتا ہے مگر سائنس کی طرح محض یہی نہیں ہوتا۔

مارکسی تنقید تمامتر عصریت پر زور دیتی ہے۔ اس میں کاڈویل (   ) کی کتاب "الوژن اینڈ ریلیٹی" سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ مادی حالات نے کس طرح ادب کو پیدا کیا اور پھر ساری انگریزی شاعری کو کس طرح عصری حالات نے وہ کچھ بنایا جو وہ ہے۔ دوسری طرف انفرادی تنقید ہے جو نٹشے (   ) کے فلسفے سے متاثر ہے اور یہ دکھاتی ہے کہ غیر معمولی انسان نئی تحریکیں اٹھاتے ہیں اور اُن کے اثر سے ادوار وجود میں آ جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ سوال اب تک حل نہ ہو سکا کہ عصر اہم ہے یا فرد۔ اصل میں یہ نقطۂ نظر کا فرق ہے۔ یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ دونوں میں سے کون اہم ہے۔ زندگی ایک پیچیدہ چیز ہے اور اس میں عصری اور انفرادی اثرات ایسے ملے جلے چل رہے ہیں کہ اُن کو الگ نہیں کیا جا سکتا ہاں ایک بات ضرور ہے کہ عصری خصوصیات ہی کو سب کچھ سمجھنے والے کوئی قابلِ قدر ادب ہمارے سامنے نہیں پیش کر سکے۔ روس جہاں عصریت کا نظریہ رائج ہے جدید دور میں کوئی ادبی کارنامہ ایسا نہ پیش کر سکا جو اشتراکیت کے وجود سے پہلے کے معمولی شاہکار تک سے مقابلہ کر سکے چہ جائیکہ وہ ٹالسٹائے اور دوستوفسکی کی سی کوئی تصنیف سامنے لاتا۔

—— x ——

کلیم الدین احمد

دو نظمیں

ویرانی

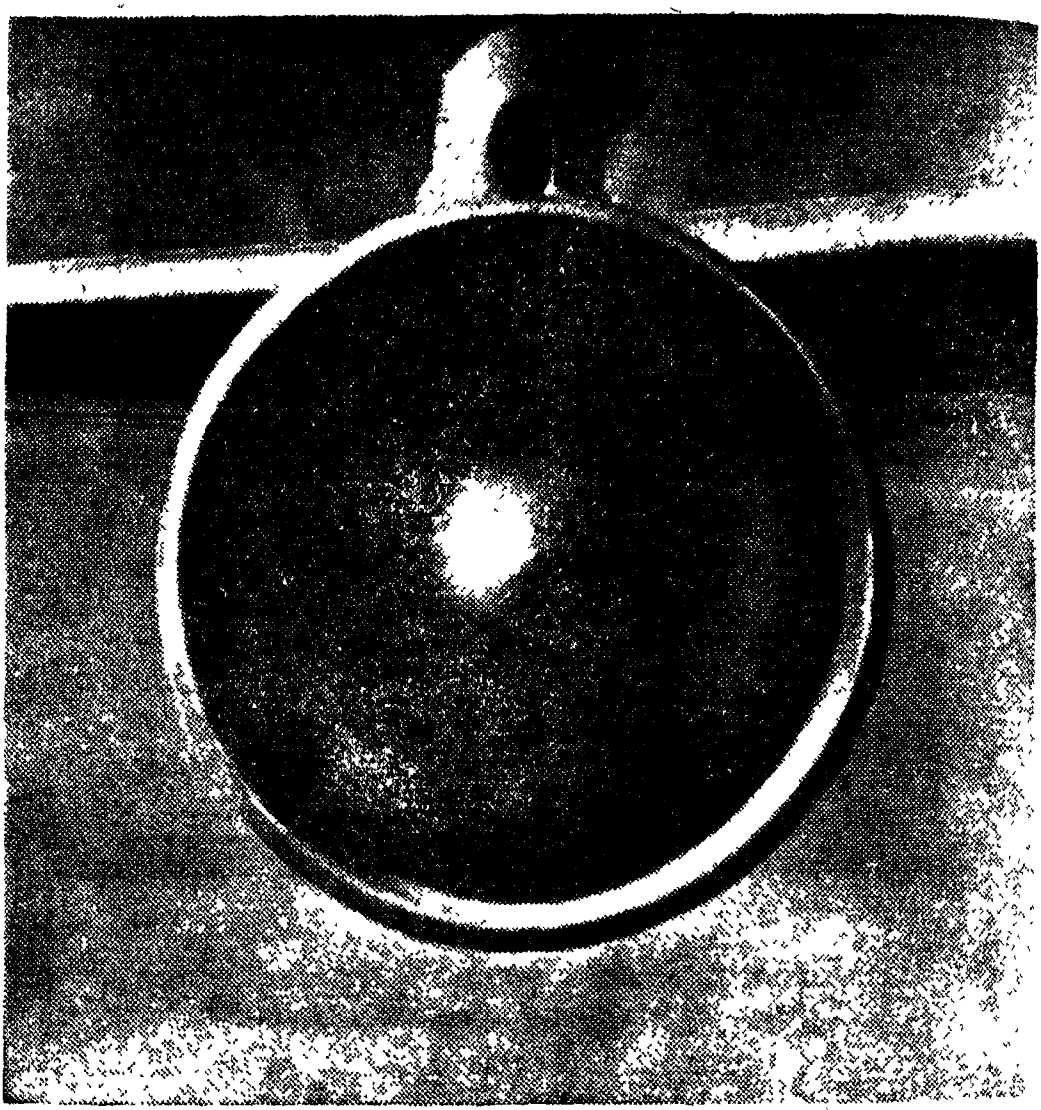
یہ زمیں اپنی کیسی پیاری تھی
اس میں قدرت نے کی تھی گلکاری
حسن کی شوخ و شنگ تصویریں
جو نہ بھولیں کبھی وہ تنویریں
دِل کے آئینہ میں درخشاں تھیں

کیسی صورت بدل گئی دِل کی
اس پہ چھائی ہوئی ہے ویرانی
شاد کیسے ہو اب دلِ ناشاد
گلشنِ دہر ہوگیا برباد
اک دھواں سازمیں سے اُٹھتا ہے!

دو تصویریں

کیسی ویران ہو گئی دُنیا
زندگی کا کوئی نشاں نہ رہا
شہر ویراں، مکاں شکستہ ہیں
خشک پودے ہیں خشک ہر چشمہ
کل جو گلشن تھا آج صحرا ہے

مشعلہ زندگی بھڑک اُٹھا
مُردہ شاخوں میں تازہ جان آئی
پتّیاں نکلیں پھُول بھی پھوٹے
حُسن رنگیں شباب پر آیا
کیسا دُنیا نے روپ بدلا ہے!




س سے سیونگ
ا سے اکاؤنٹ
ا، ب کی طرح آسان سبق! میں برابر کچھ رقم بچاتی رہتی ہوں اور اسے اپنے اسکول کے سیونگ بنک اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتی ہوں۔ میری عمر کے ساتھ ساتھ رقم بھی بڑھتی جائے گی۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ میں رقم بچانے کا سبق بھی سیکھ رہی ہوں۔ امی ابا کہتے ہیں، یہ بڑی اچھی عادت ہے۔
مسلم کمرشل بینک لمیٹڈ
نے مجھے بچت کی عادت سکھائی ہے
آپ بھی یہ عادت سیکھ سکتے ہیں
صدر دفتر
کراچی
جنرل منیجر

ڈاکٹر عبادت بریلوی

قصرِ جواہر

میر حسن دہلوی کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی

میر حسن، اُردو شاعری کے اُس دَور کے سب سے اہم شاعر ہیں جس کو آزاد نے متوسطین کا دَور کہا ہے اور جس میں انشا، مصحفی اور جرأت سب سے زیادہ پیش پیش نظر آتے ہیں۔ اس زمانے میں بدلتے ہوئے معاشرتی اور تہذیبی حالات کی وجہ سے اُردو شاعری کا انداز بدلا اور وہ روایت جو دلّی میں میر اور درد نے قائم کی تھی اُس کو اِس زمانے کے اہم شاعروں نے بڑی حد تک خیرباد کہہ دیا۔ اس زمانے میں صرف میر حسن کی شخصیت ایسی ہے جس نے اُردو شاعری کی اس عظیم روایت کو برقرار رکھا۔ اُن کی غزلوں میں یہ روایت ہر جگہ اپنی جھلک دکھاتی ہے — لیکن غزلوں کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے مثنوی کی صنف میں بھی اُس روایت کو برقرار رکھا ہے جو خود میر اور سودا کے ہاتھوں پروان چڑھی تھی۔ بلکہ اس روایت میں تو اُنھوں نے بعض ایسے اضافے کئے ہیں کہ وہ اپنے پیش روؤں سے بھی کچھ آگے جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ میر اور سودا کی مثنوی نگاری پر ہماری تنقید نے بہت کم توجہ کی ہے۔ جن لوگوں نے کچھ لکھا ہے، اُنھوں نے غلط فہمیاں ہی پیدا کی ہیں۔ بنیادی طور پر مثنوی ہماری نظم نگاری کی روایت سے تعلق رکھتی ہے۔ اور اس خیال کو بنیاد بنا کر دیکھا جائے تو میر اور سودا ہمیں اعلیٰ پائے کے مثنوی نگار نظر آتے ہیں۔ اور بات ہے کہ ان کا انداز میر حسن کے انداز سے مختلف ہے۔ میر حسن نے ان کی قائم کی ہوئی روایت میں بعض اضافے ضرور کئے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ مثنوی کی صنف کو نظم نگاری کے صحیح منصب سے آشنا کیا ہے۔ ان کی مثنوی سحرالبیان اِس اعتبار سے یقیناً بڑی اہمیت رکھتی ہے — لیکن اِس کے علاوہ اُن کی مثنویاں گلزارِ ارم اور رموز العارفین بھی کچھ کم اہم نہیں ہیں۔

یہ مثنویاں بار بار شائع ہو چکی ہیں لیکن میر حسن کی بعض مثنویاں ایسی بھی ہیں جو ان مثنویوں سے کسی طرح کم اہم نہیں لیکن جو ابھی تک اُن کے مجموعۂ کلام کے ساتھ شائع نہیں ہوئی ہیں — یہ مثنویاں اُن کے بعض قلمی نسخوں میں موجود ہیں۔ اِن مثنویوں میں (۱) خانۂ میر حسن (۲) خوانِ نعمت اور (۳) قصرِ جواہر خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں — مجھے یہ مثنویاں میر حسن کے اُس قلمی نسخے میں ملیں جو کبھی شاہانِ اودھ کے کتب خانوں میں تھا اور اب برٹش میوزیم لندن میں ہے — اِس پر شاہانِ اودھ کی مہریں ہیں اور یہ وہی نسخہ ہے جس کا ذکر اسپرنگر نے اپنی 'اودھ کیٹلاگ' میں کیا ہے۔

اِن مثنویوں کو اِس سے قبل بھی بعض لوگوں نے دیکھا۔ لیکن غالباً غور سے نہیں پڑھا۔ اس لئے اُن کی صحیح اہمیت اُن پر واضح نہ ہو سکی۔ اور اُن میں سے بیشتر نے یہ لکھ دیا کہ ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ حالانکہ یہ مثنویاں اِس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں کہ اِن سے میر حسن کی شخصیت، اُن کے زمانے کی معاشرتی حالت اور اُس عہد کی تہذیبی کیفیت پر خاص روشنی پڑتی ہے — اس کے علاوہ اِن سے اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ میر حسن کو مثنوی کی صنف پر کیسی قدرت حاصل تھی اور انھوں نے نظم نگاری کی اس روایت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

اِن مثنویوں میں سے (۱) خانۂ میر حسن اور (۲) خوانِ نعمت کو میں نے شائع کر دیا ہے۔ اب قصرِ جواہر کا متن شائع کیا جاتا ہے۔

افسوس ہے اس مثنوی کا کوئی اور نسخہ میری دسترس میں نہیں ہے۔ میں نے برٹش میوزیم کے نسخے ہی کو سامنے رکھ کر اس کا متن تیار کیا ہے۔ اس لئے اس میں بعض الفاظ کی تصحیح نہیں ہو سکی ہے۔ پھر بھی صرف اس خیال سے اس کو شائع کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والوں کو اس کی صحیح صحیح اہمیت کا اندازہ ہو ——— ظاہر ہے کہ جس وقت تک متن سامنے نہ ہو کسی ادبی تخلیق کی صحیح اہمیت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس سے قبل اس مثنوی کے حصے اگرچہ رسالہ معیار میں شائع ہو چکے ہیں لیکن پوری مثنوی کا متن اب شائع ہو رہا ہے۔

قصرِ جواہر دراصل نواب جواہر علی خاں کے محل کی تعریف میں لکھی گئی ہے ——— اس کا آغاز عام مثنویوں کی طرح حمد و نعت سے ہوتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد میر حسن نے اس قصرِ جواہر نگار کی تعریف کی ہے جو انھیں بہشت بریں کا نمونہ نظر آیا ہے، اور بہشت بریں کا نمونہ اس لئے نظر آیا ہے کہ وہ مومنین کا مکان اور "شیعیانِ علی" کی جگہ ہے ——— اس سے میر حسن کے عقیدے کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس عقیدے کے ساتھ ان کی اخلاص مندی نے انھیں اس کی تعریف کرنے پر مجبور کیا ہے ——— لیکن اس میں عقیدے کی باتیں نہیں ہیں۔ میر حسن نے تو جو کچھ خوبیاں خارجی طور پر اس محل میں دیکھی ہیں ان کو بیان کر دیا ہے، اور اس سلسلے میں اپنی جزئیات نگاری کا کمال دکھایا ہے ——— اس محل کی پُرشکوہ کیفیت، اس کی مستحکمی، اس کی صفائی، اس کی نشاط آور ہوا، اس کے چونے کی سفیدی، اس کی ابرک کی چمک، اس کی کرسی کی بلندی، اس کے شہ نشین کی پُرکاری، اس کی بارہ دری، جنوبی بنگلہ، آئینے، ستون، باغ، پھول، چمن کی شادابی، سبزہ، کوٹھے کی شان اور چاندنی میں اس کی کیفیت، شمعوں کا نور، روشنی کی فراوانی اور اس قسم کی ان گنت چیزوں کو کچھ اس طرح تفصیل جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے کہ محل کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

میر حسن نے اس تفصیل و جزئیات کو پیش کرنے میں اپنے فن کا وہ کمال بھی دکھایا ہے اور مجموعی طور پر اس کے بیان میں کچھ ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ اس کو دیکھ کر انگریزی کی بعض طویل نظموں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

قصرِ جواہر

ثنا پہلے اُس خالقِ پاک کو ۔۔۔ دیا جس نے رُتبہ کفِ خاک کو
اِسی خاک سے خلقِ عالم کیا ۔۔۔ ہَوا کر کے دَم اس میں آدم کیا
پھر آدم کی خاطر بنایا جہاں ۔۔۔ عدم اور ہستی دو رویہ مکاں
رکھی شرق سے غرب تک ایک بِنا ۔۔۔ سراسر مثالِ خطِ استوا
بنا اُس پہ پھر گنبدِ آسماں ۔۔۔ احاطے میں اُس کے دیا سب جہاں
عناصر کی چوکور اینٹیں لگا ۔۔۔ زمانے کا ایوان برپا کیا
کئے بُرج پھر اُس میں بارہ میاں ۔۔۔ لگا پیش رو ابر کا سائباں
شفق سے اُس ایواں کو رنگیں کیا ۔۔۔ بلائے شمالی سے تزئیں کیا
کئے بر سرِ بام و سقف و جدار ۔۔۔ خیالاتِ عالم کے نقش و نگار
کیا کہکشاں کا جو طاق انتخاب ۔۔۔ دیا اُس کا قوسِ قزح سے جواب

بنا جب یہ دالانِ عالی مکاں — رکھے مہر و مہ اس میں دو تاب واں
زر افشان انجم کا ابرک لگا — سفیدی سے دی مہر و مہ کی جلا
ہوا جب یہ ایوان کرسی نشیں — قرینوں سے سب اُس میں بانٹی زمیں
رکھی وسعتِ صحن لا انتہا — ازل اور ابد بیچ میں کر لیا
عجب سوت کھینچا اُس نے اے ذی عقول — مکرر کیا اُس کا سب عرض و طول
کیا مخملِ اطلسی اُس میں فرش — لگا دامنِ خاک سے تا بہ عرش
شب و روز اُن میں ہیں ایک فرشِ راہ — برنگِ گلیم سفید و سیاہ
ہے سجدے کے لائق وہ یزدانِ پاک — میں صنعت گری پر ہوں اس کی ہلاک
اُسی نے دیا عقل کو یاں کی راج — کہ پایا عمارت نے جس سے رواج
یہ کرنی اُسی کی ہے اور کس کا کام — یہاں موم ہے کارِ سنگِ رخام
کرے کون ایجاد یہ بے ستوں — یہاں تیشۂ عقل ہے سرنگوں
بنا ہے جو حیران ہے پائے فہم — کہ اس دستکاری کو کب پائے وہم

مگر فہم میں اتنا آتا ہے یاں
کہ احمدؐ کی خاطر بنا یہ مکاں

○

بیا ساقیا مے پرستی کنیم — محمدؐ بگوئیم و مستی کنیم
محمدؐ وہ ہے صاحب دوسرا — نہیں دوسرا کوئی ایسا ہوا
خداوند معراج و لولاک ہے — سمجھ بات گر تجھ میں ادراک ہے

ہے لازم مکان و مکیں چاہیئے
کہ انگشتری پر نگیں چاہیئے

○

در اُس کا ہے وہ جو علیؑ ولی — وہ ہے شیرِ حق اور وصیِ نبیؐ
رسائی ہے اُس گھر میں اس کے سبب — بجز حبِّ حیدر کوئی پہنچے کب
وہ ہے شہ نشینِ مقامِ نبیؐ — کہ جس سے ہوئی دل کے بارہ دری
وہ ہے قبۂ نورِ دار السلام — درود اُس گھرانے پہ ہو صبح و شام
تصدق ہوں میں بر سرِ اہلِ بیت — میں دل سے ہوں خاکِ درِ اہلِ بیت
اُسی در کا ہوں میں ازل سے فقیر — ہے ایمان یہ قولِ سعدیؒ پیر
خدایا بحقِ بنی فاطمہ — کہ بر قول ایماں کنی خاتمہ

اگر دعوتم او کنی در قبول
من و دست و دامانِ آلِ رسولؐ

پلا مجھ کو ساقی وہ جامِ شراب
نمک سے ملاحت کی ہو جس میں آب

کہ مستی مری شرع کے ساتھ ہے
مرا دین و ایماں مرے ہاتھ ہے

تو پس جب محمدؐ کی خاطر حسنؑ
کیا حق نے ظاہر زمین و زمن

بنا جب یہ قصرِ زمرّد سرشت
بنائے مکاں اس میں رشکِ بہشت

خصوصًا یہ قصرِ جواہر نگار
رکھے اُس کو آباد پروردگار

نمونہ بہشتِ بریں کا ہے یہ
محل و مکاں مومنیں کا ہے یہ

لکھوں کس زباں سے میں اُس کی ثنا
جو دیکھے سو جانے کہ صلِّ علیٰ

مجھے اُس کا نقشہ ہے کرنا رقم
بہرے سے اُٹھاؤں ستونِ قلم

وہ دروازۂ قصرِ عالی مکاں
رہے جس کے سائے میں سارا جہاں

اگر آوے کیسا ہی واں مضمحل
جہاں اُس کو دیکھے تو کھل جائے دِل

درِ دِل سے ازبس وہ ہم راز ہے
اُسی سے درِ عیش یاں باز ہے

ہر اک اُس کا حلقہ ہے چشمِ بُتاں
ہر اک زلفِ ہے کاکُل مہ وشاں

سرافرازیوں کا رسالہ ہے وہ
بلندی سے عالم کی بالا ہے وہ

بلند اُس سے کوئی نہ ہوگا مکاں
زمیں اُس کی ہے ہمسرِ آسماں

چڑھے اُس کے جو کوئی بالائے بام
کٹورا سا نیچے ہو بنگلا تمام

عجب طرح کا در ہے وہ خوش فضا
کہ آتی ہے جنّت کی اُس میں ہوا

اور ایک تختگی اُس میں دیکھی میں اور
جو دیکھا اُسے کھول کر چشمِ غور

جہاں تک کہ عہدے ہیں سرکار کے
وہ رہتے ہیں حجروں میں اُس کے بھرے

یہ وسعت کہ دل کی یہ وسعت نہ ہو
کسی جا میں ایسی فراغت نہ ہو

یہ وہ چاہیئے کانِ زر فیض بخش
کہ ہر در ہے اُس کا درِ فیض بخش

رہے چشمِ بد دور اس سے سدا،
کہ ہے شیعیانِ علیؓ کی وہ جا

نہ کرے کے دینے میں ساقی قصور
کہ ہے قصر کی مدح اُس کے حضور

پلا مجھ کو صہبائے اُلفت کا جام
کہ ہے دِل میں ساقیٔ کوثر کا نام

عجب قصر دیکھا میں وہ پُرشکوہ
کہ مستحکمی اُس کی مانندِ کوہ

مُربعا مسطح مصفا تمام
مکیں کی طرح خوشنما وہ مقام

ہوا اُس کی شرحِ بیانِ نشاط
فضا اُس کی طرح زمانِ نشاط

فلک سے زمیں اُس کی ہم داستاں
کفِ خاک درجبہۂ آستاں

صفا کچ کی رشکِ صفائے گہر
چمک برق و ابرک سے بُراق تر

کدورت سے چونا وہاں کا بَرّی
کہے تو چنبیلی کی جیسے کلی

ہے افشانِ ابرک سے اُس پر طلا
سراسر ہے موقعہ کا چونا لگا

ہے سُرخی کی جا سُرخیٔ لعل واں
ہو شرمندہ جس سے لبِ گل رخاں

نظر کو نہیں وقت نظارہ تاب
بھر آوے ہے سورج کی آنکھوں میں آب

وہ ایواں پُر از طاق و محراب طاق
کہ ایک وتمط دلربائی میں طاق

پُر از طاق جو واں کا ایوان ہے
نظر میں ہلالی کا دیوان ہے

وہ کرسی بلند اور وہ شہر نشیں
منقش گل اُس کے بہ گل ہائے چیں

وہ پر دوں کی کرسی کہ لالہ ہو داغ
وہ سبزی چھتوں کی کہ ہو سبز باغ

اُدھر دیکھیے یا اِدھر دیکھیے
مُرقّع کے عالم جدھر دیکھیے

ہے بارہ دری ایک واں شرق رو
مُنوّر ہے جوں عارضِ نیک خو

کرے صبح اُس آستاں کو مدام
تفاوت سے خورشید اُٹھ کر سلام

وہ سُرخ اُس کے آگے لگے سائباں
شفق جوں فلک پر ہو جلوہ کناں

بلندی میں وہ سائباں جوں سحاب
ہے قوسِ قزح اُس کی رنگیں طناب

وہ ایستادے دونوں یمین و یسار
کہ جیسے دو بازوئے دستِ نگار

ہے ایک حوض اُس سائباں کے تلے
کہ پانی ہے اُس میں کمر یا گلے

خوشا چاہ وہ جس سے ہے اُس میں آب
ٹھہر جا یہ چشمہ ہو دریا کا باب

ہے بنگلہ بھی چوبی وہاں ایک سو
کسی کا ہے گویا دلِ نیک خو

وہ بنگلہ کہے تو ہے بنگلے کا دل
کنول کی طرح جس سے دِل جائے کِھل

ہے اِک دستِ چپ ایک بارہ دری
کہ در ہے ہر ایک اُس کا چشمِ پری

دو رویہ ہے ایواں وہ فرخندہ فال
اِدھر کو جنوب اور اُدھر کو شمال

لگے واں ستونوں میں آئینے سب
وہ دالان گویا ہے شہر حلب

درخشندہ باہم مہ و مشتری
خرامیدہ عکس اُس میں کبک دری

اُن آئینوں میں ہے سماں جلوہ گر
اِدھر کا اُدھر اور اُدھر کا اِدھر

ہر ایک اُس کے جلوے سے دیوانہ ہے
وہ آئینہ گویا پری خانہ ہے

وہاں عکس جس کا نمودار ہے
وہ حیرت سے بس نقشِ دیوار ہے

ہے اس آئینے سے دلِ شمع داغ — کہ ہے راستوں کا وہ چشم و چراغ
مقابل بہم آئینہ دو طرف — قِرانِ دو اختر بہ بیت الشرف
ستوں سرو آئینہ آپ چمن — نظر اس کی قمری و بلبل سخن
مثال ستوں جو کہ ہیں راست باز — اُنھوں کے قدم پر ہے چشمِ نیاز
کرے جبکہ فوارہ گردن بلند — اور آئینے میں عکس ہو اُس کا بند
سلہ ؟ ہے اس وقت تقدّمًا شاہ بخف — کہ ساتھ اس بزرگی کے دُرِّ نجف
دو نقطہ پر آئینہ ہے یاں کہ بس — ستوں کے الف کو کیا جس نے دس
اُدھر پائیں باغ اُس کے زیرِ قدم — اِدھر وہ عمارات رشکِ ارم
کہوں باغ پائیں کا کیا میں بیاں — حنا جیسے ہو زیرِ پائے بُتاں
اُس ایوان کا روشن ہے یاں سے جمال — کہ ہے کوکبِ قطب اُس رو کا حال
ہوا ہو جسے باغ و گلزار کی — رہے اینٹ ہو اُس کی دیوار کی
گھٹا نت برستی ہے رحمت کی واں — نہیں نام کو گرد کلفت کی واں
عجائب وہاں صحن ہے دل فزا — دمِ عیسوی ہے جہاں کی ہوا
گُل خورمی کا ہے اُس جا وفور — اُگے ہے وہاں نخلِ عیش و سرور
ہوا میں رطوبت ہے واں اس قدر — کہ ہے دھوپ میں چاندنی کا اثر
نہیں بات کچھ میری یاں بے محل — یہ ہے صاف صاف اس میں کیا ہے خلل
یہ ستھرائی اور یہ صفائی کہیں — کسی صحن کی ہم نے دیکھی نہیں
ہے صحنِ مُصفّا بدن حور کا — سدا وقت رہتا ہے یاں نور کا
مُنوّر ہے ازبس وہ دیوار و در — برابر ہے اس جا پہ شام و سحر

ہے پتھر پھسلنا بھی واں ایک صاف
نظر گر نہ ٹھہرے تو رکھیو معاف

○

پلا مجھ کو ساقی مۓ لالہ فام — کہ غنچہ صُراحی ہو اور گُل ہو جام
چمن گُل سے نزہت میں معمور ہے — خزاں اُس گلستان سے دور ہے
یہاں تک ہے ہر فصل میں جوشِ گُل — کہ ہے دوشِ گُل سے مِلا دوشِ گُل
بغیر از گُل و لالہ و نسترن — درختوں نے روکا نہیں واں چمن
نہیں واں درختوں کی ہر سو بہار — وہ جنگل نہیں کچھ کہ ہوں جس میں جھاڑ
خس و خار ہوویں نہ واں جائے گیر — کہ تنکا ہے اُس آئینے پر لکیر
مرقع کہوں اُس کو تصویر کا — کہ تختہ ہو اُس کو کشمیر کا

سُہانی وہ جا اور جوشِ بہار
لہکنا وہ سبزے کا مستانہ وار

نہ ہو سبز کیونکر مکینِ فلک
کہ ہے ڈانک سبزے کا اُس کی چمک

مگر واں کی ہے چشمِ بُلبل زمیں
کہ بن گُل نہیں گوشۂ گُل زمیں

صفائی خیاباں کی آئینہ دار
کہ دونی روش پہ ہو گُل کی بہار

ہر ایک داغ بیل اُس خیاباں کی
نظر میں ہے جدول گلستان کی

نہیں یہ بھی تشبیہ ہے در کنار
یہ ہے خط گلزار دستِ نگار

کہیں ایسی داؤدی کِھلتی نہیں
یہ خوبی ستاروں کو مِلتی نہیں

یہ صد برگ کا رنگ دیکھا کہاں
جسے دیکھ کر زرد ہو زعفران

ہر ایک فصل میں ہے ہر ایک گل کی دھوم
بہار اپنی اپنی پہ اپنا ہجوم

چنانچہ کہ شبّو ہے اب روبکار
ہے گویا سوادِ دیارِ بہار

شمیم اُس کی نورِ دلِ مشک تا
طرح اُس کی شاخ گلِ آفتاب

مہکتا ہے اِس طرح شبّو سے باغ
کہ جوں زُلف سے ہو معطّر دماغ

چمن ہے مگر اس گلن کی ہے شمیع
نہیں شاخ شبّو چمن کی ہے شمع

جدھر بو کو لے جائے واں سے صبا
اُدھر سے صدا ہو کہ صلّ علیٰ

مکیں اُس مکاں کا ہے فرخندہ جام
یہ خوشبو ہے اُس کی ہی یا سو تمام

ہر ایک شب ہے اُس بو سے عنبر سرشت
ہر ایک روز اس رو سے روزِ بہشت

مثالِ حنائے کفِ پائے یار
اُسی کے قدم سے ہے ساری بہار

یہ شبّو یہ داؤدی و یاسمن
یہ اُجلا مکاں اور یہ ستھرا چمن ۔

○

بھلا سا تھا ایک جامِ ہلال
برائے شبِ ماہ چھت اُس پہ ڈال

تصّور میں مجھے سیرِ مہتاب ہے
کہ ہم حیض و ہم عالمِ آب ہے

بلندی عمارت کی کوٹھے کی شان
کہوں کیا میں بولے گا اُس کا بیان

بس اوپر جو کچھ جلوۂ ماہ ہے
نہ پوچھو کہ اللہ ہی اللہ ہے

لبِ بام سے تا زمیں اے عزیز
عجب چشمۂ نور ہے موج خیز

کہے تو کہ فرہادِ ماہِ منیر
لے آیا ہے واں کوہ سے جوئے شیر

شبِ ماہ واں کی دل افروز ہے
وہ نامِ خدا شب نہیں روز ہے

بھلا چاندنی کا ہو واں کیوں نہ جوش
کہ ہے ماہ اُس در کا حلقہ بگوش

پڑے چاندنی پر جدھر کو نگاہ
نہ دے کثرتِ نور آ آ کے راہ

نظر کو ہے مشکل وہاں سے عبور بڑا جوش مارے ہے دریائے نور
چمک کیا کہوں حوض و تالاب کی لگی ہے وہاں آنکھ مہتاب کی
غرض بام و در پہ ہے یہ کچھ سماں اب آگے اُس ایوان کا سُن بیاں
کہ اُس میں وہ قالین کا فرش و فروش کہ جس کا گُل و غنچہ نکہت فروش

کچھ صاف و ہموار یوں چاندنی
کہ بے جوڑ مہ کی ہو جوں چاندنی

○

پلا ساقیا مجھ کو تو ایک ایاغ! کہ روشن کروں فکر کا میں چراغ
دھرے نقرئی اُس پہ وہ شمع دان کہ شمعوں سے ہو جن کی روشن جہاں
وہ فانوس شیشے کے مانند دِل صفا جس سے ہو آئینے کی خجل
درخشندگی شمع کی اُس میں یوں فلک سے بڑے عکسِ خورشید جوں
اُسے اختلالِ ہوا سے فراغ کہ ہے دامنِ دل میں اُس کا چراغ

لباسِ شب اُس کا ہوا پھر تو ا ہوا دوسرا اُس کا زلفِ ہوا
نظر میں مری ہے زبس وہ جمال ہے فانوس کا دل کو واں کے خیال
دل و چشم ہیں اُس کے لبریزِ نور کہ ہے وہ جگر گوشۂ کوہِ طور
زبس سقف ہے آئینے کی نہاں عجب عکس سے شمع کے ہے سماں
دوبالا ہوا حُسنِ شمع و چراغ گیا عرش پر روشنی کا دماغ
کہوں چھت میں کیا روشنی کی چمک لیا ہے اُٹھا اُس نے سر پہ فلک
اِدھر جلوۂ شمع اُس طرف ماہ کرے کام کس کس طرف کو نگاہ
کہاں اِس طرح کی بھلا سیر ہے تکلف ہے آگے بس اب خیر ہے
خوشا وہ کہ جس کا ہو اُس جا ورود محمدؐ پہ بھیجا کرے نت درود
غرض کچھ سیر کا حق ہے سو یاں ہے بس اب آگے ہوا باغ کی ہے ہوس
نہ ہو کیونکہ یہ باغ جنت سرشت کہ ایسے کی خاطر ہے دوہرا بہشت
مکیں اُس مکاں کا ہے محکم اساس جواہر علی خاں جو ہر شناس!
وہ ہے سالکِ راہِ دینِ نبیؐ کریں چاہیے اُس کی سب پیروی
یہ عدل و سخاوت یہ جود و کرم یہ عزم و شجاعت یہ تیغ و قلم
یہ شان و صلابت یہ حلم و حیا یہ خلق و مروت یہ ذہن و ذکا

یہ قائم مزاجی یہ عزّ و وقار　　یہ ایمان داری یہ طرز و شعار
یہ حُسنِ سلوک اور یہ علم و عمل　　یہ طبعِ سلیم و دلِ ~~
نہ ہوگا کسی میں نہ اب ہے کہیں　　یہ سب خوبیاں ختم ہیں بس یہیں
سبک رو کا اُس کی کروں کیا بیاں　　روانی میں مانندِ طبعِ رواں
بہ صد گونہ ہے اُس پہ کارِ طلا　　سُنہری سا بادل ہے وہ صبح کا
نہ میانہ ہے وہ اور نہ ہے پالکی　　وہ ایک چیز ہے تخت کی نا ملکی
کہاں تک کروں اُس کی خوبی کی بات　　ہر ایک چوب ہے اس کی آبِ حیات
یہ اقبال و حشمت یہ جاہ و جلال　　رہے نت ترقی میں مثلِ ہلال
اگرچہ ثنا غیر آلِ نبیؐ　　کسی کی ہے کہنی نہیں کچھ بھلی
پہ ایسے کی ہے مدح کرنی بجا　　کہ ہے دو جہاں بیچ اس کا صلا
سخن کا نتیجہ ہے مدحِ امام　　دیا اُس کی جو ہووے اُس کا غلام
کہ صاحب کی ہوتی ہے اُس میں خوشی　　جو بندے کی اُس کے کہے کچھ بھلی
نہیں بے جگہ مجھ کو جوش و خروش　　وہ ہے اُس گھرانے کا حلقہ بگوش
موالی جو ہیں اُس کے صحبت نشیں　　سبھی شیعہ ہیں اور سبھی مومنیں
رہیں شاد و خرّم صغیر و کبیر　　ستارے یہ ہیں گردِ ماہِ منیر
یہ ہیں دوست دارِ علیؓ ولی　　نگہباں رہے اُن کا احمدؐ علیؓ
جگہ یاں بھی اُن کو ہے جنّت سرشت　　ملے گا وہاں بھی مکانِ بہشت
حسنؔ اب نہیں خوب طولِ کلام　　دُعا پر اب اِس کو میں دوں اختتام
رہے جب تک آباد قصرِ جہاں　　سلامت رہے یہ مکین و مکاں
سدا شاد اُس کے رہیں خیرخواہ　　رہیں دشمن اُس کے ذلیل و تباہ

یہ تحریر جو کی ہے ظاہر ہے یہ
مسمّیٰ بہ قصرِ جواہر ہے یہ

○

سُنا تو نے کچھ ساقیٔ سیم بر　　مئے تہنیت سے مجھے شاد کر
شمال کا واں ایک بنایا جواب　　کہ ہے سب مکانوں میں وہ انتخاب
ہوئے جیسے دُلھن کے رُخ اُس کے در　　مِٹا اُس طرف کی بدی کا اثر
جہاں کے ہوا سر پہ احسان یہ　　بنا نیک ساعت سے دالان یہ
عجب چوڑخا وہ بنا ہے مکاں　　عناصر سے خلقت کی دے ہے نشاں
کسی سرزمیں سے نہیں بے خبر　　کہ رکھتا ہے چاروں طرف وہ نظر

جدھر دیکھو ہے اُس کے گلزار سمت — عمارت میں ہے وہ سپہ چار سمت
دلوں کو ہے واں عیش و عشرت سے وصل — کہ ایک جا پہ ہے چار عالم کی فصل
ہر ایک سمت سے بس کہ خوش رو ہے وہ — سجا شاہد چار ابرو ہے وہ
کشادہ دلِ اہلِ ہمت ہے وہ — مربع نشینِ صباحت ہے وہ
صفائی کا اُس کی کروں کیا بیاں — کہ دیواریں اُس کی ہیں آئینہ ساں
نظر جس کی ہو اُن ستونوں پہ بند — رہے راست بازوں میں وہ سربلند
ہلالی زبس اُس کی محراب ہے — وہ در لمعۂ نور کا باب ہے
عجب شان سے اُس کا ہے سائباں — فلک دب گیا دیکھ کر جس کی شاں
ہوا کا نہ پوچھو وہاں کی بیاں — ہوا دار کیونکر نہ ہو وہ مکاں
نسیمِ سحر رات دن یار ہے — ہوا بھی وہاں کی ہوا دار ہے
عجب کمرکھوں کے ہیں واں دو درخت — کہ دونوں ہیں ہمسایۂ نیک بخت
ادھر ایک کونے پر اور ایک اُدھر — مقابل قرینے سے ہیں یک دِگر
مشابہ جو ہیں خیر سے وے درخت — زمیں واں کی ہے بادشاہی کا تخت
اگر دیکھنے اُس کی خوبی کو آئے — تو شمشاد بھی رشک سے زہر کھائے
رہے ہفت اقلیم میں اُن کا ناؤں — کہ عالم کو ہے بیٹھنا اُن کی چھاؤں
زبس اہلِ ایماں کا ہے وہ مکاں — کھڑے ہیں وہ دو سبزواری جواں
نہ ہو سایۂ نور کی وہ بہار — شب و روز ہوتے ہیں اُن پر نثار
جسے اُس کے سائے کی ہووے ہوا — لگے اُس کا اندھیر ظلِّ ہما
ہوا سایۂ تاک کی مہرباں — پہ ایسی ہے موزونی اُس میں کہاں
وہ نامِ خدا اُس کی گہری ہے چھاؤں — کہ آگر کدم اُس کا پوجے ہے پاؤں
اگر ذرّہ چاہے کہ واں دھوپ لے — یہ اُس سے توقع کوئی کم رکھے
شجر سایہ دار اُن کے کونوں میں ہے — جیا پوتا ایک اُن کے پوتوں میں ہے لہ ؟
میں کرسی کو دوں اِس کی تشبیہ کیا — فلک سے پرے اُس کا ہے مرتبہ
زبس ہے وہ جائے ثریا جناب — وہی شہ نشیں مطلعِ آفتاب
دقیقے کرے جب کئی طے نگاہ — تو اُس شہ نشیں کی ملے اُس کو راہ
فلک رتبہ ہو جو رکھے واں قدم — کہ واں کی زمیں ہے فلک سے بہم
مجھے لے گئی میری قسمت وہاں — وگرنہ یہ معراج ملتا کہاں
زمیں دیکھ واں کی گیا لوٹ دِل — کہ اُس سے صفا تھی گہر کی خجل
کھلی صندلی چھت وہ دیکھی کہ بس — رہی پھر نہ خوشبو کی مجھ کو ہوس

رہے اُس کے سائے تلے جو بشر
نہ ہووے کبھی اُس کے تئیں دردِ سر

خبردار ہو ساقیا! اور شتاب
شجاعت کے خُم سے مجھے دے شراب

مفصّل تو ہووے گا مجھ سے کہاں
کروں مجملاً فوج کا کچھ بیاں

ہوا سے جو در ایک طرف کھل گیا
مراجی سے دِل اُس طرف دُھل گیا

زبس تھا وہ مُشرف جلوخانے پر
جلوخانہ تھا اُس طرف جلوہ گر

تلنگے واں کے آئے یہ شان وشکوہ
جہاں گاہ سے ہو برابر نہ کوہ

زبس سُرمئی تھا اُنھوں کا لباس
ہوئی چشم کو روشنی بے قیاس

ہے آتش کا دریا کہے تو وہ فوج
کہ جوں دود سے شعلہ مارے ہے موج

تفنگوں کی پلٹن میں تھی یوں چمک
سیہ ابر میں برق کی جوں چمک

رہے جب تلک چرخِ نیلی کبود
اِس آتش سے جل جل مریں سب حسود

وہ توپ اژدھا اور وہ جمع تفنگ
نگلنے کو دشمن کے کامِ نہنگ

بر آوے نہ اُن سے عدوئے بہشت
ازل سے ظفر اُن کی ہے سرنوشت

رہے کیوں نہ واں کی سپہ سربلند
جہاں ایسا کپتان ہو عقل مند

جو کچھ اب وہاں ہے سپاہِ نجیب
یہ اشجع کسی کو ہوئے کب نصیب

اُنھوں کا سلامت رہے قدرداں
جواہر علی خانِ والا مکاں

اگر خان صاحب کی لکھوں ثنا
قلم کی زباں پر ہو جاری دُعا

کسی امر میں کچھ نہ آوے خلل
جہاں ایسا ہو عاملِ باعمل

رہے کِشت سے روز و شب اُن کا کام
کہ سرسبز ہے اُن سے عالم تمام

مئے عیش سے جام دے ساقیا
کہ پھر اُس مکاں کی ہے مجھ کو ہوا

درِ قبلہ رو اُس کا ہووے جو باز
پڑھے اُس طرف ایک عالم نماز

کُھلے پر ہیں پٹ اُس کے رنگیں کتاب
مونڈے پر ہیں دو مصرعِ انتخاب

نہ دیکھا کوئی اُس سے خوشتر مکاں
کہ مدِ نظر واں ہے آبِ رواں

صُدا سے ہلی چادرِ آبشار
کرے ہے وہ روپے کے پیڑ نثار

اُسے بھی زبس سرخوشی ہے کمال
وہ پانی بھی چلتا ہے مستی کی چال

نہ پوچھ اُس کا عالم عجب آب ہے
کہے تو کہ سیماب بے تاب ہے

زبس شوقِ تسخیرِ مہ تھا کمال — لیا سنگ نے پشتِ ماہی کا جال
نہ ہو نور کا کیونکہ واں اژدہام — کیا دام میں اُس نے ماہِ تمام
چمک یوں تھی پانی کے مہتاب میں — چراغوں کا جوں عکس ہو آب میں
عجب جگمگاہٹ سی ہے جلوہ گر — کہ مہ کی ٹھہرتی نہیں واں نظر
چمک اُس کی دیکھے جو کوئی دور سے — نظر اُس کی لبریز ہو نور سے
کہیں بیٹھنے والے اُس پاس کے — کہ جگنو ہیں تختے پہ الماس کے
دیا کر تمامی کے اوپر اوتو — کسی نے یہ کی ہے لہر گو کھرو
شبِ مہ میں عالم کہوں اُس کا کیا — نہایت بھلی لگتی ہے وہ صدا

کبھی کھرج سے اور کبھی دون سے
کِدارا بجے جیسے قانون سے

○

زمرد کے شیشے سے بھر کر شتاب — پلا ساقیا مجھ کو جامِ گلاب
اُدھر سے پھری جو نظر ٹک اِدھر — گیا میں بھی سررشتہ کی سمت پر
دروں سے درختوں کا تھا رنگ یوں — کہ دیکھے مرقع کو شیشے سے جوں
تلے اُس کے دیکھا تو رستہ ہے ایک — کہ چلتا ہوا شہر بستا ہے ایک
نظر ٹک جو رستے سے آگے گئی — نظر آئی ایک نور مجھ کو نئی لہ؛
اچنبھے کا دیکھا اُدھر پائیں باغ — کہ لعل و زمرد ہوا جس سے داغ
یہ ایجاد دیکھا ہے کس نے حسن — روش سبز اور سُرخ یہ گُل چمن
نہ گُل اُس میں ہے اور نہ ہے واں شجر — ولیکن نظر اُس سے ہے بارور
فقط سُرخی اِک کشت کی ہے وہاں — چمن کے بچھادی ہے وہ درمیاں
کتابی ہے تحریر اُس کی تمام — تکلف نہیں اُس میں کچھ والسّلام
غرض اُس پہ سادہ یہ پُرکار ہے — کہ رنگِ گُل و لالہ انبار ہے
یہ سبزی کہ جدول ہو دیوان کی — یہ سُرخی کہ سُرخی گلستان کی
کروں کس روش وصف اُس کا بیاں — ہے شرمندہ جس سے خطِ گُل رخاں
یہ سُرخی یہ سبزی چمن کی نہیں — بدخشاں کی سرسبز ہے یہ زمیں
کسی نے یہ کاہے کو دیکھی بہار — زمرد کے تختے پہ یاقوت زار
نظارے سے اُس کے پڑی جس کو خو — نہ سووے وہ گُل کی طرف کرکے رو
اگر اُس کو دیکھے کوئی غور کر — عجب کیا کہ ہو جائے طولِ نظر
دیا ہے یہ صنعت سے کس نے بٹھا — زمرد کے گھر پہ نگیں لعل کا

نہیں باغ اور باغ کی ہے بہار   عجب ہے طلسمِ جواہر نگار
مجھے اس کے دیکھے سے آیا یقیں   کہ ہے فی الحقیقت میں یہ گل زمیں
دلوں کو ہے اُس کے سمیں سے فرح   کہ ہے راستے میں یہ قوسِ قزح
بجی ہے وہ تھی بز — یہ آسرا ا،   ہوئی راست قوسِ قزح آکے یاں
شفق کا ہوا دیکھ کر رنگ فق   کہ ہوتی ہے ایسی زمیں کی شفق
نہیں سبز سُرخی یہ تحریر کی   یہ ہے ایک یاقوت کی مد کھنچی
بھرے ہے یہ جامِ زمرّد میں مے   کہ یا شعلۂ سبز آتش یہ ہے
کسی نے سلیقے سے اپنے دیا   دئے ہیں قرینوں سے مخمل بچھا
پڑے اُس جگہ جس کسی کا قدم   بہ رنگِ حنا سُرخ ہو دم بہ دم
کسی کی یہ سُرخی نہیں درمیاں   چمن میں بھرا ہے یہ خونِ خزاں
زبس کثرتِ عیش کا واں ہے جوش   بچھائے ہیں میداں میں زریں پوش
پڑے سبزے اور سُرخ بانات کے   یہ خیمے تھے گویا کہ برسات کے
کہے تو گلوں کے بہ صد برگ وساز   چمن باغباں نے کئے ہیں نیاز
خزاں کا کبھی اُس پہ وار آئے نہ   کہ ہے واں مرصع کا چار آئینہ
زبس کھُب گئی اُس کی رنگیں ادا   فلک نے زمیں کو دوشالا دیا
گُل ولالہ ہو دیکھ کر جس کو داغ   بجا ہے جو کہیے اُسے لعلِ باغ
ہوا ہے غرض یہ عجب اختراع   ثنا لکھوں اُس کی بہ خط شعاع
دگرنہ نہ ہو سبزیاں قتیل وقال   کہ ہے اِس جگہ میں زمیں اپنی لال
خدائی کی ہر رنگ میں ہے نمود   محمدؐ کے ہو آل پر ثبت درود
کہے شعر شاعر جو واں آن کر   وہ مضمونِ رنگیں سے ہو بہرہ ور
نہ آوے زباں پر سخن مبتذل   نئی اس کو سوجھے زمینِ غزل
مرے سر پہ اُس گھر کا احسان ہے   کہ میرا سخن سبز ہر آن ہے
اگر آئینہ اُس کے آگے نہ ہو   سخن کیونکہ طوطی کہے پھر کہو
سخن سنج کے آگے بھرتا ہے دل   نہیں اور ہوتا ہے جی منفعل

خدا اُس گھرانے کو رکھے مدام
بہ حقِ محمدؐ علیہ السّلام

شیر افضل جعفری

دو غزلیں

کھینچ کردار میں اُس کی تصویر
کر دلِ چاک میں یزداں کو اسیر

دار ہے مردِ انا الحق کا وطن
عرش ہے مردِ خدا کی جاگیر

روک لے ابرِ کرم گستر کو
کھینچ کر برقِ تپاں کی زنجیر

عقل کے پنجۂ بیعت سے نکل
ترا مرشد، ترا مولا ہے ضمیر

اُس کے لکھے کو بدل سکتا ہے عشق
جس کی تقدیر ہو پتھر پہ لکیر

دل سے طے ہوتی ہے شہراہِ فلک
دل ہی کرتا ہے خلا کو تسخیر

اس کا گھر پوچھتی پھرتی ہے رضا
شیر افضل ہے انا مست فقیر

غمِ حیات کا رہ رہ کے زہر پینا ہے
رہینِ زیست کو سُولی پہ چڑھ کے جینا ہے

زہے خدا و زہے ناخدا زہے قسمت
ہمارا آج بھی گرداب میں سفینا ہے

جنوں کے تھک کے سرِ رہ بیٹھ جانے پر
نثارِ گردشِ ایّام کا پسینا ہے

تپِ شباب سے ہے گرم ریگ زارِ دلاں
یہ عمر، عمر ہے یا جیٹھ کا مہینا ہے

خود اپنے دستِ حنا سے جڑا ہے قدرت نے
کہ انگشتری ہے اجل، آدمی نگینا ہے

ہمیں نے دامنِ یزداں کو چاک چاک کیا
ہمیں کو تارِ رگِ جاں سے اس کو سینا ہے

ہزار جان سے قرباں انبیاؑ اس پر
عروسِ مرگ بھی افضل عجب حسینا ہے

پروین سرور

حادثہ

تراب علی کی لاش کو لوگ لکڑی کے پُل کے نیچے سے اُٹھا رہے تھے۔

اُس کی موت پُل کے جنگلے پر سے گر کر بیس پچیس فٹ کی گہرائی میں گر جانے سے واقع ہوئی تھی جہاں ریل کی پٹڑیوں کا جال بچھا تھا۔

پُل کا جنگلہ بڑی مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا جس کے ٹوٹنے کا کبھی امکان ہی نہ تھا ...ن پھر اُس کی پکی سڑک پر سے موٹریں گزرتیں۔ تانگوں اور بسوں کا ہنگامہ رہتا اور پیدل چلنے والے جنگلے کے ساتھ ساتھ بنے ہوئے اینٹوں کے فٹ پاتھ پر بے خوف و خطر چلتے تھے۔ یہی نہیں۔ وہاں تو شام کے جھٹپٹے میں بھی اناج اور بھوسہ کی لدی پھندی بیل گاڑیاں قطار بنائے آگے پیچھے رینگتی رہتی تھیں۔ صبح کے دھندلے دھندلے غبار میں دودھ بیچنے والے اپنی گائیں، بھینسیں لے کر اسی پل پر سے گزر کر نشیب میں دور دور تک پھیلے ہوئے میدانوں اور ریلوے کالونی میں بنے ہوئے نئے بنگلوں تک صحیح سلامت پہونچ جاتے تھے۔

اِس قسم کا حادثہ پیش آنا بڑی غیر معمولی بات تھی۔

ساڑھے نو بجے کی پسنجر ٹرین کناری جنکشن کو چھوڑ چکی تھی۔ اور اب دس بج رہے تھے۔ آدھ گھنٹہ گزر جانے کے بعد فضا خاصی مطمئن ہو چلی تھی۔ سامان سے بھرے ہوئے ٹھیلوں اور ٹرالیوں کی گڑگڑاہٹ ۔ قلیوں اور مسافروں کی چیخ پکار مدھم پڑ چکی تھی۔ پُل کے آر پار جانے والے مسافر گزر چکے تھے۔ کسی کسی وقت کوئی اکا دکا راہگیر نمودار ہو جاتا تو اُس کی اہمیت بے موقع بارش کے ایک قطرے سے زیادہ نہ ہوتی۔ لہٰذا دسمبر کی ٹھٹھرتی ہوئی رات کی خاموشی میں پُل پر سے کھڑے ہو کر جنکشن پر جلتی ہوئی روشنیوں کا ہجوم بڑے اطمینان سے دیکھا جا سکتا تھا۔

پُل کے نشیب میں ایک طرف اونچے اونچے سایہ دار درختوں کے جھنڈ تھے جن میں دور دور تک ریلوے کالونی کے سرکاری اور غیر سرکاری بنگلے تھے۔ کچھ کچے کوارٹر تھے جہاں دن بھر نچلے طبقے کے ریلوے ملازمین کے بچے میلے کچیلے کپڑے پہنے دھول میں لڑتے اور اُلجھتے رہتے تھے۔ قریب ہی دو چار چھپر کی چھت سے ڈھکی ہوئی جھونپڑیاں تھیں جن میں لالٹینوں کی زرد روشنی ٹمٹما رہی تھی۔

ذرا فاصلے پر اِن درختوں میں گھرا ہوا کالونی کے گرجا کا مخروطی مینار بھی اُبھرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اُس کے قریب ہی مشن اسکول کی خاموش عمارت تھی جس کے سامنے بجلی کے کھمبے کا دُھندلا دُھندلا جلتا ہوا بلب دکھائی دیتا تھا۔

یوں تو اُس علاقے میں ہر طرف روشنی تھی لیکن پُل پر سے اُتر کر جس کچی پگڈنڈی کے سہارے چل کر تراب علی ریلوے کالونی کے پچھواڑے اپنے گھر پہونچتا تھا ـــــ وہ بالکل سنسان تھی۔

پُل کے دوسری طرف جہاں سے وہ ابھی ابھی آیا تھا درختوں کے جھنڈ یا سایہ دار عمارتیں نہ تھیں بلکہ ایک پکی سڑک چلی گئی تھی جو خاص کناری جنکشن اور شہر کے راستے کو ہموار کرتی تھی۔ اسٹیشن سے کچھ ہی فاصلے پر

اِس سڑک کے سہارے خیابان ریستوران تھا جہاں ساز بج رہا تھا - اور حسین جوڑے رقص کر رہے تھے - کبابوں اور چانپوں کی خوشبو اُڑ رہی تھی - اور صاف ستھری میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے بے فکرے نوجوان خوشی خوشی ایک دوسرے کی زندگی اور صحت کا جام ٹکرا رہے تھے -

ایک جام ـــــ صرف ایک جام ـــــ زندگی کی مسرتوں سے لبریز ـــــ ولولوں اور ارمانوں سے چھلکتا ہوا جام ـــــ جس میں ڈوب کر سارے غم نابود اور ہماری رفاقت کی خوشگوار شام جاوداں ہو جائے -

ایک لطیف جھنکار کے ساتھ کانچ کے نازک گلاس ٹکرائے ـــــ اور لبوں تک پہونچے - ساز کی آواز تیز ہو گئی - اور اُس کے ساتھ ہی رقص کرتے ہوئے قدموں کی رفتار تیز تر -

ساز کی آواز ـــــ سنگیت کی لہریں ـــــ اور رقص کا جادو -

زندگی کے سارے غم شیشے کی طرح دُھل کر صاف ہو چکے تھے - ریستوران میں روشنی کی پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں - اور رات کو بھی دن چڑھا ہوا تھا -

اِس حادثے کی خبر جب رحمان گھوڑے نے سُنی تو وہ برتنوں کے انبار پر جُھکا ہوا تھا - ہوٹل کے گندے کچن میں نل کا پانی بڑے زور شور سے ایک بالٹی میں گر رہا تھا - اُس نے جلدی سے خود کو سنبھالتے ہوئے نل پر اپنا ہاتھ رکھا - کچھ دیر سناٹے میں پتھر کا بُت بن کر کھڑا رہا - اُس کے بعد وہ اپنے جبڑے کھول کر پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے دیوانہ وار ہنسا ـــــ " مر گیا ـــــ تراب علی مر گیا ـــــ بُزدل ہی نکلا ـــــ اتنی ذرا سی چوٹ بھی برداشت نہ کر سکا ـــــ اور مجھے دیکھو ـــــ میری طرف دیکھو کہ میں اپنی چوٹوں کے سہارے جیتا ہوں ـــــ یہ زخم ـــــ میری زندگی ہیں "ـــــ

وہ دیر تک ہنستا رہا ـــــ چیختا رہا ـــــ چلاّتا رہا ـــــ پھر جب اُس کے پھیپھڑے پھٹنے لگے اور کرخت آواز حلق میں بیٹھ کر جھنکار کرنے لگی تو اُس نے سامنے کی دیوار پر کھنچ کر اپنا گلا صاف کیا - " تھو ـــــ آخ ـــــ تھوہ ـــــ اِس دُنیا میں وہ کرنے کیا آیا تھا ـــــ چوروں کی طرح چھپ چھپ کر جیا - - اور پھر بُزدلوں کی طرح مر گیا "ـــــ

رحمان گھوڑا اُس وقت بالکل پاگل دکھائی دے رہا تھا ـــــ اُس نے جلدی جلدی گندے برتنوں کا انبار وہیں چھوڑا ـــــ اور سرپٹ بھاگتا ہوا ریل کے پُل کی طرف چل دیا -

راستے بھر اُسے اپنے متعلق ہی خیال آتا رہا ـــــ وہ کون ہے ـــــ کیا ہے ؟ کہاں ہے ! کہاں جائے گا ؟ اُس کی کوئی منزل بھی ہے یا نہیں ؟ اور اگر ہے تو کون سی ؟

اُسے صرف اتنا یاد تھا کہ جب وہ پانچ برس کا تھا تو اُس کا باپ مر گیا - ماں نے غربت اور بے کاری سے تنگ آکر دوسری شادی کر لی ـــــ اور پانچ ہی برس کے بعد وہ بھی مر گئی - اُس کا سوتیلا باپ اُسے بہت مارتا تھا - کھانے کو نہیں دیتا تھا - اور ایک دن جب اُس کو ہوش آیا تو وہ اِسی ہوٹل کے کچن میں گندے برتنوں میں پڑی ہوئی ہڈیوں پر جُھکا ہوا تھا -

ہوٹل میں وہ دن کے آٹھ گھنٹے کھڑے کھڑے کام کرتا - روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے دگنی ڈیوٹی پوری کرنے کو پیش پیش رہتا - لیکن جب اُس کے پیٹ میں جلتی ہوئی آگ سرد نہ ہوتی تو وہ چوری کرتا ـــــ جتنی بار چوری کرتا اُتنی ہی بار پٹتا ـــــ نتیجہ یہ کہ بھوک - چوری اور مار پیٹ اُس کی زندگی کا جزو بنتی چلی گئیں اور وہ اِن سب کا عادی ہو گیا -

جب اُس کی یہ تینوں عادتیں پختہ ہو گئیں تو وہ چوری کے الزام میں کئی بار جیل بھی گیا - چھ چھ مہینے کی جیل ہمیشہ اُس کے لئے ٹریننگ کا کام دیتی - اور جتنی مرتبہ بھی وہ باہر نکلا اُس کے دوستوں کی پلٹن میں اضافہ ہوتا گیا - اب وہ نقب زنی کے ساتھ ـــــ ہیرا پھیری کے فن کا ماہر تھا - اور

سٹے کا اُستاد ــــ خود بھی کھیلتا اور دوسروں کو بھی کھلاتا تھا۔

اُس کا رنگ بہت گورا تھا۔ اتنا گورا ــ جیسے پھیکا شلغم ــ اِس لئے شروع شروع میں جب وہ اِس ہوٹل میں بڑی معصومیت سے برتن دھوتا تھا تو لوگ اُس کے سفید رنگ اور بھوری آنکھوں کی مناسبت سے اُسے رحمان گورا کہکر پکارتے تھے۔ وہ اپنے اِس نئے نام سے دِل ہی دل میں خوش بھی ہوتا تھا ــــ لیکن جب چار ــ چھ مرتبہ ــــ وہ جیل کاٹ کر آیا تو اُس کا نام بجائے گورے کے گھوڑا ہو چکا تھا ــــ رحمان گھوڑا ــــ

پکی سڑک کی روشنی کو چھوڑ کر جب وہ پُل کے قریب پہونچا تو لوگ تراب علی کی لاش پر جھکے ہوئے تھے۔ منہ کے بل گرنے کی وجہ سے اُس کا سر پھٹ گیا تھا۔ اور خون کا فوّارہ اُبل کر اُس کے جھرّیوں بھرے چہرے کو ڈھانپ رہا تھا۔ اُس کی سفید ململ کی کلف دار پگڑی سر سے اُتر کر پٹری کے نیچے پکھے ہوئے پتھروں پر پڑی تھی۔ اور اُڑتے ہوئے کبوتر کے دُم کی طرح ہوا میں لہراتا ہوا اونچا طرہ پچک کر رہ گیا تھا۔ اُس کی تنی ہوئی مونچھیں خون آلود ڈاڑھی میں اُلجھ گئی تھیں۔ البتہ جب چاند کی پھیکی پھیکی چاندنی میں اُس کو سیدھا کیا گیا تو اُس کی فراخ پیشانی پر سیاہ آثار السجود نُور کے ہالے کی طرح چمک رہا تھا۔

رحمٰن پھوٹ پھوٹ کر رو دیا ــــ یوں جیسے اُس کا باپ دُنیا سے اُٹھ گیا ہو ــــ

اُسے حیرت تھی تو اِس بات کی کہ ابھی ابھی تو تراب علی اُس کے پاس سے اُٹھکر آیا تھا۔ ایک گھنٹہ پہلے ہی کی تو بات ہے کہ وہ جیتا جاگتا اُس کے پاس بیٹھا تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا تھا۔ تراب علی نے ریستوران کے مالک سے اُس کی سفارش کی تھی۔ پھر دونوں نے مل کر عشاء کی نماز پڑھی تھی۔ رحمان کے بحال ہو جانے پر شکرانے کے دو دو رکعت نفل بھی ادا کئے تھے۔ جی بھر کر باتیں کی تھیں ــــ اور اب ــــ یہ کیسے ہو گیا؟ کیوں ہو گیا؟ نہ ہوتا تو کیا تھا؟

تراب علی پانچ وقت کا نمازی اور تہجد گزار تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اُس کی زندگی میں ایک آدھ مرتبہ ایسا بھی موقع آیا ہو جبکہ وہ اپنی تنگدستی کی وجہ سے کوئی غلط قدم اُٹھانے پر مجبور ہو گیا ہو ــــ لیکن ایسی لغزشیں کس کی زندگی میں نہیں آتیں؟

اُس کی موت اُس کی بیوی مریم کی موت کی طرح بڑی ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ گئی گزری کہنے والے دہراتے تھے کہ ایک رات وہ بھی اِسی لکڑی کے پُل پر سے پیر پھسل جانے کی وجہ سے انہی ریل کی پٹریوں پر جا گری تھی۔ اور اُس کے ماتھے کی رگ اِسی طرح پھٹ گئی تھی۔

تراب علی جب مریم کی لاش کو کندھے پر اُٹھا کر لایا تو اُس کی آنکھوں کے کنارے خشک تھے۔ اُن میں ایک بھی آنسو طوفان اُٹھا دینے کو نہ مچل رہا تھا۔ وہ ساکت ہو چکا تھا ــــ بالکل پتھر ــــ اور اُس کو چپ سی لگ گئی تھی۔

وہ دن اُس کی زندگی میں بڑا اہم تھا ــــ اُس دن وہ دفتر سے چھٹی لے کر کسی سرکاری کام پر خیابان ریستوران کی پکی سڑک سے گذر کر شہر گیا تھا۔ بھادوں کا مہینہ تھا۔ اور بھیگی بھیگی ہوائیں شباب پر تھیں۔ سارا دن بسوں اور لمبی لمبی کاروں کی ریل پیل دیکھنے کے بعد جب وہ رات گئے گھر واپس آیا تو خالی ہاتھ نہ [illegible] بلکہ وہ مریم کے لئے ایک خوبصورت ریشم کا دوپٹہ لایا تھا۔ ساون کی تھم تھم کر چلنے والی ہواؤں کی طرح سرسراتا پھسلتا [illegible] دوپٹہ ــــ جس کو سر پہ لیتے ہی مریم بجائے خوش ہونے کے اچانک پوچھ بیٹھی تھی ــــ "کتنے میں لیا"ــ؟

مریم کے شہابی گلابی چہرے پر ایک بھی خوشی کی کرن نہ پھوٹی ــ وہ اُس سے بہت خفا تھی ــ رات زیادہ گزر چکی تھی۔ اور وہ اپنے دونوں بچوں کو سُلا کر ٹھنڈے فرش کی چٹائی پر پلنگ کی پٹی کے سہارے اُس کے انتظار میں بیٹھی بیٹھی اونگھ گئی تھی۔

تراب علی نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا - اُس نے صرف اپنا کوٹ اُتار کر کھونٹی پر لٹکایا - اور پھر پگڑی کو بڑی احتیاط سے دیوار میں لگی الماری میں رکھدیا ——

مریم جیسے خواب میں آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی ——
"اتنی رات گئے آتے ہو —— تو میرا "جی ڈوب جاتا ہے"
میں شہر چلا گیا تھا مریم! وہاں دیر ہوگئی —— تراب علی کی نرم آواز اُس کو سمجھا رہی تھی -

مریم نے سر سے دوپٹہ اُتار کر پلنگ پر رکھدیا - اور خود نیند میں کسمساتی ہوئی صغریٰ کو گود میں لے کر تھپک تھپک کر سلانے لگی - "کیوں؟ پسند نہیں آیا"؟ تراب علی کپڑے بدلکر اُس کے قریب ہی آن بیٹھا -

"پہلے یہ بتاؤ —— کتنے میں لیا؟"

تراب علی کی آمدنی اتنی نہ تھی کہ وہ مریم کے لئے قیمتی کپڑے اور زیور لے کر آتا لیکن اُس کے دل میں ہمیشہ یہی خواہش اُٹھتی کہ وہ اُس کے لئے شہر سے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لیکر آئے -

اُس سے کوئی جواب نہ بن پڑا - اپنی قمیص کی خالی جیب ٹٹولتا ہوا چپ چاپ اُٹھا - پھر اپنے بستر میں سوئے ہوئے قدیر کو جھک جھک کر پیار کرنے لگا -

"مت بتاؤ —— کوئی بات نہیں —— میں ہرگز نہ لوں گی —— کبھی بھی نہ لوں گی" —— مریم جلے دل سے دوپٹے کو پھینک رہی تھی -

وہ بے اختیار پلٹ کر اُس کے پاس آیا - پھر بڑی حسرت سے کہنے لگا - "مریم! کیا میرا جی نہیں چاہتا کہ تجھے اچھے کپڑے پہنے دیکھوں —— بس چلے تو تجھے سونے میں پیلا اور چاندی میں اُجلا کردوں —— مگر ——"

کوٹھری میں جلتی ہوئی لالٹین ہوا کے ایک سرد جھونکے سے سرسرائی اور پھر اُس کی لَو اونچی ہوگئی - زرد روشنی میں مریم کا چہرہ نور سے دُھلا دُھلا لگ رہا تھا - وہ جب بھی کبھی اُس سے بگڑ جاتی تھی تو اُس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر سنجیدگی کی مہر لگ جاتی تھی - اور آنکھوں میں تقدس کی چمک اُمنڈ آتی تھی -

"تو پھر بتاتے کیوں نہیں کہ کتنے میں لیا ——؟ کہاں سے لیا؟"

تراب علی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا - دن بھر شہر میں دھول اُڑاتی ہوئی کاروں کو دیکھ دیکھ کر اُس کا دل کُڑھتا رہا —— کاش! وہ بھی امیر ہوتا —— ایک سرکاری دفتر کا معمولی کلرک نہ ہوتا - اُس کے پاس بھی اتنے روپے ہوتے کہ اُس کی مریم بھی ایک بڑی سی چمکیلی کار میں اچھے اچھے کپڑے پہن کر بیٹھ سکتی - اُس کے سر پہ دھانی دوپٹے کا باریک آنچل گھونگھٹ کا پٹ بنائے ڈھلک جاتا —— اور اُس کی سونے کے کنگن اور چوڑیوں سے بھری نازک سی کلائی بڑے ناز سے شیشے کی کھڑکی میں جھلک اُٹھتی ——

وہ اصل بات بتانا نہیں چاہتا تھا اِس لئے مریم کی ضد کے سامنے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دینے کے اور کچھ بھی نہ کرسکا —— "مریم —— تو اگر خفا نہ ہو تو پھر میں بتاؤں"؟

"ہاں —— ہاں —— نہیں ہوؤں گی ——" وہ اُس کا راز اُگلوانے پر تُلی ہوئی تھی -

تراب علی نے اطمینان سے صغریٰ کو اُس سے اپنی گود میں لے لیا - اور پالتی مار کر زمین پہ بیٹھتے ہوئے بولا —— "قرض لے کر آیا ہوں ——"

"بالکل جھوٹ کہتے ہو —— ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا - تمہیں کون قرض دے گا ——"

"دینے والوں نے دیا -"

"اِدھر دیکھو —— قدیر کی طرف —— اپنے بچے کے سر کی قسم کھاؤ -"

قدیر گہری نیند میں غافل تھا - اُس نے سونے سے پہلے اپنے باپ کے آنے کا بہت انتظار کیا تھا - اِس لئے اُس کے سرہانے اُس کی کتابوں سے بھرا ہوا بستہ اور گیند بلا بڑی احتیاط سے رکھا ہوا تھا - اور قریب ہی میز پر تختی دُھلی

رکھی تھی۔

سوتے میں وہ بالکل مریم کی طرح نظر آرہا تھا۔ اُس کی لمبی لمبی سیاہ پلکوں کا سایہ اُس کے رخساروں پر پڑ رہا تھا۔ اور چہرے پر معصومیت چھائی ہوئی تھی ——

تراب علی باوجود کوشش کے قدیر کی طرف اپنی نظریں نہ اُٹھا سکا۔ اور اُس کا سر شرم سے جُھک گیا۔ تھوڑی دیر کے وقفے کے بعد وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا "مریم! مجھ سے غلطی ہو گئی —— جب میں شہر جا رہا تھا —— تو میرے آگے آگے چلنے والے ایک امیر آدمی کا بٹوہ اُس کی جیب میں سے گر گیا تھا" ——

مریم تیز تیز نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بات کاٹ کر بولی "اور —— اور تم نے وہ بٹوہ اُٹھا لیا؟"

"ہاں" وہ ندامت میں ڈوب کر بولا —— "میں نے اُٹھا لیا۔"

مریم کے ہونٹوں سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ "تم نے؟ اُس کو آواز نہ دی —— اُس کی امانت واپس نہ کی؟ یہ بے ایمانی تم نے گوارا کیسے کر لی؟ تمہارا ضمیر کہاں تھا؟"

"مریم —— مریم —— خدا کے لئے ذرا سوچو تو —— اس دنیا میں اتنی ایمانداری سے جینا کتنا عذاب ہے؟ —— ایک پَل کا سکھ خریدنے کے لئے ہمیں کتنے دکھوں کا بوجھ اُٹھانا پڑتا ہے —— ذرا —— ٹھنڈے دل سے غور تو کرو" ——

"تراب علی!" وہ بڑے کرب میں چلائی —— "میں نے قرآن پڑھا ہے —— حدیث پڑھی ہے —— بزرگوں کی نصیحتیں —— آج تک سُنتی چلی آئی ہوں —— میں نے کہیں بھی چوری اور بے ایمانی کو جائز نہیں سُنا" ——

وہ بڑی جذباتی ہو رہی تھی۔ وہ یونہی جب کبھی غصّہ میں بھڑک اُٹھتی تھی تو پھر دُنیا کی کوئی طاقت اُس کو روک نہیں سکتی تھی۔ اُس نے دوپٹے کو ایک نجس چیز کی طرح چٹکیوں میں سنبھالا اور دبے پاؤں گھر سے باہر نکل آئی۔

"مریم —— کہاں جا رہی ہو —— ذرا ٹھہرو تو" —— تراب علی پریشان ہو کر صغریٰ کو پلنگ میں لٹاتے ہوئے اُس کے پیچھے لپک آیا ——

"میں تمہیں کبھی تمام عمر معاف نہ کروں گی تراب علی —— تم نے مجھے اتنا ہی گرا ہوا سمجھ لیا ہے کہ میں تمہاری ان ذلیل باتوں سے خوش ہو جاؤں گی۔"

"ذرا دم تو لو —— مریم —— اتنی تیزی نہ کرو —— جلدی میں مت آؤ —— ذرا ٹھہرو" ——

لیکن مریم کے سر پر تو غصّے کا بھوت سوار تھا۔ اُس کو تراب علی کی ایک بات بھی اچھی نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ ریلوے کالونی کے کوارٹروں سے گزر کر وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی ریل کی پٹڑیوں کے اُس بالائی حصّے پر پہونچ چکی تھی جہاں یہ لکڑی کا پُل زیرِ تعمیر تھا۔ اُن دنوں یہاں ٹریفک کی ممانعت تھی۔ پُل کی سڑک پر تمام دن تارکول پھیلا کر بجری بچھائی جاتی —— اور بھاری انجن پھکا پھک دھواں اُڑاتا رہتا۔

تراب علی اُس کے قریب ہانپتا ہوا آگے بڑھا —— "یہاں کیوں آئی ہو —— واپس چلو" ——

"میں تمہارا یہ دوپٹہ ریل کی پٹڑی پر پھینکوں گی اور جب یہ کسی گھڑگھڑاتی ہوئی گاڑی کے پہیوں میں دب کر تار تار ہو جائے گا تو" ——

تراب علی نے رات کی ملگجی روشنی میں اُس کا ہاتھ پکڑ کر کھلی سڑک کی طرف روکنا چاہا تو وہ پارے کی طرح مچل کر ایک قدم اور آگے بڑھ گئی —— اور پھر اپنا توازن برقرار نہ رکھنے کے سبب وہ منہ کے بل بیس پچیس فٹ کی گہرائی میں لکڑی کے پُل کے کمزور جنگلے سے پیر پھسل جانے کی وجہ سے ریل کی پٹڑیوں کے جال پر جا ٹکرائی۔

اُس کی لاش کو جب دھانی دوپٹے میں لپیٹ کر تراب علی گھر پر آیا تو وہ پتھر کی طرح ساکت تھا۔

کئی دنوں تک وہ یہی سوچتا رہا کہ وہ بھی کپل وستو کے

شہزادے کی طرح اپنا گھر بار چھوڑ کر جنگل میں جا بیٹھے ——— گاؤں —— گاؤں —— اور نگر نگر گھوم کر روح کا ابدی سکون ڈھونڈھ نکالے ——— امن و شانتی کی تلاش میں زندگی کے باقی دن گزار دے —— لیکن ——— اس کے بچوں کا کیا حشر ہوگا ——— اتنی بڑی دُنیا میں وہ کس کے سہارے جیئں گے ——— اُنھیں پالنے والا کون ہوگا؟

اور پھر اُس نے ایک دن قدیر کے سر پہ ہاتھ رکھکر حریم کے ساتھ ایک خاموش عہد باندھا - کہ عمر بھر چاہے گھر میں فاقے ہوں —— چاہے پیٹ سے پتھر باندھ کر سونا ہی کیوں نہ پڑے —— وہ کبھی بے ایمانی نہ کرے گا -

اُس دن کے بعد کوئی دن بھی ایسا نہ گزرا جب اُس نے نماز قضا کی ہو ——— کوئی جمعہ ایسا نہ آیا کہ وہ مسجد میں نہ گیا ہو - اور کوئی رات ایسی نہ گئی جب اُس نے گریہ و زاری سے فراغت پائی ہو - وہ مجرم تھا - اپنی بیوی کی موت کا باعث تھا - وہ اپنی نظر میں خود ہی گر چکا تھا - اُس کے لئے زندگی اب زندگی نہ تھی بلکہ دو معصوم زندگیوں کا بوجھ تھی جسے اپنے کندھوں پر اُٹھائے اُسے تمام عمر دشوار گزار راستوں پہ گھسٹنا تھا -

شروع شروع میں تو اُسے ہر بات بڑی تکلیف دہ معلوم ہوئی تھی - مثلاً قدیر کا سارا سارا دن اپنی کتابوں کے سامنے بیٹھ کر گہری سوچ میں ڈوبے رہنا - صغریٰ کا پلنگ پہ لیٹے لیٹے روتے رہنا - اور خود اُس کا ذہنی کشمکش میں اُلجھتے رہنا - لیکن پھر جیسے گزرتے ہوئے دنوں کے سہارے اُس کی مصیبتوں کے بڑھتے ہوئے طوفان میں کمی سی آگئی ——— وہ ان تمام تکلیفوں کو برداشت کرنے کا عادی ہوگیا -

دن گزرتا ——— شام آتی ——— پھر رات گزرتی — — تو دوسرا دن نمودار ہو جاتا ———

زندگی میں کوئی جاذبیت نہ تھی - کوئی حسن نہ تھا - وہ صبح ہی صبح اُٹھ کر اپنے دفتر چلا جاتا ——— دن بھر کے کام کے بعد تھکا ہارا گھر کو واپس آجاتا —— دوسرے دن پھر دفتر چلا جاتا -

آخر کار ایک دن اُس نے اُکتا کر سوچا کہ زندگی کو تو بہر حال گزارنا ہی ہے —— مشکل کے دن —— اِس طرح تو نہ گزر سکیں گے ——— یوں رو کر گزارنے سے فائدہ ———

اِس خیال سے وہ قدیر کو اپنے ساتھ تیار کرتا - اُس کے کپڑوں کا خیال رکھتا - اُس کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتا - پھر اُس کی کتابیں سنوارتا ہوا اُسے اسکول چھوڑنے جاتا ——— واپسی پر اپنے ساتھ ہی اسکول سے لے کر آتا -

دن بڑی تیزی سے گزرتے جا رہے تھے —— گرمی رخصت ہوئی تو سورج کی روشنی مٹیالی پڑ گئی - ہوا میں بڑی لطیف خنکی کی لہر بھرتی چلی گئی ———

دو تین دن کی مسلسل بارش کے بعد اُس دن سورج پہلی مرتبہ دھند کا پردہ ہٹا کر بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا - دُھلے دُھلے موسم میں وہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا گھر واپس آ رہا تھا تو مشن اسکول کے بڑے گیٹ پر اُسے قدیر کتابیں اُٹھائے ——— سر جھکائے باہر آتا دکھائی دیا ———

تراب علی نے آگے بڑھکر اُس کی کتابیں سنبھال لیں ——— پھر بڑے پیار سے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کالونی کے گرجا کے پارک کے سامنے نکل آیا ———

پارک میں اُس دن ضرورت سے زیادہ رونق تھی - رنگ برنگ پھول کھلے تھے - سورج کی روشنی میں ہر چیز نکھری نکھری معلوم ہو رہی تھی - ہری ہری گھاس پر خوبصورت بچے شور مچا مچا کر بھاگ رہے تھے - ایک دوسرے کو پکڑ رہے تھے ——— جان جان کر زمین پر گر گر کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے - چمکیلی کاریں کھڑی تھیں جن میں سے خوبصورت عورتیں اُتر رہی تھیں - کاروں کے گرد فقیروں اور بھک منگوں کا میلہ لگا تھا - خشک میوہ بیچنے والے پٹھانوں اور نیلے پیلے غبارے بیچنے والوں کا ہجوم تھا -

تراب علی اِس بہار کو دیکھکر لمحہ بھر کے لئے ٹھٹک گیا - اُس نے جُھک کر قدیر کی طرف دیکھا جو دوسرے بچوں سے بہت مختلف تھا - وہ نہ کبھی اُچھل اُچھل کر شور مچاتا ہوا کھیلتا تھا -

نہ کسی چیز کے لئے ضد کرتا تھا۔ نہ اُسے کچھ خریدنے کی خواہش تھی۔

تراب علی نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پیار سے دباتے ہوئے پوچھا —— تم بھی اِن بچّوں کے ساتھ کھیلوگے؟

"نہیں" ——

"تمہارے لئے کیا خریدوں؟"

"کچھ بھی نہیں" ——

پھر وہ خاموشی سے اُس کا ہاتھ پکڑ کر یہی لکڑی کے پُل پر سے ہوتا ہوا واپس شہر کی طرف جانے والی پکّی سڑک پر سے گزر کر خیابان ریستوران میں چلا گیا ——

خواہ کچھ بھی ہو جائے —— وہ ایک پل کی خوشی خریدنے کے لئے بہت سے دُکھوں کا بوجھ ضرور اُٹھائے گا ——

اُس دن تراب علی نے ریستوران کی سجی ہوئی میز کرسی پر بیٹھ کر دو کپ چائے کا آرڈر دیا —— گرم گرم چانپ اور کباب منگوائے —— اور قدیر کو بہلانے کی کوشش کرتا رہا ——

شام ہو رہی تھی۔ اِس لئے وہ جلدی جلدی صغریٰ کے لئے ایک کیک اور کچھ نمکین بسکٹ خرید کر گھر کی طرف آنے لگا۔ تو رحمان گھوڑا جلدی جلدی اُس کی طرف بھاگا آیا ——

"بابو صاحب!"

تراب علی نے مڑکر اُس کی طرف دیکھا —— گھوڑے کی طرح لمبا اونچا آدمی سرخ سرخ آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھکر مسکرا رہا تھا —— اُس کی قلمیں بڑھی ہوئی تھیں —— اور گھونگھریالے بالوں میں تیل چمک رہا تھا۔

"کیا بات ہے" ——

"بل تو آپ نے دیدیا —— باقی کے پیسے نہیں لئے"

"اوہ —— اچھا" —— تراب علی نے اپنا ہاتھ پھیلایا۔

رحمان نے اپنی خاکی زین کی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا —— اور مٹھی بھر کر روپے نکال کر کچھ سکّے گنتے ہوئے تراب علی کے ہاتھ پر رکھ دیئے ——

"مالدار ہو رہے ہو سیٹھ" ——

"خدا کا فضل ہے —— فضل —— بابو صاحب" ——

"گاہکوں کو لوٹتے ہو —— خاں" —— تراب علی ہنس کر اُسے ٹپ دیتے ہوئے بولا ——

"نہیں بابو صاحب —— دو چار آنے میں کیا ہوتا ہے —— یہ تو اپنا کاروبار چلتا ہے —— خدا کا فضل ہونا چاہیئے" ——

پھر وہ ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے تراب علی کی طرف بڑھا کر بولا —— "لو پیو" ——

"نہیں —— بھائی —— مجھے عادت نہیں ہے" ——

"ارے —— ؟ تو دنیا میں کیا سوکھے ہی آئے —— سوکھے ہی جاؤگے ؟"

تراب علی جلدی سے جواب دیئے بغیر سڑک کی طرف بڑھا تو رحمان گھوڑے نے قدیر کو دیکھکر شرارت سے اپنی آنکھیں جھپک دیں —— اور پھر ہنستا ہوا ہوٹل کے کچن کی طرف چلا گیا ——

اُسی طرح خاموشی سے قدم بڑھا کر جب وہ دونوں اپنے گھر میں داخل ہوئے تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ قدیر نے اپنی کتابیں الماری میں رکھکر بڑی سادگی سے پوچھا ——

"میاں جی —— موٹر کتنے میں آتی ہے" ؟

"کیا ؟" تراب علی اُس وقت نماز کے لئے وضو کا اہتمام کر رہا تھا۔

"میاں جی" —— قدیر اُس کے قریب ہی آگیا —— "موٹر —— میاں جی —— موٹر کار —— ہاں —— موٹر کار —— کتنے میں آتی ہے ؟" ——

تراب علی نے کلمہ پڑھتے ہوئے پانی کے چھپاکوں میں منہ چھپالیا۔ "تو کیا کرے گا پوچھ کر ؟"

"کچھ نہیں —— یونہی پوچھتا تھا —— وہ جو چیف صاحب ہیں نا —— اُن کے گھر نئی کار آئی ہے —— بڑی اچھی سی —— سرخ سرخ سی —— چمکدار —— لمبی" ——

"کار تو عبدالقدیر بیٹا —— بہت روپوں کی

آتی ہے ــــ تیرے میرے بس کی بات کہاں "ــــ

"تو چیف صاحب نے کیسے لی؟"

"اُن کے پاس بہت روپے ہیں"ــــ

قدیر یہ بات سُن کر کھو سا گیا "ــــ اور ــــ روپے کہاں سے آتے ہیں میاں جی؟"

"پڑھ لکھ کر ــــ اونچی نوکری کرنے کے بعد"ــــ

"اور کسی طرح نہیں آتے؟"

"نہیں ہے"ــــ

"تو پھر ــــ میاں جی"ــــ وہ کچھ سوچتے ہوئے رک رک کر پوچھنے لگا ــــ "وہ ــــ رحمان گھوڑے کے پاس اتنے روپے کہاں سے آتے ہیں؟"

تراب علی سناٹے میں رہ گیا ــــ وہ کچھ بتا نہ سکا ــــ تو قدیر کو ٹالنے کے لئے بولا ــــ "لاتا ہوگا کہیں سے ــــ اُس کا اپنا ہی کوئی کام ہوگا ــــ" اُس نے ٹخنوں تک اپنے پاؤں دھو کر جوتا پہنا اور چوکی گھسیٹتے ہوئے بولا ــــ "تجھے اگر کار چاہیئے تو جی بھر کر بہت سا پڑھ ــــ ڈھیر سارے امتحان پاس کر پھر خدا تجھے بھی ایک چھوڑ چار چار موٹریں دے گا"ــــ

"خدا کہاں ہے میاں جی"ــــ قدیر نماز کی چوکی کے ایک کونے پر ہی ٹِک گیا۔

"نماز میں"ــــ تراب علی جائے نماز سیدھی کر کے اُس کو الگ ہٹاتے ہوئے اپنی بات پر چونک گیا ــــ "وہ ہم سب کے دل میں ہے"ــــ

"خدا ایک ہوتا ہے ــــ ہیں میاں جی"

"ہاں"ــــ

"تو پھر وہ اتنے سارے دِلوں میں کیسے گھُس گیا؟"

تراب علی ان سُنی کر کے سجدے میں جھُک گیا۔

قدیر اُسی چوکی پر سر جھکائے بہت کچھ سوچتا رہا ــــ ایک بات اُس کی سمجھ میں ہی نہ آتی تھی کہ رحمان گھوڑے اور چیف صاحب میں کیا فرق ہے؟ دونوں ہی کے پاس ڈھیروں روپے ہوتے ہیں ــــ لیکن پھر بھی دونوں برابر نہیں ہیں ــــ پڑھنا اور نہ پڑھنا کیا ایک ہی جیسی بات ہوتی ہے ــــ اگر نہیں تو پھر ــــ روپے ــــ؟ کہاں سے آجاتے ہیں ــــ آخر کیسے؟

تراب علی نے جب دعا مانگ کر نماز ختم کی تو قدیر خوش ہو کر بولا ــــ "چاہے کچھ بھی ہو جائے ۔ میں بہت بڑا آدمی بنوں گا"ــــ

"انشاء اللہ"ــــ تراب علی کا رواں رواں خوشی سے بھر گیا ــــ

قدیر نے جب دسویں کے امتحان کی تیاری کی تو نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات ــــ

کالونی کے سایہ دار درختوں سے گھرے ہوئے بنگلوں کے سامنے کون سا بجلی کا کھمبا نہ تھا جس کی دھندلی روشنی میں اُس نے اپنی کتابوں کے ورق نہ پلٹے تھے۔ گرمیوں کی چلچلاتی دوپہروں میں کون سی ایسی سایہ دار دیوار نہ تھی جس کے سہارے اُس اُس کے کمر ٹکا کر اپنا قلم نہ لگایا تھا ــــ ریلوے کالونی کے گرجا کی داخل سیڑھیوں میں سے کون سی ایسی نہ تھی جس پر بیٹھ کر اُس نے صبح کے اُجالوں میں اپنے دل کی گہرائیوں سے ڈھیر ساری دعائیں مانگتے ہوئے ریاضی کی مشکل سے مشکل مشق کو حل نہ کر ڈالا تھا ــــ

لیکن دسویں پاس کرنے کے بعد جب اُس نے اپنے دل میں امتیازی نمبروں کی خوشی لئے کالج میں داخل ہونے کے خواب کی تعبیر مانگی تو تراب علی کی پنشن اور صغریٰ کی بیماری نے سب کچھ اُلٹ کر رکھ دیا۔

مہنگائی تھی کہ منہ زور گھوڑے کی طرح ہوا کی چال پہ اُڑی جا رہی تھی ۔ سر ڈھکیں تو پیر کھلیں ــــ اور پیر ڈھکیں تو سر کا چھپر اُڑا ــــ تن کے کپڑے تک تو سونے چاندی کے مول ہو رہے تھے ۔ پیٹ بھرنے کو روٹی کا ایک ایک ٹکڑا ہیرا موتی بنا جا رہا تھا ۔ اُدھر صغریٰ تھی کہ کھانسی بخار میں پچک کر زرد

ہوئی جا رہی تھی ۔

"خدا خیر ——— ایسی ہی مشکل کے اور دن گزریں گے تو گور کفن بھی نصیب ہوگا یا نہیں " ——— تراب علی بیٹھا بیٹھا ایسی ہی باتیں سوچتا رہتا ——— صغریٰ کا علاج کرے ——— یا قدیر کے کالج کے داخلے کی فکر کرے ——— اور پھر یہ اونچی جماعتوں کی پڑھائی۔ کوئی ایک دن کی بات تو ہے نہیں ——— کہ پلک جھپکتے میں پروان چڑھ جائے ——— مٹھی بھر بھر روپے جھونکنے ہوں گے ———

" قدیر بیٹا ! تو کالج نہیں جائے گا ——— صغریٰ کا علاج کرنا ہوگا ——— مجھے کچھ اچھے آثار نہیں دکھائی دیتے "———

قدیر سر جھکائے فیصلہ سُنتا رہا ۔

" بہتر ہے کہ ——— ٹائپ کا کام سیکھ لے ——— میری اور تیری ——— بلکہ صغریٰ کی بھی ——— ہم تینوں کی مشکل کا حل اسی میں ہے "———

قدیر کی خاموش نظروں میں کتنی ہی چمکیلی کاریں دھول اُڑاتی میلوں دور بھاگی جا رہی تھیں ——— اُس کے چہرے کا رنگ ماند پڑگیا ——— پھر وہ آہستہ سے بولا ——— " میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ ——— عبدالرحمٰن کی زندگی ہم سے بہت اچھی ہے "———

"عبدالقدیر " ——— تراب علی بگڑ گیا ——— " بات کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لینا چاہیئے "

" نہیں میاں جی ——— میرا اندازہ غلط نہیں ہے "———

تراب علی نے سر سے پیروں تک اُس کو نظر بھر کر دیکھا ۔ چھوٹا سا قدیر ان چند سالوں میں کیسا بانکا جوان نکل آیا تھا ۔ لمبا اونچا سا بھرا بھرا بدن ——— کندن کی طرح چمکتا ہوا رنگ ——— لیکن بجھی بجھی سی آنکھوں میں ہزاروں ہی ان کہی شکائتیں لئے ہوئے ———

" شرم کر " ——— تراب علی نے نظریں پھیرتے ہوئے کہا ——— ایک بار پھر ذرا اپنی کہی ہوئی بات پر غور کر "

" میں نے غلط نہیں کہا ہے میاں جی ——— اتنی ایمانداری کی زندگی اس دُنیا میں بسر کرنا عذاب ہے "———

تراب علی یوں چونک اُٹھا جیسے اُس کو بچھو نے ڈنک مارا اور نیلا نیلا زہر اُس کی رگوں میں اُتر گیا ———

" ذرا سوچئے تو سہی ——— دیکھئے تو سہی ——— کہ ایک پَل کا سکھ خریدنے کے لئے ہمیں کتنے دُکھوں کا بوجھ اُٹھانا پڑتا ہے "———

"عبدالقدیر " ——— تراب علی تڑپ اُٹھا ——— " بس کر ——— بس ——— میں اب تیرے منہ سے ایسی کوئی بات نہیں سُننا چاہتا ——— تجھے ٹائپ کا کام سیکھنا ہی ہوگا "———

" سیکھوں گا میاں جی ——— کیوں نہیں سیکھوں گا ——— مگر میں جھوٹ نہیں کہتا ہوں کہ ——— آپ نے اپنی ساری عمر یوں ہی تباہ کی ——— غربت اور دُکھ سے لڑتے اُلجھتے آپ نے کیا سکھ پایا ——— میں نے اور صغریٰ نے کیا دیکھا ——— یہ بتائیے ——— کون سی خوشی ——— کون سی خوش نصیبی ہم سب کو اس زندگی میں ملی ہے "———

اُس دن تراب علی کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے مریم دوبارہ زندہ ہو کر ایک بار پھر لکڑی کے پُل پر سے گِر کر مر گئی ہے ——— اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا ——— اپنی کم مائیگی پر نہیں ——— بلکہ قدیر کے دُکھتے ہوئے احساس پر۔

قدیر نے جی جان سے ٹائپ کا کام سیکھا ۔ روز صبح وہ گھر سے نکلتا اور چراغ جلے واپس آتا ۔ اِس عرصے میں اُس کے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگ گئی تھی ۔ کسی نے اُس کو مسکراتے نہیں دیکھا تھا ۔ نہ اُس نے کبھی تراب علی سے کوئی بات کی ——— نہ صغریٰ کی دبی دبی کھانسی اور بخار کی ہلکی ہلکی تپش پر افسردہ ہو کر مزاج پُرسی کے لئے اُس کے پاس آن کر بیٹھا ———

اُس کی یہ حالت دیکھ کر تراب علی کا دِل بیٹھا جاتا تھا ۔ اُس نے ایک دن اُس سے صرف اتنا کہا ——— " قدیر بیٹا ——— تو اتنی رات گئے واپس آتا ہے تو میرا جی ڈوب جاتا ہے "

"کام بہت ہوتا ہے میاں جی ——— بڑا آدمی بننے کے لئے خون پسینہ بھی تو ایک کر دینا ہوتا ہے ——— اور پھر ایک

ایماندار آدمی بننے کے لئے تو اور بھی مشقت کا سامنا ہوتا ہے ــــ آپ تو ابھی سے گھبرا گئے "ــــ

لیکن سردیوں کی ایک شام کو جب وہ اپنے کام سے واپس لوٹا تو حسبِ معمول رات کی تاریکی ہر طرف پھیل چکی تھی۔ تراب علی اُس کے انتظار میں ٹھنڈے فرش پر پلنگ کی پٹی کے سہارے بیٹھا بیٹھا اونگھ گیا تھا۔ ذرا سی آہٹ ہوئی تو جھٹ چونک کر بولا ــ "عبدالقدیر؟"

"جی میاں جی" ــــ قدیر قدم بڑھاتا ہوا انگنائی پار کرکے کوٹھری میں آ گیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اُس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ اس نے نیا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اور جیب میں روپے تھے۔

"میاں جی" ــــ اُس نے کمرے میں داخل ہوکر جلدی جلدی کوٹ اُتارتے ہوئے کہا ــ "سردی بہت ہو گئی ہے۔ میں نے چیف صاحب کے گھر کوئی ڈیڑھ مہینہ ہوا ٹیوشن کر لی تھی ــــ چھوٹے بچوں کو اُردو اور حساب پڑھانے کی ــــ آج خدا کے فضل سے تنخواہ مل گئی ہے"۔

"تو یہ ــــ یہ کوٹ" تراب علی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"خرید کر لایا ہوں ــــ آپ پہن لیجئے ــــ کام چل پڑا ہے تو میں اور لے آؤں گا"

تراب علی منع کرتا ہی رہا لیکن وہ نہ مانا ــــ اپنے بوڑھے باپ کو کوٹ پہنا کر ہی دم لیا ــــ

تراب علی کی آنکھیں مارے خوشی کے نمناک ہو گئیں ــــ اور وہ بے اختیار سجدے میں جھک گیا ــــ اِس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

لیکن ٹیوشن کے چالیس روپے کب تک ساتھ دیتے تھے۔ اِدھر آئے ــــ اُدھر گئے ــــ صغریٰ کی بیماری تو کنوئیں کی طرح گہری ہو چلی تھی۔ جس کی کوئی تہ ــــ تھی ہی نہیں۔

اِدھر ٹائپ کا کام ختم ہوا اور تراب علی نے اپنے افسروں اور دوستوں کی منت خوشامد ــ پر کمر باندھی ــــ آخر قدیر کو ملازمت تو چاہئے تھی۔ دوسروں کی خوشامد کرنے میں تراب علی کا کیا بگڑتا تھا۔

قسمت اچھی تھی ــــ ایک امریکن کمپنی میں دس اسامیاں خالی تھیں اور عرضیاں ڈھائی سو کے قریب تھیں۔ چیف صاحب کی سفارش سے قدیر کا نام کامیاب اُمیدواروں میں سے ایک تھا۔

اُس دن تراب علی کو پہلی مرتبہ یہ محسوس ہوا کہ دُنیا کتنی حسین ہے ــــ کتنی سہانی ــــ مگر اُسے تعجب تھا کہ اُس کی زندگی کہیں بے خبری میں گزری چلی جا رہی تھی ــــ اُسے تو اپنی ہی خبر نہ تھی۔

اُس نے رات بھر شکرانے کی نفل پڑھ کر گزارے ــــ اور آنسوؤں کا تار ٹوٹتا رہا ــــ

دوسرے دن صبح ہی قدیر دفتر جانے لگا تو تراب علی نے نظر لگ جانے کے خوف سے اُسے نظر بھر کر نہ دیکھا ــــ کیسا بانکا تھا اُس کا بیٹا ــــ ایسا کڑیل ــــ ایسا جوان ــ جیسے خود اُسی کی اپنی جوانی دوسرا جنم لے کر اُس کے سامنے آن کھڑی ہو ــــ

وہ صرف دبی دبی زبان سے بولا "عبدالقدیر ــــ بیٹا ــــ اُس بے نیاز کا یہ کرم ہے کہ ہمیں یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے ــــ نیک نیتی ــــ اور محنت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا ــــ جس کی گرہ میں عزت نہیں ــــ وہ دیوالیہ ہوتا ہے بیٹا" ــــ

یہ کہتے کہتے اُسے بے اختیار رحیم یاد آئی ــــ اور وہ آبدیدہ سا ہو کر چپ ہو گیا۔

قدیر کا یہ دفتر میں پہلا دن تھا۔ جانے کو تو وہ چلا گیا مگر واپس نہ لوٹا ــــ تراب علی دوپہر تک صغریٰ کے سرہانے بیٹھا اُس کی ہی باتیں کرتا رہا ــــ اُس کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔

صغریٰ اُس کے سامنے پلنگ پر لیٹی تھی۔ اُس کے سفید

رنگ میں زردی رچی ہوئی تھی - اور تیکھے تیکھے دلآویز نقش بالکل اپنی ماں کے جیسے تھے - وہ بار بار کروٹیں بدل کر پوچھ رہی تھی ـــ "میاں جی ـــ بھائی نہیں آیا"

"آتا ہی ہوگا" ـــ وہ کوٹھری میں کمر پر ہاتھ باندھے ٹہلتا رہا ـــ "آج پہلا دن تھا - کام نیا نیا ہوگا - اس لئے سیکھتے سمجھتے بھی دیر ہو جاتی ہے"

دوپہر ڈھل گئی ـــ سردیوں کا چھوٹا سا دن دیکھتے دیکھتے ہی چھپنے کو ہوا ـــ

"میاں جی! ـــ قدیر بھائی نہیں آیا" ـــ صغریٰ اپنی پریشانی میں بھی بڑی حسین دکھائی دے رہی تھی ـــ

"چیف صاحب کے بنگلے پر بچوں کو پڑھانے چلا گیا ہوگا" ـــ

شام گزر گئی ـــ رات نے آنچل میں ستارے بھر کر آسمان پر بکھیر دیئے ـــ

"میاں جی" ـــ صغریٰ چلا اٹھی ـــ "بھائی کہاں ہے؟" ـــ

"یہی تو میں بھی سوچ رہا تھا" ـــ تراب علی نے کھونٹی پر لٹکا ہوا کوٹ پہن کر پگڑی اپنے سر پر رکھتے ہوئے طرہ پھیلا دیا - اس نے انگنائی کے دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا - ارد گرد کے کھلے میدانوں میں بڑی خاموشی تھی - کسی کے قدموں کی چاپ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی -

چراغ جل گئے ـــ رات گہری ہو گئی ـــ قدیر واپس نہ آیا ـــ

تراب علی نے کمبل اپنے شانوں پر لپیٹا ـــ اور لالٹین ہاتھ میں اٹھائی ـــ پھر قدم قدم پر آئتیں پڑھ کر پھونکتا ہوا باہر نکلا ـــ

ہر طرف تاریکی تھی - اور ٹھنڈ بڑھ گئی تھی -

"عبدالقدیر" ـــ اس نے ایک آواز دی ـــ

"عبد ـــ القد ـــ یر" ـــ آواز ویرانوں ـــ اور بیابانوں میں گونج کر واپس پلٹ آئی -

کالونی کے بنگلوں کے سامنے گھنے درختوں کی جھکی جھکی ڈالیوں کے نیچے سے گزر کر جب لکڑی کے پل کے پاس پہونچا تو قدیر سر جھکائے بجلی کے کھمبے کے نیچے بیٹھا تھا ـــ

"میاں جی ـــ آپ" ـــ وہ ڈر کر کانپتی ہوئی آواز میں بولا ـــ

"گھر کیوں نہیں آیا بیٹا" ـــ

"میاں جی ـــ میں ـــ میں" ـــ وہ کچھ کہہ نہ سکا ـــ -

"اتنی دیر کہاں رہا ـــ صغریٰ انتظار کرتی رہی" ـــ

"میاں جی ـــ دفتر میں آج پہلا دن تھا ـــ اس لئے دیر ہو گئی ـــ وہاں سے اٹھا تو ٹیوشن پر چلا گیا"

"ٹیوشن کے بعد تو ـــ سیدھا گھر آجانا چاہیئے تھا تجھ کو" ـــ

"ایک دوست مجھے زبردستی اپنے گھر لے گیا تھا ـــ میاں جی ـــ وہ کالج جاتا ہے ـــ کالج کی باتیں سناتا رہا ـــ میرا اٹھنے کو جی نہیں چاہا" ـــ

تراب علی پل کے قریب کھڑا ہو کر جنکشن پر جلتی ہوئی روشنیوں کا ہجوم دیکھ رہا تھا ـــ

"اب گھر نہیں چلے گا کیا؟ یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟"

"کالج کی کورس کی کتابیں ہیں میاں جی ـــ اسی دوست سے مانگ کر لایا ہوں - گھر پر تو اتنی روشنی نہ ہوگی ـــ سوچا تھا یہاں ہی بیٹھ کر ذرا دیکھ لوں" ـــ

"پھر ـــ دیکھ لیں؟"

"میاں جی" ـــ قدیر کی آواز میں منت تھی ـــ "میں تو یہ ساری کتابیں بڑی آسانی سے پڑھ سکتا ہوں؟ آپ کہیں تو پرائیویٹ ہی تیاری کر لوں ـــ ہیں میاں جی ـــ امتحان دیدوں؟"

تراب علی پتھر ہو گیا ـــــ

"میں نوکری نہیں کروں گا میاں جی" ـــ قدیر بے اختیار اُس سے لپٹ کر رو رہا تھا۔ اُس کے گریبان کو اپنے آنسوؤں سے بھگو رہا تھا ـــ "مجھ سے کام پر جانے کو نہ کہئیے میاں جی ـــ خدا کے لئے" ـــ

لیکن تراب علی کے سامنے اُس کی ایک نہ چل سکی ـــ وہ ہاتھ پکڑ کر قدیر کو ایک ننھے بچّے کی طرح گھر لے آیا ـــ

قدیر رات بھر روتا رہا ـــ سسکتا رہا ـــ تھم تھم کر آنسو بہاتا رہا ـــ

اور پھر جب صبح ہوئی تو تراب علی نے بڑے پیار سے اُس کو اُٹھایا ـــ سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا ـــ

"عبدالقدیر بیٹا ـــ حالات سے لڑنا جواں مردوں کا کام ہے ـــ بچّوں کی طرح آنسو بہا کر اور رو کر کیا بنتا ہے ـــ تجھے کام پر جانا ہوگا" ـــ

"جا رہا ہوں میاں جی" ـــ

قدیر ناشتہ کر چکا تو اُس نے بخار میں پھنکتی ہوئی صغریٰ کی طرف دیکھا۔ پھر تراب علی کے اُترے ہوئے چہرے کو خالی خالی نظروں سے دیکھتا ہوا اپنے دفتر کی طرف چلا گیا ـــ

دوپہر کو جب وہ واپس آیا تو اکیلا نہ تھا ـــ وہ ایک چمکیلی کار میں بیٹھا تھا ـــ اور اُس کے ساتھ ہی اُترنے والا ایک بوڑھا ڈاکٹر بھی تھا ـــ

تراب علی کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں ـــ وہ سمجھ نہ سکا کہ بات کیا ہے ـــ

قدیر نے جلدی جلدی ڈاکٹر کا بیگ ایک چھوٹی سی تپائی پر رکھا ـــ ایک پُرانی سی گرد آلود کُرسی کو جھاڑ پونچھ کر ڈاکٹر کو بٹھایا ـــ جو جلد ہی صغریٰ پر معائنے کے لئے جُھک گیا ـــ

"ہاں ـــ کیا شکایت ہے ـــ بخار آتا ہے" ـــ ؟

"جی ـــ" صغریٰ نحیف آواز میں خوش ہو کر کہہ رہی تھی۔ ڈاکٹر کو دیکھتے ہی اُسے جیسے نئی زندگی مل رہی تھی۔

"کھانسی بھی ہوتی ہے" ـــ ؟ ڈاکٹر اُس کی پسلیوں کو اپنی انگلیوں سے ٹٹول رہا تھا۔

"جی ـــ"

"کمزوری" ـــ

"بہت ہوئی ہے" ـــ صغریٰ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"نسخہ میں لکھے دیتا ہوں ـــ کوئی فکر کی بات نہیں" ـــ ڈاکٹر نے قلم کاغذ سنبھال کر دواؤں کے نام لکھے ـــ

"خوراک ـــ جتنی اچھی خوراک آپ دے سکیں اِن کو دیجئے" ـــ وہ تراب علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا ـــ "دودھ ـــ پھل ـــ انڈے ـــ سبزی ـــ گوشت" ـــ

تراب علی مبہوت کھڑا تھا ـــ

اِس کے بعد جب وہ جانے لگا تو قدیر نے آگے بڑھ کر اُس کا بیگ اُٹھایا ـــ جیب میں سے بتیس روپے فیس کے گن کر دیئے تو تراب علی ہڑبڑا گیا ـــ "اتنے روپے ـــ ؟ کہاں سے آئے ؟"

"آپ فکر نہ کیجئے میاں جی ـــ میرے ہوتے ہوئے آپ فکر کیوں کریں ـــ میرے پاس کچھ روپے ٹیوشن کے رکھے ہوئے تھے" ـــ

ڈاکٹر جب کمرے سے باہر نکل آیا ـــ تو تراب علی اُس کے ساتھ تھا۔

"مریضہ کی حالت اچھی نہیں ہے ـــ کمزوری تمام تکلیفوں کی جڑ ہے ـــ ایکس رے کروانا ہوگا" ـــ

"بہت بہتر ـــ میں کل ہی کروا لوں گا" ـــ قدیر بڑے عزم سے بولا ـــ

"مگر" ـــ تراب علی کی نظروں میں پورے مہینے کی خشک سالی گھوم گئی ـــ

"کوئی بات نہیں ہے ـــ میاں جی" ـــ قدیر نے اُس کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا ـــ اور خود ڈاکٹر کو کار تک چھوڑنے چلا گیا ـــ

دوسرے دن قدیر بڑے خیال سے دفتر گیا —— اور دن بھر کے کاموں کے بعد صغریٰ کی دواؤں اور رسیلے پھلوں کے انبار سے لدا پھندا رات گئے واپس آیا —— مارے تھکن کے ٹوٹ رہا تھا —— اور ساتھ ہی وہ کسی بات سے خوفزدہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اُس نے سب سے پہلے چاروں طرف کے دروازے اچھی طرح بند کرکے چٹخنی چڑھادی —— اور پھر جلدی جلدی کپڑے بدل کر لحاف اوڑھتے ہوئے بولا —— "میاں جی —— میں کھانا نہیں کھاؤں گا —— مجھے نیند آرہی ہے ——"

تراب علی نماز ختم کرکے اُٹھتے ہوئے بولا۔ "مگر —— عبدالقدیر بیٹا —— تو روز رات کو اتنی دیر سے کیوں آتا ہے؟"

"میاں جی —— میں تو ساری رات ہی کاموں میں لگا رہوں —— آپ ہی کا خیال مجھے جلدی جلدی گھر کی طرف گھسیٹتا ہے" ——

اتنا کہکر اُس نے آنکھیں بند کرلیں ——

تراب علی نے صغریٰ پر اپنے شانوں سے کمبل اُتار کر ڈھک دیا —— پھر لالٹین مدھم کرکے اپنے بستر میں لیٹا تو قدیر ہولے ہولے کہنے لگا ——

"میاں جی —— مجھے لکڑی کے پُل سے خوف آنے لگا ہے ——"

"کیوں؟"

"جب میں رات کو وہاں سے گزرتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی روح میرے پیچھے پیچھے آرہی ہے —— جیسے دھیرے دھیرے میرے ساتھ ساتھ چل رہی ہے"

"تیری ماں ہوگی —— تجھے رات کو اکیلے دیکھ کر تیرے ساتھ آجاتی ہوگی ——"

قدیر آہستہ سے ہنسا —— "آپ بھی ایسی باتیں سوچتے ہیں میاں جی؟"

"پھر تیرا وہم ہوگا" —— تراب علی جھینپ کر بات بدل گیا ——

"میاں جی —— آج" —— قدیر کو کپکپی سی آرہی تھی —— اُس کی زبان تھر تھرا گئی —— "آج رحمان گھوڑے کو پھر پولیس پکڑ کرلے گئی ہے" ——

"اچھا" تراب علی کو بڑا تعجب ہو رہا تھا۔ "کیوں" ——؟

"ہوٹل میں اُس نے سٹہ کی بازی لگائی تھی —— غنڈوں میں گولی چل گئی —— پولیس بھاگی پھر رہی ہے —— میاں جی" ——

"تو تجھے کس بات کا ڈر ہے" ——؟

"نہیں —— میں کوئی ڈرتا تھوڑا ہی ہوں —— میرا کسی سے کیا واسطہ —— پھر بھی میاں جی —— لوگ کہتے ہیں کہ گھوڑے نے ایک گروہ بنا رکھا ہے —— چوروں اور لٹیروں کا" ——

"بنایا ہوگا —— تو آرام سے سوجا" ——

"اچھا میاں جی" —— قدیر نے آنکھیں بند کرلیں —— مگر پھر آہستہ سے بولا —— "میاں جی —— گھوڑا اب پھر جیل میں چلا جائے گا" ——!

"اور نہیں تو کیا —— ایسی ذلت کی زندگی سے تو موت ہی بہتر ہے" ——

"وہاں کیا ہوگا" ——؟

تراب علی نے کوئی جواب نہ دیا تو قدیر سوچتے سوچتے سو گیا ——

کمپنی کی نوکری میں برکت تھی۔ اور پھر امریکن صاحب لوگ تو ذرا ذرا سی تکلیف سن کر اور قدیر کی بہن کی بیماری اور اُس کی پریشانیوں کی ہمدردی میں روپے برسا رہے تھے —— قدیر تو سچ مچ برگد کا درخت ہو چلا ——

"میاں جی —— دکھ کے دن گزر گئے —— میں نے دفتر ہی میں ایک دو سمجھدار آدمیوں کے ساتھ مل کر بزنس میں

ہاتھ ڈالا ہے —— دفتر سے چھٹکارا ہوتا ہے تو حساب کتاب دیکھ لیتا ہوں —— خدا کے فضل سے یہ ہنگائی ہمارے حق میں اچھی ہی ثابت ہو رہی ہے —— بس دعا کیجئے یونہی زور پکڑتی رہے"۔

تراب علی اُس کی سادگی پر ہنس دیا ——

کچھ ہی دنوں میں صغریٰ کا ایکسرے بھی ہو گیا ——

باقاعدگی سے علاج شروع ہوا تو کچھ دنوں میں چہرے پر تازگی آگئی —— سرخی جھلکنے لگی —— اور آنکھوں میں چمک بڑھ گئی —

تراب علی تہجد پڑھتا تو قدیر کے اقبال مند ہونے کی کی دعائیں مانگتا۔ سجدے میں جھکتا تو مارے شکرانے کے سر اُٹھتا ہی نہ تھا۔ سوتا تو زبان رُکتی ہی نہ تھی۔ آیتوں کا ایسا سلسلہ بندھ جاتا۔ لیٹتا تو دور کہیں سے مریم کی آواز سُنائی دیتی —— وہ ہنس کر کہتی —— "دیکھا —— میں نہ کہتی تھی کہ نیکی کی سیدھ میں چلنے سے یونہی برکت ہوتی ہے —— شکر کرو کہ خدا نے تمہارے دن پھیرے"۔

وہ جاگتا تو مریم کی شکل آنکھوں میں پھرتی ——

پھر ایک رات جب ریلوے کالونی کے گرجا میں زور زور سے گھنٹے بجے تو تراب علی نے دِل کی گہرائیوں سے دعا مانگی —— "اے پاک بے نیاز —— جیسا ایماندار اور محنتی بیٹا تو نے مجھ کو دیا ہے —— ایسے ہی سعادت مند کل جگ کے بیٹے ہوں"۔

وہ روز صبح تاروں کی چھاؤں میں اُٹھ کر لکڑی کے پُل کی طرف نکل جاتا۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا آہستہ آہستہ اٹکھیلیاں کرتی گزرتی رہتی۔ اور مشرق کے ایک کونے میں سے سورج کا نارنجی کنارا اُبھرتا آتا —— ریل کی پٹری پر مال گاڑیوں کے ڈبے آپس میں ٹکرا جاتے —— کوئی خالی انجن سائیں سائیں کرتا ہوا گزر جاتا —— کبھی کوئی مسافروں سے بھری ہوئی گاڑی چھکا چھک —— چھکا چھک کرتی گزر جاتی تو وہ ایک آہ بھر کر اُس وقت یہی سوچتا —— "مریم نے ہی بیٹے کا عروج نہ دیکھا —— کیسی بدنصیب ماں تھی"۔

کئی دن یونہی ہنسی خوشی گزر گئے۔ ایک دن قدیر عصر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوا تو بولا —— "میاں جی آج میں کالونی میں نئے بنے ہوئے گھر دیکھنے جاؤں گا —— خدا نے اتنا فضل کیا ہے —— اب اس گھر میں رہتے شرم سے آتی ہے —— رات کو شاید بہت دیر ہو جائے —— اسٹیشن پر مال بھی چھڑوانے جانا ہے"۔ ——

"کیسا مال؟"

"میاں جی کاروبار کا —— مجھ کو ہی یہ کام بھی کرنا ہوگا"۔

"کیا کیا ہوگا" ——

"مختلف چیزیں ہیں —— آپ کو تو اتنی لمبی فہرست ٹھیک طرح بتا بھی نہ سکوں گا"۔ ——

تراب علی اُس وقت آرام سے بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ قدیر کی بات سُنی تو جاگتے میں خواب سا دیکھنے لگا۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت مکان —— جالی کے نفیس پردوں سے گھرے ہوئے کمرے —— ایک نرم نرم اسپرنگ لگا صوفہ سیٹ —— دیوان —— آرام دہ کرسیاں ——

زندگی کیسی مشکلوں میں گزری تھی۔ جس مکان میں وہ رہتا تھا اُس کی شکستہ عمارت اور جھکی جھکی محرابیں اُس عمارت کے کھنڈر ہونے کا ثبوت دے رہی تھیں —— اِن کوٹھریوں میں تو دن کے وقت بھی شام کا اندھیرا پھیلا رہتا تھا —— سیلن کے مارے جھڑتی ہوئی دیواریں ——

"یہ گھر ہے یا اصطبل ——؟" اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا ——

قدیر صغریٰ پر جھک کر بڑے پیار سے پوچھ رہا تھا —— "میں شہر بھی جا رہا ہوں —— تمہارے لئے کیا لاؤں؟"

"ریشم کا دوپٹہ —— دھانی رنگ کا" ——

صغریٰ جھٹ کروٹ بدل کر خوشی خوشی کہہ رہی تھی ——

تراب علی کے ذہن پر جیسے کھٹ سے کوئی چیز

آن گری ــــ کالونی کے نئے گھر کا خواب ٹوٹ گیا ــــ

"مجھے ریشم کا دوپٹہ چاہیئے" ــــ ؟ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا بیٹھا صغریٰ سے بولا ــــ

"ہاں میاں جی" ــــ

"کیوں" ــــ

"یونہی ــــ بس ــــ میرا جی چاہتا تھا"

قدیر جا چکا تھا ــــ صغریٰ دن بھر خوش ہوتی رہی - انتظار کرتی رہی ــــ

رات کو جب قدیر بہت دیر کے بعد واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں ریشم کا دھانی دوپٹہ تھا - اُس نے دیوار کی اوٹ میں کھڑے ہو کر اُسے اپنے ہاتھوں پر پھیلایا ــــ اور چپکے سے صغریٰ کے سر پر ڈال دیا ــــ

تراب علی لرز گیا ــــ گھبرا کر پوچھنے لگا ــــ "کتنے میں لیا ؟ کہاں سے لیا ؟"

"شہر سے لیا میاں جی" ــــ قدیر تھوک نگل کر بولا-

"اور کہاں سے ؟"

"کتنے میں لیا ؟" اُس کو مریم بُری طرح یاد آرہی تھی -

"کیا کیجیے گا پوچھ کر" ــــ

تراب علی کو سانپ سونگھ گیا ــــ وہ ایک دم جیسے یخ بستہ ہو گیا ــــ اسی خیال میں تھا کہ قدیر اس کے پلنگ کی پٹی پکڑ کر بیٹھ جائے گا پھر رک رک کر کہے گا ــــ

"میاں جی ــــ آپ خفا نہ ہوں تو میں بتاؤں" ــــ

"ہاں ــــ میں نہیں ہوؤں گا ــــ تو جلدی بتا ــــ دیر نہ کر"

"میاں جی ــــ آج سڑک پر ایک امیر آدمی کا بٹوہ" ــــ

وہ اپنے خیالوں ہی میں چیخ اُٹھتا اگر قدیر خود ہی ہنس کر نہ کہتا ــــ "میاں جی - ٹیوشن بڑھ گئی ہے نا - پہلے میرے پاس صرف دو بچے پڑھتے تھے - اور اب چھوٹے بڑے ملا کر دس ہو گئے ہیں ــــ اردو ، انگریزی ــــ حساب ــــ سبھی کچھ ہوتا ہے" ــــ

"لیکن اب تو مہینے کا وسط جا رہا ہے" ــــ

"میاں جی" ــــ قدیر بڑے آرام سے کرسی گھسیٹ کر ڈاکٹر کی طرح صغریٰ کے سرہانے بیٹھتے ہوئے بولا ــــ "ہر گھر سے پہلی تاریخ کو اکٹھے روپے نہیں مل جاتے ــــ آگے پیچھے ہو جاتے ہیں"

تراب علی کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے سر سے منوں بوجھ اُتر گیا ــــ

رات کو سونے سے پہلے بہت سی باتیں خود بخود اُس کے ذہن میں اُترتی چلی گئیں ــــ بس اب گھر بدل جائے گا ــــ ہر طرح کا آرام ہوگا ــــ میری پنشن بھی آتی رہے گی - قدیر یونہی صبح دفتر جاتا رہے گا ــــ دوپہر کو کاروبار کا حساب کتاب کرے گا ــــ شام کو ٹیوشن پڑھائے گا ــــ

اب وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو ہی گیا ہے تو اس کا بیاہ بھی کر ہی دینا چاہیئے ــــ

بہو آجائے گی تو گھر میں رونق ہوگی ــــ خوشی ہوگی ــــ پوتے ہوں گے ــــ پوتیاں ہوں گی ــــ پھر اور بھی اچھے دن آجائیں گے ــــ قدیر کی ترقی ہو جائے گی ــــ کاروبار بڑھ جائے گا تو ــــ خدا نے چاہا ــــ تو ــــ ایک دن کار بھی دروازے پر کھڑی ہی ہوگی ــــ

رات بھر اُس کے نئے گھر کے پکے آنگن میں پیارے پیارے بچے بھاگتے رہے - لڑتے رہے - اُلجھتے رہے ــــ اور وہ اُن کے فیصلے کرواتا رہا ــــ ایک چمکیلی سی کار کا ہارن بجتا رہا ــــ اُسے معلوم ہی نہ ہوا کہ کب اور کیسے اُس کی داڑھی بھیگتی رہی ــــ اور آنکھیں برستی رہیں ــــ

ہائے ــــ مریم ــــ تو ہی نہ ہوئی یہ عروج دیکھکر خوش ہونے والی ــــ

دوسرا دن تراب علی کی زندگی کا سب سے اہم دن تھا- صبح ہی اُٹھ کر اُس نے کپڑے بدلے ــــ ناشتہ کیا - اور پنشن

پہننے کے لئے شہر چلا گیا۔

وہاں سے اُٹھا تو جیب میں پچھتر روپوں کی بڑی گرمی تھی۔ وہ جگہ جگہ دکانوں پہ چیزیں دیکھتا رہا —— شہر ہی میں اُسے اپنے دفتر کے دو تین دوست مل گئے۔ اُن کے ساتھ دوپہر باتوں باتوں میں گزر گئی۔

شام کے وقت جب وہ قدم بڑھاتا ہوا اپنے گھر کی طرف خیابان ریستوران کے سامنے سے گزرا تو رحمان گھوڑا ضمانت پہ رہا ہو کر آچکا تھا۔ ہوٹل کا بھاری بھرکم مالک اُس کو دھکے دے دے کر باہر نکال رہا تھا۔ اور وہ اُس کی ٹانگوں سے لپٹ کر رو رہا تھا۔ ناک رگڑ رہا تھا۔

تراب علی کے قدم رُک گئے —— "خان صاحب —— کیا بات ہو گئی"۔

"بابو صاحب —— یہ غنڈہ ہے —— اِس نے ہوٹل کو بدنام کر رکھا ہے —— شریف لوگ میرے یہاں اِس کی وجہ سے ہی آنا پسند نہیں کرتے"۔

تراب علی کو گھوڑے کی طرف دیکھکر نفرت سی آگئی۔ مگر پھر وہ اُس کی حالت دیکھکر آہستہ سے مالک کو سمجھاتے ہوئے کہنے لگا —— "ایک مرتبہ موقع اور دید یجئے —— شاید یہ ٹھیک ہی کہتا ہو"——

"کُرسی لا —— او —— گھوڑے" —— مالک نے للکار کر کہا ——

رحمان جلدی جلدی بھاگا گیا —— اُس نے ایک ہی وار میں دو کرسیاں ہوٹل کے برآمدے میں سے اپنے کندھے اور سر پہ ٹکائیں اور ہوٹل کے ہرے بھرے لان میں رکھدیں ——

"بابو صاحب —— یہ بدمعاش ہے —— بہت —— حرامی ہے" —— ہوٹل کا مالک اپنے موٹے موٹے ہاتھوں میں تراب علی کا ہاتھ دبا کر یقین دلا رہا تھا۔

گھوڑے نے اُسی وقت آستین سے ناک پونچھتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیئے —— اور ایک لمحہ میں گر کر تراب علی کے پیروں سے لپٹ گیا "خدا کے لئے —— رسول کے لئے —— میں بے آسرا ہو جاؤں گا —— بابو صاحب —— آپ کے سوا اِس دنیا میں میرا اور کوئی ہے بھی نہیں"——

ہوٹل کے خان نے اُٹھکر ایک بھرپور لات اُس کی کمر پہ جمائی پھر طیش میں آکر بولا "جھوٹ بکتا ہے —— بخدا یہ خنزیر ہمارا بدنامی کا باعث ہے —— اِس نے یہاں پستول چلایا —— سٹہ کا اڈہ جلیا —— اب ٹھکانا مانگتا ہے —— دفع ہو جا —— تجھ پر خدا اور رسول کا —— لعنت"——

گھوڑا گڑگڑا رہا تھا —— رو رہا تھا —— اور تراب علی موم کا بت بنا اندر ہی اندر پگھل رہا تھا ——

"کوئی بات نہیں ہے خان صاحب"——

گھوڑے نے اُسی وقت اپنا سر اُٹھایا —— اور اپنی بھری نظروں سے تراب علی کی طرف دیکھا۔

"اِس کا معاملہ آپ مجھ پر چھوڑیئے —— اب اگر یہاں ایسی کوئی بات ہوئی تو اِس کا ذمّہ دار —— آپ مجھ کو —— جی ہاں —— مجھ کو سمجھ لیجئے گا"——

"اوہ —— بابو صاحب" —— ہوٹل کا خان نرم پڑ گیا —— چھوڑیئے بھی —— خدا قسم —— ایسی بات نہ کیجئے —— ایسا فال —— منہ سے نہ نکالئے"——

پھر اُسی شام تراب علی نے مغرب کی نماز ہوٹل کے لان پہ پڑھی —— مالک اُس کو چھوڑ کر اندر چلا گیا تو —— گھوڑا اُس کے لئے اپنی جیب سے چائے لے آیا ——

تراب علی کے سامنے اُس نے برتن سجا دیئے —— تو تراب علی اُس سے پوچھنے لگا "عبدالرحمٰن —— تم نے کبھی نماز پڑھی ہے؟"

"نہیں ——"

"کبھی نہیں ——؟"

"نہیں" —— اُس کے لبوں سے ایک سرد آہ سی نکلی۔ پھر وہ چائے کی پیالی پہ جھک گیا ——

"پھر تم نے کیا سوچ کر خدا اور رسول کا نام لیا تھا"

"معلوم نہیں جی ——— بس سب یونہی کہتے ہیں ———
تو میں نے بھی چٹخارے کے لئے کہدیا ——— وہ سالا ——— ہوٹل کا مالک اپنے کو جانے کیا سمجھتا ہے ——— میری ایک گولی کی مار ہے ——— ایک ہاتھ کی چوٹ بھی نہیں کھا سکتا"———

تراب علی حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگا ———

"بابو صاحب ——— آپ فرشتہ ہیں ——— آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے ——— میں کسے کس طرح تمام عمر آپ کی خدمت کروں گا"!

تراب علی کو حوصلہ سا ہوا ——— جھٹ خوش ہو کر بولا ———
"بس ——— عبدالرحمٰن نماز پڑھا کرو ——— نماز ——— اس سے بڑی تسکین ملتی ہے ——— برے راستوں سے بچنے کا بہترین ذریعہ ——— نماز ہے"

پھر وہ بڑی دیر تک عبدالرحمٰن کو اپنے سامنے بٹھا کر اس کے لئے صراطِ مستقیم روشن کرنے لگا ———

"بابو صاحب ——— میں ضرور یہ ذلت کی زندگی چھوڑ تو دوں ——— میں خود بھی اپنے آپ سے تنگ آچکا ہوں - مگر کیا کروں ——— کہاں جاؤں ——— کوئی اور نوکری بھی ہو"———

"نوکری؟ نوکریاں بہت" ——— تراب علی چائے پیتے پیتے خوش ہو کر بولا ——— اس نے جھٹ پیالی تپائی پر رکھی ——— اور اپنی پگڑی کے طرے کو اونچا کر کے پھیلایا ——— اپنی کلف لگی شلوار کے پائنچوں کو سیدھا کیا ——— "وہ اپنا عبدالقدیر کمپنی میں نوکر ہے ——— اس سے کہوں گا کوئی اور جگہ ہو تو نظر رکھے ——— کمپنی میں تو آئے دن جگہ نکلتی ہی رہتی ہے"———

"بس ——— بابو صاحب ——— میں تمہارا غلام بن کر رہوں گا" ——— گھوڑے نے انڈوں کے حلوے کی پلیٹ آگے بڑھائی تو تراب علی سوچنے لگا ——— بھلا جس کا جوان بیٹا کماؤ ہو ——— اور بند ڈبوں میں دیسی ولائتی ہر طرح کے حلوے مٹھائیاں لاتا ہو ——— وہ ہوٹل کے حلوے اور کناروں ٹوٹی چائے کی پیالی کو کیا سمجھے؟ ———

مگر پھر وہ جلدی جلدی دو گھونٹ سڑ سڑا کر چائے کی پیالی تپائی پر رکھکر منہ پونچھتے ہوئے بولا ——— "اچھا بھئی عبدالرحمٰن تمہارا شکریہ ——— اب میں گھر جا رہا ہوں"———

"نہیں بابو صاحب ——— ایک احسان اور کرنا ——— خدا کی قسم اتنی محبت مجھے آج تک کبھی نصیب نہیں ہوئی"!

تراب علی رک گیا ———

"آج رات کا کھانا آپ میرے پاس ہی کھائیے"———

"ارے نہیں نہیں"———

لیکن گھوڑا نہ مانا ——— تراب علی کو رکنا پڑا ———

باتوں میں وقت گزرتا گیا ——— رات کو دونوں نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا ——— اور پھر تراب علی نے گھوڑے کو اپنے ساتھ ہی عشاء کی نماز میں شامل کر لیا ———

تراب علی رکوع میں جھکتا تو گھوڑا آنسو بہاتا ہوا ساتھ ہی جھک جاتا ——— وہ سجدے میں جاتا تو گھوڑا زمین پر اوندھا گر کر سسکیوں کا طوفان اٹھاتا ——— اسے تراب علی کی رفاقت میں خدا کے حضور اپنے گناہوں کی سفارش مل رہی تھی ———

نماز کے بعد تراب علی نے ڈھیروں دعائیں مانگیں ——— سب رحمان کے حق میں تھیں ———

اور پھر جب وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا تو ہوٹل میں اندر باہر روشنی کا سیلاب امنڈ رہا تھا ——— لوگوں کی ریل پیل تھی - ہوٹل کا مالک بہت خوش نظر آرہا تھا ———

سنگیت تھا ——— خوشی تھی ——— رقص تھا ——— سرور تھا ——— کس بات کی کمی تھی وہاں ———

لمبی لمبی کاروں کی ایک طویل لائین کو چھوڑتا ہوا جب وہ باہر نکلا تو زور سے پکار کر کہنے لگا "عبدالرحمٰن میں عبدالقدیر سے تمہاری ملازمت کے متعلق بات کروں گا ——— بس تم درود شریف پڑھا کرو ——— درود شریف"———

اور عبدالرحمٰن جواب میں بھاگا آیا ——— اس کے ہاتھ چوم کر بولا ——— "میری زندگی تمہارے لئے ہوگی بابو صاحب" ——— اور پھر وہ ہوٹل کے کچن میں قدم بڑھاتا ہوا برتنوں کے انبار پر جھک گیا - تراب علی آیت الکرسی پڑھتا ہوا پکی سڑک کو چھوڑ کر گلی

کے پُل کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر پہونچا تو دس بج رہے تھے۔ رات کو ساڑھے نو بجے کی پسینجر ٹرین کتاری جنکشن کو چھوڑ چکی تھی۔

خدا کا احسان ہے — آج عبدالقدیر بھی اس قابل ہوا کہ وہ دوسروں کو ملازمت کی سہولت پہونچا سکے — بس اب — اب — اُس کا بیاہ ہو جائے تو اچھا ہے —

راستے بھر اُس کے کانوں میں جیسے شہنائیاں بجتی گئیں — بڑے دھوم دھڑکے کی بارات تھی — عبدالقدیر تاریخی دوشالہ اوڑھے گیندے اور موتیا کے ہاروں میں ڈھکا گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ بینڈ باجوں کے مارے کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ چراغوں اور مشعلوں کے جھرمٹ میں تاریک رات دن میں بدل رہی تھی۔

یکایک پُل کے پار کھڑے ہوئے سپاہی کی سیٹی بجانے کی آواز سنائی دی۔ اور پھر بے اختیار دو تین آوازیں رات کے سناٹے میں گونج اُٹھیں — ”ٹھہرنا — رک جانا —“

تراب علی کی آنکھ کھُل گئی —

ریلوے پولیس کا ایک سپاہی تیزی سے بھاگا آیا۔ پھر اندھیرے میں اُس کو پہچان کر بولا — ”کون؟ آپ ہیں بابو صاحب؟ بابو تراب علی — کوئی بات نہیں — بالکل کوئی بات نہیں —“

اُس کی سمجھ میں نہ آیا کیا بات تھی۔

”یونہی جی — تلاش تھی ایک آدمی کی — وہ جو ہے نا — عبدالرحمان — وہی — گھوڑا — ساری کالونی میں اُس کے ساتھی چھپے ہوئے ہیں۔ اسٹیشن پر آج کئی کیس تھے جیب کتروں کے — اس لئے“ —

تراب علی خاموش کھڑا رہا تو سپاہی پُل کے دوسری طرف اُترتے ہوئے اونچی آواز سے بولا — ”راستہ بالکل صاف ہے — آپ چلے جایئے“ —

تراب علی نے پھر سے آنکھیں موند لیں — قدیر کی دلہن مسند پر شرمائی لجائی بیٹھی تھی۔ میراثنیں ناچ رہی تھیں۔ گا رہی تھیں۔ صغریٰ کا پیر اگنائی میں ٹکتا ہی نہ تھا — گھر بھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ اُس کے دفتر کے سبھی پُرانے دوست اور افسر ہنس ہنس کر اُس کو مبارکباد دے رہے تھے۔

بے خیالی میں اپنی پگڑی کے طرّے کو اونچا کرتے ہوئے تراب علی نے لکڑی کے پُل پر قدم رکھا ہی تھا کہ سامنے سے کوئی شخص بڑی تیزی سے بھاگتا ہوا آیا اور اُس کے سینے سے ٹکرا گیا — اُس کا ہاتھ تراب علی کی جیب پر پڑا تھا۔

آدمی ایک جھٹکے سے الگ ہوا تو اُسے بڑی ہی مانوس — جانی پہچانی — جیسے اپنی ہی خوشبو کا ایک جھونکا ٹکرا گیا —

اُس کی جیب کٹ چکی تھی۔ پنشن کے پچھتّر روپے اُس شخص کے کوٹ کی جیب میں جا چکے تھے۔

”عبدالقدیر“! وہ اپنے خوابوں سے پلٹ کر چلّایا — اُس کو اپنی آواز بڑی دور سے آتی ہوئی سُنائی دے رہی تھی۔

”جی میاں جی“ — ایک ندامت بھری گلوگیر آواز رات کے سکوت میں لرز رہی تھی۔

”تُو — تُو ہے — عبدالقدیر بیٹا؟“

پولیس کے سپاہی نے پُل کے پار سے ایک زوردار سیٹی بجائی تو قدیر بلّی کی طرح دبے پاؤں جدھر سے آیا تھا اُدھر ہی پلٹ گیا — تراب علی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا — اُس نے جنگلے کا سہارا لینے کو اپنا ہاتھ بڑھایا تو ڈگمگا گیا — اُس کو اپنا توازن رکھنا دشوار ہو رہا تھا —

اور پھر دوسرے ہی لمحے میں اُس کا سر بیس پچیس فٹ کی بلندی سے نگوں پر ریل کی پٹڑیوں کے جال پر ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ ہر طرف تہلکہ مچ گیا۔ بھاگتے ہوئے قدم — چڑھی ہوئی سانسیں — اور اونچی آوازیں اُس کے گرد جمع ہو گئیں —

گھوڑے نے جب یہ خبر سُنی تو اپنا سر پیٹ لیا۔ اُس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ ریستوران سے نکل کر ننگے پاؤں بھاگتا ہوا جب وہ لکڑی کے پُل کے قریب پہونچا تو لوگ لاش کے گرد جمع تھے۔ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ ریلوے پولیس کے تین چار

(بقیہ ص۵۶ پر)

دوٌ غزلیں

کرشن موہن

صیدِ امید، گرفتارِ تمنّا ہونا — دل کا ایمان ہے سرگرمِ تقاضا ہونا
دیکھنا آئینہ اور خود ہی پہ شیدا ہونا — اے تماشائی ترا اندرِ تماشا ہونا
شوخ چتون سے کبھی شوخیٔ دل کا اظہار — مست آنکھوں سے کبھی مستِ تقاضا ہونا
یاد آتا ہے وہ چاہت کا رسیلا موسم — اور وہ لطفِ کشِ ساغر و مینا ہونا
کتنے اِمکاں ہیں نہاں جوہرِ تاباں تجھ میں — اک قیامت ہے ترے راز کا اِفشا ہونا
ایک ہی بات ہے دراصل جو سمجھے کوئی — ذلّتِ عشق ہو یا حُسن کا رُسوا ہونا
رہ کے دُنیا میں بھی دُنیا سے وہ بالاتر ہے — جس بشر کو نہیں آتا سگِ دُنیا ہونا
روز و شب جس کو ہو محض اپنے ہی آرام کی فکر — ایسے انساں کا یکساں ہے نہ ہونا، ہونا
کثرتِ رنج والم عشرتِ یک گونہ ہے — درد کا حد سے گذرنا ہے مداوا ہونا
تیرا معیارِ کرم بے رُخی و جور و ستم — میری معراجِ وفا تجھکو گوارا ہونا
وصل تیرا کوئی مشکل تو نہیں ہے اے دوست — ہاں مگر شرط ہے سَر میں ترا سودا ہونا
ایک دو اشک سرِ بزم اُمڈ آئے تو کیا — کس نے دیکھا ہے مری آنکھ کا دریا ہونا
ہم تو کوشاں ہیں کہ بگڑی کو سنواریں لیکن — تیری جانب سے ضروری ہے اشارا ہونا
کتنا پُرلطف تھا اے جانِ جہاں شامِ وصال — تیری خاموشیٔ طنّاز کا گویا ہونا

کرشنؔ موہن ہے تماشائے فنا یہ ہستی
منزلِ مرگ کا آغاز ہے پیدا ہونا

وفا براہی

کوئی بے خود ہے کوئی محوِ خود آرائی ہے
ایک ہی بزم میں دوٌ طرح کی رعنائی ہے
آپ اپنے سے نظر آپ کی ٹکرائی ہے
آئینہ کیا ہے فقط ایک تماشائی ہے
جب ترے نام کی غیروں نے قسم کھائی ہے
کیا کہوں کیسی طبیعت مری گھبرائی ہے
مرنے والے کو کبھی میں نے نہ مرتے دیکھا
ہر ترے ناز میں اندازِ مسیحائی ہے
لغزشِ فطرتِ انساں کا سہارا لے کر
مغفرت خود ہی سفارش کے لئے آئی ہے
عہدِ ماضی کی کہانی کے سُنانے والو!
حال کی بات تمہیں کوئی پسند آئی ہے
کون تصویر تمہاری ہے بتاؤں کیوں کر
کئی تصویریں تصوّر میں نظر آئی ہے
نارسا آہ کبھی کانوں تک اُن کے پہونچی
عرش تک یوں تو یہ جا جاکے پلٹ آئی ہے
آئینہ سامنے ہے، عکس پہ نظریں ہیں جمی
خود تماشا ہے کوئی خود ہی تماشائی ہے
ناامیدی جو طبیبوں کو ہوئی مجھ سے وفاؔ
گریہ احباب کو اور مجھ کو ہنسی آئی ہے

ڈاکٹر معز الدین

سید اسمٰعیل حسین شیرازی

انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں بنگالی مسلمانوں میں اسلامی روح کو از سرِ نو زندہ کرنے کی کوشش اور قومی بیداری کا احساس نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اس زمانے میں مسلمان ادیبوں اور قومی رہنماؤں کی ایک ایسی جماعت میدانِ عمل میں آئی جس نے مسلمانوں کی قومی اور مذہبی زندگی کے جمود کو ختم کر کے ان میں قومی بیداری پیدا کرنے کی بے پناہ کوشش کی۔ اس جماعت کے سربراہ اسمٰعیل حسین شیرازی ہیں۔ انہوں نے اپنی تقریر و تحریر کے ذریعے مسلمانوں کے اندر اسلامی روح پھونک دی۔

سید اسماعیل حسین شیرازی پبنا ضلع کے سراج گنج سب ڈویژن میں ۱۶ر جولائی ۱۸۸۰ء کو پیدا ہوئے۔ اپنے مولد و مسکن کی مناسبت سے یہ ایک عرصے تک سراجی لکھتے رہے۔ اور بعض ادیبوں نے انہیں سراجی ہی لکھا ہے۔ لیکن ڈاکٹر انعام الحق نے اپنی کتاب "مسلم بنگالی ادب" میں انہیں غالباً ان کے آباؤ اجداد کی نسبت سے شیرازی لکھا ہے۔ اور یہ سید اسماعیل حسین شیرازی ہی کے نام سے مشہور ہوئے۔

گو افلاس و غربت کی وجہ سے یہ اعلیٰ تعلیم سے محروم رہے لیکن خداداد ذہانت اور ذاتی صلاحیت کی بدولت اپنے طور پر مطالعہ کر کے اچھی استعداد بہم پہنچائی تھی۔ ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ ان میں شروع ہی سے تھا۔ تحریک آزادی کے علمبرداروں میں ان کا نام ناقابل فراموش ہے۔ اپنی حُب الوطنی کے جذبے کے لئے انہیں مصائب بھی اٹھانے پڑے، حکام وقت کے ہاتھوں سختیاں بھی جھیلنی پڑیں اور قید و بند کی سزائیں بھی بھگتنی پڑیں لیکن یہ کبھی بھی ہمت نہ ہارے اور نہایت عزم و استقلال کے ساتھ ایک طرف تو انگریزوں سے لڑتے رہے تو دوسری طرف مسلم کش عناصر سے نبرد آزما رہے۔ ان کی پرجوش نظموں کا مجموعہ "انل پربا ہو" ان کی زندہ تحریروں کی ایک ناقابل فراموش یادگار ہے۔

اسلام اور قوم کے نام پر ہر قربانی کے لئے تیار رہتے۔ جنگ بلقان میں جب ترکوں کی شکست کے آثار نظر آنے لگے تو یہ کانگریس کے صدر ڈاکٹر انصاری کے ساتھ جانفروشی کا جذبہ لئے ہوئے ترکوں کی طرف سے جنگ بلقان میں شریک ہوئے۔ ترکی میں یہ تقریباً دو سال تک رہے، اور اسلامی اخوت اور اپنے جذبۂ ایثار و قربانی سے ترکوں کو بے حد متاثر کیا۔ اتنے ہی عرصے میں ترکی زبان میں اتنی مہارت پیدا کرلی کہ جب سلطان ترکی نے انہیں خلعت عطا کیا اور غازی کا خطاب بخشا تو انہوں نے اس موقع پر ترکی زبان میں تقریر کر کے سامعین کو متحیر کردیا۔ ترکی کے تمام واقعات کو انہوں نے اپنی کتاب "تورکشا بھرمن" میں قلمبند کیا ہے۔

یہ چھوٹی بڑی پندرہ بیس کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنگالی ادب کی توسیع کے ساتھ ساتھ بنگالی ادب کے ذریعے مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کو فروغ دینا ان کا واحد مقصد تھا۔ یہ ہمیشہ قومی زندگی کی تزئین اور اسلامی ادب کی ترقی کے لئے کوشاں رہے۔ بنگالی مسلمانوں کو نئی زندگی بخشنے، ان میں روحِ اسلام پھونکنے، خودداری اور خود اعتمادی پیدا کرنے کے سلسلے میں انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ بنگال کی ادبی، ملی اور مذہبی تاریخ میں جلی حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ مشرقی پاکستان کے قومی ادب

کے راستے کو ہموار کرنے اور پاکستان کی دشوار گذار راہ کو سہل بنانے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔

ان کا عقیدہ تھا کہ مسلمان اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور اپنے اسلاف جیسی ہمت و شجاعت پیدا کئے بغیر دوسری قوموں کے مقابلے میں ہرگز آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اسی احساس کے تحت ان کی تمام تر ادبی اور سیاسی سرگرمیاں مسلمانوں کے اندر زندگی کی حرارت پیدا کرنے کے لئے وقف تھیں۔ حرم کی پاسبانی کے لئے مسلمانوں کو تسبیح کے دانوں کی طرح ایک ہی رشتے میں پرونے کے لئے یہ برابر گرم جولاں رہے۔ اسی طرح اسلامی فلسفۂ حیات کے مبلغ و مفسر کی حیثیت سے یہ مسلمانوں کے دوسرے بزرگوں اور رہنماؤں کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔

اپنی ادبی تصانیف میں بھی ان کی برابر یہی کوشش رہی کہ قومی حمیت کو کس طرح ابھارا جائے۔ مسلمانوں کی ہمت، شجاعت، بلند کرداری اور ایمان کی پختگی ان کے خاص موضوعات ہیں۔ "گسم انجلی" اور "انل پرو باہ" وغیرہ کتابوں سے ان کی شاعرانہ صلاحیت، جودت طبع اور اسلامی جوش و خروش کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی کئی نظموں کی بنیاد حکومت برطانیہ کی مخالفت پر ہے۔ اسی لئے اس وقت کی حکومت نے انہیں ضبط کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ اسماعیل حسین شیرازی کی پوری کوشش یہ تھی کہ مظلوم مسلمان صنعت و حرفت، علم و ہنر اور تہذیب و تمدن میں دوسری قوموں کے مقابلے میں سربلندی حاصل کریں۔ اپنے وقت کے یہ آتش نوا مقرر بھی تھے۔ اور شیریں بیان مصنف بھی۔ کبھی دریاؤں کے دل ہلا دینے والے طوفان کی صورت یہ سامنے آتے تو کبھی جنگلا میں ٹھنڈک پیدا کرنے والی شبنم کی طرح نرم گفتار بن جاتے۔

مسلمانوں میں ادبی اور مذہبی جوش پیدا کرنے کے لئے ۱۹۰۱ء میں ایک رسالہ "الاسلام" کا اجرا ہوا تھا اس کے پہلے شمارے میں سید اسماعیل حسین شیرازی نے ادب کے ذریعہ قومی احساسات و جذبات میں انقلاب پیدا کرنے کی جو ترغیب مسلمانوں کو دی تھی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قومی بیداری کے لئے یہ کس قدر کوشاں تھے۔

یہ تعلیم نسواں کے بھی بڑے حامی تھے۔ ان کی کتاب "استری شکشا" اس بات کی نشاندہی ہے کہ عورتوں کی تعلیم میں کس حد تک یہ عملی سرگرمیاں دکھاتے تھے۔

ان کی تصنیفات میں تارا بائی، فیروزہ بیگم، سنگیت سنجیبنی، پریمنجلی، اسپین دیجے کادو، سوچنتا، گور رکہانی، ادب قاعدہ شکھا کادو وغیرہ مشہور رہیں۔

اسپین دیجے کادو میں سید اسماعیل حسین نے فتح اسپین کے واقعات اور فاتح اسپین طارق کے بہادرانہ کارناموں کا ذکر بڑی دھوم دھام سے کیا ہے۔ مہا شکھا میں واقعات کربلا کو بڑے دلدوز انداز میں پیش کرکے بتایا ہے کہ انسان کو اپنی آزادی، مذہب، انصاف اور ایمان کی حفاظت اور ظلم و تعدی کی بیخ کنی کے لئے کس طرح سینہ سپر رہنا چاہئے۔

غرض مسلمانوں میں ادبی، مذہبی اور سیاسی بیداری کے لئے اسماعیل حسین شیرازی نے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ اور قوم و ملت کا یہ مجاہد شاعر و ادیب کی حیثیت سے بلند پایا اور منفرد ہو یا نہ ہو ایک قومی معمار، مرد مومن اور مذہبی رہنما کی حیثیت سے اس کا نام تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیگا

رستم علی خاں

درندہ اور انسان

۲۴ نومبر ۱۹۴۷ء کو میکلوڈ گنج میں ایک شخص نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ یہ بتائیں کہ موضع سیوانی کے راجپوت اب کہاں ہیں۔ میں نے کہا۔ بھائی صاحب سیوانی کے راجپوتوں سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ جواب میں وہ شخص بولا۔ میں ریاست پٹیالہ کا باشندہ ہوں اور میں محکمہ مال میں پٹواری تھا۔ میرے ایک عزیز موضع سیوانی ضلع حصار کے قافلہ کے ساتھ پاکستان پہنچے ہیں اب میں اپنے عزیز کی خیریت معلوم کرنے کے لئے سخت بے چین ہوں۔ میں نے کہا۔ بھائی صاحب سیوانی کے راجپوتوں کی خیریت معلوم کرنے کے لئے میں خود پریشان ہوں۔ سیوانی پر حملہ ہوا تھا۔ اس حملے کے بعد میرے ماموں زاد بھائی صوبیدار میجر محمد یوسف خاں اور جمعدار نیاز محمد خاں کا مجھے کوئی خط نہیں ملا۔ ان لوگوں کی طرف سے مجھے بے حد تشویش ہے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس شخص نے کہا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ سیوانی پر حملہ ہوا تھا لیکن وہ حملہ پسپا کر دیا گیا تھا۔ بعد میں مہاراجہ گنگا سنگھ والئے بیکانیر نے ان لوگوں کو اپنی ریاست سے گزار کر بخیریت پاکستان پہنچا دیا ہے۔ اب یہاں پتہ نہیں چلتا کہ وہ لوگ کس جگہ پہنچے ہیں۔ سیوانی کے علاوہ دس بارہ حملے موضع موٹھ لوہاری پر ہوئے تھے۔ موٹھ لوہاری کے راجپوتوں نے جرأت اور مردانگی کی حد کر دی۔ انہوں نے حملہ آوروں کو کھیرے ککڑی کی طرح کاٹ کر پھینک دیا۔ لاشوں کی سڑاند سے ان کا جنگل سڑنے لگا۔ پھر بھارتی فوج نے آکر برین گنوں سے انہیں بری طرح چھلنی کیا۔ بہت لوگ مارے گئے۔ جو زندہ بچے وہ پاکستان آ گئے ہیں۔ ایک حملہ موضع ننگتھلہ پر ہوا تھا۔ ننگتھلہ کے راجپوتوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور وہ حملہ ناکام بنا دیا۔ اس مقابلہ میں رانا سلیمان خاں نے بہت دلیری اور بے حد مردانگی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے علاوہ موضع منگالی میں راجپوتوں اور بشنوئیوں[1] کا زبردست معرکہ ہوا جس میں کچھ راجپوت اور کافی بشنوئی مارے گئے اور موضع جمالپور کے حوالدار تاج محمد خاں نے تو حد کر دی۔ انہوں نے اپنے تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر جمالپور کے جنگل میں سات بھارتی فوجیوں کو ہلاک کیا اور ان کا تمام اسلحہ چھین کر حوالدار صاحب اپنے گاؤں میں لے آئے۔ ورنہ وہ فوجی بلوائیوں کے پشت پناہ بن کر موضع جمالپور کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے۔ فسادات کے سلسلے میں آپ کی بڑی معلومات ہیں۔ ان سے میں نے کہا۔ اُف۔ فسادات کے متعلق اگر میں آپ کو اپنے چشم دید واقعات سناؤں تو آپ کا دل کانپ اٹھے گا اور آپ سن نہ سکیں گے۔ ان الفاظ کے جواب میں وہ بولا۔ دل کہاں ہے جو کانپ اٹھے گا اب تو یہ پتھر ہے آپ اپنے چشم دید واقعات ضرور سنائیں۔

اچھا سنئے۔ ریاست پٹیالہ کی سرحد پر ایک چھوٹا سا گاؤں ایک ہندو راجپوت سردار راؤ پرتاب سنگھ کی ملکیت ہے۔ پرتاب سنگھ سے تمام مزارعے سکھ دھرم کے پیرو تھے اور اس گاؤں میں صرف ایک گھر عبدالرحیم نامی مسلمان طبیب کا تھا۔ اس گاؤں میں بطور پٹواری چند سال میں بھی تعینات رہا۔ اس لئے میرے اور عبدالرحیم کے بہت گہرے مراسم تھے۔ عبدالرحیم کے اولاد نرینہ نہ تھی۔ صرف ایک معصوم اور بے حد قبول صورت لڑکی تھی۔ اس لڑکی کا نام ثریا تھا۔ ثریا کو راؤ پرتاب سنگھ بیٹی کہہ کر پکارا کرتے اور بلاشبہ وہ اس لڑکی کو اپنی اولاد سے زیادہ چاہتے تھے۔ پرتاب سنگھ کے کوئی لڑکی نہ تھی۔

---

[1] بشنوئی راجپوتانہ میں ایک قوم ہے۔

صرف ایک لڑکا کنور بچے سنگھ تھا۔ اپنے اکلوتے بیٹے بچے سنگھ سے انہیں از حد محبت تھی۔ کئی سال پہلے بچے سنگھ کی والدہ یعنی پرتاپ سنگھ کی دھرم پتنی سرگباش ہو چکی تھیں۔ وہ اپنی بیوی سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس کی موت کے بعد دوسری شادی کرنے کا کبھی نام نہ لیا تھا۔ الغرض ہندو مسلم شورش زوروں پر تھی۔ مجھے عبدالرحیم کا خط ملا کہ بیٹے کو دل چاہتا ہے صرف ایک روز کے لئے تشریف لے آئیں۔ جس وقت میں عبدالرحیم کے گھر پہنچا، گہری شام تھی اور بڑے زور کی آندھی چل رہی تھی۔ وہاں جو المناک منظر دیکھا وہ میں کبھی نہ بھولوں گا۔ ان کی اکلوتی بیٹی ثریا چارپائی پر بیہوش پڑی تھی اور عبدالرحیم اور ان کی بیوی ڈھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ میرا دل لرز گیا۔ میں نے انہیں بہت تسلی تشفی دی۔ لیکن وہ اپنے آپ میں نہ تھے۔ اُن کا گھر عجیب ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ ان لوگوں کے ساتھ ضرور کوئی خوفناک حادثہ بیتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں یہ لرزہ خیز حقیقت بیان کرنے پرتاپ سنگھ کی گڑھی میں پہنچا۔ وہاں عجیب حال دیکھا۔ شدید غصہ میں پرتاپ سنگھ کا چہرہ سرخ اور اُن کی تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے مزارعوں سے چیخ کر کہا۔ بچے سنگھ کو جلد حاضر کرو۔ ورنہ سب کو گولی سے اڑا دوں گا۔ پرتاپ سنگھ کے تیور بےحد غضب ناک تھے۔ بچے سنگھ کو گڑھی میں لایا گیا۔ اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔ پرتاپ زخمی شیر کی طرح گرجا۔ پاجی، بدمعاش، کمینہ۔ تم نے اپنی بہن کی آبرو ریزی کی ہے۔ میں ثریا کو ہمیشہ اپنی بیٹی تصور کرتا رہا ہوں۔ اوہ توبہ۔ وہ تمہاری بہن نہیں ہے۔ حقیقت میں تم میرے بیٹے نہیں۔ اگر آج تمہاری ماتا زندہ ہوتی تو میں دریافت کرتا۔ سچ بتاؤ کہ بچے سنگھ کس کی اولاد ہے۔ میرا بیٹا کبھی زنا کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میں نے اپنی زندگی میں کسی غیر عورت پر کبھی بری نظر تک نہیں ڈالی ہے۔ اُف۔ زنا بالجبر۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی پرتاپ سنگھ کے پستول کی گولی بچے سنگھ کی پیشانی کو چیر کر پار نکل گئی۔

خون میں لت پت بچے سنگھ زمین پر تڑپ رہا تھا۔ وہ زمین سے اٹھا اور لڑکھڑا کر پھر وہیں گر پڑا۔ پیشانی سے خون بہہ کر زمین پر لہو کی چادر سی تن گئی۔ نیم بیہوشی کی حالت میں وہ پھر اٹھا۔ ساتھ ہی پرتاپ سنگھ نے اپنی ٹھوکر سے اسے پھر گرا دیا۔ "بار کھیت کو کھا گئی۔ میں نے باڑ میں آگ لگا دی ہے"۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی پرتاپ سنگھ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اور اس کی چڑھی ہوئی ڈاڑھی میں سے گزر کر زمین پر ٹپکنے لگے۔ شاہ جی اب میں آپ لوگوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں۔ یہ الفاظ پرتاپ سنگھ نے مجھے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے بچے سنگھ ٹھنڈا ہو گیا۔ ثریا اور بچے سنگھ میرے گود کھلائے بچے تھے۔ یہ دونوں بچے حقیقی بہن بھائی کی طرح رہتے تھے۔ لیکن گردش زمانہ اور مذہبی جنون نے میری آنکھوں کے سامنے سب سے کچھ کر دیا تھا۔ یک لخت میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دل سینہ توڑ کر زمین پر گر پڑے گا۔ پھر میں وہاں رک نہ سکا اور نہ پرتاپ سنگھ نے مجھے روکنے کی کوشش کی۔ میں باہر نکلا اور عبدالرحیم کے گھر کی طرف چلا۔ یکا یک پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ میں اُدھر چل نہ سکا۔ اُس وقت ایک غیرت مند باپ کی شریف اور معصوم بیٹی کی لٹی ہوئی عصمت کے خیال نے مجھے لرزا دیا۔ یاد نہیں کہ پھر میں نے کیا کیا۔ ہاں یہ یاد ہے کہ میں عبدالرحیم سے بغیر ملے اپنے گھر چلا آیا۔ وہاں مجھ پر کئی روز غشی کی سی کیفیت طاری رہی۔ جو دل دوز منظر میں نے دیکھا وہ اس قدر بھیانک تھا کہ میں اسے اپنی زندگی میں کبھی نہ بھولوں گا۔ جانے کیوں پھر میں عبدالرحیم سے ملنے کے خیال سے کانپ اٹھتا اور ساتھ ہی سوچتا کہ اگر پرتاپ سنگھ ایسا غیور اور انصاف پسند شخص ملک کا حکمراں ہوتا تو کبھی یہ فسادات رونما نہ ہوتے۔ اس خوفناک حادثہ کی یادتازہ تھی۔ کہ فروری ۱۹۴۷ء میں میں موضع گوانی سے تبدیل ہو کر موضع تھنوا اس ضلع نارنول بطور مستقل پٹواری تعینات ہوا۔ موضع تھنوا اس ہندو گوجروں کا گاؤں ہے۔ میں نے چارج سنبھال کر چودھری نانک رام نمبردار سے کہا کہ یہ کاغذات رکھوا دیں۔ نمبردار نے پٹوار خانہ کے کمرے میں کاغذات رکھ کر تالا لگا دیا۔ جس وقت تالا لگایا گیا۔ بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان لوگوں میں جھادیا گوجر بھی تھا۔ جھادیا بولا۔ شاہ جی تالا کمزور ہے۔ میں نے کہا دیانت دار کے لئے تو یہی کافی ہے اور چور ڈاکو کے لئے تالا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ میرے ان الفاظ کے ساتھ ہی تمام لوگ ہنس پڑے۔ اور کہنے لگے شاہ جی آپ کو کیسے پتہ چلا کہ جھادیا ڈاکو ہے۔ آپ گیان جانتے ہیں؟ جھادیا چلا گیا تو لوگوں نے بتایا کہ یہ اس علاقہ کا مشہور ڈاکو ہے۔ اور اس سے تمام علاقہ کانپتا ہے۔ جھادیا روزانہ میرے پاس آتا اور ہر طرح کی خدمت کرتا۔ پہلے وہ لوگوں میں بیٹھتا تو اپنی بہادری اور ڈاکہ زنی کی باتیں سنایا کرتا۔ مگر وہ جب سے

میرے پاس بیٹھنے لگا تو ہر وقت مذہبی باتوں کا ذکر کرتا اور جب اسے پتہ چلا کہ پٹواری ہندو اور اسلام دونوں مذاہب کے متعلق واقفیت رکھتا ہے تو پھر وہ گاؤں کے لوگوں اور پنڈتوں سے ذکر کرتا کہ شاہ جی سے مناظرہ کریں۔ پھر کئی مرتبہ آریوں اور پنڈتوں سے مناظرہ ہوا۔ وہ لوگ ہندو دھرم کے متعلق مجھے قائل نہ کر سکے۔ کیونکہ میں شاستروں کا بھی پنڈت ہوں۔ تاہم مناظرہ کے لئے فضا سازگار نہ تھی۔ کیونکہ ملک میں مذہبی تفریق نے انسانوں کے دلوں میں آگ لگا رکھی تھی۔ اس لئے موضع تھنواس کے سوا آس پاس کے ہندو مجھ سے نفرت کرنے لگے۔ انہیں دنوں ایک اور غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔ تھنواس میں کافی آبادی ہندو مالیوں کی تھی۔ انہیں گاؤں کے گوجر زمینداروں نے گذارہ کے لئے کچھ زمین دے رکھی تھی۔ زمین کے عیوض مالیوں کا کام گوجروں کے گھروں میں پانی بھرنا اور ان کی خدمت کرنا تھا۔ اچانک مالیوں نے ایک کانفرنس منعقد کی اور اعلان کر دیا کہ ہم مالی نہیں سینی راجپوت ہیں۔ اور اعلان کے ساتھ ہی ان لوگوں نے گوجروں کے گھروں میں کام کرنا چھوڑ دیا۔ اس کے رد عمل میں گوجروں نے ان سے زمین چھین لی۔ مالیوں نے دعویٰ کیا۔ اس دعویٰ میں میرا نام بھی لکھوایا گیا کہ پٹواری حلقہ گوجروں کی امداد کرتا ہے۔ مختصراً یہ کہ مقدمہ چلا اور فیصلہ گوجروں کے حق میں ہو گیا۔ مالیوں نے میرے خلاف مذہبی پروپیگنڈا کر کے آس پاس کے ہندوؤں کو میرے خون کا پیاسا بنا دیا۔ چند روز بعد نارنول پر حملہ ہوا۔ مسلمانوں نے تین روز مقابلہ کیا۔ بالآخر ریاستی فوج نے آ کر مسلمانوں کو بہت نقصان پہونچایا۔ اور جو زندہ بچے انہیں گھروں سے نکال دیا۔ موضع میں بھی چند گھر مسلمانوں کے تھے۔ میں نے انہیں گوجروں کی مدد سے نکال کر ریاست جے پور میں موضع بن ٹی پہنچا دیا۔ مہنٹی کا تعلیمی تھا کر مسلمانوں کا ہمدرد اور بہت غیر متعصب انسان تھا۔ مہادیوا کو پتہ چلا تو وہ ناراض ہوا کہ شاہ جی آپ نے تھنواس سے مسلمانوں کو نکال کر ہماری سخت توہین کی ہے۔ اور اب آپ بھی یہاں سے بھاگ جائیں گے۔ مگر یہ نہ بھولنا کہ ہم اس قدر بزدل اور کمینے نہیں جس قدر رذیل ہمیں آپ نے سمجھ رکھا ہے۔ یقین جانو مسلمانوں کے لئے گوجر کا بچہ بچہ کٹ مرتا۔ بات آئی گئی ہوئی پھر کچھ روز بعد سنا کہ مشہور کانگریسی کارکن دیوکی دیو نے میرے خلاف کوئی سازش کی ہے۔ تیسرے دن رات کے وقت پٹوار خانہ کے قریب یہ نعرہ گونجا۔ مہاتما گاندھی کی جے۔ پٹواری پٹوار خانہ میں سے یہ سنکر میں سہم گیا کہ گاندھی جی کے نام پر میرا خون بہایا جائے گا۔ لیکن وہ بلوائی نعرے لگاتے ہوئے کہیں دور چلے گئے۔ آسمان پر کالی گھٹا تھی۔ یکا یک مینہ برسنے لگا۔ بجلی کی چمک اور بادل کی خوفناک گرج نے بڑی ہولناک فضا پیدا کر دی۔ کسی نے اچانک دروازہ پر دستک دی۔ میری بیوی اور میں سہم گئے۔ اس وقت یہ محسوس ہوا کہ موت کا فرشتہ ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ پھر دستک ہوئی۔ کون ہے؟ میں نے ہمت کر کے دریافت کیا۔ شاہ جی میں نمبردار امراؤ سنگھ ہوں۔ میں نے دروازہ کھولا۔ شاہ جی آپ کی زندگی سخت خطرہ میں ہے آپ یہ جگہ چھوڑنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ نمبردار نانک رام وغیرہ بھی آپ کی مدد کے لئے آ رہے ہیں۔ ہم ساتوں نمبرداروں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کو کسی خفیہ جگہ رکھیں۔ اور گاؤں میں شہرت کر دیں کہ رات پٹواری بھاگ گیا ہے۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں چھ نمبردار اور آ گئے جس وقت ہم پٹوار خانہ سے نکلے۔ دھواں دھار مینہ برس رہا تھا۔ موضع تھنواس ایک سرسبز پہاڑی کی جڑ میں آباد ہے۔ اس پہاڑی کا کچھ حصہ عبور کر کے ہمیں امراؤ سنگھ کی حویلی میں پہنچنا تھا۔ جس وقت ہم پہاڑی پر چڑھے۔ شدید بارش کے سبب اس قدر اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ بجلی چمکتی تو ہم چلتے ورنہ کھڑے بھیگتے رہتے۔ وہ پہاڑی راستہ جس مصیبت سے طے کیا وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ القصہ ہم امراؤ سنگھ کی حویلی میں جا پہنچے صبح لوگوں کو پتہ چلا کہ پٹواری غائب ہے۔ گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ عورت اور مرد سب ہاتھ ملنے لگے۔ تحقیقات سے صرف یہ پتہ چلا کہ رات بارش میں ساتوں نمبردار پٹوار خانہ کی طرف گئے تھے۔ مہادیوا نے لوگ جمع کئے اور نمبرداروں سے کہا کہ سچ بتاؤ پٹواری کہاں ہے۔ امراؤ سنگھ بولا۔ پٹواری بھاگ گیا ہے۔ یہ سنکر مہادیوا بولا۔ یہ بیان غلط ہے۔ اصل میں تم نے پٹواری کا روپیہ زیور چھین لیا ہے اور اسے قتل کر دیا ہے۔ اب ساتوں نمبردار کان کھول کر سن لیں کہ یا تو پٹواری اور اس کی بیوی کو حاضر کرو اور اگر انہیں قتل کر دیا گیا ہے تو ان کی لاشیں دیں ورنہ میں اپنے سر کی یہ پگڑی اتار کر پھینکتا ہوں اور عہد کرتا ہوں کہ آج شام تک اگر پٹواری کا پتہ نہ چلا تو پھر میں ساتوں نمبردار کو ہلاک کر دوں گا۔ نمبرداروں نے وعدہ کیا کہ کل تک جواب دیں گے۔ مگر اس وعدہ کے باوجود نمبرداروں کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔ اور پھر انہوں نے شام سے پہلے مہادیوا کو بتلا دیا کہ پٹواری بخیریت تمام امراؤ سنگھ کی

ویلی میں ہے۔ یہ خبر سنکر جہادیولنے ایک لوٹے میں گنگا جل بھر کر پھر پورے گاؤں سے اُس میں نمک ڈلوایا کہ اگر ہم پٹواری کے ساتھ دغا کریں تو اس نمک کی طرح گل جائیں۔ اس کے بعد جہادیو امراؤ سنگھ کی حویلی میں آکر مجھ سے ملا۔ اور رو پڑا۔ ساتھ ہی میری آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے۔ دوسرے دن دیو کی دیدنے تھنواس آکر لوگوں سے کہا کہ مسلمان پٹواری کو ہمارے حوالہ کردیں۔ ورنہ گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے۔ جواب میں جہادیو بولا کہ ہماری زندگی میں پٹواری کا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔ اس سے اگلے دن قریب جوار میں خونی نقارے بجنے لگے۔ ساتھ ہی گوجروں نے بھی موضع بہنٹی کے ٹھاکر کے پاس پیغام بھیجا کہ ایک مظلوم مسلمان کی خاطر ۴۸ گاؤں موضع تھنواس پر حملہ کی تیاری کر رہے ہیں۔ ٹھاکر کے آباؤاجداد ماضی میں انگریزوں سے لڑے تھے۔ اس لڑائی میں تھنواس کے گوجروں نے ٹھاکروں کا ساتھ دیا تھا۔ اس لئے بہنٹی کے ٹھاکر تھنواس کے گوجروں کے بیحد احسان مند تھے۔ سورج غروب ہو رہا تھا کہ ٹھاکر ہزاروں مسلح گھوڑسواروں کے ساتھ تھنواس آپہنچا۔ تمام رات دونوں طرف سے دیسی ساخت کی توپوں کے فائر ہوتے رہے اور صبح ہوتے ہی جب دونوں طرف سے حملہ آور بڑھے تو گھوڑوں کی ٹاپوں سے جنگل گونج اٹھا۔ اب دونوں پُرجوش حملہ آوروں کے درمیان صرف ایک میل کا فاصلہ تھا۔ معاً مجھے خیال گزرا کہ محض ایک میرے لئے یہاں خون کا دریا بہہ نکلے گا۔ میں گوجروں کا دوست نہیں بلکہ بدترین دشمن ہوں۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں چیخ کر بولا۔ "آپ لوگ میرے لئے قتل وغارت گری نہ کریں بلکہ مجھے دشمنوں کے حوالہ کردیں۔ امن کے لئے میں جان دینا چاہتا ہوں۔ لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ بعد میں دنیا یہ کہے کہ ایک مسلمان کی سازش نے پورے علاقہ کو تباہ و برباد کرڈالا۔" میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ میری بات کاٹ کر جہادیو بولا۔ "شاہ جی آپ کی خاطر ہم پر جو رعب گانٹھا جارہا ہے۔ ہم ان دھمکیوں میں آنے والے نہیں۔ یہ تو ۴۸ گاؤں ہیں اگر دیو کی دید مہاراجہ پٹیالہ کی تمام فوجیں لے آئے تب بھی ہم آپ کو ان کے حوالہ نہ کریں گے۔" جہادیو کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ گیروے رنگ کے کپڑوں میں ملبوس ایک گھوڑسوار سادھو زور سے بولا۔ "آپ لوگوں کو بھگوان کی قسم ہے کہ جب تک میں واپس نہ آؤں آپ اپنی طرف سے لڑائی کا آغاز نہ کریں۔" سادھو اتنا کہنے کے بعد اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑا کر آنکھوں سے اوجھل ہوگیا اور ایک گھنٹہ بعد جب وہ واپس آیا تو اس نے لوگوں کو بتایا۔

یہ سب دیو کی دید کی سازش تھی۔ اُس نے جاٹ گوجر اور سکھ سرداروں کو بتایا کہ تھنواس میں ایک پٹواری نے تمام گوجروں کو مسلمان بنا لیا ہے۔ پھر میں نے ان سرداروں سے کہا۔ یہ غلط ہے کہ تھنواس کے گوجروں نے دھرم تبدیل کرلیا ہے۔ ہاں انہوں نے پٹواری کی حفاظت کا بیڑا ضرور اٹھایا ہے۔ اور اس معاملہ میں بہنٹی کے ٹھاکر کے چوبیس گاؤں بھی تھنواس کے ساتھ ہیں۔ اگر آپ لوگوں کو دیدکی باتوں پر اعتماد ہے تو آگے بڑھو اور تھنواس کی اینٹ سے اینٹ بجادو۔ لیکن یہ خیال رہے کہ مقابلہ کھانڈے کے کھلونوں سے نہیں بلکہ بہنٹی کے ٹھاکروں اور تھنواس کے گوجروں سے ہے۔ دیو کی دید کو بلاؤ۔ کئی آوازیں گونجیں۔ دیو کی دید یہاں نہیں ہے۔ وہ کل دلی چلا گیا ہے۔ ایک شخص نے چیخ کر کہا۔ پھر ایک بوڑھا جاٹ سردار بولا۔ دید کی سازش بزدلانہ اور بڑی کمینہ ہے۔ تھنواس کے گوجروں نے اگر ایک مسلمان کو پناہ دی تو کیا ظلم کیا۔ ہم تھنواس پر حملہ نہیں کریں گے میں تو اپنے آدمیوں کو لیکر واپس جاتا ہوں۔ اس کے بعد اعلان کر دیا گیا کہ سب لوگ اپنے اپنے گاؤں واپس چلے جائیں۔ وہ بہادر سادھو جس نے ہزاروں انسانوں کی جانیں بچائیں بہنٹی کے ٹھاکر کا چچیرا بھائی تھا۔ اس نے گھربار اور زمین چھوڑ کر فقیری لے لی تھی۔ وہ بیابان جنگلوں اور پہاڑوں میں رہتا تھا۔ یہ اتفاق تھا جو خدا نے اسے امن کا دیوتا بناکر بھیج دیا۔

اس واقعہ کے تین روز بعد تحصیلدار پیارے لال تھنواس آئے۔ پھر انہوں نے مجھ سے کہا۔ شاہ جی۔ گوجر، جاٹ اور ٹھاکر عجیب قسم کی اقوام ہیں۔ بظاہر کا لڑائی جھگڑا کرتے انہیں دیر نہیں لگتی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ پھر آپ کو بہانہ بناکر آپس میں کٹ مریں۔ بہتر ہے کہ آپ اب پاکستان چلے جائیں۔ تحصیلدار پیارے لال کے جانے کے بعد میں نے جہادیو سے کہا کہ اب میں پاکستان جانا چاہتا ہوں۔ اس نے انکار کیا کہ اگر آپ اپنے کو اکیلا تصور کرتے ہیں تو ہمیں بھی مسلمان بنالیں۔ اس وقت میں خاموش ہوگیا لیکن رات کو ٹھنڈے دل سے سوچا کہ اپنا ہم خیال بنا لیا۔ دوسرے روز صبح نو بجے کے

قریب جہادیوا آیا۔ اُس کے ساتھ چھ فٹ قد، مضبوط جسم اور دلکش نقش و نگار والی بے حد حسین ایک دیہاتی لڑکی تھی۔ لڑکی کی پیشانی پر خون میں ڈوبی ہوئی ایک پٹی بندھی تھی۔ جہادیوا بولا۔ شاہ جی یہ میری بہن ہے۔ بس اتنا فرق ہے میں ہندو گوجر ہوں اور یہ مسلمان گوجری ہے۔ آپ اسے اپنی بیوی کے پاس بھیج دیں۔ رات کو لڑکی نے میری بیوی کو بتایا کہ مسلح سکھ بلوائیوں نے ہمارے گاؤں پر حملہ کیا اس حملہ میں پچاس ساٹھ سکھ اور ہمارے گاؤں کے تمام مرد مارے گئے۔ فتح یابی کے بعد چار پانچ سکھوں نے میرے ساتھ دست درازی شروع کی۔ میں نے ایک سکھ سے کرپان چھین کر اس کے پیٹ میں گھونپ دی۔ وہ زمین پر گرا۔ ساتھ ہی دوسرے سکھ نے اپنی کرپان سے میری پیشانی کو گھائل کر دیا۔ اور پھر مجھے بے قابو کر کے وہ وہاں سے روانہ ہوئے۔ جب گھنا جنگل آیا تو ان درندوں نے پھر مجھے چھیڑنا شروع کیا میں نے اپنا سر زور سے درندے کے سر پر دے مارا۔ میری زخمی پیشانی سے خون بہنے لگا۔ اور ساتھ ہی میری چیخ نکل گئی۔ اسی دم گھنے جنگل سے ایک شخص نکلا اور وہ غصہ میں زور سے بولا۔ اس لڑکی کو چھوڑ دو۔ یہ لڑکی کون ہے۔ جواب میں سکھ نے کہا۔ یہ مسلمان گوجر کی بیٹی ہے "یہ گوجر کی بیٹی ہے اور میری رگوں میں بھی گوجری خون ہے۔ اور میں موضع تھنوا کا جہادیوا ڈاکو ہوں"، جواب میں سکھ بولا۔ جا او ہے میں نے اکڑ مونچھوں والے بہت ڈاکو دیکھے ہیں۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ پستول کی گولی نے اسے ڈھیر کر دیا۔ باقی سکھ مجھے چھوڑ کر جنگل کی طرف بھاگے تو دوسری گولی نے ان میں سے ایک سکھ کو اور لٹا دیا۔ اپنی بیوی کی زبانی یہ رُوداد سن کر میں سوچ رہا تھا کہ آج ڈاکو کے مقابلہ میں مذہبی اور سیاسی لیڈر کس قدر سفاک اور بے رحم ہیں۔ کاش ہندوستان کے تمام لوگ جہادیوا کی طرح ڈاکو ہوتے۔ پھر انسانیت پر زیادتی نہ ہوتی۔ اسی دم جہادیوا کے الفاظ میرے ذہن میں ابھرے۔۔۔۔ شاہ جی میں ڈاکو ہوں۔ میں نے بہت قتل کئے ہیں۔ لیکن میں خوش ہوں کہ میں نے کبھی کسی بیکس و مجبور کا خون نہیں بہایا شاہ جی۔ جب سے دیس میں یہ مار کٹائی شروع ہوئی ہے جانے کیوں میرا دل او رجگر انگارہ کی طرح دہکتا رہتا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ دو دن کے لئے مجھے حکومت مل جائے تو میں دکھاؤں کہ اس طرح امن قائم ہوتا ہے۔ جہادیوا کی شخصیت میرے لئے بہت اہم اور غیر معمولی بن گئی۔ خدا گواہ ہے مجھے وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔ چند روز بعد اس لڑکی کا رفیق حیات طفیل احمد خاں تھنوا آیا۔ طفیل احمد خاں کا گاؤں ریاست جیند میں تھا۔ وہ بڑا سجیلا اور گبرو جوان تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ انسانی جوڑا قدرت کا خاص شاہکار ہے۔ دو روز بعد جب طفیل احمد خاں لڑکی کو لے کر جانے لگا تو جہادیوا نے اس لڑکی کو بہن بنا کر کچھ روپیہ دیا اور چند ہتھیار بند لوگوں کی حفاظت میں انہیں ان کے گاؤں پہنچا دیا۔ میں حیران و ششدر تھا کہ یہ ڈاکو جس کے سینہ میں غیر متعصب اور فراخ دل ہے۔ کس طرح ڈاکہ ڈالتا ہے۔ غرض میں نے جہادیوا سے کہا کہ حد ہو چکی ہے اب آپ مجھے پاکستان جانے دیں۔ وہ چپ چلا گیا اور پھر دوسرے روز دس بارہ مسلح نوجوانوں کے ہمراہ آیا۔ ہم کھانے سے فارغ ہو کر دس بجے ڈابلے کے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں جھاڑیوں کے جنگل میں چار لاشیں بُری طرح خون میں لتھڑی ہوئی پڑی تھیں۔ اور کسی تیز دھار آلہ سے ان کی کھوپڑیاں خربوزہ کی طرح تراشی ہوئی تھیں۔ بڑا دردناک منظر تھا۔ میں اور جہادیوا آبدیدہ ہو گئے۔ شام کو ڈابلے کے اسٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوئے تو میں نے جہادیوا سے کہا کہ آپ واپس جائیں۔ جہادیوا بولا شاہ جی میں آپ کے ساتھ پاکستان جاؤں گا۔ اس کے ساتھی چلے گئے۔ اور جہادیوا ہمارے ساتھ اجمیر شریف آ پہنچا۔ یہاں گاڑی بدلنا تھی۔ جب میں دوسری گاڑی میں سوار ہو گیا تو میں نے جہادیوا سے کہا۔ کہ بس آپ واپس جائیں۔ مگر اس نے سوار ہونے کی کوشش کی۔ پھر میں نے راستہ روک کر کہا۔ بھائی ہمیں تو قسمت نے جلا وطن کر دیا۔ لیکن میں آپ کو جلا وطن نہ ہونے دوں گا۔ گاڑی چل پڑی۔ جہادیوا گاڑی کا ڈنڈا پکڑ کر زار و قطار رونے لگا۔ اس وقت میری آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے عجیب کرب ناک سین تھا۔ گاڑی چل رہی تھی۔ جہادیوا نے پھر سوار ہونا چاہا۔ میں نے عاجزی سے کہا۔ بھائی جس عزم اور مردانگی سے آپ نے فرقہ وارانہ منافرت کا مقابلہ کیا ہے۔ شاید میں نہ کر سکوں۔ آپ مجھے امتحان میں نہ ڈالیں۔ بلاشبہ آپ عظیم ترین انسان ہیں۔ اس نے آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پھر ڈنڈا چھوڑ دیا۔ میں نے پلیٹ فارم کی طرف دیکھا۔ وہ چلتی ہوئی گاڑی کو دیکھ کر بری طرح رو رہا تھا۔ پھر میں اُسے دیکھ نہ سکا۔ اب گاڑی فراٹے بھر رہی تھی۔ جہادیوا کے آنسو میرے خیالات کا مرکز بنے رہے۔ کس قدر عظیم تھے اس ڈاکو کے آنسو شاید وہ

(بقیہ صفحہ پر)

شاہد احمد دہلوی

مولانا صلاح الدین احمد

بتیس[۳۲] تینتیس[۳۳] سال پہلے کا ذکر ہے کہ میں ایک دفعہ لاہور گیا تو منصور احمد مرحوم سے ملنے کمرشیل بلڈنگ، مال روڈ پر گیا۔ منصور احمد اس وقت "ہمایوں" کی ادارت سے علیحدہ ہو چکے تھے اور مولانا تاجور نجیب آبادی سے "ادبی دُنیا" لے چکے تھے۔ "ہمایوں" کی تمام تر ادارتی ذمہ داری مولانا حامد علی خاں نے سنبھال لی تھی۔ مولانا تاجور نے سنہ ۱۹۲۹ء میں بڑے سائز پر "ادبی دنیا" شائع کرکے ادبی رسائل میں دھوم مچادی تھی۔ یہ زمانہ "نیرنگِ خیال" اور "عالمگیر" کے شباب کا زمانہ تھا۔ مگر "ادبی دنیا" اس شان سے نکلا کہ ان بجھ جلنے پرچوں کے چراغ جھلملانے لگے۔ "ادبی دنیا" کے ادارے میں پہلا نام مولانا تاجور کا تھا اور دوسرا پنڈت میلارام وفا کا (جو عرفِ عام میں طوطا رام بے وفا کہلاتے تھے) مولانا تاجور "ادبی دنیا" کے اجرا سے پہلے "مخزن" اور "ہمایوں" کے اڈیٹر رہ چکے تھے۔ لہٰذا منجھے ہوئے اڈیٹر تھے اور ان کی دھاک بندھی ہوئی تھی۔ "ادبی دنیا" نکلا اور دو ایک چھلانگیں لگا کر سب سے آگے نکل گیا۔ مگر جو بہت تیز دوڑتے ہیں وہ ہانپ بھی جلدی جاتے ہیں۔ "ادبی دنیا" کے عروج کا زمانہ طول نہ پکڑ سکا۔ مولانا تاجور ایک مقامی کالج میں پڑھاتے تھے۔ اور ایک بہت بڑے تاجر کتب عطر چند کپور کے ہاں کتابیں لکھنے اور لکھوانے کا کام بھی کرتے تھے۔ "ادبی دُنیا" کا کام انہوں نے میلارام وفا اور دو ایک آدھ کچرے ادیبوں پر چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ کہ پرچہ گرنے لگا تو تاجور صاحب نے منصور احمد سے اس کا سودا کر لیا۔ منصور احمد مرحوم صرف اڈیٹر نہیں تھے، ادیب بھی تھے، اور اچھی شہرت کے ادیب تھے۔ انہوں نے "ادبی دُنیا" کی ڈوبتی ناؤ کو پھر ترا دیا۔ بلکہ پرچے کی سنجیدگی اور بُردباری میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ میری مرحوم سے پہلی اور آخری ملاقات ہوئی۔ دھان پان سے خاموش طبیعت کے آدمی تھے۔ یہیں ایک اور صاحب کو بھی دیکھا جو منصور احمد کے دوست اور رفیقِ کار تھے۔ ان کا نام صلاح الدین احمد تھا۔ یہ صاحب ایک اور پرچہ بھی نکالتے تھے، یاد نہیں رہا اس کا کیا نام تھا۔ نام اس کا بھی دنیا ہی پر تھا۔ پرچہ غیر معروف ایڈیٹر بھی غیر معروف۔ اس لیے علیک سلیک کے علاوہ ان سے اور کوئی بات نہیں ہوئی۔ بات منصور احمد سے بھی کچھ زیادہ نہیں ہوئی مگر اس مختصر ملاقات نے بھی منصور احمد کے لیے میرے دل میں جگہ بنا دی۔ اور کچھ ہی دنوں میں مجھے ان سے اس درجہ شیفتگی ہو گئی کہ میں نے ان کے نام پر اپنے ایک بچے کا نام منصور احمد رکھا۔ انہوں نے "ادبی دُنیا" کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ مگر انہیں زمانے کی نظر لگ گئی اور یہ منحوس خبر سننے میں آئی کہ منصور احمد کو دق ہو گئی۔ اس زمانے میں اس موذی مرض کا کوئی علاج نہیں تھا۔ منصور احمد گھُل گھُل کر مر گئے اور "ادبی دُنیا" بھی ان کے ساتھ دم توڑنے لگا۔ عجب اتفاق ہے کہ میرا لڑکا منصور احمد بھی ایک سال کا ہو کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ پھر سُنا کہ اشتہارات کی ایک کمپنی نے "ادبی دُنیا" کو لے لیا ہے اور صلاح الدین احمد کو اس کا اڈیٹر مقرر کیا ہے۔ پرچہ اسی آن بان سے شائع ہونے لگا۔

صلاح الدین احمد صاحب اس وقت تک بالکل گمنام تھے - مگر ان کا سلیقہ پرچے کی ترتیب و تہذیب سے ٹپکتا تھا۔ انھوں نے اپنی مدد کے لیے میراجی کو شریکِ ادارت کر لیا تھا - کچھ تو اپنے عجیب و غریب نام کی وجہ سے اور کچھ اپنی عجیب تر منظومات کے باعث میراجی شہرت کے پر لگا کر اڑنے لگے - صلاح الدین احمد صاحب نثر کی نگرانی کرتے تھے اور میراجی نظم کی - میراجی پھر بہت اچھی نثر بھی لکھنے لگے تھے، مگر صلاح الدین احمد صرف ادارتی نوٹ لکھتے تھے - سالہا سال تک انھوں نے کوئی مضمون نہیں لکھا -

مجھے جو عقیدت "ادبی دُنیا" سے تھی وہ جاری رہی اور میں "ادبی دُنیا" کے اشتہارات ساقی میں شائع کرتا رہا - اور طلب کرنے پر بھی تبادلہ میں ساقی کا اشتہار نہیں بھیجتا تھا - اور جب "ادبی دنیا" کے کسی خاص نمبر پر ریویو لکھتا یا اس کا تذکرہ کرتا تو اسے "اُردو کا سب سے بڑا رسالہ" کہتا تھا - پھر میں نے "اَدبی دنیا" کے لئے مضامین بھی لکھنے شروع کر دیئے تھے - اس دور میں جو میں لاہور گیا تو "اَدبی دنیا" کے دفتر بھی پہنچا - دفتر مال روڈ ہی پر اور آگے منتقل ہو گیا تھا - جب صلاح الدین احمد صاحب سے ملاقات ہوئی تو بڑی محبت سے گلے ملے اور ان کی گفتگو کا آغاز میری توصیف سے ہوا - میں شرمندہ ہو رہا تھا اور صلاح الدین احمد صاحب مسکراتے اور ہنستے جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ "صاحب، آپ "ادبی دُنیا" کے اشتہارات شائع کر دیتے ہیں - اور ہمیں اپنا اشتہار نہیں بھیجتے - آپ ہمارے لیے مضامین لکھتے ہیں اور معاوضہ نہیں لیتے - عجیب بات ہے" یہ کہہ کر مقتہ ہنس ہنستے - میں ٹالنے کے لیے "چونکہ چنانچہ" کی باتیں کرتا مگر وہ خندۂ دنداں نما کے ساتھ موضوع کو بدلنے نہ دیتے - دراصل اس زمانے میں لاہور سے ایک سے ایک بڑھ کر رسالہ شائع ہو رہا تھا - ہمایوں، نیرنگِ خیال، عالمگیر، شاہکار، خیالستان - سبھی باون گزے تھے - جتنے یہ بڑے تھے اتنی ہی ان میں بڑی رقابتیں تھیں - دُنیائے ادب میں انھوں نے چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں بنالی تھیں، ان ریاستوں میں باہمی خوشگواری نہیں تھی بلکہ تناتنی یا بے تعلقی رہتی تھی - ہر رسالے نے اپنے مضمون نگاروں کا ایک مخصوص حلقہ بنا رکھا تھا - ایک رسالے کے مضمون نگار عموماً دوسرے رسالے میں نہیں لکھتے تھے، یا شاید مدیروں نے اپنے مضمون نگاروں سے حلفِ وفاداری لے رکھا تھا کہ کسی اور پرچے میں نہیں لکھیں گے - چنانچہ سالک، امتیاز علی تاج، پطرس تاثیر، ایم - اسلم، قاضی عبدالغفار اور حفیظ جالندھری "نیرنگ خیال" ہی میں لکھا کرتے تھے - صلاح الدین احمد صاحب کی خوش مذاقی اور سلیقہ شعاری نے بھی اپنے گرد نئے اور اچھے ادیبوں کا ایک حلقہ بنا لیا تھا - ان میں کرشن چندر، بیدی عاشق بٹالوی، اپندر ناتھ اشک، حفیظ ہوشیارپوری، اور حلقہ اربابِ ذوق کے اُبھرتے ہوئے ادیب اور شاعر شریک تھے -

"ہمایوں" کے لکھنے والوں میں فلک پیما، نیرنگ، آزاد انصاری، جوش ملیح آبادی، اور فیاض محمود تھے - خود میاں بشیر احمد ؒ اپنے پرچے کے کسی اور پرچے میں نہیں لکھتے تھے - یوں لاہور چھوٹے چھوٹے ادبی جزیروں میں بٹا ہوا تھا - ایک رسالے کا اشتہار دوسرے رسالے میں بالعموم نہیں چھاپا جاتا تھا اور نہ کسی تقریب میں دوسرے حلقے کے ادیبوں کو مدعو کیا جاتا تھا -

جنوری ۱۹۳۰ء میں دلّی سے ساقی نکلا تو بڑی جد و جہد اور کشمکش کے بعد اس نے ان سب حلقوں سے تعلقات استوار کیے - بے تعلقی کے حصاروں میں رخنے ڈالے - دوسرے پرچوں کے اشتہارات بھی شائع کئے اور بلا امتیاز ان پرچوں کے لیے مضامین بھی لکھے - اس روش پر صلاح الدین احمد صاحب کو بڑا اچنبھا ہوا اور اسی لئے وہ ٹوٹ کر ملے اور اس ملاقات کے بعد حلقے اور حصار بھی رفتہ رفتہ ٹوٹ گئے -

صلاح الدین احمد صاحب کی شخصیت بڑی من موہنی تھی - وہ ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے اور باتیں کرنے میں بھی مسکراتے جاتے تھے -

دُہرے ڈیل کے بھاری بھرکم آدمی تھے - بمبئی والوں کی سی کالی کرسٹی کیپ، ہنستی پیشانی، غلافی آنکھیں خوش دلی سے نیم وا، کتابی سی ناک، کتروان مونچھیں، لبوں پر خلوص کی مسکراہٹ، گول چہرہ، کھلتا ہوا رنگ، اچھا نکلتا ہوا قد، سوٹ پہنتے تھے۔ تھے تو گریجویٹ مگر انھیں انگریزی بولتے نہیں سُنا، بلکہ گفتگو میں بھی کیا مجال جو کوئی انگریزی لفظ آجائے - اُردو کے عاشق تھے - اپنے رسالے میں برابر اعلان کرتے رہتے - اُردو پڑھیے اُردو لکھو، اُردو بولو۔ یوں تو پنجاب کے سبھی ادیب اُردو کے فدائی ہیں اور زبان کے معاملے میں اہلِ زبان سے بھی اُلجھتے سلجھتے رہتے ہیں مگر میں نے یہ تماشہ بھی بہت دیکھا ہے کہ جب اُردو کے دو پنجابی ادیب آپس میں ملتے ہیں تو بلا تکلف اُردو کو بالائے طاق رکھکر فوراً پنجابی میں بات چیت کرنے لگتے ہیں - اوروں کا تو ذکر ہی کیا، علامہ اقبال بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے - مگر ایک تو صلاح الدین احمد اور دوسرے حامد علی خاں دو ادیب ایسے دیکھے جو پنجاب کے معزز خانوادوں سے تعلق رکھتے ہوئے بھی ہمیشہ اُردو ہی بولا کرتے تھے - بلکہ یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے گھروں میں بھی اُردو ہی بولی جاتی تھی جبھی تو زبان بھی چغلی نہیں کھاتی تھی اور اہلِ زبان کی طرح فر فر اُردو بولنے لگے تھے - یہاں تک کہ بعض دفعہ مجھے ان کی خوش گفتاری پر رشک آنے لگا تھا - لکھنے کو تو سینکڑوں کتابی زبان والے اچھی سے اچھی زبان لکھ لیتے ہیں مگر بولنا ٹیڑھی کھیر ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد وضع قطع سے تو بالکل اَپ ٹو ڈیٹ جنٹلمین دکھائی دیتے تھے مگر کہلاتے "مولانا" تھے - سب انہیں مولانا کہہ کر ہی مخاطب کرتے تھے اور جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو انھوں نے مجھے بھی مولانا ہی کہہ کر مخاطب کیا - میں نے دل میں کہا "دلی را دلی می شناسد" شاید میں بھی مولانا ہی ہوں! لہٰذا آخری ملاقات تک "مَن ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" پر ہمارا عمل رہا - وہ مجھے مولانا کہتے رہے اور میں انھیں مولانا کہتا رہا۔

پہلی ملاقات کے دوسرے دن شام کو مولانا نے اپنے دفتر میں میرے اعزاز میں پُر تکلف عصرانہ کا اہتمام کیا - اس میں اپنے مقامی لکھنے والوں کو بلایا اور سب سے مجھے متعارف کیا - مولانا کے اس خلوص نے مجھے اور بھی ان کا گرویدہ کر دیا - اسی پارٹی میں کرشن چندر، بیدی، اشک، شیر محمد اختر، عاشق بٹالوی، اور کئی اور ادیبوں سے ملاقات ہوئی اور ان سے تعلق خاطر قائم ہوا - اس تقریب سے میری تو عزت افزائی ہوئی ہی مگر مولانا کی وسیع القلبی بھی ظاہر ہوئی، ورنہ اس زمانے میں یہ رواج تھا کہ اڈیٹر اپنے مخصوص لکھنے والوں سے بالمشافہ ملوانا تو کیسا ان کے پتے تک نہیں بتاتے تھے۔

مولانا ادب کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے - اگر کسی مضمون میں ذرا بھی فحش کا شائبہ ہوتا یا عریانی کی جھلک ہوتی تو وہ اسے مسترد کر دیتے - اس وضع احتیاط میں پہلا نمبر "ہمایوں" کا تھا کہ بوسہ کا لفظ "ہمایوں" میں نہیں چھپ سکتا تھا - مولانا اتنے متشدد تو نہ تھے لیکن کچھ زیادہ ہی محتاط تھے - ترقی پسند تحریک نے ہمارے ادیبوں کو کھل کھیلنے کی راہ سجھا دی تھی - "انگارے" نے جیسے کہ اس نے اور آگ لگا دی اور اسی طرز کے افسانے لکھنا فیشن میں داخل ہو گیا - جنسی معاملات کا بے باکانہ بیان ترقی پسندی کی علامت ٹھہری - لہٰذا نئے لکھنے والے تو سب بہک کر اُدھر ہی کو ڈھل گئے - بہت کم ادیب ایسے رہ گئے جنھوں نے ملامت روی کی چال نہیں چھوڑی - یہی وہ افراتفری کا زمانہ تھا کہ مولانا نے کرشن چندر اور بیدی جیسے ادیبوں کو سہارا دیا - اور ان سے مضامین لکھوا لکھوا کر انھیں بھاری بھرکم ادیب بنا دیا - مولانا سالہا سال تک "ادبی دنیا" شائع کرتے رہے - مگر انھوں نے سوائے ادارتی نوٹوں کے نہ تو اپنے رسالے میں کوئی قابلِ ذکر مضمون لکھا اور نہ کسی اور رسالے میں - دو چار کتابوں کے پیش لفظ انھوں نے ضرور لکھے تھے جن میں سے ایک ان کے عزیز دوست عاشق بٹالوی کے افسانوں کے مجموعہ "شاخسار" پر تھا اور ایک عصمت چغتائی کے افسانوں کے مجموعے "کلیاں" پر - انہی کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ مولانا کی نظر

بھی گہری ہے اور عبارت بھی سلیس اور رواں لکھتے ہیں۔ مولانا اس وقت تک، ادیب سے زیادہ ادیب گر تھے۔ پھر قیام پاکستان سے چند سال پہلے انھوں نے "کہنے کی باتیں" کے عنوان سے رسالوں کے بعض مضامین کے بارے میں لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ گویا جدید ترین ادب کا جائزہ ہوتا تھا۔ اسی سلسلے میں آگے چل کر انھوں نے ساقی کے ایک مضمون پر کڑی تنقید کی جو مجھے اس لیے ناگوار گزری کہ میں اتنا لقمہ مذاق نہیں رکھتا تھا جتنا کہ مولانا، یا میں اتنا محتاط نہیں تھا جتنے کہ مولانا۔ میں نے ساقی میں اس کا جواب لکھا اور شروع اس فقرے سے کیا کہ مولانا جو "کہنے کی باتیں" ہر مہینے لکھتے ہیں وہ دراصل "نہ کہنے کی باتیں" ہوتی ہیں۔ اس مضمون میں مَیں کسی قدر بدلحاظی بھی کر گیا تھا۔ مولانا بڑے ظرف کے آدمی تھے۔ مجھے فوراً معذرت کا خط لکھا اور لکھا کہ آج سے یہ سلسلہ ہی بند کر دیا گیا۔ مجھے اپنی بدتمیزی پر افسوس ہوا اور میں نے مولانا سے معافی چاہی۔ مگر "کہنے کی باتیں" پھر نہیں چھپیں اور جب اس واقعہ کے بعد مولانا سے ملاقات ہوئی تو ان کے طرزِ تپاک میں کوئی فرق میں نے محسوس نہیں کیا۔ "از خورداں خطا و از بزرگاں عطا"۔ مولانا مجھ سے پانچ سال بڑے تھے۔ مجھ پر آخر تک شفقت فرماتے رہے۔

جب دلی سے اجڑ کر مَیں ستمبر ۱۹۴۷ء کے تیسرے ہفتے میں لاہور پہنچا تو اپنی ادبی برادری والوں سے ملنے کی جستجو ہوئی۔ معلوم ہوا کہ مولانا کا گھر ہندوؤں کے محلّے میں تھا۔ جب اس محلّے میں آگ لگی تو ان کا گھر بھی جل گیا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ مولانا کے لواحقین سب شملہ میں تھے ورنہ اس آتش زدگی میں خبر نہیں ان پر کیا گزرتی؛ مگر وہ سب کے سب شملے میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ مولانا بے حد پریشان تھے، مگر اللہ نے بڑا فضل کیا کہ ان کے مال پر ملی۔ جانیں سب کی بچ گئیں۔ مکان جل گیا تھا، گھر والے شملے میں پھنسے ہوئے تھے۔ "ادبی دنیا" بند ہو گیا تھا، مگر مولانا کے اندازِ تکلم میں مسکراہٹ اس وقت بھی شامل تھی۔

قیامِ پاکستان سے پہلے مولانا کی حیثیت ایک اچھے اڈیٹر اور صاحبِ نظر نقّاد کی تھی۔ ادیب یا مصنّف یا تو انھوں نے بننا نہیں چاہا یا شاید وہ یہ چاہتے تھے کہ اس میدان میں جب آئیں تو کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ وہ صفِ اوّل کے اڈیٹر تھے، غالباً انھوں نے اسے پسند نہیں کیا کہ تیسری یا دوسری صف کے ادیبوں میں ان کا شمار ہو۔ کیونکہ ایک دفعہ ساکھ بگڑ جانے کے بعد اس کا سنورنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جو ادیب زیادہ لکھتا ہو وہ اچھا بھی لکھتا ہو۔ مولانا نے بڑی دانشمندی سے کام لیا کہ محض اپنا شوق پورا کرنے کے لیے یا حصولِ شہرت کے لیے کچھ نہیں لکھا۔ اور جب وہ اس میدان میں آئے تو اس شان کے ساتھ کہ سب سے بازی لے گئے۔ اس وقت وہ پچاس کے پیٹے میں آ چکے تھے۔ گویا ان کے شیب سے ان کے قلم کا شباب شروع ہوا۔ مگر جس منزل تک پہنچنے کے لئے ادیب ساری ساری عمر خامہ فرسائی کرتے ہیں اور پھر بھی نہیں پہونچ پاتے، مولانا نے ایک ہی جست میں اس منزل کو جا لیا۔

اب جو مولانا ہمارے سامنے آئے تو ان کا رنگ روپ ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک نہایت حسین و دل نشین طرزِ بیان بھی لائے تھے۔ اس اندازِ گلفشانی پر شمس العلماء محمد حسین آزاد کا سایہ تھا۔ مولانا کو پروفیسر آزاد کی تحریروں سے والہانہ شیفتگی تھی۔ اور ہونی بھی چاہیئے تھی کیونکہ آج بھی اُردو کے سب سے بڑے انشاپرداز آزاد ہی ہیں۔ مگر آزاد کی مرصّع کاری کی پیروی کرنا جوئے شیر کا لانا ہے۔ اس صدی میں تو کسی کو حوصلہ ہوا نہیں۔ آزاد کی برسی ہر سال ان کے پوتے آغا محمد باقر لاہور میں مناتے ہیں اور ہر برسی میں مولانا صلاح الدین احمد آزاد کے کسی نہ کسی پہلو پر آزاد ہی کے انداز میں مضمون لکھ کر سناتے رہے ہیں۔ یوں آزاد کا طرزِ تحریر مولانا کے گھٹ میں اُتر گیا اور اس میں مولانا نے اپنے قلب و نظر کی خاص ودیعتیں شامل کر کے اپنا ایک خوش رنگ و خوش آہنگ اسلوب مرتّب کر لیا۔ اس مد میں مولانا نے جو کچھ لکھا آنکھوں سے لگانے اور دل میں سمانے

کے لائق ہے۔

اب سے کوئی دس سال پہلے پاکستان کے ادبی رسائل کی ناقدری وزبوں حالی کے پیش نظر جب مولانا رازق الخیری اور میں نے مل کر انجمن ادبی رسائل پاکستان کی داغ بیل ڈالی تو پاکستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں کے ادبی رسائل کو ہم نے انجمن کا ممبر بنالیا۔ اور سب نے رکنیت اس لیے فوراً قبول کرلی کہ ہم سب کے مسائل ایک ہی سے تھے۔ مگر مولانا صلاح الدین احمد نے رضامندی ظاہر نہیں کی۔ اس پر ہمیں تعجب بھی ہوا۔ خیر چند مہینے بعد انجمن کی مجلس عاملہ نے طے کیا کہ اس کا باقاعدہ افتتاحی جلسہ لاہور میں کیا جائے۔ لہٰذا ہم نے چندہ کیا اور بارہ اڈیٹر لاہور پہنچ گئے۔ لاہور میں ہمارے ٹھہرنے اور جلسے کا انتظام لاہور کے ادبی رسائل کے اڈیٹروں نے کیا تھا۔ ان میں پیش پیش نقوش کے اڈیٹر محمد طفیل صاحب تھے۔ شام کو مہمان اور میزبان سب ایک جگہ جمع ہوئے اور جلسے کی تفصیلات طے کی گئیں۔

اگلے دن صبح ہی صبح میں اور مولانا رازق الخیری مولانا صلاح الدین احمد کے گھر پہنچے۔ دروازہ بند تھا۔ کنڈی کھٹکھٹائی، جواب ندارد۔ پھر کھٹکھٹائی، دور سے آواز آئی۔" ذرا ٹھہرو" ٹھہر گئے۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا تو صلاح الدین احمد صاحب گھبرائے ہوئے برآمد ہوئے اور ہمیں دیکھکر اور بھی گھبرا گئے۔ ان کا سر اور دھڑ پانی میں تربتر تھا۔ صرف پاجامہ پہنے ازاربند باندھتے چلے آئے تھے۔ جھجک کر بولے۔" آپ حضرات ہیں! میں سمجھا دودھ والا ہے۔ معاف فرمائیے ابھی حاضر ہوا" اور مولانا بغل ڈوب کر غائب ہوگئے۔ ہم اپنی جگہ پر شرمندہ ہورہے تھے کہ ایک شریف آدمی کے گھر صبح ہی صبح کیوں بے اطلاع جادھمکے۔ اتنی دیر میں مولانا کرتا پہن کر آگئے۔ اور بولے" آئیے، اندر تشریف لائیے" پہلو میں ایک کمرہ تھا۔ جس میں انھوں نے ہمیں بٹھایا اور ناشتہ کو پوچھا۔ ہم نے کہا" ناشتہ سے ہم فارغ ہوچکے ہیں۔ آپ سے دو باتیں کرنی تھیں، اس لئے حاضر ہوگئے" بولے۔" فرمائیے" خیری صاحب نے کہا۔" ایک تو یہ بتائیے کہ آپ انجمن کے ممبر کیوں نہیں بنے؛ اور دوسرے یہ کہ آپ ہمارے جلسے میں شریک کیوں نہیں ہورہے؟" مولانا نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ پھیلا کر کہا۔" مولانا! میں کسی انجمن کا ممبر نہیں بنتا۔ ویسے میں آپ کے ساتھ ہوں۔ دیکھئے میں نے جلسے کے لیے دو ریزولیوشن لکھے ہیں جو میرے ہی نام سے پیش کئے جائیں گے۔"

ہم نے مولانا سے مزید سوالات کرنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ مولانا بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتے تھے، اور پھر اپنے فیصلے پر جم جاتے تھے۔ ہمیں جلسہ گاہ میں پہنچنا تھا اس لیے اس مختصر سی ملاقات کے بعد ہم نے مولانا سے اجازت چاہی۔

مولانا بہت ہی خوددار آدمی تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ جو انجمن بنی ہے اس لیے بنی ہے کہ ادبی رسائل کے حقوق کا تحفظ کرنے کے ساتھ ساتھ اسے کچھ سرکاری امداد ملنے لگے۔ اور جب اسے امداد ملنے لگے گی تو آگے چل کر اس میں جھگڑے بھی بہت پڑیں گے۔ مولانا دنگے فساد سے دور رہتے تھے۔ اپنی ۴۵ سالہ ادبی زندگی میں وہ ایک دفعہ بھی کسی سے نہیں اُلجھے۔ خاموشی سے اپنا کام کئے جاتے تھے۔ سرکاری امداد قبول کرنے کے وہ سخت مخالف تھے۔ جب انھوں نے پنجاب اکیڈمی بنائی تو انھیں بڑی آسانی سے ۲۵ ـ ۳۰ ہزار سالانہ کی سرکاری امداد مل سکتی تھی۔ مگر وہ اپنا گھر لٹاتے رہے اور انھوں نے کبھی ایک پیسہ بھی کسی سے بطور امداد قبول نہیں کیا۔ مولانا اپنے منصوبے خود بناتے تھے اور انھیں اپنی ہی مرضی سے پورا کرتے تھے۔ کسی طرف سے دخل درمعقولات وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ دو ایک سال ہوئے کہ انھوں نے ایک ادارے اُردو فاؤنڈیشن کی بنیاد ڈالی تھی اور بڑے پیمانے پر اُردو مطبوعات کا کام کرنا چاہتے تھے۔ اور یقیناً وہ ان تمام اداروں سے کہیں زیادہ اور بہتر کام کرتے جنھیں لاکھوں روپے سالانہ کی امداد حکومت سے مل رہی ہے۔ انجمن ادبی رسائل پاکستان نے حکومت سے سالانہ امداد حاصل کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں کیا

کیونکہ اس انجمن کا کام صرف ادبی رسالوں کے حقوق کا تحفظ کرنا ہے اور اس میں کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ اگر کچھ خرچ ہوتا بھی ہے تو اس کے اراکین خود ہی اخراجات کو پورا کر لیتے ہیں۔ مگر مولانا کی حد سے بڑھی ہوئی احتیاط نے اس پر بھی انھیں رکنیت قبول کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ جب ڈیڑھ سال پہلے انجمن کا سالانہ جلسہ لاہور میں ہوا تو اس کی ایک ادبی نشست میں، جس کی صدارت جسٹس جان نے کی تھی، مولانا نے ایک نہایت پُر مغز اور دلآویز مضمون پڑھا تھا۔ یوں انھوں نے اپنا وعدہ پورا کیا کہ ممبر نہ ہونے کے باوجود وہ ہمارے شریکِ کار رہے۔

[illegible] سال سے اس کوشش میں ہے کہ بعض ان مدیرانِ رسائل کے وظائف مقرر ہو جائیں جنھوں نے ساری عمر خدمتِ ادب میں گزار دی اور اب ان کی صحت بھی جواب دے رہی ہے اور مالی حالت بھی اچھی نہیں رہی ہے۔ جتنی بھی حکومتیں اب تک پاکستان میں برسرِ اقتدار آئیں ان کے وزرا اور وزارت کے سکریٹریوں کی خدمت میں انجمن کے وفود حاضر ہو کر محضر پیش کرتے رہے مگر یہ اتفاق ہے جب کام پنپنے پر آیا تو حکومت بدل گئی۔ جن [illegible] مدیروں کے لیے جدوجہد کی جا رہی ہے ان میں سے بلا استثنا سبھی نے شرط لگائی ہے کہ یہ وظائف بطور خیرات قبول نہیں کئے جائیں گے بلکہ انھیں اگر حسنِ خدمات کا صلہ موسوم کیا جائے گا تو قابلِ قبول ہوں گے۔ اور یہ بھی اس لیے کہ حکومت ہماری اپنی ہے، اسی غیر ملک کی نہیں ہے۔ مگر وظائف کی فہرست میں جب مولانا کا نام [illegible] کرنے کی اجازت چاہی گئی تو وہ اس قدر گھبرائے اور برہم ہوئے جیسے ان سے خطِ غلامی لکھوایا جا رہا ہو۔ بولے: "میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میرا نام ہرگز پیش نہ کریں میں نے آج تک کسی قسم کی سرکاری امداد قبول نہیں کی ہے۔ مجھے معاف رکھا جائے۔"

میں تو مولانا کی طبیعت سے کسی قدر واقف تھا اس لئے ان کی برہمی پر متعجب نہیں ہوا، مگر انجمن کے صدر مولانا رازق الخیری حیرت اور شرمندگی سے ان کا مُنہ تکنے لگے۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ مولانا اس تجویز کو سُن کر خوش ہو جائیں گے۔ مگر وہاں الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔ مُعذرت کر لی مگر مولانا قائل نہیں ہوئے اور ہم اپنا سا مُنہ لے کر مولانا کے دفتر سے چلے آئے۔ مولانا رازق الخیری نے زینے سے اُترنے کے بعد خاص دلّی والوں کے [illegible] کہا "بس بھئی، کیا کہنے" میں نے کہا۔ "جی ہاں! یہ طائرِ لاہوتی ہے۔"

قیامِ پاکستان کے بعد اُردو کے فدائی لاہور میں گنتی کے رہ گئے تھے، ان میں سے بھی نئے حالات نے بہت سوں کو ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان شکست خوردہ ادیبوں میں [illegible]، مہر، اور امتیاز علی تاج جیسے قد آور لوگ بھی شریک تھے۔ سالک اور مہر نے اخبار "انقلاب" بند کر کے کتابیں تصنیف کرنا شروع کر دی تھیں۔ تاج صاحب "تہذیبِ نسواں" اور "پھول" سے کنارہ کر کے ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہو گئے تھے، اور بعد میں اور سرکاری کاموں میں مبتلا ہو گئے۔ میاں بشیر احمد نے پے در پے کئی اڈیٹر بدلے مگر "ہمایوں" کا معیار بھی گرتا گیا، اور اشاعت بھی یہاں تک کہ مایوس ہو کر انھوں نے "ہمایوں" بند کر دیا۔

حامد علی خاں صاحب نے "احمر" جاری کیا تھا، بہت سارا نقصان بھرنے کے بعد بند کرنا پڑا۔ "نیرنگِ خیال" کے اڈیٹر حکیم محمد یوسف حسن صاحب لاہور سے اپنا پرچہ پنڈی لے گئے اور جب اس کے چلنے کی کوئی راہ نہ نکلی تو اسے بند کر کے حکمت سے ہو رہے۔ "عالمگیر" کے اڈیٹر حافظ محمد عالم کا انتقال ہو گیا اور ان کے ساتھ ان کا پرچہ بھی مر گیا۔ اس افراتفری میں بڑے بڑوں کے جی چھوٹ رہے تھے مگر مولانا صلاح الدین احمد ڈٹے ہوئے تھے۔ جب بھی انھیں موقع ملتا "ادبی دُنیا" کا ایک پرچہ چھاپ دیتے۔ یوں کئی سال تک ان کا پرچہ گنڈے دار نکلتا رہا اور اسی افراتفری میں انھوں نے پنجاب اکیڈمی قائم کر کے کتابیں چھاپنی شروع کر دیں۔

اپنے پُرانے رفیقِ کار میراجی کی کتابیں چھاپنا چاہتے تھے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ بمبئی میں میراجی کا انتقال ہوگیا تھا۔ ن کی یادگار اس طرح قائم کرنا چاہتے تھے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا تھا اسے کتابی صورت میں محفوظ کردیں۔ دوسرے میراجی کے مرنے سے ان کی بیوہ، بیٹا، والدہ مالی مشکلات میں مبتلا ہوگئی تھیں۔ مولانا نے مجھے اس سلسلے میں خط لکھا کہ میراجی کی کتابیں چھاپ کر ان کی رائلٹی ان کی والدہ کو دینا چاہتے ہیں۔ میرے پاس میراجی کی چار کتابوں کے حقوقِ اشاعت تھے میں نے ان سے دست برداری لکھ کر مولانا کو بھیج دی۔ مولانا بہت خوش ہوئے اور مجھے طویل خط شکریہ کا لکھا۔ میراجی کے نثری مضامین کا انتخاب مولانا نے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں چھاپ دیا تھا۔ افسوس کہ ان کی منظومات کے مجموعے شائع کرنے کی نوبت نہ آئی۔

یوں تو مولانا لڑائی بھڑائی سے بہت دور رہتے تھے اور کبھی کسی سے ان کی معاصرانہ چشمک نہیں ہوئی مگر وہ تھے بڑے دبنگ آدمی۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ صدر ایوب نے جب پنجابی میں تقریر کی تو مولانا نے انھیں برملا ٹوک دیا کہ انھیں قومی زبان اُردو میں تقریر کرنی چاہیئے تھی۔ اور اس پر بھی توجہ دلائی تھی کہ اسلامی جمہوریۂ پاکستان میں سے لفظ اسلامی کیوں ساقط کیا گیا؟

صدر ایوب مولانا کی اس جراُت مندانہ تنقید سے ناخوش نہیں ہوئے جیسا کہ ان کے اس پیغام سے ظاہر ہوتا ہے، جو انھوں نے مولانا کے انتقال پر دیا۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر کہیئے کہ ہم میں سے کتنے ہمت رکھتے ہیں کہ صدرِ پاکستان کو اس بے باکی سے ٹوک دیں؟ ؎

آئینِ جوانمرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اپنی زندگی کے چند آخری سال میں مولانا کے دل میں یہ سما گئی تھی کہ وہ ۶۳ سال کی عمر میں مرجائیں گے۔ اس کی تصدیق یوں ہوئی کہ ابنِ انشا صاحب نے کراچی سے اپنے ادارے کا کچھ کام مولانا کو سال ڈیڑھ سال پہلے بھیجا تھا۔ مولانا نے کم فرصتی کا عذر کرکے کام لوٹا دیا تھا اور انشا صاحب کو بتایا تھا کہ چونکہ ان کے اب و جد ۶۳ سال کی عمر میں انتقال کرتے رہے ہیں لہذا انھیں بھی ۶۳ سال کی عمر میں مرجانا ہے۔ اور اس عمر کو پہونچنے میں کچھ زیادہ عرصہ باقی نہیں رہا تھا۔ یہ بات انشا صاحب نے مجھے بتائی تھی، اور جب میں پچھلے سال لاہور گیا تو حامد علی خاں صاحب سے برسبیلِ تذکرہ مولانا کے اس وہم کا بھی ذکر آیا۔ حامد صاحب نے فرمایا۔ "یہ واقعہ صحیح ہے۔ اسی لیے وہ اپنے تمام کام جلدی جلدی سمیٹ رہے ہیں۔" انھوں نے اپنی ساری پونجی اپنے ادارے "اُردو فاؤنڈیشن" کے لیے وقف کردی تھی اور "ادبی دُنیا" کو ایک نئے انداز سے نکالنا شروع کردیا تھا۔ تین سو صفحے کا پرچہ اب انھوں نے ایک روپے میں دینا شروع کردیا تھا حالانکہ اصولاً اس کی قیمت تین روپے ہونی چاہیئے تھی۔ اخبار فروشوں کو کمیشن وغیرہ دینے کے بعد نو آنے کا پڑتا تھا۔ لہذا "ادبی دُنیا" کی دھوم مچ گئی اور ہر اشاعت کے بعد اس کی تعداد دوگنی ہوتی چلی گئی۔ یعنی نقصان بھی دوگنا ہوتا چلا گیا۔ ہم کہتے تھے کہ یہ تو صریحاً خودکشی ہے، مولانا نے موم بتی کو دونوں سروں سے جلا دیا ہے۔ اور مولانا یہ سمجھتے تھے کہ ایک وقت ایسا ضرور آجائے گا کہ اس صورت میں پرچہ خود کفیل ہوجائے گا۔ وہ فرماتے تھے کہ "میں اپنی اولاد کے فرائض سے سبکدوش ہوچکا ہوں۔ میرا ایک مکان اور رہ گیا ہے، میں اسے بھی بیچ کر اس تجربے میں لگا ڈالوں گا۔ ۶۳ سال کی حد اب قریب آچکی ہے۔ اپنے سامنے ہی "ادبی دُنیا" کی بنیادیں استوار کردینا چاہتا ہوں۔" اور اگر مولانا کو موت فرصت دیتی تو یقیناً وہ اپنے تجربے میں کامیاب بھی ہوجاتے۔ مگر ۶۳ سال پورے ہوگئے

اور مولانا کا اندیشہ پورا ہوا۔

• ارجون کو "نقوش" کی سو یں اشاعت "آپ بیتی نمبر" کی تقریب میں جب میں اپنا مضمون پڑھ رہا تھا تو اچانک میری نظر اٹھی تو اس کے دیکھا کہ سامعین کی دوسری صف میں مولانا بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں جب اپنا مضمون ختم کرکے واپس آیا تو میری جگہ پر کوئی مہمان بیٹھے ہوئے تھے، اس لیے مجھے تقریباً سب سے پیچھے جاکر بیٹھنا پڑا۔ وہاں سے پھر میں نے مولانا کو دیکھا۔ بالکل ویسے ہی تھے جیسے تیس ۳۰ سال پہلے تھے، صرف مونچھیں کھچڑی ہوگئی تھیں۔ میں نے سوچا تھا کہ جلسہ ختم ہوگا تو میں مولانا سے لپٹ جاؤں گا۔ مجھے ان سے ملے دس سال ہو گئے تھے، مگر جب جلسہ ختم ہوا تو اس جلسے کے منتظم عشرت رحمانی صاحب نے مجھے لے جاکر وزیر تعلیم مغربی پاکستان کے پاس بٹھا دیا۔ اور جب میں وہاں سے اٹھا تو مولانا جا چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ کل دفتر جاکر مولانا سے مل لوں گا مگر اگلے دن میں کچھ اور کاموں میں پھنس گیا اور شام کی گاڑی سے کراچی واپس روانہ ہو گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہی مولانا کا آخری دیدار ہے۔ اس کے چوتھے دن ریڈیو نے یہ منحوس خبر سنائی کہ مولانا کا انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر [illegible] سال کی تھی۔

"حادثہ" (صفحہ ۴۰ کا بقیہ مضمون)

سپاہی کھمبے کے جلتے ہوئے بلب کی زرد روشنی میں جھکے ہوئے واردات کی رپورٹ لکھ رہے تھے۔

"فرقان صاحب — آپ یہ لکھ لیجئے کہ تراب علی کی موت ایک ناگہانی حادثہ ہے جو غالباً لکڑی کے تختے سے پیر پھسل جانے کی وجہ سے واقع ہوئی ہے" — موٹا تازہ امداد ماتھے پر تیوریاں چڑھائے بڑی بے نیازی سے کہہ رہا تھا۔

فرقان علی نے اپنی مونچھوں پر ذرا سا تاؤ دیا۔ اندھیرے میں کناری جنکشن پر جلتی ہوئی روشنیوں کے ہجوم کی طرف دیکھا پھر اپنی پگڑی درست کرکے دو تین لائنیں ایک کاغذ پر گھسیٹ کر بولا — "مگر امداد صاحب — پل کا جنگلا تو بڑی مضبوط لکڑی کا بنا ہوا ہے — یہاں پیر پھسلنے کا تو امکان ہی نہیں ہے" —

"آپ وقتی رپورٹ لکھ لیجئے — تفتیش بعد میں ہوتی رہے گی" —

فرقان علی نے رپورٹ لکھنے کو ہاتھ چلایا تو بیک وقت اُن دونوں کی نظر گھوڑے پر پڑی جو گریبان چاک — سر کے بال اُلجھائے — آنکھیں لال کئے کھو تختے کے قریب ساکت کھڑا تھا۔

فضا میں ہیڈ کانسٹیبل کی سیٹی سناٹے کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔

"پکڑ لو اسے — گرفتار کر لو — جانے نہ پائے" —

سپاہی کرم داد خاں بے اختیار اُچھلا اور لپک کر اُسے گریبان سے پکڑ لایا —

"تراب علی کی موت کا سبب یہی ہے" — امداد علی نے اپنے وزنی ہاتھ سے اُس کے سر پر ایک دھول جماتے ہوئے کہا — فرقان صاحب — لکھئے — جلدی رپورٹ لکھئے — اس بدمعاش کی ضمانت پہلے بھی کئی بار ہو چکی ہے — سارا فساد اسی کا ہے" —

چند لمحوں کے بعد لمبی لمبی ٹانگوں والا گھوڑا یوں سر جھکائے پولیس کی حراست میں لڑکھڑاتے قدموں سے حوالات کی طرف جا رہا تھا جیسے وہ سچ مچ تراب علی کا قاتل تھا۔

ثریا مظفر

ڈاکٹر صفدر۔ شخصیت اور فن

ڈاکٹر صفدر حسین کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں ان کا شمار محکمہ تعلیم کے سربراہوں میں ہے۔ ان کی شخصیت سے ہر شخص بالواسطہ یا بلاواسطہ واقف ہے۔ ان کے عہدے اور ان کی تعلیمی سرگرمیوں سے قطع نظر اگر ہم ان کی ذاتِ گرامی کا جائزہ لیں تو یہ اندازہ ہو سکے گا کہ وہ کتنے گوناگوں اوصاف کے حامل ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نہایت وجیہہ، باوقار اور بارعب انسان ہیں ان کی آواز میں شیرینی، لوچ اور گرج کا ایک عجیب امتزاج ہے۔ جو سننے والوں کو بے ساختہ مرعوب کر دیتا ہے۔ اسی طرح ان کی شگفتہ مزاجی اور خوش خلقی بھی ہر ملنے والے کو پہلی ہی ملاقات میں اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔ جیسے خوش دل اور خوش باش انسان ہیں۔ ہر ایک سے خلوص اور کھلے دل سے ملتے ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ہر جگہ اپنے پرستار پیدا کر لیتے ہیں ہر شخص ان کو اپنا ہمدرد اور مخلص سمجھتا ہے۔ صاف گوئی ان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ گفتگو بہت دلکش اور شگفتہ انداز میں کرتے ہیں ان کی بات چیت اور مزاج ہر چیز میں ادبی رنگ نمایاں رہتا ہے۔

پنجاب کی سرزمین پر ایک عرصہ رہنے کے بعد جب وہ کراچی آئے تو کہنے کو کراچی ان کے لئے اجنبی اور وہ کراچی کے لئے اجنبی تھے مگر بہت جلد یہ اجنبیت دور ہو گئی اور ہر وقت اپنے معتقدین کے درمیان گھرے نظر آتے ہیں۔ ابتدا میں پنجاب کی حسین سرزمین کے چھوٹنے کا بڑا قلق تھا اور بڑے پُر درد انداز میں اس کا تذکرہ کیا کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ اعتدال پر آ ہی گئے۔

ڈاکٹر صاحب ادب پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں آپ شاعر بھی ہیں، نثر نگار بھی محقق بھی ہیں اور نقاد بھی۔ لیکن بطور شاعر آپ حال ہی کی دریافت ہیں۔ میرا تعلق بھی چونکہ تعلیم و تعلّم سے ہے اس لئے بعض ادبی اور سماجی محفلوں میں مجھے بھی ڈاکٹر صاحب سے ملاقات اور گفتگو کا شرف حاصل رہا ہے۔ میں نے ان میں ہمیشہ اپنوں کا سا خلوص اور یگانگت محسوس کی۔ بڑے شستہ مذاق کے سدا بہار آدمی ہیں۔

طالب علمی کے دور ہی سے طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل تھی اس دور میں متعدد غزلیں، نظمیں اور بعض اشعار جو وقتی تاثرات کے حامل تھے لکھے اور رکھتے رہے۔ اس طرح مشقِ سخن جاری رہی۔ ان کے کلام کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ صفدر صاحب اپنی تحریر اور تقریر میں مختلف نہیں ہیں۔ جو شگفتگی اور بے ساختگی ان کی گفتگو کا خاصہ ہے وہی ان کی تحریر کا انداز بھی ہے۔

حال ہی میں ان کے کلام کے دو مجموعے "چراغِ دیرو حرم" اور "رقصِ طاؤس" شائع ہوئے ہیں۔ اوّل الذکر غزلیات اور کچھ متفرق اشعار کا مجموعہ ہے۔ جس کی بیشتر تخلیقات اگرچہ کہ طالب علمی کے دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن ان غزلیات کو پڑھ کر ان کی ذہانت اور تخلیقِ شعر کی خداداد صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے اور اس طرف گمان بھی نہیں جاتا کہ یہ ان کی نو مشقی اور ناپختگی کے زمانے کا کلام ہے۔ ایسے ہی فطری شاعروں کی تخلیق تو ہی درحاصل ادب کا لازوال سرمایہ ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی ان غزلوں کا ہر شعر گویا اپنی نوع کا ایک نادر اور تازہ پھول ہے۔ انہیں متنوع اور منتخب پھولوں سے یہ کتاب

بڑے اچھوتے انداز میں سجائی گئی ہے ذیل میں میری پسند کے چند اشعار درج ہیں جن کو پڑھ کر صاحبانِ ذوق اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

چھوڑے جاتا ہوں وہ کانٹے جو کم آزار سے ہیں　　آ ہی جائے گا کوئی آبلہ پا میرے بعد

دلفریب آج بھی ہے آپ کا نقشِ کفِ پا　　نہ ہوا سجدۂ بے لوث ادا میرے بعد

سلجھاؤں لاؤ شیخ و برہمن کی کش مکش　　رشتے ملاؤں ان کے تمہاری نگاہ سے

نقشے بچے ہوئے تھے جو تخلیق حشر سے　　ترتیب پا کے پیکر جاناں میں آگئے

مہر و مہ و انجم تو فقط گردِ سفر ہیں　　تاریخ بنائیں گے مرے نقش قدم اور

پہلے تو کائنات سمٹے تو اک نگاہ　　یہ نازِ حسن ایک کنایہ کہیں جسے

بوئے گل، نالۂ بلبل، نفسِ سردِ نسیم　　کون اس باغ میں آزاد ہے مجبور نہیں

یہ اور اسی قسم کے متعدد اشعار ہیں جو صفدر صاحب کی ندرتِ خیال اور طرزِ فکر کے انوکھے پن پر دلالت کرتے ہیں۔

• رقصِ طاؤس" چودہ رومانی نظموں کا مجموعہ ہے۔ ان نظموں میں صفدر صاحب کا فن اپنے کمال پر نظر آتا ہے۔ ان میں نظرت کی نقاشی اور تاثرات کی مکمل صورت گری پائی جاتی ہے۔ اچھی نظم کی خوبی یہی ہونی چاہئے کہ پڑھتے وقت یہ اندازہ ہو کہ جیسے تہہ بہ تہہ کوئی لپٹی ہوئی چیز کھلتی چلی جا رہی ہے۔ خیال کا تدریجی ارتقا نظم کی شان ہوتا ہے۔ پوری نظم میں وحدتِ تاثر کا پایا جانا نہایت ضروری ہے۔ اس کی ابتدا، وسط اور نقطۂ عروج اور پھر مجموعی تاثر کا ہونا لازمی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس مجموعے کی ہر نظم ان خصوصیات کی حامل ہے اور پڑھنے والے کے دل پر ایک مکمل تاثر چھوڑتی ہے۔ ان کے اشعار میں لطفِ بیان بھی ہے اور مضمون آفرینی بھی۔ نظم کا ہر جزو کل سے اس طرح مربوط ہے کہ کہیں جھول یا بے ترتیبی کا احساس نہیں ہوتا۔ صفدر صاحب کی شاعری زندگی اور ماحول سے علیحدہ نہیں ہے انہوں نے زندگی اور فن میں توازن برقرار رکھا ہے۔ اگرچہ واردات اور واقعات کا تسلسل ان کی نظموں کا نمایاں حسن ہے لیکن مجھے سب سے اہم خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ وہ عام انداز سے ہٹ کر شاعر کے انفرادی احساس، انفرادی تجربے اور انفرادی طرزِ بیان میں لکھی گئی ہیں۔

اردو ادب کی نظمیں ابتدا میں ایک ڈھانچہ بنا کر لکھی جاتی تھیں ان میں قافیہ کی پابندی شاعر کی طبع آزمائی کے میدان کو تنگ اور اس کے دائرہ عمل کو محدود کر دیتی تھی۔ شاعر کے دل میں آئے ہوئے دلکش خیالات اور جذبات محض اس لئے دفن ہو جاتے تھے کہ شعرا قافیہ اور ردیف کی پابندیوں کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ اور یہ پابندی اردو ادب کے ارتقا میں خاصی سدِ راہ تھی۔ عبدالحلیم شرر نے پہلی بار معرّیٰ شاعری کا تجربہ کیا اور پھر دورِ حاضر میں چند مخصوص شعرا نے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اس کو پروان چڑھانے کی کوشش کی۔ لیکن معرّیٰ شاعری

میں قافیے کو نظر انداز کرنے کے بعد موسیقی، تغزل، تسلسل، فکری تنظیم اور روانی کا قائم رکھنا ہر شاعر کے بس کا کام نہ تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی یہ نظمیں، اردو ادب میں معرّا شاعری کا بڑا اہم اور گراں قدر تجربہ ہیں۔ اس طرح کے رومان اور قلبی واردات کا منظوم بیان ہمیں مختلف شعرا کے ہاں ان کے اپنے اپنے انداز میں مل جاتا ہے۔ لیکن صفدر صاحب نے ان میں نفسیاتی نظر کی بے ساختگی شامل کر کے نئے رنگ اور نئے مزاج کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس لئے ان نظموں میں ایک اچھوتا پن پیدا ہو گیا ہے۔ یہ نظمیں بلاشبہ ذہن کی پختگی، لہجہ کی تازگی، صدق دلفریبی اور فنی تکمیل کا بہترین نمونہ ہیں۔ صفدر صاحب کے ہاں فکری تنظیم کے ساتھ ساتھ تغزل کی چاشنی بھی ہے۔ ان نظموں میں ہمیں کہیں بھی شاعر جذبات کی رو میں بہتا اور بھٹکتا نظر نہیں آتا۔ وہ اپنی واردات قلبی کا جذباتی اور فنی جائزہ لیتا ہے۔ اور پھر قلم اٹھا کر تسلسل اور تدریجی ارتقا کا خیال رکھتے ہوئے واردات کا سماں سا باندھتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً

اس کی پہلی ہی جھلک پر مرا ماتھا ٹھنکا — اور اس جرأت معصوم پہ حیرت سے ہوئی
آنچ اُدھر شعلہ رخسار کی کچھ تیز ہوئی — اور یاں دھڑ دل کی بجھی شمع میں پیدا ہوئی لو
نگہِ ناز میں ایک خجلتِ اقرار اُدھر — اس طرف عقل میں اور عشق میں بحث و تکرار
آخر اس طرح دبے پاؤں سراپا اس کا — دل کے تاریک نہاں خانوں میں آیا ناگاہ
دفعتاً ذہن میں روشن ہوئے فانوس خیال — گوشے گوشے میں تمنا کے دئیے جل اٹھے
دو نگاہوں میں کچھ اس طرح ملاقات ہوئی — جس سے کھل کھل گئی دونوں کے دلوں کی چوری
کچھ تخاطب کے طریقوں میں فرق آنے لگا — کچھ تبسم میں بھی پیدا ہوا عنوان پیام
میرا اقدام تھا خود حفظ مراتب کے خلاف — مجھ پہ لازم تھا کہ میں ضبط کی حد سے نہ بڑھوں
میں نے اس طرح سے کی شوق کی اپنے تادیب — کہ مری چوٹ کا چہرے سے نہ ظاہر ہوا اثر
آئینہ ٹوٹ کے اپنا ہی نہ غماز بنے — غم کی تفسیر نہ کر دے کہیں ماتھے کی شکن

ان اشعار کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں مربوط فکر اور مسلسل پرواز دونوں کی امتزاجی قوت کارفرما ہے۔ یہ صفت ان کی تمام نظموں میں ملتی ہے۔ اور مجموعی طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا ہر شعر زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے مربوط ہے۔ اچھے شعر کی خوبی یہی ہوتی ہے کہ اسے سن کر سامع پر نشے کی سی کیفیت طاری ہو جائے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ شعر شاعر کے دل کی گہرائیوں میں نکلا ہو۔ اگر قائل کا دل جذبات سے بھرپور ہو تو سامع اپنا دامن نہیں بچا سکتا۔ اس پر اسی نوع کا تاثر ضرور ہوگا۔ صفدر صاحب کی یہ نظمیں واردات عشق کا ایسا ہی مسلسل اور نفسیاتی نقشہ پیش کرتی ہیں۔ ان کو پڑھ کر واردات کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ ان نظموں میں جذبات اور شعور دونوں میں ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ ان میں فکر کی پروازیں بھی ہیں۔ لیکن وہ معنی اور حقائق سے بیگانہ نہیں کرتیں۔ شاعر کے تخیل نے خواہ کتنی ہی بلندی پر پرواز کیوں نہ کی ہو لیکن موضوع ہر حال میں پیش نظر رکھا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے اس مجموعہ میں جو نادر چیز مجھے محسوس ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ آپ انسانی ذہن اور دل کی فطری کیفیات اور احساسات کو بڑے عمدہ پیرائے میں بیان کرنے پر قادر ہیں۔ نفسیاتی اور ذہنی کیفیات جو اپنی نزاکت کے باعث اشعار کے جامے میں مشکل ہی سے آسکتی ہیں صفدر صاحب انہیں بڑے برجستہ اور نیچرل انداز میں بیان کر جاتے ہیں۔ جیسے

صرف تخیل میں جلتے رہے یادوں کے چراغ

بن رہا تھا کہ امیدوں کا محل بیٹھ گیا

کہ جیسے زیست کا بھاری جمود ٹوٹ گیا

تصورات کا بت خانہ جگمگا اٹھا

دفعتاً ذہن میں روشن ہوئے فانوس خیال
گوشے گوشے میں تمنا کے دیئے جل اٹھے

دو جیتے ہیں بھی انداز ہار جانے کے

کہ پائے وقت میں باقی نہیں رہی رفتار

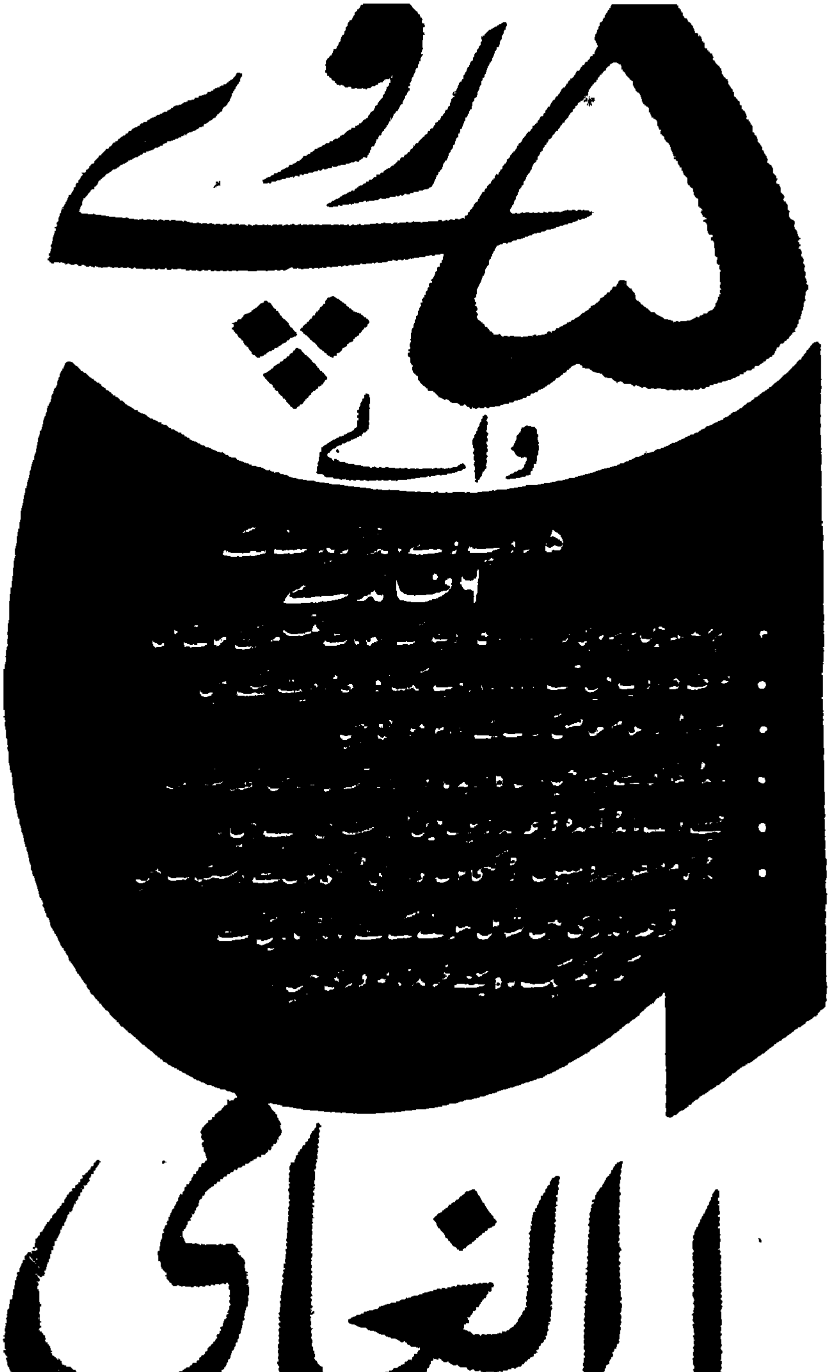
یہ اور اس طرح کے متعدد مصرعے اور اشعار اس مجموعے میں موجود ہیں جو ندرتِ خیال، نفسیاتی تجوئے اور حسن تشکیل کی صلاحیتوں کے کمال پر دلالت کرتے ہیں۔ ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ الفاظ کے برمحل انتخاب نے "رقصِ طاؤس" کی نظموں اور "چراغِ دیر و حرم" کی غزلوں کو خاص تازگی اور رفتار بخش دیا ہے۔ الفاظ کیا ہیں بس موتی ہیں جن کو فنکار نے کچھ اس انداز سے شعر کے دھاگے میں پرو دیا ہے کہ یہ لڑیاں سلکِ گہر معلوم ہوتی ہیں۔ تمام نظموں سے ڈاکٹر صاحب کے سلیقۂ انتخاب، غنائی احساس اور قدرتِ زبان کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہمارے اس فیصلے کی تائید اور حمایت میں کوہری کے ان اشعار پر غور فرمایئے۔

روپہلی دھوپ، گلابی شفق، سنہری چھاؤں	نشاط ریز، جنوں خیز، ولولہ انگیز
یہ نور و نکہت و خنکی، یہ تازہ کاری و نم	یہ انجمادِ ثوابت، یہ لرزشِ سیار
بہشتِ اہلِ محبت، ریاضِ حسن زمین	ترے جمالِ دل افروز کا جواب نہیں

اگرچہ کہ شاعری کو مبالغہ آرائی سے علیحدہ تصور نہیں کیا جا سکتا لیکن ڈاکٹر محمد صفدر کی شاعری میں حق و صداقت کا عنصر زیادہ اور شاعرانہ مبالغے کے اجزاء بہت کم نظر آتے ہیں چنانچہ مندرجہ بالا اشعار میں جو مبالغے کی کیفیت ہے وہ شاعر کی شدتِ احساس کے پیشِ نظر ایک حقیقت معلوم ہوتی ہے اس لئے ان اشعار کو ہم مبالغہ آرائی سے پاک سمجھیں گے۔
اس مختصر مقالے میں ڈاکٹر صفدر کی تخلیقات کی تمام خوبیوں کا احاطہ ہمارے پیشِ نظر نہ تھا۔ اس لئے محض ایک طائرانہ نظر ڈال کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ صفدر صاحب پختہ شاعرانہ صلاحیتوں اور چونکا دینے والی نفسیاتی قوتوں کے شاعر ہیں۔ تعجب اس بات پر آتا ہے کہ ایسی توانائیوں والا شاعر اب تک خاموش یا روپوش کیونکر رہا۔ بہرحال اب وہ منظرِ عام پر آئے ہیں اور بڑے عزم سے آئے ہیں ؎

زمینوں کی خیر، آسمانوں کی خیر

خدا کرے کہ ان کا ماحول ان کی تخلیقات کے لئے اسی طرح سازگار رہے۔



روپے
والے
۶ فائدے
انعامی
بانڈ

نعیم اقبال

حجِ اکبر

رخصتی کے وقت رمیش سہگل نے ان کے پیر چھوئے، مدھر تیر کی طرح ان کے سینے سے پیوست ہوگئی اور خلوص اور محبت کے آنسوؤں سے ان کا سینہ تر ہونے لگا تو حمید الدین احمد کی آنکھوں کا آنسوؤں کا بند ٹوٹ پڑا، ان کی ڈاڑھی تر ہوگئی، ان کے گلے میں کانٹے پڑ گئے، بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولے: "بیٹی تو بھاگیوان ہے تجھے ایک اچھا پتی ملا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تو اپنی خوش اخلاقی، سیوا اور خلوص سے اپنے میکے کا نام روشن کرے گی۔" مدھر کی ہچکیاں بند ہوگئی تھیں۔ "یوں رویا نہیں کرتے، چل کار میں بیٹھ جا بیٹی، وقت بیتا جا رہا ہے۔" نہ جانے وہ کیسے یہ سب کچھ کہہ سکے، خود ان کا گلا رندھ گیا تھا، جب کار جانے لگی تو وہ نڈھال ہو کر اپنے آپ کو آرام کرسی پر گرا دیا اور وہ ماضی کی وادی میں یکایک پہنچ گئے...

"کیا بات ہے بیگم، کچھ اداس سی لگتی ہو؟"

"نہیں تو۔"

"نہیں تو!" حمید الدین احمد مسکرائے۔ "کیا بیس سال کے یکساتھ رہنے کے باوجود تم سمجھتی ہو کہ ہم نے اپنے ساتھی کو پہچان نہیں پایا"

"کوئی خاص بات تو نہیں۔"

"پھر بھی کچھ تو ہے نا۔"

"طرح طرح کی چہ می گوئیاں ہو رہی ہیں بے پر کی اڑانے میں ہمارے پڑوسیوں کا جواب نہیں۔"

"وجہ؟"

"ہم نے حج جانے کا پروگرام جو ملتوی کر دیا۔"

"کیا کہتے ہیں یہ لوگ، ہم بھی تو سنیں۔"

"کہتے ہیں، ہم تو حمید الدین احمد کو کفایت شعار سمجھتے تھے۔ مگر اللہ رے کنجوسی کہ خدا کی راہ میں اور اپنی نجات کے لئے بھی خرچ کرنے میں مخلات برت رہے ہیں۔"

"بس اتنی سی بات کے لئے اداس ہوگئیں۔"

"اسی ایک بات پر منحصر نہیں لاکھوں باتیں ہو رہی ہیں۔ ہمارے پیچھے جس کا میں ذکر نہیں کر سکتی۔"

"جتنے منہ اتنی باتیں ہوتی ہی ہیں۔"

"کیوں نہ ہم حقیقت سے آگاہ کر دیں۔"

"کس کس کو بتاتی پھرو گی، کس کس کو اپنا مدعا سمجھاتے رہیں گے ہم، پھر ایسے کتنے لوگ ہیں جو تمہارے خیالات سے اتفاق کر لیں گے۔"

"پھر بھی...."

"اللہ ہمارے دلوں کو بہتر جاننے والا ہے۔"

جب حمید الدین احمد نے حج پر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تو یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ پڑوسی کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ان کے بیٹھک میں آدھمکتے اور حقیقت جاننے کی کوشش کرتے کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔ جب راز افشاں نہ ہوتا تو وہ تلملا اٹھتے اور طرح طرح کے افواہوں کا جنم ہوتا۔ عورتیں زنان خانے میں بیگم کے پاس آتیں انہیں جب راز جاننے میں مایوسی ہوتی تو وہ غصہ سے دوہری ہو جاتیں، طرح طرح کی باتیں تراشی جاتیں۔

اقبال سنگھ ہی واحد شخص تھے جنہیں اس بات کا علم تھا کہ حمید الدین احمد نے اپنا مبارک سفر کیوں ملتوی کر دیا۔ وہ جانتے تھے کہ وہ لوگوں کے طعن و طنز کا نشانہ کیوں بنے ہوئے تھے۔ حمید الدین احمد ان کی نگاہوں میں اس لئے اور اونچے ہو گئے تھے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ اس بات کا ڈھنڈورا پیٹتے پھریں کہ کس چیز نے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔

اقبال سنگھ اور حمید الدین احمد کے گھر ایک ہی احاطے میں واقع تھے، دونوں کا لگ بھگ سولہ سال کا ساتھ تھا، حمید الدین احمد صاحب حیثیت تھے اور ان کی اکلوتی لڑکی فسادات کا نشانہ بن گئی تھی۔ اقبال سنگھ لاہور سے ہندوستان ہجرت کر آئے تھے۔ وہ خود کسی زمانے میں موتیوں میں تلتے تھے۔ مگر ایک بڑی جائداد پاکستان میں چھوڑ آئے تھے اور جو کچھ ہندوستان لے آئے وہ جھوٹے وقار کی نذر ہو گیا تھا اب تو صرف ایک کوٹھی باقی رہ گئی تھی اور کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے بغیر گذر ہو ہی جاتی تھی۔ ان کی سب سے بڑی دولت تو ان کی اکلوتی لڑکی مدھر تھی جس کی ہر ادا مدھر تھی، وہ بہت ہی شوخ نہیں تھی۔ مدھر کی منگنی شہر کے مشہور سرجن رمیش سہگل سے طے پائی تھی، اقبال سنگھ کا جب کینسر کا آپریشن ہوا تھا تو مدھر بھی ساتھ تھی، رمیش سہگل جن کی نگاہیں اپنے ساتھی کی تلاش میں تھیں فوراً مدھر کو چن لیا، جب اقبال سنگھ صحت پا کر گھر جاتے ہوئے اپنی فیس دینی چاہی تو رمیش سہگل نے یہ کہہ کر بات ٹال دی۔ "آپ میرے بزرگ ہیں۔ فیس کی بات رہنے دیجئے پھر دیکھا جائے گا۔ مجھے تو آپ کا آشیرواد چاہئے۔"
اقبال سنگھ اس وقت کچھ نہیں سمجھے، جب حمید الدین احمد نے یہ بات سنی تو وہ مسکرائے۔

"وہ تو تم سے تمہاری انمول چیز فیس کے بدلے لینا چاہتے ہیں۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"وہ بٹیا کو اپنانا چاہتے ہیں۔"

"کہاں وہ شہر کا مشہور سرجن کہاں میں ایک معمولی حیثیت کا انسان، بھلا وہ کیوں اپنا رشتہ جوڑنے چلے۔"

"مگر ہمارے پاس مدھر جیسا نایاب موتی جو ہے۔"

اقبال سنگھ مسکرا کر رہ گئے۔ انہیں حمید الدین احمد کی قیاس آرائی پر یقین نہیں آیا۔ مگر ایک ماہ بعد جب رمیش سہگل کا پیام آیا اور خود ان کے والد چلے آئے تو اقبال سنگھ سے کچھ بن نہیں پڑ رہا تھا۔ حمید الدین احمد کو بلوا بھیجا۔

"آپ کو جو کچھ طے کرنا ہے ان سے طے کیجئے۔" اقبال سنگھ نے رمیش سہگل کے والد کو مخاطب کیا۔

"میں آپ سے ایک بات صاف صاف بتا دوں۔" حمید الدین احمد نے پہل کی۔ "جہیز جوڑنے کی کوئی شرط نہیں ہونی چاہئے، آپ جو بھی کپڑے اور زیورات لے آئیں، کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ مگر آپ کی جانب سے بھی کوئی قسم کی پابندی نہ ہو۔" حمید الدین احمد جہاں دیدہ آدمی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ خود رمیش سہگل اپنے لئے کچھ نہ چاہیں گے۔ مگر ان کے والدین کو جوڑے جہیز کی بات چلائے بغیر چین کب آئے گا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جب لڑکی لڑکے کی آنکھوں میں بچ گئی ہو تو ہر شرط مان لی جائے گی۔

اقبال سنگھ ایک کشمکش میں پڑ گئے تھے۔ بعض وقت سوچتے کہ شادی کا بغیر کسی دھوم دھام کے معمولی طور پر کر دی جائے مگر اس کے لئے ان کا دل نہیں مانتا تھا، وہ سوچنے لگے کہ شہر کے مشہور سرجن کی شادی اس کے شایان شان ہونی چاہئے۔ اگر جوڑے کی بات ہوتی تو کیا دیتے

اچھے رشتے کو ٹھکرا دیتے، وہ ہر حال میں اور ہر شرط پہلے کر ہی دیتے۔ مگر جب شادی بغیر کسی شرط کے منظور ہوئی ہے تو کیوں نہ جوڑے جہیز میں بچا ہوا پیسہ شادی میں لگا کر دھوم دھام کی ہی شادی کیوں نہ کر دی جائے، پھر ان کی اکلوتی بیٹی ہے پھر اس کے اپنے ارمان بھی ہوں گے، جب انہوں نے اپنے دوست سے اپنا خیال ظاہر کیا تو پہلے تو حمید الدین احمد نے سمجھایا کہ یہ کہاں کی عقلمندی ہے، شادی معمولی قسم سے کر دو اور جو کچھ جائداد بچ رہے گی وہ بیٹی ہی کے کام آئے گی۔ مگر جب اقبال سنگھ اداس ہو گئے تو حمید الدین احمد نے زیادہ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ ایک بات جو اقبال سنگھ نے اپنے دوست سے چھپائی۔ وہ صرف یہ تھی کہ انہوں نے اپنا گھر رہن رکھ دیا تھا۔

رقعے چھپ گئے تھے، شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں، کپڑوں اور زیورات کی خرید کے لئے اقبال سنگھ کو اکیلے بنگلور جانا پڑا کیونکہ ایک تو حمید الدین احمد کے مزاج ٹھیک نہیں تھے اور پھر یہاں کے انتظام کے لئے بھی کوئی اور نہیں تھا۔ اقبال سنگھ چار دن کا پروگرام بنا کر بنگلور روانہ ہو گئے تھے۔ مگر انہیں دوسری صبح اپنے مکان میں پا کر حمید الدین احمد کا ماتھا ٹھنکا، وہ اقبال سنگھ کے گھر پہنچے تو دیکھا۔ وہاں ایک محشر بپا ہے۔ اقبال سنگھ کی کمر ڈھل گئی تھی، ان کی بیوی کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ مدھر کی آنکھوں سے دہشت اور بیچارگی جھلکتی تھی، حمید الدین احمد کو دیکھ کر اقبال سنگھ اٹھے اور لپٹ گئے۔

"کیا ہوا بھائی، کیا ہوا۔" حمید الدین احمد کسی انجانے خوف سے لرز رہے تھے۔

"میں لٹ گیا بھائی" اقبال سنگھ کے آنسو ان کے کرتے کو تر کرنے لگے۔

"کچھ بتاؤ بھی، ایسی کونسی آفت آ پڑی، کیا رمیش سہگل نے کچھ....."

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" اقبال سنگھ کی بیوی بولیں۔

"اگر وہ بات نہیں تو دوسری ایسی کون سی اتنی دکھ بھری بات ہو سکتی ہے کہ تم لوگوں کو یوں سکتے کے عالم میں پہنچا دے"

"وہ سوٹ کیس چوری ہو گیا۔ جس میں سارا روپیہ رکھا ہوا تھا۔" اقبال سنگھ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولے۔ "اب کیا ہوگا، شادی تو صرف ایک ماہ رہ گئی ہے، پیسوں کا انتظام کیسے ہوگا۔"

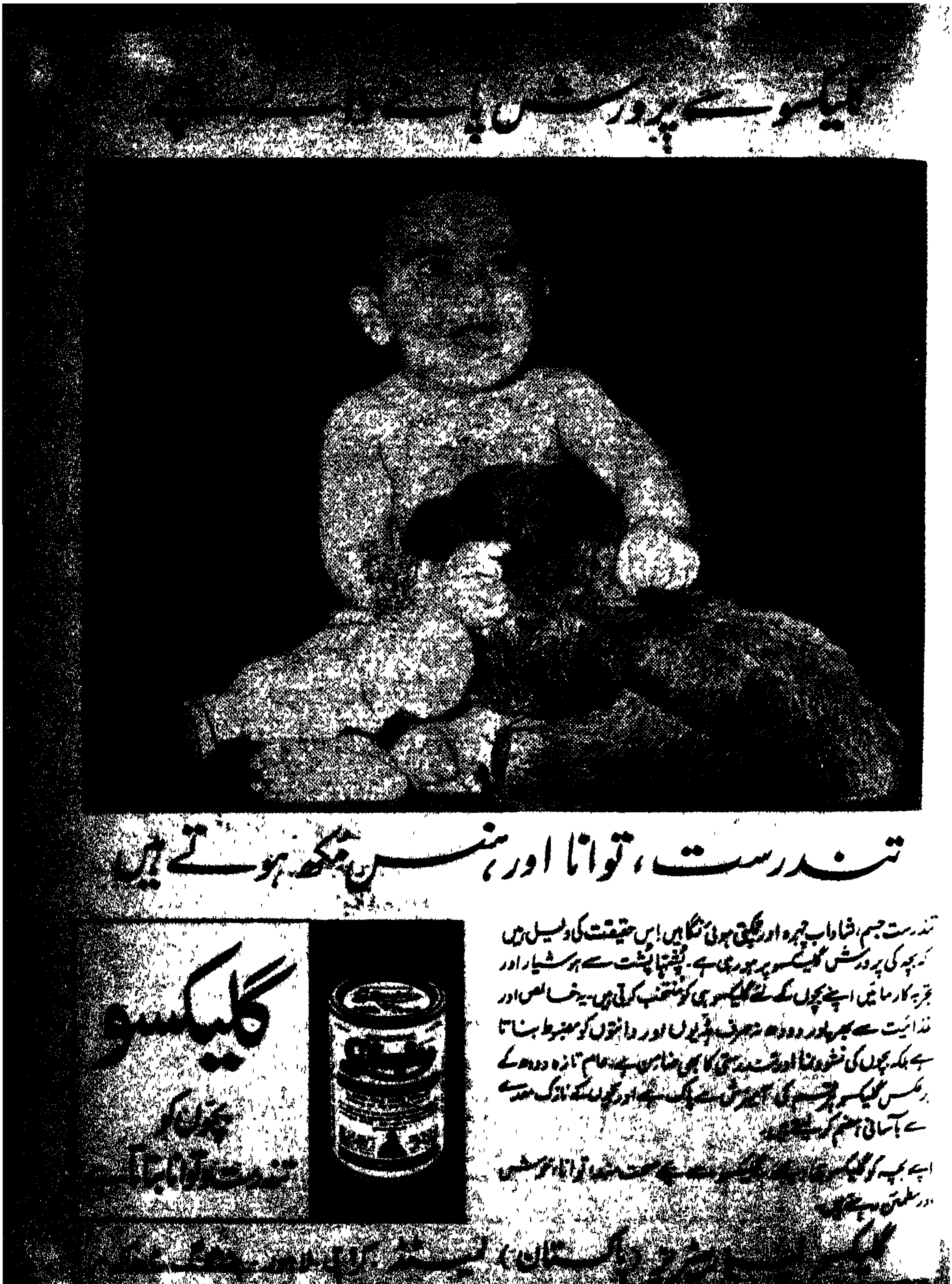
"اتنی سی بات کے لئے تم لوگ اس قدر پریشان ہو گئے۔" حمید الدین احمد نے سکھ کا سانس لیا اور پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "بھلا میں کس مرض کی دوا ہوں، تمہارے بھائی کے ہوتے ہوئے تمہیں فکر کرنا نہیں چاہئے۔ مدھر میری بھی تو بیٹی ہے۔"

"مگر آپ کا سفر؟"

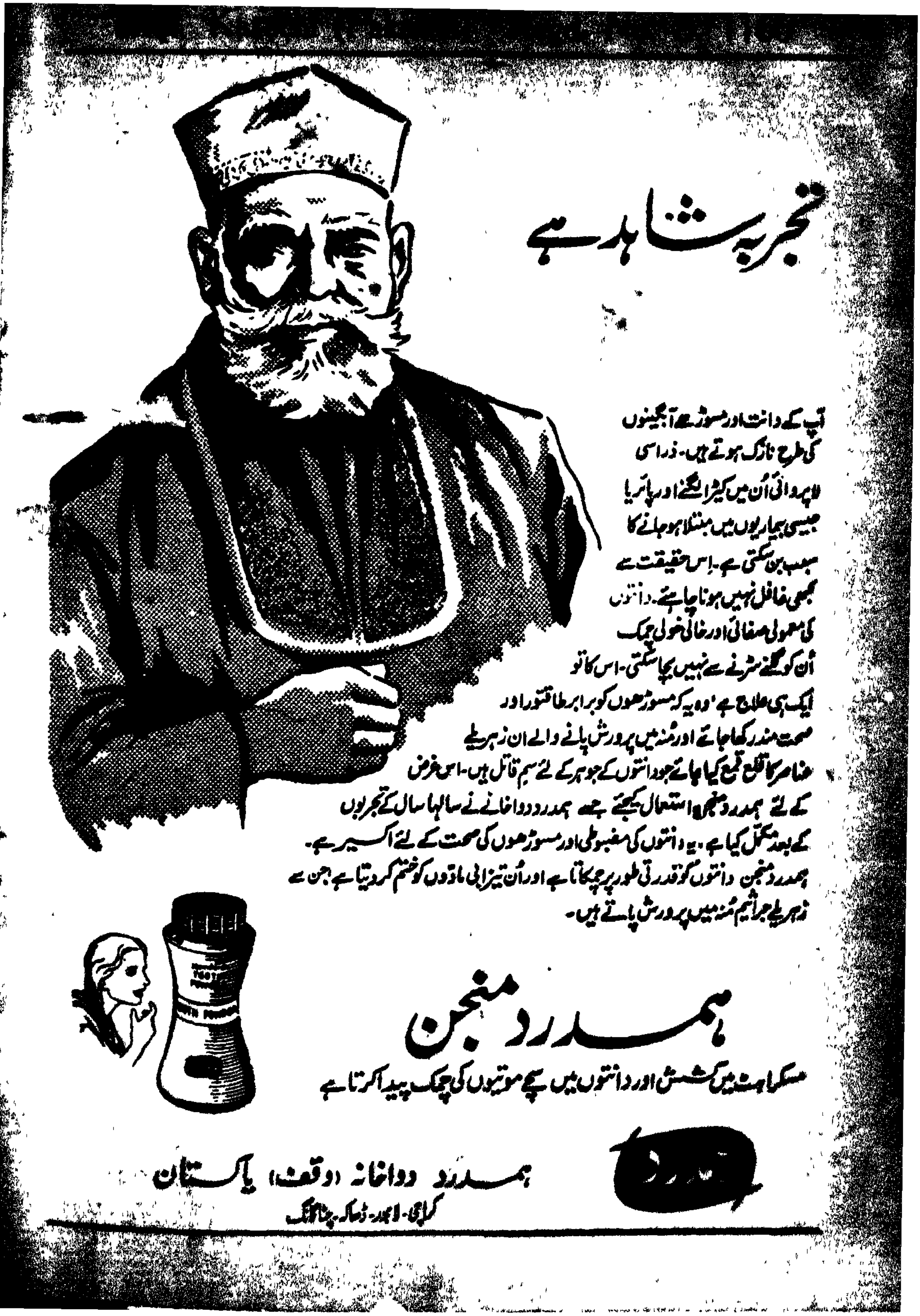
"ادھر آؤ بیٹی۔" حمید الدین احمد نے مدھر کو قریب بلوایا اور سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے "مجھے تو صرف حج نصیب ہو رہا تھا مگر اب تو مجھے حج اکبر مل رہا ہے۔"

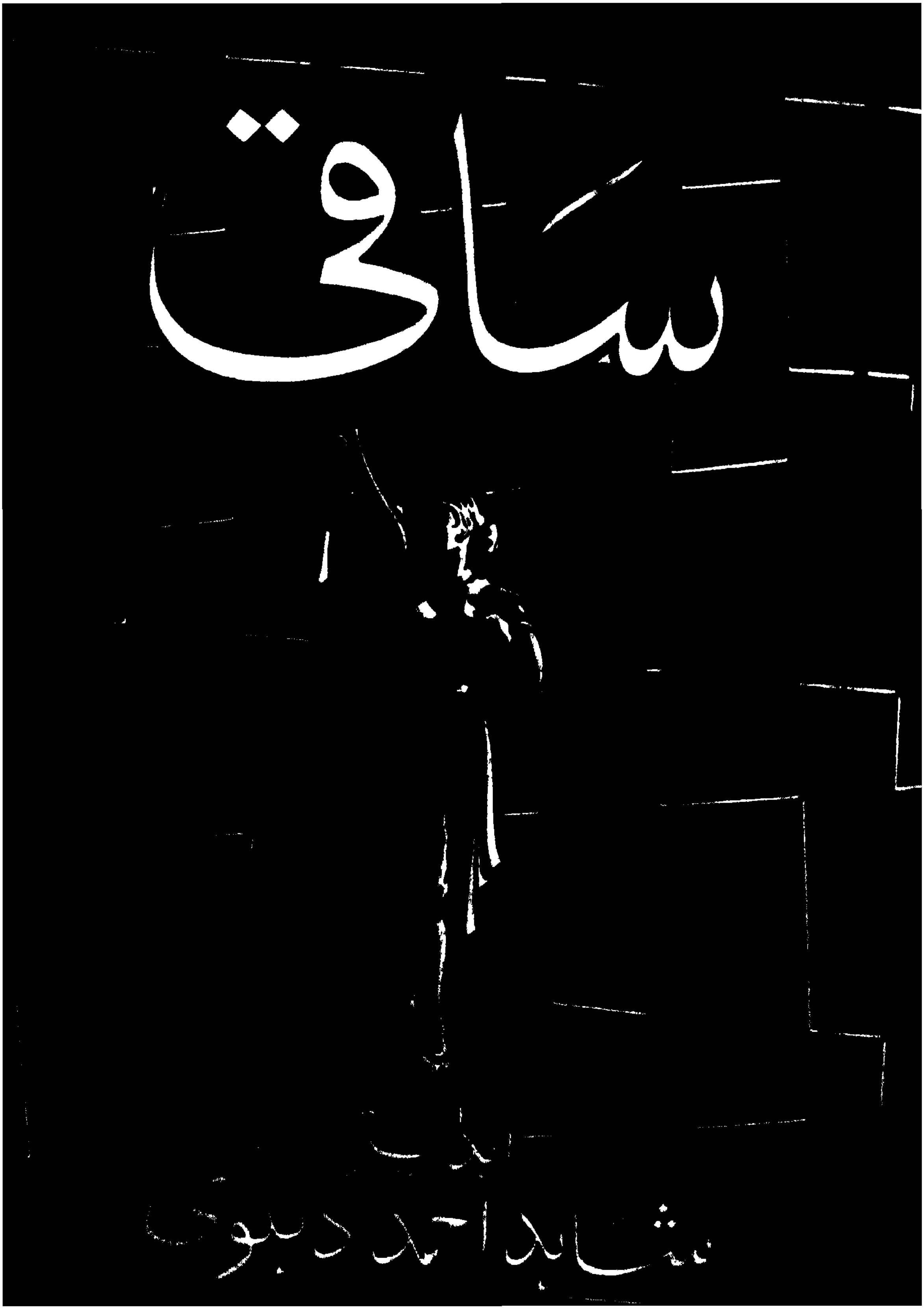
ظریف دہلوی بھی چل بسے

قاضی عباس حسین ظریف دہلوی اردو کے ان گنتی کے شعرا میں سے تھے۔ جو سنجیدہ مزاحیہ شعر گوئی کے دلدادہ تھے۔ نام و نمود سے ہمیشہ بچتے رہے۔ مشاعروں میں خود نہیں جاتے تھے، لے جائے جاتے تھے۔ ۸ جنوری کو ان کا اچانک انتقال ہو گیا۔ عمر ۸۱ سال کی تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔



گلیکسو سے پرورش پانے والے بچے
تندرست، توانا اور ہنس مکھ ہوتے ہیں
تندرست جسم، شاداب چہرہ اور چمکتی ہوئی نگاہیں اس حقیقت کی دلیل ہیں
کہ بچہ کی پرورش گلیکسو پر ہو رہی ہے۔ پشتہا پشت سے ہوشیار اور
تجربہ کار مائیں اپنے بچوں کے لئے گلیکسو ہی کو منتخب کرتی ہیں۔ یہ خالص اور
غذائیت سے بھرپور دودھ نہ صرف ہڈیوں اور دانتوں کو مضبوط بناتا
ہے بلکہ بچوں کی نشوونما اور تندرستی کا بھی ضامن ہے۔ عام تازہ دودھ کے
سے بآسانی ہضم
گلیکسو
بچوں کو


تجربہ شاہد ہے
آپ کے دانت اور مسوڑھے آبگینوں کی طرح نازک ہوتے ہیں۔ ذرا سی لاپروائی اُن میں کیڑا لگنے اور پائیریا جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو جانے کا سبب بن سکتی ہے۔ اِس حقیقت سے کبھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ دانتوں کی معمولی صفائی اور خالی خولی چمک اُن کو گلنے سڑنے سے نہیں بچا سکتی۔ اس کا تو ایک ہی علاج ہے، وہ یہ کہ مسوڑھوں کو برابر طاقتور اور صحت مند رکھا جائے اور مُنہ میں پرورش پانے والے ان زہریلے عناصر کا قلع قمع کیا جائے جو دانتوں کے جوہر کے لئے سمِ قاتل ہیں۔ اس غرض کے لئے ہمدرد منجن استعمال کیجئے جسے ہمدرد دواخانے نے سالہا سال کے تجربوں کے بعد مکمل کیا ہے۔ یہ دانتوں کی مضبوطی اور مسوڑھوں کی صحت کے لئے اکسیر ہے۔ ہمدرد منجن دانتوں کو قدرتی طور پر چمکاتا ہے اور اُن تیزابی مادّوں کو ختم کر دیتا ہے جن سے زہریلے جراثیم مُنہ میں پرورش پاتے ہیں۔
ہمدرد منجن
مسکراہٹ میں کشش اور دانتوں میں سچے موتیوں کی چمک پیدا کرتا ہے
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی۔ لاہور۔ ڈھاکہ۔ چاٹگام


ساقی
شاہد احمد دہلوی



نفیس و لطیف
تبت
ٹالکم پاؤڈر
جسم کو تروتازہ رکھتے ہیں!
TIBET
TIBET
TIBET
ٹالکم پاؤڈر میں تبت کا جواب نہیں۔ اسکی نفیس خوشبو سے
بدن مہک جاتا ہے اور آپ دن بھر شاداب و شگفتہ نظر آتے ہیں۔
گرمیوں میں تروتازہ رہنے کے لئے اپنے پسندیدہ تبت ٹالکم پاؤڈر
کا استعمال اپنی عادت میں شامل کریجئے۔
تبت ٹالکم پاؤڈر
شادابی اور شگفتگی کے لئے
کوہ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ ۔ کراچی ۔ ڈھاکہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مدیر: شاہد احمد دہلوی

معاون: عاصمہ بیگم

(رکن انجمن ادبی رسائل پاکستان)

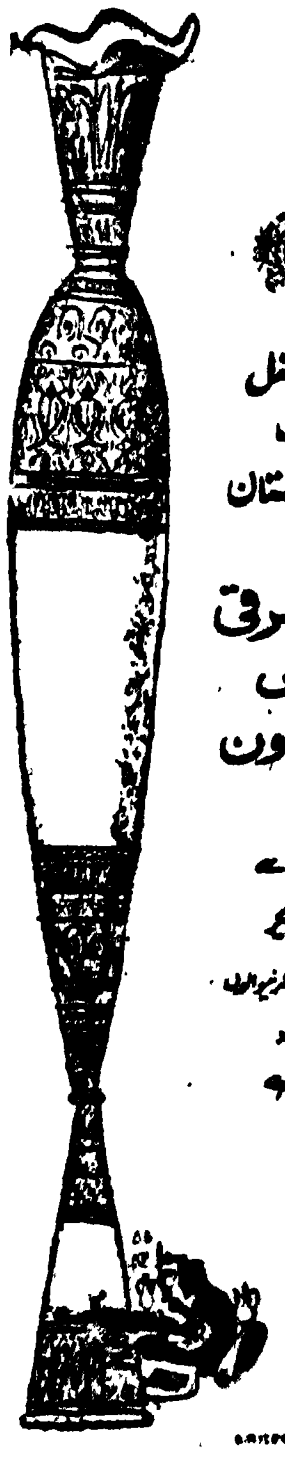
سالانہ چندہ مع خاص نمبر
پاک و ہند دس روپے
قیمت فی پرچہ ۵۰ پیسے

جرعات

جلد ۱۷ | ساقی، کراچی، بابت مارچ ۱۹۶۵ء | نمبر ۳

بھارت میں ساقی کا چندہ بھیجنے کا پتہ:۔ علیم کتاب گھر ۲۴۶۳ رنگ محل خورد پھاٹک حبش خاں، دہلی

ناشر عاصمہ بیگم نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر پی، آئی، بی کالونی ۲۸ سے شائع کیا



نقی محمد خاں

عبدالرحیم خانخاناں کے دوہے

دوہے جمع کرنے کا شوق تو مجھے عرصہ دراز سے ہے اسی لئے کافی ذخیرہ جمع ہوگیا تھا اور وہ یادداشت میں نے بغرض اشاعت مولوی عبدالحق مرحوم بابائے اردو کو دیدی تھی۔ تلسی داس اور کبیرداس کے دوہے تو اکثر زبان زد خلائق ہیں، لیکن عبدالرحیم خانخاناں کے دوہے نہ صرف نایاب بلکہ ناپید ہیں۔

۱۹۳۲ء میں ایک ہندو نابینا سادھو سے میری ملاقات ہوئی تھی، اس کو خانخاناں کے بکثرت دوہے یاد تھے اور یہی اس کا ذریعہ معاش تھا۔ کچھ تو مجھے پہلے سے یاد تھے، کچھ بمشکل اس سے دستیاب ہوئے تھے۔

خانخاناں جیسا اولوالعزم، دلیر اور فراخ حوصلہ شخص تھا ایسی مثالیں کم ہیں لیکن افسوس کہ اس کے تفصیلی حالات سے تاریخ کے صفحات خالی ہیں۔

مولوی محمد حسین آزاد کا ایک خط "رسالہ" لاہور مطبوعہ ۱۸۸۷ء میں شائع ہوا تھا، جس کو نقوش لاہور نے شائع کیا ہے، اس میں خانخاناں کی داد و دہش کا تو ذکر ہے لیکن اس کے دوہوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تلسی داس اور کبیر داس اپنے زمانے کے بادشاہِ سخن تھے، لیکن اگر ان کا کوئی ہم پلہ پیدا ہوا ہے تو وہ خانخاناں تھا۔ آپ خود اندازہ کرلیں گے کہ خانخاناں کے دوہے کسی لحاظ سے کم نہیں ہیں۔

خانخاناں، بیرم خان ترکمان کا لڑکا تھا، بیرم خان ہمایوں کا جانباز رفیق اور اکبر بادشاہ کا اتالیق تھا، وفاداری اور نمک حلالی کے باعث بادشاہ کے دل میں ایسا گھر کرلیا تھا کہ ہمایوں خطوں میں برادر مہربان لکھتا تھا اور اکبر اس کو خان بابا کہتا تھا۔

۱۵۵۶ء میں بمقام لاہور اس کے لڑکا پیدا ہوا جس کا نام عبدالرحیم رکھا گیا۔ ابھی چار ہی سال کی عمر تھی کہ باپ مکہ کے راستے میں مارا گیا۔ اکبر کو جب علم ہوا تو چار سالہ عبدالرحیم کو بلاکر دیکھا تو بیرم خاں کی خدمات اور جان نثاریاں یاد آگئیں، لڑکا نہایت حسین و جمیل تھا، اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ معتمد ملازمان اس کام پر مقرر کئے گئے اور اپنی خدمت میں حاضر رہنے کا بھی حکم دیا، اس طرح یہ لڑکا تھوڑے ہی عرصہ میں دربار اکبری کے قابل ہوگیا اور اس کو خاص و عام مرزا خان کہنے لگے۔ صورت شکل کے لحاظ سے اس کو دربار اکبری کا اجالا کہنا بیجا نہ ہوگا۔ جب اکبر نے گجرات پر چڑھائی کی اور تین مہینے کے راستے کو دن اور رات چل کر نو دن میں طے کیا اور قلعہ پر حملہ آور ہوا اس وقت نشان لشکر کا اسی چودہ سال لڑکے کے ہاتھ میں تھا۔ گو فوجی تربیت باقاعدہ اس نے نہ پائی تھی لیکن ذہانت کے باعث ملک گیری اور ملک داری میں ایسا نکلا کہ جیسا اکبر جیسے بادشاہ کے سپہ سالار کو ہونا چاہیئے تھا۔ اکبر بھی اسے بہت چاہتا تھا اور فرمانوں میں اس کو یار وفادار، فرزند، اور برخوردار کہتا تھا۔

لڑائیوں میں بڑے بڑے معرکے سر کئے اور ایسی بہادری سے لڑا کہ نامور سپہ سالار دیکھتے رہ گئے۔ یہ تمام خوبیاں دیکھ کر بادشاہ نے جہانگیر کا اتالیق مقرر کردیا اور کہا کہ جس طرح اس کے باپ کی اتالیقی مجھے مبارک ہوئی اس کی اتالیقی میرے بیٹے کو بھی مبارک ہوگی۔

خان خاناں کی دلیری کے علاوہ سخاوت کے بھی بہت واقعات مشہور ہیں۔ منجملہ ان کے صرف دو واقعات پیش کرتا ہوں :-

ایک دن جہانگیر بادشاہ کسی بھاٹ پر ناخوش ہوا اور حکم دیا کہ اس کو ہاتھی کے پیر سے کچلوا کر مروا دو۔ اس وقت خان خاناں بھی موجود تھا۔ اس فرقہ کی گستاخی اور حاضر جوابی مشہور ہے، بھاٹ نے عرض کیا کہ حضور نواب خانخاناں بڑا آدمی مشہور ہے، اسے ہاتھی کا پیر چاہیئے میں تو ایک چیونٹی سے بھی بدتر ہوں، مجھے مارنے کے لئے تو آپ کا چھوٹا سا چوہے اور چوٹے کا ہی پیر کافی ہے' جہانگیر اور زیادہ خفا ہوا، خانخاناں نے عرض معروض کرکے اس کی جان بخشی کرادی اور پانچ ہزار روپے بطور انعام اس کو دئے اور کہا کہ اس نے مجھے بڑا آدمی خیال کیا، البتہ یہ اسس کا حوصلہ ہے کہ اپنے خیال کو اچھے الفاظ میں ظاہر نہ کرسکا۔

ایک روز برہان پور کی خدمت پر دربار شاہی سے روانہ ہوا اور پہلے ہی مقام پر شامیانے کے نیچے بیٹھا ہوا اس مقام کی خوشنمائی کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ ایک آزاد سامنے سے گذرا اور کہا ؎

منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

عبدالرحیم خانخاناں (منعم خان) نے حکم دیا کہ اسس کو ایک لاکھ روپے انعام دیدو۔ وہ شخص سات روز تک متواتر ہر منزل پر آتا اور وہی شعر پڑھ کر ایک لاکھ روپے انعام لیتا رہا، آٹھویں دن اس خیال سے نہ آیا کہ میرا روز روز آنا خانخاناں کو ناگوار نہ گذرے۔ لیکن خانخاناں نے رات تک انتظار کیا اور افسوس کے ساتھ کہا کہ میں نے تو یہ طے کیا تھا کہ برہان پور تک ستائیس منزل اسس کو متواتر ایک لاکھ روپے انعام دیتا رہوں گا۔ نہ معلوم وہ کیا خیال کرکے بیٹھ رہا۔

خان خاناں ۷۲ سال کی عمر میں دکن میں جاکر مرگیا اور دکن میں ۱۶۲۶ء میں دفن ہوا۔ اس کا عالی شان مقبرہ گر کر چونے کے ڈھیر پڑے ہیں۔

خان خاناں کے دوہے جو مجھے بمشکل دستیاب ہوئے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱)

سمے لگے سندر سبھی روپ کروپ نا کوئی
جن کی رچی جیتن جتے تت تیتی رچ ہوئی

یعنی وقت وقت پر ہر چیز بھلی معلوم ہوتی ہے، خوبصورتی وہی ہے جو دل کو بھلی معلوم ہو۔ "جس کو پیا چاہے وہی سہاگن ہو"

(۲)

کوؤ تیئن پیرا کرے کوؤ کرے نہ پیچ
نل مل جل اوپر چڑھے تتا نیچ کے نیچ

یعنی کوئی لاکھ تدبیر کرے انسان کی فطرت نہیں بدلتی جس طرح کہ پانی نل کے ذریعہ سے اوپر چڑھ جاتا ہے، لیکن دباؤ کم ہونے سے پھر نیچے آجاتا ہے۔

(۳)

مہت نہ میتا گل تپائی موی جو دھنا دھوی جور

کمائے کرچ جو بہے تو کرے جوڑ پے جوڑ

یعنی "اپنی بُری حالت بنا کر روپیہ جمع کرنا مناسب نہیں ہے - البتہ جو جائز اخراجات سے بچ جائے اس کو جمع کرتے رہو"

(۴)

سپت کیشا شد لیشا نرانوت دھنا ان کا بان

دیو استرا کیا نیما نرا ترم د بھوا کے بان

یعنی "خوشحال اور کمال کے زمانے میں شریف جھک جاتے ہیں - جس طرح کمان کی بال، لیکن کمینے کو جب دولت مل جاتی ہے تو وہ مغرور ہو جاتا ہے اور اکڑتا پھرتا ہے"

(۵)

سنگت دوش لگے سین کھاتا سا نچے نین

کٹھلا بھیونیا سنگھا بھئے کھلاک مبنک نین

یعنی "بُری صحبت سے عیب لگ جاتا ہے جس طرح ٹیڑھی بانکی بھوؤں کی صحبت سے آنکھوں میں بھی ٹیڑھی ترچھی ادائیں پیدا ہو جاتی ہیں"

(۶)

جو رحیم اوچھو بڑھے اتنا ہی اترائے

پیدل سے پھرجی بھیو ٹیڑھو ٹیڑھو جائے

یعنی "اے رحیم اگر کوئی کم ظرف کسی بڑے رتبہ پر پہنچ جاتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہے کہ جس طرح شطرنج میں پیدل جب فرضی بن جاتا ہے تو ٹیڑھا ٹیڑھا چلتا ہے"

(۷)

جال پڑے جل جات ہے تجا میانا کو موہ

رحمنا مچھلی پانی کو ناچھا نوٹت چھوہ

یعنی "جال پڑنے پر پانی مچھلی سے محبت ترک کر دیتا ہے، لیکن مچھلیاں پانی سے الگ ہو کر بھی پانی سے محبت قائم رکھتی ہیں"

(۸)

رحمنا لاکھ بھلی کرو لرگنی اگتا نا جائے

ناگ سیت بیا پت ہیں ناگ سیت ڈس جائے

یعنی "اے رحیم بری خصلت والے کے ساتھ لاکھ بھلائی کرو، لیکن وہ اپنی بدی سے باز نہیں آتا - اس کی مثال اس سانپ کی ہے، جس کو دودھ پلاؤ لیکن جب موقع ملتا ہے کاٹ لیتا ہے"

(۹)

رحمنا انسوان نین ڈہرے جیا دکھا پرگھٹا کردیے
نباہ نہ کارو گیندنے کسا نہ بھید رکھے دیے

یعنی " رحیم آنسو ڈھلکر دل کی کیفیت کو ظاہر کر دیتے ہیں اور یہ ٹھیک بھی ہے، جس کو گھر سے نکال دوگے وہ گھر کا بھید کیوں نہ کہے گا "

(۱۰)

رحمنا دل کی بپتا سنائے مت راکھو واکو گری
سنے اور اٹھہ پیھن اکلائے بانٹ نہ لیوے کوئی

یعنی " اے رحیم اپنی مصیبت کو کسی پر ظاہر مت کرو کیونکہ وہ تمہیں ہی الٹا جھٹلائے گا لیکن تمہاری تکلیف میں وہ حصہ دار نہ بنے گا "

(۱۱)

رحمنا وے ترا مرے جو بھیک مانگنے جائے
اس پہلے وہ مرے جن کے منہ سے نہ نکلے آ ہے

یعنی " اے رحیم وہ مرگیا سمجھو جو دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور اس سے پہلے وہ مرگیا، جس کے منہ سے تکلیف میں آہ نکلی "

(۱۲)

سر سوکھے پکشی اڑن دوجے سرن کی راہ
بنا پر کی مچھلیاں کہو رحیم کاں جائے

یعنی " جب تالاب سوکھ جاتا ہے تو مرغابیاں اُڑکر دوسرے تالاب میں چلی جاتی ہیں۔ لیکن اے رحیم مچھلیاں کیسے اُڑکر جائیں "

(۱۳)

اے رحیم تن متا دیو چھوٹے بج بھوان
تا سو دیکھ سکھ گھٹی کی رہی مات اب مان

یعنی " اے رحیم جس نے تن من دھن سب لٹا دیا اس کے پاس سوائے جان کے کیا باقی ہے جو دکھوں میں مبتلا رہتی ہے "

(۱۴)

نین سلونے ادھر مدہ کہو رحیم گھٹ کون
سونے پر میٹھا رچے اور میٹھے پر لون

یعنی " اے رحیم تیری آنکھیں نمکین ہیں اور ہونٹ شیریں ہیں، اے رحیم بتلا کر انمیں کون اچھا ہے۔

پھر خود ہی کہتے ہیں کہ "میں کیا بتلاؤں سمجھ لو کہ میٹھا کھا کر نمکین کو جی چاہتا ہے اور نمکین کھا کر میٹھے کی رغبت ہوتی ہے"

عبدالرحیم خانخاناں کے دوہوں کے بعد تلسی داس اور کبیر داس کے دوہے ملاحظہ ہوں جو دوہوں کے اُستاد مانے گئے ہیں۔ خانخاناں کے دوہوں میں سنسکرت غیر مانوس الفاظ زیادہ ہیں لیکن آخر الذکر دوہے برج بھاشا میں ہیں جو عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ان میں ان کے تجربات ہیں جو دوہے مجھے یاد ہیں انھیں کو پیش کرتا ہوں:۔

(۱)

تلسی یا سنسار میں سبھی بناؤ لوگ
کا پر کیجے نیاؤ تو اور کا پر کیجے نیوگ

یعنی "اے تلسی اس دُنیا میں سبھی لالچی اور خود غرض ہیں۔ کس سے انصاف کی توقع رکھی جائے اور کس پر اعتبار کیا جائے"

(۲)

تلسی لکھا کرم کا بدل سکے نا رام
بدلے تو اچرج نہیں پر سمجھ کھو ہے کام

یعنی "اے تلسی قسمت کا لکھا ہوا کوئی نہیں مٹا سکتا اور اس کو خدا بھی نہیں مٹا سکتا اگر وہ بدلنا چاہے تو بدل سکتا ہے لیکن جب سمجھ بوجھ کر کام کیا ہے تو کیوں مٹائے"

(۳)

مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ
تلسی داس گریب کی کوؤ نہ پوچھے بات

یعنی "دولت مند کو اور زیادہ دولت ملتی ہے اور تلسی داس غریب کی کوئی بات بھی نہیں پوچھتا"

(۴)

تلسی بُرا نہ مانیو جو گنوار کہہ جائے
برکھا رت کا نا روا بُرا بھلا بہ جائے

یعنی "اے تلسی اگر گنوار کوئی بات کہہ دے تو اس کا بُرا مت مان۔ برسات کے پانی سے سبق حاصل کر جو بُرا بھلا سب بہا کر لے جاتا ہے"

(۵)

کا ہو کے من کچھو بسے کا ہو کے من کچھو سہائے
آگ پھونک سے جل اُٹھے دیا پھونک بجھ جائے

یعنی "ایک ہی بات کا اثر مختلف لوگوں پر مختلف ہوتا ہے جیسے کہ پھونک ہی سے چراغ گل ہو جاتا ہے اور پھونک ہی سے آگ جل جاتی ہے"

(۶)

نین سلونے ادھر مدہ شام سیت رت نار
جیت مرت گر گر پرت گ چتوت ایک بار

یعنی" اے محبوب تری آنکھوں میں ہونٹوں میں نمک بھی ہے، شہد بھی ہے، زہر بھی ہے اور نشہ بھی ہے۔ تجھے دیکھکر جیتا ہوں، مرتا ہوں نشہ میں گر گر پڑتا ہوں"

(۷)

پیتم پتیاں جب لکھوں جب تم ہو کہیں بدیس
تن میں من میں نین میں واکو کون سندیس

یعنی" اے محبوب میں تجھے خط تو اس وقت لکھوں جب تو پردیس میں ہو۔جو میرے جسم میں ہے میرے دل میں ہے میری آنکھوں میں ہے اس کو تو خط لکھنے کا کوئی سوال ہی نہیں"

(۸)

دھی جنوائی لے گیو اور بہویں لے گئیں پوت
تلسی یا سنسار میں سب ہی اوت کے اوت

یعنی" بیٹی کو جنوائی بیاہ کرلے گیا اور بیٹے کو بہویں لے گئیں۔اے تلسی اس دنیا میں تم ہی بیوقوف بنے، اوت لا ولد کو بھی کہتے ہیں۔

کبیر داس کو اہل ہنود ایک مفکر اور فلسفی خیال کرتے ہیں، اور جو اس کے معتقد ہیں وہ کبیر پنتھی کہلاتے ہیں۔ اس کے دوہے بھی زبان زد خلائق ہیں۔ بعض دوہے یہ ہیں:-

(۱)

رنگی کو نارنگی کہیں اور چلے دودھ کو کھویا
الٹی بدھی دیکھکر دیا کبیرا رویا

یعنی" رنگین چیز کو بے رنگ کہیں اور جلے ہوئے دودھ کا نام کھویا رکھا ہے، اس بد مذاقی کو دیکھکر کبیر کو رونا آتا ہے۔

(۲)

تیرا سائیں تجھ میں ہے جوں پھولیں بن باس
کستوری کا مرگ جیوں پھر پھر ڈھونڈھے گھاس

یعنی کبیرا خدا تجھ میں اس طرح موجود ہے جس طرح پھولوں میں خوشبو۔کیسی حیرت کی بات ہے کہ مشک کا نافہ ہرن ہی کے جسم میں موجود ہوتا ہے اور وہ اس کی خوشبو کو جگہ جگہ گھاس میں تلاش کرتا ہوا پھرتا ہے"

(۳)

بت پوجیں ہری ملیں تو میں پوجوں پہاڑ
تا سے تو چاکی بھلی کہ پیسی کھائے سنسار

(بقیہ صفحہ ۲۹پر)

ڈاکٹر عابد علی خاں

جگر کی باتیں اور یادیں

جگر صاحب میرے والد حافظ حامد علی خاں صاحب مرحوم کے ہم سن اور ہمدرس تھے۔ وہ بچپن میں ان کے ساتھ پڑھا کرتے تھے، مراد آباد میں ان کا خاندان بہت ہی معزز تھا، ہم بچپن میں سنا کرتے تھے کہ جگر صاحب کے اجداد میں سے کسی نے اپنے لڑکے کی شادی میں شہر بھر کی دعوت کی تھی گویا عام دعوت کی تھی، ان کے مورث اعلیٰ شاہجہاں کے عہد میں شہزادہ کے اتالیق تھے اور بادشاہ اس صلہ میں ان کو مراد آباد کی تحصیل سنبھل دینا چاہتا تھا لیکن اپنی فطری خودداری کی بنا پر اس پیش کش کو قبول نہیں کیا، یہ بات جگر صاحب ہی نے بیان کی تھی۔

جگر صاحب کا خاندان اردو فارسی، عربی دانی، شعر و شاعری اور خوشنویسی کے لئے مشہور تھا۔ ان کے والد مولوی علی نظر صاحب بھی بہت نامور خوشنویس اور شاعر تھے۔ مرثیہ اچھا کہتے تھے۔ جگر صاحب کے چھوٹے بھائی مظفر صاحب تقسیم ہند سے پہلے کانپور میں رہتے تھے۔ جگر صاحب سے کافی شباہت رکھتے تھے۔ مراد آباد میں ان کے چچازاد بھائی بہن اور دوسرے رشتہ دار رہتے تھے جن کی وہ اکثر مدد کیا کرتے تھے، جگر صاحب کے حالات یوں تو لکھے جا چکے ہیں اس پر میرا قلم اٹھانا بیکار ہے، لیکن میں یہاں چند نجی باتیں پیش کروں گا، ہاں تو جگر صاحب کو میں نے ۱۹۳۰ء سے پہلے نہیں دیکھا تھا صرف نام سنا تھا آخر کار سعادت دیدار نصیب ہوئی، اس وقت وہ چالیس کے لگ بھگ تھے۔ میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ میرے بڑے بھائی ساجد علی خاں صاحب راز نو عمری ہی سے شعر و شاعری کی طرف راغب تھے اور شعر گنگناتے رہتے تھے۔ میں ان کے بالکل الٹ تھا، مجھے اس سے کوئی مس نہ تھا بلکہ کچھ برا ہی مانتا تھا۔

جگر صاحب کی زندگی بڑی طوفانی تھی، آج یہاں کل وہاں کبھی ہوش میں اور کبھی بیہوش۔ ہماری پہلی ملاقات ان سے ۱۹۳۰ء میں ہوئی۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں بھائی صاحب کو شاعری کا شوق تھا، جگر صاحب ہمارے گھر ٹھہر گئے، بھائی صاحب نے ان کو غزل دکھائی، اس واقعہ کو جگر صاحب اکثر متبسم ہو کر سنایا کرتے تھے، پاکستان میں بھی کئی مرتبہ سنایا، واقعہ یوں بیان کرتے تھے کہ پٹھان بیٹا آیا اور کہا شاگرد بنا لیجئے۔ میں نے ٹالنا چاہا تو ناراض ہو کر کہا کہ آپ جانتے ہیں میں پٹھان ہوں۔ مجھے یہ کلمہ پسند آیا، راضی ہو گیا۔ پھر فرماتے وہ تو تشدد کے زور پر شاگرد ہوا ہے۔ جگر صاحب مرحوم اور والد صاحب چونکہ ایک دوسرے سے مدت بعد ملے تھے لہٰذا مل کر بہت ہی خوش ہوئے۔ اب جگر صاحب ہماری بیٹھک میں رہنے لگے۔ پینے پلانے کا زمانہ تھا، لوگ گھیرے رہتے تھے۔ صبح سے رات تک یہی چکر تھا، ہر طرح اور ہر قسم کا آدمی آتا تھا، جگر صاحب سناتے رہتے، کبھی کبھی جگر صاحب ایک کائستھ سب جج بھٹناگر صاحب کے گھر چلے جایا کرتے تھے۔ کوئی ۵۲، ۵۳ کا سن تھا، قد لانبا، چہرہ شگفتہ، تعصب کے داغ سے آزاد، پیشانی کشادہ، مونچھ شاندار اور دراز، بحیثیت مجموعی ان کی شخصیت جاذب اور پر کشش تھی، جگر صاحب کے سفید اور پرستار تھے، گویا انسانی اقدار کے پرستار تھے، جگر صاحب کو دیکھ کر کھل جاتے، خود کو بھول جاتے سبحان اللہ کیسے مخلص لوگ تھے، آج وہ بات کہاں اور اگر ہے بھی تو شاذ، شاعروں میں صہبا مرحوم، سوز، قمر، محشر مرادآبادی اور دوسرے اہل ذوق رہتے،

صہبا مرحوم کا قد چھوٹا، مخمل کی ٹوپی، خلطی پائجامہ اور شیروانی میں ملبوس رہتے، کوئی پینسٹھ سال کے تھے، داڑھی سفید اور گھنی، چہرہ شگفتہ، شرافت و محبت وصفا کا پیکر، لگن تو دیکھئے کہ جگر صاحب کی محبت میں کہاں سے چل کر پیدل آتے آنے جانے میں دو ڈھائی میل کا چکر ہو جاتا، خوش رہتے، ہنستے ہنساتے، شعر سنتے اور سناتے، معصوم انداز میں گفتگو کرتے، جگر صاحب کو نکتے اور خوش ہوتے، سوز صاحب کی عمر کوئی پچیس سال کی تھی وہ بھی جگر صاحب کا کافی احترام کرتے، ذرا سنجیدہ تھے، شیروانی اور پاجامہ پہنتے، کبھی سوٹ میں بھی نظر آجاتے، قد درمیانہ تھا۔ قمر صاحب کا قد لانبا، جسم بھرپرا، آواز میں سوز اور ترنم، شعر اچھا کہتے تھے، شیروانی اور پاجامہ پہنتے، اختر کی عمر بھی کوئی بائیس سال تھی میرے ہمدرس تھے، آواز اچھی تھی، دبلے پتلے لانبے قد کے تھے، پاجامہ اور شیروانی پہنتے، سنا ہے کہ ان کا انتقال ہو گیا، خدا بخشے عجب آزاد مرد تھا۔

جگر صاحب جب آتے ہمارے گھر قیام فرماتے، جب تک جی چاہتا رہتے اور چلے جاتے۔ مناسب ہے کہ یہاں اپنے مشاہدہ اور نزدیکی کی بنا پر کچھ جگر صاحب کی اخلاقی صفات پر بھی اظہار کر دوں، کیونکہ کار نیک میں کسی قسم کی تاخیر جائز نہیں، وہ بڑے خلیق، بامروت اور شریف تھے، دل کے صاف اور مذاق کے ستھرے تھے، اس سلسلہ میں کئی باتیں ہیں۔

اکثر یہ بھی ہوا کہ جگر صاحب شعر پڑھ رہے ہیں کوئی فقیر آگیا، خاموش کھڑا ہو گیا، سنتا رہا، اگر جگر صاحب اس کے دروازہ میں گھستے ہی ختم کر چکے تو اس پر ایک گہری نظر ڈالتے اور اس کی اندرونی کیفیت کی الجھن کو پا جاتے اور فرماتے، میں خاموش تقاضوں کی تاب نہیں لا سکتا ہوں لہٰذا فقیر کے بغیر کہے ہی اپنا کلام سنانا شروع کر دیتے، وہ خوش ہو جاتا، اس کا چہرہ کھل جاتا اور دعائیں دیتا ہوا چلا جاتا۔

اسی طرح جب جگر صاحب چند آدمیوں کے ساتھ راستہ چلتے تو کیا مجال کہ کسی سے غفلت یا لاپرواہی برتیں، کوشش کرتے۔ بلکہ اس بات کا خیال رکھتے کہ ہر ایک یہ سمجھے کہ جگر صاحب اسی کے ساتھ ہیں، اس میں بڑے چھوٹے، حاکم محکوم، استاد شاگرد، امیر غریب کسی کی تخصیص نہ تھی، یہ ایک ایسی خوبی تھی جو ہر ایک کو نظر آتی تھی اور اس کے دل میں ان کی اخلاقی عظمت، محبت اور عزت کا نقش جما جاتی تھی۔ ان کی فروتنی، ان کا اخلاص، ان کا تبسم اور ان کی حیا آمیز نگاہیں تسخیر قلب کا ایک مؤثر آلہ تھیں،

جگر صاحب قاضی شاہ عبدالغنی صاحب منگلوری سے بیعت تھے، ایک دفعہ رڑکی کا سفر کیا، پہنچے ہوئے تھے لہٰذا اپنا بستر ٹرین ہی میں چھوڑا اور اتر گئے، وہاں سے منگلور پہنچے، چھ میل کا فاصلہ ہے۔ تانگے چلتے تھے، قاضی صاحب قبلہ نے بہت خیال کیا۔ چند روز بعد روانہ ہوئے ٹرین پر سوار ہوئے، اپنے ہی گمشدہ بستر پر نگاہ جم گئی، ایک دوسرے صاحب اس کے مالک بنے بیٹھے تھے، گیا، آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں، والا معاملہ تھا۔ نظریں جھکا لیں، سبحان اللہ کیا حوصلہ، کیا رواداری اور کیا اخلاق تھا؟

جگر صاحب کے اکثر دوست اور آشنا ظالم ہی ثابت ہوئے۔ شراب کی زیادتی سے قلب کے دورے پڑ رہے ہیں مگر مشاعروں میں شرکت پر اصرار ہے، کہا جاتا تھا بس آپ کی موجودگی ہی چاہیئے، لیکن وہاں لے جا کر فرمائشوں کا تانتا بندھ جاتا، اور اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لئے ان کو اسی حالت میں شراب پیش کی جاتی، بلکہ ان کی صدائے ھل من مزید پر لبیک کہا جاتا، کتنی خود غرض ہے دنیا، کیسے مطلب پرست ہیں لوگ، ذرا غور تو فرمایئے، کیا انسانیت کش سلوک تھا۔ کیا دوستی اور تعلق کا اسی طرح حق ادا کیا جاتا ہے؟ داستان تو بہت طویل ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

جگر صاحب کے پیر و مرشد جناب شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے والد صاحب جناب حضرت قاضی شاہ محمد اسمٰعیل صاحبؒ کے خلیفۂ ارشد جناب مولانا سید غالب علی شاہ صاحبؒ جو اپنے زمانہ میں ایک نہایت بلند پایہ اہل دل تھے مرادآباد میں رہتے تھے، آپ ننہیال اور ددھیال کی طرف سے دو نامور منصبداروں سے تعلق رکھتے تھے، آپ کی عمر ستر سے اوپر تھی مگر داڑھی اور سر میں زیادہ تر کالے بال تھے۔ ہمارے محلہ کھیر سیف خاں کی مسجد

میں جو ہمارے پر دادا حاجی گوہر علی خاں صاحب کے نام سے مشہور تھی نماز ادا کیا کرتے تھے۔ جگر صاحب ان سے بیحد محبت کرتے اور ان کے سامنے نہایت ہی مؤدب رہتے۔ وہ بھی جگر صاحب کا صد درجہ خیال فرماتے ا۔ ان کی غیبت میں ان کا ذکر بڑی محبت سے کرتے۔

جگر صاحب نے ہمارے سامنے اکثر شراب پی۔ دیسی تنگی کے وقت اور اس کے برعکس جیسی مل جاتی پی لیتے تھے۔ نشہ میں کبھی بھی ان کی زبان سے گالی یا بُری بات نہ سنی، جب وہ باہر پیتے اور راستے تو عجیب منظر ہوتا، اس وقت اگر ہم میں سے کوئی بول اٹھتا اور کہتا، آپ گھر پر پی لیں، سڑکوں پر نہ پئیں، اگرچہ وہ نشہ میں دُھت ہوتے نہ معلوم کتنی پئے ہوتے مگر فوراً کہتے آپ حکیم ہیں۔ آپ ڈاکٹر ہیں؟ میں تو مراد آباد کی گلیوں اور سڑکوں کا حق ادا کر دوں گا اور اس طرح رہوں گا کہ ہر شخص مجھ سے نفرت کرے، یہ سنکر ہم چپ ہو جاتے، اکثر یہ بھی کہتے، میں مُسلم ہوں، یہ میری چیز نہیں ہے، یہ وقتی ہے۔ میں ننگ اسلام ہوں، ننگ خاندان ہوں، اس سلسلہ میں جب کبھی مولانا صاحب قبلہ سے گفتگو ہوتی تو وہ (مولانا) فرماتے، عابد خاں جگر بڑا اچھا آدمی ہے یہ شراب وقتی ہے، اس کا خاتمہ بالخیر ہوگا، جب میں نماز کو جانے لگتا تو مجھ سے سلام کہلواتے۔ ایک دفعہ جگر صاحب نے ان کو ایک عصا بھیجا بیحد خوش ہوئے۔ اس کی ہر ایک سے تعریف کی اور دعائیں دیں۔ مولوی صاحب قبلہ جمعرات کو بعد مغرب اپنے ایک مُرید عاشق ارشاد عرف حافظ چھٗو مرحوم سے بزرگان دین کا فارسی کلام سنتے تھے وہ بہت خوش گلو تھے، اسی میں جگر صاحب کا فارسی کا سراپا اور اردو کی نعت بھی ہوتی، بعد میں قرآن شریف کا ایک رکوع ہوتا۔

جگر صاحب کو میری چھوٹی بہن ستارہ بیگم سے بڑی محبت تھی، وہ اس وقت تین چار سال کی تھی اس کو بیٹی بنالیا تھا۔ اس کو مجذوب بیٹی کہتے، اس کا بیحد کہا مانتے تھے، اس سے بڑی بہن کو چھیڑتے اور کہتے کہ ہماری بیٹی ملکہ ہے اور تم خادمہ، وہ بیچاری روتی لیکن پھر اسے راضی کر لیتے، اس کی عمر اس سے دو ایک سال زیادہ تھی۔ ستارہ بیگم مراد آباد میں ان کے ساتھ بندھی رہتی۔ کھانا ساتھ ہی کھاتی، جب جگر صاحب پئے ہوتے تو بلانے پر بھی ان کے پاس نہ جاتی اور سنان کے گلاس میں پانی پیتی، وہ بیچارے خوشامدیں کرتے، مناتے اور کہتے، میں شراب نہیں پیوں گا، پھر کھٹائی یا لیمو کا استعمال کرتے، نشہ ہرن ہو جاتا، نہاتے دھوتے، کپڑے بدلتے، تب پاس جاتی، اس وقت میں کافی بڑا تھا لیکن یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ جگر صاحب پئے ہوئے ہیں کیونکہ تھوڑی تو ان پر کوئی اثر ہی نہیں کرتی تھی،

ایک روز جگر صاحب نے بیان کیا، بھئی ہمارے ایک کرم فرما نے ہماری شیروانی کی جیب سے پیسے (نوٹ) نکالے ہم بال کٹوانے کے بعد آئینہ لئے چہرہ دیکھ رہے ہیں اور اسی میں ان کا عکس بھی، مگر اب کیا کریں، دیکھ رہے ہیں اور تو نہ ملیئے کیا ظرف تھا کیا ضبط تھا، کیا رواداری تھی۔

جگر صاحب اپنی کیف و مستی کی زندگی میں کچھ خود سے بیگانہ اور بے تعلق دکھائی دیتے تھے، نہ سامان کا خیال، نہ جوتے اور کپڑوں کا دھیان، بس ایک عجیب عالم فراموشی تھا، گویا، کوئی منزل ہو مگر گذرا چلا جا تا ہوں میں، والا معاملہ تھا۔

میلے کپڑے یہاں چھوڑے وہاں چھوڑے، کچھ چیزیں یہاں اور کچھ وہاں، شطرنج اور تاش کا شوق تھا۔ شطرنج کافی اچھی کھیلتے۔ اور گرد کو بالکل بھول جاتے، سارا سارا دن اور ساری ساری رات چپے ہوئے ہیں، گویا بے خبر از ہمہ عالم چہ بلند ست وچہ پست، کا مصداق ہو جاتے۔

جگر صاحب یہ تین باتیں اکثر بڑے غمناک انداز میں کہتے۔ میں بعض موقعوں پر خود کو بڑا بے بس پاتا ہوں، ایک تو اس وقت جبکہ شراب پینا چاہوں اور نہ پی سکوں (پیسہ نہ ہو)، دوسرے جب کوئی مدد مانگے اور نہ کر سکوں، وہ وقت صاف کپڑے پہننا چاہوں، اور پلنگ پر صاف چادر دیکھنا چاہوں اور نہ کر سکوں۔ مجھے کبھی یاد نہیں کہ جگر صاحب نے شراب کے نشہ میں شعر کہا ہو۔ بلکہ اس سلسلہ

میں اکثر یوں فرمایا کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں شراب پی کر شعر کہتا ہوں مگر معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے، یعنی یہ کہ میں چاہتا ہوں کہ غسل کئے ہوئے ہوں۔ صاف کپڑے ہوں، چادر سفید، عمدہ قلم اور کاغذ ہو اور پھر شعر۔

جگر صاحب کو کاغذ اور دیوار پر مچھلیاں اور نہایت پاکیزہ خط میں بسم اللہ شریف لکھنے کا بیحد شوق تھا لہٰذا جب جی چاہتا اس میں لگ جاتے، ہمارے گھر کا کوٹھا جس کی دیواریں سیاہ تھیں ان کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا وہاں وہ نہایت خوبصورت مچھلیاں بنانے اور تسنہ جاننے والے ان کے اس فن کی داد دیتے، وہ مچھلیاں کئی سال باقی رہیں، ہم کو بھی ہماری پسند کی کوئی غزل مع بسم اللہ لکھ کر دی گئی، آخر میں جگر مراد آبادی عفی عنہ، خدا بخشے خوب لکھتے تھے۔

حضرت اصغر گونڈوی ان کے ہم زلف اور پیر بھائی تھے، ان کا بیحد ادب کرتے تھے، یعنی وہ تو اپنے سے ہر بڑے کا ادب اور چھوٹے کا خیال کرنے میں اپنی مثال آپ ہی تھے، جگر صاحب کی والہانہ محبت کا ایک چشم دید واقعہ یاد آگیا۔ ایک دن وہ شہر میں گھوم رہے تھے، پی رہے تھے اور جھوم رہے تھے، بوتل جیب میں تھی۔ گویا ساری کائنات پر قبضہ تھا۔ پر کچھ اس وقت ان کے لئے کچھ اسی قسم کی شے تھی۔ اس عالم میں کسی نے اصغر گونڈوی کی موت کی خبر دی، تڑپ گئے، بیچ بازار میں بوتل دے ماری اور چیخنے لگے، جیسے تیسے گھر پہنچے، کئی وقت غذا نہ کھائی اور کامل آٹھ ماہ تک شراب نہ چھوئی۔ اسی طرح جب اپنے ایک دیرینہ مشفق اور کرمفرما نواب صدیق حسن خاں صاحب بھوپال ہاؤس، لکھنؤ والے کے انتقال کا پتہ چلا تو نہایت غمگین ہوئے اور کئی ماہ تک شراب نہ پی، لیکن بعض دوست نما دشمن ان کی یہ ہوشمند زندگی نہ دیکھ سکے لہٰذا پھر دور چلا، وہ ان دونوں حضرات کا نام نہایت ہی محبت اور احترام سے لیا کرتے تھے، ان کے چہرے پر ایک عجیب کیفیت رونما ہو جاتی جو ان کی روح کی گہرائیوں کی غمازی کرتی۔

جگر صاحب کبھی کبھی کوٹھے کی چھت پر ٹہلتے ٹہلتے نہایت مترنم اور مؤثر انداز میں یہ گنگناتے، "ندیا دھیرے بہو سارے ندیا دھیرے بہو" وہ وقت قابل دید ہوتا، اس وقت ان پر ایک عجیب اور پر اسرار کیفیت طاری ہوتی، آنکھوں میں غیر معمولی چمک اور گہرا انہماک، پس و پیش سے بے خبر اس کی تکرار کرتے، کوئی سننے والا اگر خاموشی سے آنکلتا تو وہ بھی اس مسحور کن اور دلآویز گنگناہٹ کی تاثیر سے بقدر ظرف لطف اندوز ہوتا۔

جگر صاحب ایک دفعہ نشہ میں چور تھے مگر ان کی روح بیدار تھی۔ دن کا ۱/۲ بج رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے کہ حضرت کی خدمت میں لے چلو (مولانا غالب علی شاہ صاحبؒ) میں گھبرایا۔ ہر چند سمجھایا مگر نہ ماننے، لہٰذا اپنے ساتھ ان کے گھر لے گیا، دستک دی، اس وقت مولوی صاحب کی عمر ۳ ۔ سال تھی، وہ دراز قامت اور نحیف تھے، ہماری آواز سن کر باہر تشریف لائے، جگر صاحب مدہوش تھے میں نے عرض کیا "حضور! جگر صاحب نہایت اصرار سے آپ کی خدمت میں آئے ہیں، میں اس حال میں لانا نہیں چاہتا تھا۔ مولوی صاحب قبلہ بہت شفقت سے پیش آئے، ہم اب گلیوں میں سے چل کر سڑک پر آ نکلے۔ جگر صاحب نے بیچ سڑک میں رو رو کر کہنا شروع کیا، میں ننگ اسلام اور ننگ دین ہوں، یہ کہکر ان کے قدموں کی طرف بڑھے، مولوی صاحب نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا، راہگیر ٹھٹھک کر رہ گئے، عجیب سماں تھا، جگر صاحب ان کا دامن پکڑ رہے تھے اور مولوی صاحب اپنے ضعف کی بنا پر جگر صاحب کی طرف جھکنے لگے تھے، میں یہ دیکھ کر کافی گھبرایا اور ہمت کرکے جگر صاحب کا ہاتھ دامن سے جدا کر دیا۔ جوں توں کرکے مسجد تک پہنچے، جگر صاحب کو گھر پہنچا کر میں مسجد آگیا۔ مولوی صاحب قبلہ نے ان کے بارے میں اپنے وہی پرانے نیک کلمات ادا فرمائے، ان کے ارشادات سے یہ صاف طور پر ظاہر ہوتا تھا کہ جگر صاحب کی شراب چھوٹ جائے گی۔ ان کی عمر کا آخری حصہ عالم ہوش میں گذرے گا اور انجام بخیر ہوگا۔

ایک دن میں مسجد جا رہا تھا، جگر صاحب ہمارے گھر مقیم تھے۔ کہنے لگے "بیٹے! حضرت سے میرا سلام عرض کرنا اور یہ پیچھ دینا۔"

میں لے لیا، جیسے ہی مسجد میں داخل ہوا جگر صاحب کا سلام اور پرچہ پیش کر دیا۔ بڑی خوشی سے لیا، چونکہ وضو کر کے بیٹھے تھے اور حشیہ حجرے میں تھا اس لئے اپنے ایک مرید مولوی سید نورالحسن صاحب عرف نوشہ میاں صاحب مرحوم کو جو سید ضیاالحسن صاحب ریٹائرڈ جج اودھ کورٹ کے بڑے بھائی تھے یہ کہکر دیا، مولوی صاحب اسے پڑھئے یہ جگر صاحب نے بھیجا ہے، پڑھا، اس میں یہ دو شعر درج تھے جو اسی وقت لکھکر دیئے گئے تھے۔

بظاہر گو نہ حسن و عشق کی تصویر دیکھیں گے ۔۔۔ وہ جب دیکھیں گے میری خاک دامنگیر دیکھیں گے

اب اس صورت سے کیا آئیں تیرے آئینہ خانے میں ۔۔۔ تری تصویر ہی بنکر تری تصویر دیکھیں گے

جب یہ شعر سنے تو مولوی صاحب قبلہ نے ایک زبردست نعرہ مارا، اس کے بعد مسرت کا اظہار کیا اور جگر صاحب کو دعائیں دیں، میں لوٹا تو جگر صاحب کو سارا حال سنا دیا وہ بہت مطمئن ہوئے (مولوی صاحب قبلہ اگرچہ بید نحیف تھے اور بعض وقت تو پاس بیٹھ کر بھی ان کی بات سننے میں دقت ہوتی تھی۔ لیکن جب نماز میں یا شعر سننے میں نعرہ لگاتے تو دل دہل جاتے، کبھی کبھی جمعہ کی نماز میں جامع مسجد میں نعرہ نکل جاتا تو کم از کم چار صفیں جس میں سات آٹھ سو آدمی ہوتے ہل جاتیں)

جگر صاحب نے ایک دفعہ سنایا کہ آگرہ میں ایک مشاعرہ تھا اس میں چوٹی کے شعراء جمع تھے وہاں ایک ان پڑھ کسگر آگیا اور کہا میں نے کچھ کہا ہے اور یہ شعر پڑھا۔

وہ مانوس خلش اے چارہ گر تلوؤں کے چھالے ہیں ۔۔۔ کہ پہروں پھوٹ کر روتے ہیں جب کانٹے نکالے ہیں

مشاعرہ ختم ہو گیا، ہر طرف سے واہ واہ کی صدا گونج اٹھی۔

اکثر فرمایا کرتے تھے کسی شخص سے روز تیس سال تک ملئے پھر بھی اجنبی رہئے اور کسی سے صرف ایک مرتبہ ملئے اور ساری زندگی تلاش کیجئے، آج بھی ان کی یہ بات اکثر یاد آتی ہے سبحان اللہ کیا بات کہی ہے۔ جگر صاحب کو فطری طور پر ہر چیز میں نفاست کا خیال رہتا۔ طبیعت میں چھل فریب نہ تھا، ہمہ وقت متبسم رہتے اور فریبیوں کے جان بوجھ کر دھوکے کھاتے اور مگن رہتے، سب کچھ سمجھتے مگر لب نہ ہلاتے کیا تحمل اور کیا سمائی تھی۔

جگر صاحب کے کام کے لئے ہم میں سے ہر ایک کمربستہ رہتا، ان کے رہنے سے مہمان داری کافی رہتی اور بے وقت بھی انتظامات کرنے پڑتے لیکن ان کی شخصیت اتنی محبوب اور پرکشش تھی کہ وہ ہمارے لئے خاندان کے ایک ہمدرد فرد کی حیثیت رکھتے تھے، اکثر کہا کرتے کہ میں نے سارے ہی ہندوستان کا سفر کیا اور بڑے بڑے لوگوں میں پُرتکلف کھانا کھایا لیکن بیوی کے ہاتھ کے کھانے میں جو مزہ پایا وہ بہت کم کہیں پایا۔ بیوی ہم اپنی والدہ صاحبہ کو کہتے ہیں، یہی چیز جگر صاحب لے اور مقامات پر میرے خود کے سامنے بھی کہی۔ جگر صاحب جب زیادہ پی لیتے تھے تو غذا تقریباً چھوٹ جاتی تھی۔ قلب پر تکلیف ہونے لگتی تو میری والدہ صاحبہ ان کے لئے دواء المسک بار بار بھیجتیں اس سے طبیعت سدھر جاتی۔

ایک دفعہ مراد آباد میں مسلم ہائی اسکول (حال مسلم کالج) کے سنٹرل ہال میں ایک جلسہ ہوا، جگر صاحب بھی مدعو تھے، پورا ہال بھرا ہوا تھا۔ میری بہن ستارہ بھی جس کی عمر اس وقت ۵ سال تھی، ان کے ہمراہ تھی۔ جگر صاحب کسی ہلے سے باہر گئے اور پی کر اندر آ بیٹھے، بوتل جیب سے باہر نظر آ رہی تھی۔ اتنے میں ستارہ کی نظر اس پر پڑ گئی۔ باوجود اپنی کم سنی اور معصومی کے وہ نہایت خاموشی اور ہوشیاری سے اسے اپنے پاؤں سے اندر کرنے میں لگی ہوئی تھی، لوگ یہ دیکھکر حیران رہ گئے کہ بچی کس طرح جگر صاحب کی پردہ پوشی کر رہی ہے۔

جگر صاحب جیسی وضعداری کے لوگ میں نے بہت ہی کم دیکھے ہیں، ان کو لوگوں کے نام یاد نہیں رہتے تھے اور یاد بھی کہاں تک رہتے،

ملنے والوں سے بڑے تپاک سے ملتے، اس طرح ملتے کہ کسی کو گمان بھی نہیں ہوتا تھا کہ نام بھول گئے ہیں۔ پھر جب ہم سوال کرتے کہ صاحب آپ نے فلاں صاحب کو پہچانا یا ان کا نام آپ جانتے ہیں، تو بیچارے ایک خاص انداز سے مسکرا دیتے۔ میں نے جگر صاحب کا نام کبھی بھی کسی شخص سے نہیں سنا، البتہ جگر صاحب ضرور رہے، ان سے عمر میں بڑے لوگ بھی ان سے ملے، لیکن کبھی کسی نے میرے سامنے ان کو نام سے نہیں پکارا، شروع شروع میں تو میں ان کا نام جگر ہی سمجھتا رہا۔

شراب کو مختلف ناموں سے یاد کرتے جن میں سے عام اور محبوب نام پریچم تھا۔ ایک دفعہ جگر صاحب کچھ ناراض ہو گئے، اور ایک غزل ہمارے محلّہ اور ہم سب پر لکھ ماری اور ستارہ کو سنائی اور جتنا یاد وہ بہت بڑا مانی، شاید مصرع یہ تھا۔

آج کل واسطہ سخت گنواروں کے ساتھ ہے

جگر صاحب سے دوسرے کی مدد کے سلسلہ میں جو بھی بن پڑتا، کرتے اور بھول جاتے، ان کے پاس جو بھی کسی سفارش کے لئے آتا، اس میں کمی نہ کرتے، لکھتے، خود جاتے اور کہتے،

مالی امداد سے ان کے مخالفین بھی محروم نہیں رہے۔ یہ میرے علم میں ہے، یہ وہ لوگ تھے جو ان کو بُرا جانتے، ان سے حسد کرتے اور پھر انہی سے پیسے بھی مانگتے۔ مروّت بلا کی تھی۔ چلنے میں نگاہیں ہمیشہ نیچی رہیں اور انداز سُبک رفتار، داد دینے میں کبھی بھی بخل سے کام نہیں لیا۔ ہم کئی ایسے مشاعروں میں شریک رہے جس میں چند ایسے لوگ بھی تھے جو ان سے بظاہر خوش لیکن دل میں خالف رہتے تھے۔

جگر صاحب، ساغر و مینا کے دور میں بھی گاہ بگاہ نماز روزہ کر لیا کرتے تھے۔ یہ کوئی پابندی سے نہ تھا۔ بلکہ گنڈے دار تھا لیکن بہرحال تھا۔

ایک شب قاضی شوکت باغ مراد آباد میں مشاعرہ ہوا۔ شوکت باغ ایک وسیع اور پرفضا باغ ہے اور اس کے وسط میں ایک کوٹھی ہے۔ اس کے کشادہ چبوترے پر بہت لوگ جمع تھے۔ جگر صاحب نے غزل پڑھی اور پھر کچھ .... انداز میں یہ بھی کہہ ڈالا کہ ہم تو اب بوڑھے ہوئے۔ چل چلاؤ کا وقت ہے، آپ نوجوان کام کریں۔ صبح کو جگر صاحب ہمارے گاؤں (نواب والی ملک) ہمارے والدین سے ملنے چلے گئے۔ دو ایک دن بعد جب میں کالج سے لوٹا تو ہمارے ایک عزیز جن کا نام منّن خاں تھا اور وہ جگت ماموں تھے، مجھ سے بولے، بیٹے، جگر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ میں نے پوچھا، کہاں سنا، بولے، سارے شہر میں اُڑ رہی ہے اور جلسے کی تیاری ہو رہی ہے، بہت سے لوگ ہمارے گھر بھی آئے، ہم نے کہا بھئی وہ تو گاؤں گئے ہیں جو یہاں سے ۱۲ میل دور سنبھل جانے والی پکی سڑک پر ہے، مگر وہ مُصر تھے کہ جناب ہم نے تو یہ سنا ہے اور وہ سنا ہے۔ ہمیں بھی کافی پریشان ہوا۔ غرض لیڈر، پاینیر اور دیگر اخبار میں بھی موت کی خبر آ گئی۔ عجیب تہلکہ مچا تھا۔ کچھ لوگ کار، گھوڑے کے تانگے اور سائیکلیں لیکر ہمارے گاؤں چل پڑے کہ راستہ میں اتفاقاً جگر صاحب اور میرے والد صاحب بیلوں کے تانگہ میں مراد آباد آتے ہوئے نظر پڑے۔ ان کو دیکھ کر حیران رہ گئے، جگر صاحب بھی اپنے متعلق وہ افواہ سنکر کچھ کم متعجب نہ ہوئے۔ یہ ان کے لئے تیسرا موقع تھا۔ شہر آئے لوگوں کو اطمینان ہوا، چند دن مراد آباد رہ کر دہلی پہنچے تعزیت کے خطوط ہمارے گھر آتے رہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے لیڈر یا پاینیر میں ۱۳ مئی ۱۹۳۶ء کو کچھ یا دو دن بعد یہ پڑھا DEAD POET SPEAKS ON RADIO (مردہ شاعر ریڈیو سے بولتا ہے) اتفاق سے اسی دن دہلی پہنچے کہ ریڈیو والے ان کی یاد میں ایک جلسہ کر رہے تھے، جگر صاحب کا ان کو بھی پتہ چل گیا۔ آئے اور اصرار کیا کہ وہ خود ہی اپنے بارے میں ریڈیو سے اعلان اور اظہار خیال کریں، لہٰذا انہوں نے ایسا ہی کیا۔

میں نے جگر صاحب کو تقریباً تیس سال دیکھا لیکن سر میں کبھی نہ دیکھا، کسی محفل یا مجلس میں برہنہ سر نہ پایا۔ سر پہ بیٹھے تھے۔ بالدار ٹوپی، شیروانی، آڑا پائجامہ اور عام طور پر پمپ پہنتے تھے۔ رنگ اگرچہ سیاہ تھا اور چہرہ پر ہلکا سا سفید دھبہ بھی تھا، گویا پہلے پکا ہوا جیسا چہرہ

تو نہ تھے اور بعض تو ان کو بد صورت ہی کہہ دیں گے، لیکن ان کے سراپے میں بے پناہ کشش اور جاذبیت تھی، دانت بہت اچھے تھے، خوب چمکدار اور جمے ہوئے اور کافی صاف رکھتے تھے۔ نمک اور سرسوں کے تیل سے صاف کرتے، یہ نسخہ انہی سے معلوم ہوا، جب ہنستے، دانت موتیوں کی مانند چمکتے گویا بلا مبالغہ سلکِ گہر تھے، آنکھیں نہایت پُرکشش تھیں، وہ مجسّم جاذبیت تھے۔

جگر صاحب کی بوتل ان کی صحت اور حالت دیکھتے ہوئے کبھی کبھی چھپا دی جاتی یا اس میں پانی ملا دیا جاتا تھا تو بےحد مضطرب رہتے اور سخت ناراض ہوتے۔ جب بوتل دی جاتی، گھونٹ لیتے، نہایت بُرا منہ بناتے اور کہتے، آپ لوگ میرے اتالیق ہیں، میرے حکیم اور طبیب ہیں۔ میرے مُصلح ہیں آپ؟ میں اس قسم کی لغویات ہرگز ہرگز برداشت نہیں کر سکتا ہوں، ایسی صورت میں ان کو بہلانے کی کوشش کی جاتی، کبھی بہل جاتے اور کبھی کوئی صاحب اپنے ساتھ لے جاتے اور پھر وہ ضد میں بہت سی پی کر آ جاتے، ویسے تو جگر صاحب کو راستوں کی شناخت نہ تھی لیکن شراب کی ہٹی کا پتہ ازبر تھا گویا کوئے خرابات کے مستند شناسا اور واقف تھے۔ کبھی کبھی نشہ میں "ہفت کیا بکتا ہے" کسی شاعرانہ بحث یا تعلّی آمیز موضوع سے متعلق کہہ دیا کرتے تھے۔ بعض مرتبہ ہوش میں بےمد ہوش نظر آتے اور افکار کی دنیا میں کھوئے رہتے، بڑے آدمیوں سے کبھی بھی مرعوب نہ ہوئے، کچھ باتیں تو اوروں نے لکھدی ہیں ایک کا ذکر میں کرتا ہوں،

ایک دفعہ ریاست ٹونک میں نواب سعادت علی خاں صاحب مرحوم کے دورِ حکومت میں چوٹی کے شاعر جمع تھے۔ جگر صاحب کے ہمراہ میرے والد صاحب اور بھائی صاحب بھی تھے۔ نوابوں اور معتبر لوگوں کے سامنے جانے کے کچھ آداب ہوتے ہیں جن کی رعایت اور ملحوظ رکھنا ضروری ہیں، مثلاً جھکنا جھکانا، نگاہیں فرش پر جمائے رکھنا، بُت کی طرح کھڑے رہنا، دم سادھ لینا، مجبوری اور بیچارگی کا پیکر بن جانا وغیرہ۔ سب لوگ آئے اور آداب بجا لانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی ٹھان لی، لیکن جگر صاحب آئے، اسلام کے بعد پُروقار انداز میں ایک جگہ جم گئے، نواب صاحب بھانپ گئے۔ جب پڑھنے کی باری آئی تو نواب صاحب نے فرمایا، جگر صاحب اپنی جگہ سے ہی پڑھیں گے، مخصوص جگہ پر آنے کی ضرورت نہیں ہے، مجلس برخاست ہونے کے بعد خود نواب صاحب نے بڑھ کر مصافحہ کیا اور بڑی محبت سے پیش آئے، جگر صاحب کافی متاثر ہوئے۔ وہاں بڑی عزت اور احترام سے رہے۔ اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ آتے اور بیٹھتے ہی جگر صاحب سے کچھ سنانے کی فرمائش کرتے، جگر صاحب ان کے اس طرزِ عمل کو دیکھ کر کبھی کبھی فرماتے، کیا آپ اس بات کا یقین دلا سکتے ہیں کہ آپ شعر سمجھتے بھی ہیں، لیکن پھر ان کی خاموشی اور بیچارگی دیکھ کر سنانے لگتے۔ جب جگر صاحب مراد آباد میں نکلتے تو لوگ ان کو دیکھنے کے لئے ٹھہر جاتے اور نہایت غور سے دیکھتے، اس وقت کان میں مختلف آوازیں آتیں، جگر صاحب، ارے جگر، جگر جگر، جگر صاحب کا انداز بھی خوب تھا، ٹوپی سے پٹھوں کی ایک لٹ نکلی ہوئی اور کاندھے پر شیروانی پڑی ہوئی چلے جا رہے ہیں، یہ عام طور سے نظر کی صورت میں دیکھا گیا ہے۔

ان کو گوشت کے علاوہ کریلے قیمہ، مغز، شامی کباب۔ گوشت کی ٹکیاں۔ سیخ کے کباب، اچار چٹنی، ارد کی دھوئی دال وغیرہ غذائیں بہت پسند تھیں۔ جگر صاحب ٹونک سے مراد آباد ہی واپس آ گئے۔ اب ان کو گورکھپور کا سفر درپیش تھا، جناب دیوانہ گورکھپوری کے یہاں شادی میں شریک ہونا تھا۔ ضعیف ہوتے جا رہے تھے اور ذرا کمزور ہو رہے تھے، لہٰذا ضروری تھا کہ کوئی ان کے ساتھ جائے۔ والد صاحب نے مجھے حکم دیا۔ میں نے عرض کیا، بسر و چشم، لیکن یہ تو بتائیے آپ تا جاری رکھیں گے میں ان سے کس طرح نبٹ سکوں گا، یہ کہا اور چپ ہو گیا۔ "تم میرے حوالے کرتے ہوئے چند ہدایات بھی دیدیں۔ لہٰذا میں بادلِ نخواستہ تیار ہو گیا، کیونکہ میں تو حکماً جا رہا تھا۔ جگر صاحب کے ٹرنک میں شراب کی بوتل تھی، چلنے سے پہلے اسے نکالا اس میں پانی ملایا اور رکھدی، اسٹیشن جانے کے لئے تانگہ آیا، گھر سے چل دیئے، راستہ میں کہیں شراب خانہ دیکھ لیا، مچل گئے، اترنے پر مُصر ہوئے بہت منت سماجت اور ٹرین نکل جانے کا اندیشہ ظاہر کر کے اسٹیشن تک لے آیا، مگر راستہ بھر بےچین رہے۔ گاڑی میں اوپر کی سیٹ پر بستر جما دیا اور لٹا دیا اب پھر یاد آئی، اصرار کیا کہ بکس سے نکال کر دیدو، آخر دیدی، منہ لگایا تو منہ بنایا اور بپھر گئے، جو جا ہا سنایا، مسافر دیکھ رہے تھے۔

اور سُست رہے تھے میں خاموش تھا میری حالت دیدنی تھی، بریلی کے قریب انجن کی خرابی کی بنا پر کئی گھنٹے ٹھہرنا پڑا، وہاں بھی جیسے تنگ کیا، وہی ایک سبق تھا، لاؤ شراب، گاڑی چلی، تھک کر سو رہے، ذرا جان میں جان آئی۔ لکھنؤ مغرب کے قریب آیا وہاں سے گاڑی تبدیل کرنی تھی، پلیٹ فارم سے باہر آئے ان کو شراب خانہ یاد آیا وہ مڑ گئے مچلنے اور اصرار کرنے کہ روپے نکالو، ہر چند سمجھایا مگر نہ ماننے، مجبوراً کچھ روپے دے دیئے، بدلے ابھی آیا، گئے خوب پی۔ اتنے میں میں نے گونڈہ والی گاڑی میں قلیوں سے سامان رکھوایا، تھوڑی دیر بعد ہاتھ میں کباب لئے جھومتے جھامتے چلے آئے، میرے لئے یہ تجربے نئے تھے، کافی گھبرایا اور پریشان ہوا، لیکن کیا کر سکتا تھا، ان کو اپنی سُدھ بدھ نہ تھی۔ جیسے تیسے قلیوں کی مدد سے سیٹ پر لٹایا، اسی ڈبہ میں چند سکھ بھی تھے وہ کچھ کسمسا رہے تھے اور برا مان رہے تھے میں نے ان سمجھایا، جگر صاحب کا حوالہ دیا تب کہیں وہ خاموش اور مطمئن ہوئے۔ صبح سویرے گاڑی گورکھپور پہنچی غالباً اطلاع نہیں دی تھی اسٹیشن پر کوئی لینے نہیں آیا تھا، ہم پلیٹ فارم کے باہر آگئے، فرمایا آم لاؤ، مالدہ آم لے کر دیدیا وہاں وہی تھا کھایا، کہا۔ لوٹا لاؤ، وہ بھی کسی سے لیکر دیدیا۔ فراغت پانے کے بعد اب دیوانہ صاحب کے مکان پر چلنے کا تقاضا، دیوانہ صاحب، جناب مجنوں گورکھپوری کے والد ہیں اور وہ میاں صاحب گورکھپور والے کے منبر تھے۔ غرض ہم منزل مقصود پر آ پہنچے، دروانہ پر دیوانہ اور ان کے صاحبزادہ مجنوں گورکھپوری نے ہم کو خوش آمدید کہا، جگر صاحب اور دیوانہ صاحب میں کچھ دیر گفتگو ہوئی اور پھر دور شروع ہو گیا۔ ساغر صاحب بھی وہاں مقیم تھے میں ان سے پہلے بھی مل چکا تھا۔ شادی میں شرکت کرلی، جگر صاحب کہنے لگے۔ میں گونڈہ جاؤں گا، عرض کیا بہت اچھا۔ دیوانہ صاحب ایک زمانہ میں علی گڑھ میں استاد بھی رہ چکے ہیں۔ اب وہ ساٹھ پینسٹھ کے تھے، پستہ قد، سر سپاٹ، اور دیگر دیوانوں کا جنگلا اور لمبی کھچڑی داڑھی، چہرہ اور آنکھیں چمکیلی اور جاذب، ہاتھ میں ایک نٹ کا ڈنڈا رہتا تھا۔ کافی پڑھے لکھے انسان نظر آئے۔ نہایت ظریف اور خوش طبع تھے، نماز کے ساتھ مے و مینا کا حق بھی خوب ادا کرتے تھے، وہاں ہم کئی دن رہے، مشرقی اضلاع میں چاول کا زور ذرا زیادہ ہے، روٹی ہوتی تھی، لیکن بس نام کے لئے، مجھے چاول مرغوب نہ تھا لہٰذا الجھتا تھا، کبھی کبھی جگر، جگروا، عابد، عبدوا اور گلاس، گلسوا بن کر کان میں پڑتا رہا۔ اس لہجہ میں کافی ترنم محسوس کرتا۔ ہاں تو دیوانہ صاحب کے دولت کدہ پر جگر صاحب کے مزے تھے، کیوں نہ ہوتے، اعلیٰ قسم کی بیئر ہیم سے سرفکار تھا۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وہاں ایک کمرے میں ساغر صاحب بھی رونق افروز تھے ماگرچہ کچھ بیمار تھے، مگر شغل مے جاری تھا، جگر صاحب سے بولے جگر صاحب آپ نے سنا سیماب صاحب نے آپ کو اپنا شاگرد بتایا ہے، اس وقت جگر صاحب دوسرے عالم میں تھے بلکہ نشہ میں چور تھے، بپھر گئے اور فرمایا، حضرت میں ان کی شاگردی اپنے لئے نسلی، خاندانی اور شاعرانہ توہین سمجھتا ہوں، میں نے یہ رنگ دیکھ کر ان کی توجہ اس طرف سے ہٹانا چاہی، تو ساغر صاحب نے فرمایا، آپ جواب لکھ دیں میں چھاپ دوں گا۔

جگر صاحب جب ہوش میں آئے تو میں نے ان کو سمجھا دیا اور وہ سمجھ گئے اب رات کو گونڈہ جانا تھا۔ جگر صاحب غرق مے اور میں عالم لاچاری میں محو تماشا، چونکہ میں ان کی اولاد کی جگہ تھا لہٰذا کب، کیسے کیسے اور کہاں تک ان کو ان کی محبوب چیز پر چھم سے جدا رکھتا۔ ساغر صاحب بھی ٹرین میں ساتھ تھے ان کو کہیں اور جانا تھا، میں نے جگر صاحب کو آرام سے لٹا دیا، ساغر صاحب نے دوسرا سلسلہ چھیڑ دیا گویا یکہ شدہ طور سے آپ کو کچھ نہیں ملتا۔ دراصل وہ اس معاملہ میں کچھ باتیں طے کرنا چاہتے تھے۔ جگر صاحب ایک تو بامروت اور پھر غافل، عجیب معاملہ تھا۔ میں پھر درمیان میں آگیا، او ران کو اس سلسلہ میں کوئی قول یا وعدہ دینے سے باز رکھا، اس کے بعد وہ سو گئے اور میں بھی اونگھ گیا، اتنے میں ایک جگہ گاڑی رکی، ہڑبونگ مچ گئی۔ گونڈہ آگیا، گونڈہ آگیا مسافر اترنے چڑھنے لگے۔ جگر صاحب کے کان میں بھی کہیں بھنک پڑ گئی، فوراً اتر گئے اور تقاضا کیا جلدی کرو، بستر لپیٹے تو سامان نکالنے میں کچھ دیر لگ گئی، گاڑی نے سیٹی دی اور رینگنے لگی میں چلتی گاڑی سے اترا مرتے مرتے بچا، خدا کا شکر ادا کیا اسٹیشن کے باہر آگئے، مجھے پتہ نہ تھا کہ کہاں جانا ہے۔ لہٰذا خود ہی گاڑی والے کو بتایا کہ خواجہ حامد علی صاحب کی کوٹھی پر چلو، یہ لکھنؤ کے خواجہ

خاندان کے ایک معزز فرد تھے۔ ہم ان کی کوٹھی پر صبح سویرے ہی پہنچ گئے۔ خواجہ صاحب سے میرا تعارف کرایا اور کہا، ان کو ناشتہ کرا دیجئے اور خود یہ کہکر کہ بیٹھے ابھی آیا، غائب ہو گئے، وہ تو چل دیئے اور ہم راہ دیکھا کئے۔ میں اس نئی جگہ اور اجنبی ماحول میں پریشان تھا مگر علاج؟ قید و بند بشر بجان درویش والا معاملہ تھا، صبر کیا، وہ تقریباً تین بجے دن تشریف لائے اور ایک عجیب انداز سے، گویا اس کے مصداق، آئے گا لیکن بانداز دگر آئے گا میں، بگھی میں لیٹے ہوئے ایک ٹانگ باہر نکلی ہوئی، شیروانی کہیں پڑی ہوئی اور خود عالم بالا کی نیرنگیوں میں گم، اس حال میں دیکھکر سب لوگ دوڑ پڑے، اتار لیا اور لے آئے، خواجہ صاحب کے بالمقابل کوٹھی میں ذوقی صاحب رہتے تھے، ان کا نام سنا تھا، اب ملاقات بھی ہو گئی، آدمی بڑے مہذب وضعدار و طرحدار و با ذوق نظر آئے، کئی سال بعد علی گڑھ یونیورسٹی میں بھی ملاقات ہوئی تھی، وہ وہاں اردو میں ایم اے کرنے آئے تھے۔ غرض انہی نے جگر صاحب کو اپنے گھر اتار لیا اور ان کی تیمارداری میں لگ گئے، میں بھی وہیں پہنچ گیا۔ جیسے ہی ذرا سنبھلے ہل من مزید، کا نعرہ بلند کیا، گویا سیرابی میں بھی تشنگی باقی تھی، جلوۂ پری چہرہ دل و دماغ پر مسلّط تھا اور سامرا رتھا،

ایک اضافہ ہی سہی طور کے افسانہ میں۔

ذوقی صاحب اگرچہ جگر صاحب کے مدّاح، دوست اور بہت ہی نزدیک تھے، لیکن بیچارے عقل و خرد کے غلام تھے۔ جگر صاحب کی صحت اور اپنے ماموں صاحب کی موجودگی کا خیال کرتے ہوئے منطقی دلائل میں زور باندھنے لگے، مگر کبھی ایسے وقت میں منطق ایاہج، خود بیکار، پند و نصائح بے سود، محبتیں بے آبرو، تعلقات نا استوار نظر آرہے تھے، بس ایک ہی صدا تھی۔ ایک ہی رٹ تھی۔ ایک ہی سبق تھا اور وہ یہ تھا:

میں یہ سب کچھ ہرگز نہیں سننا چاہتا ہوں، پری چہرہ لاؤ، نگاہوں میں وحشت، ابرو پر گرہ، ماتھے پر بل، چہرے پر غم و غصہ کیا کچھ نہ تھا، زبان بھی اس وقت اپنا حق ادا کئے بغیر نہ رہ سکی، مستقل اپنا کام کر رہی تھی، لیکن رکیک یا مبتذل الفاظ نہیں ڈھال رہی تھی۔

مگر واہ رے ذوقی صاحب! اپنے ارادہ سے نہ ہٹے ملکہ ٹس سے مس نہ ہوئے اور اس دن خوب خوب جگر صاحب کو اپنی بے ذوقی کا ثبوت دیا، جگر صاحب اصرار اور ذوقی صاحب انکار کرتے رہے، مکالمہ اور منظر نہایت دلچسپ تھا، ذوقی صاحب اسی دن رات کو ایک مختصر سی نشست کا انتظام کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ بھی اسی بحث و تمحیص کی نذر ہو کر رہ گئی۔ جگر صاحب تن گئے اور سارا پروگرام درہم برہم ہو گیا، لیکن ایک فائدہ ضرور رہا وہ یہ کہ جگر صاحب رات کو آرام سے سو سکے اور صبح کو تازہ دم ہو کر اپنی ایک بہت عزیز اور محبوب چیز یعنی سسرال در بہشت تک پہنچ سکے، میں بھی ساتھ تھا، وہ تھا تو اصغر صاحب کا دولت کدہ لیکن وہاں پر جگر صاحب کے خسر صاحب بھی رہتے تھے۔ جگر صاحب کی مطلقہ بیگم اب اصغر صاحب کی اہلیہ تھیں، انہی سے اصغر صاحب کی بچی بھی تھی جو اس وقت شادی کے قابل تھی اور جگر صاحب اس کو مثل اپنی ہی بچی کے سمجھتے تھے، اس گھر کو اپنا گھر جانتے تھے۔ اس بچی کی شادی کے سلسلہ میں گفتگو میں حصہ لیا۔ وہیں پر ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی جن کا نام سید حامد علی صاحب تھا، اس وقت ان کی عمر ستر پچہتر ہوگی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے داڑھی بڑی تھی اور مہندی لگاتے تھے۔ وہ جگر صاحب کے خسر رہ چکے تھے، اور اب اصغر صاحب کے تھے۔ جگر صاحب ان کے ساتھ نہایت ادب سے پیش آتے رہے۔ ان کی ہر بات پر لبیک کہتے رہے۔

اللہ رے فلک کج رفتار اپنی روش اور گردش زمانہ اپنے مسلک پر قائم ہیں اور رہیں گے، لیل و نہار بدلتے ہیں اور بدلتے رہیں گے، انسانی قافلے آتے رہیں گے اور جاتے رہیں گے اور یہ مصرع گنگناتے رہیں گے:

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

آج اسی کا مصداق جگر صاحب، وہ بچی اور سید حامد علی صاحب ہیں، انا للہ و انا الیہ راجعون" ان کی یادیں اور باتیں ہیں، اگر بندہ

کی تاریخ کچھ بھی ہو مگر ہمارے لئے تو وہ بہت ہی پیارا اور مقدس مقام ہے، وہ جگر صاحب کو عزیز تھا اور جگر صاحب ہم کو۔

اب جو نمٹے سے لکھنؤ کا تقاضہ تھا، بار بار یاد دلایا جا رہا تھا کہ لکھنؤ چلنا ہے، میں سنتا اور جواب دیتا، جی ہاں، چلنا ہے، غرض چل دیئے۔ لکھنؤ آگیا۔ بغیر اطلاع بھوپال ہاؤس پہنچ گئے، وہی ان کے محبوب اور محسن نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم والا بھوپال ہاؤس، میں نے وہاں پہنچ کر اندازہ کیا کہ جگر صاحب اس گھر کے افراد سے بہت ہی قریب ہیں، ہمارا تعارف کرایا گیا، کھانا کھایا اور اس کے بعد جگر صاحب نے روپیہ طلب کیا، مطلوبہ رقم تھوڑی سی حجت کے بعد دیدی گئی۔

حجت! یہ کیا؟ یہ اس لئے کہ پی کر سڑکوں پر نہ لڑکھڑائیں، صحت نہ گرے، اس وقت کچھ زیادہ نہ جھگڑے اور چلے گئے۔ شام کو خبر ملی کہ کسی دوست کے پاس ہیں اور خوب پی رہے ہیں، کہہ کر گئے تھے کہ بیٹا ابھی آتا ہوں بس لگ گئے اپنے کام میں، وہ وعدہ پر آتے بھی کیسے؟ کیونکر آتے؟ ان سے اس عالم میں یہ توقع رکھنا شاید بے جا ہی تھا، اس رات نہ لوٹے، صبح کو دس بجے کے قریب بڑے فاتحانہ انداز میں پلٹے، میں نے سلام کیا، حال پوچھا، جواب ملا، روپے نکالو، مجھے ابھی جانا ہے۔ میں نے دریافت کیا، کہاں؟ بولے بس جانا ہے۔ باتوں باتوں میں یہ بھی کہا، لکھنؤ کے بعد ایٹہ، مین پوری، علی گڈھ اور آگرہ کا پروگرام بھی ہے۔ اس پر تو میں خاموش رہا لیکن روپئے کے معاملہ میں ان کو جواب دیدیا اور کہا، آپ اپنی حالت تو دیکھئے، خود پر رحم کیجئے، اتنا سنکر بولے آپ میرے اتالیق ہیں آپ کو ان سب چیزوں کا کیا حق پہنچتا ہے؟ آپ میرا روپیہ لائیے میں کچھ نہیں سننا چاہتا، آپ کیوں آئے میرے ساتھ وغیرہ وغیرہ، اہل خانہ بھی موجود تھے مجھے بڑا غم اور ندامت ہوئی، میں نے بھی ساری رقم میز پر رکھدی اور حساب کا کاغذ ساتھ اور کہا، میری بلا سے آپ جہنم کے ٹھکے پیئں، میں واپس چلا، جگر صاحب پر اس وقت کچھ کچھ نشہ طاری تھا، لیکن جب میں نے سختی سے یہ سب کچھ کہا تو ان کا نشہ ہرن ہوگیا۔ ان کے چہرے پر آثار انفعال ظاہر ہونے لگے، وہ میرے بزرگ تھے اور میرے لئے باعث احترام، مگر میں چونکہ طبعاً الگ تھلگ رہنے والا اور خاموش قسم کا حساس انسان تھا، لہٰذا ان کی بعض باتیں سب کی موجودگی کی وجہ سے مجھے بری لگ گئیں۔ روپیہ دینے میں تامل محض ان کی صحت اور اپنے والد صاحب کے حکم اور ہدایت کی بنا پر تھا، رقم لے کر چلے گئے۔ میں عابد صاحب کو لیکر لانڈری گیا۔ بے دھلے کپڑے واپس لئے، پھر عابد صاحب یا کسی سے کچھ رقم مستعار لے کر اسٹیشن آگیا، پانچ چھ گھنٹے کے سفر کے بعد والدین کی خدمت میں بخیر و عافیت مراد آباد پہنچ گیا، سارا حال سنا دیا، پتہ چلا کہ جگر صاحب میری غیبت میں خوب پیتے رہے، اب ان کو صحیح آزادی ملی تھی، لکھنؤ کا خوب خوب حق ادا کیا، صحت خراب کرلی، ہم راہ دیکھتے اور جگر صاحب مراد آباد کا رُخ نہیں کرتے۔ مجھے بھی اس چیز سے کافی تکلیف تھی غرض کوئی دو تین ماہ بعد جگر صاحب ہمارے گھر آئے، میں حاضر ہوا بہت محبت سے پیش آئے۔ ہم میں سے کسی نے اس واقعہ کو بھول کر بھی نہیں دہرایا، وہ ہم لوگوں سے بیحد محبت کرتے تھے۔

جگر صاحب تنتے رہے جاتے رہے، ہنگامے ہوتے رہے، وہ دور کچھ ایسا تھا کہ ہر طرف ملک میں جگر صاحب کا طوطی بول رہا تھا، کیا شاعر کیا متشاعر کیا شعرخواں اور کیا آوازخواں، سب ہی تو جگر صاحب کے طرز میں شعر پڑھنے ان کی نقل کرنے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں نظر آرہے تھے، حتیٰ کہ تانگے والے بھی ان کی ایک پرانی غزل اسی لے میں ٹھمک ٹھمک پڑھتے تھے، غزل کا شعر ملاحظہ ہو۔

کیا چیز تھی کیا چیز تھی ظالم کی نظر میں
اُف کرکے وہیں بیٹھ گیا درد جگر بھی

گویا اصل شعر کی یوں گت بنائی جاتی تھی۔

کیا چیز تھی کیا چیز تھی جالم کی نجر بھی
اُف کرکے وہیں بیٹھ گیا درد جگر بھی

(بقیہ صفحہ ۶۲ پر)

ا۔ے۔ نقوی

شیشہ و سنگ

مسز صدیقی نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ مس قریشی کرسی کی پشت پر سر ٹکائے آنکھیں بند کئے تصورات کی دنیا میں گم تھیں۔ ایکسین صاحب کے یہاں ریڈیو پر فرمائشی پروگرام ہو رہا تھا۔ اس وقت آفس کی چھوٹی سی دنیا میں بڑا سکوت تھا اور ایسے میں لتا کی آواز بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ مسز صدیقی خاموشی سے مس قریشی کے چہرے پر فضا میں ابھرنے والے گیت کا ردعمل دیکھ رہی تھیں ــــ آج کوئی نئی بات نہ تھی۔ ہر روز یہی ہوتا جب آفس کے کلاک پر بارہ بجتے تو لنچ بریک شروع ہو جاتا۔ تھوڑی دیر کے لئے ٹائپ رائٹر کی کھٹ پٹ چپڑاسیوں کی فائلوں کے ساتھ گردش ختم ہو جاتی۔ فضا تھوڑی دیر کے لئے بڑی پرسکون ہو جاتی۔ ایکسین صاحب کی بیگم نہایت پابندی سے ریڈیو لگا دیتیں۔ اور وہ مس قریشی کی بند آنکھوں کے پیچھے کی دنیا کے متعلق سوچنے میں محو ہو جاتی۔ ہر گانا اپنا ایک الگ ردعمل ان کے چہرے پر چھوڑ جاتا اور وہ بڑے شوق سے انہیں تاثرات کو ان کے چہرے پر سے پڑھتی رہتیں۔ کبھی شدید کرب ان کی لرزتی پلکوں پر چھا جاتا۔ کبھی ہلکی سی پھیکی سی مسکراہٹ ان کے بے شک سے بے نیاز ہونٹوں پر جم سی جاتی۔ اور ــــ کبھی عجیب سی لطافت ان کے سارے چہرے پر چھا جاتی۔ بالکل وہی لطافت جو کسی فنکار کے چہرے پر فن کی گہرائی کو چھو لینے کے بعد پیدا ہوتی ہے ــــ مسز صدیقی پروگرام کی اس یکرنگی سے کبھی نہ اکتائیں بلکہ بڑے شوق سے وہ ان کے چہرے کو تکتی رہتیں گویا ان کا بند آنکھوں والا چہرہ ایک ایسا دلچسپ ناول تھا جس کا ہر باب ان کے لئے ہر روز ایک نئی کہانی پیش کرتا جس میں انوکھے خیالات جمع تھے۔ اور جو اس خشک زندگی سے ان کو کبھی بیزار نہ ہونے دیتے۔ کلرکوں کی خشک آنکھوں اور پچکے گالوں والے چہرے انہیں کبھی یہ سوچنے پر مجبور نہ کرتے کہ یہ دنیا مسکراہٹوں اور قہقہوں سے بھرپور بھی ہے۔ صرف فائلوں پر جھکے رہنا سگریٹ پھونکتے رہنا یا ہر آدھ گھنٹہ کے بعد چائے کی ایک پیالی حلق سے اتار لینا ہی زندگی نہیں ہے بلکہ دنیا میں کچھ اور بھی ہے۔ دنیا میں نغمے ہیں جو روح کی گہرائیوں کو چھو لیتے ہیں۔ رنگ ہیں جو قوس قزح بن کر آنکھوں میں چھا جاتے ہیں ــــ کبھی کبھی سگریٹوں کے غیر مختتم سلسلے اور چائے کی پے در پے پیالیوں کو دیکھ کر جو یہ خیال آتا تھا کہ یہ بیچارے سب کچھ یہاں گنوا کر گھر کیا خاک دیتے ہوں گے مس قریشی کے چہرہ پر نگاہ پڑتے ہی جانے کدھر غائب ہو جاتا اور نگاہوں کے سامنے صرف وہ معصوم سا چہرہ رہ جاتا جس پر آواز کا زیر و بم پرچھائیاں سی ڈالتا چلا جاتا۔

"مجھ کو اس رات کی تنہائی میں آواز نہ دو ــــ آواز نہ دو ــــ" مسز صدیقی نے فائل نکالنے کے لئے دراز کھینچا اور ان کا ہاتھ جہاں کا تہاں رہ گیا۔ ایک ہلکی سی آواز ابھری "داہ ــ!" اس کے بعد انہوں نے گہری سانس لی۔ چھت کی طرف دیکھا "ــ آواز نہ دو ــ آواز نہ دو!" کتنا سوز تھا ان کی آواز میں! مسز صدیقی کا دل ان کی نمناک آنکھوں کو دیکھ کر بیحد اداس ہو گیا۔ پہلے کی طرح اس وقت بھی ان کو اس مسافر کا خیال آیا جو کسی کٹھن راہ پر چلتے چلتے تھک کر کسی سائے دار درخت کی تلاش میں بھٹک رہا ہو اور اس ویرانے میں دور دور کسی خاردار جھاڑی نظر آنے کا بھی امکان نہ ہو۔ مسز صدیقی نے ڈرتے ڈرتے ان کی طرف دیکھا۔ گانا ختم ہو چکا تھا اور اب وہ انہیں بڑی گہری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ مسز صدیقی کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ گانا دوبارہ لگ گیا ہو "آواز نہ دو ــ آواز نہ دو ــ" اور یہ بول اب ان کی آنکھیں گا رہی

ہوں۔ یکایک انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر ان کے کندھے پر رکھ دیا اور ذرا سا جھک گئیں۔

" مسز صدیقی۔ آپ نے وہ گانا سنا ہے جس میں کچھ جانِ من جانانِ من ہے۔؟ " اب ان کے چہرے پر بے حد شگفتگی تھی۔ مسز صدیقی کو انجانی سی خوشی ہوئی کیونکہ حسبِ عادت جلدی ہی ان کا موڈ بدل گیا تھا۔

" نہیں۔ ! " مسز صدیقی نے بے حد آہستگی سے کہا۔ جانے کیوں انہیں افسوس ہوا کہ انہوں نے وہ گانا کیوں نہیں سنا۔

ان کے لاعلمی کے اظہار پر مس قریشی کو کچھ کوفت سی ہوئی۔ وہ ذہن پر کافی زور ڈالتی رہیں۔ مگر مصرعہ کا باقی حصہ نہ یاد آیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "جانِ من جانانِ من" گنگناتے ہوئے انہوں نے الماری سے تھرموس نکال کر چائے ڈالی۔ ایک پیالی ان کی طرف بڑھا کر دوسری انہوں نے ہونٹوں سے لگالی۔ چھوٹے چھوٹے گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے وہ کبھی کبھی پھر گنگنانے لگتیں۔ جانِ من جانانِ من۔"

لنچ بریک ختم ہو چکا تھا آس پاس کے کمروں میں زندگی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ کلاک کی سوئیاں مقررہ رفتار سے ایک دوسرے کے پیچھے چل رہی تھیں۔ مس قریشی بڑی بے زاری سے ایک فائل کے کاغذات الٹ پلٹ رہی تھیں۔ پاس کی گلی میں جیپ کی آواز آئی۔ انہوں نے کان لگا دیئے۔ "ایکسین صاحب آ گئے۔!" وہ معصوم بچوں کی طرح خوش ہو کر بولیں۔ مسز صدیقی نے ان کی طرف دیکھا ان کے چہرے پر بشاشت اور خلوص کی ہلکی سی سرخی تھی۔ آنکھوں میں عجیب سی خوشی۔!

کون ایکسین صاحب۔ ! " مسز صدیقی نے انجان بن کر پوچھا۔

" یہی۔ اپنے پڑوس والے۔ " ان کے لہجے میں بے حد اپنایت تھی۔ پھر وہ ایکسین صاحب اور ان کی بیگم کی کہانی سنانے لگیں۔ اور خود تو ابھی خاصی عمر کے ہیں مگر بیوی بے حد کمسن مگر ساتھ ہی بے حد خوبصورت۔ ایکسین صاحب مری میں اسپیشل ڈیوٹی پر لگا دیئے گئے تھے۔ جو پندرہ دن مری میں رہتے ہیں۔ پندرہ دن گھر پر۔ "سارے موسم گرما یہی چکر چلے گا"۔ ان کے لہجے میں بے حد افسردگی تھی۔

" پندرہ دن تو گھر پر رہتے ہیں نا۔ " مسز صدیقی نے بڑے سکون سے کہا۔

" اور باقی پندرہ دن۔ ! " انہوں نے مسز صدیقی کی طرف کچھ ایسی خشمگیں نگاہوں سے دیکھا کہ انہیں محسوس ہوا گویا ایکسین صاحب کی مری میں اسپیشل ڈیوٹی انہوں نے لگا دی ہو۔

" وہ بیچاری یہ دن کس طرح کاٹتی ہیں۔ معلوم ہے آپ کو۔ ! "

" مجھے کیا ضرورت معلوم کرنے کی۔ ! " مسز صدیقی صرف دل ہی دل میں کہہ سکیں۔ کچھ دیر تک مس قریشی بالکل چپ رہیں۔ غالباً ان کو مسز صدیقی کی بے حسی پر غصہ آ رہا تھا۔

" بڑی اچھی ہیں بیچاری۔ ! " مس قریشی نے پھر گفتگو کا آغاز کیا۔

" کل میں ان کے گھر گئی تو انہوں نے مجھے خوب آئس کریم کھلائی۔ ! شام کو ہم دونوں انگلش پکچر دیکھنے گئے۔ پکچر تو خیر یونہی سی تھی مگر وہ خوش ہو گئیں۔ ان کا کچھ وقت اچھا گذر گیا"۔ مسز صدیقی بدستور فائلوں پر جھکی ہوئی تھیں۔

" کسی دن آپ بھی چلئے نا ان کے یہاں۔ ! " ان کے لہجے میں بے حد اشتیاق تھا۔

" چلیں گی نا۔ ! " انہوں نے اصرار کیا۔

" مجھے نئے لوگوں سے ملنے کا کچھ ایسا شوق نہیں۔ ! " مسز صدیقی نے بڑی بد دماغی سے کہہ دیا۔ " اور پھر فرصت ہی کہاں ملتی ہے "۔ انہوں نے جلدی سے بات بنائی۔ جانے کیوں وہ ان کے جذبات مجروح نہیں کر سکتی تھیں۔

" مجھے۔ ! بڑی بور ہیں آپ۔ ! " مس قریشی بڑی بے تکلفی پر اتر آئیں۔

" پلیز — ! ابھی باس آجائیں گے —" مسز صدیقی نے انہیں خاموش کرانا چاہا کہ ان کی بیگم ایکسین نوازی سے سخت تنگ آچکی تھیں اس کے علاوہ کوئی کام مکمل ہوتا ہوا نظر نہیں آرہا تھا۔

" چھوڑیئے۔ باس کمبخت کو — اب تو جانے والا ہے"۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ "جانے نیا باس کیسا ہو — !" اندیشوں نے انہیں گھیر لیا اور وہ کچھ چپ چپ سی ہوگئیں — باس ان کی سستی اور لاپروائی سے چڑا رہتا اور وہ اس کے غیر ہمدرد ہونے پر نالاں رہتیں: "لوگ لیڈیز کی جانے کیا کچھ عزت کرتے ہیں اور ایک یہ کمبخت ہے۔ ذرا بھی تو لحاظ نہیں کرتا۔" وہ اکثر کہتیں — ٹھیک ہی تو کہتی ہیں — مسز صدیقی سوچتیں۔ "کبھی جان بوجھ کر کون لیٹ آتا ہے — !" وہ انہیں خاموش دیکھ کر کہتیں۔ "ایک تو صبح صبح اس قدر طبیعت خراب رہتی ہے کہ اٹھا ہی نہیں جاتا اور پھر اوپر سے سو کام۔ چھوٹی بیا کو تیار کرنا۔ ناشتہ کرنا۔ کنگھی کرنا — !" وہ بڑی بے زاری سے صبح کی مصروفیات کا ذکر کرنے لگتیں۔ "اور پھر بال کمبخت اتنے لمبے ہیں کہ کسی طرح سلجھنے کا نام نہیں لیتے — !" وہ پھر بالوں کا رونا لے بیٹھتیں۔

" آپ کے بال تو بے حد خوبصورت ہیں — !" مسز صدیقی ان کی دلجوئی کے لئے کہہ دیتیں۔

" ہوں — دوسروں کو تو خوبصورت لگتے ہیں مگر جس کو سنبھالنے پڑتے ہیں اس کو اس حسن کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔" وہ بڑی ناگواری سے کہتیں۔ وہ اللہ میاں کی اس بیجا سخاوت پر کبھی خوش نہ ہوئی تھیں — اور پھر ساری مصیبت ان بالوں ہی کی وجہ سے آتی تھی۔ بال بنانے میں دیر لگتی اور وہ آفس لیٹ آتیں پھر باس منحوس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔ "اسے کیا معلوم کہ عورتوں کو دفتر آنے تک کون کون سے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔" وہ سوالیہ نگاہوں سے مسز صدیقی کی طرف دیکھتیں۔

" واقعی —!" مسز صدیقی طویل خاموشی کے بعد کہہ دیتیں۔

" اللہ کرے یہ باس بھی چند دنوں کے لئے عورت بن جائے —" وہ جل کر بددعا دیتیں — اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑتیں۔

"کتنے معصوم خیالات ہیں — !" مسز صدیقی سوچتیں۔

ہر وقت وہ سائیکالوجی کے تھیوریز پر بحث کرتی رہتیں، ہر ایک کی عادتوں کا نفسیاتی جائزہ لیتیں۔ مگر خود اُن کے خیالات کس قدر ناپختہ تھے۔ مسز صدیقی بظاہر فائلوں پر جھکی ہوئیں مگر ان کا دماغ اس غیر آسودہ ذہن میں الجھا رہتا۔

" یہ لیجئے — !" مسز صدیقی خیالات کے تانے بانے سے نکلیں۔ مس قریشی کی ہتھیلی پر خوبصورت رنگین کاغذ میں لپٹی ہوئی ایک ٹافی تھی۔

" مس قریشی — ! یہ چیزیں تو بچوں کے کھانے کی ہیں — !"

" تو پھر بچے کے لئے رکھ لیجئے — !" مس قریشی نے بڑی برجستگی سے کہا۔ شکریہ کہہ کر مسز صدیقی نے پھر فائل کی طرف متوجہ ہونا چاہا۔ انہیں یہ احساس کھائے جا رہا تھا کہ کام ابھی تک کچھ نہیں ہوا۔ اور اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ ایسی پرخلوص ہستی کو منہ توڑ جواب دیں اور بے حسی سے کام میں جُٹ جائیں۔ مسز صدیقی نے یہ بات بھی ان کو بتانی مناسب نہ سمجھی کہ اس وقت وہ انہیں کے کاغذات مکمل کر رہی تھیں۔ ذرا دیر وہ کمرے میں اِدھر اُدھر پھرتی رہیں پھر الماری کا پٹ کھولے کھولے بولیں۔

" مسز صدیقی — !" مسز صدیقی نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

" کہئے — !" مسز صدیقی نے آہستہ سے کہا۔ اور انہوں نے دیکھا کہ وہ معصوم آنکھیں انہیں تک رہی تھیں — عجیب آنکھیں تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ان پر جلنیں سی پڑی ہوں۔ کبھی ایک اُٹھ جاتی۔ دوسری گر جاتی۔ ان میں عجیب متضاد کیفیات کا عکس نظر آتا۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ سارے زمانے کا دکھ ان کی آنکھوں میں سمٹ آیا ہو۔ کبھی ظلم و زیادتی کے خلاف نفرت کے شعلے بھڑکتے ہوئے محسوس ہوتے اور کبھی روح کی پاکیزگی ان شفاف آنکھوں سے مترشح ہوتی۔ کبھی کبھی ان میں ایسی کیفیت جھلکتی کہ دیکھنے والا اس بات پر مجبور ہو جاتا کہ اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دے — اس قدر

بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ان آنکھوں میں تھی کہ مسز صدیقی کی گرفت فائل پر ڈھیلی پڑ گئی۔

جواب میں مس قریشی نے گلابی موتیوں کی ایک لمبی سی مالا اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا دی۔

" دیکھئے۔ کیسا پیارا رنگ ہے۔!"

" بہت پیارا۔" مسز صدیقی نے بھی تعریف کر دی۔

دوسرے ہی لمحے موتیوں کی وہ مالا مسز صدیقی کے گلے میں پڑی ہوئی تھی۔ مس قریشی کے دمکتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر وہ بھی ہنس پڑیں۔

" یہ بتائیے۔ آپ کبھی کچھ پہنتی کیوں نہیں۔!" وہ ابھی تک ان کے گلے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

" مجھے پسند نہیں۔" مسز صدیقی نے مختصر سا جواب دیا۔

" آپ کو پسند نہیں۔ یا صدیقی صاحب کو پسند نہیں۔!" وہ بڑے انداز سے مسکرائیں۔

" چلئے۔ یوں ہی سمجھ لیجئے۔!" مسز صدیقی نے جھینپ کر کہا اور کام میں جٹ گئیں۔ مس قریشی الماری کو کھلا چھوڑ کر سیٹ پر آ بیٹھیں۔

" تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را۔ گر داغہائے سینہ را۔" وہ گنگنا رہی تھیں۔ آس پاس کے کمروں سے آتی ہوئی کھٹ پٹ کی آواز میں ان کی ہلکی مگر سریلی آواز مدغم ہوتی جا رہی تھی۔ شروع شروع میں جب وہ اس کمرے میں آئی تھیں تو کوئی کام نہیں کر سکتی تھیں مگر اب تو اس شور سے اس قدر مانوس ہو گئی تھیں کہ دوسرے کمروں میں عجیب سی وحشت اور ویرانی برستی ہوئی محسوس ہوتی۔

" تازہ خواہی داشتن۔ تازہ خواہی داشتن۔" اب وہ کمرے میں ٹہل ٹہل کر گنگنا رہی تھیں۔

" اس شعر کا مطلب کیا ہے۔!" مسز صدیقی نے ان کو محض گنگنانے سے باز رکھنے کے لئے سوال کیا۔

" ہائیں۔! آپ کو نہیں معلوم۔!" حیرت سے ان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

" مجھے فارسی نہیں آتی۔" مسز صدیقی نے کسی مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔

" اس کا مطلب۔" اور وہ بڑے پرجوش انداز میں مسز صدیقی کو شعر کا مطلب سمجھانے لگیں۔ پھر وہ اپنی بستی کی باتیں بتانے لگیں جہاں سارے بچے تالاب کے کنارے شام کے جھٹپٹے تک کھیلتے رہتے۔ جہاں آم کے باغوں میں برسات شروع ہوتے ہی جھولے پڑ جاتے۔ اور جہاں مارچ کے پہلے ہی ہفتے تمام فیملی ممبر صحن میں نکل آتے۔ اتنے بڑے صحن میں جس کا اب تصور بھی محال تھا۔ سب کی چارپائیاں لائنوں میں بچھ جاتیں اور پھر نومبر سے پہلے کوئی اندر نہ سوتا۔ شادی بیاہ، مرنے جینے کی رسموں کا بڑی دیر تک تذکرہ کرتی رہیں۔ مسز صدیقی نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں افسردگی کی کربناک لہریں تھیں۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے۔ "یادِ ماضی عذاب ہے یارب۔!" مسز صدیقی نے سوچا۔

کل جب بی اور مسز صدیقی باس کے آفس کی طرف چلدیں۔ مس قریشی بڑبڑا رہی تھیں کہ ان کی اسی اطاعت بازی نے تو باس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ ایسی ہی فرمانبرداری وہ ان سے وابستہ کر لیتا ہے اور پھر۔۔ وہ جانے کیا کچھ کہتی رہیں۔ مسز صدیقی جلدی سے باہر نکل گئیں۔

" آفس میں ایک نیا کلرک آیا ہے۔!" جب مسز صدیقی واپس آئیں تو انہوں نے یہ خبر سنائی۔

" آیا ہو گا۔!" مسز صدیقی کے لہجے کی لاپرواہی کو محسوس کر کے وہ اور بھی افسردہ ہو گئیں۔

" جانے کیوں بیچارہ اس آفس میں کلرک بننے آ گیا۔!" مس قریشی کے لہجے میں دکھ کے بے پناہ جذبات اُبھر آئے۔

" ہونہہ۔ روز کتنے ہی آتے جاتے رہتے ہیں۔" مسز صدیقی نے دل میں سوچا ہر ایک کے لئے انسان دل جلانے بیٹھ جائے تو بس۔!

" مسز صدیقی۔ اس قدر ینگ اور FRESH ہے کہ بس کیا بتاؤں۔!"

"بھلا۔ !" ان کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔

"بس ہوں گے کچھ ایسے ہی حالات۔ !" مسز صدیقی کچھ چڑ سی گئیں۔

"حالات۔ !" مس قریشی کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔ اور آنکھیں بھیگ گئیں۔

"ارے چھوڑیئے بھی، آج کل ساری دنیا اسی بحران سے گزر رہی ہے۔" مسز صدیقی نے کہا۔

"کچھ دنوں بعد سعید احمد کی طرح ہو جائے گا بیچارہ۔!" انہوں نے بڑے افسوس سے کچھ دیر بعد کہا۔

"سعید احمد کی طرح۔" مسز صدیقی زور سے ہنس پڑیں۔

مس قریشی نے بڑے دکھ سے مسز صدیقی کی طرف دیکھا۔

"نہیں ہنسئے۔" ان کے لہجے میں لجاجت سی تھی۔

"خدا کی قسم۔ میں تو تشبیہ کے اس نرالے انداز پر ہنسی ہوں۔" مسز صدیقی نے صفائی پیش کرنا چاہی۔

"معلوم ہے۔ صابر۔ میرا بھائی اسی عمر کا ہو گا۔ کالج میں تھرڈ ایئر میں پڑھ رہا ہے۔" مس قریشی نے جلدی سے کہا۔ آپ دیکھیں گی تو آپ کو پتہ چلے گا۔ کس قدر صحت مند ہے۔ ٹھہریئے ابھی میں اسے بلاتی ہوں۔" ذرا دیر بعد ہاتھ میں کاغذ لہراتا ہوا ریاض احمد دروازے پر کھڑا تھا۔

"آؤ بھئی آؤ۔" مس قریشی نے بید مشفقانہ انداز میں اسے اندر بلا لیا۔ ایک نظر مسز صدیقی کی طرف ڈال کر وہ ریاض احمد کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

مسز صدیقی کو ان کی یہ بے نیازی بہت کھلی۔ "بھئی یہ کیا بات ہوئی۔" مگر وہ چپ رہیں۔

مس قریشی نہایت سنجیدگی سے انگلیوں کے اشارے سے اسے کچھ سمجھاتی رہیں۔ مسز صدیقی نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ ان کی نگاہیں بار بار اس کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی ماں حیرت اور حسرت سے اپنے جوان بیٹے کو دیکھے۔ جانے کب ریاض احمد کمرے سے نکل گیا۔ مسز صدیقی بڑی دلچسپی اور محویت سے انہیں تکتی رہیں اور سوچتی رہیں کہ آخر ان ہمدردیوں، خلوص اور دلچسپیوں کا پس منظر کیا ہو گا۔!

گرمیاں ختم ہو چکی تھیں اب مس قریشی تھرموس میں چائے لانے کے بجائے آفس ہی میں ہیٹر پر گرم گرم کافی بناتیں۔ ان کے ہاتھوں کی بنی ہوئی کافی مسز صدیقی کو بید مزا دیتی۔ وہ بڑے خلوص اور انہماک سے کافی بناتیں۔ الیکسین صاحب بھی اب اسپیشل ڈیوٹی پر نہیں جاتے تھے مستقل طور پر وہ اب گھر ہی پر رہتے۔ مس قریشی کو بیگم الیکسین کی تنہائی کی طرف سے جو خواہ مخواہ کی پریشانی لاحق تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔ ان کے یہاں اب فرمائشی پروگرام کے بعد باقاعدہ اردو میں پھر انگریزی میں خبریں سنی جاتیں۔ بیگم الیکسین کو پکچر دکھالانے گھنٹوں ان کو باتوں میں معروف رکھنے کی ڈیوٹی اب ان کی ختم ہو چکی تھی۔ الیکسین صاحب بھی بڑی فرمانبرداری سے آفس سے سیدھے گھر آجاتے۔ جیپ کی آواز پر مس قریشی چونکتی ضرور مگر پھر بڑی پُرسکون سی ہو کر دہکتے ہوئے ہیٹر کو دیکھنے لگتیں۔ بجلی کی حدت کی سرخی ان کی آنکھوں میں تیرنے لگتی۔ پانی جانے کب تک ابلتا رہتا اور بے پرواہ سی بیٹھی ہیٹر کو تکتی رہتیں۔ بیگم الیکسین کی طرف سے بے فکری نے ریاض احمد کے غم کو شدید کر دیا تھا۔ یہ عمر کلرک بننے کے لئے بالکل موزوں نہ تھی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ "تندرست شانے یوں جھکے جھکے باڈی کو خراب کر دیتے ہیں۔ پھیپھڑوں پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔" وہ اکثر کہتیں۔ ٹائپ رائٹر کی KEYS جونکیں بنکر انگلیوں سے سارا خون چوس لیتی ہیں اور پھر۔ !" مس قریشی ایکدم سے بیحد اداس ہو جاتیں۔ "پھر۔ کھوکھلے جسم والا ریاض احمد ایک دن کسی سینیٹوریم ہی جا لیٹے گا جہاں نہ باس کام آئے گا نہ ہم لوگ۔ اور نہ ہی اس کے رشتہ دار۔ !" ان کی آواز گھٹ سی جاتی اور وہ ایکدم سے خاموش ہو جاتیں۔ حالانکہ مسز صدیقی دیکھ رہی تھیں کہ ریاض ابھی تک ویسے کا ویسا شگفتہ تھا اور بقول مس قریشی فریش تھا۔ البتہ وہ خود اس کے غم میں گھلی جا رہی تھیں۔

باہر زور کی بارش ہو رہی تھی۔ مس قریشی کافی کا خوب لطف لے رہی تھیں۔

"آج کتنی اچھی کافی بنی ہے۔ !" مس قریشی نے سوالیہ نگاہیں مسز صدیقی کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

"آپ کے ہاتھوں کو اللہ میاں نے صرف کاتی کے لئے بنایا ہے۔" مسز صدیقی نے بھی تعریف کر ڈالی۔

"مس قریشی اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر آنکھوں کے قریب لائیں۔ اور زیر لب کہا۔

"واقعی۔! ویسے میرے ہاتھوں میں لچک بھی ہے۔ میری انگلیاں مخروطی ہیں۔" انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر مسز صدیقی کے سامنے رکھ دئے۔ "ایسے ہاتھ ٹائپ بہت اچھا کر سکتے ہیں۔ کشیدہ کاری کے لئے بیحد موزوں ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میری انگلیاں پتلی ہیں کسی کے سر میں تیل ڈال دوں تو وہ بیحد سکون محسوس کرے۔ اس کے علاوہ میرے پوروں میں ایک خاص طرح کی نرمی ہے۔" انہوں نے پیار سے انگلیوں کے پوروں کی طرف دیکھا۔ "چھوٹے بچّوں کو ذرا بھی تھپکوں تو جھٹ سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ جب بھائی جان کے بچّے آجاتے ہیں تو میرے سوا کسی سے نہیں سوتے۔"

اس کے بعد وہ یکایک چپ ہو گئیں جیسے اب کہنے کے لئے کچھ نہ رہ گیا ہو۔ مسز صدیقی کو کمرے میں ایک بے کراں سناٹے کا سا احساس ہوا۔ انہوں نے خاموشی سے ایک نگاہ مس قریشی پر ڈالی جہاں آنکھوں کے گوشوں میں شکنیں ابھر آئی تھیں اور پیشانی پر کئی لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔ قرینے سے بنے ہوئے بالوں میں سفید ریشم کے تار پیوستہ سے معلوم ہوئے۔ بے ارادہ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور نہ معلوم کیوں سوچا کہ اس لڑکی کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ اور انہوں نے دل سے دعا کی کہ انجینئر صاحب کے ریڈیو پر کوئی نغمہ ابھرے یا پھر ریاض احمد ہی اندر آجائے تاکہ اس تکلیف دہ سناٹے سے چھٹکارا ملے۔

ذرا رک کر انہوں نے مس قریشی کا دھیان بٹانے کے لئے ایک فائل ان کے سامنے کر دی۔

"مس قریشی ذرا اسے تو دیکھئے۔!"

مس قریشی چند منٹ تک فائل کو لاپرواہی سے دیکھتی رہیں اور پھر سر اٹھایا۔

"کتنی سردی ہے مسز صدیقی۔!"

"دوسرا ہیٹر بھی لگا دوں۔!" مسز صدیقی نے پوچھا۔

"ارے نہیں۔!" مس قریشی نے جلدی سے کہا۔ "میں یہ کہہ رہی ہوں کہ ہم اندر بیٹھے ہیں تب یہ حال ہے۔ وہ بیچارا ریاض احمد باہر سکڑ رہا ہوگا۔"

"نہیں بھئی۔ وہ بھی کمرے میں ہے۔" مسز صدیقی ہنسیں۔

"اس کے پاس گرم کپڑے جو نہیں ہیں۔ اتنی سردی میں بیچارہ ٹھنڈا کوٹ پہن کر آتا ہے۔ سوئٹر بھی شاید نہیں ہے۔" مس قریشی نے بڑی سنجیدگی سے مسز صدیقی کی طرف دیکھا۔

"ہاں شاید۔!" مسز صدیقی نے آہستہ سے کہا۔

"اگر اسے ایک سوئٹر بُن دیا جائے تو۔!" مس قریشی نے سوالیہ نگاہیں مسز صدیقی کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

مسز صدیقی نے بڑی فراخدلی سے کہا۔ "نیکی اور پوچھ پوچھ۔ آج شام کو اون لے آئیے اور بسم اللہ کر دیجئے۔ بھئی میرے پیچھے تو بچوں کی ایک آفت لگی ہوئی ہے۔ سب کے لئے ایک ایک بھی بنوں تو موسم گزر جاتا ہے۔" مسز صدیقی نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنی جان بچالی۔

کام مکمل کرنے کی عادت تو ان کی نہ تھی۔ مگر جب وہ تین دن کی چھٹی گزار کر آئیں تو ان کی باسکٹ میں چوزے جیسے رنگ کا پورا آستین کا سوئٹر تیار تھا۔ اور ریاض احمد کو سوئٹر پہنے دیکھ کر ان کا تمام دن بیحد موڈ اچھا رہا۔ "بالکل میرے چھوٹے بھائی جیسا ہے۔ معلوم ہے آپ کو۔ ایک لفظ بھی شکریہ کا نہ کہہ سکا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔! بالکل میرے بھائی کی طرح عادتیں ہیں۔" انہوں نے پھر دہرایا۔ مسز صدیقی نے ان کے چہرے پر بچّوں کی سی معصوم خوشی دیکھی اور ان کی انسان دوستی سے دل ہی دل میں متاثر ہوئیں۔

ایک دن مطلع ابرآلود تھا۔ وہ گرم کوٹ پر شال اوڑھے گلے اور کانوں کو مفلر میں لپیٹے، دستانے چڑھائے کمرے میں داخل ہوئیں۔ مسز صدیقی نے لکھتے لکھتے قلم رکھ دیا۔ "السلام علیکم۔۔!"

"وعلیکم۔" ان کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔ اپنی ٹوکری انہوں نے انتہائی بیزاری سے زمین پر پٹخی اور بیگ زور سے زمین پر۔ دھم سے کرسی پر بیٹھ گئیں۔ مسز صدیقی نے کام کی زیادتی کے پیش نظر کوئی سوال نہ کیا۔ اور پھر سر جھکا کر فائل میں غرق ہو گئیں۔ یوں بھی انہیں معلوم تھا کہ وہ خود سب کچھ ذرا دیر میں بتا دیں گی۔۔ مگر کافی دیر گزرنے پر بھی کسی قسم کی تحریک نہ ہوئی تو مجبوراً ان کو سر اٹھا کر دیکھنا پڑا۔ مس قریشی دونوں ہاتھوں میں سر تھامے کرسی پر سر جھکائے بیٹھی زمین کو گھور رہی تھیں۔

خیریت تو ہے۔۔!" مسز صدیقی نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "میرا تو خیال تھا آج آپ نہیں آئیں گی۔" مسز صدیقی نے کلائی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ساڑھے نو تو ہو چکے ہیں۔"

"اور آج ریاض احمد بھی تو نہیں آیا۔۔!" مسز صدیقی نے مسکرا کر کہا۔

"گولی ماریئے ریاض کو۔۔!"

مسز صدیقی حیران ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

"مسز صدیقی۔ ! میرا دماغ پھٹا جا رہا ہے۔" انہوں نے سر پر اپنے ہاتھوں کی گرفت اور سخت کر دی۔۔ اور تھوڑی دیر بعد سر اٹھایا۔

"مسز صدیقی۔ ! دنیا کو آخر ہو کیا گیا ہے۔ ! آج بھی لوگ وہیں ہیں جہاں بیس برس پہلے تھے۔۔ یہ حالات بدلتے کیوں نہیں۔۔!" مسز صدیقی کچھ نہ سمجھتے ہوئے خاموش رہیں۔

"اس کو سمجھاؤں یا ان کو سمجھاؤں۔۔ آپ ہی بتائیے۔۔!"

"کس کو۔۔!" مسز صدیقی نے کھسیانے پن سے پوچھا۔ اور دل میں سوچا کہ بھی کوئی اور دورہ پڑا۔

"وہی سیما۔ جس کو اس دن میں آفس ساتھ لائی تھی۔۔ اس کمبخت نے رو رو کر برا حال کر لیا ہے۔ ماں باپ ایک دوسرے سے لڑتے ہیں اور بدلے بچی سے لیتے ہیں۔ عجب مصیبت ہے۔۔!"

"آخر ہوا کیا۔!" مسز صدیقی نے دبی زبان سے پوچھا۔

"ہوا کیا۔ لڑکی کو بالکل قیدی بنا رکھا ہے' نہ خود کہیں جائیں نہ کسی کو گھر میں آنے دیں۔۔ یہ سارے ماں باپ جانے کیوں ایک ہی طریقے سے سوچتے ہیں۔" انہوں نے بڑی بے زاری سے کہا۔

"گھر میں پڑے سڑتے رہو۔ گھر میں کوئی رشتہ دار آ جائے تو اماں ابا بڑے فضیحتے کرتے ہیں فلاں کیوں گھر میں آیا۔ فلاں کیوں آیا۔ ان لوگوں کی ذہنیتیں پتہ نہیں کب بدلیں گی۔ ہمارے ابا نے بھی یہی کیا ادھر کسی نے گھر میں قدم رکھا ادھر انہوں نے اس کی ٹانگ لی۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ تمام اپنے بیگانے ہوتے چلے گئے۔ ہمارے اپنوں میں ہم کو اب کوئی پہچانتا تک نہیں۔۔"

"بیچاری سیما۔" ! انہوں نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"اور کچھ دنوں بعد یہ ہوگا کہ تمام دنیا اسے فراموش کر دے گی۔ والدین جو اس کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں زندگی کی راہوں میں اسے بالکل اکیلا چھوڑ دیں گے۔ تمام رشتہ دار جو اتنی محبت اور پیار سے اس کی طرف لپکتے ہیں۔ بالکل آنکھیں پھیر لیں گے۔۔ اور زندگی کے لق و دق صحرا میں سپاٹ اور سنسان راستوں پر وہ اکیلی چلی جا رہی ہوگی۔۔"

ان کا لہجہ اتنا تلخ تھا کہ مسز صدیقی کے دل کو دھچکا سا لگا۔ مسز صدیقی کی نگاہ دریا سے ہٹ کر باہر کھڑکی کی طرف گئی۔ جہاں سیاہ بادل جھکے کھڑے تھے۔

انہیں ایسا محسوس ہوا کہ دور کی بلند پہاڑی کی چوٹی پر مس قریشی کھڑی ہوں ۔ بالکل تن تنہا ۔ کسی سائبان کے بغیر ۔ موسلا دھار بارش سے بچنے کے لئے کوئی بھی پناہ گاہ تو نہ تھی کوئی سایہ دار درخت نہ تھا ۔ مسز صدیقی سر سے پاؤں تک کانپ اٹھیں ۔ ان کا دل چاہا کہ وہ مس قریشی کے جھکے ہوئے سر کو سینے سے لگا کر انہیں تسلی دیں ۔ لیکن وہ چپ چاپ ان کے پاس کھڑی رہیں ۔ کتنے ہی لمحے دبے پاؤں سرک گئے ۔ "بات یہ ہے مس قریشی ۔ کہ آج کل زمانہ بیحد خراب ہے ۔ ماں باپ حالات کو سمجھتے ہوئے اتنی پابندیاں لگا دیتے ہیں ۔" مسز صدیقی نے طویل خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا مگر مس قریشی تو خیالات کی جانے کن گہرائیوں میں کھوئی ہوئی تھیں ۔

" جناب ۔ ! یہ کزن وزن بڑی خراب قوم ہوتی ہے ۔" مسز صدیقی نے بڑی شگفتگی سے کہا ۔ وہ ان کی اس قدر سنجیدگی سے گھبرائی ہوئی جا رہی تھیں ۔" کوئی بھی نہیں ۔" مس قریشی خیالات کے تانے بانے سے نکلیں ۔

" سچ ۔ !" مسز صدیقی نے ان کی اداس آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور مسکرائیں ۔

" سب اپنا اچھا برا سمجھتے ہیں ۔" مس قریشی نے بدستور دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔

" پندرہ سال پہلے آپ کچھ بھی نہ سمجھتی ہوں گی ۔ !" مسز صدیقی ان کو قائل کرنے پر تلی ہوئی تھیں ۔

" نہیں جناب ۔ ! میں پہلے بھی سب کچھ سمجھتی تھی ۔" مس قریشی نے بڑی برجستگی سے کہا ۔

مسز صدیقی نے غور سے ان کی طرف دیکھا ۔ انہیں یوں لگا گویا ان کی آنکھیں بالکل خشک ہوں اور ان میں ناکام اور تشنہ تکمیل آرزوؤں کی راکھ ہو ۔

" سب لڑکیاں آپ جیسی تو نہیں ہوتیں نا ۔ !" مسز صدیقی ان کے پاکیزہ اخلاق اور بلند کرداری کی بے حد مداح تھیں ۔

" یہ بات نہیں مسز صدیقی ۔ !" انہوں نے بڑی گہری نگاہوں سے مسز صدیقی کی طرف دیکھا ۔

" میں آپ کو سائیکالوجی کی کتابیں لا کر دوں گی آپ پڑھیئے گا تو آپ کو معلوم ہوگا کہ پس پردہ کون سے حالات ہوتے ہیں جو ماحول سے بغاوت کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں ۔ ناسازگار حالات طبیعت میں موجودہ حالات سے بیزاری اور ایک نئے ماحول کو اپنانے کی شدید خواہش پیدا کر دیتے ہیں ۔ اور یہی طبیعت کی تیزی اور روانی ہر بند کو توڑ دیتی ہے ۔"

" یہ تو ٹھیک ہے ۔ !" جب بھی مس قریشی نفسیاتی نکتوں پر اتر آتیں مسز صدیقی ہتھیار ڈال دیتیں ۔

سائیکالوجی کی مختلف تھیوریز پر روشنی ڈالنے کے بعد اب وہ اپنے کزن کی باتیں کر رہی تھیں جن کو انہوں نے کبھی نہ دیکھا تھا ۔۔۔ بڑی خالہ کے تین لڑکے تھے ۔ ایک انجینئر ۔ دوسرا ڈاکٹر اور تیسرا جانے کیا تھا ۔ اس کے متعلق کچھ اچھی طرح انہیں معلوم نہ تھا ۔ انہوں نے اس کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ مسز صدیقی کے پپو کے برابر تھا ۔ چچا ابا کا بڑا لڑکا بال بچوں سمیت بستی ہی میں رہ گیا تھا ۔ چھوٹا پاکستان آ گیا تھا جو لاہور میں کسی مضمون میں ریسرچ کر رہا تھا ۔ اماں کی طبیعت کی تیزی نے کبھی کسی کزن کو ملنے ہی نہیں دیا تھا ۔ اب تو وہ اتنی سختی نہیں کرتی تھیں ۔ مگر دلوں کے درمیان جو دوری آ گئی تھی اس کا دور کرنا بیحد مشکل تھا ۔ اب تو خود ہی کوئی ادھر کا رخ نہ کرتا تھا ۔ ابا بیچارے بھی عمر بھر کسی رشتہ دار کا منہ نہ دیکھ سکے ۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ ایک دفعہ ایک دھان پان سی کوئی رشتہ کی خالہ ان کے گھر مہمان بن کر آ گئیں ۔ وہ بیچاری تو اماں کے تیور ہی دیکھ کر زیادہ دن نہ ٹھہریں مگر ابا کو آخری سانسوں تک خوب جلی کٹی سننا پڑیں ۔

ابا کی بے بسی کی زندگی یاد کر کے ان کی آنکھیں نم ہوئی جا رہی تھیں جنہوں نے سارے رشتہ داروں کو ایک اماں کی خاطر تج دیا تھا مگر اماں پھر بھی ان سے کبھی خوش نہ ہوئی تھیں ۔ ان باتوں کو یاد کر کے وہ بے حد اداس ہو رہی تھیں ۔

" آپ نے کام ختم کر لیا ۔ !" مسز صدیقی نے بے تکے پن سے سوال کیا ۔ مس قریشی کو ماضی کے ویرانوں میں بھٹکتا دیکھ کر ان کا دل بری طرح کڑھ رہا تھا ۔ جواب میں مس قریشی نے صرف نفی میں سر ہلا دیا ۔ اور گم سم کتنی دیر بیٹھی رہیں ۔

مسز صدیقی نے بڑی فکرمندی سے مس قریشی کی خالی سیٹ کی طرف دیکھا اور جھنجھلا گئیں۔ انہیں خواہ مخواہ کی کوفت ہو رہی تھی۔ مس قریشی بیگم ایکسین کے یہاں پڈنگ بنانے کی ترکیب سیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ وہ بے غمی سے وہاں بیٹھی ہوں گی اور مسز صدیقی کے دل میں ہول اٹھ رہا تھا کہ اس کو نہ پتہ چل جائے۔

"ہنھ — مجھے کیا۔" مسز صدیقی کو اپنی پریشانی پر خواہ مخواہ کوفت ہو رہی تھی۔ آج کل وہ انگریزی اور روسی ناولوں کے بجائے "رشیدہ کی کشیدہ کاری" "عصمتی دسترخوان" — اور جانے کاہے کی ہینڈ بک — جیسی کتابوں میں کھوئی رہتیں حالانکہ انہیں ہمیشہ ایسے کاموں سے نفرت رہی۔ مگر آج کل تو رنگ برنگ کے کھانے کی ترکیبیں لکھتی رہتیں۔ تکیہ غلافوں اور رومالوں کے پھول ٹریس کرتی رہتیں۔ بات دراصل یہ تھی کہ کوئٹہ والی پھوپھی کا منجھلا لڑکا — ارشد آیا ہوا تھا۔ وہ نفسیات میں ایم۔ اے کا امتحان پرائیویٹ دینے آیا تھا۔ مس قریشی کو اس کے باذوق ہونے پر کامل یقین تھا — کیونکہ اور مضامین تو ان کے خیال میں بکواس تھے۔ "بس یہی ایک مضمون ایسا ہے جو ہر باذوق شخص پڑھتا ہے۔" وہ اکثر کہتیں۔

اس کے آنے کے بعد سے وہ عملی اور خیالی طور پر اتنی مصروف ہو گئی تھیں کہ ان کا ذہن باقی تمام غموں سے نجات پا گیا تھا۔ اب ان کو بیگم ایکسین کا غم نہ ستاتا حالانکہ ایکسین صاحب پھر مری میں اسپیشل ڈیوٹی پر لگا دیئے گئے تھے۔ ریاض احمد اب سکنڈ شفٹ میں بھی کام کرنے لگا تھا۔ اور واقعی اس کی رنگت کی سرخی کو کوئی غیر مرئی شے جذب کرتی جا رہی تھی۔ سفید شلجم کا سا پھیکا پن اس کے چہرے پر آتا جا رہا تھا۔ مگر اسے ڈانٹ دیتے ہوئے مس قریشی انہیں اب نہ ٹوکتیں — "پلیز — اسے زیادہ کام نہ دیا کریں" — مسز صدیقی اسے جان بوجھ کر زیادہ کام دیتیں۔ مگر وہ بڑی بے غمی سے بیٹھی رہتیں — نئے باس کی سرخ آنکھیں انھیں اب نہ پریشان کرتیں۔ آج کل تو ان کا دل و دماغ میں گھر کی سجاوٹ۔ پردوں کے ڈیزائن ہرا ابلا کی پڈنگ پکانے۔ مچھلی کے شامی کباب بنانے میں الجھا رہتا تھا۔ مدتوں کے بعد کوئی رشتہ دار مہمان بن کر آیا تھا۔ مہمان بھی کیسا۔ بیحد خوش مذاق باذوق۔ ہنس مکھ اور سب سے بڑھ کر نفسیات کا طالب علم — کوئٹہ سے انگلی کے پوروں جیسے لمبے لمبے پستے لایا۔ کسی کی آنکھوں جیسے بادام — ایسی بڑی بڑی کشمش جو ایسی خوش ذائقہ اور خوش نما تھیں کہ دیکھ کر بھی دل خوش ہو۔ مسز صدیقی کو ایکدم سے صدیقی صاحب کا خیال آ گیا جو کبھی کوئی ڈھنگ کی چیز نہ لاتے۔ پچھلی دفعہ جب پشاور گئے تو پتہ نہیں فضل ربانی کہ فضل سبحانی جانے کون سے آلوچہ لائے۔ اور تعریفیں میں زمین آسمان کے قلابے ملائے۔ انہیں تو ذرا بھی پسند نہ آئے۔ صدیقی صاحب کی بدذوقی پر خواہ مخواہ ہی ان کا جی جل گیا۔

مسز صدیقی خیالات میں ایسی کھوئی ہوئی تھیں کہ انہیں کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ کب مس قریشی آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔

"یہ پھول کیسا لگ رہا ہے —!"

مسز صدیقی نے چونک کر مس قریشی کی طرف دیکھا۔ سفید نامکمل سے دستی رومال پر چھوٹا سا بیحد نفیس پھول مسکرا رہا تھا۔

"اچھا ہے۔" مسز صدیقی نے بے دلی سے کہدیا۔ جانے کیوں ان کا تعریف کرنے کو جی نہ چاہا۔ حالانکہ کام کی نفاست اور صفائی اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ پھول بڑی محنت سے بنایا گیا ہے۔

"اچھا نہیں — کہئے بیحد اچھا لگ رہا ہے۔" مس قریشی نے بڑے پیار سے اصرار کیا۔

"چلئے۔ یوں ہی سہی۔"

مس قریشی اپنے ادھورے رومال پر جٹ گئیں اور مسز صدیقی نامکمل ڈرافٹ پر۔

بڑی دیر کے بعد مسز صدیقی کی نگاہ اٹھی تو انہوں نے مس قریشی کو بڑی تندہی سے رومال بنانے میں مصروف پایا تو مسز صدیقی ایکدم سے

بول پڑیں۔

" یہ دیدہ ریزی کس لئے جناب ۔!"

مس قریشی جیسے اسی سوال کی منتظر تھیں، پھول کی طرح کھل گئیں۔

" ارشد کے لئے ۔! "اس بیچارے کے پاس ایک بھی رومال نہیں اس کی کوئی بہن بھی تو نہیں جو بنا کر دے ۔ اور ۔"

" دیکھئے ۔! میں پھر وہی کہوں گی کہ زمانہ بہت خراب ہے۔ اتنی ہمدردیاں ہر ایک کے ساتھ مت کیا کیجئے ۔!" مسز صدیقی نے کئی دفعہ کی کہی ہوئی بات پھر دہرائی ۔ انہیں مس قریشی کے اس خلوص سے ہمیشہ کوفت ہوا کرتی تھی۔

کسی دن ضرور یہ شیشۂ خلوص چور چور ہو کر رہے گا۔ مسز صدیقی نے ہمیشہ کی طرح پھر سوچا۔

گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں ۔ پنج بریک ہو چکا تھا ۔ ان کو اُٹھتا دیکھ کر مس قریشی بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔ دروازے سے نکلتے ہوئے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور مس قریشی ہنس پڑیں۔

" مسز صدیقی ۔ بھئی بات یہ ہے کہ میں انسانوں کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتی ۔"

" اور میں زمانے کی باتیں ۔" مسز صدیقی جلدی سے بول اٹھیں۔

" لے لیجئے ۔ زمانے کی باتیں ۔! بھلا زمانہ ہمیں کیا کہے گا ۔! مس قریشی نے خوش طبعی سے کہا۔

اب وہ ریاض احمد کے کمرے کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ نئے اکاؤنٹنٹ کا بھدا سا قہقہہ مسز صدیقی کے کانوں کے پردے سے ٹکرایا تو وہ ٹھٹھکیں ۔ "ارے یہ لوگ ابھی تک نہیں گئے ۔!" مسز صدیقی نے آہستہ سے مس قریشی سے کہا۔

اندر کمرے سے کلرکوں کی باتوں کی آوازیں آ رہی تھی ۔

" ارے بھیا ۔ کیا بات ہے ۔ تم پر کچھ نظر کرم نہیں ہے ۔ ریاض میاں تو ۔ کیوں ریاض میاں ۔!" اور ایک ملے جلے قہقہے کی آواز فضا کے سناٹے کو چیر گئی ۔ مس قریشی اور مسز صدیقی کی رفتار سست پڑ گئی۔

" یار ۔ نبے دل پھینک ہیں ۔" ریاض ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

" یہ دیکھو ۔ یہ سونٹر انہیں کا بنا ہوا ہے ۔ مجھے خوب کافیاں بنا بنا کر بھیجتی تھیں ۔ میں نے لفٹ ہی نہیں دی ۔ اس عمر میں رنگین مزاجی تو دیکھو ۔!" سب پھر زور سے ہنسے۔

" ہر ایک کو پھانستی ہے ۔ ہونہہ ۔ ہم کوئی ایسے اُلو تو نہیں ۔ ریاض نے انتہائی نفرت سے کہا اور باقیوں نے بھرپور قہقہہ لگایا۔

" معلوم ہوتا ہے آج کل کوئی اور پھانس رکھا ہے ۔ بیٹھی رومال بنا رہی تھی ۔" جانے کون کہہ رہا تھا۔ مسز صدیقی نے گھبرا کر مس قریشی کی طرف دیکھا۔ مس قریشی کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ تیزی سے انہوں نے قدم آگے بڑھائے مگر لڑکھڑا سی گئیں۔ مسز صدیقی نے بڑھ کر انہیں تھام لیا ۔!

سید محمد علی جمالزادہ
ڈاکٹر محمد ظفر خاں

ثواب یا گناہ

جیبہ سلطان برسوں سے ہمارے ہاں کپڑے دھونے پر مامور تھی۔ اس کا ایک پیارا سا بچہ تھا بڑا شیطان اور بہت ہی شریر، نام تو اس کا سہراب تھا مگر سوری کہہ کر پکارتے تھے۔ سبھی اس کے سے پیار کرتے تھے اور ہمیشہ اس سے ہنسی مذاق کرتے رہتے۔

وسط خزاں میں ایک دن دوپہر کو اس کی ماں صابن کے جھاگ سے بھری چلمچی اپنے سامنے رکھے نیچے زمین پر ادھ گھٹنے بغل میں دبائے پسینے سے شرابور کپڑے دھونے میں مشغول تھی کہ نہ جانے سوری کہاں سے ایک کمزور مریل سے بلّی کے بچے کو پکڑ لایا اور بچّوں کی عادت کے مطابق ماں سے دو تین گز پرے اس سے کھیلنے لگا۔ وہ اس بدبخت حیوان کو اس قدر اذیت دے رہا تھا کہ اس کے کراہنے کی آواز بلند ہو رہی تھی ماں نے پہلے تو اسے لعنت ملامت کی پھر گالیاں دینا شروع کیں۔ لیکن جب دیکھا کہ سوری کو اس کی کچھ پروا نہیں بلکہ گستاخانہ جواب دے رہا ہے تو وہ اپنی جگہ سے لپکی اور بچے کو اچانک جا لیا۔ اپنے گیلے اور صابن والے ہاتھوں سے کپڑے دھونے والے ڈنڈے کو اس بے پروائی سے اس کے سر پر برسانا شروع کیا کہ اگر میں وہاں نہ پہنچتا اور بیچ بچاؤ نہ کرتا تو وہ اس معصوم بچے کا بھیجہ ہی نکال دیتی۔

سوری بیچارے کا رنگ فق تھا، ہونٹ لٹکا ہوا اور تھوڑا سا خون ناک سے ملا ہوا اس کے منہ کے ایک کونے سے بہہ رہا تھا اور وہ زمین پر پڑا رو رہا تھا۔

بیچاری جیبہ سلطان کا بھی بُرا حال تھا۔ پریشان بال اور پھٹا ہوا دوپٹہ اوڑھے اپنے بیٹے کے پاس بیٹھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور خالق و مخلوق سے پوچھ رہی تھی کہ اس نے کیا گناہ کیا ہے جو ایسے ظالم کے ہاتھوں میں پھنس گئی ہے جسے نہ خدا کا خوف ہے اور نہ کسی بندۂ خدا کا ڈر۔

مجھے اُن دونوں پر بہت رحم آیا میں نے کہا "جیبہ سلطان اس بچے کو اسکول میں داخل کیوں نہیں کرا دیتیں تاکہ تمہیں آرام و سکون میسر ہو۔ اور شاید یہ بھی انسان بن جائے" کہنے لگی "اپنا پیٹ بھرنے کو تو روٹی ملتی نہیں روپیہ کہاں سے لاؤں جو اس حرامی کے مدرسے کا خرچ اٹھاؤں۔ کیا آپ چاہتے ہیں اس بڑھاپے میں چوری کروں؟ مجھ سے تو یہ نہیں ہونے کا"۔ میں نے کہا "انشا اللہ ایسا بندوبست کر دوں گا کہ اسے مفت میں داخل کر لیں گے اور تجھے کچھ نہیں دینا پڑے گا"۔

سوری کا مدرسے جانا تھا کہ اس کی ہیئت ہی بدل گئی۔ وہ خوب چمکا، سبق پڑھنے والا، وقت پر حاضر ہونے والا، معقول اور مودّب بچّہ بن گیا۔ کبھی کبھی ماں کے ساتھ ہمارے ہاں آتا اور حاصل کردہ نمبر مجھے دکھایا کرتا۔ میری بھی کوشش تھی کہ اس کی حالت بہتر ہو جائے۔ میں نے چونکہ کہہ رکھا تھا اس لئے اس کی ماں جب بھی کپڑے دھونے آتی اور اس کی مزدوری اُسے دیتے تو دو تین روپیہ نو ماں بچے کے تعلیمی اخراجات میں مدد کے طور پر بھی دے دیا کرتے۔

اب سہراب اکیس سالہ نوجوان تھا اور ثانوی تعلیم کو ختم کر چکا تھا۔ پایۂ تخت کے اکثر نوجوانوں کی طرح سرکاری دفتر میں کام کرتا تھا یا نہیں کرتا تھا البتہ ہر ماہ کی ابتدا میں قلیل تنخواہ وصول کر لیتا جو اس کی ضروریات کے ایک حصہ کو پورا کرنے کے لئے کافی ہوتی تھی۔ اس کی ماں بیماری سے عاجز

ہو گئی تھی اور کپڑے دھونے کا کام اس سے نہ ہو سکتا تھا۔ اب تو ڈاکٹر، دوا اور دواخانے سے ہی سروکار تھا۔ سہراب کی تنخواہ سے اس قسم کے اخراجات پورے نہ ہو سکتے تھے، ماں بیٹا اب وہ کام کرنے پر آمادہ تھے جو ایسے مواقع پر ہمارے اہل وطن عام طور پر کرنے پہ مجبور ہو جاتے ہیں یعنی اپنے گھر کا سامان مثلاً دیگ، سینی، تالیں، بالیاں اور کنگن وغیرہ گرو رکھنا اور فروخت کر دینا۔ سہراب کی خواہش تھی کہ جس طرح بھی ہو وہ میڈیکل کالج میں داخل ہو جائے لیکن اس کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ میری امداد اور جدوجہد کا بھی کچھ نتیجہ نہ نکلا چنانچہ اس نوجوان کی یہ آرزو دل ہی دل میں رہی۔ وہ حسرت سے آہیں بھرتا اور اکثر آنسو اس کی آنکھوں میں تیرنے لگتے۔ ہفتہ میں ایک دو دفعہ کالج کے سامنے سے گذرتا اور طالب علموں کو بڑی بڑی ضخیم کتابیں بغلوں میں دبائے نکلتے دیکھتا اور پریشان حال و مضطرب روح کے ساتھ اپنے گھر کو لوٹ آتا۔

ایک مدت سے میں سہراب اور اس کی ماں کے حال سے بے خبر تھا۔ اچانک اطلاع ملی کہ سہراب نے کسی آدمی کو مار ڈالا ہے اور وہ پکڑا گیا ہے اور حوالات میں ہے۔ میں بہت حیران ہوا۔ وہ چونکہ ایک حد تک میرا تربیت یافتہ تھا۔ اس کی قسمت بنانے میں میرا بھی ہاتھ تھا اس لئے میں نے تحقیق کرنا شروع کی کہ اصل معاملہ کیا ہے۔

میں سیدھا اس کے گھر گیا۔ گھر کا دروازہ کھلا تھا اور اس کی ماں آنکھوں کو آدھا بند کئے ایک پھٹے پرانے بستر پر پڑی تھی جونہی مجھے دیکھا اس کی چیخ نکل گئی اور اس نے دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا۔ پتہ چلا کہ اسے بھی صحیح حالات کا علم نہیں ہے اس نے بھی ادھر اُدھر سے اتنا ہی سنا ہے کہ اس کا بیٹا رات کے وقت کسی طرح اپنے ہمسائے اور شہر کے مشہور دولت مند حاجی فتح اللہ کے گھر میں داخل ہوا اور حاجی فتح اللہ کو چھری سے قتل کرنے کے بعد جب وہ بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا پکڑا گیا اور اب جیل میں ہے۔

میں نے دیکھا کہ مصیبت زدہ ماں کو کسی طور تسلی نہیں دی جا سکتی۔ بہرحال جس طرح بھی ہو اس واقعہ کی تہ تک پہنچنا چاہئے تاکہ پتہ تو چلے کہ یہ واقعہ کیونکر رونما ہوا۔

پولیس میں میرے بہت سے دوست اور واقف کار تھے میں فوراً ان کے پاس گیا اور جس طرح بھی بن پڑا میں نے سہراب سے ملاقات کی اجازت حاصل کر لی۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس کی آنکھوں سے شرم و انفعال ٹپک رہی تھی، ہونٹ کانپ رہے تھے اور وہ کچھ کہنے کے لئے میرے سوال کا منتظر تھا۔ میں نے کہا "سہراب میں کیا سن رہا ہوں! لوگ جو باتیں کر رہے ہیں وہ درست ہیں کیا؟"

"آپ کو جو کچھ بتایا گیا ہے۔ صحیح ہے"

"لوگ تو کہتے ہیں کہ تو چھت کے راستے حاجی فتح اللہ کے گھر گیا اور اُسے ہلاک کر دیا"

"ٹھیک ہے"

"وہاں کس لئے گیا تھا"

"چوری کے لئے"

"تو چور تو نہ تھا"

"کوئی چور پہلے چور نہ تھا"

"تو تو پڑھا لکھا اور علم دوست انسان تھا۔ چوری اور قتل کرنے سے تجھے کیا کام؟"

"بیمار ماں کی آہ و زاری سن سن کر زندگی سے بیزار ہو گیا اور سوچا جس طرح بھی ہو اپنے آپ کو اس گندگی اور مفلسی کے گڑھے سے نکالنا چاہئے"

"خوب راہ نکالی تو نے، تو گندگی سے اپنے آپ کو نکالنا چاہتا تھا اور جوہڑ میں گر گیا۔ چور اور قاتل بن گیا۔ تیری ماں تو اس غم سے مر جائے گی"

"میں بدقسمت پیدا ہوا ہوں، خدا کسی کو گدا اور محتاج نہ کرے کیونکہ اس کا انجام یہی ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں؟"

"ہاں تو اب ایسی باتوں کا وقت نہیں، کہو تو اصل واقعہ کیا ہے؟"

"حاجی فتح اللہ کو تو آپ جانتے ہی ہیں امیر آدمی تھا اور کنجوس بھی۔ کسی سے نیکی کرنا اُس کے نزدیک گناہ تھا۔ وہ چونکہ میرے پڑوس میں رہتا تھا اس لئے اُس کے نوکروں اور خدمت گاروں کو جانتا تھا۔ اس کی زندگی کے طور طریقوں سے بھی واقف تھا۔ سبھی جانتے تھے کہ اس کا مال تو اس کی اپنی ذات پر بھی حرام ہے وہ تو دنیا کو بھی صرف روپے پیسے کے لئے پسند کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اگر کوئی بھوک سے مر رہا ہوتا تو وہ اس کی زندگی بچانے کے لئے پھوٹی کوڑی تک خرچ کرنے کے لئے تیار نہ تھا حتیٰ کہ اُس کی بیوی اور بچے بھی خدا سے اس کی موت کے طلب گار تھے۔"

"کیا تو نے نہیں سنا کہ الجنون فنون۔ یہ بھی تو ایک پاگل پن ہے۔ تم دوسروں کے لئے جواب دہ تھوڑے ہی ہو، اس کا اپنا مال تھا وہ خرچ کرنا نہیں چاہتا تھا تو ہمیں کیا۔"

"آپ نے ٹھنڈے دل سے نہیں سوچا۔ اگر میری جگہ آپ ہوتے اور اسی طرح غم والم میں مبتلا ہوتے اور آپ کی تمناؤں کا بھی خون ہو گیا ہوتا تو ایسی باتیں نہ کرتے۔"

"عزیزم! اس بنا پر ہر وہ شخص جو گرفتار رنج و محن ہو اور اس کی آرزوئیں خاک میں مل گئی ہوں۔ وہ چاقو لے اور آدھی رات کو ہمسایہ کا پیٹ چاک کر دے تو کیسا رہے؟ وہ نہیں چاہتا کہ اپنا مال ہم جیسے مفلس اور بھوکے لوگوں کو دے۔ یوں ہونے لگے تو سوسائٹی اور دنیا پر فاتحہ پڑھ لی جائے۔"

"مدت ہوئی میں نے دُنیا پر فاتحہ پڑھ دی ہے۔ مجھ میں تو ہمت ہی نہ رہی تھی۔ شیطان مجھ پر سوار تھا میں جس وقت ہوش میں آیا کچھ بھی میرے بس میں نہ رہا تھا۔"

"ذرا تفصیل سے کہو تاکہ پتہ تو چلے کہ اب مداوا کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔"

"ایک مدت سے میری نگاہیں اس شخص پر پڑ رہی تھیں۔ دنیا میری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی تھی۔ اس کے دیکھنے کی مجھ میں تاب نہ تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اس کا گلا پکڑ لوں اور کہوں کہ نکال وہ روپیہ پیسہ جو تو نے بے کس لوگوں سے ہزاروں حیلوں اور بہانوں سے ہتھیایا ہے۔"

"سہراب جان اسی کا نام تو حسد، بخل، طمع اور تنگ نظری ہے۔ یہی امیر لوگ تو ہیں جو غریبوں کو روٹی دیتے ہیں، داور حقیقی تو خدا ہے اور کوئی شخص بھی کسی کی اچھائی اور برائی کا ذمہ دار نہیں۔"

"ہاں ایسی ہی باتوں سے ہم اپنے دل کو خوش کرتے رہتے ہیں لیکن جس وقت میں نے ارادہ کر لیا کہ جس طرح بھی ہو میں اس شخص کے گھر میں داخل ہو کر تھوڑا سا سرمایہ حاصل کروں گا۔ اس سے اس کی دولت میں تو کچھ زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ البتہ میرا کام بن جائے گا اور اس قسم کی بات تو میں نے کبھی سوچی نہ تھی۔"

"تو گھر کا راستہ کیسے جانتا تھا۔"

"گھر کی چھت اور کمروں سے میں نے سینکڑوں بار اُسے آتے جاتے دیکھا تھا اور محلہ کا ہر آدمی جانتا تھا کہ حاجی نقدی، جواہرات اور تمسکات کس کمرے اور کس الماری میں رکھتا ہے۔"

"یہ ٹھیک سہی کہ تو اس کے مال کا دشمن تھا لیکن تو نے اُسے قتل کیوں کیا؟ تو قاتل تو نہیں تھا۔"

"یہی تو میری بدقسمتی تھی، جونہی ہزاروں خوف، احتیاط اور تشویش و اضطراب سے رات کی تاریکی میں مذکورہ کمرے میں داخل ہوا اور میری نگاہیں اس الماری پر پڑیں۔ میں نے ابھی آلات اور اوزاروں کو جنہیں میں الماری کھولنے کے لئے اپنے ساتھ لایا تھا جیب سے باہر نکال رہا تھا کہ اچانک میں نے حاجی کو دیکھا جو ٹارچ ایک ہاتھ میں لئے اور پستول دوسرے ہاتھ میں پکڑے شب خوابی کے لباس میں میرے سامنے آکھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ مجھے اپنی موت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ذرا سی حرکت سے ہی گولی میرے سر کے پار ہو سکتی تھی۔ الماری کھولنے کے لئے جو اوزار میرے

ہاتھ میں تھا وہ چھری کی طرح تیز اور لمبا تھا کو ترا اُس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ وہ چیخ مارتا ہوا زمین پر آ رہا یہ سمجھے بغیر کہ کیا ہوا ہے میں فی الفور کھڑکی سے باہر کود اور جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میرا بایاں پہلو اور بائیں ران پر اتنی شدید چوٹ لگی ہے اور اس قدر درد ہو رہا ہے کہ قدم اٹھانا محال ہے۔ چند لوگ مجھے گھیرے ہوئے ہیں۔ پولیس، چوکیدار، سپاہیوں اور تھانے کی باتیں کر رہے ہیں، گھر کے اندر عورتوں کے رونے کی آواز بلند ہے میں سمجھ گیا کہ حاجی مر گیا ہے.....‘‘

سہراب یہاں تک کہہ پایا تھا کہ اس کی ہچکی بندھ گئی اس کا دم گھٹ گیا اور منہ کھلے کا کھلا رہ گیا وہ پیشانی کے بل اس طرح زمین پر گرا گو یا سجدہ میں ہو۔ سر سے پاؤں تک تشنج کی کیفیت اس پر طاری ہو گئی۔ اس حالت میں ایسے آدمی کی دلجوئی بے معنی تھی اور چونکہ ملاقات کا وقت بھی ختم ہو گیا تھا اس لئے میں نے اسے تھپکی دی اور شبہے پریشان دل کے ساتھ قید خانے سے باہر آیا۔

حاجی فتح اللہ کمرہ واردات میں ہی مر گیا۔ جی تو چاہتا تھا کہ اس ختم کی مجلس میں جو نہایت شان و شوکت سے منعقد ہو رہی تھی شرکت کروں، لیکن میرے قدم اس طرف نہ بڑھ سکے۔ میں نے سوچا کہ مجھے چونکہ سہراب کا حمایتی خیال کرتے ہیں اس لئے میرا وہاں جانا اچھا نہیں۔

میں دو تین بار حبیبہ سلطان کے پاس گیا وہ تو پاگل سی ہو گئی تھی اپنے بیٹے کی باتیں بھی زیادہ نہ کرتی تھی، کم ہی روتی تھی ہذیانی کیفیت میں اکثر اپنے متعلق، اپنی جوانی، اپنی ذات، اپنے ماں باپ اور شوہر کے بارے میں باتیں کرتی رہتی۔ میں نے اس کے ہمسایوں میں سے ایک غریب عورت کو اس کی دیکھ بھال پر مقرر کیا۔ میں سہراب کو رہائی دلانے کے لئے تگ و دو کر رہا تھا اگرچہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ سب بے فائدہ ہے لیکن میں اپنے آپ کو اس کام سے روک بھی نہ سکتا تھا۔

وکیل وعدے تو بہت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ قتل اپنی مدافعت میں ہوا ہے اس لئے سزا میں کمی ہو گی۔ میں بھی یہی سوچ کر خوش ہو جاتا تھا۔ ایک بار پھر میں سہراب سے ملنے کی اجازت حاصل کی کچھ کھانے پینے کی چیزیں اور سگریٹ کے دو تین پیکٹ لے کر اس کے پاس گیا۔

آہ میں نے اسے کس حال میں دیکھا۔ سہراب کے حسن اور دلکشی میں کچھ باقی نہ رہا تھا۔ اس کی حالت اس انسان کی مانند تھی جس کو سل ہو گئی ہو اور پاؤں قبر میں لٹکائے ہوئے ہو۔ اس میں زندگی کی ذرا سی رمق بھی باقی نہ تھی۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو رونے لگا۔ چند دنوں سے اس نے کنگھی تک نہ کی تھی، اس کے بکھرے ہوئے بال اُس کی پیشانی اور چہرے پر گرے ہوئے تھے اور اس کا منہ بھی ٹیڑھا ہو گیا تھا۔

میں نے سگریٹ سلگا کر اُس کے ہاتھ میں دے دیا جسے اس نے لمبے لمبے کش لگا کر آدھے منٹ میں ختم کر دیا۔ پھر اچانک اپنی آنکھوں کو میری آنکھوں میں گاڑ کر کہنے لگا۔

’’کاش آپ میری مدد کرتے تاکہ میں خودکشی کر سکتا‘‘۔

’’کیسی باتیں کر رہے ہو، لائق وکیل اطمینان دلاتے ہیں کہ تو رہا ہو جائے گا‘‘۔

’’خدا نہ کرے رہا ہو جاؤں۔ میری خواہش تو یہ ہے کہ پھانسی کا حکم ہو جائے اور جان اس عذاب سے چھوٹ جائے جو ہر لمحہ موت کو میری آنکھوں کے سامنے مجسم کر دیتا ہے‘‘۔

’’سہراب جان! میں تیرا مقصد نہیں سمجھا۔ تیری مراد کس عذاب سے ہے؟‘‘

’’جناب میں نے ایک انسان کو قتل کیا ہے، اللہ کے ایک بے گناہ بندے کو جان سے مار دیا ہے، وہ جس قدر بھی بُرا تھا قتل کئے جانے کے لائق نہ تھا۔ میں قاتل ہوں میں نے انسان کو قتل کیا ہے لعنت ہے مجھ پر.....‘‘

’’سہراب یہ تو اتفاقاً ہوا ہے۔ تو نے دانستہ تو قتل نہیں کیا۔ یہ انسان جس کی موت کے لئے جن و انس بھی خدا سے دعا کرتے تھے اپنے آپ مر جاتا۔ شاید وہ کئی قسم کے امراض میں مبتلا ہو جاتا۔ کیا معلوم زخم معدہ اور سرطان کے مرض کا شکار ہو جاتا۔ تقدیر میں ایسے تھا اس کا ذکر کرنے اور اظہار

بے تابی کی ضرورت کیا ہے؟

"میں خود یہ تمام باتیں جانتا ہوں اور سو بار اس قید خانے کے گوشوں اور رات کی تاریکی میں اپنے ضمیر کو فریب دینے کے لئے یہی منطقی استدلال کیا ہے لیکن بے فائدہ ...... میرے وجود کا ذرہ ذرہ کہتا ہے کہ تو نے آدمی کو قتل کیا ہے اور ایک زندہ انسان کو مار ڈالا ہے۔ تجھکو یہ حق حاصل نہ تھا تو نے ظلم کیا ہے۔ تو انتہائی دردناک حادثہ اور گناہ کا مرتکب ہوا ہے۔ تو نے ہمیشہ ہمیشہ کی بدنامی کی کالک اپنے منہ پر مل لی ہے۔"

"تمام مذاہب توبہ اور استغفار پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اگر تو بھی بارگاہ خداوندی میں خلوص نیت اور صفائی باطن سے توبہ کرے تو مجھے یقین ہے کہ تیری توبہ قبول ہو جائے گی۔"

"میں نہیں چاہتا کہ میری توبہ قبول ہو۔ میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ میں تو بس ایک رسی چاہتا ہوں جسے اپنی گردن میں ڈالوں اور چھٹکارا پا جاؤں۔ یہ زندگی ...... اس کا ہر لمحہ میرے لئے پیام مرگ ہے یہاں تک کہ سانس لینا بھی ایسے ہے جیسے سخت ترین شکنجہ میں کسا ہوا ہوں میں خدا سے، دنیا سے، لوگوں سے اور آپ سے جو اس دنیا میں میرے واحد دوست اور رمدگار ہیں۔ ایک چیز کا آرزومند ہوں اور وہ ہے موت.... فقط موت۔ آدھ گز رسی اور دو منٹ کی فرصت کافی ہے...."

پہلی بار کی طرح جبکہ میں اسے ملنے گیا تھا اب بھی وہ پہلے گھٹنوں کے بل ہوا اس کے بعد بلا اختیار جھک گیا اور اس کا ماتھا زمین پر آ گیا۔ اس کا تمام بدن کانپنے لگا اور پھر رکھ گیا۔ ایسے منظر کو دیکھنے کی طاقت مجھ میں نہ تھی اس لئے میں باہر چلا آیا۔

اس واقعہ کے دو تین روز بعد مجھے اطلاع ملی کہ جیبہ سلطان کسی تکلیف یا دکھ کا احساس کئے بغیر فوت ہو گئی ہے۔ ایسے لگتا تھا کہ وہ سو رہی ہے۔ آہ وہ کپڑے دھونے کی محنت و مشقت سے بیچاری گی چھوٹ گئی تھی۔ ہم نے اسے شہر کے باہر قبرستان کے ایک گوشہ میں سپرد خاک کر دیا۔ اور نشان کے طور پر آدھی اینٹ اس کے مزار کے اوپر نصب کر دی اور خدا کے حوالے کرتے ہوئے شہر لوٹ آئے۔

چند دن تک میں اس کشمکش میں مبتلا رہا کہ سہراب کو اس کی ماں کی موت کی اطلاع دوں یا نہ دوں پہلے تو ڈر لگا کہیں یہ غم اس کے آلام میں ایک اور کے اضافہ کا باعث نہ ہو لیکن جس وقت اس کی اس پریشانی اور آشفتگی خاطر کا خیال آیا تو میں نے دل میں کہا ممکن ہے ماں کی موت کی خبر اس کو ہلاک کرنے والے اندرونی ظالم سے رہائی دے دے اس لئے میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس سے مل کر یہ ماجرا بیان کر دوں گا۔

قیدی سے ملاقات کرنے کے لئے کافی دیر انتظار اور منت سماجت کرنے کے بعد سپرنٹنڈنٹ جیل کے دفتر میں داخل ہوا۔ وہ شریف آدمی تھا اور مجھ سے اس کی دوعدکی واقفیت تھی۔ اس نے پس و پیش کئے بغیر مجھے ملنے کی اجازت دے دی۔ میں نے اس سے کہا آخری بار جب میں اس جوان قیدی سے ملا تھا تو اس کی حالت سے میرا دل بہت دکھی ہوا۔ وہ بہت پریشان تھا اور موت کی آرزو کرتے ہوئے خودکشی کے بارے میں ہی باتیں کرتا رہا تھا۔ جواباً کہنے لگا ہمارے ہاں جتنے قیدی ہیں ان کی اکثریت کے برعکس یہ زیادہ حساس ہے اور جیسا کہ بیان کرتے ہیں یہ اپنے کئے پر سخت پشیمان ہے اور ہمیشہ اپنے مقتول سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ اس سے اپنے قصور کی معافی چاہتا ہے۔ میں نے سب کو ہدایت کر دی ہے کہ اس کا خیال رکھیں کہیں یہ اپنے آپ کو ہلاک نہ کر دے۔"

میں نے پوچھا "کیا کچھ معلوم ہوا ہے کہ اس کے بارے میں عدالت کا کیا خیال ہے؟"

"بات صاف ہے۔ اس نے قتل کیا ہے۔ چوری اور قتل کے ارادے سے ہی آدھی رات کو گھر میں داخل ہوا۔ خیال ہے آج کل میں اس کو پھانسی دینے کے احکام صادر ہو جائیں گے۔"

"شاید آپ نہیں جانتے کہ اپنی حفاظت کرتے ہوئے قتل کا مرتکب ہوا ہے اس لئے اس کی سزا میں تخفیف ہونا چاہئے۔"

"واللہ میں اس قسم کی قانونی موشگافیوں سے واقف نہیں ہوں لیکن جہاں تک مجھے علم ہے عدالت صفائی سے مطمئن نہیں ہوئی سرکاری وکیل نے

اسے پھانسی دینے کی درخواست کی ہے اور خیال یہ ہے کہ وہ کامیاب ہوگا۔"

ایک پاسبان کے ہمراہ میں داروغہ صاحب کے دفتر سے سیدھا سہراب کی کوٹھری میں گیا۔ میں انتہائی دلی کوفت سے چل رہا تھا۔ خیال تھا کہ جونہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑے گی اسے ویسی پریشانی اور روحانی تکلیف ہوگی جس سے مجھے بھی بہت قلق و ملال ہوگا مگر جس وقت دروازہ کھلا اور میں اُس کے کمرے میں داخل ہوا تو حیران رہ گیا۔ میں نے دیکھا کہ منہ ہاتھ دھوئے صاف لباس پہنے، کنگھی کئے اپنے بستر پر بیٹھا ہے اور نہایت اطمینان اور مزے سے سگریٹ پی رہا ہے۔ اس کے سلام کرنے کے طریقے اور آداب تکلف سے میں سمجھ گیا کہ اُس کی کایا پلٹ گئی ہے وہ تو کوئی دوسرا آدمی بن گیا ہے۔

میں نے خیال کیا شاید اس لئے کہ وہ زیادہ پریشان ہوئے نظر نہ آئے، فریب دیا گیا ہے کہ تمہاری بریت ہوگئی ہے، لیکن جلد پتہ چل گیا کہ اصل وجہ کچھ اور ہی ہے۔ اس قلب ماہیت کا سبب اور ہی کچھ ہے۔ میں نے کہا "ماشاءاللہ آج تو بہت کچھ بدلے ہوئے معلوم ہوتے ہو، ہوش و حواس ابھی ٹھکانے پر ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ تیری پریشانی اور پاگل پن بے سبب تھا۔ اب تو ایک دو دن میں تجھے رہائی کی خوش خبری ملنے والی ہے۔ تو خوش خوش صحت اور سلامتی سے باہر آکر اپنی زندگی اور جوانی سے لطف اندوز ہوسکے گا۔ امید ہے تو آئندہ شیطان کو اپنے پر غلبہ نہ پانے دے گا۔"

"جناب چاہے میں کتنا ہی بے وقوف کیوں نہ ہوں اس قسم کی باتوں سے خوش نہیں ہوسکتا۔ مجھے اپنی قسمت کے لکھے کا علم ہے نہ صرف یہ کہ میں موت اور پھانسی سے نہیں ڈرتا بلکہ میں تو دل و جان سے ان کا خواہاں ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس زندگی سے جس کا ایک لمحہ بھی میری مرضی کے مطابق نہیں گذر رہا، سیر و بیزار ہوگیا ہوں اور اب آرام کا متمنی ہوں۔"

"آج جو تبدیلی تجھ میں دیکھ رہا ہوں اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آرہی۔"

"آپ جانتے ہی ہیں حاجی فتح اللہ کا خیال ہی مجھے دیوانہ کئے جا رہا تھا۔ لوگ جو چاہیں کہیں۔ لیکن میں ارادۂ قتل سے اس شخص کے گھر میں داخل نہیں ہوا تھا، میرا خیال تھا کہ اس کے کروڑہا تومان کی نقدی اور مال و اسباب سے اگر دو تین ہزار مجھے مل جائیں تو اُس کی دولت میں کچھ کمی واقع نہ ہوگی۔ البتہ میں میڈیکل کالج میں داخلہ لے سکوں گا۔ اس علم کے پڑھنے کا مجھے جو شوق ہے اس کی بدولت میں اس کالج سے ڈاکٹر بن کر ہی نکلوں گا اور اس طرح عمر بھر کے لئے اپنی اور اپنی بوڑھی ماں کی زندگی کی بہتری کا بیمہ کرلوں گا۔ لیکن منشائے تقدیر کچھ اور ہی تھا اس لئے یہ شخص میرے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ اگرچہ جانتا ہوں کہ اس کا وجود خیر و برکت سے عاری تھا اور جب بھی میری نگاہ اس موٹی توند اور ترش رُو پر پڑتی تو یوں لگتا تھا کہ وہ ایسا کھوٹا سکہ ہے جو بے انصافی اور طمع کی ٹکسال اور کینہ و فریب کے دارالضرب میں مہر لگ کر باہر آیا ہے۔ یہ تصور ہی میرے تمام وجود پر چھا جاتا تھا۔ اس کے باوجود بھی میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی منحوس زندگی میرے ہاتھوں ختم ہو۔ جب مجھے یاد آتا کہ میں قاتل ہوں۔ اس کا قتل میرے ہاتھوں سے ہوا ہے اور قیامت کے دن خدا کو جواب دینا ہوگا، اس کے خون کا ہر قطرہ صحرائے محشر کی دھوپ میں مجھ سے جواب طلب کرے گا۔ تو دل میں ٹیسیں اٹھنے لگتی تھیں، سر چکرانے لگتا اور اپنے اس فعل سے اس قدر منفعل اور پشیمان ہوتا تھا کہ سچے دل سے اپنی موت کی دعا کرتا لیکن پرسوں رات دو تین راتوں کی بے خوابی اور تمام دن کی بدحالی اور پریشانی کے بعد پریشان و ناتوان اس بستر پر پڑ گیا اور کچھ سدھ نہ رہی۔ اچانک میں نے دیکھا حاجی فتح اللہ ہشاش بشاش مسکراتا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوا اور میرے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ اپنے ہاتھ کو میرے سر پر آہستہ سے پھیرا اور نہایت محبت شفقت اور مہربانی سے کہنے لگا "پیارے سہراب خدا تیرے باپ کو جنت نصیب کرے تو نے مجھے نجات دلائی۔ کاش تو جانتا کہ میں تیرا کس قدر ممنون ہوں، میری عمر اکسٹھ سال کی تھی۔ آرام و سکون کا لطف جاتا رہا تھا۔ بچپن کے زمانے میں.... اس وقت سے جب مجھے یاد ہے.... مرغی بازار کے بھڑبھونجے ایک کبابیے کی دکان میں نوکر تھا۔ نہ میرے ماں باپ زندہ تھے اور نہ میرا کوئی گھر تھا۔ راتوں کو اس طرح کہ میرے مالک کو پتہ نہ چلے اسی دکان کے تھڑے کے نیچے کتوں کے قریب ہی سو جاتا اور جس طرح بھی جو کچھ ملتا جمع کرتا تھا۔ دمڑی دمڑی اکٹھی کرتا اور کسی پھٹے پرانے کپڑے میں لپیٹ کر دکان کی پچھلی کوٹھری کے کونوں کھدروں میں چھپا دیتا حتیٰ کہ میں اس شہر کا ایک معتبر تاجر بن گیا۔

جمع بھی کرلیا، مال و اسباب اور دولت بھی جمع کرلی لیکن کر دمیں راحت کے نام سے ناواقف اور زندگی کے لطف سے بے بہرہ تھا۔ تُو تو اچھی طرح جانتا ہے میری توجہ فقط مال و دولت جمع کرنے پر مرکوز تھی۔ مجھے اس کی پروا نہ تھی کہ روپیہ کس طرح سے آیا ہے بس اتنا خیال ہوتا تھا کہ ظاہرداری قائم رہے اور کوئی شخص قانونی طور پر یہ ثابت نہ کر سکے کہ یہ مال راہ حرام یا غیر مشروع طریقے سے میرے ہاتھ لگا ہے۔ میں مطمئن تھا اور مجھے کسی سے بغض یا محبت حتیٰ کہ بیوی بچوں تک کی پرواہ نہ تھی۔ رات کو جب سونے لگتا اور یہ خیال آتا کہ آج پھر میں نے اپنی دولت میں کسی قدر اضافہ کیا ہے تو میں اپنے آپ اور تمام دنیا سے راضی ہوتا تھا۔ لیکن افسوس یہی فکر اور خیال مجھے سونے نہ دیتا تھا کیونکہ میں اس عالم خواب و بیداری میں دیکھتا تھا کہ رت سے دعویداروں میں سے چند نے میرے خلاف عدالت میں دعویٰ دائر کردیا ہے اور چاہتے ہیں کہ میرے خلاف ڈگری حاصل کرلیں۔ میرے وعدے بید بھی ان پر کچھ اثر نہیں کرتے وہ تو یہی کہتے ہیں کہ تھیلی کا منہ ذرا ڈھیلا کرو۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکتا۔ میرا سر درد کرنے اور جی متلانے لگتا۔ ٹھنڈے پسینے سے تمام بدن شرابور ہوجاتا۔ گھنٹوں کروٹیں بدلتا رہتا۔ اسکیمیں سوچتا اور صبح سویرے ایک پیالی چائے کی زہر مار کرتا یا نہ کرتا۔ دھتورا کھائے ہوئے کتے کی طرح گلیوں میں گھومنے لگتا تاکہ جس طرح بھی ہو مجھے کوئی دھوکہ نہ دے سکے۔"

"وکیلوں، اسمبلی کے ممبروں، اخبارنویسوں، وزیروں اور رہبروں کی جنس مجھے سخت ناپسند تھی۔ لیکن اپنے فائدے کے لئے مجبور تھا کہ روزانہ انہیں دوپہر یا شام کے کھانے پر مدعو کروں۔ انہیں عزت و احترام سے پکاروں، ان پر قربان اور تصدق ہوؤں۔ میں تو ایسا حریص اور بخیل آدمی تھا جو گناہ بھی مانگے پر دینے کا روادار نہ تھا اور تھیلی پر سرسوں جما دیتا تھا یہ کب گوارا کرسکتا تھا کہ ان بیکار، بے پروا اور آرام طلب لوگوں کو ناحق اور زبردستی سے چھینے ہوئے مال سے کچھ دوں۔ ایسے گھٹیا لوگوں کی کہ جن کے پیٹ میں بھوک سے چوہے دوڑتے تھے اور جن کی مقررہ تنخواہیں میرے ملازمین سے کم تھیں۔ ہزاروں خوشامدیں کروں اور سو طرح کی چاپلوسی اور تملق سے انہیں خوش کروں۔ میں بنیادی طور پر سیاست سے بیزار تھا اور ان سیاست دانوں سے دور بھاگتا تھا۔ لیکن مصلحت کے پیش نظر مناسب تھا کہ دن کو کسی دائیں بازو کے ممبر کو لنچ پر بلاؤں اور ڈنر پر کسی عوامی کارکن کو دعوت دوں اور انہیں ایسے راستوں سے اپنے گھر لے آؤں تاکہ میرے ہمسایوں کی تکالیف سے آگاہ نہ ہوں۔ سب سے جھوٹ بولوں۔ ان کی الٹی سیدھی باتیں سنوں اور سنی ان سنی کردوں یا ہاں میں ہاں ملاتا رہوں۔

میرے معدہ میں زخم ہوگئے تھے لیکن مجھے یہ بالکل پسند نہیں تھا کہ خون پسینہ ایک کر کے پہلے دمڑی دمڑی پھر برسوں بعد قران قران اس کے بعد تومان تومان اور آخرکار سو سو تومان، ہزار ہزار تومان کر کے اکٹھا کی ہوئی دولت ڈاکٹروں اور دواؤں پر صرف کردوں۔ بلڈپریشر ہزار تومان کے اخراجات کے برابر تکلیف دہ تھا۔ اعصاب جواب دے گئے تھے۔ دمہ کی بھی شکایت تھی۔ منہ سے سرکہ کی سی بو آتی تھی۔ دانت خراب ہوگئے تھے۔ لیکن پھر بھی میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ علاج کروں۔ میں جانتا تھا کہ ہر کس و ناکس حتیٰ کہ میرے نوکر اور خدمتگار اشارۃً کنایۃً میرے متعلق کیا کیا باتیں کرتے ہیں۔ مگر میں نے کبھی پروا تک نہیں کی۔ البتہ تنخواہ اور واجبات کی ادائیگی کے وقت کسر نکال لیتا تھا۔ کتوں کی سی زندگی گذار رہا تھا۔ مجھے بھی اس کا احساس تھا لیکن حرص و طمع اس زندگی میں تبدیلی کی اجازت نہیں دیتے تھے میں نے ہزاروں دلیلوں سے اپنے آپ اور دوسروں پر ثابت کردیا تھا کہ حقیقی راہ وہی ہے جس پر میں گامزن ہوں۔ اگر کبھی کوئی مطمئن نہ ہوتا تھا تو پھر میں اسے اپنا بہی کھاتہ اور بنک کی پاس بک دکھا دیتا اور اس طرح بحث میں سب کو خاموش کردیا کرتا تھا۔

مختصر یہ کہ کیوں بور کروں تم جانتے ہی ہو کہ میں کیسا انسان تھا اور کس طرح زندگی بسر کر رہا تھا۔ جب میں لوگوں کو دیکھتا کہ وہ اپنے بیوی بچوں اور دوستوں کے ساتھ سیر سپاٹا کرتے ہوئے باتیں کررہے ہیں ہنس بول رہے ہیں کھا پی رہے ہیں تو شدت حسرت سے میں حسد کرنے لگتا اور چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور انہیں نگل لے تاکہ میں انہیں نہ دیکھ سکوں لیکن ظاہرداری کے طور پر کہتا "افسوس ہے ان لوگوں پر جو اپنا قیمتی وقت اس طرح ضائع کررہے ہیں اور انہیں اپنی یا اپنے ہم وطنوں کی حالت کو سنوارنے کا خیال تک نہیں، حیوانوں کی طرح چرتے اور شور مچاتے پھرتے

رہا انہیں اپنے اور اپنی اولاد کے مستقبل کی فکر نہیں۔

مال و دولت اکٹھا کرنے میں میری حالت ایک مشین کی سی تھی جسے دست روزگار نے آز و طمع کی کنجی سے چابی دے رکھی تھی جس کی سوئیاں رات دن کام کرتی تھیں اور میرے وجود کے کانوں میں ٹک ٹک کرتی رہتی تھیں مجھے تو یہ تک سوچنے کی فرصت نہ تھی کہ آیا میں خوش قسمت ہوں یا بدقسمت، کامیاب ہوں یا ناکام۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ ایک دن میں چھوٹے چوک سے گذر رہا تھا ایک فقیر کی آواز میرے کانوں میں پڑی وہ یہ شعر گا رہا تھا۔

برانیم تند وبتازیم تیز　　　چو آسودہ گردیم گویند خیز

یہ سنکر میری طبیعت اس قدر منغض ہوئی گویا مجھے ماں باپ کی گالیاں دی گئی ہوں۔ جی چاہتا تھا ڈنڈے سے اس کی کھوپڑی توڑ دوں۔

تم جانتے ہی ہو میرے تجارتی کاموں میں روئی اور رادن کا کاروبار شامل تھا اور اس طریقے سے کہ جن کی عقل بھی دنگ رہ جائے، اہل ایران سے سستی خریدتا اور یورپی خریداروں کو مہنگی بیچتا تھا۔ جس دن مال تہران پہنچنے والا ہوتا مجھے رات بھر نیند نہ آتی تھی۔ منہ اندھیرے ہی اس کاروانسرائے میں جہاں مال اتارتے تھے ناگہانی موت کی طرح داخل ہوتا اور کہنی تک اپنے بازوؤں کو روئی اور رادن کی گانٹھوں میں ڈالکر ٹٹولتا کہ کہیں بیچنے والوں۔ دلالوں۔ خچر والوں اور رکیبوں نے مال چرا کر اس میں پتھر ہی ڈال دیئے ہوں، وہ اگر کبھی میرے قابو میں آتے تو فساد کی اینٹ سے ایسا جھگڑا پیدا کر دیتا کہ دنیا حیران رہ جاتی۔ ایک دن خبر ملی کہ وہ روئی جو میں نے جرمنی کی فرم کو بھیجی تھی جب ہمبرگ میں جہاز سے اتار رہے تھے۔ تو گٹھو کا کپڑا پھٹ گیا اور قلیوں پر اینٹوں اور پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ میں نے وہ پتھر اور اینٹوں کے ٹکڑے اگرچہ اپنے ان منحوس ہاتھوں سے روئی میں چھپائے تھے۔ لیکن عدالت میں خدا۔ رسولؐ۔ موسیٰؑ۔ عیسیٰؑ۔ بارہ اماموں، چودہ معصوموں اور اس قسم کی بڑی بڑی قسمیں کھائیں کہ مجھے اس واقعہ کا بالکل علم نہیں اور جس طرح بھی ہو سکا میں نے بیمہ کمپنی کو قصور وار ٹھہرا کر ان فرنگیوں کا بیڑا غرق کیا، اپنی بات منوائی اور روپیہ جیب میں ڈالا۔ لعنت ہے ایسی تجارت اور ایسی زندگی پر۔ اب جب مجھے اس کا خیال آتا ہے تو شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔ آہ افسوس ہے ایسے کاموں پر اور ایسی زندگی پر۔

حاجی فتح اللہ کی بات جب یہاں تک پہنچی تو یہ آدمی جو شمر ذی الجوشن سے زیادہ شقی تھا اور سو دینار کے بدلے میں علی اصغر حسین کے سر کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرنے پر آمادہ ہو جانے والا تھا اچانک زار و قطار رونے لگا۔ اس کے آنسو اس کی داڑھی مونچھوں سے ہوتے ہوئے میرے سر اور بالوں پر گرنے لگے۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے پاس چارپائی پر بٹھا لیا ایک سگریٹ سلگا کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ کوئی بات نہیں، آنسو بہاؤ کیونکہ آنسو ہر درد لا دوا کی دوا ہے" دیر تک اس کے کندھے اوپر اٹھتے اور نیچے آتے رہے اور وہ روتا رہا۔ اس کے بعد آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ اس نے سلسلۂ گفتگو دوبارہ شروع کیا۔

• ہاں تو میں عرض کر رہا تھا اس مکر و فریب، جان کاہی اور کتوں کی سی انتہائی تکلیف دہ بھاگ دوڑ جسے میں نے تجارت اور زندگی کا نام دے رکھا تھا میرے مشکل کشا ہاتھوں سے ختم ہوئی اور تیر اخضر میرے لئے کلید نجات بن گیا۔ جوں ہی مجھے معلوم ہوا کہ دنیا ہی بدل گئی ہے اور دوسری دنیا میں داخل ہو چکا ہوں میں نے سکون کا سانس لیا، اپنے اور اپنے اردگرد پر نگاہ ڈالی۔ میں نے دیکھا کہ تاریکی و تنہائی کی جگہ ہے، سودا بازی اور لین دین کا یہاں کوئی امکان نہیں ہے، نفع بازی اور مال و مکنت کی حس میرے سر سے ختم ہو چکی ہے، میں نے اپنے آپ کو ایسی راحت و آرام میں پایا کہ کبھی نہیں پایا تھا۔ اس گھڑی کے بعد وہ لذت جو اس نئی دنیا میں حاصل ہوئی ہے لحظہ بلحظہ بڑھتی جا رہی ہے مجھے یقین ہے کہ میں بہشت کے صحن میں ہوں اور مجھے امید ہے کہ بہشت کی طرف جا رہا ہوں۔ میرے بزرگ، بار بار تیری زندگی اور جوانی کو دعا دیتا ہوں۔ تو اگر نہ مارتا تو میں کئی سال تک ایک کیڑے کی مانند اپنی گندگیوں میں رینگتا رہتا طرح طرح کے درد اور بیماریوں میں مبتلا ہو اور جواب لینے کے بعد ان لوگوں کے سامنے جان دے دوں جن کی اکثریت ان کتوں کی طرح ہے جو قصائی کی دکان پر دم ہلاتے ہوئے ہڈی کے ایک ٹکڑے کے منتظر ہوتے ہیں میری موت کے منتظر ہیں۔ یہی جھوٹ موٹ میرے سامنے پر میری زندگی

اور دولت کی بقا کی دعا کرتے ہیں مگر حقیقتاً نذر نیاز مانتے رہیں تاکہ میں مر جاؤں۔ میرے مرنے کی دیر ہے کہ اس لعنتی مال کو جس کا تنہا میں ہی محافظ ہوں اور جسے میں نے بڑی محنت سے جمع کیا ہے اپنے میراث کھانے والوں کے لئے چھوڑ جاتا۔ اور کسی ویران جگہ پر چلا جاتا۔ تو نے مجھے اس ذلت و خواری سے نجات دی۔ تو نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے عافیت و رستگاری کے نورانی راستہ پر لا کھڑا کیا ہے۔ اگر ہزار سال تک سو زبانوں سے تیرا شکریہ ادا کروں تب بھی حق ادا نہیں ہو سکتا۔ تجھ سے ملنے کی آرزو تھی اس لئے جس طرح بھی ہو سکا تیرا کھوج لگایا اور تجھ تک آیا ہوں تاکہ تیرے چاند سے مکھڑے پر پورے خلوص سے بوسہ دوں اور تجھ سے کہوں کہ میرا ہاتھ خالی ہے، میں تیرا بدلہ نہیں چکا سکتا۔ اللہ تعالیٰ جو عالم الغیب ہے ہر بھید اور راز کو میری اور تیری بہ نسبت کہیں بہتر جانتا ہے۔ تجھے اس کی جزا دے گا۔ کیونکہ اس قسم کی نیکیوں کا بدلہ دنیاوی مال و متاع سے نہیں دیا جا سکتا۔ اچھا خدا حافظ۔ اللہ کے حوالے"۔

میں نے جب آنکھیں کھولیں تو میں اکیلا ہی تھا لیکن ابھی تک میرا چہرہ حاجی کے آنسوؤں سے تر تھا۔ سگریٹ جو اس نے پیا تھا اس کا آدھا جلا ہوا ٹکڑا میری چارپائی کے سامنے زمین پر پڑا تھا اور اس کی بو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں یقین کرنا نہیں چاہتا تھا کہ یہ واقعہ سوائے خواب و خیال کے کچھ اور بھی ہو سکتا ہے لیکن آواز میری روح کے کانوں اور میرے وجدان کی گہرائیوں میں گونج رہی تھی کہ جو کچھ تو نے دیکھا اور سنا ہے عین حقیقت ہے اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس آواز کو میں نے اتنی بار سنا کہ ہر غلط خیال کو دل سے نکال دیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ حاجی کی روح تھی جو مجھ سے ملنے آئی تھی اور اس نے ہی اپنے نظریات کو بیان کیا تھا اور ایسے جیسا کہ میں بالکل ہی بدل گیا تھا تمام وسوسے اور خوف جاتے رہے۔ ایک عجیب قسم کی باطنی صفائی کہ اس جیسی میں نے کبھی محسوس نہیں کی تھی اپنے آپ میں دیکھی اس آدمی کی مانند جو کسی گرم حمام سے باہر آئے اپنے آپ کو ہر پلیدی اور آلودگی سے پاک اور صاف پایا۔ برسوں العقدسے اپنے لئے ایک نئی دنیا بسائی ہے جو اس دنیا سے دور بہت دور ہے، مجھے دلی سکون و آرام حاصل ہے اور میرا خیال ہے بہت کم لوگوں نے اس کا مزہ چکھا ہوگا۔ اب زندگی اور موت میرے لئے برابر ہے۔ اب دونوں کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہوں میری آنکھوں کے سامنے واضح ہو گیا ہے۔ کہ زندگی ایک جوئے کم آب ہے جو مشیت ایزدی کے بحر بیکراں میں جا گری ہے"۔ میں نے کہا "سہراب عجیب عارف ہو گئے ہو، مبارک ہو، لیکن اب جب تو موت کو اس نظر سے دیکھتا ہے میں افسوس کے ساتھ ایک بری خبر سناتا ہوں۔ ٹھیک ایک ہفتہ ہوتا ہے کہ تیری ماں فوت ہو گئی ہے۔ میری موجودگی میں اسے غسل دیا گیا اور کفن پہنایا گیا، ہم نے ایک اچھی جگہ پر اسے دفن کر دیا ہے، انشاء اللہ تو جلد رہا ہو جائے گا اور ہم دونوں اس کے مزار کی زیارت کو جائیں گے"۔

ایسے لگتا تھا جیسے خوشی کی خبر سنی ہو، اس کا چہرہ چمک اٹھا اور خوشی کے آثار اس کے چہرے پر نمودار ہو گئے۔ وہ کہنے لگا۔ "اللہ تیرا شکر ہے، مجھے اپنی ماں کا غم کھائے جا رہا تھا جو میرے ہی غم میں ہلاک ہو گئی ہے میں ڈرتا تھا کہ میرے مرنے کے بعد وہ تنہا بے کس بے زبان اور بغیر مددگار کے رہ جائے گی، واہ کیا ہی اچھا کیا کہ مجھ سے پہلے چلی گئی، خدا اس پر رحمت کرے وہ شیر عورت اور بہترین ماں تھی"۔

وقت ختم ہو گیا تھا میں نے سہراب کو بوسہ دیا اور قید خانے سے باہر آ گیا۔

دو دن کے بعد منگل وار تھا خبر ملی کہ حکم سنا دیا گیا ہے اور جمعرات کو علی الصبح ہی پھانسی دیں گے۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ دل کی خواہش پر قابو پالوں اور پھانسی دیئے جانے کی جگہ پر نہ جاؤں لیکن دل نے گواہی نہ دی۔ میں ٹھیک وقت پر وہاں پہنچ گیا۔

زیادہ دیر نہ گذری کہ سہراب کو لائے۔ پھانسی تیار تھی۔ سیدھا اسے پھانسی کے تختہ پر لے گئے ان چند لوگوں میں جو تماشا دیکھنے کے لئے آئے ہوئے تھے کسی کی نگاہیں مجھے تلاش کر رہی تھیں۔ جب آنکھیں چار ہوئیں تو ایک بے جان سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر جم گئی۔ اس نے سر سے ہلکا سا اشارہ کیا کہ خدا حافظ الوداع۔ میں نے بھی اُسے جواب دیا۔ (باقی صہ ۴۶ پر)

کرشن موہن

قطعات

سرد راکھ

حرارتِ زندگی نہیں، سرد راکھ کا ایک ڈھیر ہوں میں
مجھے کسی کے برہ کی اگنی جلائے بیٹھی ہے مدتوں سے
عجب ہے چاہت کی بے بسی بھی، غضب ہے جذبے کی نارسی بھی
اداس ہوں، یاس دل پہ دھونی رمائے بیٹھی ہے مدتوں سے

پاگل کی بکواس

اک پاگل کہتا تھا سنسار ہے ستیہ ناس
ہستی کی حکایت ہے اک پاگل کی بکواس

کیفِ بہاراں

اہلِ جنوں کو بھی ہے سکوں اس موسم میں جان و دل پر رونقِ ہستی چھائی ہے
حسنِ بہاراں، صحبتِ یاراں، فرطِ نشاط بستی بستی مستی چھائی ہے

کھلونی

ہر اچھی چیز پر موہت ہے روہت[1] یہ رُت بچپن کی ہے کتنی سلونی
مزاجِ عاشقانہ دیکھئے گا! کھلونے کو بھی کہتا ہے کھلونی

---

[1] میرے بچے کا نام

یعنی " اگر بتوں کو پتھر کے پوجنے سے خدا مل جاتا تو میں پہاڑ کو پوجتا - ارے بیوقوف اس سے تو چکی کا پتھر ہی اچھا جس سے مخلوق آٹا پیس کر کھاتی ہے "

(۴)

ذات نہ پوچھو سادھو کی پوچھ لیجئے گیان
مول کرو تلوار کا پڑا رہنے دو میان

یعنی " کسی درویش سے اس کی ذات مت پوچھو - کیونکہ تلوار کا خریدار اس کے لوہے کے جوہر دیکھتا ہے میان کو نہیں دیکھتا "

(۵)

موئے کو کیا روئے جو اپنے گھر جائے
روئے بندی دان کو جو ہاٹ ہاٹ کمائے

یعنی " کسی کے مرنے پر کیوں روتے ہو وہ تو قید ہستی سے آزاد ہو گیا - البتہ اس پر روؤ جو پیٹ کی خاطر گھر گھر بھیک مانگنے جاتا ہے "

(۶)

جو گھٹ پریم نہ سنچرے سو گھٹ سان مسان
جیسے کھال لہار کی سانس لیت ہر آن

یعنی " جو دل عشق الٰہی سے خالی ہے - اس کی مثال مُردہ کی ہے - جس طرح لہار کی دھونکنی کی کھال ہر وقت سانس لیتی رہتی ہے "

(۷)

جب میں تھا تو گرو نہیں جب گرو ہیئے میں ناہیں
پریم گلی ست سانگری تا میں دو نہ سمائیں

یعنی " جب تک مجھ میں خودی رہی خدا کی محبت حاصل نہ ہوئی اور جب خدا مل گیا تو خودی غائب ہو گئی کیونکہ محبت کی راہ میں صرف ایک ہی کا گذرنا ممکن ہے "

(۸)

کبیر سنگت سادھو کی جوں گندھی کی باس
جو گندھی کچھ دے نہیں سو بھی باس سو باس

یعنی " اللہ والے کی صحبت ایسی ہے جیسے عطر فروش کا قرب - اگر وہ کچھ دے نہیں دیتا تو خوشبو سے دماغ کو تو معطر کر ہی دیتا ہے "

(۹)

جہاں دَیا وہاں دہرم ، جہاں لوبھ وہاں پاپ
جہاں کرود وہاں کال جہاں کال وہاں آپ

یعنی "جہاں رحم ہے وہاں مذہب ہے، جہاں لالچ ہے وہاں نااتفاقی ہے، جہاں غصہ ہے، وہاں موت ہے، اور جہاں عفو اور درگذر ہے وہاں وہ خود آپ ہے"

(۱۰)

تنکا کبھو نہ نندئے جو پاؤں تلے پڑ جائے
کبھو اڑے آنکھن پڑے تو بدن دکھی ہو جائے

یعنی "اس تنکے کو جو تمہارے پیر کے نیچے ہے حقیر مت سمجھو۔ وہی جب ہوا سے اُڑ کر آنکھ میں گر جاتا ہے، تو تمام جسم کو تکلیف ہوتی ہے"

(۱۱)

چلتی چاکی دیکھکر دیا کبیرا رو
ان دو پاٹن کے بیچ میں ثابت بچا نا کوئ

یعنی "چکی چلتی ہوئی دیکھکر کبیر کو اس وجہ سے رونا آیا کہ جس طرح چکی میں پس کر کوئی ناج کا دانہ ثابت نہیں رہتا اسی طرح زمین اور آسمان کے بھی دو پاٹ ہیں جن کے درمیان میں بھی ہر چیز فنا ہو کر معدوم ہو جاتی ہے"

حمید کوثر

غزل

مصیبت عین راحت ہو گئی ہے
محبت اب قیامت ہو گئی ہے

قضا پیغام راحت ہو گئی ہے
مرے جینے کی صورت ہو گئی ہے

نہیں چلتے فلک پر اب ستارے
شب فرقت قیامت ہو گئی ہے

کوئی تم کہا رہا ہے اس خوشی میں
بہت مجھ پر عنایت ہو گئی ہے

کوئی جیسے نہ ہو اپنا جہاں میں
مجھے سب سے شکایت ہو گئی ہے

انھیں کیوں رحم اب آتا ہے مجھ پر
یہ کیسی میری حالت ہو گئی ہے

یہاں تک بڑھ گئی ہے بے قراری
مجھے اپنے سے نفرت ہو گئی ہے

رہائی چاہتا ہوں زندگی سے
مگر جینے کی عادت ہو گئی ہے

سُنا ہے اس مری دیوانگی کی
زمانے بھر میں شہرت ہو گئی ہے

زمانہ بے وجہ ہنستا ہے مجھ پر
کہ میری رونی صورت ہو گئی ہے

حمید اب غم نہیں کوئی جہاں میں
مصیبت عین راحت ہو گئی ہے

محمد خورشید عاصم (کوریائی افسانہ)

پرولتاری عدالت

مشرق والوں پر خدا کا قہر ٹوٹے، مغرب والوں پر خدا کا عذاب نازل ہو ـــ میرے وطن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے خون میں نہلانے والوں پر خدا کا عتاب ہو۔ خدا ان سب کو غرق کرے۔

وہ زور زور سے دروازے کھٹکھٹا رہے تھے اور دیواروں کو کوٹ رہے تھے "چلو چلو۔ باہر نکلو۔ سب لوگ کھیل کے میدان میں پہنچو۔" ڈر کے مارے کانپتے ہوئے ہم اٹھ کھڑے ہوئے ـــ ہم اپنی گرم رضائیوں سے نکل کر صبح کی سرد ہوا میں کھڑے تھے۔ میں، میرا باپ، ماں، بھائی اور بہنیں ہم سب بستروں سے نکل پڑے تھے۔ "نکلو۔ نکلو۔ چلو۔ کھیل کے میدان میں پہنچو۔" دروازے زور زور سے پیٹے جا رہے تھے اور شور جاری تھا۔

"اوک سیون کے بارے میں کیا کیا جائے؟" ماں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے باپ سے پوچھا۔ "ان کو کیا خبر کہ وہ یہاں ہے؟ شاید اس کے چھپے رہنے ہی میں بہتری ہو؟"

"اوں ہوں" باپ نے نفی میں سر ہلایا۔ "آخر ان کو معلوم تو ہو ہی جائے گا۔"

"لیکن کس طرح اگر ہم اسے چھپائے رکھیں تو کسی کو کیا پتہ چلے گا۔"

"پتہ چل جائے گا... ان کو تو پتہ چل ہی جائے گا۔ وہ دروازے توڑ کر بغیر اطلاع کے گھروں میں گھس جاتے ہیں۔ پچھلی رات ہی وہ ہمارے محلے کے بارہ گھروں میں اسی طرح گھس گئے تھے۔ ہاں... آدھی رات کو... انہوں نے دروازہ پیٹا اور پھر بوٹوں سمیت اندر گھس گئے اور ہر چیز کو توڑتے پھوڑتے مردوں کو گھسیٹ لے گئے۔"

"بوٹوں سمیت؟" اس ناقابلِ یقین بربریت کا ذکر سن کر ماں ایک لمحہ تک تو بول بھی نہ سکی۔ کیونکہ کوئی کنگال اور جاہل سے جاہل گنوار بھی بغیر جوتے اتارے کسی کے گھر میں داخل ہونے کا تصور نہیں کر سکتا۔

"لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم اسے بحفاظت چھپا سکتے ہیں۔" ماں نے پھر بحث شروع کر دی۔

"نہیں نہیں..." باپ نے احتجاج کیا۔ "بہت خطرہ ہے۔ بہتر یہی ہے کہ وہ ہمارے ساتھ چلے۔"

"لیکن...."

لیکن بحث کا وقت ہی کہاں تھا۔ "نکلو، نکلو ـــ چلو ـــ" باہر شور مچ رہا تھا اور دروازے دھڑا دھڑ ٹوٹ رہے تھے۔ وہ ہر مرد، عورت، بچے کو ہانک کر لئے جا رہے تھے۔ میں بھی اپنے ماں باپ، بہنوں اور بھائی کے ساتھ کھیل کے میدان کی طرف چل دی۔

میں ایک ہی ماہ قبل گھر لوٹی تھی۔ میرا سال بھر کا وظیفہ ختم ہو گیا تھا اور میں اپنے پسماندہ ملک کے لئے "مغرب کی دانش" اکٹھی کر کے لائی تھی۔ جہاز سیول میں توقع سے ایک دن پہلے مگر بہت رات گئے پہنچا تھا۔ جب میں آدھی رات کے بعد گھر پہنچی تو مجھے کسی بھی ہمسائے نے آتے ہوئے نہ دیکھا تھا

میرا باپ بھی اگرچہ باقی گھر والوں کی طرح میرے آنے پر بہت خوش تھا تاہم اس نے کہا "بس بس اب سب سو جائیں۔ وہ بہت تھکی ہوئی ہے باتیں صبح ہو جائیں گی۔"

تھکی ہوئی تو میں تھی ہی۔ طویل سفر نے مجھے اس قدر نڈھال کر دیا تھا کہ آتے ہی نقاہت کی وجہ سے بخار نے غلبہ پا لیا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں بخار کا مقابلہ محض اس لئے کرتی رہی تھی کہ گھر پہنچ لوں اور اب جونہی میں اپنے بستر میں لیٹی اس نے آ دبوچا۔ میں ہفتوں بیمار پڑی رہی۔

میری بیماری کی ابتدا ہی میں ناگہاں غنیم کی طرف سے فوجیں میرے وطن پر چڑھ دوڑیں اور جو کچھ سامنے آیا اسے اٹھاتیں تہس نہس کرتیں، میری مادرِ وطن پر مسلط ہو گئیں۔ اور اسے ایک ایسی غیر حکومت کے قبضے میں دے دیا جو اگرچہ ہماری قوم ہی کی اولاد کی تھی لیکن ان کی شخصیتیں اور ان کے کردار بیرونی ملکوں میں ڈھالے گئے تھے — میرے وطن پر ایک جابر حکومت قابض ہو گئی ایسی حکومت جس کا دل اور دماغ دونوں احساسات سے عاری تھے۔

ایک دفعہ اس کرۂ ارض کے دوسری جانب ایک ملک میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر، ملکۂ معظمہ کے وزیرِ اعظم اور سپریم سوویٹ کے چیئرمین اپنے اعلیٰ افسروں، مشیروں اور انسانی امور کے ماہروں سمیت اکٹھے ہوئے تھے۔ نقشے کے سرخ، سبز، زرد اور نیلے رنگ ان کے سامنے چمکتے تھے — دنیا کی قسمت کا فیصلہ کر دیا گیا تھا — یہاں سے کاٹا، وہاں سے کترا۔ ادھر لائن لگائی ادھر حد قائم کی — تاریخ کی کتابوں میں ہے کہ فوجی سہولت کے مدنظر میرا وطن دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ہمارے دل و دماغ، ہمارے خاندان اور ہماری زندگیوں کے بخیے اڑا دیئے گئے تھے۔

میرے پیارے وطن کیا کبھی تیرے چاول اور تیری کا شراب پھر وہی مزا دے گی؟ کیا تیرے بربط اور تیری بنسریاں پھر کبھی اس فضا میں پیار کے نغمے بکھیر سکیں گی؟

اس دفعہ پھر ہم کھیل کے میدان میں تھے۔ وہی کھیل کا میدان جو ہمارے بہت سے حسین تصورات کی آماجگاہ تھا اب بدترین تکلیف دہ یادگار بننے والا تھا۔ وہی میدان جس میں میں نے اپنی ہم جماعت لڑکیوں کے ساتھ بچپن کے حسین دن گزارے تھے، میدان جو ہمارے جاپانی حکمرانوں کے دورِ حکومت میں بنا تھا — وہ دور جس میں تمام کوریا کو ایک بیرونی زبان بولنے لکھنے اور اس میں سوچنے کا حکم تھا اور اگر کہیں برسرِعام بھولے سے بھی اپنی مادری زبان کا کوئی کلمہ منہ سے نکل جاتا تو اس رعایا کے "پاسبان" یا ان کے "جی حضوری" تھپیڑوں سے نڈھال کر دیتے تھے۔ یہی میدان تھا جس میں میرے باپ کو دوسرے لوگوں کے ہمراہ شنتو مذہب کی عبادت گاہ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے لئے جانا پڑتا تھا۔ وہی میدان جس میں پھر ہمارے حکمرانوں کے سوچنے کے انداز میں اچانک تبدیلی آئی — وہ ہمیں اپنے بھائی، ہم نسل اور مشترکہ تہذیب کے وارث قرار دینے لگے۔ اور ہمارے جوانوں کو فوج میں بھرتی ہونے کی دعوت دینے لگے تاکہ "اپنے مشترکہ عظیم آبا کی عظمت کی حفاظت کی خاطر جان کی بازی لگا دیں — اس وقت ہمیں پتہ چلا کہ جنگ ان کے حق میں نہیں جا رہی اور یہ کہ ان کے لوگ ذبح ہو رہے ہیں۔

کھیل کا میدان — صبح کی سردی میں ہم اپنے آقاؤں کی رہبری کے منتظر تھے۔ ہم وہاں ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ باپ، مائیں، بچے، بوڑھے — میں نے اپنے ان ہمسایوں کو دیکھا جن سے سال بھر سے ملاقات نہ ہوئی تھی، لیکن وہ سب کچھ اس طرح گم صم تھے کہ کسی نے بھی میری اچانک آمد پر اظہارِ تعجب نہ کیا۔ صبح کی سردی میں ہم اپنے آقاؤں کی راہبری کے منتظر تھے۔

وہ آئے — وہی بھاری بوٹوں اور مضبوط رائفلوں والے — وہ اپنے ساتھ بارہ آدمیوں کو گھسیٹتے ہوئے لائے — ان بارہ آدمیوں کو جنہیں ہم جانتے تھے، وہ بارہ آدمی جن کے ساتھ ہم پلے بڑھے تھے۔

بھاری بوٹوں اور رائفلوں والے آدمی ہجوم میں بکھر گئے۔ وہ سو یا اس سے کچھ زیادہ تھے۔ ایک ایک ہو کر وہ پھیل گئے، ہم میں سے ہر ایک کو

اپنی چمڑی کے ساتھ کسی غیر ملکی کے چپٹے ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے سرطان ہماری روح کو کھائے جا رہا ہے۔

ان کا لیڈر پلیٹ فارم پر چڑھا اور نظر اٹھا کر آہستہ آہستہ اپنے اردگرد لاتعداد چہروں کو دیکھا۔ ایک اشارہ ہوا اور ان جانے پہچانے بارہ آدمیوں میں سے ایک آدمی اس کے پاس کھڑا کر دیا گیا۔ یہ آدمی میونسپل کمیٹی کے دفتر میں کلرک تھا اور یہ جتنا نا اہل تھا اتنا ہی بے ضرر بھی تھا۔ وہ اپنی محدود استعداد کے مطابق اپنے غیر اہم کام میں جُتا رہتا تھا۔ وہ ایسا آدمی تھا جس کا نوکری سے واحد مقصد باقاعدہ تنخواہ حاصل کر سکنا اور شام کو اپنے گھر چلے جانے میں تھا۔

میں نے ہجوم میں اس کے بیوی بچوں کو بھی دیکھا تھا۔

"کامریڈز" لیڈر دہاڑا۔ "قوم کے اس غدار کو دیکھو — یہ آدمی جسے آپ دیکھ رہے ہیں اس کے ہاتھ میں سالہا سال سے اس شہر کے لوگوں کی زندگیاں اور ان کی فلاح و بہبود تھی — یہ ہے وہ آدمی جو راشن کارڈ بناتا ہے۔ یہی ہے جو یہ فیصلہ کرتا ہے کہ تم کو کتنے چاول ملنے چاہئیں اور کب ملنے چاہئیں۔ کامریڈز اس کے کام کی تحقیقات سے ہماری برادری کے راشننگ کی بہت سی بدانتظامی کی باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ جب اس غدار، وطن دشمن سے اپنے اطوار درست کرنے کو کہا گیا تو اس نے مزاحمت کی اور رجعت پسندانہ، خلافِ انقلاب مشورے دیئے۔ دس دن سے وہ راشننگ کو دیانتدارانہ اور معقول انداز میں منظم کرنے کی ہر کوشش کو ناکام بنانے اور خفیہ طور پر تباہ کرنے میں لگا ہوا ہے — کامریڈز" وہ چیخا۔ "اس غدار کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"

"گولی سے اڑا دو"۔ وہی سو آدمی جو ہجوم میں بکھرے ہوئے تھے بازو لہراتے ہوئے یک زبان ہو کر گرجے۔ "گولی سے اڑا دو"۔

لیڈر نے اثبات میں سر ہلایا "کامریڈز شکریہ۔ غداروں سے یہی سلوک مناسب ہے"۔

اس نے اپنا بھاری پستول نکالا اور اس آدمی کی کنپٹی کے ساتھ لگا کر گھوڑا دبا دیا۔ کلرک پلیٹ فارم کے تختوں پر گرا — ہجوم کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

"غداروں کو موت" وہ سو آدمی پھر چیخے — خون تختوں کی درزوں سے بہتا ہوا زمین پر گر رہا تھا اور اسے رنگین بنا رہا تھا۔

ایک دوسرے آدمی کو اس کی جگہ لا کھڑا کیا گیا۔

"کامریڈز" لیڈر دھاڑا "قوم کے اس غدار کو دیکھتے ہو...؟"

اس آدمی کو پہچانتے ہی ہجوم میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ میں نے بھائی کو ابا کے کان میں کہتے سنا "ابا! کیا یہ آدمی کمیونسٹوں کا لیڈر نہیں؟"

"ہاں"

"پھر یہ — ؟"

"تین قسمیں ہیں — ایک وہ جو ہمیشہ جنوبی کوریا میں رہے، دوسرے جنہوں نے روس اور چین میں تربیت حاصل کی اور تیسرے وہ جو تقسیم کے بعد شمالی کوریا میں تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے ہیں۔ اب انہوں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا ہے"۔

لیڈر نے الزامات کا بیان ختم کر لیا تھا۔ "کامریڈز ہم اس غدار سے کیا سلوک کریں؟" وہ چیخا۔

"گولی سے اڑا دو"۔ وہی سو آدمی پہلے کی طرح گرجے۔

لیکن اب کے لیڈر ناراض معلوم ہوتا تھا۔ "کامریڈز میں پوچھتا ہوں کہ غدار سے کیا سلوک کیا جائے اور آپ توجہ ہی نہیں دیتے۔ کامریڈز ذرا سوچ لیجئے۔ آرام سے اس معاملہ پر غور کر لیجئے۔ میں ایک منٹ کے بعد پھر سوال دہراؤں گا"۔

ان سو آدمیوں نے غصہ بھری نظروں سے ہمیں دیکھنا شروع کر دیا۔ پھر وہ اپنی جگہ پلٹے اور باری باری ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور

سناسنا کر کہنے لگے۔" نہ جانے ہم میں یہاں اور کون کون سے غدار ہیں"۔

لیڈر نے پھر ہجوم سے خطاب کیا۔" کامریڈز! ہم قوم کے اس غدار کے ساتھ کیا سلوک کریں ؟"

"گولی سے اڑا دو"۔ سو آدمی گرجے۔

"گولی سے اڑا دو"۔ ہمارے ہونٹ حرکت میں آئے۔

لیڈر مسرور نظر آتا تھا۔ اس نے پستول نکالا اور سر کے قریب لا کر داغ دیا۔ اس آدمی کا خون بھی پہلے کے خون میں شامل ہو کر میدان پر گرنے لگا۔

لیڈر نے اسی طرح دس بار ہم سے خطاب کیا اور ہر بار جب ہمارے ہونٹوں سے "گولی سے اڑا دو"۔ نکلتا تو جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی۔ دس بار پھر کوریا کا خون کوریا کی سرزمین پر گرایا گیا۔

جوں جوں وہ سرد صبح ٹھنڈے دن میں تبدیل ہو رہی تھی۔ ہماری کپکپی میں اضافہ ہو رہا تھا

میرے پیارے وطن! کیا کبھی تیرے چاول اور تیری شراب پھر وہی مزا دے گی۔

کیا تیرے بلبل اور بنسریاں پھر کبھی اس فضا میں پیار کے نغمے بکھیر سکیں گی۔

مشرق والوں پر خدا کا قہر ٹوٹے۔

مغرب والوں پر خدا کا عذاب نازل ہو۔

میرے وطن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے خون میں نہلانے والوں پر خدا کا عتاب ہو۔ خدا سب کو غرق کرے۔

نصیر پرواز

غزل

گویا مثل نقش پا ہوں !
صدیوں سے خاموش پڑا ہوں

ہنستے دن اور روتی راتیں
میں اکثر ان سے بہلا ہوں

احساسات کے بازاروں میں
اپنی دھڑکن بیچ رہا ہوں !

پیار جو اک ٹوٹا درپن ہے
میں وہ درپن جوڑ رہا ہوں

تم دنیا کو جنت کہہ لو
میں اس سے منہ موڑ چکا ہوں

یہ دنیا گر اک لمحہ ہے
کوئی بتائے پھر میں کیا ہوں

نغموں کے لب سوکھ چکے ہیں
اب تو بس چپ ہی رہتا ہوں

تنہائی کے ویرانوں میں
اکثر خود پہ ہنس لیتا ہوں

دیکھ کے اپنی بھیگی پلکیں
میں پرواز سلگ اٹھتا ہوں

مصنف: لیم اوفلاہرٹی ترجمہ: شام بارکپوری

"پہلی پرواز"

ننھی مرغابی پہاڑ کی چوٹی پر تنہا کھڑی تھی۔ اس کے بھائی اور بہن دونوں اُسے تنہا چھوڑ کر ایک دن قبل ہی وہاں سے پرواز کر گئے تھے۔ وہ اپنی بزدلی اور کم ہمتی کی وجہ سے وہاں تنہا رہنے پر مجبور ہو گئی تھی، اس لئے جب وہ پہاڑی سطح پر پھدکتی ہوئی، بالکل اس کے آخری سرے پر آ گئی اور اڑنا چاہا تو سمندر کی لامحدود وسعت اور تموّج کو دیکھ کر رک گئی۔ وہ اپنے نامکمل پنکھ کی وجہ سے ڈر رہی تھی کہ اگر اس نے اڑنے کے لئے چھلانگ لگائی تو شاید پنکھ اس کے بوجھ کو سہارا نہ دے سکیں اور وہ چٹانوں سے ٹکرا کر ختم ہو جائے گی۔ اس لئے وہ ڈرتی ہوئی اپنے پہاڑی گھونسلے میں واپس آ گئی اور ساری رات وہیں گزار دی۔

اس کے بھائی اور بہن جو نہ صرف اس سے چھوٹے تھے بلکہ ان کے پر بھی ابھی نامکمل تھے، وہ اُڑنے کی کوشش کرتے رہے اور آخرکار اُڑتے ہوئے وہاں سے چلے گئے، لیکن قطع نظر اس کے کہ وہ اڑنے کی سعی کرتی، اس نے تو اپنے پیروں کو تولنا بھی گوارا نہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُسے وہاں اکیلا ہی رہ جانا پڑا۔ اس کے والدین اس کے گرد چکر لگاتے، پھدک پھدک کر اڑنے کے طریقے بتاتے اور اپنی زبان میں بھوک اور تنہائی کا احساس بھی دلاتے جاتے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ بزدلی کے باعث اُڑ نہ سکی، آخر اس کے والدین اسے چھوڑ کر چلے گئے۔

گھر کے تمام افراد کو گئے ہوئے چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں کوئی بھی اس کی خیریت دریافت کرنے واپس نہ آیا۔ اس نے دیکھا کہ دور سمندر کے اُوپر اس کے بھائی اور بہن قلابازیوں کی مشق کر رہے ہیں اور اپنے والدین سے پرواز کے نئے نئے گُر سیکھ کر فضا کی پہنائیوں میں دادِ پرواز دے رہے ہیں۔ اس نے اپنے بھائی اور بہن کو بہت اچھی طرح پرواز کرتے ہوئے دیکھا حتیٰ کہ اس کا بڑا بھائی باقاعدہ سمندر میں غوطہ لگا کر مچھلیاں بھی پکڑ رہا تھا اور خاندان کے تمام افراد اس کی تعریفیں کر رہے تھے اور جہاں تک خود اس کا تعلق تھا وہ سب اس کے تساہل پر طعنے دے رہے تھے۔

آفتاب مغرب کی جانب تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی جو جنوبی رُخ پر واقع تھی، اب دھوپ کی تپش سے گرم ہو رہی تھی۔ پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ اس نے گزشتہ چوبیس گھنٹے میں کچھ بھی نہیں کھایا تھا اس لئے بھوک الگ پریشان کر رہی تھی۔ گرمی کی شدت سے ویسے ہی برا حال تھا، بھوک اور پیاس سے بے قابو ہو کر وہ اپنی لمبی چونچ سے سنگ ریزوں کو کریدتی رہی، سوکھی مچھلی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آیا۔ جسے وہ نہایت ہی بے صبری کے ساتھ نگل گئی اور پھر سوکھے ہوئے انڈوں کے چھلکوں کو کریدنے لگی جس سے مایوسی کے سوا اور کچھ بھی حاصل نہ ہو سکا۔ اسی ادھیڑبن میں وہ چٹان کی سطح پر کنارے کنارے دوڑتی رہی، کبھی ہمت کر کے آگے بڑھتی اور کبھی لڑکھڑا کر پیچھے ہٹتی۔

بالکل کنارے پہنچ کر اس نے دل میں کہا، کاش! میں اپنی ماں کے پاس پہنچ جاؤں، لیکن! وہ چونک پڑی اور سوچنے لگی کہ بغیر پرواز کئے یہ ناممکن ہے۔ پھر جب اس نے اُڑنے کا ارادہ کیا تو نیلے سمندر کی موجوں نے اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دیا۔ آخرکار وہ کنارے کھڑی

ننھا سا بہانہ کرنے لگی۔ لیکن کسی نے بھی اس کی ان حرکتوں کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ اس نے دور اپنے بھائیوں کو دیکھا کہ سمندر کے کنارے آپس میں لڑ رہے ہیں۔ اس کا باپ اپنے سفید پنکھ کو دھوپ میں پھیلا کر آرام کر رہا تھا۔ اس کی ماں اپنے پنجے میں سے کھینچ کھینچ کر ایک مچھلی کھا رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کی طرف بھی رحم آلود نگاہوں سے دیکھ لیتی تھی۔ مچھلی کھانے کے منظر نے اسے بھوک سے اور بھی زیادہ بیتاب کر دیا۔ "کاش مجھے بھی اسی طرح کھانے کا موقع ملتا"۔ اس نے زور کی چیخ ماری۔ اس کی ماں بھی اس کے جواب میں چلائی اور حسرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"گا۔ گا۔ گا" وہ بانگ لگاتی رہی۔ تاکہ اس کی ماں اس کے لئے کچھ کھانے کا سامان لائے "گا۔ لوہ" اس نے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ اسی طرح وہ مسلسل بانگ لگاتی رہی اور پھر ایک لمحے کے لئے وہ مسرت و انبساط سے جھوم اٹھی۔ اس کی ماں اس کی طرف مچھلی کا ٹکڑا لیکر آ رہی تھی۔ وہ بے تابی سے بڑھتی ہوئی بالکل چٹان کی نوک پہ آگئی اور اپنی چونچ کھول کر بے صبری سے انتظار کرنے لگی۔ لیکن خلاف توقع اس کی ماں قریب پہنچ کے چٹان کے پاس رک گئی۔ اب بھی اس کی چونچ میں مچھلی کا ٹکڑا اٹک رہا تھا۔ وہ حسرت سے اس کی اس حرکت کو دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہ آسکا کہ وہ اسے لالچ کیوں دے رہی ہے؟ اب وہ برداشت نہ کر سکی، بھوک سے اس کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی۔ اس نے غیر ارادی طور پر مچھلی کا ٹکڑا پکڑنے کے لئے چھلانگ لگا دی۔ حیرت زدہ سی ... اب وہ فضا میں تیر رہی تھی، اچانک وہ نیچے کی طرف تیزی سے گرنے لگی۔ اس کی ماں کافی اونچا اڑ چکی تھی۔ ایک انجانا خوف اس پر مسلط ہو رہا تھا۔ اب اس نے اپنے پنکھ کھول دیئے تھے۔ اس نے اپنے پروں کو چند بار جنبش دی۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ کھلی فضا میں آگے بڑھ رہی تھی۔ ہوا کے تند جھونکے اس کے سینے سے ٹکرا رہے تھے۔ اب وہ مسلسل اپنے پنکھ ہلا رہی تھی۔ اس طرح وہ بہ آسانی فضا میں تیرنے لگی۔ اب تمام خوف ختم ہو چکے تھے۔ لیکن پھر بھی ایک نامعلوم سی سنسنی محسوس ہوتی رہی۔ اس نے مسرت سے مغلوب ہو کر ایک بانگ لگائی۔ اس کی ماں اس کے قریب سے گا۔ گا۔ گا۔ لوہ۔ لاہ کرتی ہوئی گزری۔ اب وہ بھی اس کا جواب دے رہی تھی۔

اس کا باپ اس کی طرف دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کے ہمراہ اس کے بھائی اور بہن خوشی سے جھومتے ہوئے قلابازیاں کرتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔ اسے یہ یاد ہی نہ رہا کہ وہ کبھی اڑنے سے ڈرتی بھی تھی۔ وہ سمندر کی سطح پر پانی کے مقابل اڑ رہی تھی۔ اس نے دور بہت دور تک پھیلے ہوئے اور آسمان سے سرگوشیاں کرنے والے بحر بیکراں کے نیلے پانی کو دیکھا، ہلکی ہلکی لہروں کو سر اٹھاتے پایا۔ جس کے سینے میں سینکڑوں امنگیں پرورش پا رہی تھیں۔ اس نے سر گھما کر پیچھے کی طرف دیکھا اس کے والدین اور بھائی بہن پانی پر تیر رہے تھے۔

اب وہ اپنی ٹانگیں سمندر کے نیلے پانی میں ڈبو رہی تھی۔ تاکہ کھڑی ہو سکے۔ لیکن اس کے پاؤں ڈوبنے لگے۔ وہ گھبرا کر چیخی اور اڑنا چاہا۔ چونکہ وہ بہت تھک چکی تھی اور بھوکی بھی تھی اس لئے اسے اڑنے میں بہت دشواری ہو رہی تھی۔ وہ رک گئی۔ اس کے پیر پانی میں ڈوب چکے تھے اور اس کا پیٹ پانی سے لگ گیا تھا۔ اس طرح وہ ڈوبنے سے بچ گئی۔ اور پانی پر تیرنے لگی۔ اس کے گرد تمام عزیز و اقارب جمع ہو گئے اور اس کی ہمت بندھانے لگے اور تحفے کے طور پر اس کے منہ میں مچھلیاں دینے لگے، وہ خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی..... یہ اس کی پہلی پرواز تھی۔

ثواب یا گناہ (بقیہ سلسلہ صفحہ [illegible]) کا جب رسی نیچے آئی میں بھی تماشائیوں کے ساتھ قریب گیا اس مسکراہٹ کے ساتھ جو اطمینان و سکون کی حامل تھی میں نے یہ کہتے سنا "وہ کیا سکون سے آدم ہے"۔ رسی کے سرے پہ دی گئی گرہ کو آہستہ سے دو تین بار ڈھیلا کیا اور کسا کہ شاید کانی سخت گرہ نہیں لگائی اور اس وقت سر کو کسی قدر جھکا کر اپنے ہاتھ سے حلقے کو گلے میں ڈالا اور دنیا و مافیہا کی ذرہ برابر پرواہ کئے بغیر پاؤں کی نوک سے اس زمین... اس تیرہ و تار بہری اور اندھی زمین کو جس کے پاس اس کے لئے سوائے کینہ توزی، تلخ کامی اور بے اعتنائی کے کچھ نہ تھا۔ ٹھوکر ماری...... شاید اس کو پر پرواز مل گئے تھے۔ وہ اس زمین سے روشن اور نورانی آسمان کی جانب اٹھنے لگا جو سیماب اور اس جیسوں کے لئے میٹھے وعدوں اور تسلی بخش خوش کن خبروں سے پر اور امن و امان اور آرام و آسائش کا ایک دنیا ہے۔

یہ تھی اس کے گناہ کی سزا یا ثواب کا اجر ... جو جی میں آئے خیال کیجئے۔

سید حرمت الاکرام

غزل

سانس، نیزے کی انی ہو جیسے
وقت، ہیرے کی کنی ہو جیسے

دل کا یہ حال نہ جانے کیوں ہے
عالمِ بے وطنی ہو جیسے

ہائے! جھک جھک کے وہ اٹھتی ہوئی آنکھ
تیرِ ناوک فگنی ہو جیسے!

بے ستوں کاٹ رہا ہوں کیا کیا!
ہر نفس کوہکنی ہو جیسے

تہمتیں خود کو دیئے جاتا ہوں
آپ اپنے سے ٹھنی ہو جیسے

تری زلفوں کے بکھرنے کا سماں
رات رہ رہ کے گھنی ہو جیسے

پارہ پارہ ہوئی جاتی ہے حیات
خودگری، خودشکنی ہو جیسے

جینے والے جئے جاتے ہیں مگر
کچھ دل و جاں پہ بنی ہو جیسے

جنگ، یزداں سے چلی جاتی ہے
زندگی، اہرمنی ہو جیسے

بیتے لمحوں کا تصور حرمت
چادرِ نور تنی ہو جیسے

شاہین غازی پوری

غزل

دل جہاں بھی ڈوبا ہے ان کی یاد آئی ہے
ہائے کیا سکوں پرور دردِ آشنائی ہے

تم سراب بن بن کر اپنی چھب دکھاتے ہو
تشنہ لب مسافر کی جان پر بن آئی ہے

یہ کشاکشِ ہستی کتنی دور لے آئی!
دن کہاں گذارا ہے شب کہاں گنوائی ہے

کچھ کہا تھا پچھلی شب مدبھری ہواؤں نے
چاندنی کے طوفاں میں نیند کس کو آئی ہے

زندگی تری خاطر تیرے دردمندوں نے
اک جہان کی تہمت اپنے سر اٹھائی ہے

شیر افضل جعفری

فلک رنگ

مری بہار پہ مائل نگارشاتِ جلی
مرے فراق میں سینہ فگار ذاتِ جلی

میں آسماں سے اُترتے سرود کی منزل
مرے لبوں پہ کنول کار غزلیاتِ جلی

مرے ضمیر کے حجرے میں بے نقاب ازل
مری نگاہ میں رقصاں تبسّماتِ جلی

مرے لہو سے شگفتہ ریاضِ کون و مکاں
مرے جنوں سے درخشندہ باقیاتِ جلی

میں شاہکار رانائے الست و مستِ ازل
مرے مزاج میں نعرہ زناں صفاتِ جلی

ش۔ د شارق

غزل

غم کا تلخاب سہی یہ بھی تو پینا ہوگا
ہم کو ہر حال میں ہر طور سے جینا ہوگا

مسکرائے بھی اگر لب، نہ کھلا غنچۂ دل
خندۂ گل کا کوئی اور قرینہ ہوگا

جوشِ وحشت میں کوئی چاک گریباں کیوں ہو
اور اگر ہو بھی تو اس چاک کو سینا ہوگا

کب خبر رکھتے ہیں ساحل پہ ٹہلنے والے
دُور طوفاں میں گھرا کوئی سفینہ ہوگا

کتنے اہرام ابھی اور مکمّل ہوں گے
ایک بہتوں کا ابھی خون پسینہ ہوگا

تابکے نرگسِ بیمار رہے گی بیمار
اور حاصل اُسے کب دیدۂ بینا ہوگا

دُور پہنچے گی بہت بادہ و مینا سے بات
جب کبھی تذکرۂ بادہ و مینا ہوگا!

جس نے احساس کی اور درد کی دولت پائی
کتنے تیروں کا نشانہ بھی وہ سینہ ہوگا

شارق اشعار میں اظہارِ غبارِ خاطر
اِس سے بہتر نہ کوئی اور قرینہ ہوگا

بشیر محمود اختر

کچھ تو کہئے.....

بہت دنوں کی بات ہے۔ اپنا دل ایک شوخ نازنین کی دراز زلفوں کا اسیر تھا، جی یہی چاہتا تھا کہ بس باتیں کئے جاؤں اور نہاں خانۂ دل کے سب سربستہ اسرار اُس پر افشا کر دوں۔ لیکن مہلت کے ہاتھوں زبان کو یارائے سخن نہ تھا[*] کبھی اِدھر مہلت نہیں، کبھی اُدھر فرصت نہیں، گفتگو ایک گوہر نایاب سی شے معلوم ہوتی تھی ؎

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو — کہے سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو تو کیوں کر ہو

ایک روز اُس نے میرا تعارف ایک ایسے صاحب سے کرایا جو بہت ہی کم آمیز تھے۔ اُن کی گفتگو کی رفتار خرام بلکہ مخرام کی قائل معلوم ہوتی تھی، وہ محض ایک رکنی الفاظ استعمال کرنے کے عادی تھے، وہ ان صاحب کو کچھ خاموش سا کہا کرتی تھی، اِس میں تعریف کا پہلو نکلتا ہے، اُس روز سے میں حیران ہوں اور آج تک اپنی حیرت سے فارغ نہیں ہوا کہ وہ لوگ جو ہمیشہ اپنی زبانیں بند رکھتے ہیں اور مہر سکوت توڑنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کرتے، کس قدر لائق تحسین سمجھے جاتے ہیں، اپنی کیفیت تو ہمیشہ شکوہ سنج رہی ہے کہ ؎

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں — یہاں تو بات کہنے کو ترستی ہے زباں میری

بھلا کوئی بتائے کہ گونگے بہرے بنے رہنے میں آخر کیا قابلِ ستائش بات ہے، کچھ نہ بولنے سے تو کچھ نہ کچھ بولنا ہر حال بہتر ہے، کچھ اپنی کہئے، کچھ دوسروں کی سنئے، یہ مریضوں کی طرح چپ چاپ گم سم بیٹھے رہنا کہاں کی دانش مندی ہے، میں تو اُن لوگوں کو ترجیح دیتا ہوں جو بس بولے جاتے ہیں۔ جو گفتگو کے کسی معمولی سے موقعے کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اور معلومات کی بہم رسانی میں پیش قدمی کرنا عین سعادت مندی خیال کرتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسے لوگ بات چیت کے دوران میں غلطیوں سے نہیں بچ سکتے۔ شاید اُن کے ہاں بیان کا ربط و تسلسل اور وحدت خیال کی کارفرمائی نہیں ملتی۔ لیکن اُن سے کچھ دیر گفت و شنید کے بعد ہم یہ ضرور محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہمیں کچھ عنایت کر گئے ہیں، ہماری سوچ اور فکر کی کچھ گرہیں کھل گئی ہیں، اور ہم میں پہلے سے کچھ نہ کچھ اضافہ ہو گیا ہے، وہ صرف ایک خیال ہی کا کیوں نہ ہو۔

میں اُن لوگوں سے قطعاً غیر متاثر رہتا ہوں جو اپنے کو حلقوں میں جکڑے رکھتے ہیں، چہرے پر سوالیہ نشان، منہ پر تالا، آنکھوں میں ویرانی، کی تو مطلب کی بات، نہایت مختصر ترین انداز میں، ورنہ چپ سادھے دیئے۔ مثال کے طور پر وہ سیٹھ صاحب مجھے ذرا اچھے نہیں لگتے۔ جن کے ذہن پہ ہر دم سود و زیاں کا کوہ ہمالیہ سوار رہتا ہے، وہ خود تو کاروبار کے دام میں پھنسے رہتے ہیں اور جو کوئی اُن سے ملاقات کا شرف حاصل کرتا ہے اس دام سے بچ نہیں سکتا۔ اصل میں ایسے ہی "سامعین" سے اُن کی گفتگو کا کاروبار چلتا ہے۔ لیکن انہیں گلشن کے کاروبار سے کوئی ربط

---

[*] قارئین کو غلط فہمی نہ ہو، اُن کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اس مضمون کا مرکزی خیال ایک انگریزی مضمون سے ماخوذ ہے۔ یہ ابتدائی سطریں خاص طور پر پوری شدت سے اخذ کی گئی ہیں۔ بشیر محمود اختر

نہیں، گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے یا نہ چلے انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ سہانا موسم، چاند کی چاندنی، ثقافتی اور تہذیبی سرگرمیاں، پاگداؤں کی صدائیں، ان میں سے کوئی چیز ان کے لئے اتنی بھی کشش نہیں رکھتی کہ یہ اپنی زبان کو جنبش دینے کی تکلیف گوارا کریں۔ وہ ڈاکٹر صاحب کبھی میرا دل نہیں جیت سکتے (بشرطیکہ وہ پہلے ہی کسی نے نہ جیت لیا ہو) جو اپنے لاتعداد مریضوں کے دلوں کی دھڑکنیں مساح الصدر سے سننے کی شاید ناکام کوشش کرتے ہیں (اپنے دل کی دھڑکنیں نہ سنتے ہیں نہ گنتے ہیں) لیکن بجز "ہوں" کے بولتے کچھ نہیں، تھرمامیٹر دیکھ کر اسے جھٹکے دے دے کر خود بھی جھٹکے کھاتے ہیں (جھٹکا نہیں کھاتے) لیکن مجھے میرا درجۂ حرارت تک نہیں بتاتے اور "پھر" "ہوں" کہہ کر نظریں جھکا لیتے ہیں۔

اسی طرح اور بہت سے حضرات (از قسم خاموش) ہیں۔ جن کی خاموشی بے معنی بھی ہوتی ہے اور بے کار بھی، اس لئے ناگوار گذرتی ہے، اس طرح میں ایسے لوگوں سے متاثر نہیں ہو سکتا۔ اگر دل میں کچھ تاثرات مرتب ہوتے بھی ہیں تو بالکل منفی قسم کے۔

اکثر اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ میں ایسے حضرات کو کچھ کھل جانے کی طرف مائل کر لیتا ہوں۔ اور میرے بخت کی یاوری سے وہ رفتہ رفتہ کچھ کچھ گفتگو بھی فرمانے لگ جاتے ہیں۔ اتنی تو تسلی ہو جاتی ہے کہ ؎

راہ پر اُن کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں

اور امید بندھنے لگ جاتی ہے کہ ؏

اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

لیکن صد افسوس کہ میں اپنی کوشش و کاوش کے مطابق بھی اس کا ثمر نہیں پا سکتا اور دو چار ملاقاتوں میں کھل جانے کی توقع پوری نہیں ہوتی، پھر ہم کلامی کا شرف۔ ؏

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

گویا ؎

ایسے کہاں نصیب کہ وہ بُت ہو ہم کلام　　　ہم طور پر بھی جائیں تو کچھ گفتگو نہ ہو

بات در اصل یہ ہے کہ پسند تو مجھے وہ لوگ ہیں جو غیر منطقی اور بے تکلفی سے گپ شپ کہتے رہتے ہوں، وہ دانش مند تو ضرور ہوں لیکن عقل و منطق کی پاسبانی سے کبھی کبھی دل کو آزاد بھی کر دیا کریں، وہ دل کے قائل ہوں، دماغ کے پجاری نہ ہوں، نہایت محتاط، مجتنب، نماشتی ادب آداب پر عامل اور نظم و سوار قسم کے شخص سے مجھے کوفت ہوتی ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ انسان کو کندۂ ناتراشی ہی رہنا چاہئے۔ یا یاوہ گوئی میں دسترس حاصل کرنے کا ارادہ کرنا چاہئے۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ آداب و رواج کی بے جا پابندی اور محض روایات پرستی میرے نزدیک پسندیدہ نہیں۔

آپ کم از کم میری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ دنیا کے بچانوے فی صد مہربان، مخلص اور ہمدرد لوگ وہی ہوتے ہیں جو بالعموم باتونی یا بے تکے کہے جاتے ہیں۔ غالباً آج تک کسی ایسے شخص کی دریافت نہیں ہو سکی جو باتونی بھی ہو اور بوریت کا باعث بھی بنے، بوریت تو اُن کے دم قدم سے پھیلتی ہے جو کم سخن بلکہ "بے سخن" ہوتے ہیں۔ اور سامعین کی موجودگی سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ورنہ بولنے والے (سخن ور) تو یہ کہہ کر سخن داں فراہم کر لیتے ہیں ؎

بیا ور ید گر ایں جا بود سخن دانے　　　غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

وہ شخص کبھی کوئی دانش و حکمت کی بات یا عمیق خیال پیش نہیں کرتا۔ جسے بے تکی باتیں کرنے پر قدرت حاصل نہیں، جو لوگ غیر منطقی ہونے سے خائف رہتے ہیں بڑی ہی غلط منطق کے شکار ہو رہے ہیں۔

جو شخص آپ کی گفتگو میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کرتا۔ اور کبھی بیچ میں بولنے کی جرأت نہیں کرتا۔ وہ حقیقت میں آپ کی گفتگو بغور سنتی ہی نہیں رہا۔ اسں گفتگو کو وہ دلچسپ بلکہ قابل اعتنا ہی نہیں سمجھتا۔ البتہ جو شخص اپنے بارے میں باتیں کرتا رہتا ہے وہ آپ پر اعتماد کرتا ہے (یہ الگ مسئلہ ہے کہ آپ اس کے اعتماد سے کہاں تک کھیلتے رہتے ہیں۔)

اگرچہ زندگی کی بہت ساری کہاوتیں اور داناؤں کے اقوال ایسے بھی ہیں جو خاموشی کی تعریف میں ہیں، جیسے یہ کہ ایک خاموشی سو بلاؤں کو ٹالتی ہے، ایک چپ سو سکھ، جو اپنا منہ نہیں کھولتا کبھی اپنا پاؤں اس میں نہیں ڈالتا، لیکن یہ دنیا کس قدر جاندار متحرک اور شگفتہ ہوتی اگر بہت سارے لوگوں کے پاؤں ان کے منہ میں ہوتے۔ اس طرح دنیا کے حالات شاید زیادہ پُرامن ہوتے۔

القصہ جب بھی مجھے آپ کی ہم نشینی کی سعادت نصیب ہو ہمیں باتیں کرتے چلے جانا چاہئے اور اپنی اپنی غلطیاں ایک دوسرے کے سامنے جلد کرلینی چاہئے۔ تاکہ یا تو ہم آپس میں رفیق بن جائیں اور ایک دوسرے سے محبت کرنے لگ جائیں یا ایک دوسرے سے رفاقت کا رشتہ توڑ دیں۔ دوٹوک سے صاف صاف تعلقات کے زندگی میں یہی دو راستے ہیں ۔۔ اندھیرا یا اجالا!

علامہ راشد الخیری اور ان کی سوانحعمری (بقیہ سلسلہ صفحہ ۴۶)

اس کی اشاعت دیکھتے ہی دیکھتے دس گنی ہوگئی۔ علامہ اطمینان قلب سے کتابیں لکھتے رہے اور مولانا خاص اہتمام سے انہیں چھاپتے تھے۔ اسی دھندے میں اتنی برکت ہوئی کہ روپے کی ریل پیل اور گھر میں لہر بہر ہوگئی۔ اور جب علامہ ۱۹۳۶ء میں ہم سے رخصت ہوئے تو دلی کے اچھے خاصے رئیسوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

مولانا رازق الخیری نے عصمت کے علاوہ دو اور رسالوں بنات اور جوہر نسواں کو بھی بام ترقی پر پہونچا دیا۔ اور سینکڑوں کتابیں بھی چھاپ ڈالیں۔ مگر ایک ضروری کام رہا جاتا تھا۔ اس کا خیال انہیں علامہ مرحوم کی وفات ہی کے بعد سے ستا رہا تھا۔ مولانا اپنے والد مرحوم کی سوانحعمری ایک نئے انداز سے لکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے اسی وقت سے مواد جمع کرنا شروع کردیا تھا مگر ۱۹۴۷ء کے آشوب میں ان کے بیش بہا مسودات ضائع ہوگئے اور کراچی آجانے کے بعد حالات نے انہیں سنبھلنے نہیں دیا۔ یہاں تک کہ اب چند سال سے خود مولانا کی طبیعت خراب رہنے لگی اور انہیں محسوس ہوا کہ اس فرض کو مزید ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا دن رات ایک کرکے انہوں نے علامہ مرحوم کی سوانحعمری سال ڈیڑھ سال میں تیار کرلی۔ اس کی اشاعت کے سلسلے میں انہیں جو ہفت خواں طے کرنے پڑے، ان کی ایک الگ داستان ہے جس کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ بہرحال اللہ نے یہ مشکل بھی آسان کی اور مولانا اپنے فرض سے ادا ہوئے۔ یہ سوانحعمری عصمت کی ۵۷ ویں سالگرہ پر عصمت کے ایک خاص نمبر کی صورت میں شائع ہوگئی ہے۔ مولانا کا کارنامہ آپ کے سامنے ہے۔ ملاحظہ فرمائیے اور اس محنت کی داد دیجئے۔

نام نیک رفتگاں ضائع مکن   تا بماند نام نیکت برقرار

اسرار الحق شیدائی

نذر الاسلام

ارضِ مشرق کا یہ زندۂ جاوید شاعر اپنے وقت کا بہت بڑا شاعر ہے۔ وہ رنج والم اور غم و آلام اور انسانی زندگی کے دردناک پہلوؤں کا کامیاب ترجمان ہے۔ اُس کے اشعار ستم رسیدہ انسانیت، شکستہ حال کسانوں اور بدحال مزدوروں کی ستائی ہوئی زندگی کی دردناک چیخوں سے لبریز ہیں۔

بغاوت اور رومان دونوں چیزیں نہ صرف نذر الاسلام کی شاعری بلکہ اُس کی پوری زندگی پر حاوی ہیں۔ اگر ایک طرف وہ "شوخ و شنگ" کے کاکل و رخسار کا ذکر کرتا ہے تو دوسری طرف نئی دلہن کے ہاتھ میں انقلاب کی چمکتی ہوئی تیغ نا صبور دیتا ہے اور خود کو شاعرِ انقلاب کہتا ہے۔ اگر ایک طرف اسلام کی عظمت اور کرت ذکا قصیدہ خواں ہے تو دوسری طرف مناظرِ فطرت کا چابکدست مصور ـــــ

نذر الاسلام ۲۴ مئی ۱۸۹۹ء میں بردوان کے چرولیا نامی گاؤں کے ایک شریف قاضی گھرانے میں پیدا ہوا۔ زمانے کی رسم کے مطابق اسلام کی ابتدائی تعلیم عربی اور فارسی میں ہوئی۔ گاؤں کے مکتب کا معلم قاضی فضل الکرام سے اُس نے لڑکپن میں اچھی خاصی فارسی سیکھ لی۔ اور دیوانِ حافظ کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ مگر اس "مردِ خدا" کی آزاد طبیعت اسکول کی قید و بند کو برداشت نہ کر سکی۔ اور وہ تعلیمی سلسلہ کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم اپنی پوری ہولناکیوں سے چھڑ چکی تھی۔ نذر الاسلام کو قدرت کی طرف سے ایک نادر موقع ملا۔ اور وہ ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہو کر میدانِ جنگ میں چلا گیا۔ اُس وقت اُس کی عمر اٹھارہ انیس (۱۹) برس کی تھی۔ جنگی معرکوں نے اُس کے دل و دماغ اور شاعری پر گہرا اثر چھوڑا۔ جنگی بینڈ اور باجوں کی جھنکار اور زیر و بم نے اُس کے جذبات اور احساسات کو بھی طوفان بہ کنار بنا دیا۔ جس سے اُس کی شاعری کا سرچشمہ ایک بحرِ بیکراں بن گیا۔ یوں تو اُس کا سارا کلام ہیجان جذبات سے لبریز ہے۔ لیکن اُس زمانے کی خاص پیداوار اس کی مشہور نظم "باغی" ہے۔ جو ۱۹۲۱ء میں کلکتہ کے ایک رسالہ "مسلم بھارت" میں شائع ہوئی تھی۔ اُس کے کچھ حصے درج ذیل ہیں:-

جوانمرد کہدے میں ہوں سربلند ۔۔۔ تناور، تنومند، اتنا بلند
کہ قدکش ہمالہ مرے سامنے ۔۔۔ شوالگ کے مانند ہے سرنگوں
بہادر یہ کہدے فلک چیر کر ۔۔۔ مہ و مہر و انجم کو میں روند کر
بچا ہے دل عرش میں تہلکہ ۔۔۔ میں تمثال حیرت کی خود بن گیا
جوانمرد کہدے میں ہوں سربلند ۔۔۔ ہمیشہ رہے گا مرا سر بلند!

میں سرکش ہوں، آتش زباں پُرجلال
قیامت کے آشوب کا ہم عناں

اُس کے بعد کہتا ہے:-

تباہی ہوں، دہشت ہوں طوفان ہوں ۔۔۔ سراپا ہلاکت کا سامان ہوں!

ہیں دونوں مری ضرب سے چور چور — دلِ بے گداز و سرِ پُر غرور
کچلتا ہوں میں ایسے قانون کو — جو غارت کرے عدل و انصاف کو
مجھے جان بربادی کا دیوتا — تباہی کا پھنکارتا اژدھا
نہ ہو خواہ موسم بھی برسات کا — میں برسا ہی دیتا ہوں اک ڈونگرا

بلا سے جو تنہا و بے یار ہوں
اکیلا نہیں اک مرج مہار ہوں

نذر الاسلام سوئی قوم کو بیدار کرتا ہے۔ اُس کے آتشیں نغمے قلب کو گرماتے اور روح کو تڑپاتے ہیں۔ وہ زاویہ نگاہ میں وسعت اور خیالات میں بلندی پیدا کرتے ہیں۔ اُن کی رگوں میں شرافت، خودداری، عزم و استقلال، عزّتِ نفس اور جوش و ولولہ کا نیا خون دوڑاتا ہے۔ وہ مسلمانوں کو اُن کے شاندار ماضی کی یاد دلا کر آمادۂ جہاد کرتا ہے۔ اور مجاہدِ اسلام کو یوں پکارتا ہے۔

اے مجاہد! مرے مجاہد! بج رہا ہے طبلِ جنگ
باندھ لے عمامہ اپنے سر کو اونچا کر کے بڑھ
عصر نو نے دی ہے تجھ کو دعوتِ عزم و عمل
ٹوٹے قلعوں پر پھریرا اُڑ رہا ہے آج پھر
ہاتھ میں تلوار ہو اور نعرۂ توحید ہو!
جوشِ ملّی قلب میں ہو موجزن!
پھر بڑھا آگے قدم!!
اے مجاہد! پھر بڑھا آگے قدم!!
بج رہا ہے طبلِ جنگ!
بج رہا ہے طبلِ جنگ!!

اُس دور کی شاعری میں حُب الوطنی اور ملک کی فلاح و بہبود بلکہ اصلاح کے بے پایاں جذبات و خواہشات بدرجہ اتم نمایاں ہیں۔ سیاسی افراتفری، وطن کی بدحالی اور سماج کی برائیوں کی عکاسی جن پُر زور الفاظ، جس دلکش و موثر انداز میں کی گئی ہے بنگالی ادب میں اس کی مثال خال خال ہے۔ اُس نے اُن نظموں کے ذریعہ زندگی کا پیغام دیا۔ آزادی کا راگ سنایا، جو آگے چل کر تحریکِ آزادی کا ایک جُز ثابت ہوا۔ اُس کے اشعار میں رقصِ بسمل کا تماشہ نہیں بلکہ لہو گرم کرنے کا بہانہ ہوتا ہے۔ وہ ظالموں کے ظلم کے خلاف شمشیر بکف نظر آتا ہے۔ وہ ایک زبردست انقلابی ہے۔ وہ عوام کو افیون گھول کر نہیں پلاتا بلکہ انجکشن لگاتا ہے۔ اُس کے دل کی بھٹی عمل اور پیکار کی آگ سے بھڑک رہی ہے۔ وہ ٹوٹ سکتا ہے مگر جھک نہیں سکتا۔ اُس کے دل کا سوز جتنا ہے بڑھ کر ہے۔ اُس کے اشعار میں برق کی تڑپ اور رعد کا اضطراب ہے۔ وہ شہنشاہیت کا بدترین دشمن، شمعِ آزادی کا پروانہ اور نعرہ ہائے بغاوت بلند کرنے والوں کا سرخیل ہے۔ ایک جگہ کہتا ہے:

میں ان وحشیوں کا ہوں مستانہ رقص — تھرکتے ہیں جو اپنی ہی تال پر
تمدّن کی راہوں سے بیگانہ ہوں — ہے آزادی شمع اور میں پروانہ ہوں

سپاہی کا ہوں گیت آتش فروز — چتا سے ہے بڑھکر مرے دل کا سوز
میں صحرا کا ہوں جھلملاتا سراب — مرا کارواں، اضطراب، اضطراب
میں چلتا ہوں چل کر ٹھٹکتا بھی ہوں — سنبھلتا، سنبھل کر لہکتا بھی ہوں

ہر اک گام پر لغزشیں بے شمار
تڑپ برق کی رعد کا اضطرار

نذرالاسلام پہلا شاعر ہے جس نے بنگالی شاعروں میں سب سے پہلے علم بغاوت بلند کیا۔ اور جنگ آزادی کا علمبردار ثابت ہوا۔ اُس نے بنگالی مسلمانوں کی نگاہوں کو آفاق کی پہنائیوں اور افلاک کی بلندیوں کی طرف مائل کیا۔ تاکہ وہ غلامی، بے شرمی و ذلت اور بے غیرتی کے غار سے نکل کر کائنات کی وسعتوں کو تسخیر کریں۔ اور انسانیت کو اُن نعمتوں سے مالا مال کردیں، جو اپنی کم نظری کے باعث اب تک محروم چلی آتی ہے۔ اُس نے بوسیدہ سوسائٹی، قدیم رجحانات، رجعت پسندی اور پرانی قدروں کی بجائے صحت مند سوسائٹی، جدید رجحانات اور ترقی پسند ادب کی داغ بیل ڈالی۔ اُس نے شاعری میں کسی کی تقلید نہیں کی، خود اپنی ایک راہ نکالی اور اُسی راہ سے وہ اس قدر کامیاب و کامراں گزرا کہ اُسے میر کارواں کی حیثیت حاصل ہوئی۔ وہ پہلا شاعر ہے جس نے بنگلہ شاعری میں اردو اور فارسی غزلوں کے نمونے پر غزلیں لکھیں۔ اُس سے پہلے بنگلہ شاعری میں ناپید تھی۔ دیکھتے دیکھتے دوسرے شعراء نے بھی اُس کی پیروی کی اور غزلوں کا رواج عام ہو گیا۔ اُس نے حافظ شیرازی اور عمر خیام کی رباعیات کے بنگلہ میں نہایت دلکش منظوم ترجمے کئے۔ عم پارہ کا مکمل ترجمہ بنگلہ زبان میں پہلی بار نذرالاسلام نے پیش کیا۔ اُس کے یہ کارنامے نہ صرف قابل تحسین ہیں۔ بلکہ اُس کی فارسی و عربی سے گہری دلچسپی اور بنگلہ ادب کی بے پناہ خدمت کا بین ثبوت ہیں۔

نذرالاسلام کی بیشتر نظمیں اور گیت ایسے ہیں، جن کے شعروں کے اکثر ٹکڑے اردو، فارسی الفاظ کے ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ پورا پورا شعر اردو، فارسی کے الفاظ سے بھرا پڑا ہے۔ ایک گیت نقل کیا جاتا ہے جس کا عنوان ہے "شراب"۔ واضح رہے کہ یہ کوئی ترجمہ نہیں، بلکہ بنگالی رسم الخط سے اردو رسم الخط میں منتقل کر دیا گیا ہے ؎

نرگس باگ میں، بہار کی آگ میں
باغ
بھرے دل درگ میں، کہاں میرے پیارے
داغ
وردِ دل ز در — رنگیلا کوثر
شرابًا طہورا — لاؤ ساقی بھر
پیالہ بھر دے
مستانہ کر دے

ایک نظم جس کا عنوان ہے "محرم" کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے۔ حرف بحرف ملاحظہ ہو۔

نیل سیاہ آسمان، لال لال دنیا — اماں لال تیری خون کیا خون یا

یہ عجیب بات ہے کہ حافظ سے ٹیگور بھی متاثر تھے اور نذرالاسلام بھی۔ لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ ٹیگور نے حافظ کی رفعت خیال سے

استفادہ کیا۔ اور نذرالاسلام خیالات کے علاوہ اُن کی زبان سے بھی مستفید ہوا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نذرالاسلام نے جو کہانیاں اور جو غزلیں لکھی ہیں۔ اُن میں شراب، گلستان، بلبل، مصلیٰ، کباب، ساقی، نقاب، نوروز، حرم، شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں اور اسی نوع کے سینکڑوں الفاظ استعمال کئے۔

نذرالاسلام نے حافظ شیرازی کی چند غزلوں کا ترجمہ بھی کیا ہے:۔

مطربِ خوش نوا بگو تازہ بہ تازہ نو بہ نو　　　بادۂ دلکشا بجو تازہ بہ تازہ نو بہ نو

نذرالاسلام کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

آرد نو تن ترونا دگیتی گانے والا !　　　آرد تازہ شراب ڈھالو کورو ہردے آلا

اصل شعر میں جو عاجزی اور الفاظ و تراکیب کی شیرینی کی جو جھلک ہے۔ اُسے نذرالاسلام نے ترجمے میں پوری طرح ظاہر کر دیا ہے۔
حافظ کی ایک دوسری مشہور غزل کا مطلع ہے:۔

صبا بہ لطف بگو آں غزالِ رعنا را　　　کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادۂ مارا

نذرالاسلام کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

بلو رے صبا دھیرے دھیرے بولو گوشٹی ہرنی رے
اور کو تون دیس ہا را گور روا بیگا گھور در جٹے

نذرالاسلام نے غزلیں، نعتیں اور رومانی گیت بھی لکھے ہیں۔ اُن سب اصناف میں وہ اپنے رتبے سے گرنے نہیں پایا۔ ان کے کلام میں موسیقی کی فراوانی ہے۔ اُن کے الفاظ نغمہ ریز ہیں اور خیالات حسن و عشق کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ اُن کی نظمیں حضرت عمرؓ، خالدؓ، امین اللہ ابن سعود اور رضا شاہ وغیرہ پر بنگالی ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک جگہ وہ شوخ شاہد کی نظر بازیاں، اُس کی خوشبو میں بسی ہوئی سانسیں، اُس کی شہاب جیسی رنگت اور جوش پر آئی ہوئی الھڑ جوانی کا ذکر بڑے دلنشیں انداز میں کرتا ہے:۔

جسے حُسن ٹھکرا دے وہ دل میں ہوں　　　تڑپتا نہیں اور بسمل بھی ہوں!
کبھی چشمِ دوشیزہ کی سنسنی　　　محبت کے اک بوسے کی تھرتھری
نظر بازیاں شوخ شاہد کی ہائے　　　جو پردے سے جھانکے پھر آنکھیں چرائے
نہ دیکھا کہ دیکھا یہ اُلجھن سے ہے　　　کبھی کچھ کہے دل کبھی کچھ کہے!
ہوں چیت چور سجنی کے من کی لگی　　　اُسی کی مہکتی ہوئی سانس میں
اُسی کی ہوں چوڑی کی جھنکار جو　　　ہلا دیتی ہے دل کے ہر تار کو
وہ دیہاتی لڑکی وہ مست شباب　　　وہ رنگت روپہلی کہ جیسے شہاب
سمٹتی نہیں یا لپکتی نہیں!　　　جھجکتی نہیں ہے جھجکتی نہیں!
جتن کون سے ہیں جو کرتی نہیں　　　جو آگ ہے دیتی دبائے کہیں!

نچوڑ اُس حُسن کی رعنائیوں کا ہوں میں
نکھار اُس کی سہانائیوں کا ہوں میں

نذرالاسلام کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت جو ہماری فکر و نظر کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ وہ ان کی سچائی اور

خلوص ہے۔ اُن کی تمام انقلابی اور رومانی شاعری میں نرم و گرم الفاظ سموئے ہوئے ہیں۔ اُس میں جو حسن، تڑپ، گہرائی اور جاذبیت ہے وہ کسی فن کی وجہ سے نہیں بلکہ اُس "خونِ دل و جگر" کی وجہ سے ہے، جو کہنے والے کے دل میں موجزن ہے۔

خونِ دل و جگر سے ہے مری نوا کی پرورش ہے رگ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو

نذرالاسلام کی غزلوں میں "بیماریٔ نغمۂ عاشقانہ" نہیں۔ ایک طرف طربناک و دلآویزی ہے۔ ایک رقت آمیز ترنم اور گہرا سوز خاص طور پر نمایاں ہے۔ مگر اُس کے باوجود بھی اُس کے مطالعے میں گھٹن، جھنجھلاہٹ اور بے اطمینانی نہیں پائی جاتی۔ اُس کے یہاں جذبات کی گرمی کے ساتھ غم والم میں تازگی اور شگفتگی کی روح کارفرما ہوتی ہے۔ ایک مشہور غزل کا ترجمہ ملاحظہ ہو:-

بلبل آج تو شاخوں کو اس طرح نہ جھنجھوڑ
کلیاں خوابِ ناز میں مست ہیں۔ اُن کی نیند اب تک نہیں اُچٹی ہے
آہ بادِ شمال کے سرد جھونکے خزاں رسیدہ شاخوں پر آج بھی جھپٹ رہے ہیں
بھنوروں کو وجد میں لانے والی جوبن کی غزل سرا ہوا اب تک نہیں چلی۔
دوشیزہ کلی گھونگھٹ اُلٹ کر کب اپنا رُوپ دکھلائے گی؟
شبنم کے مَس سے کب اُس کی نیند ٹوٹے گی، اُس کے گال کب لال ہوں گے۔
بندھنوں کو توڑنے والا، غنچوں کو جگانے والا،
رنگ و بو کا سیلاب کب آئے گا؟
کلیوں کے لبوں پر مسکراہٹ کب کھیلے گی، اُن کے گالوں پر گہرے نشان کب نمایاں ہوں گے؟
شاعر بو باس نے تجھے مست کر ڈالا۔
مستی کے سیلاب میں تو بہہ گیا۔ اب تجھے کنارہ نہیں مل رہا ہے۔
پھولوں سے تو نے اپنا دامن تو بھر لیا۔ اب آنسوؤں سے آنکھوں کی گود بھی بھر لے۔

نذرالاسلام کو اسلامی تصورات محبوب ہیں۔ اُسے امیر و غریب کی تفریق "بنامِ رنگ و خون" کا امتیاز اور طبقہ بندی کسی قیمت پر قبول نہیں۔ وہ مساوات کا بہت بڑا علمبردار ہے۔ علامہ اقبال کی طرح اُس نے بھی انسان کی خودی پر بہت زور دیا ہے۔ وہ قسمت کے عقیدے کو خرابی کی جڑ خیال کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک زندگی کی بقا و ارتقا کا راز عمل پیہم اور سعیِ ناتمام میں پنہاں ہے۔ اقبال کو نذرالاسلام کی ایک نظم "نوجوانوں سے خطاب" کے کچھ حصے سنائے گئے تو اُنھوں نے فرمایا کہ "اُس کے زورِ بیان اور جوشیلے خیالات نے خدا معلوم بنگالی نوجوانوں میں کیا روح پھونکی ہوگی۔"

نذرالاسلام ایک آگ بھڑکنے والا باغی ہے۔ اُس کو باغیانہ خیالات جنگ سے ملے تھے۔ جنگ میں انسانی زندگی کی ارزانی اور بھیانک موت کی چیرہ دستی کی تمام کیفیتیں اُس کے دل و دماغ پر ثبت کر گئیں۔ ستم رسیدہ انسانیت اُس کے جذبات میں طوفان خیزی کا سبب بنی۔ اور اُس کی شاعری جابر حکومت اور سرمایہ داری کے خلاف اعلان جنگ بن گئی۔ چنانچہ وہ انقلاب کا رجز پڑھتا ہوا کہتا ہے:-

آج تم سب مل کر خیر مقدم کے نعرے لگاؤ
آج تم سب مل کر خیر مقدم کے نعرے لگاؤ

وہ عصر جدید کا پرچم لہرا رہا ہے
طوفانی مینہ بیساکھ کا طوفان !
آج تم سب مل کر خیر مقدم کے نعرے لگاؤ
اس دفعہ وہ طوفان آرہا ہے جواب تک نہیں آیا
نشۂ قیامت میں وحشیانہ ناچ ناچتا ہوا۔

اسی طرح وہ ایک اور نظم میں نوجوانوں کو دعوتِ عمل دیتا ہوا لکھتا ہے :۔

اے پیش تاز نوجوان ! تیزی سے قدم بڑھائے چل
اے مشرق کے زبردست نوجوان بہادرو !
اے انسانیت کے سربلند علمبردارو !
میں اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں کہ تم اپنے مضبوط قدموں سے ضرور آگے بڑھو گے۔
پہاڑ اور دریا پھاند کر دشت اور صحرا طے کر کے بجلی کی سرعت کے ساتھ۔
اے پیش تاز سپاہی ! تیزی سے قدم بڑھائے چل۔

نذر الاسلام نے بنگلہ شاعری کو موضوع دیا، وسعت دی، فکر، عمق، گہرائی اور حکیمانہ نظر عطا کی۔ اُن غزلوں میں اُن کا پیغام، رجائیت، جوش، آئندہ مستقبل کی بشارت، ایک پیہم دوراں اور ہردم جواں رہنے والی زندگی کا پیغام ہے۔ اُن کی سیاسی نظموں نے بنگال کے مسلم نوجوانوں میں ایک نئی روح پھونک دی، اُن کے نغموں کا اثر جہاں عوام پر پڑا، وہاں بنگال کے شعرا بھی اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ دوسرے شعرا نے بھی اسلام اور مسلمانوں کی عظمت کو اپنا موضوع بنا لیا۔

" یہ صورت سیاب مرد مومنؔ ایک عرصے سے بیمار ہے۔ اور اب وہ دماغی طور پر بالکل مفلوج ہو چکا ہے۔ اُس کے ایک قدرداں نے کیا خوب کہا ہے کہ جس چشمۂ حیات کا ہر قطرہ قلزم بہ کنار تھا، اُس کے سوتے اب خشک ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ اُس کے اندر کیسے طوفانی لاوے پرورش پا رہے ہیں جو یک لخت کسی باطنی زلزلۂ عظیم سے پھوٹ نکلیں گے۔ مگر نذر الاسلام جب زندہ تھا اُس کے آتشیں نغمے نوجوانوں کے دلوں کو گرماتے تھے۔ غلامی کی آگ سے جلنے والوں کے خون میں ہیجان پیدا کرنے اور شمع آزادی کے پروانوں کو آتش نفس بنا دیتے تھے۔ خدا رب العزت سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُسے تکلیفوں سے نجات دے اور خدمتِ اسلام کے لئے کمربستہ کر دے۔

مانک ٹالہ

خدا کی آواز

اتوار کا روز تھا۔ ہفتہ بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد پانچوں ساتھی مُردم بےزار سے بیٹھے تھے۔ بات بے بات ایک دوسرے کو کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ ایسے بیسیوں اتوار آئے اور چلے گئے تھے۔ تقریباً ہر اتوار کو ایک ہی منظر ہوتا تھا ــــ بے کیف، سنگین تھکا تھکا سا ماحول۔

رنجیت کمار عرف چڑچڑی تین ٹانگ کی کرسی پر بیٹھا مٹھی باندھے نہایت بے دردی سے چار مینار پھونک رہا تھا۔ سب سے زیادہ وہی بےزار نظر آرہا تھا کیونکہ بل بھدر نے اس کی زبان بندی کی ہوئی تھی۔ اور وہ اُسے چار مرتبہ دھمکی دے چکا تھا کہ اگر اُس نے پھر زبان کھولی تو وہ اُس کا گلا گھونٹ دے گا۔ لیکن رنجیت کمار عرف چڑچڑی کے لئے زبان مُنہ میں بند رکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ وہ ہر وقت چڑ چڑ کرتا رہتا تھا۔ اس لئے یار لوگوں نے اُس کا نام ہی چڑچڑی رکھ دیا تھا۔

اس رین بسیرے کے سبھی باسیوں کی، سوائے بل بھدر کے، کوئی نہ کوئی عرفیت تھی۔ حتیٰ کہ وہ ایک دوسرے کے اصلی نام ہی بھول چکے تھے۔ بل بھدر اپنے نام ہی کی طرح بھاری بھرکم ڈیل ڈول والا شخص تھا۔ اور موقعہ بے موقعہ اپنے بازوؤں کی مچلتی مچھلیوں کی نمائش کر کر کے لوگوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ وہ سلمنٹ فلموں کا ہیرو بننے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اور اپنے آپ کو دنے کمار جیسے رومانٹک نام سے بلائے جانے کا خواہاں تھا۔ لیکن یار لوگ انتقاماً اُسے بل بھدر کے نام سے ہی بلاتے تھے کیونکہ وہ ہر وقت اُن پر دھونس جماتا رہتا تھا۔

عباس علی خاں عرف شاخ شاخ بھگوان کے خون میں بجاعنہ کہاں سے سیکولر جراثیم سرایت کر آئے تھے کہ وہ دورانِ گفتگو ہندی کے نئے نئے سنے سنائے الفاظ دھانستا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اُس نے کہیں سے ساکشات بھگوان (مجسم خدا) کا لفظ سُن لیا۔ چنانچہ اُس نے اپنی پہلی فرصت میں بل بھدر کو مسکا لگانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "بل بھدر بھیا، تم تو شاخ شاخ بھگوان ہو!"

بل بھدر کے جن سنگھی خون نے ایسا جوش مارا کہ عباس علی خاں کی کلائی کئی روز تک شری جٹ مل ہلدی ویدکے ہاں زیرِ مرمت رہی۔ لیکن شاخ شاخ بھگوان کے خون میں سیکولر جراثیم میں کمی واقعہ نہ ہو سکی۔

مکڑ جی کا اصلی نام گھنشیام تھا لیکن چونکہ وہ ہر کام اور ہر بات کر کے مکر (مُنکر ہو) جاتا تھا۔ اس لئے یاروں نے اُس کا نام ہی مکڑ جی رکھ دیا تھا۔

ٹھاکر من شرما بات بے بات "سب چوپٹ کر دیا"۔ "سب چوپٹ ہو گیا" قسم کے الفاظ استعمال کرتا تھا اس لئے وہ چوپٹ راجہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

چوپٹ راجہ کی ہماچل کے علاقہ میں ایک چھوٹی موٹی جاگیر تھی۔ آزادی سے پہلے اس علاقہ میں چھوٹی بڑی بیسیوں ریاستیں تھیں۔ انہیں میں سے ایک درمیانہ درجہ کی ریاست میں اُس کے سورگ باشی پتا دیوان رہ چکے تھے۔ مہاراجہ نے انہیں ایک بہت بڑی جاگیر اور خلعت عطا کی ہوئی تھی۔ چوپٹ راجہ کے پتا کی چھ شادیاں ہوئی تھیں۔ اور موت رنڈی کے کوٹھے پر کثرت شراب نوشی کے باعث ہوئی تھی۔ جاگیر کا بیشتر حصہ اُس کے والد صاحب موت سے پہلے ہی ٹھکانے لگا چکے تھے۔ باقی کی بچی کچی جاگیر وہ اور اُس کے بھائی بندل جل کر بڑے سلیقے اور بچے تُلے انداز میں ٹھکانے لگاتے جا رہے تھے۔

یہ بھی غنیمت تھا کہ اُس کے والد کی چھ شادیوں سے صرف دو کے ہاں ہی اولاد ہوئی تھی۔ اور وہ دونوں ماؤں سے دو دو بھائی تھے ورنہ اگر سب کے ہاں اولاد ہو جاتی تو سب بھائی بہنوں کے حصے میں جاگیر کی ایک ایک بوٹی بھی نہ آتی۔ دوسری ماں سے دو بھائیوں نے اپنے حصے کی آدھی جاگیر اور آدھی حویلی الگ کرالی تھی۔ باقی کی آدھی جاگیر پر دونوں بھائی گزران کرتے تھے۔ پہاڑی علاقوں کی زمین پر پیداوار ہی کتنی ہوتی ہے پھر بھی اپنے مزارعوں کی کھال تک ادھیڑ لینے کے باوجود اُن کے عیش و عشرت کا خرچ نہ چل پاتا تو وہ جاگیر کا ایک آدھ ٹکڑا فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتے۔

عیش و عشرت تو چھوٹے راجہ کے خون میں رچے ہوئے تھے۔ والد صاحب نے چھ چھ شادیوں کے باوجود اپنی جاگیر کی کوئی خوبصورت لڑکی کنواری نہیں چھوڑی تھی۔ اور ذائقہ بدلنے کے لئے دور نزدیک رنڈیوں کو بھی چکھتے رہتے تھے۔

لیکن زمانے کے ساتھ ساتھ اُس کے اور اُس کے بھائیوں کے طور طریقے بھی بدل گئے تھے۔ سکڑتی ہوئی جائداد کے ساتھ ساتھ، اُن کی سرگرمیوں کا دائرہ بھی سکڑ گیا تھا۔ شراب تو بس میلوں ٹھیلوں کے موقعہ پر ہی چکھتے تھے۔ چھوٹے راجہ تو شراب کے نام پر بھی کانوں کو ہاتھ لگاتا تھا شاید والد محترم کی حالت زار سے عبرت پکڑلی تھی!

اُس کا بڑا بھائی اور اُس کے سوتیلے بھائی بہت باذوق واقع ہوئے تھے۔ عشرت گاہ تو سچ مچ حجلۂ عروسی نظر آتی تھی۔ اور عشرت گاہ سے ملحقہ غسل خانہ میں دُنیا بھر کے لوازمات موجود تھے۔ طرح طرح کی خوشبوؤں سے مہکتے ہوئے ولائتی صابن، عطر، لونڈر اور نہ جانے کیا کیا الم غلم بھرا رہتا تھا۔

اپنی جاگیر میں گھومتے پھرتے کسی کی عورت، بہو یا بیٹی اُن کی نگاہ میں جچ جاتی تو اُس پر زبانی نوازشوں کی بارش کرتے ہوئے فرماتے "ارے جگیا! تیرے کھیت میں اتنے بڑے بڑے کدّو لگے ہیں اس سال! کیا رنگ چھوڑا ہے۔ شُشرُیا کبھی ہمیں بھی بیل پھلوری بھجا کر۔ کل بھیجنا ایک بڑا سا کدو اپنی بیٹی (یا بہو) کے ہاتھ۔"

اور جگا دونوں ہاتھ جوڑ کر چہرے پر عجز و انکسار کا ایک اور تہ جماتے ہوئے عرض کرتا "جی مہاراج! ان داتا! کل ہی ایک بڑھیا سا کدو بھیج دوں گا، مائی باپ! یہ تو کدو ہے۔ چمڑی کا بھی مانگ لیں تو حاضر ہے؟"

اور وہ مسکراتے ہوئے من ہی من میں کہتے "کل تیری بہو بیٹی کی چمڑی ہی تو ادھیڑوں گا"۔

اگلے روز جگے کی بہو یا بیٹی سر پر بڑا سا کدو رکھے آتی۔ پاؤں میں کدو رکھ کر ڈنڈوت پرنام کرتی اور چھوٹے راجہ کے بھائی صاحب اُسے بازو سے پکڑ کر غسل خانہ میں لے جاتے۔ اُس کے گندے بوسیدہ کپڑے اتروا کر اپنے ہاتھوں سے خوشبودار صابن مل مل کر نہلاتے۔ پانی میں لونڈر کا شیشی انڈیلتے۔ بڑے سے بڑے تولئے سے رگڑ رگڑ کر اُس کا بدن کندن کی طرح چمکاتے۔ اُسے عطر میں بساتے اور پھر عشرت گاہ کی زینت بناتے۔

لیکن چھوٹے راجہ اس معاملہ میں اپنے سبھی بھائیوں سے مختلف تھا وہ شیر کی کچھار میں جا کر شکار کھیلنے کا عادی تھا۔

ایک مرتبہ بڑے بھائی کی سب سے چھوٹی لڑکی کو اسکول میں داخل کروانے گیا۔ گاؤں کے اسکول میں قریب کے شہر سے ایک نئی اُستانی حال ہی میں آئی تھی۔ اُس کے رکھ رکھاؤ میں ذرا شہری مرچ مصالحہ تھا۔ آرائش و زیبائش کا بھی سلیقہ تھا۔ اس لئے گاؤں والوں کے دل میں اُتری ہوئی تھی۔ اُس کی حقیقی یا فرضیہ حقیقہ داستانوں کا بھی غلغلہ تھا۔ چھوٹے راجہ بھتیجی کو لے کر اسکول گئے تو اُسی سے بھینٹ ہوئی۔ وہ ان گفتگو وہ چھوٹے راجہ کی نگاہوں سے اُس کے دل میں اُتر گئی۔ اور اُس نے وہیں اُسی وقت ایک خالی کمرے میں لے جا کر بوس و کنار سے اپنا پہلا تعارف کروایا۔ بقایا تعارف اُسی رات اُس کے گھر میں جا کر دیا۔ دیوالی کے جشن میں چھوٹے راجہ نے اُسے بھی دعوت نامہ بھجوایا تھا۔ اُس کے باقی برادران اُسے پھانسنے کی اسکیموں پر غور ہی فرما رہے تھے کہ کب اور کیسے اس پرندہ کو پھنسایا جائے۔ اور چھوٹے راجہ جشن کے بعد رات کو گھر کی عورتوں کے نرغے میں

سوئی ہوئی اُستانی کو جگا کر اندھیرے میں اپنی عشرت گاہ میں ہانک کر لے گئے تھے۔ ایک مرتبہ ایک غریب بال دو مواکو گاؤں کے غسل خانہ میں غسل کے لئے جاتے دیکھا تو یہ حضرت غسل خانے کے فرش پر ہی عشرت کی سیج سجا کر دادِ عیش دے آئے۔

بمبئی میں بھی چوپٹ راجہ نے خوب گل کھلائے۔ فارس روڈ اور بیلا ہاؤس (پلے ہاؤس) کے علاقوں کی بھی درجۂ اوّل کی رنڈیوں کے ڈیرے معلوم تھے۔ کبھی کبھار چھوٹی موٹی ایکسٹرا لڑکیوں کو بھی پھانس لاتے۔ کبھی موڈ میں ہوتے تو اپنے ساتھیوں کو بھی عیش کروا دیتے۔

ان سب باتوں کے باوجود چوپٹ راجہ بڑے پکّے مذہبی آدمی تھے۔ منگل آدرشی کو ہنومان کا برت رکھتے۔ رات کو ہنومان جی کے مندر میں پوجا کروانے کے بعد چرنامرت اور پرشاد سے برت توڑتے۔ جس روز نیا کنٹریکٹ ملنے کی آشا ہوتی اُس صبح سویرے اٹھ کر سب سے پہلے بھنگی یا بھنگن کی صورت دیکھتے۔ اور پھر ہنومان کے مندر میں جا کر پوجا کرواتے۔ مندر سے پرشاد لا کر سب ساتھیوں میں بانٹتے۔

چوپٹ راجہ بی۔ اے پاس تھا۔ اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ وجیہہ، نوجوان اور تعلیم یافتہ تھا۔ ایکٹنگ کے ساتھ ساتھ فلمی طرز کے گیت بھی گھسیٹ لیتا تھا گلا بھی غضب کا پایا تھا۔ زبان بڑی شستہ اور رنگین تھی۔ باقی ساتھیوں میں کوئی ہیرو کے رول کے لئے تو کوئی ولن کے کام کے لئے کوشش کر رہا تھا۔ کوئی کہانی، مکالموں کے لئے تو کوئی گیتوں کے لئے جوتیاں چٹخا رہا تھا۔ گھر سے خوشحال تو تھا ہی چند ایک سفارشی خطوط بھی ساتھ لایا تھا۔ اس لئے اُسے کچھ نہ کچھ کام ملتا ہی رہتا تھا۔ باقی چاروں شکل و صورت سے تو یتیم نظر آتے ہی تھے، جیب کیسے سے بھی ہمیشہ کڑکے رہتے۔ اور اکثر چھوٹی موٹی خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے بھی انہیں چوپٹ راجہ کا دست نگر بننا پڑتا۔ اس لئے اُسے مسکا پالش لگاتے رہتے تھے۔ اُس کے لکھے گیتوں، اُس کی سُریلی آواز اور ایکٹنگ کی بھی تعریف کرنا پڑتی۔ کبھی کبھار اُس کے دم سے عیش بھی ہو جاتا تھا۔

چوپٹ راجہ کو ایک نئی فلم سے ایک دو گیتوں کا کنٹریکٹ ملنے کی اُمید تھی۔ اس لئے وہ اپنی چارپائی پر بیٹھا پُرانی فلموں کی چوپڑیاں کو کھنگال رہا تھا اور اُن کے پھڑکدار ٹکڑے، مصرعے اور الفاظ نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ تاکہ انہیں اپنے گیتوں کے کلبوت میں فٹ کر سکے۔

باقی سب بے کار اور بے زار سے بیٹھے تھے۔ چیٹرجی بل بھدر سے بے زار بیٹھا تھا کہ وہ اُسے زبان کھولنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ اور بل بھدر اس لئے بے زار بیٹھا تھا کہ اُسے ایک سٹنٹ فلم میں مار ماری کا جو رول ملنے کی بہت روز سے اُمید تھی۔ وہ رول کل ڈائرکٹر نے کسی دوسرے کو دے دیا تھا۔

پندرہ بیس منٹ کی جاں گسل خاموشی کے بعد چیٹرجی کی زبان قابو میں نہ رہ سکی۔ "ہے بھگوان! تو ہے کہاں؟ دیکھ تیرے بھگتوں کی کیا حالت ہو رہی ہے"۔

اب کے چیٹرجی کے الفاظ بل بھدر کے کومل ہردے کو بھی متاثر کئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ وہ اس مرتبہ چیٹرجی کی زبان درازی پہ خاموش رہا۔ بلکہ چیٹرجی کے الفاظ سنکر اُس نے نردئی بھگوان کی کٹھورتا کا شدید احساس کرتے ہوئے اپنے چہرے کا حلیہ اس طرح بگاڑا جیسے مُنہ میں کونین کی گولی پڑی ہو۔

"بھگوان تو نراکار۔ سادھار اور آکار ہے"۔ شاخ شاخ بھگوان کے خون میں پھر سیکولر جراثیم نے جوش مارنا شروع کر دیا تھا "یہ تو اپنی قسمت کا دوش ہے۔ ہم مورکھ انسان نتیجے کی چنتا کئے بغیر کام کر دو۔ لوبھ۔ موہ اور اہنکار کے چکّر میں گھن چکر بنے پھرتے ہیں۔ تات پریہ گھور اندھکار۔۔۔۔"

"بک بک نہ کر شاخ شاخ بھگوان کے بچے"۔ بل بھدر کے جن سنگھی جراثیم کو بھی تاؤ آگیا۔ "تو پلیچھ ہمیشہ شدھ ہندی بولے گا۔ لاکھ مرتبہ سمجھایا ہے کہ اگر ہندی نہیں آتی تو مت بولا کر۔ بائیں گل کرنا ہے تو اپنی سالی اُردو کا کر"۔ پھر بل بھدر اپنے بازوؤں کی مچھلیوں کو پھڑپھڑاتے ہوئے بولا "سالے اب کے ہندی میں بات کی تو تجھے پنڈر واڑے خاں پارسل کروا دوں گا"۔

عباس علی خاں عرف شاخ شاخ بھگوان بغلیں جھانکنے لگا ۔۔ اپنی نہیں بلکہ بل بہادر کی کیونکہ اُس کے دونوں بازو زاویہ قائمہ پر اکڑے ہوئے اپنی بجلتی ہوئی بچلیوں کا مظاہرہ کر رہے تھے ۔

" میں تو بھگوان کو سرے سے مانتا ہی نہیں " مکرجی ہر بات کی طرح خدا کی ہستی سے بھی مُکر (منکر ہو) گیا ۔ بھگوان ہوتا تو ہماری یہ حالت ہوتی کیا بھگوان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم سالہا سال سے دھکے کھا رہے ہیں ۔ اگر وہ ہوتا تو ہماری یہ دُردشا نہ ہوتی " مکرجی نے اپنی ساری ناکامیوں کا بدلہ خدا کی ہستی سے مُنکر ہو کر لے ڈالا ۔

چوپٹ راجہ جو پرانی فلم " دھوم دھڑکا " کے ایک گیت کا پھڑکتا ہوا مکھڑا اپنے نئے گیت کے انترے میں پھنسانے کی کوشش میں مصروف تھا ۔ مکرجی کی بات سُنکر مکھڑے کو انترے سے باہر گھسیٹ کر کھڑا ہو گیا " سالے ناستک تیری زبان میں کیڑے پڑیں ۔ اوندھی کھوپڑی کے گھن چکر ! بھگوان تیرے باپ کا کارندہ ہے جو تیرے کام کرتا پھرے گا ؟ وہ سب دیکھتا ہے ۔ وقت پڑنے پر مصیبت زدوں کی مدد کو بھی آتا ہے ۔ تیری ماں کا پانی بھرنے نہیں آتا " چوپٹ راجہ کے مذہبی جذبات پر ٹھیس لگی تھی ۔ اس لئے وہ خلاف توقع سخت کلامی پر اُتر آیا تھا ۔

" میں ماننے کے لئے تیار نہیں کہ کبھی بھگوان نے مصیبت زدوں کی مدد کی ہو ۔ کیا تم کوئی مثال دے سکتے ہو ؟ " مکرجی نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا ۔ وہ آج چوپٹ راجہ سے بالکل مرعوب ہونا نہیں چاہتا تھا ۔ کیونکہ پچھلی رات مسکا پالش کے باوجود وہ اُسے اپنے ساتھ عیش و عشرت کے لئے نہیں لے گیا تھا ۔

" ایک نہیں ہزار مثالیں دے سکتا ہوں ۔ ۔ ۔ گورا بھگت کو بھگوان نے کٹے ہوئے ہاتھ واپس کر دیئے ۔ پُورن بھگت ۔ ۔ ۔ "

" یہ سب بکواس ہے " مکرجی نے یہ زمانوں کی رٹ لگائی " سنی سنائی باتیں میں ماننے کو تیار نہیں ۔ کوئی اپنے ساتھ بیتی گھٹنا بتاؤ تو مانوں "

چوپٹ راجہ چند لمحے سوچ لگے ۔ پھر گویا ہوئے " تو سُن ایک سچا واقعہ بتاتا ہوں ۔ بی ۔ اے کا آخری سال تھا گرمی کی چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا ۔ لمبی دوپہریں سو کر گزار دیتا ۔ لیکن دن اتنے طویل تھے کہ کٹتے نہ کٹتے تھے ۔ صبح شام سیر و تفریح کی غرض سے دو ایک ساتھیوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا رہتا ۔

" ہماری حویلی کے پچھواڑے ہماری خالی زمین پر لمبی لمبی گھاس اُگی ہوئی تھی ۔ رام دتی بوڑھی بیوہ کی جوان لڑکی چھلو اپنی گائے کے لئے ہر روز وہاں گھاس کاٹنے کے لئے آتی تھی ۔ میلے پھٹے پرانے کپڑوں سے اُس کی جوانی پھوٹ پھوٹ پڑتی تھی ۔ میں اس پر جی جان سے فدا ہو گیا ۔ اور ہر وقت اس کی جوانی کا مزا لوٹنے کے خواب دیکھنے لگا ۔ لیکن وہ حرام زادی ہماری طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی ۔ کئی مرتبہ کھنکار کر نظریں دوچار کرنے کی کوشش کی ، لیکن وہ نگاہیں جھکائے گھاس چھیلنے میں مصروف رہتی یا مصروف رہنے کی کوشش میں مصروف رہتی ۔

" آخر سوچ سوچ کر میں نے ایک اسکیم بنائی ۔ اُس قطعہ زمین کے دو اطراف آنے جانے کے لئے پگڈنڈی بنی ہوئی تھی ۔ دوپہر کے وقت یوں تو آمد و رفت کم ہوتی ، پھر بھی رواں راستے پر کسی کے آ نکلنے کا دھڑکا تھا ۔ چنانچہ میں نے دونوں راستوں پر اپنے دو ساتھی کھڑے کر دیئے کہ اگر کسی کو آتے دیکھیں تو مجھے آواز لگا دیں ۔

" چنانچہ انہیں وہیں کھڑا کر کے میں اُس راہزن صبر و سکون کی طرف گیا ۔ وہ اپنی درانتی سے گھاس کاٹتی جا رہی تھی ۔ میں اُس کے قریب جا کھڑا ہوا ۔ لیکن اُس نے میرا کوئی نوٹس نہ لیا ۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کا ہاتھ تھام لیا ۔ اور اُسے سینے سے لگانا چاہا ۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے جدوجہد کرنے لگی اور ساتھ ساتھ بڑبڑاتی رہی " راجہ جی ہم گریبوں کی بھی عزت ہوتی ہے "

" اُس کی یہ تلملاہٹ بالکل خلاف توقع تھی ۔ ہماری جاگیر میں ہماری ہی رعایا ہمارے خلاف ہاتھ اُٹھائے ۔۔ اور وہ بھی ایک حقیر عورت ۔ جس کی جوانی سے ہم صدیوں سے کھیلتے آئے ہیں ؟ چنانچہ میں بھڑک اٹھا ۔ اور اُسے گریبان سے پکڑ لیا ۔ اُس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا ۔ میرے ہاتھ کی گرفت

مضبوط تھی. لیکن اُس کا کرتا بوسیدہ تھا. جھٹکا لگنے سے گریبان پھٹ کر میرے ہاتھوں میں آگیا. اور اس کا سڈول سینہ ننگا ہو گیا۔

چوپٹ راجہ نے اپنی رال چاٹتے ہوئے باقی ساتھیوں کی طرف دیکھا. سب کے منہ سے گرم گرم رال ٹپک رہی تھی۔

" ایسا گٹھا ہوا بدن میں نے آج تک کسی عورت کا نہیں دیکھا تھا. میں اُس کی طرف لپکا کہ باقی کے کپڑے بھی اُتار دوں. لیکن میری نیت بھانپ کر وہ درانتی سے مجھ پر حملہ آور ہوئی. میں نے اُس کی کلائی مروڑ دی. اور درانتی نیچے آ رہی. اب میں اُس سے گتھم گتھا ہو گیا. لیکن وہ بھی بلا کی جاندار عورت تھی کتنی ہی دیر جدوجہد کرتی رہی. آخر وہ ہمت ہار کر ڈھیلی پڑ گئی. اُس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے. میں نے اُسے زمین پر گرا دیا اور وہ "بھگوان" کہہ کر میری طرف گھائل ہرنی کی طرح دیکھنے لگی.

" اتنے میں مجھے ایسا سنائی دیا جیسے میرا ایک ساتھی مجھے زور سے آواز لگا رہا ہے. میں گوش بر آواز ہو کر بیٹھ گیا. چند لمحے بعد مجھے دوسرے ساتھی کی آواز بھی سنائی دی. دونوں آوازیں بالکل صاف تھیں. اس لئے شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی. میں لڑکی کو چھوڑ کر گھر کی طرف بھاگا۔

" اُس شام کو جب میں اپنے ساتھیوں سے ملا اور اُن سے پوچھا تو وہ کہنے لگے کہ انہوں نے مجھے بالکل نہیں پکارا تھا اور نہ کوئی اُس راستے سے گذرا تھا. میں حیران ہوا کہ ماجرا کیا ہے. لیکن دل نے گواہی دی کہ یہ بھگوان ہی کی آواز تھی "

اُس کی رام کہانی سن کر سبھی ساتھی بہت متاثر نظر آتے تھے. اور بھگوان کی ہستی پر ایمان لانے کی کوششوں میں مصروف نظر آتے تھے.

" اب بتا گھوجی کے بچے. آیا یقین بھگوان کی ہستی پر" چوپٹ راجہ نے گھُجی کو مکمل طور پر متاثر سمجھتے ہوئے پوچھا.

" میں اب بھی ماننے کو تیار نہیں ہوں" گھُجی نے دو ٹوک فیصلہ دے دیا.

" تو جا جہنم میں ــــ سالا میں نہ مانوں میں نہ مانوں کی رٹ لگائے گا" چوپٹ راجہ نے چڑ کر کہا.

" اور پھر تم نے کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کر لی ہوگی اور اُس لڑکی کو بہن بنا کر اُس سے راکھی بندھوائی ہوگی" بل بھدر نے چوپٹ راجہ پر طنز کیا.

" بکواس سینڈ کی آواز ـــ بہن بنی ہوگی تیری ـــ ہم نے تو اُسی وقت جا کر اُسے اُس کے جھونپڑے میں جا پکڑا. میرے ساتھی اُس کی بوڑھی ماں کو پکڑ کر جھونپڑے کے باہر بیٹھ گئے. اور ہم نے اندر جا کر اس کی نئی جوانی کی بہار لوٹی" چوپٹ راجہ نے اپنی تلوار کٹ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے اپنے ساتھیوں پر ایک فاتحانہ نگاہ دوڑائی اور منہ سے گرتی ہوئی رال کو چاٹنے لگا.

---X---

جگر کی باتیں اور یادیں (بقیہ سلسلہ صفحہ ۱۸)

میں لوگوں کا ملنا کچھ بھی تھا. لیکن لے وہی ہوتی، جوش وہی ہوتا. کیا وقت اور کیا زمانہ تھا، جگر صاحب یہ دیکھ کر اور سُن کر خود بھی متبسم و محظوظ ہوتے۔

۱۹۵۲ء میں مجھے جگر صاحب کے ساتھ علی گڑھ جانا پڑا. وہاں محترم پروفیسر رشید صاحب کے گھر قیام کیا. بڑی خوبیوں کے ہیں یہ بزرگ. ان کو اور ان کے مزاج کو کون پڑھا لکھا نہیں جانتا. جگر صاحب سے ان کے نہایت ہی مخلصانہ تعلقات اور مراسم تھے. جگر صاحب ان کو اپنا اور ان کے گھر کو خود کا گھر سمجھتے تھے. رشید صاحب کے گھر پر ہی احسان رشید کو جناب ڈاکٹر احسان رشید ہیں اور کراچی یونیورسٹی میں اقتصادیات کے استاد ہیں بہت چاہتے تھے کیونکہ یہ ذہین، خوش مزاج، بذلہ سنج اور خوش گفتار تھے اور ہر وقت ان کے آرام کا خیال رکھتے تھے. وہاں دو تین دن قیام رہا. محفلیں اور صحبتیں رہیں، خوب اچھا وقت گذرا.

جیسا دیکھا، سنا، اور پایا، لکھ دیا ہے. اگر کہیں شخصی حوالہ آ گیا ہے تو وہ آ گیا ہے، حقیقت پر مبنی ہے،

نوٹ :- لایا نہیں گیا ہے.

شاہد احمد دہلوی

علّامہ راشد الخیری اور انکی سوانحعمری

اللہ اللہ کیسی مبارک گھڑی تھی وہ جب میاں ابّی کی امّاں بی بی رشید النساء نے اپنے اکلوتے بیٹے سے کہا تھا کہ "بیٹا، تم کہانیاں لکھا کرو" اور کم عمر میاں ابّی نے حیرانی سے اماں کا مونہہ تکتے ہوئے کہا تھا "مگر اماں بی مجھے تو کہانی لکھنی نہیں آتی"۔ اماں نے نہایت شفقت سے فرمایا "بیٹا میں سناؤں گی تمہیں کہانیاں، تم بس یہ کرنا کہ انہیں لکھ کر چھپوادیا کرنا" یہ کہہ کر گھر ہی کا ایک واقعہ سنایا کہ سوتیلی ماں نے کمسن بچّوں پر کیسے کیسے ظلم ڈھا رکھے تھے۔ میاں ابّی نے اس کہانی کو ذرا بنا سنوار کر لکھا اور یہ کہانی "مخزن" میں چھپ گئی۔ اس پہلی کامیابی پر ماں بیٹے دونوں بہت خوش ہوئے۔ بس اس کے بعد میاں ابّی کا ہیاؤ کھل گیا اور انہوں نے باقاعدہ مضامین اور کہانیاں لکھنی شروع کردیں۔ یہ واقعہ اب سے ساٹھ ستّر سال پہلے کا ہے۔ یہ میاں ابّی دلّی کے ایک معزز مولویوں کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ بچپن ہی میں ان کے والد عبدالواجد صاحب کا انتقال ہوگیا تھا۔ ان کی والدہ بڑی صابرہ اور غیور خاتون تھیں۔ خاندان کے بزرگوں نے بہت چاہا کہ ان کا نکاح ثانی کردیں۔ مگر انہوں نے منظور نہیں کیا اور پہاڑ سی جوانی سسرال ہی میں اپنے دو بچوں کے ساتھ کاٹ دی۔ جب میاں ابّی سیانے ہوئے اور کمانے دھمانے لگے تو ان غیرت مند بی بی نے سسرال سے بہت دُور شہر کے دوسرے حصّے میں اپنا ایک گھونسلا بنالیا۔ اور تنگی ترشی سے بسر اوقات کرتی رہیں۔ اسی تنگ دستی میں انہوں نے اپنی سلیقہ مندی سے بیٹی کی بھی شادی کی اور بہو بھی بیاہ کے لائیں۔ اور یہ دونوں شادیاں اس پیمانے پر کیں کہ سسرال والوں کو ان پر انگلی اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔

آپ سمجھے بھی "یہ میاں ابّی کون تھے؟" یہ تھے عبدالراشد جو "مخزن" میں مولوی عبدالراشد کے نام سے آئے۔ اس کے بعد عبدالراشد الخیری اور پھر صرف راشد الخیری کے نام سے مضامین اور کتابیں لکھتے رہے۔ اور اب دُنیا انہیں علّامہ راشد الخیری رحمتہ اللہ علیہ کے نام سے جانتی ہے۔

علّامہ مرحوم کا تعلق چونکہ جید مولویوں کے خاندان سے تھا۔ اس لئے مذہبی ماحول میں انہوں نے ہوش سنبھالا۔ تمنّا یہ تھی کہ یہ بھی اپنے بزرگوں کی طرح وعظ کہنے اور تبلیغ کرنے کے لئے وقف ہوجائیں۔ لہٰذا اسی نقطۂ نظر سے ان کی تربیت ان کے دادا دادی اور والدہ نے کی۔ علّامہ مرحوم نے آغازِ جوانی میں وعظ کہنا شروع بھی کردیا تھا۔ آواز اونچی اور گھبّیدار تھی۔ اس لئے سامعین کو متاثر کرلیتے تھے۔ مگر وہ پیشہ ور واعظ نہیں بننا چاہتے تھے۔ باپ کا سایہ کم عمری ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا۔ دادا بہت امیر آدمی تھے مگر ان کی امارت سے انہیں کوئی فائدہ پہنچنے کی صورت باقی نہیں رہی تھی۔ دادا کی موجودگی میں بیٹے کے مرجانے سے شرعاً وہ محروم الارث ہو گئے تھے۔ لہٰذا علّامہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد خود کمانے کے لائق ہوجائیں۔ طبیعت کا رجحان لکھنے لکھانے کی طرف تھا۔ لہٰذا میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد مضامین لکھتے رہے اور نوکریاں کرتے رہے۔ نوکری سے بھی رغبت نہیں تھی۔ اس لئے افسروں سے نہیں بنتی تھی۔ اور نوکریوں کو جوتیوں کی طرح بدلتے رہتے تھے۔ اور نوکریاں تھیں کہ ان کی جوتیوں سے لگی پھرتی تھیں۔ ادھر چوٹی ادھر ملی۔ جب لاہور سے منتقل ہو کر "مخزن" دلّی آیا تو شیخ عبدالقادر صاحب نے مولانا کو اپنا دستِ راست بنالیا۔ شیخ صاحب ہی کے اصرار پر انہوں نے ناول نگاری شروع کی۔ اور اپنا پہلا ناول لکھ کر اپنے پھوپھا اور استاد ڈپٹی نذیر احمد کی خدمت میں بغرضِ اصلاح پیش کی

گیا۔ خبر نہیں اس ناول میں کیا تھا کہ ڈپٹی صاحب ناراض ہوئے اور تاکید کی کہ اگر ناول لکھنا چاہتے ہو تو ایسے لکھو جیسے میں لکھتا ہوں۔ مولانا نے اپنے اس ناول کا مسودہ ضائع کر دیا اور ڈپٹی صاحب کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ناول "صالحات" لکھا۔ اسے دیکھ کر ڈپٹی صاحب خوش ہو گئے، اور انہوں نے فرمایا "اگر مجھے یقین کامل نہ ہوتا تو میں کہہ دیتا کہ صالحات میری لکھی ہوئی ہے اور مسودہ چوری ہو گیا"۔

پسندیدگی کی سند استاد سے پانے کے بعد مولانا نے ملازمت کو دھتا بتائی اور قلم ہی کے ہو رہے، دوست احباب سب اچھے ملے سب سے زیادہ حوصلہ افزائی کرنے والے تو شیخ عبدالقادر صاحب ہی تھے۔ ان کے علاوہ شیخ محمد اکرام، مولوی اشرف حسین، شہزادہ مرزا ارشد گورگانی، قاری سرفراز حسین، ان کے علاوہ واحدی صاحب، خواجہ حسن نظامی، عارف ہسوی، آصف علی بیرسٹر، خواجہ فضل احمد شیدا، سبھی اعلیٰ ادبی مذاق کے لوگ تھے۔ واحدی صاحب، جن کا میں نے ابھی نام لیا ہے اور جو حُسن اتفاق سے کراچی ہی میں موجود ہیں، عجیب مقناطیسی شخصیت کے بزرگ ہیں۔ کوچہ چیلان میں ان کا دولتکدہ ادیبوں کا مرجع تھا۔ واحدی صاحب ادیب بھی ہیں اور لو بیب گر بھی۔ انہوں نے ساری عمر اچھے سے اچھے رسالے نکالے اور ادب کی خدمت کے لئے ایثار و پیسہ پانی کی طرح بہایا۔ مولانا راشد الخیری کے مزاج میں درویشی کا لاابالی پن تھا۔ انہیں اس کا احساس نہیں تھا کہ وہ کتنے عظیم المرتبت مصنف بن گئے ہیں۔ لوگ ان کے مضامین اور کتابیں پڑھنے کے لئے چشم براہ رہتے تھے۔ مگر وہ سب سے بے پرواہ صرف اس وقت لکھتے تھے جب ان کا جی چاہتا تھا۔ واحدی صاحب کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے مولانا سے زبردستی لکھوایا۔ وہ اس طرح کہ مولانا کو روزانہ اپنے گھر کے ایک کمرے میں بند کر دیتے اور چند گھنٹے بعد مولانا کو کنڈی کھول کر باہر نکالتے تو مولانا پسینے میں شرابور برآمد ہوتے اور میز پر ۲۵، ۳۰ صفحے لکھے ہوئے موجود ہوتے۔ غالباً شام زندگی اسی طرح لکھوائی گئی۔

مولانا نے ۱۹۰۸ء میں ماہنامہ "عصمت" جاری کیا اور اس کے دو ایک سال بعد ایک مردانہ پرچہ "تمدن" نکالا۔ اس زمانے میں مولانا نے کتابیں کم لکھیں۔ مگر جب چند سال بعد ان کے خلف اکبر مولانا رازق الخیری نے عصمت کو سنبھال لیا اور "تمدن" کو ان کے دوست قاری سرفراز حسین کے صاحبزادے قاری عباس حسین صاحب نے مانگ لیا تو علامہ مغفور کو کتابیں لکھنے کی فرصت مل گئی۔ اور انہوں نے تابڑ توڑ کئی کتابیں لکھ ڈالیں۔ ان کی بڑی صاحبزادی راشدہ بیگم صاحبہ بیاہ کر گنگاپور چلی گئی تھیں۔ مولانا گنگاپور جاتے تو فرصت ہی فرصت ہوتی۔ یہیں انہوں نے منجملہ اور کتابوں کے "آمنہ کا لال" اور "نالۂ یتیم"، "سیدہ کا لال" جیسی بے مثل کتابیں لکھیں۔ آپا راشدہ کا بیان ہے کہ ابا جان صبح کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد ایک کمرے میں اگر بتیاں جلاتے۔ ایک طشتری میں پھول بھر کے اپنے پاس رکھ لیتے۔ اور فرش پر مؤدبانہ بیٹھ کر یہ کتابیں لکھا کرتے تھے۔ جبھی تو یہ دونوں کتابیں سدا بہار ہیں اور رہتی دنیا تک مہکتی رہیں گی۔

مولانا کے پہلو میں ایک چوٹ کھایا ہوا دل تھا۔ چھوٹی سی عمر میں باپ کے سائے سے محروم ہوئے۔ ماں کی عمر رنڈاپے میں کٹی۔ ددھیال کی محتاجی اور تنگدستی میں مبتلا رہے۔ امیر زادے کے رستے میں سے غریب ہوتے کو کچھ نہ ملا۔ خلاف مزاج نوکریاں کرنی پڑیں۔ ددھیال بھی امیر اور ننھیال بھی امیر مگر خود پردیس میں چھوٹی تنخواہ کے نوکر، بیوہ ماں اور چھوٹی بہن کا ساتھ۔ پریشانیوں کے ہجوم میں زندگی کے ابتدائی سال گذرے غم ان کے گھٹی میں اتر گیا تھا۔ یہی غم ان کی تحریروں میں بھی رچ گیا اور حُزن نگاری ان کے لئے مخصوص ہو گئی۔ مگر کس بلا کا غم اور کس غضب کا حُزن تھا کہ ہم نے لوگوں کو ان کی کتابیں پڑھ کر دھاروں روتے دیکھا۔ ان کے اسی انداز تحریر کی وجہ سے خواجہ حسن نظامی نے علامہ کے نام سے پہلے غم اداا لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اور بعد ازاں احسان نے انہیں "مصور غم" کا خطاب دیا تھا۔ اور یہ خطاب اس درجہ موزوں ثابت ہوا کہ مولانا کے نام کا جزو لاینفک بن گیا۔

شیخ عبدالقادر، واحدی صاحب کے بعد تیسرا نمبر رازق الخیری صاحب کا ہے۔ بلکہ سب سے اہم ROLE مو خرالذکر ہی کا ہے کہ انہوں نے کتابت، طباعت و اشاعت دیکھ کے جھنجھٹوں سے علامہ مرحوم کو فارغ کر دیا اور محنت و دیانت داری سے عصمت کا اشاعتی کام [illegible]

گلیکسو سے پرورش پانے والے بچے



تندرست، توانا اور ہنس مکھ ہوتے ہیں

گلیکسو

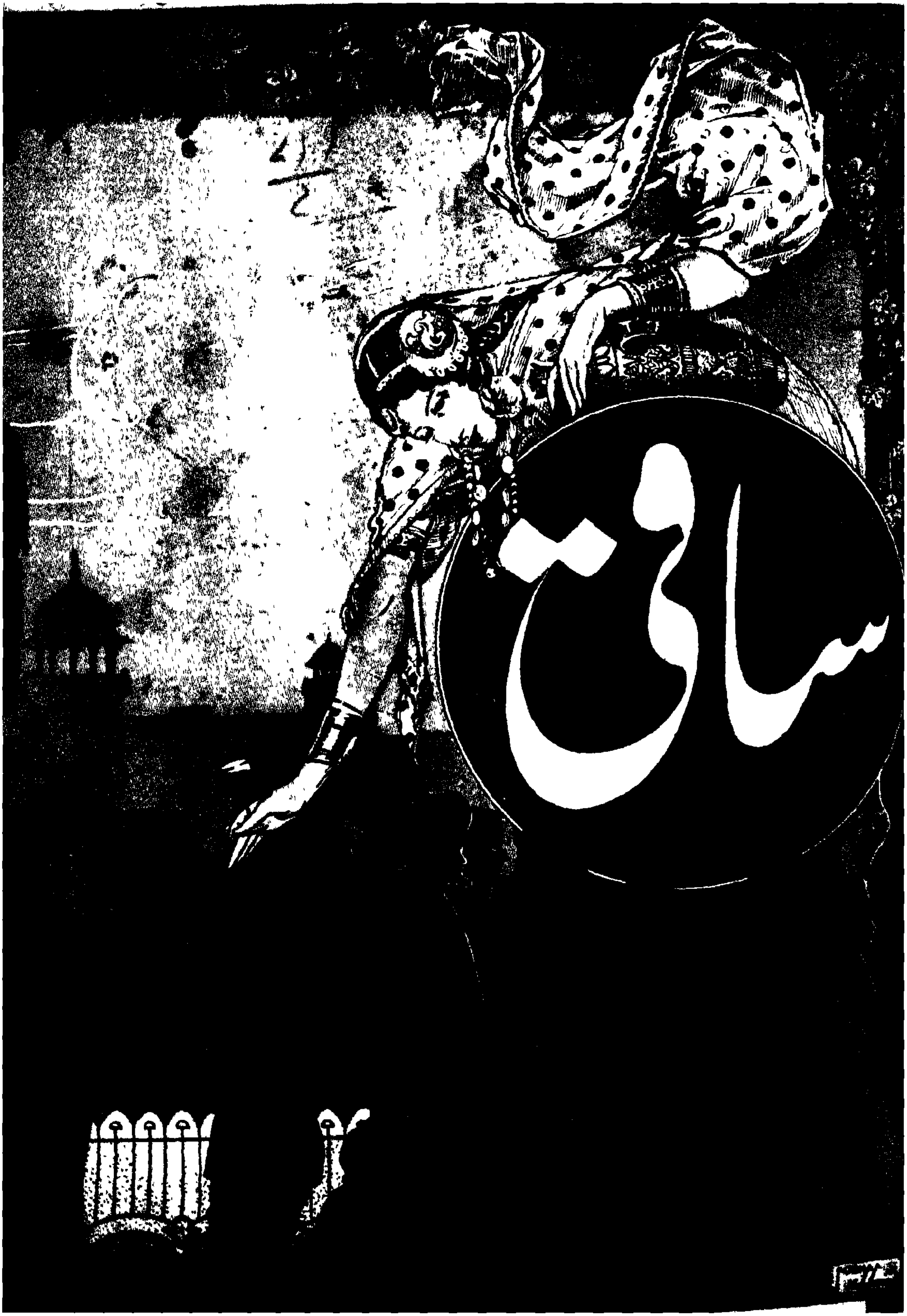
بچوں کو
تندرست و توانا بناتا ہے



تندرست جسم، شاداب چہرہ اور چمکتی ہوئی نگاہیں اِس حقیقت کی دلیل ہیں کہ بچہ کی پرورش گلیکسو پر ہو رہی ہے۔ پُشتہا پُشت سے ہوشیار اور تجربہ کار مائیں اپنے بچوں کے لئے گلیکسو ہی کو منتخب کرتی ہیں۔ یہ خالص اور غذائیت سے بھرپور دودھ نہ صرف ہڈیوں اور دانتوں کو مضبوط بناتا ہے بلکہ بچوں کی نشوونما اور تندرستی کا بھی ضامن ہے۔ عام تازہ دودھ کے برعکس گلیکسو ہر قسم کی آمیزش سے پاک ہے اور بچوں کے نازک معدے بآسانی ہضم کر لیتے ہیں۔

بچے کو گلیکسو ہی دیجئے۔ گلیکسو سے بچے صحت مند، توانا، خوش و خرم رہتے ہیں۔

گلیکسو لیباریٹریز (پاکستان) لمیٹڈ۔ کراچی۔ لاہور۔ چٹاگانگ۔ ڈھاکہ


ساقی



نفیس و لطیف
تبت
ٹالکم پاؤڈر
جسم کو تر و تازہ رکھتے ہیں!
TIBET
TIBET
TIBET
ٹالکم پاؤڈر میں تبت کا جواب نہیں اس کی بھینی خوشبو سے
بدن مہک جاتا ہے اور آپ دن بھر شاداب و شگفتہ نظر آتے ہیں
گرمیوں میں تر و تازہ رہنے کے لئے اسے پسندیدہ تبت ٹالکم پاؤڈر
کا استعمال اپنی عادت میں شامل کر لیجئے۔
تبت ٹالکم پاؤڈر
شادابی اور شگفتگی کے لئے
کوہ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ ۔ کراچی ۔ ڈھاکہ
united

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مدیر
شاھد احمد دہلوی
معاون
عاصمہ بیگم

(رکن انجمن ادبی رسائل پاکستان)

جرعات

سالانہ چندہ
مع خاص نمبر
پاک و ہند دس روپے
قیمت فی پرچہ ۵۰ پیسے

جلد ۱۷	ساقی، کراچی، بابت اپریل ۱۹۶۵ء	نمبر ۴

بھارت میں ساقی کا چندہ بھیجنے کا پتہ:۔ عظیم کتاب گھر ۲۲۶۳ رنگ محل خورد پھاٹک حبش خان، دہلی

ناشر عاصمہ بیگم نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر پی۔ آئی۔ بی کالونی (۵) سے شائع کیا

واحدی

ایک نیک دل خونی

دلّی میں ایک کاروباری آدمی تھے، کوٹ پتلون پہنتے تھے، موٹر میں پھرتے تھے، حج کر چکے تھے، نماز کے پابند تھے، ایک مُٹھ دو دو انگشت ڈاڑھی رکھتے تھے، لیکن اُن کے متعلق مشہور تھا کہ آدمی کو مار ڈالتے ہیں، کئی کو مار چکے ہیں۔ جس طرح جنوں کے قصے سنائے جاتے ہیں، اُس طرح اُن کے قصے سنائے جاتے تھے کہ جیل میں ہوتے ہیں اور قتل کراتے ہیں۔ جیل کے عملے کی کیا مجال ہے جو انہیں جیل سے نکلنے نہ دے۔ قتل سے فارغ ہو کر واپس پہنچ جاتے ہیں، اور جب عدالت میں مقدمہ چلتا ہے تو کہتے ہیں کہ جناب! میں تو اس وقت مقیّد تھا۔ خدا معلوم شہرت صحیح تھی یا غلط، میری عقل تو کام نہیں کرتی کہ ایسا شخص خونی کیسے ہو سکتا ہے۔ اُن کا کوئی قتل کبھی ثابت نہیں ہوا۔ چند دن جیل میں رہے، اور پھر دندنانے لگے۔ دندنانے کا لفظ میں نے سخت کہہ دیا۔ دندنانے والے آدمی نہیں تھے۔ کسی سے تنتے اور اکڑتے نہیں دیکھا اور نہ سُنا۔ مگر اس کے باوجود لوگ اُن کی دھونس مانتے تھے، اُن سے ڈرتے تھے۔

اُن کے خونی ہونے کی شہرت لوگوں کے کام آتی تھی۔ لوگوں کے حق میں مفید تھی۔ ایک خاتون تھیں، کئی بچوں کی ماں۔ خاوند نے دوسرا گھر بسا لیا اور ساری تنخواہ دوسری بیوی کو دینے لگا۔ پہلی بیوی "خونی صاحب" کے پاس گئیں اور اپنی بپتا بیان کی۔ "خونی صاحب" نے کہا، تم اپنے خاوند کو کہلا بھیجو کہ مجھ سے مل لیں۔ نام سنتے ہی خاوند صاحب فوراً حاضرِ خدمت ہوئے۔ "خونی صاحب" نے تنخواہ پوچھی، اور بالکل دھیمی آواز سے اتنا حکم دیدیا کہ آدھی تنخواہ کی حق دار پہلی بیوی ہے۔ خاوند نے تعمیل شروع کر دی، اور پہلی بیوی سے جواب طلب نہیں کیا کہ بیوی! تم نے اُس خطرناک شخص کو بیچ میں کیوں ڈالا، کیونکہ جواب طلب کرنا خاوند کے نزدیک خطرہ مول لینا تھا۔ یہ واقعہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔ اس قسم کے واقعات کی بھی قتل کے واقعات کے ساتھ ساتھ شہرت تھی۔

میں قتل کے واقعات کو مبالغہ آمیز سمجھتا تھا، مگر خونی صاحب کی دھونس مانتا تھا۔ ایک دفعہ غریب خانے پر تشریف لائے اور نہایت لجاجت سے فرمایا:۔ ذرا سی تکلیف دینی چاہتا ہوں۔ کھڑے کھڑے خان بہادر حاجی رشید احمد صاحب کے پاس چلے چلئے اور ان سے سفارش کر دیجئے کہ چیف کمشنر سے میرا غیرمعیّن ریزرو منظور کرا دیں۔ میں کان دبائے موٹر میں جا بیٹھا اور خان بہادر صاحب سے تعارف کرایا۔ خان بہادر نے کہا، میں حاجی صاحب کو جانتا ہوں۔ انشاء اللہ چیف کمشنر کے ہاں کل ہی جاؤں گا۔

"خونی صاحب" جن کے کام آتے تھے، انہیں تو پسند تھے ہی، لیکن دوسرے بھی اُن کے ساتھ عزت کا برتاؤ کرتے تھے۔ اس خیال سے کہ کہیں کسی وقت کے گماشتہ نہ آ نکلیں، اُن کی عزت دولت مندوں میں خاص طور سے کی جاتی تھی۔ وہ شہر کے معززین میں سے تھے۔ خیر مجھے تو دلّی کے ایک "خونی" کا کردار دکھانا تھا۔ دلّی کے بدنام ایسے ہوتے تھے۔

ایک بزرگ گزرے ہیں، شیخ احمد ابن صبا، جن کی بابت حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ ابن صبا نے وہ راہ چند لمحوں میں طے کر لی، جسے دوسرے برسوں میں طے نہیں کر سکتے۔ ان کا واقعہ یوں ہے کہ چوری کرنا اور جیل جانا پیشہ بنا رکھا تھا۔ ایک شب حضرت

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

ملک اسمٰعیل حسن خاں

غالب کا نظریۂ شعر

غالب نے شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن کی طرح اپنی مناسب بلکہ خاطر خواہ قدر و منزلت نہ ہوتے ہوئے دیکھ کر یہ بھی کہا تھا کہ ؎

جو چاہیے نہیں وہ مری قدر و منزلت — میں یوسفِ بقیمتِ اوّل خریدہ ہوں

اسی لئے ان کا خیال تھا ؎

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج — میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

وہ اپنے عہد میں واقعی گلشنِ ناآفریدہ کا بلبل تھا، لیکن جس گلشن کا وہ بلبل ہے وہ عہد حاضر ہی ہے اور غالب اسی زمانے کا شاعر تھا جو سو سال پہلے پیدا ہو گیا تھا۔ جوش کا یہ شعر جوش سے زیادہ غالب پر صادق آتا ہے ؎

جہاں سو سال بعد آنا تھا مجھ کو — وہاں سو سال پہلے کھینچ لایا

"دیوانِ غالب ہندوستان کی الہامی کتاب ہو یا نہ ہو۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ ہمارے پچھلے دور کا نکھار اور جدید دور کا آغاز ہے۔ سرور صاحب کے بقول ان کی عظمت اور موجودہ مقبولیت کا راز یہ ہے کہ وہ بعض حیثیتوں سے پرانے ہیں اور بعض حیثیتوں سے نئے۔ اور اُن کی نے میں ہمیں اُن کی آواز کے ساتھ اُن کے دور کی اور آنے والے دور کی کتنی ہی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔" غالب نے ہمارے ادب میں ایک تشنگی ایک کوتاہی کو محسوس کیا۔ اور نظم و نثر دونوں میں ایک نئے انداز کی طرح ڈالی۔ اسالیب بیان کو ایک وسعت دی جو ہمارے ادب میں جدید خیالات کی سمائی اور پہنائی کے لئے ضروری تھی۔ اُنہوں نے اردو شاعری کو دماغ اور اس کے ساتھ فلسفیانہ آہنگ عطا کیا اور ہم کو ایسے جذبات و تاثرات عطیے جو زندگی میں ہر موڑ اور ہر قدم پر ہماری دستگیری اور رفاقت کرتے، یاد آتے اور ہم کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ اسی لئے ہم دیوانِ غالب کو محمد حسن صاحب کے الفاظ میں "نئی نسل کی انجیل" قرار دے سکتے ہیں۔

غالب نے اپنے کلام نیز مکاتیب میں کئی جگہ اپنے نظریۂ شعر و شاعری کی طرف بھی اشارے کئے ہیں اور اُن سے بھی اُن کی بلند نظری، روشن خیالی، اور بصیرت و بصارت کا پتہ چلتا ہے کہ اس باب میں بھی اُن کا نقطۂ نظر اپنے زمانے سے کس قدر جدا اور دورِ مابعد سے کتنا قریب تھا۔ اُس دور میں جبکہ شعراء تعمیرِ ذوق اور فکر سنگلاخ زمینوں، محاورہ بندی، روزمرہ نگاری، قافیہ پیمائی کے چکر میں مبتلا تھے۔ اور مومن اپنے چیستانی انداز میں لوگوں کی کثرت داد لیا چاہتے ہیں یا اُلجھے ہوئے تھے اور شعرائے لکھنؤ تو سب کے سب اسی عالم میں پہنچے ہوئے تھے چنانچہ اُن کے یہاں بقول آتش بندشِ الفاظ نگوں کا جڑنا تھا۔ اور شاعری مرصع سازی۔ اور ناسخ کے یہاں نئی زمینوں اور نئی بندشوں پر ریختہ کی ساری دنیا تھمائی گئی تھی ؎

سب نہیں اپنی زمیں پہلے یار تھی — روز باں ریختہ کی تجھ سے دیار تھی

صرف غالب ہی وہ شاعر تھے جو قافیہ پیمائی و معنی آفرینی میں امتیاز کرتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اس پر شدت سے قائم بھی تھے۔ ؎

غالب بخود شیوۂ ما قافیہ بندی ظلمی ست کہ بر کلک و ورق می کنم امشب

اُن کا خیال تھا کہ "دلِ گداختہ" پیدا کرنے کے بعد ہی "حسنِ فروغِ شمعِ سخن" کا جلوہ نظر آتا ہے ؎

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

اُن کا اُس دور میں یہ کہنا کہ "بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل" آنے والی تغیر کی نہ صرف تمہید بلکہ صریح ابتدا تھی۔ اور غالب ہی وہ پہلا "بت شکن" تھا جس نے دوش کے آئینے میں فردا کا عکس دیکھ کر غزل کی مروجہ "فارم و اسلوب و معنویت" کے خلاف آواز اٹھائی۔

غالب کی شاعری کے اوصاف و محاسن کی یہ داستان بڑی طویل و بسیط ہے۔ چونکہ اس وقت صرف ان کے "نظریۂ شعر" سے بحث مقصود ہے اس لئے اس کو فی الحال یہیں چھوڑ دینا مناسب ہے

غالب کے نظریۂ شعر کا جائزہ لینے سے قبل شعر و شاعری کے متعلق تھوڑی سی گفتگو ضروری ہے۔ جس سے اصل موضوع کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

قدیم یونانی فلسفہ میں شاعری "جزوِ پیغمبری" خیال کی جاتی تھی۔ اسی لحاظ سے یونانی علم ادب میں شاعر اور پیغمبر دونوں کے لئے لفظ VATE استعمال ہوتا تھا۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ کائنات کی ہر شے خواہ وہ مرئی ہو یا غیر مرئی، مادی ہو یا غیر مادی، اپنے وجود میں ایک راز رکھتی ہے۔ جس کو کائنات کا مقدس راز کہا جا سکتا ہے۔ اور اس مقدس راز تک شاعر کی رسائی بھی ویسی ہی ہوتی ہے جیسے کہ پیغمبر کی۔ گوئٹے (GOETHE) المانیہ کا مایۂ ناز فلسفی اور شاعر "مستغرقین کا امام" کائنات کے اس مقدس راز کو اپنی اصطلاح میں "رازِ آشکارا" (OPEN SECRET) کہتا ہے۔ اُس کی یہ اصطلاح اتنی مقبول ہوئی کہ تمام السنۂ مغربیہ میں "رازِ آشکارا" روزمرہ کا محاورہ بن گیا۔ ان دونوں لفظوں کی توضیح کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنے وجود میں ایک راز رکھتی ہے۔ راز تو اس وجہ سے کہ عام انسانی آنکھ اس تک پہنچنے سے قاصر ہے۔ اور آشکارا اس لئے کہ قدرت نے اُس کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اُس راز تک پہنچنا فقط شاعر اور پیغمبر کا کام ہے۔

مختلف علماء و ادباء اور شعراء نے روایت کی طرح "شاعری" کی مختلف و متعدد تعریفیں کی ہیں۔ لیکن اُن میں سے زیادہ تر تعریفیں یک رُخی، ناقص اور نامکمل ہیں۔ تعریف کے معنی ہیں کسی چیز کی حقیقت کو واضح کرنا۔ لیکن ایسی تعریفیں خال خال ہیں جو اس مفہوم کا احاطہ کر لیں۔ مثلاً کسی نے شعر کو موزوں اور مقفیٰ کلام بتایا۔ کسی نے کہا کہ مناسب الفاظ، نقوش اور اوزان میں احساسِ توازن کو ڈھال دینا شعر ہے۔ کسی نے شعر کو لفظی صنعت گری قرار دیتے ہوئے لکھا "جب بہترین لفظوں کو بہترین ترتیب کے ساتھ رکھ دیا جائے تو شعر وجود میں آتا ہے۔" شیلی نے شاعری کی تعریف "تصورات کی مصوری" کی ہے۔ کارلائل موسیقیت آمیز اور ترنم ریز خیالات کو شاعری کہتا ہے۔ میتھیو آرنلڈ کا خیال ہے کہ "ہر وہ کلمہ جو انسان کی زبان سے پُرسرور انداز سے نکلتا ہے شعر ہے۔" کالرج کی رائے میں سائنس کی ضد شعر ہے۔ ورڈزورتھ شاعری کو تمام سائنس کی روح کہتا ہے۔ پو تعریف کرتا ہے کہ "حسن کا توازن الفاظ کے ساتھ ادا ہونا شعر ہے۔" جانسن کہتا ہے کہ "جس عبارت میں وزن ہو وہ شاعری ہے۔" بیڈلے نے کہا ہے کہ "تخلیقی پیکروں کا پیدا کرنا شاعری ہے۔" اہلِ منطق نے شاعری کی تعریف یہ کی ہے کہ "الشعر انبساط النفس او تنقبض" یعنی شعر وہ ہے جس سے نفس کو انبساط یا انقباض حاصل ہو۔ عربی میں کی گئی ایک دوسری تعریف ہے کہ "وان الشعر بیت انت قائلہ۔ بیت یقال اذا انشدتہ، صدقا" یعنی سب سے عمدہ شعر جو تم کہہ سکتے ہو وہ ہے جس کو سن کر لوگ کہیں کہ سچ ہے۔ یا یہ تعریف کہ "اذا اقبل الطبع الناس طرا۔ واذ لرم الجوبن الجرین" یعنی جب کہا جائے تو سب کو ایسا لگے کہ کی طرح ہو اور جب [illegible] کیا جائے تو بڑے بڑوں کے حوصلے پست کر دے۔ نظامی عروضی سمرقندی چہار مقالے میں لکھتے ہیں۔

"شاعری صناعتیست کہ شاعر بداں صناعت اتساقِ مقدماتِ موہمہ کند و التیامِ قیاساتِ منتجہ بر آں وجہ کہ معنی خرد را بزرگ گرداند و معنیٔ بزرگ را خُرد۔ و نیکو را در خلعتِ زشت باز نماید و زشت را در صورتِ نیکو جلوہ کند و بہ ایہام قوتہائے غضبانی و شہوانی را برانگیزد تا بداں ایہام طباع را انقباضی و انبساطی بود و امور عظام را در نظامِ عالم سبب شود۔"[1]

یہ جتنے نظریئے سطورِ بالا میں پیش کئے گئے ہیں ان میں شعر کی تعریف اور شعر کی تاثیر و اہمیت ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئی ہیں۔ ان تعریفات و توصیفات میں ایک آدھ کے علاوہ سب کے سب پرانے اور غیر ترقی یافتہ ذہنوں کی پیداوار ہیں۔

شاعری دراصل تصور و خیال اور احساسات کا آئینہ خانہ ہونے کے ساتھ ساتھ حرف و صوت میں رقصِ حیات ہے۔ اصل چیز فن کی افادیت ہے۔ اس کا کام محض مسرور و مسحور یا محو و مگن کرنا ہی نہیں، زندگی کی تہذیب و تعمیر اس کا فرض اولین ہے" جیسے کہا گیا ہے۔ اتنا اہم و ضروری نہیں جتنا کیا کہا گیا ہے" اہم ہے۔ اقبال کے الفاظ میں "شاعری کی جان معنویت اور خیالات ہیں" غالباً اسی خیال کے پیش نظر اکبر الہ آبادی نے کہا تھا کہ ؎

قاعدوں میں حُسنِ معنی گم کرو   شعر میں کہتا ہوں ہجے تم کرو

اب غالب کی طرف آئیے۔ شاعری جیسا کہ کہا جا چکا ہے ایک الہامی و وہبی چیز ہے، کسبی نہیں۔ غالب اس الہام کے قائل ہیں ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں   غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

نشاۃ الثانیہ (RENAISSENCE) کے شاعر بھی شاعری کو "عطیہ وہبی" سمجھتے تھے۔ اسپنسر (SPENSER) کے بقول "شاعری ایک عطیۂ الٰہی ہے۔ جو مشقت اور مطالعے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہاں ان دونوں سے سنوارا جاتا ہے"۔ مغرب کے نئے نقادوں میں سے ہربرٹ ریڈ (HERBERT REED) نے بھی اپنی تنقیدی کتاب ورڈسورتھ (WORDSWORTH) میں اسی قسم کے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ اور شاعری کو "الہامی کیفیت" کہا ہے۔

شاعری چونکہ الہامی و وہبی اور وجدانی شے ہے، اس لئے اس کا تعلق انسان کے جذبات و احساسات سے ہے یعنی وہ احساسات و جذبات کی زبان ہے۔ اور شاعر "مصحفِ احساس" کی تفسیر پیش کرتا ہے۔ وہ (شاعری) ایک آزاد رندی کی طرح ہے۔ اس کو کسی مقصد یا نظریہ کا تابع بنانا مناسب نہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک مقصد اور ایک افادیت بھی رکھتی ہے۔ کانٹ (KANT) کے الفاظ میں "شاعری بے مقصدی ایک مقصد رکھتی ہے" یعنی وہ بے مقصد مقصدیت رکھتا ہے۔ بے مقصد سے یہاں مراد سرور صاحب کے الفاظ میں یہ ہے کہ اس کا مقصد عمل کے لئے تحریک نہیں، نہ اس کا مقصد علم میں اضافہ کرنا ہے۔ وہ تو ایک خاص تجربہ عطا کرتا ہے۔ مقصدیت سے مراد یہ ہے کہ وہ اگرچہ کسی عمل کے لئے برانگیختہ نہیں کرتا مگر زندگی کے متعلق ایک بصیرت ضرور عطا کرتا ہے۔ جو اگرچہ سائنسی یا معلوماتی صداقت نہیں رکھتی مگر ایک معنی میں اس سے ارفع اور دوسرے معنی میں اس سے مختلف صداقت ہے۔ اور جو اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہے ..... ادب ایک فنِ لطیف ہے اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ جمالیات کے معیار پر پورا اترے۔ لیکن اس کے لئے ہمیں بہرحال زندگی کی کچھ قدروں کا احساس رکھنا ہوگا۔ اور یہ قدریں وہی ہوں گی جن سے زندگی کی گہرائی، پیچیدگی، وسعت اور بلندی کا کچھ علم ہو گوئٹے اور کولرج نے اسی لئے شاعری میں ایک حکیمانہ نظر پر اصرار کیا ہے۔ حکیمانہ نظر کے یہ معنی نہیں کہ شاعری فلسفے کی تشریح ہو جائے یا فلسفے کی طرح منظم اور مربوط نظامِ فکر پیش کرے۔ ادب کو اس قسم کے مقصد سے کوئی سروکار نہیں، بڑی شاعری ہمیشہ مقصد کی قید سے آزاد رہی ہے۔ کیونکہ شاعری نظریہ نہیں ہوتی۔ نظریئے کے اظہار کا ایک ذریعہ ہو سکتی ہے۔

---

[1] چہار مقالہ ص ۔ ۲۶ ۔ و ما بعد مطبع فخر و صلاحیت قاہرہ

اس مقصدیت و غیر مقصدیت کی منزل سے غالب اظہارِ خیال کرتے ہوئے اس طرح گزرے ہیں ؎

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے　　　نالہ پابندِ نے نہیں ہے

غالب نے اس سیدھی سادی بحر میں کتنی گہری بات کہی ہے۔ اُن کا مقصد یہ ہے کہ جذبات بہتا ہوا دریا ہیں۔ ان کو بحر و وزن و الفاظ کی قیود میں جکڑ دینا انسان کے لئے مشکل ہے۔ اور اگر کوئی کوشش کرے گا تو ممکن ہے کہ کامیاب بھی ہو جائے۔ لیکن دل کے اندر جو تلاطم و ہیجان ہے اُس کی پوری تصویر کشی نہیں کر سکتا۔ نالے کی رو کو جکڑ دینا یا پابند کر دینا ناممکن ہے۔

غالب کے اس خیال سے دو پہلو سامنے آتے ہیں یا دو اُمور مترشح ہوئے ہیں :۔

(۱) اوّل یہ کہ شاعری کو فلسفیانہ خیالات یا کسی مخصوص منظم و منضبط نظامِ فکر کا آلہ بنانا مناسب نہیں اور نہ ہی وہ کسی فلسفہ کی نشر و اشاعت یا تشریح کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ کیونکہ جذبات و احساسات ہر وقت یکساں نہیں ہوتے۔ انسان پر مختلف اوقات میں مختلف کیفیتیں گزرتی رہتی ہیں۔ وہ زندگی میں اَن گنت حالات سے گزرتا ہے اور اُن سب کا اثر قبول کرتا ہے۔ اگر حساس و ذی شعور ہے تو اُس بات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا جو اس کے مخصوص نظریۂ زندگی، یا نقطۂ نظر سے ہم آہنگ نہ ہو۔ اور اگر نظر انداز نہیں کرتا تو اس کے یہاں مختلف النوع خیالات کے باعث تضاد کا اُبھر آنا یا راہ پانا یقینی و ناگزیر ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ شاعر کے دل میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ پورے طور پر باہر نہیں آ سکتا اور اُس کے لئے الفاظ کا سانچہ ناکافی ٹھہرتا ہے۔ شاعری اظہارِ خارجی سے مجروح ہو جاتی ہے۔ جذبہ کی شدت الفاظ کے پیمانوں میں نہیں ظاہر ہوتی۔ دل کی کیفیت کو الفاظ کے ذریعے پورے طور پر ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اصل شعر تو دل ہی میں ہو جاتا ہے۔ باہر جو کچھ الفاظ کی مدد سے آتا ہے وہ اُس کا ایک حقیر یا معمولی یا ہلکا سا عکس ہوتا ہے۔ وہ حلق کی موجوں پر خالی سیپیوں کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس طرح دل کی آواز پابندِ نے نہیں ہو پاتی۔

شاعری کے بارے میں غالب کی فکر و خیال کے یہی وہ رموز و نکات ہیں جن کو سُن کر یا دیکھ کر اُن کے معاصر حیرت و استعجاب میں پڑ جایا کرتے تھے۔ اور اُن کو ضد و غصہ میں اپنی لیاقت و سخن فہمی کا بھرم رکھنے کے لئے مجہول الحقول یا غیر معمولی باتیں بنا کر "محض مہمل یا لغویات" کہہ کر دل بہلا لیتے تھے ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن　　　دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

غالب اپنے ذہنی سفر کی ہر منزل میں معنوی پیروں کا شیدا رہا ہے۔ اس انداز طبیعت کا ثبوت اُن کا وہ رجحان ہے کہ انہیں عرفی، ظہوری اور بیدل وغیرہ سے خاص عقیدت تھی۔ بیدل کے متعلق کہتے ہیں ؎

اسد ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی ہے　　　مجھے رنگِ بہارِ ایجادیٔ بیدل پسند آیا

مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے غالب　　　ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب　　　عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

گر ملے حضرتِ بیدل کا خطِ لوحِ مزار　　　اسد آئینۂ پروازِ معانی مانگے

ظہوری کے متعلق کئی جگہ فارسی میں اور ایک جگہ اردو میں کہا ہے ؎

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب — میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

غالب ایک عرصہ تک معنی آفرینی اور دقیق خیال کو کمال فن سمجھتے رہے۔ نسخۂ حمیدیہ غالب کی ابتدائی مجموعہ کلام کی مثالیں پیش کرتا ہے۔ اُن کی طبیعت کورانہ تقلید سے منحرف تھی اور وہ ہر بات کو بالکل نئے زاویے سے کہنا چاہتے تھے۔ بیدل کا پیچیدہ طرزِ بیان ان کو اس قدر پسند آیا کہ اُسے شاعری کا معراج سمجھنے لگے۔ اور دقیق آفرینی کو شاعری کا حاصل۔

غالب کا یہ مخصوص بیدلی رنگ جو وہ آگرہ سے لیکر آئے تھے اور جس میں جذبے سے زیادہ تخیل کی کشیدہ کاری ہوتی تھی وہ دہلی میں مقبول نہ ہوا۔ اور یہاں لوگوں نے ان کا مذاق اڑانا شروع کیا۔ غالب اس قدر ناشناسی پر بہت دل گرفتہ ہوئے۔ اور سب کو سخنورانِ جاہل[1] کہہ ڈالا لیکن یہ تنقید غالب کے حق میں مفید ثابت ہوئی۔ جدت طرازی اور بیدل کی پیروی میں وہ کچھ عرصہ دشوار گزار گھاٹیوں میں بھٹکتے رہے مگر ان کے ذوقِ سلیم نے زیادہ بھٹکنے نہ دیا اور بالآخر وہ جلد ہی صراطِ مستقیم پر آگئے۔ اس کے بعد وہ میر کی طرف متوجہ ہوئے۔ میر کے یہاں جو جذبے اور احساس کی شدت اور گرمی تھی اس کی مقناطیسی کشش نے بہت جلد ان کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ اور میر کے جذبات کی تندی سے ان کا آبگینۂ قلب پگھلنے لگا۔ میر کے متعلق کہتے ہیں ؎

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب — جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقول ناسخ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالب — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ شعر میں صرف جذبہ کی اہمیت کے قائل ہو گئے اور تفکر و تعقل کی گہرائیوں سے نکل آئے۔ ایسا نہیں۔ غالب، بیدل کے چنگل سے نکلنے کے بعد بھی بیدل کی رمزیت کو نہ چھوڑ سکے۔ انہوں نے ایسی نو موشگافیوں اور ثقیل الفاظ اور پیچیدہ ترکیبوں سے احتراز کیا۔ لیکن مضمون کا رمزی اور طلسمی اشکال باقی رہا، یہ اشکال مضمون کے اچھوتے پن اور ایمائی اسلوبِ بیان کا لازمی نتیجہ تھا۔ اب جذبے اور تفکر کی آمیزش کو انہوں نے اپنا مطمحِ نظر بنالیا

حسن فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ — پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

یعنی وہ اس حقیقت سے واقف ہوگئے کہ دلِ گداختہ کے بغیر حسنِ فروغِ سخن ممکن نہیں۔ میر کے اشعار میں جذبہ کی جو گہرائی اور گرمی ہے وہ اسی دلِ گداختہ کا فیض ہے۔ یہ فیض حاصل کرنے کے لئے شاعر کی وہ حیثیت کا دش و جانفشانی شرط ہے۔ جسے اقبال نے خونِ جگر سے تعبیر کیا ہے۔ اور حالی نے بھی اپنے ایک شعر میں اس پر زور دیا ہے ؎

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے — تب نظر آتی ہے اک مصرعۂ تر کی صورت

غالب کی نوائے شعلہ اثر کا راز ان کے دلِ گداختہ والے نظریہ ہی میں پنہاں ہے۔

غالب کو بنیادی طور پر ہیئت یا اسلوب پرست کے بجائے مواد پرست کہا جاسکتا ہے، وہ الفاظ و اسلوب کو بھی شعر کی خوبی دکھانے کے لئے

---

[1] بعد میں سخنورانِ کامل سے بدل دیا تھا۔ یعنی شعر سخن کے اُستے سخنورانِ کامل۔

ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن اُن کا ذہن شعر کی معنویت اور خیال کی نُدرت کی طرف بار بار بھاگتا تھا۔ عقلی گورکھ دھندوں اور رعایتوں، صنعتوں کے استعمال اور محاورہ بندیوں وغیرہ سے وہ کوسوں دور تھے۔ اُنہیں شعر کی معنویت عزیز تھی۔ اقبال نے کہا ہے کہ "شاعری کی جان تو شاعر کے جذبات ہیں"۔ یہ بات غالب پر بھی حرف بہ حرف صادق آتی تھی۔ لیکن ایسا نہ تھا کہ وہ شعر کی ظاہری ہیئت سے غافل تھے۔ وہ اُس کا بھی بہت اچھا سلیقہ اور شعور رکھتے تھے۔ وہ شاعری کو اقبال کے الفاظ میں "ارتباطِ لفظ و معنی، ارتباطِ جان و تن" سمجھتے تھے۔ اُنہیں اپنے "اندازِ بیان" پر فخر تھا ؎

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور
ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے

اُنہیں اس بات کا احساس تھا کہ "اندازِ بیان" سے شعر کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ اسی لئے وہ "اندازِ بیان" کو شاعری میں "سب کچھ" نہیں بلکہ "بہت کچھ" سمجھتے تھے۔ وہ شاعری میں "الفاظ" کے عمل دخل اور اس کی ساحری پر بھی ایمان رکھتے تھے، لیکن اس سلسلے میں اُن کا نظریہ یہ تھا ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

اُن کی شاعری میں جو الفاظ استعمال ہوتے تھے وہ معنی کی ایک دنیا لئے ہوتے تھے۔ محض بڑے بڑے، خوبصورت اور شاندار الفاظ کا استعمال اُن کا مطمحِ نظر نہ تھا۔ اُن کو اپنے ذخیرۂ الفاظ کی نمائش مقصود نہ تھی۔ شاعری کا تعلق الفاظ سے ہے۔ یعنی شعر لفظوں کا آرٹ ہے۔ لیکن الفاظ کا ڈھیر نہیں محض الفاظ استعمال کرنے سے اعلیٰ پائے کی شاعری ہاتھ نہیں آتی۔ الفاظ ایک گہرا ایمائی مفہوم رکھتے ہیں اور یہی ایمائی مفہوم آرٹ کی جان ہے۔

غالب کے الفاظ گہری "ایمائیت و رمزیت" کے حامل ہوتے ہیں۔ اسی لئے اُنہوں نے اُن کو "گنجینۂ معنی کا طلسم" کہا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ غالب کا کلام معنی کا ایک بے پایاں سمندر ہے، اُنہی کے الفاظ میں "گنجینۂ معنی کا طلسم" ہے۔ جس قدر اس طلسم کو سمجھا اور کھولا جاتا ہے اُسی قدر نئے نئے معنی و مطالب دریافت ہوتے ہیں۔

اُوپر غالب کی "رمزیت و ایمائیت" کا ذکر آیا تھا۔ غالب نے اس رمزیت و ایمائیت سے بھی بہت کام لیا ہے۔ اردو میں تو استعارہ، کنایہ اشارہ اور رمز و ایما کی اس قدر افراط ہے کہ میں صرف اسی کے باعث ساری اُردو شاعری کو "رومانی شاعری" کہتا ہوں۔ یہاں قفس، آشیاں، صبا، ساحل، صیاد، برق، نشیمن، محفل، میخانہ، شراب، جام و پیمانہ، زنجیر، قاتل، بسمل وغیرہ وغیرہ سے اُن کے لفظی معنی کے علاوہ بھی بہت کچھ مراد ہوتی ہے۔ اُردو میں یہ علامتیں گہری معنویت کی حامل ہیں۔ لیکن یہ بات بہت حد تک صحیح بھی ہے۔ کیونکہ اگر ہر بات صاف صاف انداز میں دو اور دو چار کی طرح کہہ دی جائے تو پھر شاعری و حسن کاری کا سارا مزہ ہی ختم ہو جائے۔ یہ رمزیت و ایمائیت ہی شاعری کو پُرلطف اور بامزہ بناتی ہیں۔ شاعر لفظوں کو علامتوں کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اور بظاہر وہ جتنا کہتا ہے اُس سے کہیں زیادہ حقیقت میں کہہ جاتا ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

خوشتر آں باشد کہ سِرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

غالب نے اپنے کلام میں بہت سی باتیں رمز و کنایہ میں بیان کی ہیں اور بادہ و ساغر کے پردے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو کی ہے۔ اس باب میں اُن کا نظریہ ذیل کے دو شعروں سے آشکارا ہوتا ہے ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو!
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

فارسی میں ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

رمز شناس نہ ہر نکتہ ادائے دارد
محرم آں است کہ رہ جز بہ اشارت نہ رود

غالب کو خود اپنے اس "رمز و ایما" کا احساس تھا کہ اُنہوں نے متنوع موضوعات کو غزل کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ اسی لئے وہ کبھی کبھی اپنے قارئین سے پکار اُٹھتے تھے ؎

نقش کراچی

ادبی ڈائجسٹ

ہر ماہ ،معیاری رسائل افسانوں، غزلوں، نظموں اور مضامین کا انتخاب پیش کرتا ہے

کاشانہ اردو پوسٹ بکس کراچی ۳

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے　　　خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

یا رب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات　　　دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھکو زباں اور

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے　　　مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

فرصت نہ اندک فرد لم تا بہ دلے تو　　　معذوری اگر حرف مرا زود نیابی!

دراں دیار کہ گوہر خریدن آئین نیست　　　دکاں کشودہ ام و قیمت گہر گویم

اُنہیں اسی وجہ سے یہ خیال تھا کہ لوگ اُن کے کلام کو نہیں سمجھ پاتے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ ان باؤن برسوں میں اُس نے کس قدر معنی کے دروازے مجھ پر کھولے ہیں۔ اور میری فکر کو کس قدر بلندی بخشی ہے۔ مگر افسوس کہ لوگوں نے میرے کلام کی خوبی کو نہیں سمجھا۔"

غرض غالبؔ "شاہدِ سخن" کو "رمز و ایما" میں روپوش رکھنا ہی مناسب سمجھتے تھے۔ رمزیت و ایمائیت کے اس نظریہ کو اقبالؔ بھی اس طرح سراہتے ہیں۔

برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائی است　　　حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

غالبؔ معنی آفرینی کے دلدادہ تھے اور قافیہ پیمائی کو شاعری نہیں سمجھتے تھے۔ وہ شعر میں "ورائے شاعری چیزے دگر" کے قائل تھے۔ چنانچہ اپنے خط میں ہر گوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

"لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اُس کے قوافی پیش رکھ لئے ہوں۔ صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا۔ اور اُس زمین میں غزل، قصیدہ لکھنے لگا..... بھائی شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں۔"

مذکورہ بالا اقتباس سے تخلیقِ شعر کے بارے میں غالبؔ کا نقطۂ نظر معلوم ہوتا ہے کہ وہ آورد کے قائل نہ تھے۔ نہ تصنع و تکلف اور لفظی شعبدہ گری کو پسند کرتے تھے۔ لیکن وہ ہیئت کے مرکب نہیں رہ سکتے تھے۔ اور ذوقؔ، ظفرؔ، شاہ نصیر وغیرہ یا دبستانِ لکھنو کے اساتذہ کی اس تلقین سے بہت دور تھے کہ "پہلے قافیے اور ردیف لکھو اور دوسرے مصرعے کہہ لو پھر پہلے مصرعے چسپاں کرتے جاؤ۔" لکھنوی شعرا قافیہ پیمائی سے اپنی غزلوں میں جو وحدت میں کثرت کے تماشے دکھاتے تھے اُس سے غالبؔ کو کوئی سروکار نہ تھا۔ ایک فارسی شعر میں بھی اسی خیال کا اظہار کرتے ہیں ؎

غالبؔ بخود شیوۂ "قافیہ بندی"　　　ظلمی ست کہ بر کلک و ورق می کنم امشب

محاورہ بندی، صنائع کے استعمال اور رعایتِ لفظی جس سے اُس وقت کے مشاعرے گونج رہے تھے اور جو شاہ نصیر اور ذوقؔ کا خاص طرۂ امتیاز تھی غالبؔ کو پسند نہ تھی۔ وہ اُسے سطحی کہنے والوں اور معمولی شاعروں کی چیز سمجھتے تھے اور اپنے کو اس سے بہت بلند خیال کرتے تھے چنانچہ جب کسی نے اسدؔ شاگرد سوداؔ کا غزل کا شعر غالبؔ سے منسوب کر کے اُس کی بہت تعریف کی ؎

اسدؔ اس جفا پر بتوں سے وفا کی　　　مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

تو غالب یہ سنکر برافروختہ ہوئے اور کہنے لگے کہ "استاد و شہریت اور خدا۔ جفا اور وفا میری طرزِ گفتار نہیں ہے"۔

ایک دوسری جگہ انہوں نے شعر و سخن کی جو تعریف کی ہے اُس سے اُن کا مطلب آئینہ ہوجاتا ہے:۔

"سخن ایک معشوقۂ پری پیکر ہے۔ تقطیع شعر اُس کا لباس اور مضامین اُس کا زیور ہے۔ دیدہ وروں نے شاہدِ سخن کو اِس لباس اور اِس زیور میں دلکشِ ماہِ تمام پایا ہے"۔

یہاں غالب نے اپنا نقطۂ نظر بالکل واضح کردیا ہے۔ کہ وہ شعر کی اصل بنیاد تو معنی کو سمجھتے ہیں۔ لیکن اُس کے لباس کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ اُن کا یہ نقطۂ نظر بالکل ابتدا سے نہیں تھا جیسے جیسے اُن کے خیالات میں تغیر اور شاعری میں اُن کا تجربہ وسیع ہوتا گیا۔ ویسے ویسے وہ اُس کے ظاہری محاسن کے بھی قائل ہوتے گئے۔ چنانچہ عبدالغفور نساخ کو ایک خط میں اُن ہی کے کلام کی خوبیوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:۔

"الفاظ متین، معانی بلند، مضامین عمدہ، بندش دل پسند، ہم فقیر لوگ اعلائے کلمۃ الحق میں بے باک و گستاخ ہیں"۔ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"زبان پاکیزہ۔ مضامین اچھوتے، معانی نازک، مطالب کا بیان دل نشین"۔ پھر ایک جگہ رقمطراز ہیں:۔

"ہزار آفریں کیا اچھا قصیدہ ہے، واہ واہ چشم بد دور تسلسل معنی، سلاست الفاظ"۔

نظریے کی اِس تبدیلی سے غالب کے معیارِ شعر میں دونوں پہلوؤں کی اہمیت ہوگئی جہاں وہ معنی پر زور دیتے ہیں۔ وہاں الفاظ کی خوبی کی اہمیت کو بھی فراموش نہیں کرتے۔

مختصر یہ کہ غالب کے نزدیک اچھے اشعار میں لفظاً سلاست و متانتِ الفاظ، پاکیزگی و صفائی، ندرت و دل پسندی بندش اور حُسنِ بیان، اور معناً بلندیٔ خیال، نزاکتِ معنی، عمدگیٔ مضمون، جذبہ و تفکر کا امتزاج، تاثیر، تازگی و ظرفگیٔ فکر اور رمزی و ایمائی کیفیت ہونا چاہئے۔ اسی کا نام "شیوۂ بیانی" ہے۔ اور یہی خصوصیات کلام کا جوہر اور شاعر کی عظمت کی ضامن ہیں۔

———— x ————

ایک نیک دل خونی (بسلسلہ صہ ۲) جنید کے ہاں جا دھمکے۔ حضرت جنید کو پہچانتے نہیں تھے اور نہ اِس سے واقف تھے کہ یہ گھر کس کا ہے۔ جس کمرے میں داخل ہوئے وہاں پشمینے کے کچھ تھان پڑے تھے۔ ابن صباط کا صرف ایک ہاتھ تھا۔ سوچ رہے تھے کہ ایک ہاتھ سے اتنا بوجھ کیسے اٹھاؤں گا، یکایک اندھیرا روشنی سے بدل گیا۔ کوئی صاحب شمع دان لئے سامنے کھڑے تھے، اور کہہ رہے تھے کہ جو کام تمہیں کرنا ہے، اُسے بغیر روشنی کے انجام نہیں دیا جاسکتا۔ روشنی بھی حاضر ہے اور میں بھی مدد کیلئے حاضر ہوں۔ تم تھکے تھکے ہو، آرام سے بیٹھ جاؤ۔ گٹھریاں میں باندھ دوں گا۔ پھر اُن صاحب نے دو گٹھریاں باندھیں، ایک ہلکی، ایک بھاری۔ ہلکی گٹھری ابن صباط کو دی اور بھاری گٹھری خود اٹھائی، اور کہا، چلو، جہاں چلنا ہے، چلتے چلتے اُن صاحب نے اپنی قبا بھی اُتار کر ابن صباط کی گٹھری میں ٹھونس دی، اور اپنی گٹھری پشت پر دھرے ساتھ ہولئے۔ وہ صاحب بہت ضعیف اور نحیف تھے، بوجھ سنبھلنا مشکل تھا۔ مگر ابن صباط کی جھڑکیوں اور گالیوں نے بھی اُن کی پیشانی پر بل نہیں آنے دیا۔ یہاں تک کہ گٹھری جہاں پہنچانی تھی، پہنچادی، اور نہایت نرمی سے کہا، بھائی! میں اسی محلہ میں رہتا ہوں۔ جب جی چاہے، پھر آجانا۔ اس کے بعد مصافحہ کیا، اور روانہ ہوگئے۔ ابن صباط کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ دوسرے دن ابن صباط نے اُن صاحب کے قدموں پر سر رکھدیا۔ وہ صاحب جنید بغدادی تھے۔ حضرت جنید بغدادی کے کریمانہ برتاؤ نے کرامت دکھائی اور چند لمحوں میں وہ راہ طے کرادی جسے دوسرے برسوں میں طے نہیں کرسکتے۔ کاش دلّی کے نیک دل خونی کو بھی کوئی جنید مل جاتا۔ اپنے بعض اعمال کی وجہ سے وہ خونی کی بجائے اہل اللہ کہلانے کے اہل تھے۔

———— x ————

کرشن موہن

تین مختصر نظمیں

زیست ایک بَن، اُداس

رات دن وفورِ یاس۔
زیست ایک بَن اداس۔
درد کے درخت ہیں۔
اور حسرتوں کی گھاس۔
آس کے ہیں پھول بھی کھلے مگر کہیں کہیں۔
آس ہی حیات ہے۔
لیکن آس دائمی نہیں، نہیں۔

سورج، اِک تماشائی

سورج ایک تماشائی ہے یعنی رمتا جوگی ہے۔
اپنے جوگ کی مستی ہی میں دیکھ رہا ہے دھرتی کو۔
دیکھ رہا ہے اپنی دھرتی بھوگی، روگی، سوگی ہے۔
رمتا جوگی۔
دھرتی کا دُکھ درد مٹاتا، اپنا تیج دیئے جاتا ہے۔
اپنا کرم کئے جاتا ہے۔
اِس کے جوگ سے کیا دھرتی کا روگ کٹے گا،
درد بٹے گا؟

کائنات، ایک کھلونا

کائنات ایک کھلونا ہی تو ہے۔
مالک اِس کا ہے وہ ضدّی بچہ۔
جس کو ہم لوگ خدا کہتے ہیں۔

آمنہ ابوالحسن

اندھیرا۔ روشنی اور دل

رات کی تنہائی میں چونک کر رئیسہ جاگ پڑی۔ کسی نے تڑپ کر اپنی باہیں پھیلائیں اور اس سے کہا۔ آؤ۔ آجاؤ . . . .

رئیسہ مقناطیسی اثر سے کھنچتی ہوئی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ چاندنی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور شب کا پچھلا پہر کسی دکھیا کی ماری کی طرح اداس، افسردہ ملول تنہائی کا بوجھ برداشت کر رہا تھا۔ رئیسہ نے ایک گہری سانس بھری اور حیرت سے سامنے والے چار منزلہ مکان کے ایک کمرے میں اتنی رات گئے جاگتی ہوئی روشنی کو دیکھنے لگی۔ نغمہ وہیں سے تڑپ تڑپ کر رئیسہ سے کہہ رہا تھا۔ آؤ۔ آجاؤ . . . .

پھولوں کی طرح مہکتا، اوس کی طرح برستا شہد کی طرح رس گھولتا نغمہ مگر یہ نئی بات، بات کیسی۔ پچھلے چھ سال وہ اس محلے کے اس مکان میں مقیم ہے اور آج تک کسی نے اس سے نہیں کہا آؤ پھر آج یہ نغمہ؟

رئیسہ کے دل میں آئی ننگے پیر بھاگتی ہوئی اُس جاگتی ہوئی روشنی، اُس مچلتی ہوئی پھوار کی زد میں چلی جائے اور کہے۔ مجھے پہچانو۔ گذشتہ چھ سال سے یہاں کسی نے مجھے نہیں پہچانا۔ لیکن وہ ٹھٹکی ٹھٹکی کھڑی رہ گئی۔ رات کے پچھلے پہر گہرے نگل جانے والے سناٹے میں کسی نئی جگہ جا کر ایک نئے اجنبی آدمی سے ملنا رئیسہ کو بڑا عجیب بڑا غیر مناسب معلوم ہوا۔

اگر اس نے نہیں آنے دیا یا دُنیا نے دیکھ لیا تو؟

اس کی چھ برس سے تھمی ہوئی جوانی اور جانے کتنے برسوں کی کمائی ہوئی ماں باپ کی عزت چُپ چپاتے نیلام پر چڑھ جائے گی۔ بولی لگانے والوں کا تو دُنیا میں جواب نہیں۔

رئیسہ کھڑکی سے ہٹ کر تھکی تھکی سی پلنگ پر آبیٹھی۔ ایسا ماحول اس کے لئے بڑا صبر آزما تھا۔

دودھ کی طرح چٹکی ہوئی چاندنی جس میں محبوب کے وصل جیسی خوشگوار تھکن اور آسودگی ہو۔ تڑپتا مہکتا احساس سے باتیں کرتا مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتا ہوا نغمہ اور اس کی چوٹ کہ تڑپنے والا جان بھی نہ سکے اب اسے کیا کرنا چاہئے۔

نیند صبح تک رئیسہ کی آنکھوں سے غائب رہی۔ پھر دیں کی تانیں بھی بالآخر دمکتی ہوئی صبح کی نذر ہو گئیں۔ اور بجانے والا مضمحل لیکن رئیسہ ایک مضبوط مربوط خواہش کے تحت جاگی جاگی چوکنی چوکنی، صبح ہوتے ہی شاگرد پیشہ کی طرف لپکی اور فتّو کو پکار آئی۔

فتّو نے اتنے سویرے رئیسہ کی آواز سنی تو حیران ہو کر سوچنے لگی۔ کہیں اُسے جاگنے میں دیر تو نہیں ہو گئی۔ چائے کا وقت ٹل تو نہیں گیا۔ پھر رئیسہ کی ڈانٹ پھٹکار سننے کے لئے تیار ہو کر وہ جلدی جلدی اس کے کمرے کی طرف ہولی۔

کُتھئی شال اوڑھے رئیسہ کسی دُھلے دھلائے مجسمے کی طرح نکھری ستھری نظر آئی۔ فتّو اسے دیکھ کر ذرا بھی نہ سمجھ سکی۔ وہ پچھلے پہر کی جاگی ہوئی ہے۔ تھکن اور بے خوابی نے رئیسہ کو چھو تک نہ تھا۔ بلکہ اس کی ڈوبی ڈوبی آنکھیں کچھ اور گہری ہو چلی تھیں، جیسے وہ ندیاں جو سمندر سے ملنے کے اشتیاق میں سمندر ہی کا ایک حصہ بن گئی ہوں۔

"چائے ابھی دم ہوئی جاتی ہے بی بی جی..." فتو ہکلائی۔

"بھاگ کے سامنے والے مکان میں تو جا۔" رئیسہ نے عجیب طرح کہا۔

"اور دیکھ آ چوتھی منزل کے سرے والے کمرے میں کوئی نیا کرایہ دار تو نہیں آیا۔ یا پرانے کرایہ دار کا کوئی عزیز رشتہ دار ہی۔"

فتو نے شک بھری نظروں سے رئیسہ کو دیکھا۔ اس عجیب اور یک لخت پیش آنے والی بات کا رشتہ وہ رئیسہ جیسی لڑکی سے ہرگز نہ ملا سکی پھر بھی کچھ کہنے کی بجائے چپ چاپ باہر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ آئی تو آپ ہی آپ مسکرا رہی تھی۔

"ایک آرٹس آیا ہے۔ باجہ بجانے والا۔"

"کون ہے وہ؟"

"یہ تو میں نہیں جانوں بی بی پر نگوڑا والا پنواڑی کہتا ہے۔ کل ہی نیا نیا آیا ہے اور دو مہینے کا پیشگی کرایہ بھی ادا کر چکا ہے۔"

"تو اب وہ مستقل یہیں رہے گا؟"

"دو مہینے تک تو ضرور رہے گا۔ پھر اس کے بعد اللہ کو خبر ہووے۔"

فتو کی یہ بدگمانی رئیسہ کو بُری لگی۔

"آدمی شریف نہیں کیا؟"

"مرد ذات سانپ ہوتا ہے بی بی اس کا اعتبار ہی کیا۔"

"اچھا فتو ایک بات بتا۔ تجھے مردوں پر اعتبار کیوں نہیں۔ تو ان کے متعلق ہمیشہ ایسی ہی باتیں کیوں کرتی ہے۔"

"کاہے نہ کروں بی بی جی۔ بالی عمریا ہی جو مرد ماں باپ کے گھر سے ہاتھ پکڑ لے گیا۔ دو چار سال میں اکیلی نہ چھوڑ، غائب ہو گیا پھر میں نے زندگی گزارنے خود اپنی خوشی سے جو مرد کیا۔ وہ ہر روز کمائی کے لئے مارا پیٹا کرتا۔ جس دن مزدوری نہ ملتی، کھال پھٹ جاتی۔ بدلہ لینے کے لئے۔ جب میں نے مزدوری نہ کرنے کی ضد کر لی تو وہ بھی ایک روز چپ چپاتے مجھے چھوڑ کر کہیں نکل گیا۔" فتو کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گدلی ندی کی طرح کجلا گئیں۔ اور اپنی بڑی بڑی روشن سورج کی طرح سنہری آنکھوں میں فتو کی ممتا کی محسوس کر کے رئیسہ بولی۔ "پھر تو نے تیسرا مرد نہ کیا سچ بول؟"

"خدا کی قسم بی بی جی، مردوں سے نفرت سی ہو گئی پھر ہم نے تمرے ہاں چاکری کر لی۔ اب مزے سے گزرتی ہے۔ تم ہی دیکھو نا۔ دو سال میں پیر کی چھانجنیں بنوائیں گلے کی ہنسلی اور۔"

فتو نے پیر کے انگوٹھے سے پکا فرش کریدنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "انگوٹھے کی پٹیاں بھی کچھ بُری نہیں۔ میری تو چاندی کی ہیں بی بی۔ اللہ چاہے گا تو تمرے لئے سونے کی آئیں گی، دولہا والوں کی جانب سے۔" فتو اپنا ذاتی دکھ بھول کر مسکرا پڑی اور رئیسہ نے اُسی وقت دکھتے ہوئے زخم پر پھایا رکھنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"لے یہ روپیہ اپنے پاس رکھ لے۔ اتی سے نہ کہنا، تو صبح ہی صبح سامنے والے مکان گئی تھی۔"

فتو نے ذرا سی سوچ بچار اور رد و قدح کے بعد روپیہ لے لیا اور اپنی گرہ میں ڈھلتے ہوئے بولی۔ "اللہ پاک تمری مانگ پوری کرے۔" اور تڑکے تڑکے اس بوہنی پر خوش خنداں خنداں شگر دپتے کی طرف جانے کی بجائے باورچی خانے کی طرف لپکی۔ اور پلک جھپکتے چائے بنا بگولے کی طرح پھر رئیسہ کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"ارے" رئیسہ نے حیرت سے کہا۔ "اِتنے جلدی۔"

"اور کیا۔ کبھی کبھی تو اپنے ہاتھ پاؤں میں بجلی بھر جاوے ہے۔ بی بی جی۔ یقین مانو چار بجے تڑکے سے اٹھ کر اُن جنم جلوں کے لئے کھانا بناتی تھی، پھر کہیں مزدوری پر جاتی۔ اللہ پاک انہیں نامرد کیے"....

فتو کی اس بد دعا پر رئیسہ کو ہنسی آجاتی۔ "گالیاں نہ دو فتو۔" "تو پھر کیا پھول ڈالوں اُن بھگوڑوں کے نام پر۔ اگر انسان ہوتے تو آج اپنا بھی ایک چھوٹا سا گھر بار نہ ہوتا۔"

عورت ــ عورت!!

رئیسہ نے یک لخت محسوس کیا۔ گھر کی تمنا ہی عورت کی پوری زندگی ہے۔ خواہ وہ کسی طبقہ، کسی قسم، کسی قماش کی عورت ہو۔ گھر کا سہانا خواب اس کی فطرت میں گندھا ہوا، جہاں وہ ضرورت پر ملکہ، اور وقت پر ماما باندی بھی بن سکتی ہے۔

چائے کے بڑے بڑے گھونٹ اضطراب سے بھر کر رئیسہ نے آہستہ سے کہا۔ "آج میں کالج سے جلد لوٹ آؤں گی۔ سہ پہر میں جب سب سو جائیں تو پھر وہاں جانا اور"....

فتو مسکرائی۔ "آگے نہ کہئے بی بی جی، میں ضرور جاؤں گی اور اللہ پاک چاہے گا تو آپ بھی ایک دن وہاں ضرور جائیں گی۔"

"فتو؟" رئیسہ نے اپنے منہ پر اس طرح ہاتھ رکھ لیا۔ جیسے یہ بات فتو کے ہونٹوں نے نہیں خود اس کے اپنے ہونٹوں نے اگل دی ہو۔ پھر وہ کالج کی تیاری کرنے کے لئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اور چاند نے لگے روز پہلے سے بھی زیادہ شدت اور چاہ سے اپنا نور بکھیرا اور نغمے نے ہرن کی طرح اڑانیں بھریں۔ بے قرار ہو ہو کر رئیسہ نے سوچا کیسے، کس طرح وہ اس سے کہے۔ یہ نغمہ تو برسوں سے خود اس کے اندر سویا پڑا ہے۔ اُسے جگانے کے لئے صرف اُن بے چین انگلیوں کی ضرورت تھی جو درد اور راس کا گداز محسوس کر سکیں اور آج ــ آج....؟ رئیسہ نے بے اختیار ہو کر دوشالہ اوڑھا اور پلنگ کے نیچے سے کھسکا کر پیروں میں جوتیاں اٹکائیں۔ ٹھیک اُسی وقت فتو ایک سائے کی طرح اس کے قریب رینگ گئی۔ "بی بی جی؟" چور کی طرح پشیمان رئیسہ الجھی الجھی فتو کی طرف مڑی۔

"وہ کسی سے بات نہیں کرتا بی بی جی۔ بہت سے لوگ اس کے اطراف جمع رہتے ہیں لیکن"....

"تو نے بات کی؟"

"کیسے کرتی۔ کچھ کہنے سے پہلے ہی لوگوں نے بتا دیا۔ اُسے اپنے باجے سے مطلب ہے اور بس جو سننا چاہے چلا آئے۔"

پھر دوسرے دن فتو ایک اور خبر لائی۔ "نغمے کی بات کیا کرت ہو بی بی جی، وہاں تو ایک سے ایک سہرا پڑا ہے۔ جھک دیکھو تو آنکھیں جھپک جاویں۔ بس اللہ پاک کی مرضی کی دیر ہے۔ لوہے کی کیل کی طرح کھنچے نہ چلے آویں تو فتو نام نہیں۔"

"چپ کر!" رئیسہ نے ڈانٹا۔ "مشورے کی ضرورت نہیں۔ جتنا کہتی ہوں اتنا کر۔"

بھیگی بلی کی طرح فتو نے آنکھیں جھکا لیں اور منت ملتے بولی۔ "اللہ پاک آپ کو نیک ہدایت دے۔"

یوں فتو بیس پچیس سے زیادہ عمر کی نہ تھی۔ لیکن تجربوں کی تلخی نے اُسے اچھا خاصا بزرگ بنا دیا تھا۔ اس لئے خاموشی سے فتو کی یہ دعا جھیل کر رئیسہ دھیرے سے بولی۔ "پچھلے پہر ہم وہاں چلیں گے فتو۔"

فتو نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے پھر بڑی گڑگڑاہٹ سے بولی۔ "میری بات مانت ہو تو کچھ صبر کر لو بی بی جی۔ محلے والوں کو یہ پتہ تو چل جاوے کہ وہ شریف ہے یا آزاد۔ بھگوڑا ہے یا رہنے والا۔"

اور رئیسہ نے محسوس کیا اس بات کی صداقت کے آگے وہ صاف صاف مات کھا گئی۔ ایک بار دل کڑا کر کے رئیسہ نے کہنا چاہا۔

کچھ بھی ہو وہ ایک آرٹسٹ ہے دلوں کو جیت لینے والا۔ لیکن بات رئیسہ کے دل میں ہی رہ گئی اور عقل نے کہا۔ اتنی جلدی ٹھیک نہیں۔

"اچھا۔ اچھا" رئیسہ نے پھر ایک کرارا کبوتر کی طرح پھڑپھڑاتا ہوا نوٹ فتو کی جانب بڑھادیا اور درشتی سے بولی "بہت باتیں کرنے والے بے وقوف اور کم عقل ہوتے ہیں۔ فتو۔ خاموش رہنے کی عادت ڈالو"

نوٹ کا لمس فتو کو ہمیشہ ایک ایسی خوشی، ایسی قوت سے ہمکنار کر دیتا جو زندگی میں اسے کسی فرد نے نہیں دی۔ پیسہ فتو کی ہمیشہ کمزوری رہا۔ اس نے ہمیشہ محنت کی اور اپنی ساری کمائی خاموشی اور ضبط سے خوشی خوشی یا ناخوشی دوسروں کے حوالے کر دی۔ اب جو بغیر محنت کے پیسہ اس کی تھیلی میں چپ چاپ سا جارہا تھا تو اس کی آنکھیں رئیسہ کو صاف کہتی نظر آئیں ـــ اب تو میں بھی سونے کی ٹپیاں پہنوں گی۔ تب یہ کٹے پھٹے میل بھرے انگوٹھے کس طرح مسکرائیں گے بی بی جی؟ پھر ایک خواہش صاف صاف اس کی آنکھوں میں عیاں ہو جاتی۔ لیکن کون مُردا انہیں دیکھے گا ـــ؟

چند روز کی مسلسل خبروں نے رئیسہ کو اتنی معلومات بہم کر دیں کہ آرٹسٹ رات بھر جاگتا دوپہر تک اپنے شائقین کے ہجوم میں رہتا۔ پھر سو جاتا ہے اور پھر رات تک اس کے کمرے میں کوئی نہیں جا سکتا۔ اس وقت وہ کیا کرتا ہے۔ فتو یہ معلوم کرنے میں ناکام رہی۔ تاہم ایک روز رئیسہ کا وہاں جانے کا پروگرام بن ہی گیا اور فتو نے اس دوپہر کو ایک چھوٹی سی چٹھی کسی نہ کسی طرح سب کی نظروں سے بچا کر آرٹسٹ کے ہاتھ میں تھما ہی دی۔ اور رازدارانہ لہجے میں بولی "آج تم سب کو چلتا کر دو جی۔ آج بڑی بی بی یہاں آنے والی ہیں اور دُنیا کتنی بُری ہے، یہ تو تم جانتے ہی ہو"

آرٹسٹ نے اول فول سننے کے انداز میں فتو کی بات سنی اور بولا "وہ یہاں کیوں آنا چاہتی ہیں"

"عجیب مانس ہو" فتو غصے سے بولی "تم سے ملنے اور کیوں۔ ہماری بی بی کچھ ایسی گری پڑی نہیں۔ بس ذرا میوجک (میوزک) کی سوقین (شوقین) ہیں اور بس"

پچھلے پہر جب رئیسہ فتو کے ساتھ کالے برقعے میں ملبوس سامنے والے مکان کی چوتھی منزل کے سرے والے کمرے پر پہونچی تو آرٹسٹ بے انتہا مگن تھا۔ برقعے اس کی محویت میں خلل نہ ڈال سکے۔ پھر وقت گزرتا دیکھکر جب فتو نے ایک ہلکی سی ہنکاری بھری اور رئیسہ نے نقاب اُلٹ دی تو ساز کے تار بھی جیسے ایک بار ہی جھنجھنا کر خاموش ہو گئے۔

حُسن کی زبان ایک ہوتی ہے۔ چاہے وہ الفاظ میں ہو نقش کی صورت یا آواز میں ڈھلا ہو۔ اس کا جلوہ تیری محویت! آرٹسٹ چند لمحے مبہوت رہا۔ پھر اسے محسوس ہوا جیسے اتنی نرمی اتنی گھلاوٹ اتنی نغمگی تو اس کے ساتھ اور راگنیوں کے آہنگ میں بھی نہیں۔ بوکھلا کر وہ اٹھا اور رئیسہ کو تپاک سے اندر لے گیا۔ دیر تک دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے اور خوش ہوتے رہے۔ رئیسہ اس لئے کہ اس کی منزل کا راستہ بغیر کھوجے اچانک اس کی راہ سے آملا۔ اور آرٹسٹ اس لئے کہ پھول، شبنم، چاند، ستاروں، خاموشی اور سکون کے علاوہ ایک انسان بھی اتنا خوبصورت ہو سکتا ہے کہ جسے دیکھکر نغمے آپ ہی آپ اُبل پڑیں۔

مہینے گزر گئے۔ رئیسہ کا سارا جیب خرچ فتو کی تھیلی میں منتقل ہوتا رہا اور فتو کی شدید ایمانداری آرٹسٹ اور رئیسہ کی خوشیوں کو ایک دوسرے سے ہمکنار کر کے اس منزل تک لے جاتی رہی۔ جہاں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب حیا خود سپردگی بن جاتی ہے اور رئیسہ اس لمحے کی انتہا پر پہونچ کر ٹھٹک گئی۔

آرٹسٹ نے اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا۔ وابستگی کا والہانہ پن سے تلاش کا اپنے گہرے گیان سے لیکن جب رئیسہ نے فن اور روح سے جسم کی طرف چھلانگ لگائی تو وہ مجبور سا اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔

"آؤ" رئیسہ نے خود کو بھول کر کہا۔ "ہم باہم ایک ایسا نغمہ بنائیں جو بے مثال ہو جسے دنیا اپنے حافظے میں فنا تک محفوظ رکھے" تو آنسو گم سم خوفزدہ خوفزدہ سا اس کی طرف بڑھا۔ پھر رات کے اندھیرے میں ازل سے ابد تک گونجنے والے نغمے نے یکا یک دم توڑ دیا۔ شہد کے قطروں کی بجائے کسی مہلک زود اثر زہر کی طرح وہ رئیسہ کے ادراک میں سرایت کر گیا۔ اور صبح منہ اندھیرے رئیسہ کو آنسوؤں سے منہ دھوتا دیکھ کر ننتو نے حیرت سے کہا "بی بی جی ؟" تو رئیسہ کسی بھری ہوئی بندوق کی طرح دھماکے سے پھٹ پڑی اور نرم ملائم دبیز تکیوں سے اپنا سر رگڑتی ہوئی بے بسی سے بولی ۔ "نغمہ آج ہمیشہ کے لئے مر گیا۔ ننتو اب یہ کبھی رات کے سناٹوں میں نہ گنگنا سکے گا۔ کیونکہ سہ پہر سے رات تک آرٹسٹ بوتلوں اور ران لڑکوں کے ساتھ اپنا وقت گذارتا ہے۔ جو کم عمر اور خوبصورت ہوں۔ دل کا۔ عورت کا اس کی زندگی میں کوئی مقام نہیں۔ کبھی ۔ کسی وقت ۔ کسی حال "۔

اور ننتو نے کلیجہ تھام کر اپنی سڑی لٹی گندی جوتیاں اٹھا لیں۔

" مُردے کا بھیجا نہ بہادوں تو ننتو نام نہیں ۔ ۔ ۔" پھر وہ اپنی پھولی ہوئی تھیلی کے سکڑ جانے کا غم بھول کر خود بھی رئیسہ کے ساتھ آنسو بہانے لگی۔ اور اُس رات چھ مہینے بعد سامنے والے مکان کی چوتھی منزل کے سرے والے کمرے میں روشنی نہیں جاگی۔ نغمہ نہیں بیدار ہوا۔ وہاں سرا کے لئے اندھیرا چھا گیا۔ گہرا۔ ڈراونا۔ مہیب۔ ٹوٹے ہوئے دل کا گھور اندھیرا ۔ ۔ ۔

اور پچھلا پہر کسی برہا کی ماری کی طرح اکیلا اداس محزون اپنا بوجھ سہتا رہا۔ صبح کی۔ اور رینگتا ہوا۔ لیکن اس کے حصے میں تابندگی نہ آئی۔ دھندلکا اور رہ گیا۔ دھیما دھیما۔ دبا دبا۔ نظر نہ آنے والا ۔ ۔ ۔ ۔ !!!

شاہین غازی پوری

غزل

دل جہاں بھی ڈوبا ہے تیری یاد آئی ہے
ہائے کیا سکوں پرور دردِ آشنائی ہے

تم سراب بن بن کر اپنی چھب دکھاتے ہو
تشنہ لب مسافر کی جان پر بن آئی ہے

یہ کشا کشِ ہستی کتنی دور لے آئی
دن کہاں گذارا ہے شب کہاں گنوائی ہے

کچھ کہا تھا پچھلی شب مدھ بھری ہواؤں نے
چاندنی کے طوفاں میں نیند کس کو آئی ہے

زندگی تری خاطر تیرے دردمندوں نے
اک جہان کی تہمت اپنے سر اٹھائی ہے

خواب ہو چکے شاہین سارے واقعے پھر بھی
شہر شہر میں اب تک داستاں سرائی ہے

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

ہمارے مشاعرے

مشاعرے ہماری ادبی، سماجی اور تہذیبی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے سلیقے اور پاکیزگی پر ہماری تہذیبی زندگی کے اظہار کا انحصار ہے۔ یوں تو جہاں ادب کی سرگرمیاں ہیں وہاں شعر و سخن کے چرچے ناگزیر ہیں۔ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مشاعرہ اپنی ہیئت کذائی کے ساتھ زمانہ قدیم یا زمانہ حال میں ایران یا عرب یا ممالک مغرب میں کہیں نہیں ملتا۔ یہ درحقیقت اس تہذیب کا دین ہے جو مغلوں اور ان کی حکومت کے سہارے مرحوم دہلی اور لکھنؤ میں پروان چڑھی۔ یہی سبب ہے کہ مشاعروں کو ہم نے ہمیشہ ایک عظیم ورثہ سمجھا۔ جب کسی مشاعرے کے بارے میں یہ سنا جاتا ہے کہ وہاں شعرا یا سامعین نے کسی قسم کی لغویت کا اظہار کیا تو بے اختیار ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے اور یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہی ہماری وہ تہذیب کے نمائندے ہیں جن کو قوم نے ادب کی حفاظت کی ذمہ داری سپرد کی ہے اور کیا یہی وہ لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اردو ایک ایسی مشترکہ تہذیب کی علامت ہے جس نے شیخ و برہمن سبحہ و زنار اور دیر و حرم کے تفرقے یک بارختم کر دیئے۔ بلکہ خیال ہوتا ہے کہ مشاعرہ ایک ایسی رزم گاہ ہے جہاں ایک شاعر دوسرے پر فوقیت لے جانے کی تمنا اور اس کو نیچا دکھانے کی غرض سے میدان میں کودتا ہے۔ اور جہاں سامعین کی داد اپنی حدوں سے آگے بڑھ کر بے داد بن جاتی ہے۔ بقول سرور صاحب "ان میں ہنگامہ زیادہ شاعری کم ہوتی ہے"۔ غرض یہی حالات ہیں جن کی بنا پر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ مشاعرے کے آداب کیا ہونے چاہئیں؟

۲۔ شاعر کا اس مشاعرہ میں رول کیا ہو؟

۳۔ سامعین کے فرائض کیا ہیں؟

۴۔ منتظمین مشاعرہ کو کن باتوں کا لحاظ رکھنا چاہئے؟

سب سے پہلے سوال خود مشاعرہ کے آداب کا پیدا ہوتا ہے۔ مشاعرہ کی اہمیت اور افادیت مسلّم۔ اس کی مقبولیت سے انکار ممکن نہیں۔ مگر کیا ضروری ہے کہ اس کو اس قدر طول دیا جائے کہ طبیعت میں تکدر پیدا ہو جائے اور زندگی کے دوسرے ضروری کام اس کی نذر ہو جائیں۔ شب بیداریاں دن کے فرائض کے لئے ایک سنگ گراں بن جائیں۔ مشاعروں کی رونق حقیقتاً راتوں میں ہے مگر اس کا دائرہ محدود کرنا ہوگا تاکہ زندگی کی کشمکش اس قدر شدید اور آویزش اس قدر سخت ہے کہ شب کی بیداری دن کے فرائض کی قیمت پر برداشت نہیں کی جا سکتی۔ وقت کی حدبندی اسی وقت ممکن ہے کہ جب اچھے شعرا اپنا منتخب کلام سنائیں۔ اچھے شعر روح کی تازگی کا سبب ہوتے ہیں۔ سامعین جب مشاعرہ گاہ سے اٹھیں تو محسوس ہو کہ ان کی روح بیدار اور ذوق ادب تازہ ہوا ہے۔ بھدے اشعار کا تکدر لے کر اٹھے تو شعر و ادب سے نفرت کی ذمہ داری شعرا پر ہوگی۔

شاعر کا رول اس مشاعرہ میں کیا ہو یہ دوسرا اہم سوال ہے اور سچ پوچھئے تو اس پر ہی مشاعرہ اور معاشرہ دونوں کی کامیابی

اور ناکامی کا انحصار ہے۔ شاعر کو یہ احساس ضروری ہے کہ وہ محض ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک معلم اخلاق بھی ہے۔ سینکڑوں اور ہزاروں لوگوں کی نگاہیں اس پر لگی ہوئی ہیں اور کان اس کی طرف متوجہ ہیں۔ اس کا ایک ایک شعر زبانوں سے نکل کر دنیا کی لامحدود وسعتوں میں گردش کرے گا۔ اس لئے غزل پڑھنے سے پہلے وہ ایک دفعہ اپنا محاسبہ کرلے کہ شعروں کا انتخاب اس کو رسوا تو نہیں کردیگا۔ محض سامعین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لئے کہیں وہ اپنی سطح سے نیچے تو نہیں آگیا۔ اگر وہ مزاحیہ کلام بھی پڑھ رہا ہے تو اس کے ہاتھ سے وقار اور متانت کا دامن تو نہیں چھوٹ گیا۔ وہ جب ڈائس سے اٹھے تو یہ سمجھ کر اٹھے کہ اس نے شعر نہیں پڑھے بلکہ حسن خیال اور ذوق ادب کے بلند نمونے پیش کئے ہیں۔

مشاعروں کا ایک تاریک پہلو یہ ہے کہ اکثر شعرا مشاعرہ گاہ میں اس طرح پہونچتے ہیں کہ۔

بایدستِ دگرے دست بہ دستِ دگرے

اس سرمستی بلکہ بدمستی میں جو مضحکہ انگیز صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ وہ ہر ادب کے شائق کے لئے تکلیف دہ ہے اور اردو کے لئے انتہائی شرم ناک۔ اگر شاعر کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو کیا ضروری ہے کہ اس کا اشتہار بھی دیا جائے اور اظہار ونمائش اور اصرار علی المعصیت کی مثال پیش کی جائے۔ میں نے خود شعر وادب کی بعض ممتاز شخصیتوں کو دیکھا ہے کہ جب وہ حضرات ڈائس پر آئے تو اپنے ہوش سے بے گانہ تھے۔ لوگ ان سے شعر پڑھنے کی فرمائش کر رہے ہیں اور وہ تمام ڈائس پر نجاست پھیلا رہے ہیں۔ شاعر کو مشاعرہ میں خاص آداب اور رکھ رکھاؤ کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے۔ میں نے جگر مرحوم کو اس زمانے میں بھی مشاعروں میں شرکت کرتے دیکھا جب وہ عالم مستی میں ہوتے۔ مگر یہ سرمستی کبھی بدمستی نہ بننے پائی۔ شاعر کو تلمیذ رحمانی کہا جاتا ہے اور جب تلمیذ رحمانی کا یہ حال ہوگا تو دوسروں پر کیا گزرے گی۔

زیادہ تر مشاعروں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ شاعر ان غزلوں اور نظموں کو مشاعرہ میں پڑھتا ہے جن کو متعدد بار مختلف مشاعروں میں پڑھ چکا ہے "چبائے ہوئے نوالوں کو چبانا خواہ کتنے ہی خوش ذائقہ ہوں کوئی خوش گوار کام نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ شاعر غریب کہہ رہا ہے کہ آپ میرا تازہ کلام سنئے مطلوبہ غزل یا نظم بہت پرانی ہے۔ مگر عوام کی جانب سے اسی کلام کا تقاضا کیا جا رہا ہے۔ یہاں پر شاعر کو جذبات عوام کے احترام کے باوجود یہ کوشش کرنا چاہئے کہ وہ اپنے تازہ کلام سے سامعین کو مستفید ہونے کا موقع دے۔ اسی ذیل میں ایک امر کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ ہر شاعر اپنے مخصوص مذہبی معتقدات اور سیاسی نظریات رکھتا ہے۔ ہم کسی شاعر کو مجبور نہیں کرسکتے کہ وہ اپنے معتقدات سے الگ ہٹ کر سوچے یا فکر سخن کرے۔ مگر اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ وہ اس کے اپنے ذاتی معتقدات ہیں۔ عوام کے سامنے وہ آفاقیت کا علم بردار بن کر آرہا ہے اس لئے ان نظریات کو پیش کرے جو پروپیگنڈہ کی بجائے کچھ اخلاقی اور اجتماعی تصورات سے بھرپور ہوں۔ اسی کے ساتھ دوسروں کے مسلک کا مضحکہ کرنا یا ایسے اشعار سنانا جو شخصیات پر طنز ہوں کسی طرح بھی مستحسن فعل نہیں کہا جاسکتا۔

افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں　　بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغ سحر خیز

مشاعروں میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ شاعر نے اپنا کلام سنایا اور مشاعرہ سے اٹھ گیا۔ اور لطف یہ کہ باقاعدہ مائک پر نشر کر کے اٹھا تاکہ صرف چند لوگ اس سے واقف نہ ہوں بلکہ ہر شخص آگاہ ہو جائے۔ اول تو مشاعرہ کے درمیان سے کسی کا اٹھنا آداب محفل کے خلاف ہے۔ اگر واقعی اس کا اٹھنا ناگزیر ہے تو اس طرح اٹھے کہ منتظم کے علاوہ اس کے جانے کا احساس کسی کو نہ ہو۔ منتظم کو اطلاع بے حد ضروری ہے ۔ (

سب سے آخر میں مگر اہمیت کے اعتبار سے مقدم ایک بات اور ہے، اور وہ یہ کہ میں اکثر سوچتا ہوں کہ آج کا شاعر صرف شاعر ہی نہیں ہے۔ وہ پروفیسر ہے۔ ٹیچر ہے۔ سکریٹری ہے۔ سپرنٹنڈنٹ ہے۔ تاجر ہے۔ غرض اس کا دامن کسی نہ کسی ایسے ادارے سے وابستہ ہے جو اس کی معاش کا کفیل ہے۔ اس کا ضمنی پیشہ مشاعروں کی آمدنی ہے پھر اس کے لئے سودے بازی الحفیظ الاماں۔ گویا شاعری ایک دکان ہے جس پر ہر قسم کا مال فروخت ہوتا ہے۔ ایک شاعر کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے اپنا نرخ لکھ کر کسی جگہ آویزاں کر دیا تھا۔ میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، داغؔ غرض جس کے رنگ میں شعر کہلوانا ہو اس کا نرخ یہ ہے۔ شاعر کا مزاج اور ظرف اس سود زیاں سے بالاتر ہونا چاہئے۔ اس کا صلہ صرف "تحسین سخن فہم" ہونا چاہئے۔ ہاں اس کا ضرور اہتمام ہو کہ شاعر سفر کر کے آیا ہے۔ اس لئے اس کا بار اس کی جیب پر نہ ہو۔ بے چارہ اپنے پاس سے خرچ بھی کرے اور کلام بھی سنائے۔ اس کا سفر خرچ اور قیام طعام بلکہ اگر کسی تاریخی مقام میں مشاعرہ ہے تو اس کی سیر بھی منتظمین مشاعرہ کے ذمے ہونا چاہئے۔ نذرانہ صرف دو حالتوں میں جائز ہے یا تو منتظمین نے مشاعرے پر ٹکٹ لگایا ہے یا شاعر کی مالی حالت اس کی مقتضی ہے۔ اس نذرانہ کے خلاف جو جذبہ پیدا ہوا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ منتظمین نذرانہ دے کر خیال کرتے ہیں کہ وہ ہر فرض سے سبکدوش ہو گئے اور شاعر کا حشر اس ووٹر کا ہوتا ہے جو ووٹ دے کر کیمپ سے باہر نکلا ہے۔ اسی طرح شاعر کو جس وصف پر ناز ہے کہ وہ خودداری اور خود اعتمادی کا حامل ہے، اس کو ٹھیس پہونچتی ہے۔ اگر شاعر کا مطالبہ زیادہ ہے اور اس لئے منتظمین اس کو بلانے سے قاصر ہیں۔ اور سامعین ایک اچھے شاعر کا کلام سننے سے محروم ہوتے ہیں تو میں ایسی صورت میں نہایت ادب سے دریافت کروں گا کہ ادب نوازی، شعر پروری اور خدمت زبان کا دعویٰ کہاں گیا۔ وہ خون جو اردو کے پسینہ پر گرنے کے لئے تیار تھا وہ کہاں گیا۔ اگر آپ یہ ایثار بھی نہیں کر سکتے۔ بعض لوگ دلیل کے طور پر یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ پھر شاعر کو ہر چھوٹے بڑے مشاعرہ میں بلایا جائے گا۔ اس دلیل میں زیادہ وزن نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی مشاعرہ کی دعوت قبول کرنا یا نہ کرنا شاعر کے اختیار میں ہے۔

تیسرے نمبر پر سامعین کے فرائض کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ سامعین میں ہر مزاج اور ہر طبقے کے لوگ ہوتے ہیں۔ مگر ایک قدر غالباً سب میں مشترک ہوتی ہے۔ یعنی ذوق و شوق شعری جو ان کو کشاں کشاں مشاعرہ گاہ میں لایا ہے۔ وہ اگر یہ توقع لے کر آئے ہیں کہ سب شعر اچھے سننے کو ملیں گے، تو یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ اگر ان کا ارادہ یہ ہے کہ وہ صرف اچھے شعر سنیں گے اور ترنم سے سنیں گے اور باقی پر ہوٹنگ مچائیں گے تو یہ ان کی نادانی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ نہ صرف اچھے شعر پر داد دیں بلکہ ناپسندیدہ شعر پر بے داد کا اظہار نہ کریں۔ جمود خواہ زندگی میں ہو یا مشاعروں میں وہ کوئی صحت مند پہلو نہیں ہے۔ مگر جمود کو اس طرح نہ توڑنا چاہئے کہ زلزلہ کی صورت میں نمودار ہو۔ اپنا معیار شعر اس قدر بلند رکھنا چاہئے کہ شاعر کو پست اشعار پڑھنے کی ہمت نہ ہو۔ اچھا ترنم شعر کے حسن کو بڑھا ضرور دیتا ہے۔ مگر شعر کی افادیت اور اہمیت بغیر ترنم کے بھی قائم رہتی ہے۔ سامعین کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس امر کا خاص خیال رکھیں کہ وہ کسی سرود کی محفل میں نہیں مشاعرہ گاہ میں ہیں۔ وہ گانے کی داد دینے نہیں بلکہ شعر کی داد دینے آئے ہیں۔ اگر مشاعرہ میں ہوٹنگ ہوگی تو دوسرے لوگ ہماری تہذیب کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ اور ہمیں اردو کی خدمت کا دعویٰ کہاں تک زیب دے گا۔ اگر یہی صورت حال رہی تو مشاعرے کی رسم ہی کو بند کرنا پڑے گا۔ اگرچہ اس تہذیبی ادارے کا موقوف ہونا ایک افسوسناک امر ہوگا۔

مشاعرے کی صدارت کے سلسلہ میں اس قدر اجازت دیجئے کہ کسی وزیر یا گورنر یا اس قبیل کی شخصیت سے نہ صدارت کرائی جائے۔ اگرچہ یہ بات عجیب سی ہے کہ گویا اس طبقہ کو شعر و سخن سے کوئی واسطہ نہیں ہے؟ ایسا ہرگز نہیں (اگرچہ بیشتر ایسا بھی ہوتا ہے) بلکہ ان کے منصب ملک کی اتنی بڑی ذمہ داریاں ہیں کہ درمیان سے ان کا اٹھنا ناگزیر ہوتا ہے۔ ان کے اٹھتے ہی سامعین کا وہ طبقہ جو صدر صاحب کی خوشنودی کے لئے آیا ہے، اپنے وجود کو غیر ضروری خیال کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محفل میں انتشار اور برہمی پیدا ہو جاتی ہے۔

سامعین کی تعداد کم ہے۔ تو اتنا بُرا اثر نہیں پڑتا جتنا درمیان سے چند اشخاص کے اٹھ جانے سے۔

عموماً یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ شعرا کی برہمی کی وجہ ان کے پڑھنے کی ترتیب ہوتی ہے۔ ہر شاعر کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا نمبر آخر میں آئے۔ تاکہ اس کا شمار اساتذہ میں کیا جا سکے۔ سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ کوئی ترتیب قائم نہ رکھی جائے۔ کسی استاد کو سب سے پہلے پڑھوا دیا جائے تاکہ یہ سوال ہی نہ اٹھے۔ عرصہ ہوا جگر صاحب بمبئی کے کسی مشاعرہ میں شریک تھے اور سب سے پہلے انہوں نے اپنا کلام سنایا۔ اس کے بعد یہ زنجیریں خود بخود ٹوٹ گئیں کہ افضلیت کس کو حاصل ہے۔ دوسری ترتیب یہ بھی ممکن ہے کہ اگر فہرست پہلے سے تیار ہے کہ حروفِ تہجی کی رعایت سے شعرا کو بلایا جائے۔ اچھے متوسط اور معمولی شعرا کی یہ ترتیب مشاعرے کے لطف کو برقرار رکھے گی اور کوئی شاعر احساس برتری یا احساس کمتری کا بھی شکار نہ ہوگا۔ منتظمین کو اس امر کا خیال بھی رکھنا چاہیے کہ شعرا کی تعداد مختصر ہو۔ منتظمین اس امر کا بھی لحاظ رکھیں کہ شعرا اپنے تازہ کلام کے ساتھ مشاعرہ میں شرکت کریں۔ وہاں غیر معروف شعرا کو بھی موقع دیں۔ جن کی صلاحیت اگر منظر عام پر آجائے تو شاید اپنے وقت کے حسرت اور جگر ہوں۔ مشاعروں کا تجربہ یہ ہے کہ وہی ہر سال آنے والے شاعر آتے ہیں۔ اور گزشتہ مشاعروں کی پڑھی ہوئی غزلیں سنا جاتے ہیں۔ اس کو روکنے کی سخت ضرورت ہے۔

چند منتشر خیالات تھے۔ جو جذبات کی رو میں صفحہ قرطاس پر آگئے۔ اگر ہم اپنے مشاعروں کو سلیقہ سے ترتیب دینے میں کامیاب اور اس سلسلہ میں شعرا منتظمین اور سامعین کو جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان سے عہدہ برآ ہو گئے تو یقین جانئے کہ یہ اردو کی وہ خدمت ہوگی جس کا کوئی جواب نہیں۔ یہ ایک ایسا انقلاب ہوگا جس پر آنے والی نسلیں فخر کریں گی۔

رپٹ (بسلسلہ صہ ۴۴) اِدھر رپٹ لکھانے آگیا ہوں۔ قرآن اٹھوا لو میں تو مقتول کو جانتا بھی نہیں۔"

"خوب تو گویا تیرا ماموں بھی اس سازش میں شریک ہے۔ حرامزادے تو اسی کے گھر سے کپڑے بدل کر آیا ہوگا۔ صبح ہی سالے کے گھر کی تلاشی لیکر ثبوت برآمد کرتا ہوں۔ دونوں جاؤ گے پھانسی کے تختے پر۔ خیریت اسی میں ہے کہ سچ سچ بات بتا دو۔" یہ کہتے کہتے حوالدار صاحب جوش میں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

اشرف خاں نے کانپتے ہوئے کہا "حضور میں تو اس آدمی کو زندہ چھوڑ کر آیا تھا۔ گاؤں والوں کے سامنے اس نے ضرور اپنا بیان دیا ہوگا۔ اگر آپ جلدی کریں تو شاید وہ زندہ ہو، خود چل کر اپنے کانوں سے اس کا بیان سن لیں۔"

زناٹے کا ایک تھپڑ اشرف خاں کے گال پر پڑا۔ "سور کے بچے۔ ہم تیرے باپ کے نوکر ہیں کہ رات کے ایک بجے تیرے پیچھے پیچھے اس سردی میں تیری جھوٹی رپورٹوں کی تفتیش کرتے پھریں۔"

عین اسی وقت گشت سے دونوں سپاہی واپس آگئے۔ حوالدار صاحب کو ان کا بے موقع آنا سخت ناگوار گزرا۔ اب مال غنیمت میں ان دونوں کا حصہ لگائے بغیر چارہ نہ ہوگا۔ خلاف امید ایک شکار جال میں پھنسا دیکھ کر سپاہی سردی کو گالیاں دینے کے بجائے حوالدار صاحب کی مدد پر پوری طرح کمربستہ ہو گئے۔

"حوالدار صاحب۔ بابر شاہ داد سے معلوم ہوا کہ قبرستان میں نالے کے پاس کوئی خون ہو گیا ہے۔ وہ علاقہ تو بجلی گھر کے تھانے سے متعلق ہے۔ یہ اُلّو کا پٹھا یہاں کیسے رپٹ لکھانے آگیا۔ اس میں بھی کوئی چال ہے۔"

دوسرے نے کیس کی نوعیت سمجھتے ہوئے کہا "حوالدار صاحب سالے کا لیسنس تو ضبط کرا کے ہی چھوڑوں گا۔" حوالدار صاحب کا ترکش ابھی خالی نہیں ہوا تھا۔ (باقی صہ ۵۸ پر)

جگن ناتھ آزاد

قطعہ

تمہارے ادب کی روایت تو اک حقیقت ہے — تری نظر میں یہ افسانہ ہو تو کیا کہئے
خود اپنے تیرے خزانے میں کچھ کمی تو نہیں — روش تری گدایانہ ہو تو کیا کہئے
ہزار علم کا پروردہ ہو دماغ مگر
مذاقِ شعر سے بیگانہ ہو تو کیا کہئے

رکے ہوئے رستے ہیں دیر اور حرم اس کا — دیوانہ دوراہے پر حیراں ہے کدھر جائے
جانے سے ذرا پہلے اشکوں کو تو رکنے دو — اتنا تو ٹھہر جاؤ طوفاں تو گزر جائے
اے فصلِ بہاراں تو جانا نہ گلستاں سے
جب تک کہ مرا دامن کانٹوں سے نہ بھر جائے

آج ممکن ہو تو پھر دیدۂ نم تازہ کریں — دردِ دل جاگ کہ سوئے ہوئے غم تازہ کریں
عقل کو آج یہ ضد ہے کہ بھلا دیں تجھ کو — دل کو یہ شوق کہ پھر سے ترے غم تازہ کریں
فن کبھی جان سے محبوب تھا اے ہم قلمو!
وہ پرانی روشِ لوح و قلم تازہ کریں!

پروین سرور

فاصلہ

سرجن بننے سے پہلے میری حالت اُس بجھے ہوئے چراغ کی مانند تھی جس میں جلنے چمکنے کی آرزو سے بڑھکر دوسروں کے تاریک راستوں پر اجالا پھیلانے کی حسرت امڈتی رہتی ہے۔ لیکن اتنا اونچا عہدہ سنبھال لینے کے بعد میں اپنی غربت میں الجھی ہوئی زندگی کی ساری کشمکش بھول کر آسمان کی بلندیوں پر چمکنے والا وہ ستارہ بن گیا جو بڑی بے اعتنائی سے چمکتا رہتا ہے۔ اور ضرورت کے وقت بڑی بے اعتنائی سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

اِس اونچائی کے باوجود مجھے بہت سی باتوں کا اعتراف کر لینے میں کوئی تامل نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ۔ میرا باپ گاؤں کا سب سے بڑا زمیندار ہوتے ہوئے بھی اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ فالج زدہ ہو کر چارپائی پر پڑے پڑے مقروض ہو کر مر گیا۔ وہ کبھی میری ایک چھوٹی سی خواہش بھی پوری نہ کر سکا۔ اُس کی تیمارداری کرتے کرتے میری ماں بالکل پتھر ہو چکی تھی۔ اُسے میرے باپ سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔۔۔ شدید نفرت تھی۔

آج اپنے دکھوں سے بے خبر ہو کر میں جس اونچائی پر پہنچا ہوں اُس کی بنیاد چچا کی بے پناہ محبت تھی۔

چچا۔۔۔ جو میرے چچا نہ ہوتے ہوئے بھی عمر بھر اپنے بدن پہ دھجیاں لٹکائے۔ گھسی گھسائی جوتیاں چٹخاتے۔ فاقوں سے نپٹتے میری محرومیوں سے لڑتے اُلجھتے مجھ پر شبنم کی طرح نثار اور کرنوں کی طرح نچھاور ہوتے رہے۔

میں تو یہ بات بھی کبھی چھپا نہیں سکتا کہ اِس بڑھاپے میں اپنے اندر ہی اندر پروان چڑھنے والے اُس بھیانک مرض سے بے پرواہ ہو کر وہ پرائیویٹ کمپنیوں میں کلرکی کرتے رہے۔۔۔ جھک مارتے رہے۔ میری تعلیم کا بار اٹھاتے رہے۔۔۔ قدم قدم پر میرے اِس احساس کو زندہ کرتے رہے کہ میں بڑی دنیا میں بے آسرا نہیں ہوں۔

اِس بلند مقام پر کھڑے ہو کر میں بڑی اچھی طرح نشیب میں جھانک سکتا ہوں۔ اُس راہ کو پرکھ سکتا ہوں جس سے گزر کر میں یہاں تک پہنچا ہوں۔ غربت، محرومیت، افلاس، کشمکش سب میرے لئے بہت پرانی باتیں ہو چکی ہیں۔ اتنی پرانی باتیں سوائے بیتے کا ماضی بے معنی ہونے کے اور ہو بھی کیا سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ اس طرح مجھے بلندیوں سے سروکار ہو گیا کہ اتنے بڑے ہسپتال کا چارج لینے کے بعد میری یادداشت میں صرف اونچے ناموں اور بڑے عہدوں کی ایک طویل فہرست ہی باقی رہ گئی۔

روزانہ صبح اسٹاف نرسوں اور ڈاکٹروں کے ایک منتخب گروہ کے ساتھ ہسپتال کے کمپاؤنڈ اور نیم روشن برآمدوں میں سے گزر کر پرائیویٹ وارڈ کا راؤنڈ لیتے ہوئے انتہائی عجلت اور مصروفیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تیز تیز قدموں سے راستہ طے کر کے جنرل وارڈ کی اُبلتی ہوئی ہنگامہ خیز صورت حال کو دنوں۔۔۔ بلکہ ہفتوں نظر انداز کر دینا میرے معمولات میں شامل ہو گیا۔

پرائیویٹ وارڈ کے ہر مریض پر دس پندرہ منٹ ضائع کرنے کے بعد مجھے میڈیکل کالج کے لیکچر تھیٹر میں جانے کی جلدی ہوتی ہفتے میں چار دن آپریشن کے لئے مقرر ہوتے۔ وہاں سے فارغ ہو کر ایک تھکا ہوا ذہن لئے میں بنگلے پر آ جاتا۔ دوپہر کو ایک آدھ گھنٹہ آرام کرنے کے بعد

دو ایک بڑے مریضوں کو دیکھنے ان کے گھر چلا جاتا۔ شام کو اپنے پرائیویٹ کلینک میں آجاتا۔ جہاں رات گئے تک مریضوں کا تانتا بندھا رہتا۔ بتیس روپے فیس۔ اور پرائیویٹ پریکٹس کی کامیابی نے مجھ سے وہ تمام مسرتیں چھین لیں جو کبھی ایک بجھے ہوئے چراغ میں جھلملاتی رہتی تھیں۔ سسکتے کراہتے مریضوں کے ہجوم نے مجھے بالکل بے حس کردیا۔ ماں بالکل سچی تھی۔ اس نے بھی تو ایک مریض کے ساتھ زندگی بسر کرتے کرتے اپنے آپ کو پتھر بنالیا تھا۔

اسی بے حسی میں مجھے یہ یاد ہی نہ رہا کہ ان دنوں چچا جنرل وارڈ کے ایک گوشے میں اپنا منہ چھپائے انتظار کئے جاتے ہیں۔ میرا اور اپنی موت کا۔ شدید انتظار۔

آج سردی کچھ معمول سے زیادہ ہے۔ اس دھند آلود صبح کو جب میں پرائیویٹ وارڈ کے ایک مریض کو دیکھ کر باہر نکلا تو ڈیوٹی روم کے ہالی وار دروازے میں مجھے میموریل کا سانولا چہرہ ابھرتا نظر آیا۔ کڈنی ٹرے اس کے ہاتھ میں تھی۔ اپنی نیوی بلیو جرسی میں سکڑتی ٹھٹھرتی وہ وارڈ کی طرف جارہی تھی۔ شاید کسی مریض کے انجکشن کا ٹائم تھا۔

میموریل نرسوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔ جنہیں بے ساختگی کے علاوہ کبھی اور کوئی ڈھنگ ہی نہیں آتا۔ اسی بے ساختگی اور بے اختیاری میں اکثر وہ اپنی ڈیوٹی اور ضروری احکامات سے بھی بے خبر ہوجاتی ہے۔ اس لئے میں ہمیشہ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اپنے سر کو اونچا رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

"ڈاکٹر۔" وہ لپک کر میرے قریب آئی۔

اس کی مداخلت انتہائی نامناسب تھی۔ پھر بھی میں رک گیا۔ میرے شانے غیر ارادی طور پر تن گئے۔ اور نظریں افق کے اس دھندلکے کو دیکھنے لگیں۔ جہاں ابھرتے ہوئے سورج کی سنہری نارنجی کرنوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔

برآمدے میں اس وقت کچھ لوگ ایک مریض کو سٹریچر پر ڈال کر آپریشن تھیٹر کی طرف لے جارہے تھے۔ اس کے چہرے کی زردی پر مایوسی کا رنگ غالب تھا۔

میموریل چلتے چلتے رک گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرکے زیر لب کوئی دعا پڑھی۔ اس مریض کی طرف بڑے خلوص سے دیکھ کر مسکرائی۔ پھر اس انداز سے آگے بڑھی جیسے کوئی اہم خبر سنانے کے لئے بیتاب ہو۔

"سر۔ وہ۔ بیڈ نمبر ایک مریض۔"

میرے قدم بندھ کر رہ گئے۔ یقیناً وہ چچا کی بات کررہی تھی۔ میں آٹھ دس دن سے اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے ان کے پاس جا نہ سکا تھا۔ اس کا مجھے خاص خیال بھی نہیں تھا۔ کیونکہ میرے ماتحت کام کرنے والے نوجوان ڈاکٹروں کا عملہ ان لوگوں کی دیکھ بھال کے لئے کافی تھا۔ لیکچر تھیٹر میں پہونچنے کی جلدی اب مجھے میموریل کی بات نہ سننے پر مجبور کررہی تھی۔

میں نے اس کو سرے سے نظر انداز کردیا۔ وہ پہلے تو محجوب سی کھڑی رہی۔ اس کے بعد کسی اندرونی جذبے کی خلش کے سہارے دبے دبے قدم بڑھاتی وہ میرے پیچھے پیچھے بڑھتی چلی آئی۔

اس کی گھیردار سکرٹ دھیرے دھیرے سرسرا رہی تھی۔ اس کے کھردرے اور خشک بال بڑی نفاست سے کلف دار ٹوپی میں بندھے ہوئے تھے۔ میں اس وقت ہسپتال کے اس احاطے میں سے گزر رہا تھا جہاں موت کا سکوت طاری تھا۔ پرائیویٹ وارڈ کی اونچی چھتوں اور منڈیروں پر کفن جیسی سفید دھلی ہوئی چادریں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک طرف برآمدے میں چرمی شکستہ بے چوں اور پالش اتری کرسیوں پر کپڑوں کے تھان پھیلے ہوئے تھے۔ بوڑھا درزی اپنی ناک پر موٹے موٹے شیشوں کی عینک چڑھائے ایک ہی دھن کے دھاری دار کرتے

اور پاجامے تراش رہا تھا۔ اُس کے پاس بیٹھی ہوئی بھدی میٹرن روئی کے بینڈیج اور پٹیاں بنا بنا کر ڈھیر لگا رہی تھی۔

"جب علاج کے لئے لوگوں کے پاس پیسہ نہیں ہوتا تو اتنے بڑے ہسپتال میں آتے ہی کیوں ہیں؟" وہ اپنی باریک آواز میں لہک لہک کر باتیں کر رہی تھی۔

"او میرے بھناں دی ڈاچی بدامی رنگ دی۔"

احاطے میں پھیلے ہوئے پیپل کے نیچے جمعدار زور دیتے بیٹھتے بیٹھتے میٹرن کی آواز پر بڑی ترنگ میں آگیا۔ فینائل اور اسپرٹ آلود فضا میں سانس لیتا ہوا میں درخت کے نیچے رکی ہوئی کار تک جا پہنچا جس کے سامنے ہی سبز رنگ کا پھاٹک تھا اور اُس کے باہر ایک رنگین اور آزاد زندگی کی ریل پیل تھی۔

"سر۔ وہ مریض آپ کو بہت یاد کرتا ہے۔" وہ بڑی رازداری میں میرے قریب جھک آئی۔ اُس کی سانس میں ہلکی سی خوشبو تھی۔ اور آنکھوں میں معصوم سی التجا۔

"مجھے؟" میں نے رُک کر بڑی کرخت نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں۔ وہ نہ دوا پیتا ہے۔ نہ کچھ کھاتا ہے۔"

میں نے ایک اونچے ستارے کی طرح بے اعتنائی سے چمک کر اوجھل ہو جانے کے خیال سے اپنا ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھا۔ "ڈاکٹر اوبل سے کہنا دیکھ لیں۔"

"نہیں ڈاکٹر۔" وہ بچوں کی طرح مچل اٹھی۔

"مرض کی تشخیص ہو گئی۔"

"یس۔ سر۔ کینسر" اُس نے جلدی جلدی اپنا سر ہلایا۔ کار کی کھڑکی میں رُکے ہوئے میرے ہاتھ کو بڑی بے ساختگی سے دبا کر بولی۔۔ بیڈ نمبر ایک۔"

میں اس سے آگے کچھ اور نہ سُن سکا۔ میموریل کا ہاتھ میرے ہاتھ پر تھا۔ مجھے ایک دم سے یوں محسوس ہوا جیسے میں دادو حلوائی کی دکان پر چوری کرتے کرتے ایک بار پھر پکڑا گیا ہوں۔ قلاقند کی مٹھاس میرے حلق میں رُک گئی۔ چچا کے مضبوط ہاتھ کی گرفت میرے ہاتھ پر سخت ہوتی جا رہی ہے۔

"بتا۔ بتا۔ چوری کرے گا؟ پیٹ میں دوزخ بھرے گا؟"

"ہاں کروں گا۔ بھروں گا۔"

"میں تیرا ہاتھ تو نہیں چھوڑوں گا۔"

"چوری میں بڑا مزا ہے چچا۔" میں انہیں گھسیٹتا ہوا بڑے میدان میں پہنچ گیا۔

"اِدھر بیٹھ۔ یہاں۔" وہ زمین پر بیٹھتے بیٹھتے بولے۔ "پہلے قسم کھا کہ تو کبھی چوری نہیں کرے گا۔"

"میں قسم کھاتا ہوں چچا۔ کہ چوری ضرور کروں گا۔"

اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مجھے بڑی ندامت سی ہوئی۔ قلاقند کا تھیلا میرے ہاتھ سے چھوٹ گرا۔

اُنہوں نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ پھر کہنے لگے "جب تک میں زندہ ہوں لالے۔ تجھے کبھی بگڑنے نہیں دوں گا۔ بس میرا ہاتھ پکڑ کر چلا چل۔ پھر دیکھ کیسے سیدھے راستوں سے گزار کر تجھے کہاں لے جاؤں گا۔"

"ڈاکٹر۔" میموریل نے اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے الگ کیا۔ "کبھی شام کے وقت ہی وزیٹنگ ٹائم میں اُس کو آکر دیکھ جانا۔ خوش ہو جائے گا

اُس بے چارے کو تو کوئی دیکھنے ہی نہیں آتا۔"

میو رپل چلی گئی۔ میں اپنی کار کی سیٹ پر سٹیرنگ تھامے بے خبر بیٹھا رہا۔ سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ سوچتا ہی رہا۔

چچا اگر جرمن کی لڑائی میں مر جاتے تو آج لیڈی جنرل وارڈ میں خوشی کے ایک لمحے کے انتظار میں سسکتے نہ رہتے۔

مجھے یاد نہیں کہ کبھی اُن کی زندگی میں بھی خوشی نے بھول کر قدم رکھا تھا ؟ کبھی انہوں نے بھی جوانی کی بہار دیکھی تھی ؟ میں نے تو انہیں سدا بوڑھا ہی دیکھا تھا۔ وہی جھکا جھکا سا شانوں کا خم۔ دھواں لگے بال۔ اُبھری رگوں سے بھری کنپٹیاں ترستی ہوئی بجھی بجھی سی آنکھیں۔ میں ایک دن اپنے گاؤں کے پرائمری اسکول میں پڑھنے جا رہا تھا تو سنا کہ چچا لام پر سے آ گئے۔

وہ کس کے چچا تھے ہم مجھے یہ بھی ٹھیک طرح معلوم نہیں۔ جگت چچا تھے شاید جبھی تو ہر شخص انہیں چچا کہہ کر پکار رہا تھا۔ ادھر اُدھر سے سننے میں آیا تھا کہ میرے والد کے دوست انہیں چھوڑ مرے تھے۔ اور جب سے وہ میرے گھر میں رس بس گئے تھے۔ لوگوں کا ہجوم انہیں گھیرے میں لئے جنگ کی باتیں کرید رہا تھا۔ اور وہ مزے مزے سے سنا رہے تھے۔ نہ جنگ کے گولوں کی وحشت اُن کے چہرے پر تھی۔ نہ قید خانے کی اذیت کے آثار تھے۔ ایک سوگوار سی پھیکی مسکراہٹ اپنے لبوں پر لئے وہ اپنے دو تین برس جنگی قیدی ہونے کے تجربات بتا رہے تھے۔

محلے کے سبھی لوگ سوال کئے جا رہے تھے۔ میں پہلے تو ایک کونے میں کھڑا دیکھتا رہا پھر اسکول چلا گیا۔

واپس آنے کا وقت ہوا تو چچا مجھے اسکول کے دروازے پر ملے۔ میری طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اُن کی نظروں میں ایسی حسرت بھری تھی کہ میں تاب نہ لا سکا۔ منہ پھیر کر۔ نظریں جھکا کر بھاگنے کو ہوا تو انہوں نے لپک کر مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

"تم۔ تم چچا ہو" ؟ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

وہ صرف مسکراتے رہے۔ منہ سے کچھ نہ بولے۔ میں اُن کے بازوؤں کے حلقے سے نکل کر اُن کے کندھوں پر چڑھ بیٹھا۔ اُن کے دو رنگے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ مجھے یونہی اٹھائے اٹھائے ندی نالے پھلانگتے۔ اونچے نیچے راستوں سے گزرتے گھر لے آئے۔ اُن کا سانس پھولا ہوا تھا اور نظروں میں وہی حسرت تھی۔

کندھوں سے اُتر کر میں نے ایک نظر انہیں دیکھا۔ وہ لپک کر مجھے پکڑنے کو ہوئے تو میں بھاگ گیا۔ ماں کے آنچل میں منہ چھپا کر بولا "ماں۔ وہ تمہارے چچا ہیں یا میرے ؟"

ماں بڑی گہری تھی۔ کبھی کوئی اچھی سی بات ڈھنگ سے بتاتی ہی نہ تھی۔ آہستہ سے بولی۔ "مجھے نہیں معلوم"۔

اِس کے بعد چچا گھر کے احاطے میں اصطبل کے ساتھ کی کوٹھڑی میں رہنے لگے۔ میں کبھی کبھی سنسان دوپہروں میں ماں کی آنکھ بچا کر صرف اپنے مطلب کے لئے اُس کوٹھڑی میں چلا جاتا۔ گھنٹوں چچا کے پاس ڈرتا ڈرتا بیٹھا رہتا۔ میں وثوق سے کبھی نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اُن کی ذات سے کبھی کوئی لگاؤ تھا یا نہیں۔ مگر وہ میرا پیچھا کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔

اپنے گاؤں کی گلیوں میں جب کبھی کبھی میں اونچی تانیں اُڑاتا ہوا گیندا کھیلتا تو وہ مجھے جوہڑ کے کنارے ڈھلتے لنگڑاتے نظر آ جاتے۔ شاداب اُڑا اِتراتا تھا۔ انہیں آتے دیکھتا تو جھٹ پٹ چھوٹے بڑے بچوں کی فوج کھلے میدان میں جمع کر کے پریڈ شروع کروا دیتا۔

ایک کمانڈر کی طرح اُس کی آواز اونچی ہوتی۔ "لفٹ۔ ستری۔ کے ہیڈ۔ کل۔ لرک۔ ڈن۔ شن۔"

بچے تن کے کھڑے ہو جاتے۔ چچا لاٹھی کے ٹیکے سے ٹک ٹک کی آواز سن کر بھاگ اٹھتے۔ بچوں کی فوج تتر بتر ہو جاتی۔ سارے میدان میں دھول اڑتی۔ گرد بیٹھ جاتی۔ بچے اونچی آواز میں چیختے، تالیاں بجاتے۔ بڑی بوڑھیاں منہ چھپا چھپا کر ہنستے۔ چچا ایک ایک کے پیچھے لپکتے۔ جان جان کے ڈنڈے سے پھر اس بھاگ دوڑ میں دائو لگا کر مجھے پکڑ لیتے۔ میرا منہ چومتے چومتے بے حال کر دیتے۔ اُن کی ہنسی ٹپک ٹپک کر بچوں میرے

نتھنوں میں گھس جاتیں۔ مارے چھینکوں کے بُرا حال ہو جاتا۔ میں بے بس ہو کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اُن کے منہ پر چپتیں لگاتا۔ مچل مچل کر اُن کی ٹانگوں پر ٹھوکریں اڑاتا۔ وہ ایک نہ سنتے۔ مجھے سینے سے لگا کر اتنا دباتے۔ اتنا بھینچتے۔ کہ میرا دم نکل جاتا۔ میری رگوں میں چلتا ہوا خون رُک جاتا۔ میں رو رو کر اُن پر تھوکتے ہوئے گالیوں پر اُتر آتا۔ میں بھلا محبت کی اتنی شدت کی تاب کیسے لا سکتا تھا۔

وہ گھبرا کر مجھے چھوڑ دیتے۔ باری باری اپنے اردگرد کھڑے ہوئے بچوں کی طرف دیکھ کر دیوانوں کی طرح ہنس دیتے۔

"جرمن کی قید میں اپنا دماغ وہیں چھوڑ آیا ہے چچا" شادا بڑی رازداری میں کہتا۔

"جرمن ہو رہا ہے۔ جرمن" گامی زور سے کہتا۔

"چچا جرمن۔ اوئے۔ چچا جرمن"۔ بچوں میں ایک نئی لہر دوڑ جاتی۔

وہ یہ ساری باتیں سنکر اڑا دیتے۔ جھک کر مجھ سے پوچھتے "سنا بھئی لالے۔ مجھ سے مِل کر خوشی ہوئی ہے یا نہیں"۔

میں اپنے آنسو کرتے کے دامن سے پونچھ کر ناک سُڑسُڑاتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیتا۔

"نہیں ہوئی ہے؟"

"نہیں"۔

وہ جھٹ اپنی جیب ٹٹول کر دو میٹھی گولیاں تھماتے ہوئے خوشامدانہ لہجے میں کہتے "اب تو خوش ہو جا۔ اب ایسا بھی کیا"۔

میں گولیاں کھاتے کھاتے چمک کر کہتا "نہیں ہوئی۔ بالکل نہیں ہوئی۔ خوشی ہوئی ہی نہیں"۔

"کیسے نہیں ہوئی" وہ آنکھیں نکال کر جھوٹ موٹ غراتے۔

میں بھاگ کھڑا ہوتا "نہیں ہوئی۔ نہیں ہوئی۔ بالکل نہیں ہوئی" کا ایک شور مچ جاتا۔

آگے آگے بچوں کی فوج۔ پیچھے پیچھے چچا۔ دوڑ لگتی۔ گلیوں کے چھوٹے چھوٹے کچے مکانوں میں سے سارے بچے ایک ایک کر کے اُبل پڑتے۔ ریلے میں خوشی خوشی ہنسنے لگتے۔ عورتیں حیران ہو کر منڈیروں پر چڑھ چڑھ کر دیکھتیں۔

چچا جان بوجھ کر ٹھوکریں کھاتے۔ گرتے گرتے سنبھلتے۔ بچے تالیاں بجا بجا کر کھل کھلاتے۔ اسی گرنے سنبھلنے میں وہ ایک بار پھر مجھے دبوچ لیتے۔ میں روتا بسورتا۔ جھٹکا کھا کر اتنا دور بھاگتا۔ پھر منہ چڑا کر کہتا۔

"بالکل نہیں ہوئی۔ جا کر لے۔ میرا کیا کرے گا۔ جیج۔ جا"۔

وہ ہنس کر کہتے۔ "خوش ہو جا۔ خدا کے لئے خوش ہو جا۔ میرے بچے"!

اور یہ بات کہتے کہتے اُن کی آنکھوں کی حسرت اور بھی شدید ہو جاتی۔ اتنی مقناطیسی کشش سے میں دور بھاگتا تھا۔ وہ بچوں کے بھرے مجمع میں مجھ پر گہری نظریں جمائے اپنا تھیلا لٹکائے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہتے کچھ سنتے ہوئے چلنے کو ہوتے تو میں موقع پا کر بدتمیزی پر اُتر آتا۔ پیچھے سے انہیں ایسا دھکا دیتا کہ وہ منہ کے بل گرتے گرتے سنبھلتے۔ پھر اسی طرح لپک کر مجھے پکڑ لیتے۔

"اب نہیں چھوڑوں گا۔ کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ مر کے بھی نہیں چھوڑوں گا"!

"ہوئی ہے۔ چچا۔ بہت خوش ہوئی ہے۔ اللہ کی قسم" میں سہم کر گھگھیاتا۔

وہ مجھے ذرا سا ڈھیلا چھوڑ کر کہتے "اچھا۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ میں نے تجھے خوش کیا ہے۔ تو پھر۔ لا میری فیس دے"۔

"میں نہیں دیتا" مارے ڈر کے میرا رنگ نیلا پڑ جاتا۔

"میں چھوڑوں گا تو نہیں"۔

" میں بھاگ جاؤں گا؟"

مگر وہ جرمن کی لڑائی میں کبھی گولیاں تو نہیں کھیل کر آئے تھے۔ زمین پر اپنا تھیلا رکھ کر بے تحاشہ میرا منہ چومنا شروع کر دیتے۔ یہ زبردستی کی فیس میں انہیں سکے ار مار کر دیتا تھا۔ وہ ساون کے بادل کی طرح جھکے آتے ۔۔ میں روتا ہوا ماں کے پاس چلا جاتا۔ چچا مارے ڈر کے کوٹھری میں گھس جاتے۔ اندر سے زنجیر چڑھا لیتے۔

" ماں ۔۔ میں بے اختیار چیختا۔ اپنے چچا کو منع کرلے۔"

ماں سے تو چچا کی جان نکلتی تھی۔ کبھی اس کے سامنے ہونٹ نہ ہلا سکتے تھے۔ بس یونہی مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے رہتے۔ جیسے میرا منہ چوم کر انہوں نے ماں کا نقصان کر دیا ہو۔

مگر ماں کے سامنے تو سب کی جان نکلتی تھی ۔۔ وہ کبھی منہ سے کچھ نہ کہتی۔ بس اپنی نظروں سے تلوار کا کام کئے جاتی تھی۔ میں اس کی آنکھ بچا کر چچا کی کوٹھری میں گھس جاتا۔ وہ اپنی چار پائی پر بے سدھ پڑے ہوتے۔ گو برادر سٹری ہوئی نالیوں کی بو سے سانس لینا دشوار ہوتا۔ مگر چچا کو تو جیسے کسی بات کی بھی پرواہ نہ ہوتی۔ میں ڈرتے ڈرتے ان کے پاس بیٹھ جاتا۔ موقع پاتے ہی زور زور سے کہتا "میں ماں سے کہوں گا۔"

" پھر کیا ہوگا؟" وہ چارپائی پر سے اٹھ بیٹھتے۔

" وہ تمہیں کوٹھری میں سے نکال دے گی۔"

اس جملے میں ایسا جادو ہوتا کہ ۔۔ وہ میرے ہاتھ جوڑتے ۔۔ میری خوشامد کرتے میرے منہ کے بجائے میرے پیروں کو چومتے۔ میں خوشی خوشی سر ہلا ہلا کر مزے سے کہتا۔" میں ضرور کہوں گا۔ ضرور کہوں گا ۔ مانوں گا تو نہیں۔"

" جلیبی کھائے گا؟"

" نہیں۔"

" قلاقند ۔۔؟"

" نہیں۔"

" کچھ بھی نہیں کھائے گا۔" وہ سوچ میں پڑ جاتے۔

" نہیں ۔۔ بس ماں سے کہوں گا۔"

وہ چپ ہو جاتے ۔۔ اپنی ہتھیلیوں کے کٹورے میں میرے منہ کو تھام کر غور سے دیکھتے دیکھتے انہیں ایسی گہری چپ لگ جاتی کہ مجھے لینے کے دینے پڑ جاتے۔ میں انہیں گدگدی کرتا۔ ہنس ہنس کر مناتا ۔۔ وہ گم سم بیٹھے رہتے ۔۔ پھر سوچتے سوچتے ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے۔ میں ان کی ڈاڑھی بھیگتے ہوئے دیکھتا۔ پھر خوفزدہ ہو کر چپکے سے کوٹھری میں سے باہر نکل جاتا۔

اس کے بعد میری ہمت نہ پڑتی کہ ماں سے چچا کے آنسوؤں کی بات کروں ۔۔ وہ تو نظروں ہی نظروں میں مجھے کھا جاتی۔ ایسی بجلی کے کوندے سے زیادہ تیز ۔۔ پانی کے دھارے سے زیادہ کاری نظریں تھیں کہ دل کے آر پار ہو جاتی تھیں۔

مگر یہ باتیں کبھی میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔

دن یونہی گزرتے رہے۔ روپیہ پانی کی طرح بہتا رہا۔ میرے باپ کی حالت بگڑتی رہی۔ چچا کام پر جاتے رہے۔ ماں اپنے ہونٹوں پر مہر لگائے دن بھر چکی کی طرح چلتی رہتی۔ کاموں میں لگی رہتی۔ اس کے چہرے پر کبھی نہ خوشی آئی۔ نہ دکھ کی جھلک دکھائی دی۔ وہ جیسے ہر بات کی عادی ہو چکی تھی۔ اس کی ہر حرکت میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔

جاڑوں کی رُت ختم ہونے پہ آتی۔ ہوا میں نمی رچی ہوتی۔ کھیتوں میں ہریالی چمک اٹھتی تو چچا کام پر سے لوٹ کر ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر پکارتے۔

"لالے ــ لالے بیٹے"۔

میں یہ آواز سنتے ہی جھپاک سے باہر نکل آتا۔ "میرا نام لالہ نہیں ہے"۔

"تو تو میرا لالے کا پھول ہے۔ سُرخ اور تازہ ــ تجھے لالہ کیوں نہ کہوں"۔

"میرا نام"۔

"ہاں ــ کیا ہے"۔

لاٹ صاحب ــ میں اُن کے ہاتھ سے ٹوپی کا کٹورہ چھین لیتا جس میں لال لال بیر بھرے ہوتے ــ کبھی گرما گرم جلیبی ہوتی ــ کبھی تر ترا تا حلوہ ــ میں دہلیز پہ کھڑے کھڑے لمبے لمبے ہاتھ مار کر کھاتا ہوا بڑے چونچلے سے کہتا۔ "چچا ــ کل لڈو لانا ــ اور رقلا قندبھی"۔

وہ دوسرے ہی دن پھر دروازے پہ آن کھڑے ہوتے۔ گاؤں میں مٹھائی کی صرف ایک ہی دادو حلوائی کی دکان تھی۔ وہ بھی اچھی نہیں تھی۔ وہاں ہر وقت مکھیاں اور رنگ دھڑنگ بچے منڈلایا کرتے تھے۔ چچا میل ڈیڑھ میل کا چکر کاٹ کر شہر سے آتے۔ پیر دھول میں اٹے ہوتے۔ مارے تھکان کے پیشانی پر نیلی رگیں تن رہی ہوتیں۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہا ہوتا۔

میں جھپٹ کر اُن کے ہاتھ سے دونا چھین لیتا ــ پھر ذرا سا سانس لے کر وہ جھک کر بڑی رازداری میں کہتے۔ "چل ــ آ ــ اب میری مزدوری دے"۔

وہ ہانپتے ہوئے ڈیوڑھی کی سیڑھی پر بیٹھ جاتے۔ دونوں ہاتھ سے اپنا پسینے سے بھیگا ہوا سر سہلاتے۔ اپنے گریبان کے بٹن کھول کر اپنے دامن سے ہوا دیتے۔ میں اُن کے ساتھ ہی چپک کر بیٹھ جاتا ــ مٹھائی کھاتے کھاتے ذرا سا سرک کر کہتا ــ "کل سے لینا اپنی مزدوری۔ اللہ کی قسم ــ کل"! اور پھر داؤ لگا کر بھاگ جاتا ــ وہ اپنا سر ہی کھجاتے رہ جاتے۔

ایک اکیلا میں ہی کیا بھاگتا تھا ــ اُن سے تو سب بھاگتے تھے۔ اُن کا پیار ہی اتنا خوفناک قسم کا تھا ــ جان لیوا ــ

کئی بار تو ایسا ہوتا، میرا جی بے اختیار گلاب جامن کھانے کو چاہتا۔ میں اپنے مطلب کی خاطر پیشگی مزدوری دینے کو اُن کے گلے میں جھول پڑتا ــ

"بات کیا ہے! آج یہ بے موسم بارش کیوں؟" وہ مجھے اپنے کندھوں سے جھٹک کر الگ کر دیتے۔

"چچا" ــ میں آواز میں خوشامد بھر کے کہتا ــ "کل گلاب جامن لانا"۔

وہ میری طرف گہری نظروں سے دیکھتے ــ پھر سر ہلا دیتے ــ "میں نہیں لاؤں گا"۔

"کیوں چچا" ــ میں ٹھٹھک جاتا۔

"میری اتنے دنوں کی مزدوری تیرے سر ہے"۔

میں جھٹ جواب میں زبردستی اُن کا منہ چومتا ــ وہ گردن جھٹک جھٹک کر اپنے گال بچاتے ــ میں جان جان کر اُن کی لٹکی ہوئی مونچھیں اپنی ناک میں گھسائے جاتا ــ چھینک چھینک کر کہتا ــ "چچا ــ ایمان سے اتنا جی چاہتا ہے گلاب جامن کھانے کو"۔

"مطلبی کہیں کا ــ جا میں نہیں بولتا تجھ سے"۔

میری گلاب جامن کھانے کی آرزو اور بھی شدت پکڑ جاتی۔ میں آزردہ ہو کر کہتا ــ "تو پھر چچا ــ کیا کروں"۔

"کڑوے کا کیا — لے — پھر پیار کر — جلدی سے۔"

میں جھٹ پٹ ان کے بڑھے ہوئے منہ کو اپنے ہاتھوں میں گھسیٹ گھسیٹ کر چومتے ہوئے پوچھتا "ٹھیک ہے؟"

"اوں — ہونہہ" وہ بُرا سا منہ بناتے۔

میں اپنی پوری طاقت سے اپنے ہونٹ ان کے اندر کو دھنسے ہوئے گالوں میں ٹھونس کر چپکا تا۔ میرے تھوک سے ان کا سارا منہ لتھڑ جاتا۔ پھولے پھولے سانس سے اپنے پاسنگے سنبھال کر پوچھتا۔

"اب چچا؟"

"ہوں — اوں — ذرا سا ٹھیک تھا۔"

"صرف ذرا سا؟"

"ہاں۔"

"بہت سا نہیں؟"

"نہیں۔"

"پھر اب تم کرو — کرکے بتاؤ۔"

چچا دھیرے سے میرا گال اپنے دانتوں میں کاٹ لیتے۔ میں بُرا مان جاتا — اپنا منہ پھیر لیتا — تو ہنس کر کہتے "بھئی روٹھنے کی بات نہیں ہے — میری ساری عمر یونہی گزر جائے گی۔ کس کس کو مناتا رہوں۔"

میں حیرانی سے ان کا منہ تکتا "اور کون تم سے روٹھ گیا ہے چچا؟"

وہ جواب ٹال جاتے — جھٹ میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہتے "چل — آ — کشتی جھاڑیں۔" میں مارے خوف کے تھرا جاتا — گلاب جامن کی آسندہ یہ شرط بڑی بھاری بیٹھتی — میں رک رک کر کہتا "میں نہیں بھڑوا تا۔"

"نہ سہی — میں بھی گلاب جامن نہیں لاؤں گا۔"

"اچھا؟ تو — پھر۔" میں سوچ سوچ کر رضامند ہو جاتا "لو — پھر جھاڑ لو۔"

گھنے درخت کی طرح وہ مجھ پر جھک جاتے — بیٹھے بیٹھے اپنے بازوؤں کا سارا بوجھ میرے شانوں پر ڈال کر اس زور سے انگڑائی لیتے کہ میں پچک کر رہ جاتا۔

دن یونہی گزرتے رہے۔ جب میں دسویں جماعت میں پہونچا تو منہ چومنے اور کشتی اتارنے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ مگر ان کے پیار کی شدت وہی رہی۔ میں روز شام کو اپنے گھر کے سامنے کھلے میدان میں کرکٹ کھیلتا۔ زور زور سے ہٹیں لگاتا۔ بھاگ بھاگ کر بولنگ کرتا تو وہ دور کھڑے مجھے داد دیتے رہتے۔ بُرا — بُرا کے نعروں سے میری ہمت بندھاتے رہتے — امتحان نزدیک آئے تو کرکٹ کا الوداعی میچ ہوا۔ اس کے بعد پارٹی کا اہتمام کیا گیا۔ اُسی ریت بھرے میدان میں کرسیاں اور میزیں بچھیں۔ ہار منگوائے گئے۔ چائے آئی۔ مٹھائی منگوائی گئی۔ چچا شہر سے بھاگے بھاگے قلاقند لے کر پہونچے۔

میچ ہوا — سب نے چائے بھی پی — ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر چچا کو بھی بٹھایا۔ باتوں اور کھیل کود میں شام ہوا چلے کے گلے مل کر رخصت ہونے کی ناسلامتی پر اکا دکا آنسو بھی نکل آئے — وہ ہر بچے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکاتے رہے۔ چلنے کا وقت آیا تو شاہد بڑے زوروں میں بول اٹھا۔ "اب ہم جناب چچا صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس تقریب کے اختتام پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔"

چچا جلدی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تالیوں اور سیٹیوں کے شور میں اُن کی پیار بھری آواز دبی ہوتی گئی۔

"مجھے کچھ کہنا نہیں ہے۔ صرف یہی کہنا ہے کہ شام ہو گئی ہے۔ رات سے پہلے پہلے اپنے اپنے گھر جاؤ۔ تمہاری مائیں راہ دیکھ رہی ہونگی ماں کا دل بڑا نازک ہوتا ہے نا۔"

"چچا تو نرا چچا ہی رہا۔" گامی پیچھے سے لے کر چلا آیا۔

"اوئے چچا۔"

"چاچا۔ ہائے چاچا۔"

"مگر چچا۔ ہم کوئی بچے تھوڑا ہی ہیں۔" میں ہنس کر بولا۔ "دیر بھی ہو جائے گی تو کیا ہے۔"

"تم سب بوڑھے ہو جاؤ گے۔ پھر بھی میری نظر میں بچے ہی رہو گے۔" چچا نے میرا ہاتھ گھسیٹا۔ گلیوں میں سے چلتے چلتے مجھے ڈیوڑھی میں دھکیل کر باہر سے زنجیر چڑھا گئے۔ میں چیختا ہی رہا۔ دیوار پھلانگ کر بھاگ جانے کے منصوبے ہی بناتا رہ گیا۔

امتحان سر پر آ گئے تو سخت گرمی شروع ہو چکی تھی۔ دن کو گرمی جان کھاتی تھی۔ اور رات کو مچھر خون چوستے تھے۔ دن بھر کی پڑھائی اور مغز ماری کے بعد یہ حال ہو گیا، میں رات بھر ٹھیک طرح سو نہیں سکتا تھا۔ مجھ پر ایک ہذیانی کیفیت طاری تھی۔ سوتے میں بھی حساب کی مشقیں دہراتا رہتا۔ جیومٹری کی پرابلم درست کرتا رہتا۔ اور تاریخ اور جغرافیہ کے صفحے رٹتا رہتا۔

ماں ایسے دنوں میں مجھے اور گھر بار کو چھوڑ کر چھ سات دن کے لئے باہر چلی گئی۔ رشتہ داروں کے یہاں موت ہو گئی تھی۔ میں چچا کے سپرد تھا وہ سائے کی طرح میرے ساتھ رہتے۔

ایک رات میں اپنے کام سے فارغ ہو کر سونے کے لئے لیٹا تو نیند کوسوں دور تھی۔ مچھر راگ الاپتے ہوئے بار بار کانوں میں گھسے جاتے تھے آنگن میں کھڑا ہوا املی کا پیڑ ایک خوفناک دیو کی طرح پھیلا کھڑا تھا۔ نہ جانے میری آنکھ کب لگ گئی۔ سوتے سوتے میں ایسا محسوس ہوا جیسے ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہے۔ موسم کی تپش تھوڑی دیر کے لئے مدھم پڑ گئی ہے۔

میری آنکھ ایک دم کھل گئی۔ چچا میرے پلنگ کی پٹی سے لگے مجھے پنکھا جھل رہے تھے۔ میں بے تحاشا بڑبڑا۔ "سونے کیوں نہیں دیتے"

"گرمی بہت تھی لالے بیٹے۔"

"گرمی تھی تو ہونے دیتے۔ تمہیں کیا۔ جگا دیا لے کے۔"

وہ میرے قریب ہی لیٹ گئے۔ اپنا نرم نرم ہاتھ میری آنکھوں پر رکھ کر دھیرے دھیرے میری کنپٹیاں تھپکتے رہے۔ "تو۔ تو خفا کیوں ہوتا ہے۔ اتنی جلدی غصّے میں کیوں بھر جاتا ہے۔؟" وہ بڑی عاجزی سے مجھے سمجھاتے رہے۔ "جب تو روٹھ جاتا ہے۔ تو۔ میرا دل ٹوٹ جاتا ہے۔" ان کی بھرّائی ہوئی آواز سے میں اور بھی چڑ گیا۔

"پھر تم مجھے تنگ کیوں کرتے ہو؟"

"تجھے تنگ نہ کروں۔ تو پھر کس کو کروں؟"

"اپنے بچوں کو کرو۔" میں ضد میں آ کر چیخا۔

"میرے بچے؟" وہ یوں تلملائے جیسے تیر اپنے نشانے پر ٹھیک بیٹھا تھا۔ ایک کاری ضرب سے تڑپ کر وہ بڑی غمگین ہنسی ہنس دیئے۔ "میرے بچے؟" وہ بار بار یہ لفظ دہراتے رہے۔ پھر بے چین ہو کر ایک دم اٹھ بیٹھے۔ ایک سرد آہ بھر کر انہوں نے چاندنی کے دودھیا اُجالے میں بے اختیار دونوں ہاتھوں کے کٹورے میں میرے چہرے کو تھام لیا۔ گہری نظر سے دیکھتے ہوئے دبے دبے بولے۔ "اگر میں جنگ پہ نہ جاتا۔ تو۔ آج۔ تنہا

کا بیٹا نہ ہوتا۔ میرے سامنے۔"

"وہ کیسے؟" میں تڑپ اٹھا۔ اُن کے ساتھ چمٹ کر لپٹتے ہوئے بولا "پہیلیوں میں باتیں کیوں کرتے ہو چچا۔ ٹھیک طرح بتاؤ۔ میں تمہارا بیٹا کیسے ہوتا۔ بتاؤ۔ بتاؤ نا۔"

اُنہوں نے گھبرا کر اپنا منہ چھپا لیا۔ ایک گہری خاموشی اُن کے لبوں پر مہر لگا گئی۔ وہ اُسی طرح گھبرائے گھبرائے بیٹھے رہے۔ پھر وحشت زدہ ہو کر اپنے پلنگ پر گر گئے۔ وہ یوں ایک ننھے بچے کی طرح سہم کر سو گئے۔ جس نے کوئی ناجائز بات کہدی ہو۔ میرے جگانے پر بھی وہ نہ جاگے جھنجوڑنے پر بھی سوتے ہی رہے۔ اسی کشمکش میں رات گزر گئی۔

وہ دن میرے لئے بڑی مشکل کے تھے۔ ہفتہ بھر جان عذاب میں رہی۔ گلی میں باہر نکلتا تو چچا سائے کی طرح ساتھ رہتے۔ شام کو میدان میں کرکٹ بھی نہیں کھیلنے دیتے تھے۔ میرے جھگڑنے پر چپکے سے کہتے "گیند لگ جائے گی۔ سائیکل مت چلا، گر پڑے گا۔ سڑک پر مت بھاگ ٹھوکر لگ جائے گی۔" میں تنگ آکر چیخ اٹھتا۔ "چچا۔ ہر وقت ہر بات پر منع کیوں کرتے رہتے ہو؟ کوئی بات بھی ہو!"

وہ اُسی دبے دبے پُراسرار لہجے میں کہتے "تو میرے پاس امانت ہے۔ لاڈلے بیٹے۔"

"کس کی امانت؟"

وہ منہ پھیر لیتے۔ میں اُن کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر اُنہیں جھٹکے دے دے کر پوچھتا "بتاؤ۔ بتاؤ نا۔ کس کی امانت۔"

وہ ہنستے ہنستے آنسوؤں کا سمندر پی جاتے۔

خدا خدا کرکے میری مشکل کے دن ختم ہوئے۔ جس شام میٹرک کا نتیجہ نکلا۔ اور میں امتیازی نمبروں سے پاس ہوا، چچا نے سارے گھر میں چراغاں کیا۔ بھاگ بھاگ کر چھڑکاؤ کیا۔ جھنڈیاں لگائیں۔ اُن کی کوٹھری میں گیندے اور موتیا کے ہاروں کا ڈھیر پڑا تھا۔ جو انہوں نے مارے خوشی کے میرے گلے میں اُلٹ دیا۔ پھر بے اختیار میری پیٹھ ٹھونکتے رہے۔ کرکٹ کے کھلے میدان میں ایک بار پھر سے بہار آئی۔ اُنہوں نے پاس ہونے والے بھی لڑکوں کو چائے پر بُلا رکھا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد شادا اپنے باپ کے ساتھ زمینوں پر ہی لگ گیا۔ گامی شہر میں کسی بزنس مین کے ساتھ کاروبار پر چلا گیا۔ اور لوگ بھی اِدھر اُدھر ہو گئے۔ ہم سب کی راہیں بالکل جدا تھیں۔ منزلیں الگ تھیں۔

میں شہر چلا آیا۔

کالج کی فضا میں خود کو آزاد سمجھتے ہوئے بھی مجھے وہ سکون نہ مل سکا جس کی مجھے خواہش تھی۔ میں جانتا تھا کہ میرے باپ کی چارپائی ہزاروں سیمنٹ جگہ ہے۔ اور نہ معلوم کب تک گھسٹتی جائے گی۔ ماں کا زیور پگھلتا رہا۔ اور میں کالج میں اپنے دن پورے کرتا رہا۔ چچا عید بقرعید میرے ساتھ ہی گزارتے رہے۔

یہ میرا میڈیکل کا پہلا سال تھا جب مجھے باپ کے مرنے کی خبر ملی۔ میں دیوانہ وار گاؤں بھاگا گیا۔ میری ناؤ بیچ منجدھار میں تھپیڑے کھا رہی تھی کنارہ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ دُنیا میری نظروں میں اندھیر ہوئی جا رہی تھی۔ باپ نے کبھی مجھے کچھ نہیں دیا تھا۔ لیکن اتنی بڑی دُنیا میں خود کو بے آسرا اور یتیم سمجھ کر میرا دل ڈوبا جاتا تھا۔

مکان رہن تھا۔ زمینیں بک چکی تھیں۔ ماں کا زیور ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے میری تعلیم کا جاری رہنا ناممکن تھا۔ سوچتا تھا کہ ایک معیاری زندگی بسر کرنے کا خواب تو دھندلا گیا۔ کیوں نہ منہ چھپا کر رات کے اندھیرے میں کہیں دور نکل جاؤں۔ اور پھر واپس نہ آؤں۔

بھیک مانگوں؟ ڈاکہ ڈالوں؟ خودکشی کروں؟ کیا کروں؟

ایک بڑی سی چیز میرے دل کو اندر ہی اندر کھائے جاتی تھی۔ سردیاں اپنے شباب پر تھیں۔ گرد آلود دن ویران نظر آتے تھے۔ اندھیری راتیں سنسان معلوم ہوتی تھیں۔ یہ آدھی رات کا وقت تھا۔ مجھے باوجود کوشش کے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں جاگتا کر دروازہ کھول آہستہ سے باہر نکل آیا۔ ہر طرف دھند تھی۔ چاندنی ایک سوگوار کی طرح بھیگی اور مدھم پڑ رہی تھی۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر سناٹے میں بیٹھ کر میں اپنے گھٹنوں پر سر رکھے روتا رہا۔ سردی اور غم کی شدت سے کانپتا رہا۔

جب ذرا دل ہلکا ہوا اور میں نے رات کی گہرائیوں میں منہ اٹھا کر کسی طرف نکل بھاگنے کا ارادہ کیا تو چچا کا نرم ہاتھ میرے شانے پر تھپکیاں دے رہا تھا۔

وہ کھیس اوڑھے کھڑے تھے۔ مجھے اپنے ساتھ بھینچتا اور سینے سے چمٹاتے ہوئے بولے "ارے۔ بتا۔ تو تو بڑا بے غیرت نکلا۔ اپنے چچا کو چھوڑ کر چلا جاتا۔ تجھے میرا ذرا بھی خیال نہیں ؟ سچ بتا۔ ذرا سا بھی خیال نہیں ہے ؟"

میں اُن کے سینے سے چمٹ کر روتا رہا۔ روتا رہا۔ روتا ہی رہا۔ بے زبانی سے اپنی داستان غم بیان کرتا رہا۔ اور وہ اسی طرح کھڑے کان لگائے میری دھڑکنیں سنتے رہے۔

اس کے بعد میں بڑے سکون سے کالج چلا گیا۔ میڈیکل کے پانچ برس میں نے چچا کی پنشن اور کلرکی کے سائے تلے روپوں کی بارش میں بھیگتے گزارے۔

نت نئے سوٹ۔ ٹائیاں۔ چمکتے ہوئے جوتے۔ مہنگی مہنگی کتابیں۔ سرجری کا سامان۔ کون سی چیز تھی جو میں نے چچا کے کندھوں پر چڑھ کر حاصل نہیں کی تھی۔

وہ خوشی خوشی میرا ساتھ دیتے رہے۔ میری ہر ہر فرمائش پر جھکتے رہے۔ جیسے انہیں کسی بڑے گناہ کا کفارہ ادا کر کے اپنے غم سے نجات مل رہی تھی۔

لیکن شبو۔ بلکہ کالج کا ایک بڑا عجیب ماحول ہوتا ہے۔ وقت آہستہ آہستہ ہم دونوں کے درمیان ریشم کے کیڑے کی طرح ایک مضبوط تار کھینچتا چلا گیا۔ پھر یہ فاصلے کی ایک دیوار بن کر اونچا ہوتا گیا۔ ہوتا گیا۔ ہوتا ہی گیا۔

میرے سبھی دوست بڑے اونچے گھرانوں کے تھے۔ کسی کا باپ بریگیڈیر تھا۔ کوئی کرنل کا بیٹا تھا۔ کسی کا چچا شہر کا نامی بیرسٹر تھا۔ کوئی ایس۔ ای کا لاڈلا جگر تھا۔

مجھے ان سب کی موجودگی میں اپنے گھر۔ اپنے ماحول۔ اپنے ماضی۔ اپنے باپ۔ یہاں تک کہ چچا کے ذکر میں بھی عجیب سی شرم محسوس ہونے لگی۔

وہ جب ہر مہینے میرے کالج کے گیٹ پر میرا انتظار کرتے تو چپراسی مجھے اُن کے نام کی چٹ دیتے ہوئے مسکرا کر کہتا "جناب کا ملازم باہر کھڑا ہے"۔

"مجھے اُس کی مسکراہٹ میں طنز چھپا ہوا نظر آتا۔ مجھے ایک دم یوں لگتا جیسے سب میرا مذاق اڑا رہے ہوں۔ میں گھٹے گھٹے جھینپ میں دھنستا ہوا چٹ پھاڑ دیتا۔ اسی بڑبڑاہٹ میں باہر نکل آتا۔ دل کی گہرائیوں میں سے صرف ایک دعا نکلتی "کاش۔ کوئی انہیں میرا چچا نہ سمجھے"

وہ کالج کے بنچ پر چوکیدار کے ساتھ پاؤں اوپر کر کے بیٹھے ہوتے۔ میل ڈیڑھ میل کی مسافت کی تھکان پسینہ بن کر ان کے ماتھے سے پھوٹ رہی ہوتی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بے اختیار کھڑے ہو جاتے۔ ڈھیلا ڈھالا خاکی کوٹ۔ میلی پگڑی۔ کھدر کا گھسا پٹا پاجامہ۔ اور کھنوس کے چٹکتے ہوئے دیکھ کر مجھے جھجک سی آجاتی۔ کوئی مجھ سے میری زندگی لے لیتا۔ انہیں میرا چچا نہ کہتا۔

اپنے چمکدار سیاہ بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ٹائی کی ناٹ درست کر کے میں ہکلا جاتا۔

وہ لپک کر مجھے گلے سے لگاتے سینے سے بھینچتے۔ اُن کے پسینے کی بو ڈاڑھی کے بالوں کے ساتھ میری ناک میں گھستی جاتی تو مجھے بڑی وحشت ہونے لگتی۔ گھبرا کر الگ ہوتے ہوئے کہتا "چچا۔ تم یہاں کیوں آتے ہو — ؟"

وہ خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتے رہتے۔ سوچ سوچ کر کہتے "میں یہاں کیوں آتا ہوں؟ تجھے پتہ نہیں؟"

میں سٹپٹا کر کہتا:

"میرا مطلب ہے۔ اتنی دور سے پیدل چل کر آتے ہو" میں بات بدل جاتا "یوں ہی تھکتے ہو یہاں آکر۔ منی آرڈر کر دیا کرو"

"تیری چاہت مجھے یہاں گھسیٹ کر لاتی ہے۔ بٹیا۔ تجھے ایک نظر دیکھ کر ٹھنڈ پڑ جاتی ہے" وہ خوشی خوشی سو سو کے نوٹ میرے ہاتھ میں تھما دیتے۔

میں ایک خود غرض بنئے کی طرح ہاتھ پھیلا کر سب کچھ سمیٹ لیتا۔

اِس کے بعد جب وہ تھکے ہارے جواری کی طرح ڈولتے قدموں سے واپس چلے جاتے تو میں ایک اطمینان کا لمبا سانس لیتا۔

ملازمت ملتے ہی میں نے چچا کو یوں چھوڑ دیا جیسے کبھی اُن سے میری جان پہچان ہی نہ تھی۔ سارا سارا دن یاروں دوستوں کے ساتھ کام کرتا۔ دوپہر کو آرام کرتا۔ شام کو کلب چلا جاتا۔ یا پھر سینما کا کوئی پروگرام بن جاتا۔

آزادی اور شہر کی رہائش ہی ایسی ہوتی ہے۔ جہاں بہت سی باتوں کو نظر انداز کر دینا بہت ضروری ہوتا ہے۔ میں گاؤں اور گاؤں والوں کو بالکل بھول گیا۔ کبھی وہاں جاتا ہی نہیں تھا۔

ایک مرتبہ کچھ دوستوں نے گاؤں میں شکار کھیلنے اور بڑی نہر میں نہانے کا پروگرام بنایا تو میں اُن کے ساتھ نہ گیا۔ یہی خیال بار بار آتا رہا کہ وہاں چچا ہوں گے۔ اُن کا دیہاتی پرانا دیوانہ پن ہوگا۔ اُنہیں دیکھ کر مجھے شرم ہی آتی رہے گی۔ وہ کبھی مجھے سڑک پر مل جاتے تو میں کترا کر نکل جاتے۔ کبھی سامنا ہو جاتا تو رسمی طور پر جیسے اپنے مریضوں سے ملتا اُن سے بھی مل لیتا۔

پھر ایک دن دفتر میں جب میں بڑے پھاٹک سے گزر کر اوپر کی منزل میں آیا تو سیڑھی پر چچا بڑی بے چارگی سے بیٹھے تھے۔

اُن کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مجھے خیال بھی نہ آیا کہ وہ بیمار ہوں گے۔ علاج کی غرض سے میرا سہارا ڈھونڈنے کے لئے آئے ہوں گے۔ میں ڈاکٹروں کے بورڈ کے ساتھ ایک ریٹائرڈ سول آفیسر کے پھیپھڑوں کے ورم کی تشخیص میں مشغول تھا۔ بڑی اہم میٹنگ تھی۔

میں نے نظریں چرا لیں۔ اُن سے بات کرنے کا موقع نہیں تھا۔

بھنا کر میں نے چپراسی سے کہا "بڑے میاں سے پوچھ لو۔ کیا کام ہے۔ اور اُن سے کہنا جو کام ہو وہ شام کو آکر بتائیں"

چچا کٹی ہوئی پتنگ کی طرح واپس چلے گئے۔

دو چار دن کے بعد ہی میں ہسپتال میں مجھے شادابل گیا۔ چچا نے میرا آبائی مکان رہن دے کر چھڑوا لیا تھا۔ ایک چھوٹی سی زمین کا ٹکڑا میرے نام منتقل کر کے رجسٹری کرادی تھی — اور وہ خود جنرل وارڈ میں تھے۔

میں نے یہ کاغذات سرسری نظر سے دیکھے۔ پھر اپنا حق سمجھتے ہوئے سنبھال لئے۔ شادے کے ساتھ اپنی مصروفیتوں اور کام کی انتہائی زیادتی کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک اونچے افسر کی طرح میں جنرل وارڈ کی طرف چلا گیا۔

میرا خیال تھا کہ چچا مجھے دیکھتے ہی اُچھل پڑیں گے۔ سینے سے لگا لیں گے۔ اُن کی ڈاڑھی کے بال میرے نتھنوں میں گھس جائیں گے۔ اُن کی محبت کی گرمی آہستہ آہستہ میرے روئیں روئیں میں سما جائے گی — یقیناً مجھے وارڈ کے دوسرے مریضوں کے سامنے خفت کا

سامنا ہوگا۔

کھٹے کی باڑھ سے چل کر گلاب کی چھوٹی چھوٹی کیاریوں سے گزرتا۔ سر جھکائے بہت کچھ سوچتا ہوا جنرل وارڈ کے چبوترے کی تین سیڑھیاں چڑھ کر جب میں اندر پہونچا تو سپرنگ لگا براؤن رنگ کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ اور میرے پیچھے ہی بند ہوگیا۔ آیوڈین اور اسپرٹ کی ہلکی سی بو اڑی وارڈ کے سبھی مریض ایک بڑے ڈاکٹر کی غیر متوقع آمد سے خوش ہوکر بے اختیار اپنے اپنے پلنگ پر سنور سنور کر لیٹنے لگے۔

لوہے کے جالی دار پلنگ پر سرخ کمبل میں لپٹا ہوا مجھے چچا کا ڈھانچہ نظر آیا۔ وہ بالکل ساکت پڑے تھے۔ اُن کی کنول جیسی روشن چمکتی ہوئی آنکھیں چہرے کی سیاہ دلدل میں مدھم تارے کی طرح ماند پڑی تھیں۔ اُن آنکھوں میں اب میرے لئے چاہت کی ایک بھی چنگاری نہ تھی۔ نہ محبت کی رمق باقی تھی۔ صابر اور شاکر ہوکر وہ اپنے حالات سے سمجھوتہ کر چکی تھیں۔

انہوں نے نظریں جھکالیں۔ نظر بھر کر مجھے نہ دیکھا۔ نہ دیوانہ وار سینے سے لگایا۔ نہ شکایت کے دو بول سنانے کے لئے اُن کے لب ہلے۔ صرف آنکھوں کے کناروں پر نمی آگئی۔ اور دو قطرے کنپٹیوں سے بہہ کر تکئے میں جذب ہوگئے۔

وہ شاید فاصلے کی اونچی دیوار دیکھ کر رک گئے تھے۔

میں اُن کے لئے کچھ بھی نہ کرسکا۔ انہیں اپنا چچا ثابت کرکے اُن کے لئے پرائیویٹ وارڈ میں ایک کمرہ بھی نہ لے سکا۔

مجھے بڑی جلدی تھی۔ وقت ہیروں کی طرح انمول تھا۔ وہ وقت جو پرندوں سے زیادہ تیز اُڑتا ہے۔ اور جس کی اُڑان بے آواز ہوتی ہے۔ جو کبھی واپس نہیں آتا۔ اس لئے میں کھڑے کھڑے واپس آگیا۔

میرے پیچھے پیچھے جالی کا دروازہ جس میں سپرنگ لگے تھے، ہلکی سی آہٹ کے ساتھ بند ہوگیا۔ اُس بند دروازے کے اندر آیوڈین اور اسپرٹ کی بو میں چچا کے پسینے کی بو گھلی جارہی تھی۔ اُن کی مرتی ہوئی محبت آخری سانس لے چکی تھی۔

"لوگوں کے پاس علاج کے لئے پیسہ نہیں ہوتا تو اتنے بڑے ہسپتال میں آتے کیوں ہیں؟" بھدی میٹرن نے ایک بار پھر درزی سے اپنی باریک آواز میں کہا۔

"یہ تو اپنے اپنے حالات کی بات ہے۔ تو اس فکر میں کیوں پڑی ہے"۔ درزی نے ایک دھاری دار کپڑا اپنی مشین پر پھیلایا اور جلدی جلدی پیڈل گھمانے لگا۔

او میرے سجناں دی ڈاچی بدامی رنگ دی۔

اوہدی ہنار دلدار جھنگ دی وے۔ میرے سجناں۔ دی۔ ڈاچی۔ احاطے میں پھیلے ہوئے پیپل کے نیچے لیٹے ہوئے جمعدار کی آواز مشین کی کھٹاکھٹ میں ڈوب گئی۔

میرے خیالات کا سلسلہ ایک دم ٹوٹ گیا۔ سوچا کہ کار سے اُتر کر ایک نظر چچا کو دیکھ آؤں۔ مگر کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا تو لیکچر تھیٹر میں پہونچنے کا وقت نکلا جارہا تھا۔ رک جاتا تو ضرور دیر ہو جاتی۔

میں نے گاڑی سٹارٹ کردی۔ اور شہر کی اُس بڑی سڑک پر آگیا۔ جہاں بڑی ہما ہمی تھی۔ ایک رنگین اور آزاد زندگی کی ریل پیل تھی۔

---x---

رفعت سروش

دھندلکے کی زنجیر

میلے کچیلے کپڑے پہنے میلے میلے ہاتھوں سے اپنے سر کو کھجاتا ہوا ایک لڑکا اچانک میرے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں اسے حیرت اور نفرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھتا رہ جاتا ہوں، اس پر نظر کیوں جم کر رہ گئی! سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس میل کچیل کے پس پردہ کوئی صاف شفاف چیز ضرور ہے۔

قہقہے — خوش گپیاں — رنگ رلیاں — زرق برق پوشاکوں کی جھلاجھل — ارے بھئی تم کون ہو؟ قریب آؤ، بولتے کیوں نہیں —؟ کیا اس ہجوم میں تم کسی کو نہیں جانتے — اتنے سارے لوگوں میں سے کسی کو نہیں پہچانتے — تم مجھے گھور کیوں رہے ہو، کیا مجھے پہچانتے ہو!! تمہاری آنکھوں سے تو ایسا ہی لگ رہا ہے — لیکن میں تمہیں بالکل نہیں پہچانتا — خیر — بیٹھ جاؤ — نئی جان پہچان سہی۔ اتنے ڈرے ڈرے سہمے سہمے کیوں ہو۔ خاطر جمع رکھو۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا — تمہیں شاید میرا اعتبار نہیں — خیر —

بڑے چاق چوبند نظر آرہے ہو دوست! تمہاری مسکراہٹ سے طنز کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ مگر مجھے تمہارا یہ انداز پسند ہے۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ میں نے تمہیں نہیں پہچانا۔ لیکن اب میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتا۔ تمام عمر نہیں بھول سکتا۔ قیامت میں بھی تمہیں پہچان لوں گا۔ تم جو کبھی سراسیمہ سراسیمہ نظر آتے تھے۔ آج ہشاش بشاش ہو۔ تم میں یہ چلت پھرت کہاں سے آئی۔ اس تبدیلی میں کس کا ہاتھ ہے۔ روپیہ پیسہ — نہیں نہیں — تمہاری روح کو آسودگی ملی ہے۔ درست! یہ آسودگی مبارک۔ لیکن تمہیں یہ ذہنی آسودگی عطا کرنے کا سہرا کس کے سر ہے! تمہاری مسکراہٹ بڑی معنی خیز ہوتی جا رہی ہے۔ شاید میں نے انجانے میں تمہاری نبض پر انگلی رکھ دی ہے، اب میں کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں تمہاری مسکراہٹ کا مطلب، تمہاری تبدیلی کا راز، مگر یہ راز راز ہی رہے گا۔ لیکن بس اتنا خیال رکھنا کہ تم اس راہ میں نو وارد ہو۔ کہیں ٹھوکر نہ کھا جانا۔

یہ جنگل — دور تک پھیلا ہوا جنگل — درختوں کی شاخیں ایک دوسرے سے الجھتی ہوئی، پگڈنڈیاں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی — اور یہ پیڑ! ان پیڑوں کو نہ خشک کہہ سکتے ہیں نہ سبز۔ یہ سسکتے ہوئے مریض پیڑ عالم جانکنی میں ہیں شاید — کہیں یہ موت کی وادی تو نہیں!! — لیکن نہیں۔ یہ موت سے پہلے کی منزل ہو تو ہو — پھر اس وادی، اس جنگل سے کیا ڈرنا — مگر میں — میں یہاں کیسے آیا۔ کیوں آیا۔ یہاں آیا نہیں لایا گیا ہوں۔ لیکن مجھے یہاں لانے والا کون ہو سکتا ہے — کون ہو سکتا ہے — کچھ یاد نہیں آتا — تھا تو ضرور کوئی میرے ساتھ۔ بہت دور تک میرے ساتھ چلتا رہا، بہت دیر تک میرا ہم سفر رہا — پھر — پھر شاید اس جنگل میں بھٹکنے کے لئے مجھے اکیلا چھوڑ گیا۔ گم ہو گیا۔ کہاں؟؟ — عجیب آدمی ہوں میں۔ یہ سوال کس سے پوچھ رہا ہوں، یہاں میرے سوا اور ہے ہی کون۔ کہیں میں اس منزل پر تو نہیں آ گیا جہاں آدمی خود ہی

اپنے آپ سے سوال کرتا ہے اور خود ہی جواب دیتا ہے ۔ مگر نہیں ان سوالوں کا جواب مجھے نہیں سوجھ رہا ہے اس لئے شاید ابھی وہ منزل دور ہے ۔ اس گھنے جنگل میں میرا وجود ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا ہے ۔ اس شاخ کی طرح جو اپنے تنے سے دور ۔ سرنگوں لٹک رہی ہے۔

تم آدمی ہو یا چھلاوہ ۔ ارے بھئی یہ کیا بد مذاقی ہے ۔ ابھی میرے پاس کھڑے تھے ، ابھی پیڑ پر جا چڑھے ۔ ہیں ! یہ کیا ۔ ! ! تمہارے ہاتھ لمبے ہوتے جا رہے ہیں ۔ لمبے ۔ اور لمبے ۔ کیا تم آسمان کے تارے توڑنے کے انسان کے دیرینہ خواب کو پورا کرنا چاہتے ہو تمہارا خمیر شاید ستاروں کی خاک سے تیار کیا گیا ہے ، یا کچھ ٹوٹے ستارے تمہاری سرشت میں شامل ہیں ۔ اچھا تم کچھ بھی ہو ۔ اس وقت اپنے ہاتھ سکیڑ لو ۔ اس وقت درخت سے نیچے اتر آؤ ۔ میرے پاس بیٹھ جاؤ ۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں ، اور اس وقت بے حد اداس ہوں ، مجھے اس وقت ایک ہمدم کی ضرورت ہے ، ایک دوست کی ضرورت ہے ۔ ایک خالص آدمی کی ضرورت ہے ۔ ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو صرف زمین کا آدمی ہو ، جس کی باتوں میں اس سوندھی سوندھی مٹی کی مہک ہو ۔ جس کی گود میں میرا بچپن مسکرایا ۔ لڑکپن بیتا ۔ جوانی گزری اور زندگی کٹ رہی ہے ، کاش تم خالص آدمی ہوتے ۔ تمہاری نظر آسمان پر نہ ہوتی ۔ تمہارے ہاتھ چاند تاروں کو توڑنے کے غرق میں بدنما اور مضحکہ خیز نہ ہو جاتے ۔ کیا تم اپنے آپ کو بدل سکتے ہو ۔ ؟ کیا تم میرے دوست بن سکتے ہو ؟ کیا تم ۔ تم میرا منہ کیوں چڑا رہے ہو ۔ میں تم سے کوئی بھیک نہیں مانگ رہا ۔ کل تم بھی میری طرح ایک دوست کی ضرورت محسوس کرو گے ، کل تم بھی میری طرح اداس ہو جاؤ گے ۔ یہ چاند تارے تمہیں کچھ نہیں دے سکتے ۔ کچھ نہیں دے سکتے ۔ ان کے پاس ہے ہی کیا سوائے دور کی چمک دمک کے ، سوائے دل کی ویرانی کے۔

دھندلکا ۔ عجیب و غریب دھندلکا ۔ نہ روشنی نہ اجالا ۔ سب گڈمڈ ۔ سب ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے ۔ وہ میلا کچیلا بچہ ۔ وہ ہشاش بشاش لوگوں کا ہجوم ۔ وہ بچھلا نوجوان ۔ سب آپس میں گتھم گتھا ۔ سب دھندلکے کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ۔ واہ ۔ بچہ کا سر نوجوان کی گردن پر لگ گیا ۔ اور نوجوان کے ہاتھ میلے کچیلے ہو گئے ۔ جادو ۔ دھندلکا ۔ دھندلکے نے جنگل کو اپنے گھیرے میں لے لیا ۔ بھٹکتے مسافر کو نگل گیا ۔ چھلاوہ درخت سے غائب ۔ ہیں ۔ ! ہاں یہ شاید میں ہی ہوں ۔ یہ میرا ہی ہاتھ ہے جس میں چاند کا گیند ہے ، مگر یہ چاند ۔ ! کیا یہ چاند ہے ۔ میرے دوسرے ہاتھ میں کیا ہے ۔ ! ایک ننھا کھلونا ۔ یہ ضرور اس بچہ کا کھلونا ہے ، سب گڈمڈ ۔ ہیں یہ ۔ یہ کیا ۔ میں بچہ بن گیا ۔ جادو ۔ میں چھلاوا بن گیا ۔ وہ دھندلکے کی چادر اوڑھے صبح کاذب کی طرح خاموش خاموش کون ہے ! یہ وہی تو نہیں جو نوجوان کو جنگل میں بھٹکتا چھوڑ کر چلی گئی تھی ۔ پھر غائب ۔ دھندلکا اندھیرا بن گیا ۔ یہ سب کیا ہے ، اب تو ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا ۔ مگر کچھ دکھائی دے تو کیسے ۔ آنکھیں تو بند ہیں ۔ یہ سب خواب تو نہیں ۔ دیوانے کا خواب ۔

شیر افضل جعفری

دو غزلیں

غلط، کہ قربتِ سلطاں کا مجھ کو دعوےٰ ہے
مری اٹھان تو رشکِ عروج کا دا ہے

سُلگ اٹھا ہے مری بندگی سے آبِ حیات
مرے سجود کی گھٹی میں سرخ لاوا ہے

ہُوا ہوں مجمرِ دوراں کی آگ میں پختہ
مرے لئے غمِ لیل و نہار آوا ہے

نہ قبرِ گنجِ خطر ہے، نہ عمر دردِ جگر!!
یہ مرگ و زیست تو اک جھرلتا کجاوا ہے

بشر کی اصل ہے چشم و نگاہ سے اوجھل
یہ خدّ و خال کا انسان تو دکھاوا ہے

ازل سے مجھ میں ودیعت ہے ضربِ جذبِ افضلؔ
یہ وہ جنون ہے جو عقل و خرد کا باوا ہے

کھینچ کر دار میں اس کی تصویر
کر دلِ چاک میں یزداں کو اسیر

دار ہے مردِ اناالحق کا وطن!
عرش ہے مردِ خدا کی جاگیر

روک لے ابرِ کرم گستر کو
کھینچ کر برقِ تپاں کی زنجیر

عقل کے پنجۂ بیعت سے نکل
ترا مرشد ترا مولا ہے ضمیر

دل سے طے ہوتی ہے شہ راہِ فلک
دل ہی کرتا ہے خلا کو تسخیر!

اس کا گھر پوچھتی پھرتی ہے رضا
شیر افضلؔ ہے انا مست فقیر

بیگم خورشید مرزا

رپٹ

اشرف خاں نے رات کو گیارہ بجے ٹیکسی اسٹینڈ پر پہلے چھت کی موٹر کھڑی کر کے دروازوں کو تالا لگایا۔ چابی جیب میں ڈالی اور مالک سے دن بھر کا حساب چکانے ٹیکسی دفتر میں داخل ہو گیا۔ آج اشرف خاں بہت خوش تھا۔ شام تک تو آمدنی روز ہی کی طرح معمولی ہوئی تھی۔ لیکن اچانک نو بجے کے قریب اسے ایسے گاہک مل گئے تھے جو لڑکیاں ساتھ لیکر بیس میل دور رات گذارنے کا پروگرام بنا کر نکلے تھے۔ بارہ آنے میل کے حساب سے انہوں نے آنے جانے کا ریٹ تیس روپے اسے دے، بیس روپے انعام کے بھی اُسے تھما دیئے تھے اور ساتھ ہی آنکھ مار کر کہا تھا "استاد بیس روپے کل بھی انعام کے پکے سمجھو۔ صبح چار بجے لینے آجانا۔"

اشرف خاں کے انعام و اکرام سے ٹیکسی کے مالک کو کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کا حساب کتاب تو بس میل کے اوپر تھا۔ اگر دو سو میل ٹیکسی چلی تو دس گیلن پٹرول خرچ ہوا۔ اس کی قیمت نکال کر دو تہائی مالک کا حق تھا۔ اس ایک تہائی میں اشرف خاں کو اتنا بچ جاتا تھا کہ وہ نو انسانوں کا خاندان پال رہا تھا۔ جس دن ٹیکسی کی مانگ زیادہ ہوتی تو مالک اور ڈرائیور دونوں کے وارے نیارے ہو جاتے۔ جس دن گاہک نہ ملتے تو ٹیکسی اسٹینڈ پر کھڑی ڈرائیور کی تقدیر کو روتی رہتی۔ ٹیکسی گویا اس کی تقدیر کی کنجی تھی کہ جس کے اسٹارٹ ہوتے ہی اشرف خاں کی مقدر کی سیاہی چھٹنے لگتی تھی۔ جو ٹھاٹھ سے دن بھر عمدہ سگریٹ پھونکتا۔ شام ہی سے گوشت ترکاری لیکر موٹر کے بوٹ میں رکھ لیتا۔ بچوں کے لئے مٹھائی لے جاتا۔ اور انہیں سوتے سے جگا کر اپنے سامنے کھلاتا۔ لیکن اب کئی مہینے سے کمائی مدھم پڑ گئی تھی۔ یہ کم بخت موٹر رکشائیں کیا چلی تھیں کہ انہوں نے ٹیکسی کا کاروبار ہی چوپٹ کر دیا تھا۔ آج یہ بیس روپے تو گویا چھت پھاڑ کر اس کی جیب میں آ گرے تھے۔ اور پھر کل صبح بھی مزید بیس روپے کے انعام کے تصور نے اس کے اکڑتے ہوئے بدن میں نئی زندگی کی روح پھونک دی۔

اشرف خاں کا دل چاہا کہ وہ اپنے چھوٹے بڑے کے لئے کوئی کھلونا لیتا جائے۔ لیکن بارہ بج رہے تھے۔ اور بازار میں ہُو کا عالم تھا۔ کڑکتی سردی میں مخالف ہوا کے مقابلے پر سائیکل چلانا آسان نہ تھا۔ اس کے ہاتھ ٹھٹھرے جاتے تھے۔ راستہ کم کرنے کی غرض سے اس نے چوڑی روشن سڑک چھوڑ کر قبرستان کے درمیان سے گزرنے والی پگڈنڈی پہ سائیکل موڑ لی۔ اس کی گلی اب مشکل سے دو فرلانگ رہ گئی تھی۔

"بچاؤ۔ بچاؤ۔ آہ" گھٹی ہوئی چیخ کے ساتھ ہی گلے سے عجیب عجیب سی نکلی ہوئی آوازیں آئیں ــــ اشرف خاں کے خوف کے مارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سائیکل سے گرتے گرتے بچا۔ اس کی ماں نے کتنی بار اُسے قبرستان والے راستے سے آنے کو منع کیا تھا۔ ابھی حال میں زبیدہ کو کسی بلا نے ایسا مارا تھا کہ اس کا بدن نیلا ہو گیا تھا۔ چار دستوں اور تین مہینے کے بعد اس کڑیل جوان کا دم

ہو گیا تھا۔ پیڈل پر پیر مارکر اس نے سائیکل کی رفتار تیز ہی کی تھی کہ پھر وہی آواز کانوں میں آئی پہلی بار سے زیادہ کمزور۔ رکتی رکتی سی۔

" آہ ۔۔ کوئی اللہ کا بندہ ۔۔ خدا کے واسطے "۔ آواز بالکل قریب ہی سے آئی تھی۔ اشرف خاں نے آیۃ الکرسی پڑھتے ہوئے سوچا کہ اگر چڑیل کی آواز کا جواب نہ دیا جائے تو پھر وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ لیکن اس کا دل نہ مانا کہ وہ بغیر اس آواز کی تحقیق کئے وہاں سے گزر جائے۔ سائیکل کے دونوں طرف بیر بریک کر اس نے جیب سے ٹارچ نکال کر جلائی تو اس کی روشنی میں اسے نالے کی ڈھلوان پر ایک اتھلے گڑھے ہی سے کسی کا ہاتھ ہلتا نظر آیا۔ اور ساتھ ہی کراہنے کی آواز نے اس کی ہمدرد طبیعت کی غیرت کو للکارا۔

سائیکل سے اتر کر قدم تولتا ہوا مجروح انسانیت کی پکار کی طرف چلا۔ وہ سمجھا تھا، کوئی راہ گیر اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑا ہے۔ اور اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ جبھی تو بیچارہ اٹھ کر چل نہیں سکتا۔ مگر ۔۔ اوہ خدا ۔۔ وہ کیا دیکھ رہا تھا ۔۔ ایک جوان آدمی خون میں لت پت بائیں کروٹ سے پڑا تھا۔ اور اس کے دائیں کان کے نیچے سے گردن تک گہرا زخم تھا۔ بلکہ تقریباً اس کی آدھی گردن تو کٹ ہی چکی تھی ۔۔ جیسے کسی مینڈھے کو پچھاڑ کر قصاب نے ذبح کر دیا ہو۔ اور موت کے سکرات میں اس کا سارا جسم پھڑک رہا ہو۔

" مجھے اسمٰعیل اور اس کے بیٹے نے مارا ہے "۔

بڑی مشکل سے یہ جملہ اشرف خاں کی سمجھ میں آیا۔ مقتول کے کٹے ہوئے گلے سے خون ایسا ابل رہا تھا جیسے کسی سوتے سے پانی پھوٹ رہا ہو۔

اشرف خاں کے منہ سے صرف اتنا نکلا " بھائی میں ابھی مدد لے کر آتا ہوں "۔ اور پھر وہ بجلی کی سی سرعت سے اپنے ماموں کے دروازہ پر پہونچ کر دروازہ پیٹنے لگا۔

اس کے ماموں قیصر خاں میونسپلٹی میں ملازم تھے۔ اور اپنے گاؤں کے معتبر لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ بارہ بجے رات کو اپنے بھانجے کی خوف میں ڈوبی ہوئی پکار پر انہوں نے بستر سے اٹھتے اٹھتے بلّم سنبھال لیا۔ اور دوڑ کر دروازے پر پہونچے۔

" خون ہو گیا ماما ۔۔۔ وہ ۔۔۔ قبرستان کے کنارے "۔

قیصر خاں پوری بات نہ سمجھے۔ لیکن جہاندیدہ آدمی تھے۔ جھٹ سے بھانجے کو گھسیٹ کر دروازہ بند کر لیا۔ سرگوشی میں بولے " سوچ سمجھ کر بات کر، اشرف خاں سے کیا جھگڑا ہو گیا کسی سے ۔ کسی نے دیکھا تو نہیں "۔

اشرف خاں نے جب ہانپتے ہوئے ساری بات سنائی خصوصاً جب یہ معلوم ہوا کہ وہ شخص ابھی زندہ ہے تو پھر انہوں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ باہر نکل کر جلدی جلدی دو چار معتبر لوگوں کو آوازیں دیں۔ دو منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ چار پانچ آدمی لپکتے ہوئے جائے وقوعہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جاتے جاتے وہ اشرف خاں کو ہدایت کر گئے کہ پاس کے تھانے میں وہ خود جا کر جلد از جلد اس واقعہ کی رپورٹ درج کرا کر دیوان جی کو روانہ کرے تاکہ وہ مرتے ہوئے آدمی کے بیانات قلم بند کر لیں۔

زندگی اور موت کے اجالوں اور اندھیروں میں صرف ہجوم اور تنہائی کی تفریق ہے ۔۔ گڑھے میں دم توڑتی تنہائی۔ اشرف خاں کی موت سے ہم کنار سانس رکتی ہوئی تنہائی میں اس نے مقتول کے خون کے فوارے چلتے دیکھے۔ اور پھر وہ زندگی کا احساس جب وہ اپنے گھر سے چلا ۔ قبر کی تنہائی اور پھر حشر کی سختیوں کا تصور بھی تو نفسی نفسی ہی میں پوشیدہ ہے۔ اللہ جل شانہٗ جس کی ذات واحد اور منزّہ ہے اپنی مخلوق کے ساتھ بھی کیا کھیل کھیلتا ہے گلّے میں رہنے کے احساس (HERD. INSTINCT) کے ساتھ اسے بیدار کرتا ہے۔ لیکن موت کے وقت اس کا گلّہ اسے چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے۔ اور وہ دم توڑتے توڑتے بھی اس کا ساتھ

دینے کی جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ اور آخرکار اپنی مجبوری پر آنسو بہاتا ہوا اکیلا ہی رخصت ہو جاتا ہے۔ بیشک یہی اللہ کی شان ہے۔ بھگوان کی لیلا ہے۔ خیر وہ تو ہے ورنہ وہ نہ ہوتا جو ہے۔ لیکن کہے بغیر بھی نہیں رہا جاتا کہ کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری!"

اشرف خاں تھانے پر پہونچا تو پہرے کے سپاہی نے ٹوکا اور بات معلوم ہونے پر کہ رپٹ درج کرانی ہے غصہ سے کہا کہ حوالدار صاحب سو رہے ہیں۔ اور باقی دو سپاہی گشت پر گئے ہیں۔ اس وقت رپورٹ لکھنے والا کوئی نہیں ہے۔ صبح آنا۔

اشرف خاں نے گھبرا کر کہا۔ "جناب یہ تو خون کا معاملہ ہے۔ اس آدمی کے بیان لینے ہیں۔ خدا کے لئے حوالدار صاحب کو جلد جگایئے۔ پہرے کا سپاہی اپنے گشت پر گئے ہوئے ساتھیوں کو مغلظات سے نوازتا ہوا کہ "سالے گشت کے بہانے روز اسی طرح گھنٹوں غائب رہتے ہیں"! اشرف خاں کو دفتر کے گرم کمرے میں لے گیا۔ اور حوالدار صاحب کو آواز دی۔ وہ اوور کوٹ سمیت بنچ پر دراز تھے اور دفتر کی فائلیں تکیہ کا کام دے رہی تھیں۔ نہایت جز بز ہو کر اٹھے۔ کھنکار کر اسٹوو میں تھوکا۔ نسوار کی ڈبیا جیب سے نکال کر چٹکی بھر نسوار منہ میں رکھی اور بغیر کسی سے مخاطب ہوئے گالیاں دیتے باہر پیشاب کرنے چلے گئے۔

پہرے کے سپاہی نے موقعہ غنیمت جان کر رائفل کندھے سے اتار کر کونے میں کھڑی کی اور کرسی گھسیٹ کر سٹوو کے پاس بیٹھ گیا۔

واپس آتے ہی حوالدار صاحب نے پہلے تو پہرے کے سپاہی پر اپنا غصہ اتارا۔ "ابے سالے تو یہاں آگ کے پاس بیٹھا ہے۔ ڈیوٹی پر کیا اپنی اماں کو کھڑا کر آیا ہے"!

رائفل اٹھا کر باہر جاتے جاتے پہرے کے سپاہی نے اپنا بدلہ ان غائب سپاہیوں سے لیا۔ "اپنی اماں کے پاس تو وہ دونوں سالے گئے ہیں۔ دس بجے ڈیوٹی پر آتے ہیں اور گشت کا بہانہ کر کے غائب۔ دیکھ لینا کسی دن چکلے سے بندھے آئیں گے"!

حوالدار صاحب نے نسوار کی پچکاری دیوار کے کونے میں اس بے پروائی سے ماری کہ اس کی چھینٹیں اشرف خاں کی شلوار پر پڑیں۔ ایک ہاتھ مونچھ پر رکھ کر اور ایک طرف کی بھویں اٹھا کر مخصوص انداز میں مخاطب ہوئے۔

"کیوں بے حرامزادے رات کو بارہ بجے کس کا خون کر کے آیا ہے۔ یہ پیش بندی نہیں چلے گی۔ میں تم غنڈوں کے سب کس بل نکال دوں گا، سمجھے۔ فوراً اقبالی بیان لکھاؤ۔ کب سے دشمنی تھی۔ کس بات پر جھگڑا ہوا تھا۔ وہی کسی عورت کا معاملہ ہوگا۔ یا تو تو نے اس کی بیوی سے یارانہ گانٹھا ہے یا وہ تیری جورو کا یار ہوگا۔ جلدی بول۔ ہمارے پاس ساری رات برباد کرنے کے لئے نہیں ہے"۔ اور حوالدار صاحب قلم سنبھال کر اقبالی مجرم کا بیان لکھنے کے لئے تیار ہو گئے۔

اشرف خاں کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ بات کہاں سے کہاں جا پہونچی۔ اگر اس کم بخت نے الٹی سیدھی رپورٹ لکھ دی تو گھر زمین سب بک جائے گی اور عدالتوں کے چکر سے نجات نہ ملے گی۔ چند لمحوں کے لئے اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیسے رپورٹ لکھائے۔ ہکا بکا کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

"بولتا ہے کہ نہیں۔ کہ ۳۰۲ میں چالان کر دوں۔ پھانسی پر چڑھوائے بغیر دم نہیں لونگا۔ بتا جا تو کہاں چھپ کے آیا ہے"!

"حضور میں تو ساڑھے گیارہ بجے ٹیکسی اسٹینڈ سے چلا تھا۔ یہ دیکھئے میرا ڈرائیونگ لائسنس"

"تیرے لیسنس کو کیا شہد لگا کر چاٹیں"! لائسنس لیتے ہوئے حوالدار صاحب گرجے۔

"مگر حوالدار صاحب جب میں قبرستان کی پگڈنڈی پر پہنچا تو بارہ بج رہے تھے۔ میں نے تو چیخوں کی آواز سنکر جیپ تھی جلائی تھی اور وہ غریب گلا کٹا وہاں پڑا تھا۔ اتنا اس نے کہا کہ مجھے اسمٰعیل اور اس کے لڑکے نے مارا ہے۔ یہ سنکر میں مدد لینے بھاگا اور اپنے ماموں کو جگا کر سیدھا

(باقی صـ ۲۰ پر)

ڈاکٹر محمد حسن فاروقی

"کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد"

دَورِ حاضر کے ہر بڑے شاعر کی طرح اقبال نے بھی اپنی اعلیٰ شاعرانہ صلاحیتوں کو اصلاح کے لئے استعمال کیا۔ اوّل اوّل اُنہوں نے "ہمالیہ" اور "جگنو" جیسی نظمیں لکھیں جن سے اُنکی محض رومانی قوتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر کچھ ہی عرصے کے بعد اُنہوں نے شاعر کا یہ تصور پیش کیا۔ ع :- شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم۔

قوم کا لفظ اس وقت انگریزی لفظ نیشن کا ترجمہ تھا اور اُنہوں نے ہندوستانی قومیت کو اپنانا شروع کیا، اس سلسلے کی نظموں میں سب سے مقبول ترانہ ہے ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا　　　ہم بلبلیں ہیں اسکی یہ گلستاں ہمارا

مگر کچھ ہی عرصے کے بعد اُنہیں محسوس ہوا کہ ہندو اور مسلمان ایک ساتھ نہیں رہ سکتے اور اُنہوں نے اس ترانے کو یوں بدل دیا ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا　　　مُسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا
اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھکو　　　اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

اس امر کا احساس شاید ان سے پہلے کسی اور شخص کو نہیں ہوا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور اُنکی دو الگ الگ حکومتیں ہونا چاہیئے۔ ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارتی تقریر میں اُنہوں نے اُن صوبوں کو الگ حکومت میں لانے کا خیال پیش کیا جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ "قوم" اُنکے لئے محض مسلمان قوم ٹھہری اور اُس کی تعمیر اُنکی شاعری کا مقصد ہو گیا۔ اس سلسلے میں "طلوعِ اسلام" بڑی اہم ہے۔ اس نظم میں مسلمان قوم کو وہ اُسکی عظمت کا احساس دلاتے ہیں ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے　　　یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی　　　ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا　　　خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی　　　جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا　　　کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا　　　لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا

اور اُن دائمی اصولوں کو یاد دلاتے ہیں جنکو مسلمانوں کی سیاست کی اساس ہونا چاہیئے ؎

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی　　　اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا　　　نہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی

میاں شاخساراں صحبتِ مرغِ چمن کب تک ترے بازو میں ہے پروازِ شاہینِ قہستانی
گمان آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے وہ کیا تھا زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی
ہوئے احرارِ ملت جادہ پیما کس تجمل سے تماشائی شگافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی
ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی
جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا تو کر لیتا ہے وہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

ایسے اشعار سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک الگ قوم کا وجود اور اس قوم کی ذہنی اور عملی خصوصیات اقبال کی توجہ کا مرکز ہو گئے۔ اُن کو اس کا احساس تھا کہ مسلم قوم جو عرب سے اپنی شان سے نکلی تھی ہندوستان کی عیش پسند آب و ہوا میں آ کر بے بال و پر ہو گئی تھی۔ اس کا علاج اُن کی نظر میں بس یہی تھا کہ اُس کو پھر تعمیری راستے پر لگایا جائے۔ اس سلسلے میں کچھ عملی یعنی سیاسی کچھ فلسفی یعنی فکری اور کچھ شاعرانہ یعنی جذباتی کاموں کی بہت ضرورت تھی۔ اقبال نے تینوں قسم کے کاموں میں کما حقہٗ حصہ لیا۔ پہلے قسم کے کام کو انہوں نے یوں انجام دیا کہ وہ سیاست میں داخل ہوئے۔ سیاسی جماعتوں کی صدارت کی۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شریک ہوئے اور سب سے زیادہ خط و کتابت کے ذریعہ قائد اعظم کو یہ سمجھایا کہ مسلمانانِ ہند کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ ایک الگ حکومت کا مطالبہ کریں اور اُس کو حاصل کریں۔ مسلم لیگ کے مشہور لاہور کے اجلاس سے پیشتر قائد اعظم کا صرف مقصد یہ تھا جو انہوں نے لکھنؤ کے اجلاس میں واضح کیا تھا کہ ہندوؤں کو مسلمانوں پر غالب ہونے سے روکیں۔ مگر اقبال سے خط و کتابت ہونے کے بعد وہ یہ کہنے لگے کہ پاکستان اور پاکستان ہی حاصل کرنا مسلم لیگ کا مقصد ہے۔ حالانکہ اقبال نے پاکستان کے جو حدود مقرر کئے تھے اس کے سلسلے میں قائد اعظم کو ترمیم کرنا پڑی۔ اور آخر میں جتنا حصہ پاکستان میں شامل ہوا اُس سے اقبال کا پورا مقصد نہ حل ہو سکا مگر پاکستان کے حاصل ہو جانے میں ہی چاہے اور کتنے شریک گنائے جائیں سب سے اہم ہاتھ اقبال ہی کا رہتا ہے۔

پھر فلسفی کاموں میں اقبال نے اپنے انگریزی لکچروں کے ذریعہ جو — اسلام میں مذہبی تصور کی تعمیرِ نو — کے نام سے جو شائع ہوئے یہ واضح کیا کہ جدید خیالات کی روشنی میں اسلام کا کیا مقام ٹھہرتا ہے اور مسلمان قوم کو کس طریقے پر سوچنا چاہیئے۔ اُن کے کام کا یہ پہلو زیادہ تر مفکرین کے لئے فائدہ مند ہے۔ مگر جیسا کہ انہوں نے خود کہا ہے ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

اقبال جہانِ تازہ کی نمود یا تازہ بستیوں کی آبادی ہی کو اہم نہیں سمجھتے تھے بلکہ اُن میں اہم فکری زندگی کے وجود کو اُن کی جان اور رُوح مانتے تھے۔ اُن کی شاعری فکر، تخیل اور جذبات کی عظیم روحانی آمیزش ہے اور اس لئے اُن کے تمام کاموں میں مرکزی حیثیت کی حامل ہے۔ یہ اعلیٰ ترین شاعری ہے یعنی یہ نہ صرف عملی زندگی کی طرف اشارے کرتی ہے اور نہ صرف فلسفی خیالات کا اظہار کرتی ہے بلکہ قوم کے جذبات کی تشکیل کر کے اس میں وہ عزم، یقین اور عمل پیدا کرتی ہے جن کے بغیر جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ قالبِ بے رُوح ہوتا ہے۔ ان کی شاعری عالمِ رنگ و بو سے بالاتر جا کر رُوح کو گرماتی ہے اور نظر میں تبدیلی پیدا کرتی ہے اس لئے تازہ بستیاں آباد کرانے میں اس کا ہی حصہ سب سے اہم ہے۔ یہ مسلمانوں کے تمام روایتی خیالات کو جمع کر کے اور قرآن پاک سے منسلک کر کے جدید دور کے تقاضوں سے ملاتی ہے اور روایتی انداز اور

اور زبان کو ایک جدید نوعیت دے کر ایسی روحانی اور معجزنما چیز وجود میں لاتی ہے کہ جس سے مس ہوتے ہی قوم کی روح میں ایک بجلی دوڑ جاتی ہے۔ پاکستان بنا لینا اور مسلم لیگ کے ماتحت تمام مسلمانانِ ہند کو جمع کر لینا بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے قوم میں وہ روحانی اور ذہنی قوت پیدا کرنا تھی جو اُسے ان کاموں میں لگائے اور لگاتے رکھے اور اقبال کی شاعری نے اس کام کو جس خوبی سے پُورا کیا ہے اُس کی مثال دنیائے ادب میں ملنا مشکل ہے گو اُنہوں نے قوم کو بتایا کہ

ع:۔ خودی ہے زندہ تو جوہر ہے بے کرانہ ترا

اور اس خودی ہی کو ہر معاملے میں رہبر بنایا ؎

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر
گُہر ہیں اُنکی گرہ میں تمام یک دانہ

ضمیرِ بندۂ خاکی سے ہے نمود اُن کی
بلند تر ہے ستاروں سے اُن کا کاشانہ

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

اور اسی جوہر کو ہر تخلیق اور عمل کا راز بتایا ؎

خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے
اِس آبجو سے کئے بحرِ بیکراں پیدا

تمام عظیم شاعروں کی طرح اقبال کی شاعری دُنیا کی خرابیوں پر نظر کرتی ہے مگر اُن سے اُمید کا پہلو نکال ہی لیتی ہے اس لئے قوم کو خودی سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اُمید سے بھی معمور کرتی ہے جیسے اس غزل میں ؎

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
دل ہر ذرہ میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خونریز ہے ساقی

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اسکا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

نہیں ہے نااُمید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اور اسی طرح اُمید کو جگاتے ہوئے وہ اس جوش کے عالم میں لے آتے ہیں جو ہر کامیاب عمل کے لئے ضروری ہے ؎

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مُرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پُرفشاں ہو جا

خودی میں ڈوب جا غافل یہ رازِ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

اس طرح اقبال کا کام ایک نئے قومی کردار کی تعمیر ہے جس سے تازہ بستیاں آباد ہونگی ورنہ یہ بستیاں ویرانوں سے بدتر ہونگی۔

پاکستان محض ایک سیاسی کشمکش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ایک مخصوص سیاسی نظریہ کی پیداوار ہے اور اس نظریہ کی تعمیر میں جتنا حصہ

اقبال کا ہے اتنا کسی کا نہیں۔ پاکستان ہی دنیا کا ایک ملک ہے جس کی بنیاد دین پر ہے اور جس کا مقصد دنیا کی لادینی سیاست کے مقابلے میں دینی سیاست کو کامیاب دکھانا ہے۔ یورپ نے نشاۃ الثانیہ سے دین اور سیاست کو الگ کر دیا تھا مگر اقبال اپنی شاعری میں یہ واضح کرتے ہیں کہ اسلام میں سیاست دین کے ماتحت ہے اور اس کو اس دور میں کیسے عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ یورپ کی تمام لادینی سیاست پر سخت تبصرہ کرتے ہیں مثلاً ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق — طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں — یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری

جمہوریت کے خلاف اشتراکیت کے وجود میں آنے پر انہیں زیادہ اعتراض نہیں ہے اس لئے انکو اکثر لوگ اشتراکیت کے ہمدردوں میں گنتے ہیں مگر وہ اشتراکیت سے بالاتر جا کر اسلامیت کو رائج کرنا چاہتے ہیں ؎

قوموں کی روش پر مجھے ہوتا ہے یہ معلوم — بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ رفتار پہ مجبور — فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر — کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں — اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار
جو حرفِ قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک — اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

اقبال کا یہ سیاسی نظریہ "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں بڑی خوبی سے ادا ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اشتراکیت کے زور نے ابلیسیوں میں ہیجان برپا کر دیا ہے اور ابلیسی نظام کے الٹ جانے کا خطرہ ہے۔ اس لئے ابلیس کا ایک مشیر پوچھتا ہے ؎

روحِ سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب — ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب
آں کلیمِ بے تجلی آں مسیحِ بے صلیب — نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز — مشرق و مغرب کی قوموں کیلئے روزِ حساب
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد — توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

مگر ابلیس کا جواب یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اشتراکیت سے خائف نہیں۔ اگر کسی انقلاب سے اسے ڈر ہے تو اسلامی انقلاب ہے ؎

کب ڈرا سکتے ہیں مجھکو اشتراکی کوچہ گرد — یہ پریشاں روزگار آشفتہ مغز آشفتہ ہو
ہے اگر مجھکو خطر کوئی تو اس امت سے ہے — جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ — کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے — مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

اقبال کے کلام سے اسلامی نظریہ سیاست اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اقبال اکیڈمی میں اس موضوع پر بڑی اہم کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں مگر ان کے یہاں نظریات سے زیادہ انکی روح اہم ہے۔ وہ ہر سیاسی نظریہ سے واقف تھے مگر کسی کو پورے طور پر ماننے کے لئے تیار نہ تھے کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے انکو ہر ایک میں خامیاں نظر آتی تھیں۔ وہ مانتے تھے کہ صحیح حکومت

بھی اسلام کا ایک جزو ہے مگر اسلام اور حکومت میں صاف فرق کرتے تھے چنانچہ کہتے ہیں ؎

ہو نہ سرگشتہ اگر ہل گئی تعمیر تری
راز توحید حکومت نہیں تفسیر تری

حکومت جس میں ایک طرف دستور اور دوسری طرف انتظام آتا ہے ان کی توجہ کا مرکز نہیں ہے۔ دستور بدلنے والی چیز ہے اس لئے کسی خاص دستور کا اظہار کرنے سے انہوں نے گریز کیا۔ دستور کوئی بھی ہو اگر چلانے والے موزوں ہیں تو اسے چلائے جائیں گے۔ اسی لئے وہ فرد پر زور دیتے ہیں اور کہتے ہیں ع :- یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے

اس لئے تعمیر خودی پر انہوں نے سب سے زیادہ زور صرف کیا ہے۔ "ملت" اور "ملت بیضا" کا بھی وہ بہت ذکر کرتے ہیں اور خودی اور ملت کی ہم آہنگی کو واضح کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ہر شخص خود دردہو جائے تو کسی نظام میں افراتفری آجاتی ہے۔ اقبال کے نظریۂ خودی میں ملی تعلق بڑا اہم ہے۔ وہ فرد جس کی خودی زندہ ہے ملت کے لئے جیتا ہے۔ مشاہیر اسلام کی خودی اسی میں تھی کہ وہ خودغرضی کا شائبہ بھی نہیں رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے تصوف سے "عشق" کی اصطلاح بھی لی ہے مگر انکے یہاں آکر اسکے معنے ترک دنیا اور عشق الٰہی میں گم ہو جانا نہیں رہ گئے ہیں۔ وہ اسے ایک درد جہانگیری بتاتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

بے درد جہاں گیری آں قرب میسر نیست
گلشن بگریباں کش اے بوئے گلاب اندر

خودی کی بہترین مثالوں میں وہ حضرت علیؓ اور امام حسینؑ کو پیش کرتے ہیں ؎

مسلم اول شہ مرداں علی
عشق را سرمایۂ ایماں علی

آں امام عاشقاں پور بتول
سرو آزادے ز بستان رسول

اور ان حضرات کے سلسلے میں جو خاص باتیں نظم کرتے ہیں اُن میں مرد مومن سیاست کے میدان ہی میں گامزن نظر آتا ہے۔ مثلاً حضرت علیؓ کے لئے کہتے ہیں ؎

ہر کہ در افلاک گردد بو تراب
باز گرداند ز مشرق آفتاب

زیر پاش اینجا شکوہ خیبر است
دست او آنجا قسیم کوثر است

از خود آگاہی ید اللہی کند
از ید اللہی خدائی می کند

اسی طرح امام حسینؑ کے سلسلے میں کہتے ہیں ؎

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید
ایں دو قوت از حیات آید پدید

زندہ حق از قوت شبیری است
باطل آخر داغ حسرت میری است

واقعۂ کربلا ان کے لئے اسلامی سیاست کی عظیم مثال ہے۔ کیونکہ امام حسینؑ کی مثال کا سب سے اہم سبق یہ ہے ؎

تاقیامت قطع استبداد کرد
موج خون او چمن ایجاد کرد

امام علیہ السلام کا اقدام تفسیر ہو جاتا ہے اس نظریہ کی جو قرآن نے بتایا ہے اور اس لئے اقبال کہتے ہیں ؎

رمز قرآں از حسین آموختیم
ز آتش او شعلہ ہا اندوختیم

ہر بڑے شاعر کی طرح وہ اصول سیاسیات سے زیادہ ان مثالوں سے سروکار رکھتے ہیں جو اسلامی نظریۂ سیاست کو واضح کرتے ہیں۔ ممتاز ہوکر ان ہستیوں کی مثال سے ہی وہ مرد مومن کے تصور تک پہونچے ہیں اور اُن کی نظر میں آبادی

مردِ مومن ہی کے وجود سے ہے۔ پُرانے زمانے کے مُسلمان مردِ مومن تھے۔ اور اُنہوں نے جو نشانیاں چھوڑی ہیں اُن سے ایمان نمایاں ہوتا ہے۔ اس لئے "مسجد قرطبہ" کو مخاطب کر کے وہ کہتے ہیں ؎

مجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز — اُس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز
اُس کا مقام بلند اُس کا خیال عظیم — اُسکا سرور اُسکا شوق اسکا نیاز اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اُسکا دل بے نیاز
اسکی اُمیدیں قلیل اُسکے مقاصد جلیل — اُس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
نقطۂ پرکار حق مردِ خدا کا یقیں — اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ — حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

اکثر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ اقبال نے اپنی نثری تصانیف میں جو انگریزی زبان میں ہیں پاکستان کا بہت کچھ ذکر کیا ہے مگر اُن کی شاعری میں اس کی طرف کوئی خاص اشارے نہیں ہیں۔ یہ لوگ شاعری کی ماہیت سے عدم واقفیت کی بنا پر ایسے سوال کرتے ہیں۔ شاعری کو مخصوص امور سے سروکار نہیں ہوتا بلکہ وہ مخصوص امر کو بھی آفاقی درجہ پر لے آتی ہے۔ اقبال کی شاعری خالص سیاسی اور عملی امور کو جن سے وہ ظاہر ہے کہ پُورے طریقے سے واقف تھے آفاقی درجہ پر لے آتی ہے۔ وہ اُن آفاقی قدروں کا اظہار کرتی ہے جن کی بنا پر ایک الگ قومی حکومت قائم کرنا لازمی ہوئی اور پھر جن کے صحیح احساس اور جن پر صحیح عمل سے ایک نئی تعمیر شدہ حکومت دائمی ہو جائیگی۔ اُن کی شاعری کے ارتقاء پر نظر کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا وہ اس میں وقتی امور کی طرف رُجحان کم ہوتا گیا اور دائمی قدروں کا ذکر بڑھتا گیا۔ چنانچہ "بالِ جبریل" کی غزلیں زیادہ تر فرد کے خدا سے تعلق پر ہیں یعنی انسانی خودی کو محض قومی مقاصد سے بالاتر لے جا کر آفاقی مسائل سے وابستہ کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک میں اقبال یہ اعتراف کرتے ہیں ؎

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں — آب و گِل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

مگر وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ اس دَور سے گزر گئے ہیں ؎

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام — اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں۔

اور جس درجہ پر وہ پہونچے ہیں اُس کا بھی صاف اظہار کر دیتے ہیں ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے — کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں
یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید — کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں
علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا — تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن — اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

اُن کا اس قسم کا کلام اُردو سے زیادہ فارسی میں ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کو اُنہوں نے اُردو پر اسلئے ترجیح دی کہ اس میں عظیم خیالات کو بھرپور عظیم انداز میں ادا کرنے کی زیادہ صلاحیت ہے۔ "پیامِ مشرق" میں وہ زیادہ تر آدمی اور انسانیت

کے بنیادی تصورات کو پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ اس مجموعے میں "حور اور شاعر" نام کی نظم اُن کے اس دور کی نمائندگی کرسکتی۔ حور شاعر سے پوچھتی ہے ؎

نہ بہ بادہ میل داری نہ بمن نظر کشائی　　　عجب این کہ تو نہ دانی رہ و رسم آشنائی

اور شاعر جواب دیتا ہے ؎

ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے　　　سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

اور جاوید نامے میں وہ کائنات کے منظر میں بالکل محو ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ آفاقی عالم　اس عملی عالم سے الگ نہیں ہے جس کا مقصد تازہ بستیاں آباد کرنا ہے کیونکہ یہ آفاقی افکار ہی وہ بنیاد ہیں جن سے جہانِ تازہ کی نمود ہوگی اور ان کا دوام ہی تازہ بستیوں کو دوام بخشے گا۔

ان سب خیالات کو یکجا کرنے پر ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی شاعری کا مقصد محض تازہ بستیاں آباد کرکے رہ جانا نہیں ہے بلکہ ان تازہ بستیوں کے آباد ہو جانے پر اس کے باشندوں کے لئے ایسا نصب العین چھوڑ جانا ہے جو ہمیشہ ہمیشہ ان کے لئے مشعلِ راہ رہے۔ اس وقت پاکستان بن گیا اور بس گیا ہے اور ہمیں دیکھنا ہے کہ اس کے استحکام اور اس کے دوام کے لئے ان کی شاعری کس طرح مددگار ثابت ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔

اقبال کی شاعری کا سب سے اہم اثر یہ ہے کہ وہ ہمیں حقائقِ زندگی سے اس طرح ہمکنار کرتی ہے کہ ہماری آنکھیں کھل جاتی ہیں اور ہماری نظر بدل جاتی ہے۔ سب سے زیادہ ہمیں ہمارے مذہب کے بابت آگاہی بہم پہونچاتی ہے۔ اسلام صدیوں سے حکمرانوں کی خودغرضیوں اور عوام کی عیش پسندی کے ماتحت آکر محض رسمی چیز ہو گیا تھا۔ مسلمان ہونے کے معنے کچھ رسموں کی پابندی کرنا، کچھ امور پر بحث کرنا اور تقدیر پر قانع ہو کر دُنیا کے تمام کاموں سے سُبک دوش ہو جانا رہ گئے تھے۔ مذہبیت ایک قسم کی پسپائیت رہ گئی تھی جو دُنیا کی طرف سے بالکل نا امید کرکے عاقبت کا خواب دکھا رہی تھی۔ اقبال کی شاعری ہم کو اس پسپائیت سے نکالتی ہے۔ رومی کے الفاظ میں وہ ہمیں بتاتی ہے ؎

مصلحت در دینِ عیسےٰ غار و کوہ　　　مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ

وہ یہ واضح کرتی ہے کہ اسلام کے معنے راضی برضائے خدا رہنے کے ضرور ہیں مگر تسلیم و رضا کی ایک صورت وہ ہے جو نا امیدی میں ڈالتی ہے اور دوسری وہ ہے جس کی بنیاد انتہائی اُمید پر ہوتی ہے۔ وہ یہ دکھاتی ہے کہ صحیح اسلام وہی جو راہ خدا پر پُر اُمید عزم کے ساتھ چلے۔ اس حقیقت نے ہی مُسلمان قوم کو نیا عقیدہ بخشا ہے اور اسے نئے عزم کے ساتھ عمل پیرا ہونے کی قوت دی ہے۔ اب تک اقبال کی شاعری کے اس اثر سے کچھ لوگ ہی متاثر نظر آتے ہیں اور یہی لوگ ترقی کے میدان میں گامزن ہیں۔ زیادہ تر مُسلمان اسی پسپائی کے عالم میں ہیں جو ان پر صدیوں سے طاری کر دی گئی ہے۔ اس وقت ہمیں کثرت سے وہ لوگ نظر آتے ہیں جو بقول اقبال صوفی اور مُلاّ کے غلام ہیں۔ یا پھر جو لوگ تعلیم یافتہ ہو گئے ہیں وہ لازمی طور پر صوفی اور مُلاّ کی غلامی سے نکل کر یورپ کے فلسفیوں کے غلام ہو گئے ہیں۔ اقبال کی شاعری ان دونوں غلط راہوں کی قاطع ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

نہ مولوی سے مجھکو نہ فلسفی سے غرض　　　وہ دل کا دشمن یہ اندیشہ و نظر کا فتور

اُن کا تو مقصد یہ ہے ؎

مثلِ بُو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا رخت بردوش ہوائے چمنستاں ہو جا
شوق وسعت ہی تو ذرّے سے بیاباں ہو جا نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے

جس وقت اقبال کے یہ الفاظ مشہور ہوئے تو ہندوستان کی قوم اسلام اور اپنے مُستقبل دونوں سے مایوس ہو چکی تھی۔ اقبال کی آواز ایک چونکا دینے والے گھنٹے کی طرح آئی اور اُس نے قوم آوارہ کو پھر سوئے حجاز عناں تاب ہونے پر مستعد کر لیا۔ اقبال کی شاعری سے جاگے ہوئے لوگ ہی ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کے طلبگار ہوئے اور اُن کی کوششوں ہی نے پاکستان حاصل کیا۔ پاکستان میں اب بھی کثرت سے ایسے لوگ ہیں جو اقبال کی شاعری کے اس مخصوص اثر سے بے بہرہ ہیں اور اسی لئے وہ اس ملک کی ذہنی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ بہرحال اقبال کی شاعری ایک روشنی ہے جو زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس ملک کے لوگوں کو قعرِ مذلت سے باہر نکال کر راہِ عمل پر گامزن کرتی رہے گی اور ان کے ذریعہ پاکستان کی تازہ بستی سچے اسلام کی رُوح سے آباد ہوتی رہے گی۔

پھر اقبال کی شاعری ہماری تازہ آباد بستی کے ذہن کی بھی تشکیل میں اہم حصّہ رکھتی ہے اور اہم حصّہ لیتی رہے گی۔ ہم جدید تعلیم کو اہمیت دینے لگے ہیں اور اس طرح یورپ کے سے آنے والے خیالات سے زیادہ سے زیادہ مانوس ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے عقائد ٹوٹ رہے ہیں اور ہمارے ذہنوں میں انتشار پیدا ہو رہا ہے۔ یہ عالم اقبال کی زندگی میں بھی نظر آتا تھا اور اب بھی جاری ہے۔ انہوں نے اسے دیکھ لیا تھا اور اُس کی یوں تصویر کھینچی تھی ؎

علمِ حاضر بھی پڑھا ناگر لندن بھی ہوئے مثلِ انجم اُفقِ قوم پہ روشن بھی ہوئے
بے عمل تھے ہی جواں دین سے بدظن بھی ہوئے صفتِ طائرِ گم کردہ نشیمن بھی ہوئے
حال اُس کا مئے نوا درِ زبوں کرتی ہے
شب مہتاب کی ظلمت کو فزوں کرتی ہے

اب بھی یورپ کے فلسفیوں کے نئے خیالات اور وہاں کے سیاست دانوں کے نئے دستور ہمارے سامنے آ رہے ہیں اور ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اُنکو کہاں تک مانیں اور کیسے اپنائیں۔ اقبال کی شاعری ہی ہماری اس معاملے میں ہدایت کرتی ہے۔ اکثر لوگ اقبال کو شاعر سے زیادہ فلسفی ملتے ہیں۔ فلسفہ ان کی شاعری کا اہم جُزو ضرور ہے مگر وہ شاعر ہی ہیں اور ان کا اہم کام رُوح کو گرما کر اس میں تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ مگر ان کی شاعری کی سب سے اہم شان یہ ہے کہ وہ تمام جدید اور قدیم فلسفوں کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے اور ان کی بابت جدید دقیع اور صحیح رائیوں کا انکشاف کرتی ہے۔ اس شاعری کی زندگی یہ ہے اور اس زندگی ہی سے وہ ہمیں زندہ رکھ رہی ہے کہ جب کہیں کسی محفل میں کسی مسئلہ پر بات چیت چھڑتی ہے تو تان اقبال کے اشعار پر ہی ٹوٹتی ہے۔ صوفیوں کے مجمعوں میں فقیہوں کے مناظروں میں سیاست دانوں کی تقریروں میں عالموں کی تفسیروں میں اور معلمین کی تدریسوں میں اقبال کے اشعار کا اقتباس کئے بغیر کام نہیں چلتا اور خوبی یہ ہے کہ یہ اشعار ہی آخر کار فیصلہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے خیالات میں توازن پیدا کرنے کے لئے اقبال کی شاعری ہی سب سے بہتر نسخہ ہے۔ اقبال مشرق اور مغرب کے تمام علوم سے واقف تھے ؎

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

ڈاکٹر معزالدین

آقا احمد علی اصفہانی

مشرقی پاکستان کی زرخیز زمین نہ صرف سنہرے ریشے ہی اگاتی رہی ہے۔ بلکہ دنیائے شعر و ادب میں بھی اس نے وہ گل بوٹے کھلائے ہیں کہ ان کی رنگینی سے چمن ہائے سخن اب تک شاداب نظر آتے ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ کے مصنفین اور تذکرہ نویسوں کی مجبوری کہئے یا سہل انگاری کہ انہوں نے بنگال کی سرزمین سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کے نام اور کام دونوں کی کھل کر داد نہیں دی ہے۔ ان میں سے بعض ہستیاں ایسی گزری ہیں جن کی شہرت نہ صرف مقامی رہی ہے بلکہ دہلی اور لکھنؤ والوں سے بھی اپنے ادبی کارناموں اور اپنی استعداد کی بنا پر داد تحسین لیتے رہے ہیں۔ خود اہل زبان نہ سہی مگر اپنی زبان دانی کا سکہ اہل زبان کے دلوں پر بٹھا چکے تھے۔ انہوں نے اردو کو اپنے سینوں سے لگائے رکھا اور اس کی ایسی خدمت کرتے رہے کہ یہ برابر ان کی نگہداشت میں پروان چڑھتی رہی۔ پاکستان بننے سے پہلے بھی اردو یہاں کی قابل احترام زبان سمجھی جاتی تھی۔ اور اس وقت بھی کئی ایسی نامور ہستیاں تھیں جن کی شہرت عالمگیر تھی۔ انہیں میں سے ایک آقا احمد علی اصفہانی بھی تھے۔ یہ اپنے وقت کے جید عالم، خوشگو شاعر، اچھے انشا پرداز اور کامیاب معلم تھے۔ مشرقی پاکستان کی دو ناقابل فراموش ہستیاں جن کے نام تاریخ ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے، ان کے دامن تربیت سے وابستہ رہیں۔ میری مراد آزاد برادران یعنی نواب سید محمود آزاد اور نواب سید محمد آزاد سے ہے۔ ان کی دونوں کی استادی کا فخر انہیں حاصل تھا۔ ان کے علاوہ ان کے تلامذہ کی ایک خاصی تعداد ایسی ہے جن کے نام تاریخ ادب میں محفوظ رہیں گے۔ انہوں نے اردو کی ترویج و ترقی میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، وہ قابل تعریف ہیں۔ اردو زبان ان کے احسان گراں سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

آقا احمد علی اصفہانی اپنے وقت کے مستند عالم تھے۔ مرزا غالب سے ٹکر لینے والا معمولی صلاحیت کا آدمی نہیں ہو سکتا۔ فارسی کے مشہور لغت "برہان قاطع" میں مرزا غالب کو بہت سی غلطیاں نظر آئی تھیں۔ ان کے یہ اعتراضات کتابی صورت میں "قاطع برہان" کے نام سے جب منظر عام پر آئے تو ہندوستان کے مختلف گوشوں سے جواب الجواب کا سلسلہ شروع ہو گیا اور کئی ایسے رسالے جو ان اعتراضات کے جواب میں لکھے گئے، عالم وجود میں آئے۔ اور ایک اچھا خاصا لٹریچر جمع ہو گیا۔ ان میں آقا احمد علی کا رسالہ "مؤید برہان" مرزا رحیم بیگ کا "ساطع برہان" اور مولوی سعادت کی کتاب "محرق" خاص طور سے قابل ذکر ہیں مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ ان میں سب سے کامیاب اور مدلل جواب رکھنے والا رسالہ "مؤید برہان" ہی ہے۔ اس میں مرزا غالب کے ہر اعتراض کا جواب نہایت معقول اور عالمانہ انداز میں دیا گیا ہے۔ اس کا ایک مطبوعہ نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی ڈھاکہ میں موجود ہے۔ مرزا غالب اور آقا احمد علی اصفہانی کے درمیان اس ادبی معرکے نے ایک قلمی مجادلے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ "مؤید برہان" ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا، اس کے دو سال بعد یعنی ۱۸۶۷ء میں مرزا غالب نے اس کا جواب دوسرے رسالے "تیغ تیز" سے دیا جس کا جواب آقا احمد علی نے "تیغ تیز تر" سے دیا۔ اس میں کون جیتا اور کون ہارا اس سے بحث نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ مرزا آقا احمد علی جیسا صاحب علم محقق زبان مرزا غالب جیسے نامور شاعر و زبان داں سے کس طرح نبرد آزما ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ یہ ایرانی النسل تھے۔ ان کے آبا و اجداد نادر شاہ درانی کے ساتھ ہندوستان آئے اور یہیں رہ گئے۔ ان کے دادا آقا عبدالعلی اپنے زمانے کے مشہور خطاط اور خوش نویس تھے۔ آقا احمد علی کی جائے پیدائش ڈھاکہ ہے۔ ان کا تاریخی نام "مظہر علی" ہے۔ جس سے سنہ ولادت ۱۲۵۵ھ

[illegible] ہے۔ ان کے استاد خواجہ اسد اللہ کوکب کا شمار ڈھاکہ کے اچھے شاعروں میں تھا۔ عربی فارسی کی تعلیم انہیں سے حاصل کی۔ آپ مرزا عبدالغفور نساخ کے ہم عصر اور ہم نشین تھے۔ انہیں کے بیان کے مطابق علم عروض میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ پہلے فارسی میں شعر کہتے تھے۔ بعد میں اردو میں بھی کہنے لگے۔ اور اچھی مشق بہم پہنچائی تھی۔

آغا احمد علی سنہ ۱۸۶۲ء میں ڈھاکہ سے کلکتہ چلے گئے اور وہاں عربی، فارسی کا ایک مدرسہ "مدرسۂ احمدیہ" کے نام سے قائم کیا۔ اور اسی مدرسے میں معلمی کا فرض انجام دینے لگے۔ کچھ عرصہ بعد مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں ان کا تقرر ہو گیا، ایک مدت تک اسی مدرسے سے وابستہ رہے۔ آہستہ آہستہ ان کی شہرت بڑھتی گئی۔ مرزا غالب سے قلمی معرکے میں ان کی قابلیت کے اور جوہر کھلے۔

مذکورہ بالا رسائل کے علاوہ ان کی چند اور قابل قدر تصانیف تھیں۔ جو اب نایاب ہیں۔ ان کی ایک مشہور تصنیف "اشتقاق" ہے۔ جس میں فارسی مصادر اور ان کے مشتقات سے اردو زبان میں بحث کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آغا نے یہ ضخیم کتاب اپنے عزیز شاگرد نواب سید محمود آزاد کے لئے لکھی تھی جسے بعد میں انہوں نے مختصر رسالے کی شکل دے کر اس کا نام "مختصر الاشتقاق" رکھا تھا۔

ان کا ایک رسالہ اوزانِ رباعی پر "ترانہ" کے نام سے فارسی زبان میں ہے۔ یہ ایک نہایت عمدہ مقالہ ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں علم عروض پر کس حد تک دستگاہ حاصل تھی۔

ان کی ایک مشہور تصنیف "ہفت آسمان" بھی ہے۔ وہ نظامی گنجوی کی "ہفت پیکر" کے اوزان پر اپنے زمانے تک کی فارسی مثنویوں کا تذکرہ لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن اس سلسلے کا صرف پہلا رسالہ "آسمان اول" چھپ سکا۔ بعض روایات کے مطابق وہ "آسمان اول" سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ان کے علمی مشاغل اور تحقیقی ذوق کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ سکندر نامہ، نظامی، اقبال نامۂ جہانگیری، منتخب التواریخ بدایونی، اکبر نامۂ ابوالفضل وغیرہ کی تصحیح کر کے دوبارہ شائع کرایا تھا۔

آخر وقت میں یہ ڈھاکہ آ گئے تھے اور یہیں انتقال فرمایا۔ تاریخ وفات کے متعلق تذکرہ نویسوں میں اختلاف رائے ہے۔ ایک نے سنہ ۱۲۹۱ھ اور دوسرے نے سنہ ۱۳۲۶ھ لکھا ہے۔ آخری سنہ زیادہ قرین قیاس ہے۔

اپنے زمانے کا یہ مشہور شاعر، صاحب نظر ناقد، پُرشوق محقق اور دانائے رموز زبان یہیں آسودۂ خاک ہے ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم ۔۔۔ تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

شاہد احمد دہلوی

نفاست حسین

میری گلی کے نکڑ پر ایک کوارٹر کی توڑ پھوڑ شروع ہوئی۔ اس زمانے میں ہماری کالونی کی منتظم سوسائٹی بڑی فعال ہوگئی تھی۔ ذرا کسی نے اپنے کوارٹر کے آگے چبوترا بنایا اور سوسائٹی سے مزدوروں کا ایک ایک دستہ آیا اور کدالیں مار کر چبوترے کو توڑ گیا۔ اب جو ایک سالم کوارٹر کی ڈھائی ڈھوئی دیکھی تو فوراً مجھے خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ پورا کوارٹر ہی کسی نے ناجائز بنا لیا تھا، جسے سوسائٹی والے اب ڈھوا رہے ہیں۔ پھر خیال آیا کہ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ دو ڈھائی ہزار کوارٹر تو خود سوسائٹی نے بنوا کر دیئے ہیں۔ ایک محلہ دار سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ کوارٹر بک گیا ہے۔ اور جن صاحب نے خریدا ہے وہ اسے دوبارہ بنوا رہے ہیں۔ کچھ دنوں بعد اس کے ملبے پر نئی تعمیر شروع ہوگئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک دو منزلہ شاندار عمارت تیار ہوگئی۔ مکان سے مکیں کا اندازہ ہو گیا۔ دروازہ پر نام کی تختی لگ گئی "نفاست حسین صدیقی"۔

کراچی کی بے تعلقی اور نفسا نفسی مشہور رہے۔ ایک فلیٹ میں رہنے والے کو اس کا علم نہیں ہوتا کہ برابر والے فلیٹ میں کون رہتا ہے۔ جب اس شہر کا دستور ہی یہ ہے تو اپنا بھی یہ حال ہے کہ دو کوارٹر آگے کی خبر نہیں کہ کون رہتا ہے۔ بس اپنے کام سے کام ہے۔

"تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو"

اس سلسلے میں ایک لطیفہ سن لیجئے۔ میرے سامنے جو کوارٹر ہے، اس میں کوئی صاحب آکر آباد ہوئے۔ بس اتنا معلوم ہوا کہ گوالیار کے کوئی صاحب ہیں، ڈاکٹر صاحب کہلاتے ہیں۔ مگر دوا درمن کے ڈاکٹر نہیں ہیں، دن گزرتے گئے، مہینے گزرتے گئے۔ سال گزرنے کی نوبت آگئی۔ روزانہ دن رات میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ڈاکٹر صاحب سے بیسیوں بار آمنا سامنا ہوتا۔ وہ مجھے دیکھتے ہوئے گزر جاتے اور میں انہیں۔ علیک سلیک کی بھی نوبت نہ آئی۔ انہوں نے مجھ سے ملنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی تو میں خواہ مخواہ اپنے آپ کو ان پر کیوں تھوپتا۔ غرض اسی مغائرت میں دن گزرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک دن صبح کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب آئے ہیں اور دیوان خانے میں بٹھا دیئے گئے ہیں۔ دیوان خانے کی کیفیت بھی سن لیجئے۔ میرے کوارٹر میں صرف دو کمرے ہیں۔ ایک مستقلاً بیوی بچوں کے تصرف میں رہتا ہے۔ دوسرا کمرہ دن کو ساقی کا دفتر اور دیوان خانہ بن جاتا، رات کو بیڈ روم بن جاتا۔ اگر کسی کی دعوت ہوتی ہے تو ڈائیننگ روم بن جاتا ہے۔ اگر موسیقی کی محفل ہوتی ہے تو میوزک ہال بن جاتا ہے۔ اور اگر کوئی مہمان آجاتا ہے تو مہمان خانہ۔ گھس گھس میرے کان میں گھس اسے جو ہال میں سمانا نہیں دم سے باندھے چار ۶۰ اور مجھے اس طالب علم کا قصہ یاد آجاتا ہے۔ جس کا ایک تہمد چوری ہوگیا تھا تو اس نے تھانہ میں اپنی ۲۲ چیزیں چوری جانے کی رپٹ درج کرائی تھی۔ کیونکہ اس تہمد کے ۲۲ مصرف تھے، لنگی، پگڑی، بستر، بوغبند، چادر، جانماز، دسترخوان وغیرہ وغیرہ۔ اپنا بھی کچھ یہی حال تھا۔

کیا کہوں میں اپنے گھر کا حال اس خرابی نے کر دیا پامال

ہاں تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب دیوان خانہ میں آئے بیٹھے ہیں۔ میں نے کہا "آج کیا جاتی گنیا دیکھی"۔

بچوں نے کہا "کیا ہو رہا ہے آپ کو"

میں نے کمرے میں داخل ہو کر مؤدبانہ سلام کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ مزاج پرسی کی۔ اور ہم دونوں اس قدر ملاقات سے ملے۔ گویا ہم سے زیادہ ملاقات دو دوستوں میں بھلا کیا ہوگی۔ باتوں باتوں میں ڈاکٹر صاحب نے ایک خط دیا۔ یہ خط مشہور انشاپرداز ل۔ احمد صاحب کا تھا۔ انہوں نے کلکتہ سے ڈاکٹر صاحب کو لکھا تھا کہ آپ کوارٹر نمبر ۱۸۱۰ میں ہیں۔ اور شاہد صاحب نمبر ۱۹۰۶ میں۔ مگر نہ تو آپ نے کبھی کسی خط میں شاہد صاحب کا تذکرہ کیا۔ اور نہ شاہد صاحب نے آپ کا۔ یہ کیا معمّہ ہے؟ اگر آپ حضرات اس قرب کے باوجود اب تک نہیں ملے ہیں تو اس سے بڑھ کر اور کیا گناہ ہوگا۔ اپنی ندامت کو چھپانے کے لئے ہم دونوں ہنسنے لگے۔ اس خط کے بعد ڈاکٹر صاحب سے واقعی مخلصانہ دوستی ہو گئی۔ آپ سمجھے بھی یہ ڈاکٹر صاحب کون تھے؟ یہ تھے ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی۔ علامہ نیاز فتحپوری کے پرانے دوست اور نگار کے مضمون نگار۔ نہایت ستھرے ادبی ذوق کے مالک! اور ل۔ احمد صاحب وہی لطیف الدین احمد اکبرآبادی ہیں۔ جنہوں نے مورؔ کی مثنوی لالہ رخ کا ترجمہ کر کے شہرت عام و بقائے دوام کے دربار میں جگہ پائی اور یہ دونوں حضرات یاران نجد میں بھی شامل تھے۔ جنہوں نے اب سے چالیس سال پہلے ادب لطیف کی داغ بیل ڈالی تھی۔

اچھا تو ذکر تھا نفاست حسین کا۔ کئی سال تک ان سے زیادہ نہ معلوم ہوا کہ یو۔ پی کے کسی شہر کے رہنے والے ہیں اور پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ کراچی کی بے تعلقی ان سے بھی ملنے میں حائل رہی۔ یہاں تک کہ مارشل لا کے نفاذ کے پہلے کا زمانہ آیا۔ ملک فیروز خاں نون کی وزارت عظمیٰ کا عمل دخل تھا۔ ان کے ایک قریبی عزیز اپنے افسروں کو پھلانگتے ہوئے کراچی کے پولیس چیف بن گئے تھے۔ ہر کہ آمد عمارت نو ساخت۔ انہوں نے اپنی کارگزاری دکھلانے کے لئے محلہ کمیٹیاں بنانے کا ڈول ڈالا۔ شدہ شدہ ہمارے محلے میں بھی ایک کمیٹی قائم کرنے کے لئے پولیس والوں نے ایک جلسہ کیا اور پولیس کے گرگوں نے نام بنام سب کو اس میں شریک ہونے کی تاکید کی۔ حکم حاکم مرگ مفاجات۔ مجھے بھی حاضر ہونا پڑا۔ محلہ کمیٹیوں کے جو مقاصد بیان کئے گئے وہ اچھے ہی تھے۔ محلّے میں امن وامان قائم رکھنا، چھوٹے موٹے آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنا، بدمعاشوں اور بدکرداروں کی اطلاع پولیس کو دینا۔ غرض ہر لحاظ سے پولیس کی نیابت کرنا۔ جب محلہ کمیٹی کے لئے نام مانگے گئے تو کسی نے میرا نام بھی لکھوا دیا۔ میں نے بہت رسیاں تڑائیں مگر میری ایک نہ چلی۔ اور ایک دن میرے ایک ہم محلہ کا پروانہ آگیا کہ آج رات کو ۹ بجے محلہ کمیٹی کی میٹنگ میرے گھر پر ہے۔ جس میں علاقے کے ڈی، ایس، پی صاحب خطاب کریں گے۔

نظام صاحب کے گھر پر دس بارہ حضرات جمع ہوئے۔ صاحب خانہ نے سب کا تعارف کرایا۔ یہیں نفاست صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی۔ مجسم زندہ دل آدمی نکلے۔ بات بات پر کھلے پڑتے تھے۔ تیس کے قریب عمر تھی، اونچا قد، چھریرا ڈیل، سانولا رنگ، کشادہ پیشانی، بے قرار آنکھیں۔ ان پر سنہرے فریم کی عینک، ستواں ناک، موزوں دہن، گول ٹھوڑی، کلین شیو۔ انگریزی اور اردو ملا کر بولتے تھے اور ہنسی کے فوارے چھوڑتے جاتے تھے۔ اس سارے اجتماع میں اپنی خوش گفتاری کی وجہ سے سب سے نمایاں شخصیت انہی کی تھی۔ معلوم ہوا کہ نظام صاحب اور نفاست صاحب نے مل کر چھاپہ خانہ اور کتابوں کا کاروبار شروع کیا ہے۔ اور خدا کے فضل سے کاروبار تیرتا چلا جا رہا ہے۔ ان دونوں ذہین اور محنتی نوجوانوں کو دیکھ کر جی بہت خوش ہوا۔ ورنہ جو لوگ بھارت میں اپنا سب کچھ گنوا کر آئے ہیں ان میں سے بیشتر اپنی باقی عمر اس نقصان کے سوگ میں بسر کر رہے ہیں۔ نفاست صاحب جس قدر شوخ و شنگ تھے، نظام صاحب اسی قدر سنجیدہ و بُردبار۔ اجتماع ضدین کے بندھن میں دونوں جکڑے ہوئے تھے۔

ڈی، ایس، پی صاحب آئے۔ اور ساتھ علاقے کے انسپکٹر اور سب انسپکٹر بھی آئے۔ محلہ کمیٹی کے مقاصد بیان کئے گئے۔ کمیٹی کے فرائض و اختیارات دریافت کئے گئے۔ بہت سلجھے ہوئے آدمی تھے۔ ڈی، ایس، پی صاحب بڑی شرافت سے جوابات دیتے رہے۔ ان کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوا کہ اب کسی اہل محلہ کو تھانہ جانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ تمام جھگڑے اور شکایتیں محلہ کمیٹی ہی آئندہ نمٹایا کرے گی۔ مگر میں پولیس کے نام ہی سے بدکتا ہوں۔ بیٹھا یہی سوچتا رہا کہ کب یہ جلسہ برخاست ہو اور میں خیر سے اپنے گھر سدھاروں۔ گفتگو ختم ہونے کے بعد محلہ کمیٹی کی

باقاعدہ تشکیل ہونی شروع ہوئی. پہلے صدر کے لئے نام مانگا گیا. تین چار آوازوں میں میرا نام لیا گیا. میں نہیں نہیں ہی کرتا رہا. اور سب نے گونتھ گانتھ کے میرا نام ہی لکھوا دیا. میں نے اپنے غائبانہ قدردانوں کا شکریہ ادا کیا اور عرض کیا کہ میں اس عہدے کے لئے قطعی ناموزوں ہوں. کچھ اپنی مصروفیات کے باعث اور کچھ اپنی افتادِ مزاج کے سبب ڈی. ایس. پی صاحب نے بڑی شرافت سے پوچھا "آخر آپ کو صدر بننے میں اعتراض کیا ہے."

مجھے حرارہ آ گیا. میں نے کہا "میں پولیس کا کتا نہیں بن سکتا" اس جواب پر چاہئے تو یہ تھا کہ ڈی. ایس. پی صاحب ناراض ہو کر مجھے کسی الزام میں گرفتار کر لیتے. مگر انہوں نے بڑے ٹھنڈے دل سے کہا "یہ ہمارا مقصد ہرگز نہیں ہے." میں نے کہا: "میں یہ ہرگز نہیں کر سکتا کہ اپنے محلے والوں کی خفیہ شکایتیں آپ کو پہنچاتا رہوں. میں تھانے میں حاضری نہیں دے سکتا. آپ کے وقت ناوقت طلب کرنے پر پیش نہیں ہو سکتا."

انہوں نے یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی. بلکہ آپ صرف ٹیلیفون کر دیں میں خود حاضر ہو جاؤں گا. غرض سے

قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

نظام صاحب کو سکریٹری بنایا گیا اور نفاست صاحب منجملہ دیگر حضرات کے مجلس عاملہ کے ممبر بنے. اس کمیٹی کے جلسے ہفتہ وار یا حسبِ ضرورت ہونے لگے مگر ان جلسوں میں ع

نشستند و خوردند و برخاستند

کے علاوہ کچھ نہیں ہوا. کیونکہ ہمارے محلے میں جو ستر بہتر کوارٹر ہیں، ان میں خدا کے فضل سے سب بھلے لوگ آباد ہیں اور اللہ بھلا کرے بے تعلقی کا کوئی کسی سے ملتا جلتا ہی نہیں جو جھگڑا ہو. جہاں دو برتن ہوتے ہیں، آپس میں کھڑک ہی جاتے ہیں. مگر جہاں ع

کسے را با کسے کارے نہ باشد

وہاں تو سناٹا ہی رہتا ہے. اس محلہ کمیٹی سے بس اتنا فائدہ ہوا کہ محلے کے دس بارہ افراد میں دوستی کا رشتہ قائم ہو گیا. نتیجہ یہ کہ کمیٹی کے جلسے باری باری سے مجلس عاملہ کے ممبروں کے ہاں ہونے لگے. جس کے ہاں جلسہ ہوتا وہ یا تو ضیافت کا اہتمام کرتا یا کم از کم بھاری چائے کا. کھلانے پلانے میں نفاست صاحب اور نظام صاحب بڑے دبنگ تھے. چند مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا. اس کے بعد پھر کوئی نئی حکومت بن گئی، تو وزیرِ اعظم کے ساتھ ان کے لواحقین بھی چلتے پھرتے ہوئے، اور محلہ کمیٹیاں اپنی موت آپ ہی مر گئیں، مگر احباب کا جو حلقہ قائم ہو گیا تھا وہ بدستور قائم رہا.

اب جو حلقہ قائم ہوا تھا وہ پولیس کا بنایا ہوا نہ تھا بلکہ دوستوں کا. اس کی بنیاد خوف و ہراس پر نہیں محبت و اخوت پر تھی. اس حلقے کے شیرازہ بند عزیز صاحب تھے. یہ صاحب تمام ممبروں سے کم عمر تھے اور محلے کے بڑے سرگرم کارکن. تھے تو سرکاری ملازم مگر ملازمت ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی. خدمتِ خلق کو یہ ہر کام پر ترجیح دیتے تھے. پہلے انہوں نے ہفتہ وار دعوتوں کا سلسلہ یوں شروع کیا کہ تمام ممبر اپنے اپنے گھروں سے اپنا اپنا کھانا لے کر آئیں، اور کسی ایک ممبر کے ہاں جمع ہو کر کھائیں. یہ تجویز بڑی کامیاب رہی. ایک تو یہ کہ دسترخوان پر بیسیوں قسم کے کھانے جمع ہو جاتے دوسرے یہ کہ زیادہ مفید اس میں کیونکہ اس میں نمود کا عنصر شامل ہو گیا تھا. اس پیش کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ طے ہوا کہ اگر کوئی صاحب اپنے ساتھ ایک آدھ مہمان لانا چاہیں. تو اطلاع دے کر لے آئیں. چنانچہ مہمان بھی شریک ہونے لگے، اور بیس پچیس افراد کا اجتماع ہونے لگا. اس یگانگت اور دلچسپ مجمع کو دیکھ کر مہمانوں کی آنکھیں پھٹیں اور وہ رشک سے کہتے کہ "کاش ہمارا بھی کوئی ایسا محلہ ہوتا."

دلّی میں بھی جب ۱۹۴۷ء کے بعد جنگ کے باعث غیر معمولی حالات پیدا ہو گئے تھے تو ہم نے ایک دن محلے کی مسجد میں بعد نمازِ عشاء محلے والوں کو جمع کیا اور حالات کے پیشِ نظر ایک انتظامی مجلس بنائی تھی. جن کے پاس تھا انہوں نے پیسہ دیا اور جو ہاتھ پاؤں سے خدمت کر سکتے تھے ان کی ایک والنٹیر کور بن گئی تھی. کئی سو روپے کا آٹا خرید کر محلے والوں نے میرے گھر میں رکھوا دیا تھا، تاکہ نایابی کے زمانے میں اہلِ محلہ کے کام آ سکے. وہاں بھی ایک مجلس عاملہ بن

گئی تھی اور ہفتہ کے ہفتہ کسی ایک ممبر کے ہاں جمع ہو کر کھانا کھایا جاتا تھا، اور شہر اور محلہ کی سیاست پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ محلہ والوں نے ازراہ تفنن ہماری انجمن کا نام انجمن شکم پروراں رکھ دیا تھا۔ یہاں بھی ایک ویسی ہی انجمن بن گئی تھی۔ اور محلے والے اسے پیٹ بھروں کی انجمن کہنے لگے تھے۔ میں کھانوں کا یہ سلسلہ مہینوں جاری رہا۔

انسان کسی حالت پر قانع نہیں رہتا۔ اب یہ ہوا کہ اس کا ڈھرّا بدلنا چاہیئے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ باری باری سے دوستوں کے ہاں دعوت ہوا کرے، لہذا یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان دعوتوں کی روح رواں نفاست حسین ہوا کرتے تھے۔ مزے مزے کی باتیں کر کے خوب ہنستے اور ہنساتے۔ میری باری آئی تو نفاست صاحب نے کہا۔ "شاہد بھائی کے ہاں صرف کھانا نہیں ہوگا"۔

میں نے کہا۔ "نہیں چائے یا کافی بھی ہوگی"۔ تو بولے۔ "وہ تو ہوگی ہی، کچھ اور بھی ہوگا"۔

میں نے کہا۔ "جو ارشاد ہو"۔ نظام صاحب نے کہا۔ "گانا بھی ہوگا"۔

میں نے کہا۔ "گانا بھی ہو جائے گا۔ مگر اس گانے کو سمجھے گا کون؟ میرے ہاں تو صرف پکّا گانا ہوتا ہے"۔ نفاست صاحب قہقہہ لگا کر بولے۔ "گانا ہونا چاہیئے۔ پکا ہو یا کچا۔ اور ہاں آپ کا گانا ہم ضرور سنیں گے"۔ سب نے ہاں میں ہاں ملائی اور مجھے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔

دعوت والے دن میں نے استاد رمضان خاں اور امام الدین کو بلا لیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد رمضان خاں صاحب نے تانپورہ سُر کرنا شروع کیا۔ کوئی دس منٹ اس میں لگ گئے۔ احباب کسمسانے لگے۔ مجھے کنگ جارج کے دلی دربار کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ میں نے احباب کی کوفت دور کرنے کے لئے سنایا۔ کہ بادشاہ کے پروگرام میں دلبستگی کے لئے طرح طرح کے فنون کی نمائش بھی رکھی گئی تھی۔ مثلاً ایک رات کو آتشبازی چھوڑی گئی۔ دلی کے آتش بازوں نے بڑے بڑے کمالات دکھائے تھے۔ میں اس وقت پانچ چھ سال کا تھا۔ مگر اب تک اچھی طرح یاد ہے کہ دھماکے کے ساتھ ایک گولا اوپر کو چلا اور آسمان پر جا کر پھٹا تو کنگ جارج اور کوئین میری کی تصویر بن گئی۔ خیر۔ پندرہ منٹ اس کے بھی رکھے گئے کہ بادشاہ کو یہاں کا گانا سنوایا جائے گا۔ ریاستوں سے بڑے بڑے خان صاحب آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے دو کو انتخاب کر کے وقت مقررہ پر بادشاہ کے حضور پیش کیا گیا۔ طنبوروں پر سے مخملیں غلاف اتارے گئے۔ سارنگی نواز نے سارنگی پر سُر دکھایا اور طربیں ملانے لگے۔ خان صاحبوں نے کھونٹیاں مروڑ مروڑ کر تار ملانے شروع کئے۔ پھر منکوں سے ملانے لگے۔ ادھر طبلہ نواز نے ہتھوڑی لے کر آٹھوں گھاٹ صحیح کرنے شروع کئے۔ ادھر ساز سُر میں ہوئے، ادھر پندرہ منٹ ختم ہو گئے۔ بادشاہ سلامت نے ہندوستانی موسیقی کا جو مظاہرہ آج دیکھا تھا۔ اس پر خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ اور دربار برخاست ہو گیا۔ اس لطیفے پر سب ہنسنے لگے۔ استاد بھی کھسیانی ہنسی ہنسے اور بولے۔ "میاں تانپورے کے ملانے ہی سے گویئے کی جانچ ہو جاتی ہے"۔ تانپورہ مل گیا تو طبلے کی ٹھکائی ہونے لگی۔ مگر لطیفہ اپنا کام کر گیا تھا اس لئے طبلے کے ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میاں امام الدین نے باجا سنبھالا اور خان صاحب نے مالکونس کا خیال الاپ میں شروع کر دیا۔ استاد رمضان خاں ہر کھنڈ کی گائیکی پر حاوی ہیں۔ انہوں نے جو سُروں کے مجمعے بنانے شروع کئے تو آدھا گھنٹہ ٹیپ تک پہنچنے میں لگا دیا۔ اس کے بعد تان پلٹوں کا سلسلہ جو شروع کیا تو سُروں کی ایسی تیسی کر کے رکھ دی۔ خدا خدا کر کے ۵ ہ منٹ میں خیال ختم ہوا تو سامعین کی جان میں جان آئی۔

سب نے بہت تعریف کی نفاست صاحب نے کہا۔ "استاد آپ نے تو کمال کر دیا"۔ پھر فوراً ہی مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ "اب آپ سنایئے استاد تھک گئے ہوں گے، انہیں آرام کرنے دیجئے"۔ استاد چمک کر بولے۔ "تھک گئے۔ توبہ توبہ کر کے کہتا ہوں۔ ابھی تو پانچ گھنٹے اور گا سکتا ہوں"۔ یہ سُن کر سب کے چہرے فق ہو گئے۔ ایک ہی خیال نے ان کا پلیتھن نکال دیا تھا۔ بڑی بے کسی سے میری طرف دیکھا اور معاً مجھے وہ گانے یاد آ گئی جو اقبال پر نفاست صاحب کے گھر کے سامنے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی اور قصاب اس کی رسی کھول رہا تھا۔

مجھے ان پر بڑا ترس آیا۔ میں نے کہا۔ "یہ گانا حظِ نفس کے لئے نہیں ہوتا، تزکیۂ قلب کے لئے ہوتا ہے۔ "آوازیں آئیں" "بیشک بیشک"! میں نے

کہا "دیکھئے میں آپ کو درباری کا خیال سناتا ہوں"۔ سب کے چہرے پھر اتر گئے۔ میں انہیں بطور سزا گانا سنانا چاہتا تھا نہیں بتا دیا گیا تھا کہ پکا گانا ایک بہت بڑی مصیبت ہے، مگر وہ نہ مانے اور یہی کہتے رہے کہ ہم تو پکا گانا ہی پسند کرتے ہیں۔

"لو! تو پھر سنو!" میں نے درباری کا خیال آدھے گھنٹے میں ختم کیا۔ گانے کے دوران میں سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ نہ آہ، نہ واہ۔ قبرستان کا منظر پیش نظر تھا۔ جب میں نے دیکھ لیا کہ ان کا اچھی طرح تزکیۂ نفس ہو گیا تو خیال ختم کیا اور فوراً کافی منگوا کر سب کو پلوائی۔ ضرب بڑی کاری لگی تھی۔ اسے سہلانا بھی ضرور تھا۔ اس لئے اپنے بعد میاں امام الدین کو بٹھایا۔ انہوں نے قوالی، جگر اور فیض کی غزلیں سنا کر محظوظ کیا اور سب ہنسی خوشی رخصت ہوئے۔

اگلی دعوت نظام صاحب کے ہاں ہوئی۔ انہوں نے ایک بالکل نئے انداز کا انتظام کیا تھا۔ یعنی وہ کھانے جو چین لوگ کھاتے ہیں۔ چینی کھانا ایک باورچی سے تیار کرائے تھے۔ کھانا سب کھاتے جاتے تھے اور خوش گپیاں ہوتی جاتی تھیں۔ نفاست صاحب نے پکے گانے کا ذکر چھیڑا اور ہنس کر کہنے لگے: "ہوگا میاں کوئی بڑا اونچا فن۔ اپنے پلے تو کچھ نہیں پڑا۔ اگر ایسا ہی گانا سننا ہو تو کسی کتے کے ڈھیلا کیوں نہ مار دیا جائے" اس پر ایک قہقہہ پڑا۔ نظام صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا: "فن تو یقیناً یہ ہے اور بہت اونچا فن ہے، یہ کہئے یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا"۔ نفاست صاحب بولے: "یہ بھی کوئی فن ہوا کہ کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آتا"۔ میں نے کہا: "آپ تجریدی آرٹ کی تصویروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں؟" بولے: "نہیں۔ عجیب بھدے سے بھدے رنگ لگا کر کہتے ہیں کہ یہ شاہکار ہے۔ ایک لطیفہ سنا تھا کہ کسی ایسے ہی تجریدی آرٹ کے شاہکار کو دیکھ کر ہم جیسے کسی اناڑی نے پوچھا تھا کہ یہ کیا ہے؟ تو اسے بتایا گیا کہ یہ چراگاہ میں گائے چر رہی ہے۔ اس نے حیران ہو کر پوچھا کہ سبزہ کہاں ہے اور گائے کہاں ہے؟ کہا گیا کہ گھاس گائے نے چر لی اور گائے گھاس چرنے کے بعد چلی گئی۔ ابھی حال میں ایک خبر اخباروں میں شائع ہوئی تھی کہ کسی نمائش میں ایک تصویر کو پہلا انعام ملا۔ بعد میں مصور نے بتایا کہ غلطی سے تصویر الٹی لٹکا دی گئی تھی۔" ان لطیفوں پر جب سب ہنس چکے تو میں نے عرض کیا: "فنون لطیفہ کو سمجھنے کے لئے اپنے اندر بھی بڑھی چاہئے ہوتی ہے۔ پکا گانا یا تجریدی آرٹ فن کے اعلیٰ مدارج میں سے ہے۔ فن کو سمجھنے اور پرکھنے کے لئے برسوں مطالعہ و مشاہدہ اور ریاض کرنا ہوتا ہے۔ آپ نے سولہ سال انگریزی کی تعلیم حاصل کی اس پر بھی شیکسپیئر اور ملٹن سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔" نفاست صاحب بولے "ہاں! یہ بات تو ہے!" میں نے کہا: "یہ بتلایئے آپ نے موسیقی یا مصوری کتنے سال تک سیکھی"۔ بولے: "بالکل نہیں سیکھی"۔ میں نے کہا: "تو پھر آپ اسے کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ جبھی تو میں نے کہا تھا کہ پکا گانا ایک بہت بڑی مصیبت ہے"۔ "عذاب ہے صاحب" نفاست صاحب سنجیدگی سے بولے اور سب ہنس پڑے۔ "اب کھائی سو کھائی، اب کھاؤں تو رام دہائی۔ آپ نے اس دن ہمارا پورا تزکیۂ نفس کر دیا۔ اب آپ کی طرح ہم بھی ۳۰–۳۵ سال اس فن کو سیکھیں، سنیں اور برتیں تو اس سے لطف اندوز ہوں۔ نا بابا، نا۔ آپ ہی کو مبارک رہے یہ فن"۔ غرض بڑی دلچسپ گفتگو رہی کھانے کے بعد اور اگلی دعوت نفاست صاحب کے ہاں طے ہوئی۔

نفاست صاحب کو اللہ نے پیسہ دیا تھا اور پیسے کے ساتھ دل بھی دیا تھا۔ وہ محنت کر کے خوب کماتے تھے، اچھا کھاتے، اچھا پہنتے، آرام سے رہتے، دوستوں کی خاطر تواضع پر جی کھول کے صرف کرتے۔ اپنی دعوت سے دو ایک دن پہلے اپنے گھر کے آگے بیٹھے ہوئے مل گئے تھے، فرمانے لگے۔ "کھانے کے بعد کچھ ہونا چاہئے"۔

میں نے کہا۔ "جیسی رائے ہو"۔ ہنس کر بولے۔ "پکے گانے سے تو آپ نے توبہ کرا لی۔ آپ کے تو سینکڑوں شاعر دوست ہوں گے۔ کسی اچھے سے شاعر کو پکڑ لایئے"۔ نفاست صاحب کو میری اس کمزوری کا علم تھا کہ میں شاعروں کے نام سے بدکتا ہوں اور ہنس ہنس کر میرا یہ فقرہ دہرایا کرتے تھے کہ "میں نے تو شاعروں کے ڈر کے مارے اپنے گھر پر اپنے نام کی تختی بھی نہیں لگائی"۔ اس پر انہوں نے مجھ سے ایک شاعر کو پکڑ لانے کی فرمائش کر دی۔

میں نے کہا: "ہم کھانے کے بعد کوئی اور برا کام نہیں کر سکتے"۔ بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور بولے۔ "آپ کا بھی تو تزکیۂ نفس ہونا چاہئے"۔

دعوت ہوئی اور بڑے ٹھاٹھ کی ہوئی۔ میں اپنے ساتھ حضرت ظریف دہلوی کو لے گیا تھا۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا اور چائے کے ساتھ ظریف صاحب کا چٹ پٹا کلام۔ ظریف صاحب سنجیدہ پن کے شعر بھی کہتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے اپنی شاعری کو نمبروار تقسیم کر دیا ہے۔ پہلے نمبر کی شاعری اور

ان کا بہترین کلام ہے۔ دوسرے نمبر میں مزاحیہ، تیسرے میں طنزیہ اور چوتھے نمبر پر فحش۔ ظریف صاحب کا تعارف کراتے ہوئے میں نے ان کی نمبروار شاعری کا تعارف بھی کرا دیا۔ حاضرین ان کا کلام خصوصاً نمبر ۴ سننے کے لئے ہمہ تن گوش بن گئے تھے، مگر ایک دم سے نمبر چار کی فرمائش بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا نمبروار ان کا کلام سنتے چلے گئے۔ جب نمبر چار کی باری آئی تو ظریف صاحب تامل کرنے لگے۔ ان کی عمر ستّر سے اوپر ہے۔ ویسے وہ بڑے منہ پھٹ ہیں مگر اجنبی لوگوں میں پھر بھی لحاظ مانع ہوتا ہے۔ جب چاروں طرف سے بہت اصرار ہوا تو انہوں نے گونگے کا ایک قطعہ سنایا، سب ہنستے ہنستے لوٹ گئے کیونکہ ظریف صاحب جب اپنا کلام سناتے ہیں تو خود بھی کلام کی تصویر بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد بھلا انہیں کون چھوڑتا تھا۔ تابڑ توڑ فرمائشیں ہونے لگیں۔ پھر ظریف صاحب نے تکلف بالائے طاق رکھ کر جو اپنی منظومات سنانی شروع کی تو اللہ دے اور بن… مادر پدر آزاد شاعری نے چھت اڑا دی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک ان کا کلام سنا اور اشتیاق پھر بھی باقی رہ گیا۔ یہ بھی ایک یادگار دعوت تھی جس کا چرچا مہینوں رہا۔[1]

نفاست صاحب دل کے مریض تھے مگر بڑے زندہ دل اور وسیع القلب انسان تھے، دوسروں کی خدمت کر کے خوش ہوتے تھے۔ انگریزی اور اردو کی کتابیں چھاپتے تھے اور ان کا کاروبار خوب چل رہا تھا۔ میں نے چونکہ خود بیس سال پبلشنگ کا کام کیا ہے۔ اس لئے میرا تعلق بیسیوں پبلشروں سے رہا ہے۔ میں نے تو کوئی پبلشر ایسا نہیں دیکھا۔ الّا ماشاءاللہ۔ جو ادیبوں کا شکار نہ کرتا ہو۔ یہاں تو میں نے ایسے ایسے پبلشر دیکھے ہیں کہ میں نے متنفر ہو کر پبلشنگ کا کام ہی چھوڑ دیا ہے تاکہ میں ان کی برادری سے از خود خارج ہو جاؤں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ غضب خدا کا مصنف سے اس کا مسودہ بھی لے لیا اور کتاب کی پوری لاگت بھی اور اس کے بعد سارا اسٹاک کھا کر ڈکار تک نہ لی۔ بیچارا مصنف ہے کہ جوتیاں چٹخاتا پھر رہا ہے۔ اور کسی کو اس پر ترس نہیں آتا۔

نفاست حسین اس کلیّہ سے استثنا تھے۔ میں نے ان کی ادیب دوستی کی کئی مثالیں دیکھیں، سب سے بڑی مثال تو ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھنؤ یونیورسٹی میں ۱۸ سال انگریزی پڑھانے کے بعد ترک وطن کر کے پاکستان آگئے تھے اور کراچی یونیورسٹی میں صدر شعبۂ انگریزی ہو گئے تھے۔ تھوڑی ہی مدت بعد وہ ریشہ دوانیوں کا شکار ہو گئے۔ اور یونیورسٹی سے انہیں علیحدہ کر دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب بیچارے سیدھے سے آدمی ہیں۔ چھل فریب وہ کیا جانیں، انہوں نے سوچا، ملکِ خدا تنگ نیست، پائے مرا لنگ نیست۔ کسی اور یونیورسٹی میں جگہ مل جائے گی۔ کچھ دنوں بعد پشاور یونیورسٹی میں ایک جگہ نکلی، درخواست دی، انٹرویو کے لئے بلائے گئے۔ نہایت موزوں استاد سمجھے گئے، مگر جگہ نہ ملی۔ وجہ یہ معلوم ہوئی کہ کراچی یونیورسٹی والوں نے ان کی برائی لکھ بھیجی تھی۔ اب انہیں اندیشہ ہوا کہ کہیں دوسری یونیورسٹیوں میں بھی یہی معاملہ پیش نہ آئے۔ ان کا یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی اور سندھ یونیورسٹی سے بھی جواب مل گیا۔ سخت حیران اور پریشان ہوئے۔ پورا ٹبّر ساتھ، سات آٹھ سو مہینے کا خرچ۔ ایک مقامی کالج کے مالک نے انہیں زیادہ تنخواہ دے کر پرنسپل رکھنا چاہا۔ مگر ڈاکٹر صاحب وضعدار آدمی ہیں۔ انہوں نے اس پیش کش کو قبول نہ کیا، یونیورسٹی کے بعد کالج میں آنا انہیں گوارا نہ ہوا۔

— مگر مارنے والے سے جلانے والا قوی تر ہے۔ اس بیکاری و پریشانی کے زمانے میں انہیں کتابیں لکھنے کا خیال آیا۔ دو ایک ناول ادھورے پڑے تھے انہیں مکمل کیا۔ اپنے مضامین کے مجموعے مکمل کئے، پبلشروں کے چکر کاٹے۔ اونے پونے ان کا سودا کیا۔ شدہ شدہ بک کارپوریشن میں بھی پہونچ گئے۔ وہاں نفاست صاحب اور نظام صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب کے نام اور کام سے کون واقف نہیں؟ ان حضرات نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جو کتابیں تیار تھیں، ان سے لے لیں اور نقد معاوضہ پیش کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ بات کچھ عجیب سی لگی۔ ان کا تجربہ تو اب تک یہ تھا کہ جب تک پھیرے کرتے کرتے جوتیاں نہ ٹوٹ جائیں پبلشر پیسے نہیں دیتا، بلکہ پورے پیسے پھر بھی نہیں دیتا۔ لہٰذا ان دونوں بھلے آدمیوں سے ڈاکٹر صاحب کی دوستی ہو گئی۔ اس تعلق سے ڈاکٹر صاحب کی مالی پریشانی رفع ہو گئی۔ بک کارپوریشن کے لئے انگریزی میں وہ تعلیمی کتب اور نصابی کتب کے نوٹس لکھتے رہے۔ ان کے نام کا کھاتہ کھل گیا اور حسب ضرورت اخراجات کے لئے بک کارپوریشن سے روپیہ لیتے رہے۔ ڈھائی

[1] ظریف دہلوی کا انتقال اسی سال، ۲ جنوری کو اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ہو گیا۔

تین سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس عرصے میں ڈاکٹر صاحب کراچی یونیورسٹی کی تھوپی ہوئی بدنامی کے داغ کو مٹانے کی کوشش کرتے رہے مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے؟ یونیورسٹی بھلا اپنے فیصلے کو واپس کیسے لیتی۔ اس کے پرسٹیج کا سوال تھا۔ بڑی بڑی کوششیں کی گئیں ناکامی ہوئی، ادیبوں کا ایک ڈیپوٹیشن بھی وائس چانسلر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہیں باور کرایا گیا کہ ڈاکٹر صاحب کا کوئی قصور نہیں اور اگر آپ سمجھتے ہیں، کہ قصور ہے تو انہیں معاف کر دیجئے۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ میں نے زچ ہو کر کہا "خدا بھی قصور معاف کر دیتا ہے"۔ بڑی رعونت سے جواب دیا۔ "جی ہاں، خدا معاف کر دیتا ہے"۔ ہم بے زار ہو کر وہاں سے چلے آئے مگر ڈاکٹر صاحب کے دل کو لگی رہی اور ایک دن ڈاکٹر صاحب بڑے خوش خوش آئے اور کہا کہ داغ بدنامی مٹ گیا ہے۔ مگر میں اب کراچی یونیورسٹی میں نہیں جاؤں گا سندھ یونیورسٹی میں جا رہا ہوں۔ معلوم ہوا کہ کسی ذریعے سے بات گورنر تک پہونچائی گئی اور انہوں نے کیس دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کے حق میں حکم دے دیا۔

اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کرنے کی اس لئے ضرورت پڑی کہ ڈاکٹر صاحب کی صحیح پریشانی کا اندازہ ہو جائے۔ صاحب اندھیرگردی کی کہ ایک شخص پر چاروں طرف سے روزی کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ مگر یہ ظالم بندے بھول گئے کہ رزاق کوئی اور ہے جو ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ۔ ڈاکٹر صاحب کو یونیورسٹی سے سات سو ملتے تھے۔ یونیورسٹی سے علیحدہ ہونے کے بعد نفاست ولنظام کے ہاں ہزار بارہ سو ملنے لگے۔ میں جانتا ہوں کہ بیروزگاری کے تھوڑے سے عرصہ بعد ڈاکٹر صاحب پر کیا گزر گئی۔ ان کی بھوک اور نیند اڑ گئی تھی۔ اور وہ پاگلوں کی طرح ڈھوپوں میں پھرتے رہتے تھے۔ بنی کے سب ساتھی ہیں بگڑی کا کوئی نہیں۔ مگر زمانہ بھلے آدمیوں سے خالی نہیں رہتا۔ نفاست حسین ہنس ہنس کر کہا کرتے تھے: "ہم نے ڈاکٹر صاحب پر کوئی احسان نہیں کیا۔ وہ ہمیں کتابیں لکھ لکھ کر دیتے ہیں یہ ان کا احسان ہے"۔ یہ ان کی نیک نیتی ہی تھی کہ ان کا کاروبار بڑھتا ہی چلا گیا۔ اور روپے کی لہر بہر ہو گئی۔

نفاست حسین نے تعلیمی کتب کے ساتھ ساتھ ادبی کتب بھی شائع کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس سلسلے میں وہ لاہور بھی گئے تھے۔ اور وہاں سے اچھے اچھے ادیبوں کے مسودے خرید کر لائے تھے۔ بزرگ ادیب حضرت ایم اسلم سے پانچ ناولوں کے مسودے لائے تھے۔ غالباً وہ شائع بھی کر دیئے تھے مگر اسلم صاحب نے بتایا کہ رقم پانچوں کی ادا کر دی تھی۔ ایسے کھرے پبلشر اگر چند اور ہو جائیں تو ادب اور ادیبوں کے دن پھر جائیں۔

نفاست حسین کو اللہ نے روپیہ دیا مگر روپیہ کے ساتھ جو خرابیاں آتی ہیں ان سے وہ بچے رہے۔ سارا دن اپنے کام میں لگے رہتے اور بعد مغرب اپنے گھر آجاتے۔ نہ سینما، نہ کلب، نہ ہوٹل، کچھ نہیں۔ آپ بھلے اور اپنا گھر بھلا۔ اپنے بچوں اور محلے کے دوستوں سے جی بہلاتے تھے، کھلانے پلانے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ پیغام چلا آ رہا ہے کہ ایک آئس کریم بنانے والا آگیا ہے۔ کل شام کو ذرا اس کا ٹیسٹ لیا جائے۔ دس بارہ دوست جمع ہیں۔ اور آئس کریم کا دور چل رہا ہے۔ ایک دن سرِ راہ مل گئے، پوچھا۔ "آپ کو سیخ کے کباب پسند ہیں"۔ اور جواب کا انتظار کئے بغیر بولے، "لاجواب بناتا ہے۔ ہم کھلوائیں گے آپ کو پرسوں"۔ پرسوں گئے تو دیکھا صحن میں کبابی بیٹھا سیخیں بھر رہا ہے۔ نفاست صاحب نے پوچھا۔ کیوں بھائی کیا دیر ہے"۔ جواب ملا۔ "تیار ہیں"۔ ہم میز پر پہنچا اور کباب آنے شروع ہو گئے۔ پیاز کا لچھا، ٹماٹر کے قتلے، لیموں طشتریوں میں پہلے ہی رکھا ہوا تھا۔ گرم گرم گولے کے کباب آ رہے ہیں اور روک کے کھائے جاتے رہے۔ چٹ پٹے، مزیدار اور سیر ہو کر کھائے گئے۔ مرچیں کم تھیں نے پرسی کچھ تو تھیں ہی، برف کے پانی سے انہیں کم کیا۔ اتنے میں سب کے سامنے گاجر کا حلوہ آگیا۔ یار لوگوں نے کہا "پہلے سے کیوں نہ بتایا کہ اس کے لئے گنجائش رکھی جاتی"۔ صاحب خانہ نے ہنس کر کہا۔ "یہ اپنی جگہ خود بنا لے گا"۔ "چلئے صاحب منہ بھی میٹھا ہو گیا۔ مگر نہیں، ابھی نہیں، اب چل کر دیوان خانہ میں بیٹھئے، چائے کی ایک پیالی پیجئے، پان کی گلوری منہ میں رکھئے، سگریٹ لیجئے اور گپ لڑایئے، ملک، حکومت، محلے کی سیاست پر گفتگو کیجئے، جب اس سے جی بھر جائے تو اپنے گھر سدھاریئے۔

ایک دن پیغام پہنچا کہ بمبئی کا ایک گانے والا آیا ہے۔ رات کا کھانا یہیں کھایئے اور گانا سنئے۔ بمبئی کا گانے والا اور نفاست صاحب کے

ہاں! یہ کیا معمّہ ہے۔ رات کو پہنچے تو دیکھا کہ ایک صاحب خالص میراثی وضع میں کھنائے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے مجھے اور میں نے انہیں دیکھا۔ ارے اسے تو میں نے کہیں دیکھا ہے! وہ بھی کوئی آدھے منٹ تک مجھے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد ارے شاہد صاحب کہہ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ اب حیران ہونے کی باری نفاست صاحب کی تھی۔ جب ہم بیٹھ گئے تو اس نے کہا۔ "زہے نصیب، یہ صورت پندرہ سال بعد دوبارہ دیکھی۔ مگر میاں آپ یہاں کہاں؟" میں نے کہا "میں یہیں رہتا ہوں نفاست صاحب کا پڑوسی ہوں۔" دراصل یہ بیچارہ ایک معمولی سا آرٹسٹ تھا۔ جو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے غزل گیت گایا کرتا تھا۔ ۴۷ء کے ہنگامہ میں کراچی آگیا۔ مگر یہاں اس وقت ریڈیو اسٹیشن نہیں تھا۔ اس لئے بمبئی چلا گیا۔ وہاں اس نے اچھے پیسے کمائے اور فلموں میں اپنی جگہ بنالی۔ یہاں اپنی لڑکی سے ملنے آیا تھا۔ تو اتفاق سے نفاست صاحب کے ہتھے چڑھ گیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جو اس سے گانے کو کہا تو اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا "نا، بابا، نا۔ میں بھلا ان کے سامنے کیا گا سکتا ہوں۔" میں نے کہا "آپ شوق سے گایئے آپ کو سنے ہوئے پندرہ سال ہوگئے۔" تو اس نے بڑے ادب لحاظ سے چند غزلیں اور گیت سنائے۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ وہاں بہت اچھے حالات میں ہے۔ یہ تو اس کے ہاتھوں کی انگوٹھیوں سے بھی ظاہر ہو رہا تھا۔ یہاں کا حال پوچھا۔ میں نے دبی زبان سے کہا "اچھا ہے" میں اسے کیا بتاتا کہ استاد رمضان خاں بینائی کھو کر لالوکھیت میں بھکا مر رہا ہے، اپنا گھٹنا کھولو اور آپ ہی لاجوں مرو — محرم میں نفاست صاحب کے ہاں ایک دن حلیم ضرور کھائی جاتی تھی۔ وہ اس کا خاص اہتمام کرتے تھے اور کئی دیگیں پکوا کر تقسیم بھی کرتے تھے۔

نفاست صاحب ہر وقت ہنستے مسکراتے رہتے تھے۔ مگر دل کی بیماری انہیں اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہی تھی۔ انہیں دورے پڑنے لگے تھے۔ پہلے طویل وقفوں سے، پھر قلیل وقفوں سے۔ ایسا بھی ہوا کہ شدید دورہ پڑا۔ تو اسپتال میں داخل ہوگئے اور وہاں سے چند روز بعد ساونٹے ہو کر آ گئے۔ اب جو ان پر دورہ پڑتا تو ہم سمجھتے کہ کوئی بات نہیں اچھے ہو جائیں گے۔ مگر ایک دن صبح ہی صبح سنا کہ نفاست حسین کا انتقال ہوگیا۔ بھاگا ہوا ان کے گھر گیا تو عورتوں کے بین کی دردناک آوازیں سنائی دیں۔ معلوم ہوا کہ صبح ہوتے اسپتال میں جان دے دی۔ دو گھنٹے بعد پھر گیا تو ان کی میت کو غسل دیا جا رہا تھا۔ نفاست حسین تختے پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان پر پانی کے تڑیڑے پڑ رہے تھے مگر وہ بے حس و حرکت لیٹے ہوئے تھے۔ بیماری یا موت نے ان کے جسم اور چہرے پر کوئی اثر نہیں چھوڑا تھا۔ ان کی آنکھیں نیم باز تھیں اور چہرے پر مسکراہٹ سے

نشانِ مردِ مومن با تو گویم — چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

*

رپٹ (بسلسلہ ص ۲۰)

اشرف خاں نے جیبیں اُلٹ دیں۔ بیس روپے انعام کے علاوہ بارہ روپے اور نکلے۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔
"آپ لوگ مائی باپ ہیں، میرا لیسنس ضبط ہوگیا تو بچے بھوک کے مر جائیں گے۔ یہ مٹھائی کے پیسے لے لیجئے۔ اور مجھ پر رحم کیجئے۔"

روپے دیکھ کر حوالدار صاحب کے تنے ہوئے تیور کچھ نرم پڑ گئے۔ جیب میں ڈالتے ہوئے بولے۔ "سالے بس یہی؟ ہمارا تو خیال تھا کہ تم ڈرائیور دن میں پچاس سے کم تو کیا کماتے ہوگے۔"
لائسنس اشرف خاں کو واپس دے کر حوالدار صاحب نے جاتے ہی لے کر سپاہی سے کہا۔ "ذرا فون تو کر دے بجلی گھر کے تھانے پر، وہ علاقہ ان کا ہے۔ وہ سنبھال لے جائیں۔"
سوجا ہوا گال اور خالی جیبیں لیکر اشرف خاں جب تھانے سے نکلا تو اس نے قسم کھائی کہ اب زندگی بھر نہ تو وہ کسی کی مدد کرے گا اور نہ کسی پولیس تھانے میں رپٹ لکھانے جائے گا۔

کرشمۂ اہل نظر و بصارتش)　　دانش افزود مرا درس حکیمانِ فرنگ　　سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

ہماری قوم کو بھی ان تمام علوم سے واقف ہوتا ہے اور اس کے زیادہ سے زیادہ افراد اس سے واقف ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارا روائتی علم بھی اپنا مقام رکھتا ہے اور اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جدید مغربی علم بھی بڑے زور و شور سے ہم پر حاوی ہوتا جا رہا ہے اور اس سے بچنا بھی غلطی ہے۔ اقبال کی شاعری ہمارے سامنے ان دونوں کے تمام پہلوؤں پر تنقید کرتی نظر آتی ہے۔ دونوں کی تمام خامیوں سے ہم کو نفرت اور خوبیوں سے رغبت کی تلقین کرتی ہے اور اس طرح روحانی اصلاح کے ساتھ ساتھ ذہنی اصلاح کا بھی دائمی ذریعہ ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جدید تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہمیں اس درجے پر نہیں رہنا ہے جس پر وہ لوگ ہیں جن کو اقبال نے دو رکعت کے امام کہا ہے' اور پھر ہمیں یورپ کے خیالات میں گم ہو کر وہ نہیں ہو جانا چاہیئے جن کو اقبال نے طائر گم کردہ نشیمن سے تعبیر کیا ہے۔ ہمیں ایک نئی آزاد خیالی پر پہونچنا ہے جس کا ہادی اقبال' رومی کو بتاتے ہیں' اور خود ان کے مُرید ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ رومی کی شاعری کو قرآن در زبان پہلوی کہا گیا ہے۔ اقبال کی شاعری کو اگر قرآن در زبان ہندوی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ رومی کی طرح وہ قرآن سے مغز لے آئے ہیں ہڈیوں کو کتوں کے لئے چھوڑ آئے ہیں قرآن جو تمام علوم کے لئے ایک دائمی میزان ہے اُن کے علم کی جان ہے اور اسی پر وہ تمام جدید علوم کو تول کر اس کی قیمت مقرر کرتے ہیں۔ اُن کی شاعری یہی ناپ تول پیش کرتی ہے اور قوم کے ذہن کو اسی کی تعلیم دیتی ہے اور دیتی رہے گی۔

آخر میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ قوم کی ادبی زندگی میں اقبال نے کیا تبدیلی پیدا کر دی اور اُنکے اثر سے ادب کا نظریہ اور عمل دونوں "تازہ بستیوں کو آباد کرنے کے کام میں مصروف ہو گئے۔ اس کا اعتراف بار بار ہو چکا ہے کہ اُنہوں نے ادب کو زندگی سے ہمکنار کر دیا۔ شاعری کو وقتی تفریح اور زبان کے کھیل کے درجے سے نکال کر زندگی کے پہلوؤں پر تخیلی تنقید کا ذریعہ بنا دیا۔ آج جو ہم ادب کو محض افیون ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں بلکہ تمام علوم اور فنون سے زیادہ اہم درجہ دیتے ہیں وہ خاص طور سے اقبال ہی کے فیض سے ہے۔ شاعری کو تو اُنہوں نے ایک زندہ قوم کا عمل صالح بنا ہی دیا۔ مگر ہر قسم کے لکھنے والوں اور ہر اصناف کے عامل پر جو اُن کا اثر ہوا ہے وہ بڑے خاص طور پر توجہ کے لائق ہے۔ میں صنف ناول کو لیتا ہوں جو اس وقت سب سے زیادہ مقبول صنف ہو رہی ہے۔ کتنی کثرت سے ناولیں ہیں' جن کی سُرخیاں اقبال کے اشعار سے لی گئی ہیں۔ "میرے بھی صنم خانے" "رہ و رسم آشنائی" "خدا کی بستی" "تازہ بستیاں آباد" کثرت سے ناولوں کے ہیرو اقبال سے متاثر نظر آتے ہیں اور صنفی ہیرو ان کے تصور مرد مومن اور تصور خودی سے قریب آ جاتے ہیں۔ ناولوں اور افسانوں کے مکالموں میں اُن کے خیالات اور ان کے اشعار کی جو بھرمار ہے اُس کی کوئی حد نہیں۔ ناولوں کی دُنیا اقبال کی بنائی ہوئی نہیں ہے۔ پھر بھی اقبال سے اس گہرے طریقے پر متاثر نظر آتی ہے کہ اگر ہر جدید ناول کو اقبال کی آباد کی ہوئی تازہ بستی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ افسانے اور مضامین جو ماہ ناموں اور دیگر جرائد کے ذریعے عام طور پر بہت زیادہ مقبول ہیں اقبال کے اثر سے پُر نظر آتے ہیں۔ مضمون چاہے زندگی کے کسی پہلو پر ہو کہیں نہ کہیں اقبال کے کوئی شعر پر ضرور آ جاتا ہے۔ تنقیدی مضمون کسی پر کیوں نہ ہو اقبال سے مقابلہ یا موازنہ

بغیر آگے نہیں بڑھتا۔ یہ اُن کے قومی نمائندہ ہونے کا سب سے اہم ثبوت ہے اور اُن کی عظیم ادبی اہمیت کا ضامن ہے۔ ان کی شاعری ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں کے لئے بھی زندہ حقیقت ہے مگر ادبی پہلو کیلئے سب سے زیادہ ہدایت اور رہنمائی سے معمور ہے کیونکہ ہر حال شاعری ادب کا ہی ایک شعبہ ہے۔ وہ ادیبوں پر زیادہ سے زیادہ واضح کرتی جا رہی ہے کہ قومی زندگی میں اُن کا کیا مقام اور کیا حیثیت ہے اور قوم کی تعمیر جو مسلسل جاری رہنے والا کام ہے اس میں وہ کیا حصہ لے رہے ہیں۔ جب ادیب زندگی پر نظر کرتا ہے تو اقبال کی آواز آتی ہے ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ — جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ — جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

اور وہ زندگی کو زندگی کی طرح دیکھنے پر راغب ہو جاتا ہے اور سمجھ جاتا ہے کہ سختیاں ہی زندگی کی حقیقت ہیں اور ان سختیوں کی ترجمانی اور ان کا حل پیش کرنا اس کا کام ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی واضح کرتی ہے کہ ادب حصول انفرادیت سے ہے اور ادیب کا کام زمانے کی رو میں بہہ جانا نہیں بلکہ اپنی انفرادیت سے زمانے کو متاثر کرنا بھی ہے اور آواز آتی ہے ؎

ترا جہاں ہے وہی تو جسے کرے پیدا — یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

مخمور سعیدی

غزل

ترے ترکِ تعلق کا ہمیں اب اعتبار آیا — خیال آیا ترا اکثر مگر بیگانہ وار آیا
شکستِ اعتبارِ غم کا عالم کیا بیاں کیجے — ہمیں اپنے نہ ہونے کا نہ تا دیر اعتبار آیا
نگاہِ نازِ بے پروا کبھی سوچا نہ یہ تو نے — کہ کس امید میں تجھ تک دلِ امیدوار آیا
لٹا دی رائیگاں سجدوں میں جبینِ منتظر کب تک — مبارک ہو کہ مسجودِ نگاہِ انتظار آیا
ہمیں مجبورِ عرضِ آرزوئے دل تھے تنہا — سلام اُن کی نظر کا بھی ہمیں بے اختیار آیا
کہاں جائیں نکل کر اس جہانِ دوش و فردا سے — جنہیں کوئی زمانہ بھی نہ اب تک سازگار آیا
ازل سے تا ابد لرزاں مری آواز کے سائے — خدا جانے تجھے کن منزلوں تک میں پکار آیا
ذرا دل کی خطاؤں پر نظر بھی دیکھ اک مجرم — جب آیا سامنے تیرے تو کتنا شرمسار آیا
گزارے عمرِ تنہائی کی راتیں اب کہاں جا کر — کبھی کی بزمِ رنگیں میں کچھ دن جو گزار آیا
متاعِ غم بھی نذرِ یک نگاہِ مہرباں کر دی — دلِ بربادِ غم یہ آخری بازی بھی ہار آیا
گماں گزرے نہ کیا کیا ہم گنہگاروں کو کیا کہیے — بمشکل ہی یقینِ رحمتِ آمرزگار آیا

اسی دنیا میں اپنے روز و شب مخمور اب یہ ہیں
کہ گزری بے کسی کی شب تو روزِ انتظار آیا

عنوان چشتی

روشنی کے سفیر

بجا کہ شہر میں جشنِ نشاط ہوتا ہے !
یہ جام و بادہ و ساقی یہ رقص و رنگ و بہار
یہ ساز و نغمہ و مطرب یہ سیم و زر کی پھوار
لبوں کے جام، حسیں ماہتاب چہروں کے
لبِ ہوس کے لئے ہیں گلاب چہروں کے
سیاہ دائرے میں ارتباط ہوتا ہے

مگر یہ شام کی ویرانیوں کے سائے میں
غموں کی دھوپ میں جلسی ہوئی خوشی کی طرح
خود اپنے کاندھوں پہ اپنی ہی لاش اٹھائے ہوئے
سوچیات میں اک فرضِ منصبی کی طرح
نگارِ صبیح کو دینے لہو کا نذرانہ !
وفا پرست طرحِ دار آدمی کی طرح
قدم قدم پہ سناتے ہوئے پیامِ سروش
کسی پیمبرِ عرفان و آگہی کی طرح

جلا رہے ہیں دلوں کو بنام جذب دروں
چراغِ جاں کی طرح مشعلِ خودی کی طرح
مری طرح ہی یہ دیوانے اجنبی تو نہیں !
سفیرِ روشنیٔ ذہن و زندگی تو نہیں

خان رشید

غزل

یہ کیسی آزمائش ہے یہ کیسا امتحاں اپنا
نہ کوئی رازدار اپنا نہ کوئی ہم زباں اپنا

یہ آئینِ زباں بندی نہ ہوتا تو بتا دیتے
نرالا ہے چمن والوں سے کچھ طرزِ فغاں اپنا

اٹھانے کو اٹھا دو داستانِ نانسے لیکن
تمہی انصاف سے کہہ دو ٹھکانا ہے کہاں اپنا

بھلے اس دل نے آخر کر دیا رسوا زمانے میں
یہ میں نے کیا کیا کس کو بنایا رازداں اپنا

خموشی بھی تو اک فریاد ہے یہ کون سمجھائے
غمِ دوراں نے یوں بدلا ہے اندازِ بیاں اپنا

ترقی اُردو بورڈ کراچی

بچوں کے لئے لکھنے والے مصنفین کے لئے نئے انعامات

انجمن مصنفین پاکستان اور ترقی اُردو بورڈ کراچی کی جانب سے مشترک اعلان سال گزشتہ کی طرح اس مرتبہ بھی بچوں کے ادب پر مبلغ ڈھائی ہزار روپے کے انعامات کا اعلان کیا جاتا ہے۔ یہ انعامات حسب ذیل عنوانات پر موصول ہونے والے بہترین مسودات پر پیش کئے جائیں گے۔

عنوانات

۱ـــــ پانچ سے سات سال تک کے بچوں کے لئے :۔

(۱) کہانیوں کا مجموعہ ــــ مبلغ ۲۵۰ روپے کا ایک انعام

(۲) نظمیں ــــ مبلغ ۲۵۰ روپے کا ایک انعام

(کل ۵۰۰ روپے)

۲ـــــ سات سے نو سال تک کے بچوں کے لئے :

تاریخ، جغرافیہ، فلکیات یا حیوانی زندگی سے تعلق رکھنے والے کسی موضوع پر آسان اور دلچسپ کتابیں

مبلغ ۵۰۰ روپے کے دو انعام

(کل ایک ہزار روپے)

۳ـــــ نو سال سے گیارہ سال تک کے بچوں کے لئے :

طبیعات، نباتیات، میکانیات یا ریاضی سے تعلق رکھنے والے کسی موضوع پر آسان اور دلچسپ کتاب۔ ــــ مبلغ ۵۰۰ روپے کے دو انعام

(کل ایک ہزار روپے)

مسودات، ۳۰ جون ۱۹۶۳ء تک حسب ذیل پتہ پر موصول ہو جانے چاہئیں۔ مسودات مصنف کی ملکیت رہیں گے۔ اگر کوئی ادارہ یا پبلشر ان کو چھاپنا چاہے تو اس کے لئے مصنف سے علیحدہ شرائط طے کی جائیں گی۔ انعامات کی رقم صرف پاکستانی مصنفین کو ادا کی جائے گی۔ مسودات طبع زاد اور پہلے غیر مطبوعہ ہونے چاہئیں۔ انعامات کا فیصلہ ایک کمیٹی کے سپرد ہوگا جس کے ناموں کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ اور اس کمیٹی کا فیصلہ حتمی تصور ہوگا۔

احسان الحق حقی

معتمد اعزازی، ترقی اردو بورڈ۔ اردو منزل، جمشید روڈ۔ کراچی ۵

ــــــــ×ــــــــ


ریحانی
خوش رنگ و خوش ذائقہ اور عام طاقت بخش
مشروب ہے
بیحد مفرح اور نشاط انگیز ہے
دل کی دھڑکن وحشت اور گھبراہٹ کو دور کرتا ہے
قوت ہاضمہ کو حیرت انگیز طور پر بڑھاتا ہے اور خون
صالح پیدا کرتا ہے۔ نقاہت زدہ مریضوں کمزور و
ناتوانوں کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے
ریحانی
خوشرنگ
و
خوش ذائقہ
مشروب
نظامی دواخانہ
کراچی

گلیکسو سے پرورش پانے والے بچے



تندرست، توانا اور ہنس مکھ ہوتے ہیں

تندرست جسم، شاداب چہرہ اور چمکتی ہوئی نگاہیں اس حقیقت کی دلیل ہیں کہ بچہ کی پرورش گلیکسو پر ہو رہی ہے۔ پشتہا پشت سے ہوشیار اور تجربہ کار مائیں اپنے بچوں کے لئے گلیکسو ہی کو منتخب کرتی ہیں۔ یہ خالص اور غذائیت سے بھرپور دودھ نہ صرف ہڈیوں اور دانتوں کو مضبوط بناتا ہے بلکہ بچوں کی نشوونما اور تندرستی کا بھی ضامن ہے۔ عام تازہ دودھ کے برعکس گلیکسو ہر قسم کی آمیزش سے پاک ہے اور بچوں کے نازک معدے اسے بآسانی ہضم کر لیتے ہیں۔

اپنے بچے کو گلیکسو ہی دیجئے۔ گلیکسو سے بچے صحت مند، توانا، خوش اور مطمئن رہتے ہیں۔

گلیکسو

بچوں کو
تندرست و توانا بناتا ہے



گلیکسو لیبارٹریز (پاکستان) لمیٹڈ ۔ کراچی ۔ لاہور ۔ چاٹگانگ ۔ ڈھاکہ

CRAWFORDS

SAQI, Karachi (Pakistan) Regd No. S. 1166







بسم اللہ الرحمن الرحیم

مدیر
شاہد احمد دہلوی
معاون
عاصمہ بیگم

(رکن انجمن ادبی رسائل پاکستان)

جرعات

سالانہ چندہ
مع خاص نمبر
پاک و ہند چھ روپے
قیمت فی پرچہ ۵۰ پیسے

جلد ۲۷ | ساقی، کراچی، بابت اگست ۱۹۶۵ء | نمبر ۲

پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی

پاکستانی شہدائے قاہرہ

ساقی کہاں، وہ رند کہاں، انجمن کہاں   وہ گلفشاں کدھر ہیں، وہ شیریں سخن کہاں
وہ حُسن وہ شباب وہ سرو وسمن کہاں   اربابِ دانش و ہنر و علم و فن کہاں
نوبادۂ جناں، گلِ سرسبدِ گلستاں   دیباچۂ ردائے عروسِ وطن کہاں
برقِ بلا سے جل گئی دنیائے آرزو   باقی نہیں چمن ہی، بہارِ چمن کہاں
یہ ہوتی رہتی ہے نئے قالب میں رونما   ہوتی ہے داستانِ شہادت کہن کہاں
آزادہ رو تھے، قلزمِ رحمت میں جا ملے   لیتے وہ سر پہ منتِ گور و کفن کہاں
پست و بلند و ماضی و حال ایک ہو گئے   محشر میں امتیازِ زمین و زمن کہاں
آخر بتا کچھ اے فلکِ مصر کھو گیا   وہ کاروانِ فلسفۂ و علم و فن کہاں
یہ مرثیہ شہیدوں کا ہے اپنا مرثیہ   دنیائے دل میں تفرقۂ تو و من کہاں
شکوہ ہو کس کا؟ کس سے؟ ہے ایمان ضیق میں   مسلم قضائے رب میں مجالِ سخن کہاں

بس عشرۂ دوم ہی محرم کا یاد ہے   غم کے ہجوم میں حسِ تاریخ و سن کہاں

درویش امین حزیں سیالکوٹی

دو غزلیں

اُف! چھن گیا ہے زورِ بیاں مل نہیں رہا!
وہ دل کہ تھا کبھی! ہے کہاں؟ مل نہیں رہا!!
برسوں سے جوش و ہوش سے کچھ واسطہ نہیں
میں جس جہاں کا تھا وہ جہاں مل نہیں رہا!
وہ مرکزِ نگاہ! وہ فردوسِ خلدِ فکر
اوجھل ہوا نظر سے کہاں؟ مل نہیں رہا!
یہ دشتِ بے گیاہ کہاں سے ٹپک پڑا؟
رضواں ترا وہ خلد کہاں؟ مل نہیں رہا!
دل کے بغیر زیست ہے بے کار ہمنشیں!
آئینۂ زمان و مکاں مل نہیں رہا!
بے تابیوں کا جو تھا کبھی زور گھٹ گیا!
یعنی سُراغِ سود و زیاں مل نہیں رہا!
سینے میں حشر سا ہے بپا اس لئے امیںؔ!
درجۂ سکوں جو تھا، وہی ہاں مل نہیں رہا!!

عیشِ دوزہ کل کا خواب ہے آج!
کل جہاں موج تھی سراب ہے آج!!
جن کی شوخی کی کل تو دھومیں تھیں
بے بسی اُس کی لاجواب ہے آج!!!
نوجوانی! تو یاد آکہ — تری!
شکل و صورت نہ آب و تاب ہے آج!!
جو تمنّا تھی خضرِ منزلِ شوق!
پاشکستہ وہی جناب ہے آج!
خواب شیریں ہے قصّۂ پاریں!
"نیند" کا بوس کا عذاب ہے آج!
تھا گناہِ عظیم جو کل تک —!
کُھلے بندوں وہی ثواب ہے آج!
دل جگر تھے جو زندگی کی اساس
اک لہو دوسرا کباب ہے آج!

تلوک چند محروم

مرزا غالب

بادل ترے نام کا گرجتا ہے ابھی
ڈنکا تری شاعری کا بجتا ہے ابھی
ہر موسمِ گُل میں اے غزل خوانِ بہار
پھولوں سے ترا مزار سجتا ہے ابھی

کب حُسنِ کلام بے اثر جاتا ہے
کام اپنا بے دریغ کر جاتا ہے
شاید ہے ترا سخن نگاہِ خوباں !
جو دل سے تا جگر اُتر جاتا ہے

گو سہل نہیں ترا سمجھ میں آنا
ممتاز ہوا وہ جس نے کچھ بھی جانا
دن رات کی بے خودی کے طالب! تجھ کو
اسرارِ خودی کے عاشقوں نے مانا

آئے ہیں بہت سخن سرا ترے بعد
انداز ترا کسی نہ چل سکا ترے بعد
خونِ دلِ عشاق سے ایثار گیا
اور زندہ ہوا رنگِ حنا ترے بعد

ہر چند تہِ خاک ہے مدفن تیرا
ہمدوشِ ثریا ہے مگر فن تیرا
نغمات ترے ہیں حرزِ جانِ فطرت
فردوسِ ادب میں ہے نشیمن تیرا

رُوداد تری ہر اک فسانے سے الگ　　دیوان ترا ہر نگارخانے سے الگ
مشہور زمانے میں ہے یہ قول کہ ہے　　اندازِ بیاں ترا زمانے سے الگ

دِکھلائے نہیں فقط حسینوں کے ناز　　دل تھا ترا رمزِ بزمِ ہستی کا ساز
سینہ ترا باوجود شغلِ مے و جام　　تھا گنجِ گراں قدر گہر ہائے راز

گلزار سخن سے پھول جو چُنتے ہیں　　بلبل کی نوا میں تری لے سُنتے ہیں
مفہوم ترا سمجھ نہیں پاتے جو　　وہ بھی ترے اشعار پہ سر دُھنتے ہیں

دل دادہ جو تیرے حُسن دیواں کا ہو　　محتاج نہ وہ گل و گلستاں کا ہو!
دیکھے جو تری شگفتگی اس کے لئے　　جنّت گلدستہ طاقِ نسیاں کا ہو

دنیائے سخن ہو گی گلستاں تجھ سے　　لیتے ہیں رنگ و بو غزل خواں تجھ سے
تجھ سے ہیں گرمیٔ نوا کے شُعلے　　خاشاک و خسِ چمن چراغاں تجھ سے

ملّا واحدی

بیدل شاہجہانپوری

۱۹۱۲ء میں مولانا محمد علی جوہر اپنا انگریزی اخبار کامریڈ (ہفتہ وار) کلکتے سے دلّی لائے اور کوچہ چیلان میں میرے مکان کے قریباً سامنے انہوں نے اس کا شاندار دفتر قائم کیا اور اعلان فرمایا کہ اُردو کا بھی روزنامہ (ہمدرد) جاری کروں گا۔

ہمدرد کی چیف ایڈیٹری کے لئے مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی کو بلایا گیا۔ اور جنرل منیجری کے لئے مولوی محفوظ علی بدایونی کو۔ مولوی محفوظ علی اور مولوی ظفر علی خاں بمبئی میں معمولی سا مشترک کاروبار کر چکے تھے جسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ مولانا محمد علی سمجھے کہ مولوی محفوظ علی روزانہ اخبار کا انتظام سنبھال سکیں گے آخر مولوی ظفر علی خاں نے روزنامہ زمیندار کا ڈنکہ بجا دیا، یا نہیں۔ مولوی عبدالحلیم شرر کے متعلق بھی حُسن ظن تھا کہ اتنے عظیم ناول نویس اور انشا پرداز ہیں۔ رسالہ دل گداز (ماہوار) کی ایڈیٹری کر رہے ہیں۔ روزنامہ ہمدرد کی ایڈیٹری کیوں نہ کر لیں گے۔ مگر خیر دونوں کا تجربہ نہیں ہونے پایا۔ ہمدرد کے نکلنے میں دیر لگی۔ اور دونوں انتظار کرتے کرتے تھک گئے اور اپنے اپنے گھر، لکھنؤ اور بدایوں واپس چلے گئے۔ جب تک مولوی عبدالحلیم شرر اور مولوی محفوظ علی دلّی میں ٹھہرے، اکثر شام کو خواجہ حسن نظامی سے ملنے غریب خانے پر تشریف لایا کرتے تھے۔ خواجہ صاحب اُس زمانے میں میرے ہاں رہتے تھے۔ ان دونوں کے ساتھ ایک تیسرے صاحب بھی ہوتے تھے، جن کا اسم مبارک مولوی سید حامد حسین بیدل شاہجہان پوری تھا۔ انہیں مولانا محمد علی نے غالباً بطور اسسٹنٹ منیجر رکھا تھا۔ مولانا محمد علی دوست نواز انسان تھے۔ ہمدرد کے عملے میں شروع شروع مولانا نے دوست ہی دوست بھر لئے تھے۔ مولوی عبدالحلیم شرر، مولوی محفوظ علی اور مولوی حامد حسین بیدل، سب مولانا محمد علی کے بے تکلّف دوست تھے، اور نہایت ذی علم اور قابل۔ مولانا محمد علی کے دوست بے علم اور غیر قابل تو ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ لیکن مولانا محمد علی نے خدا معلوم یہ کیسے خیال کر لیا تھا کہ ہر ذی علم اور قابل شخص اخبار کا ایڈیٹر اور اخبار کا منیجر بھی ہو سکتا ہے۔

بیدل صاحب ہمدرد کے اجراء کے بعد تک ہمدرد سے منسلک رہے۔ پھر اُن کی اور مولانا محمد علی کی نبھی نہیں، اور وہ دفتر ہمدرد سے رخصت کر دیئے گئے۔ میرے ہاں آنا جانا چونکہ کُھل چکا تھا، بیدل صاحب میرے ہاں آ گئے، اور بحیثیت دوست اور مہمان رہنے لگے۔ کام نہ مجھ سے مانگا، اور نہ میں نے دیا۔ بیدل صاحب کس کام کے واسطے پیدا کئے گئے تھے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ بہرحال انہیں کبھی کوئی کام ایسا نہیں میسّر آیا، جس کی بابت کہا جاتا کہ فلاں کام ان کی طبیعت کے مطابق تھا، فلاں کام خوش اسلوبی سے انجام دے دیا۔ بعض گاؤدی قسم کے آدمیوں کو مطابق طبع کام میسّر آ جاتا ہے تو گاؤدی آدمی اسے کامیاب کر لیتے ہیں۔ اور بعض ذی ہوش آدمیوں کو مطابق طبع کام میسّر نہیں آتا تو وہ عمر بھر ناکام رہتے ہیں۔

بیدل صاحب میں دو وصف غیر معمولی ضرور تھے۔ ایک تو اُن کی زبان میں جادو تھا، دوسرے علم مجلسی خوب جانتے تھے۔ اگر ان وصفوں سے تنک مزاجی کا نقص نہ چمٹا ہوتا تو ممکن تھا کہ بیدل شاہجہان پوری جوش بلگرامی کی طرح ہز اگزالٹڈ ہائی نس میر عثمان علی خاں والی ریاست حیدر آباد کے مصاحب بن جاتے، اور اچھی اچھی حیثیت والے اُن کے پیچھے پیچھے پھرتے۔ مگر اس کے واسطے بیدل صاحب کو اوّل خدا جانے کتنوں کے پیچھے پیچھے پھرنا پڑتا۔ یہ بیدل صاحب کے بس کا نہ تھا۔ بس بیدل صاحب میں یہی نقص تھا، جس نے انہیں نوابوں اور راجاؤں تک نہیں پہنچنے دیا۔ بیدل صاحب رئیسوں اور امیروں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اُن کے مراسم اہل علم سے تھے، اور اہل قلم رئیس اور امیر نہیں ہوتے۔ ملک کا ایک ایک شخص جسے اُردو لکھنی آتی تھی بیدل صاحب

کاشنا سا تھا۔ بیدل صاحب اردو کے ہر شاعر اور ادیب کی طرف دل کا تحفہ پیش کرتے ہوئے بڑھتے تھے، اور اردو کا ہر شاعر اور ادیب ان کے تحفہ کو ہاتھوں ہاتھ لیتا تھا اور قدر کرتا تھا۔ ویسی قدر جیسی بیدل صاحب چاہتے تھے اہل دول نہیں کر سکتے تھے۔ اہل قلم اور اہل علم ہی کر سکتے تھے۔ اتنے شاعروں اور ادیبوں سے بیدل صاحب کے تعلقات تھے کہ دوسرے کسی شخص کے شاید ہی ہوں۔

میرا گھر بیدل صاحب کا ہیڈکوارٹر تھا، اور ۱۹۱۲ء سے تادم مرگ ہیڈکوارٹر رہا۔ دن آج اس دوست کے ساتھ اور کل اس دوست کے ساتھ گزارتے تھے۔ رات کو سونے میرے ہاں آجاتے تھے۔ دلی سے باہر کی بھی یہی صورت تھی۔ باہر کے پھیرے لگاتے تھے اور پھر پھرا کر دلی پہنچ جاتے تھے۔ کرایہ کہاں سے لاتے تھے، کپڑے کہاں سے لاتے تھے۔ اللہ ہی کو خبر ہے۔ کپڑے صحیح تراش کے اور اجلے پہنتے تھے۔ لاہور میں مولانا عبدالمجید سالک بیدل صاحب کے خاص دوست تھے۔ سالک صاحب سے ملنے بیدل صاحب لاہور بہت جاتے تھے۔ سالک صاحب نے اپنے احباب کے حالات میں کوئی کتاب لکھی ہے۔ سنا ہے اس میں بیدل صاحب کا ذکر کیا ہے۔ کچھ عرصے بیدل صاحب نے لاہور کے رسالہ مخزن کی ایڈیٹری بھی کی تھی۔ لیکن بہت ہی تنک مزاج تھے۔ ذرا سی خلاف مزاج بات ہوئی اور انہوں نے کہا تو کون اور میں کون۔

۱۹۱۲ء میں مولانا نیاز فتحپوری اور بیدل صاحب ایک دفعہ مولانا ابوالکلام سے ملاقات کرنے گئے۔ مولانا ابوالکلام دلی آئے ہوئے تھے اور حکیم سلام کبیر یا خاں کے ہاں مقیم تھے، جن کا عرف حکیم چھوٹے میاں تھا۔ بیدل صاحب دس پندرہ منٹ بیٹھ کر چلے گئے۔ نیاز صاحب بیٹھے رہے۔ مولانا ابوالکلام نے نیاز صاحب سے پوچھا۔ آپ کا بیدل صاحب سے ملنا کہاں ہوا۔ نیاز صاحب نے کہا۔ بیدل صاحب بھی واحدی صاحب کے مہمان ہیں۔ اور میں بھی۔ مولانا ابوالکلام نے پوچھا، واحدی صاحب سے بیدل صاحب کی ملاقات کب سے ہے۔ نیاز صاحب نے کہا، تین سال سے۔ مولانا ابوالکلام اپنے مخصوص انداز میں بولے، بیدل صاحب سے ملاقات کی عمر تین سال! جس کے معنی یہ ہوئے کہ مولانا ابوالکلام بھی بیدل صاحب کی تنک مزاجی کا تجربہ کر چکے تھے۔ مولانا محمد علی کا قصہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔

حکیم محمد احمد خاں، دلی کے اطبا اور رؤسا میں سب سے زیادہ تنک مزاج تھے۔ اونچے اونچے لوگ ان کے آگے الفاظ تول کر زبان ہلاتے تھے، مگر بیدل صاحب کی تنک مزاجی سے حکیم محمد احمد خاں بھی ڈرتے تھے۔

ایک روز حکیم محمد احمد خاں کے پاس بیدل صاحب تشریف فرما تھے۔ ایک طوائف بھی آگئی حکیم صاحب نے اتفاق سے پان دینے میں طوائف کو مقدم کر دیا اور بیدل صاحب کو موخر۔ بیدل صاحب نے پان نہیں لیا اور فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور کئی دن حکیم صاحب کے ہاں نہیں گئے۔ حتیٰ کہ حکیم صاحب کو آکر منانا پڑا۔

دلی میں ایک طوائف تھی پڑھی لکھی، قبول صورت، اچھا گانے والی اور مالدار۔ وہ بیدل صاحب کی زبان کے سحر سے مسحور ہو گئی۔ نام اس کا یاد نہیں رہا۔ بیدل صاحب نے مجھ سے اور مولانا عارف ہسوی اور خواجہ فضل احمد رشید سے مشورہ کیا۔ میرا ایک مکان خالی تھا۔ میں نے بیدل صاحب سے کہا طوائف کو وہاں لے آئیے۔ مولانا احمد سعید نے نکاح پڑھا دیا۔ میاں بیوی اسی مکان میں رہنے لگے۔ مگر تنک مزاجی نے پھر معاملہ بگاڑا، اور مہینے دو مہینے ہی میں علیحدگی ہو گئی۔

بیدل صاحب باتوں سے بڑے بڑے پڑھے لکھوں کو مسحور کر لیتے تھے۔ مگر تنک مزاجی سحر کا خاتمہ کر دیتی تھی۔ مسحور کرنے کا ایک دلچسپ قصہ سنئے۔ ایک مرتبہ بمبئی سے دلی آرہے تھے۔ ٹکٹ خرید انہیں تھا یا کھو گیا تھا، غرض ٹکٹ تھا نہیں۔ راستے میں پکڑ لئے گئے اور اسٹیشن ماسٹر کے حضور پیش ہوئے۔ اسٹیشن ماسٹر یوپی کا باشندہ تھا۔ اس نے بیدل صاحب کی باتیں اتنی پسند کیں کہ ٹکٹ کو بھول گیا اور بولا آپ کم از کم پندرہ دن میرے مہمان رہئے۔ سولہویں دن گارڈ سے کہہ دوں گا۔ وہ دلی پہنچا دے گا۔ میں اس جنگل میں انسان کو ترس گیا ہوں۔

المختصر بیدل صاحب شگفتگی اور تنک مزاجی کا عجیب و غریب مجموعہ تھے، اور ہمارے زمانے کے نادر حضرات میں سے تھے۔ اللہ مغفرت فرمائے۔

جنگ: تحریر اور تقریر کی مانند گفتگو کرنے کی صلاحیت بھی اللہ تعالیٰ کسی کسی کو دیتا ہے۔ ہر شخص نذیر احمد، محمد حسین آزاد، حسن نظامی اور راشد الخیری جیسا انشا پرداز اور ابوالکلام، بہادر یار جنگ، احمد سعید اور عطاء اللہ شاہ بخاری جیسا مقرر نہیں ہو سکتا۔ مل بیٹھ کر دل موہ لینے والی باتیں کرنے کے ماہرین نے قاری سرفراز حسین، ملک حبیب احمد، نیاز فتحپوری اور بیدل شاہجہانپوری جیسے کم دیکھے ہیں۔

———— X ————

ماہر القادری

غزل

منزلیں ہی منزلیں ہیں کارواں کے سامنے
گرد ہیں لیکن یہ سب عزمِ جواں کے سامنے

میرے شکوے اُس بُتِ نامہرباں کے سامنے
آبگینے جس طرح کوہِ گراں کے سامنے

اب نہیں ہے کچھ بھی سعیٔ رائیگاں کے سامنے
ایک سجدہ پھر بھی اُن کے آستاں کے سامنے

رکھ دئے کس شوخ نے کچھ جھلملاتے سے چراغ
ماہ و انجم کے مقابل کہکشاں کے سامنے

خندۂ گل، گریۂ شبنم، چمن کی دھوپ چھاؤں
کتنے نازک مسئلے ہیں باغباں کے سامنے

چوٹ کھانے کو ترستا ہے بڑی مدت سے دل
لے چلو مجھ کو کسی ابرو کماں کے سامنے

زمزمہ سنجانِ گلشن، خوشنوایانِ بہار
دم بخود ہیں سب مری طرزِ فغاں کے سامنے

—X—

شاہین غازی پوری

غزل

کس کی باتوں میں شبِ غم تو ہے
دل تو دیوانۂ رنگ و بو ہے

خود نگر! حسن ہی سب کچھ تو نہیں
عشق بھی ایک بڑا جادو ہے

تیری بیداد پہ ہنستا ہوگا
میرے مژگاں پہ جو اک آنسو ہے

رات ڈھلتی ہے تو دل دُکھتا ہے
چاندنی میں بھی عجب جادو ہے

کچھ تو کوتاہیٔ دل ہے اپنی!
کچھ مقدر بھی بہانہ جُو ہے

جانے کیا دل کی حکایت ہوگی
آج آنکھوں میں لہو کی بُو ہے

وہ سکوں جس کی تمنا ہے مجھے
اس میں اندازِ رمِ آہو ہے

دل سے الجھو گے تو پچھتاؤ گے
اس دِوانے کی عجب خو بُو ہے

درد ہر رنگ میں رسوا ہوگا
صبح کی جوت پہ کیا قابو ہے

وہ بھی شاہین خدا بن بیٹھا
جس کو سمجھے تھے مروت خُو ہے

—X—


ریحانی
خوشرنگ و خوش ذائقہ اور عام طاقت بخش
مشروب ہے
بیحد مفرح اور نشاط انگیز ہے
دل کی دھڑکن وحشت اور گھبراہٹ کو دور کرتا ہے
قوت ہاضمہ کو حیرت انگیز طور پر بڑھاتا ہے بدن میں
خون صالح پیدا کرتا ہے۔ نقاہت زدہ مریضوں کمزور و
ناتوانوں کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے
ریحانی
خوشرنگ
و
خوش ذائقہ
مشروب
نظامی دواخانہ
کراچی
UNIVERSAL BLOCK
نظامی دواخانہ
فریر روڈ کراچی پاکستان
فون
۵۲۷۳۸

اے۔ نقوی

فیصلہ

رسالہ ختم کرکے اس نے ایک طرف رکھدیا۔ بھائی لوگ کارخانہ جاچکے تھے۔ سارے گھر میں ایک مانوس سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سردیوں کی خوشگوار دھوپ سارے صحن میں پھیل چکی تھی۔ اور اب برآمدے کی سیڑھیوں پر چڑھ رہی تھی۔ اس نے ٹی، کوزی اٹھاکر کیتلی میں جھانکا۔ رہی سہی چائے پیالی میں ڈال کر دوسری قسط شروع کردی۔ نیم گرم چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ اتارتے ہوئے اسے بیحد سکون محسوس ہورہا تھا۔ گملے میں لگے ہوئے پینزی کے پھول اسے سر اٹھائے دیکھ رہے تھے۔ ننھے منے پیارے پھولوں نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ وہ کھسک کر تخت کے کنارے ہوگئی اور پھولوں پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا۔ بے زبان سے یہ پھول اس سے جانے کیا کہنا چاہ رہے تھے۔ اچانک بہت سا وقت گزرنے کا احساس ہوا تو وہ چونکی۔ چائے کے برتن سمیٹ کر وہ باورچی خانہ میں چھوڑ آئی۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی وہ جھنجھلا گئی "کیا حلیہ بنا جاتے ہیں کمرے کا۔!" اس نے بڑی بیزاری سے بکھرے ہوئے کپڑوں کو دیوار میں لگی ہوئی میخوں کے ساتھ لگایا۔ پلنگ کی چادر کی شکنیں درست کرتے ہوئے وہ کمرے کی ہر چیز کو ترتیب دینے لگی۔ اسے بھائیوں کی یہ لاپرواہی ذرا بھی پسند نہ تھی "کوئی چیز بھی تو سنبھال کر نہیں رکھتے۔!" اس نے کتابوں کو سلیقہ سے ریک میں رکھتے ہوئے سوچا۔ کتابوں کی تو ہمیشہ ہی ان کے ہاتھوں شامت آتی رہتی ہے۔ ہر صبح وہ اسکول جانے سے پہلے دونوں کمرے ٹھیک کرتی۔ مگر دوسری صبح تک ہر چیز ان کے بے ڈھنگے پن کی نذر ہوجاتی۔ اس بات پر اس کی اکثر بھائیوں سے لڑائی بھی ہوجاتی۔ مگر وہ کبھی کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر نہ رہنے دیتے۔

"لوگوں کے بھائی ایسے باسلیقہ ہوتے ہیں —— اور ایک یہ ہیں کہ۔!" وہ جل کر کہتی اور جلدی جلدی چیزوں کو ترتیب دینے لگتی۔

دونوں کمرے ٹھیک کرکے وہ ادھورا میزپوش لیکر بیٹھ گئی۔ کتنے دن ہوئے شروع کیا تھا۔ الجھے ہوئے دھاگوں کا سرا تلاش کرتے ہوئے اس نے سوچا۔

سوئی کپڑے میں ڈوبتی ابھرتی بڑے اچھے نقش بناتی جارہی تھی۔ آج کی صبح کتنی ناخوشگوار گزری تھی۔ یکایک اس کے ذہن میں صبح کے واقعات ابھرنے لگے۔ بھائی جان دن بدن کتنے بدلحاظ ہوتے جارہے ہیں۔! جانے انہیں کیا ہوتا جارہا ہے۔ اس کا جی ایک دفعہ پھر اداس ہوگیا۔ صبح ہی صبح انہوں نے سلمان پر کتنی بری طرح چوٹ کر ڈالی تھی۔ حد ہوگئی ہے۔ وہ آہستہ سے کہہ سکی۔ اور جلدی سے پیالی اٹھاکر اس نے ہونٹوں سے لگالی تھی۔ چھوٹے بھیا بھی پیالی میں چائے انڈیلنے لگے۔ جب چائے کناروں سے چھلک کر پرچ میں گرنے لگی تو وہ چونکے۔ تھوڑی دیر کے لئے ماحول پر کربناک سناٹا چھا گیا تھا۔ اور جب اس نے ڈرتے ڈرتے سلمان کی طرف دیکھا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا چہرہ لمحہ بھر کے لئے راکھ کی طرح کا ہوگیا ہو۔ اس نے اپنی پیالی پرچ میں رکھدی تھی۔ جانے کیوں سلمٰی کو محسوس ہوا کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ کر فرش پر گرجاتی۔ اور چکنا چور ہوکر رہ جاتی۔ وہ چند ثانئے کے لئے سلمان کی طرف دیکھتی رہی اور جانے کیا سوچتی رہی پھر خود بخود ہی اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ آج کوئی نئی بات نہ تھی۔ بھائی جان اکثر ہی سلمان کو ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں سنا ڈالتے تھے۔ اسے سلمان پر غصہ آجاتا۔ "حد ہوگئی فرمانبرداری کی۔!"

وہ اپنی صفائی میں کچھ بھی تو نہ کہتا تھا۔ بھائی جان بھی اس کی خاموشی سے خوب فائدہ اٹھاتے اور دل ہلکا کر لیتے۔ پیشانی پر آئی ہوئی بوندوں کو اس نے ڈوپٹے کے پلو سے صاف کیا۔ اور پیالی میں شکر ڈال کر دوسری پیالی بنانے لگی۔ چند لمحوں تک فضا بوجھل سی رہی وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو ماحول پر سنجیدگی کے جو بادل چھا گئے تھے وہ چھٹ چکے تھے۔ بڑے زور و شور سے سیاست پر بحث ہو رہی تھی۔ چھوٹے بھائی اور سلمان ہمیشہ ہی ایک ہو جاتے۔ بھائی جان سے خوب جلی کٹی سنتے رہتے اور ہنستے رہتے۔ بھائی جان کو ان دونوں کے نظریوں سے ہمیشہ ہی اختلاف ہوتا۔ اس وقت بھی وہ خوب زور زور سے بول رہے تھے۔

" ارے بھائیو۔ کچھ کام کی باتیں کرو۔!" وہ بیچ ہی میں بول اٹھی تھی۔ ان کی بحث سن سن کر اسے بڑی کوفت ہو رہی تھی۔ دراصل اسے ایسے موقعہ پر یہی کھٹکا لگا رہتا کہ بھائی جان کہیں زیادہ ہی نہ بگڑ جائیں۔ ان کی گرتی ہوئی صحت نے انہیں کافی حد تک چڑچڑا بنا دیا تھا۔ سوچوں کے درمیان اس کا ہاتھ جانے نامکمل سے خوشنما پھول پر رک گیا تھا۔

"کتنے خوش مزاج ہوتے تھے بھائی جان۔!" کھڑکی کے باہر یوکلپٹس کے درختوں کے جھنڈ کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے سوچا۔ مگر اب تو کاروبار کا رنگ کچھ ایسا لگا تھا کہ ان کی ساری خوش مذاقی کافور ہو کر رہ گئی تھی۔ اور غم روزگار دیمک بن کر ان کی صحت کو چاٹ رہا تھا۔

" آرائش سنگ" اس امید پر کھولا گیا تھا کہ کلیم کا جو معاوضہ ملے گا وہ کارخانہ میں لگا دیا جائے گا۔ اس طرح تینوں مل کر اعلیٰ قسم کا بزنس کریں گے مگر جب معاوضہ کی رقم صرف ایک چوتھائی ملی تو سارے خواب بھائی جان کی آنکھوں سے تردد اور پریشانی بن کر جھانکنے لگے۔ ابھی وہ یہ فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ وہ اس قلیل سی رقم کو آیا کاروبار میں لگا کر کچھ پا بھی سکیں گے یا پتھر کی بے حس مصنوعات اس معمولی سے سرمایہ کو بھی نگل لیں گی کہ کسٹوڈین کے آفس سے مکان کی قیمت فوراً ادا کر دینے کا نوٹس بھی آ گیا۔ وہ دن سب پر ہی بھاری تھے۔ مگر بھائی جان کی سرخ آنکھیں جانے کن خیالوں میں کھوئی رہتیں۔ گم سم چپ چاپ سارا دن دفاتر کے چکر لگا کر شام کو جب وہ تھکے ہارے لوٹتے تو ان کے چہرے پر پریشانیوں کے بکھرے ہوئے سائے ہوتے جو اس سے دیکھے نہ جاتے تھے۔

" گولی ماریئے مکان کو۔!" دسترخوان بچھا کر سلور کی جھم جھم کرتی ہوئی پلیٹیں لگاتے ہوئے وہ کہتی۔

بھائی جان بڑی اداسی سے گہری گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے۔

" کوئی دوسرا مکان کرایہ پر لے لیں گے۔!" چھوٹے بھیا جلدی سے بول پڑتے۔

بھائی جان خلاء میں تکتے رہتے۔

" آج میں نے ایک مکان دیکھ لیا ہے۔ بیحد موزوں اور سستا۔!" سلمان یکلخت چپ ہو جاتا۔

" مگر اس مکان کی چھینیں۔!" بھائی جان کی آواز لرز جاتی اور سب جلدی جلدی نوالے حلق سے اتارنے لگتے۔

ان کی ضد کے آگے کسی کی بھی نہ چلی۔ وہ مُصر تھے کہ یہ مکان ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے جس کی چھتیں دلی والے مکان جیسی تھیں۔ اور ویسے بھی یہ رقم کارخانہ کے مُنہ میں زیرہ کے برابر تھیں۔ رات کو سونے سے پہلے وہ کتنی دیر تک چھت کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے۔ آخر ان کی آنکھیں نم ہونے لگتیں۔ اور جلدی سے وہ لحاف میں منہ چھپا کر سو جاتے۔ بھائی جان کے فیصلہ کو سب نے چار و ناچار تسلیم کیا۔ اور اس طرح آرائش سنگ ان کے جذباتی پن کی بھینٹ چڑھ گیا۔ تینوں سارا دن کارخانہ میں بیٹھے اخبار پڑھتے رہتے یا تاش کی بازی لگائے رکھتے۔ کوئی ایک آدھ بھولا بھٹکا گاہک آنکلتا تو تھوڑے بہت مال کے لئے آرڈر دے جاتا۔

بھائی جان کی اس بدلی ہوئی طبیعت پر اسے افسوس ضرور ہوتا۔ مگر وہ انہیں حق بجانب سمجھتی تھی۔ احساس کی شدت بھی تو انہیں میں تھی۔ گھر کی ساری ذمہ داری کا بوجھ بھی ان پر ہی تھا۔ چھوٹے بھیا اور سلمان تو بے فکرے لاپروا اور ہر وقت خوش باشوں میں سے تھے۔ ان کی اسی بے فکری سے بھائی جان کو چِڑ تھی۔

سوچوں کا یہ سلسلہ جانے کہاں تک طول پکڑتا کہ سیڑھیوں پر قدموں کی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ جب سلمان سامنے نظر آیا تو وہ کچھ پریشان سی ہوگئی۔

"سلمان بھائی۔۔ آج اتنی جلدی کیسے آگئے۔۔!" جیسے ہی سلمان نے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ سوال کر بیٹھی۔

"بس۔ کچھ سر میں درد ہے۔۔!"

وہ جلدی سے اٹھی۔ ہیٹر لگا کر پانی رکھدیا۔ چائے بنا کر اور اسپرو کی ٹکیہ جب وہ لے کر آئی تو سلمان دیوار کی طرف منہ کئے لیٹا تھا۔

"سلمان بھائی۔۔!" اس نے بیحد آہستہ سے کہا۔

"ہوں۔۔!" سلمان نے بغیر مڑے ہوئے کہا۔

"یہ چائے پی لیجئے۔۔!" اس نے چائے کی پیالی میز پر رکھدی۔

سلمان نے چند بڑے بڑے گھونٹ لے کر پیالی پرچ میں رکھدی اور پھر لیٹ گیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھی فریم میں لگے ہوئے پھول کو دیکھ رہی تھی۔ مناسب رنگوں کے امتزاج نے اسے بیحد خوبصورت بنا دیا تھا۔ اس نے ایک دفعہ سلمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس سے کچھ باتیں کرے مگر وہ چپ ہی رہی۔ سلمان منہ پھیرے لیٹا ہوا تھا۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے اس کے پیروں کو دیکھتی رہی جو بوٹوں سمیت کمبل سے باہر پلنگ کی پٹی پر رکھے ہوئے تھے۔ اس نے چاہا کہ تسمہ کھول کر بوٹ اتار دے۔۔ مگر عجیب سی جھجک مانع رہی۔۔ اس کے ذہن میں ان مشرقی عورتوں کا خیال آ رہا تھا جو تھکے ہارے خاوند کے بوٹوں کے تسمے کھول کر اتار دیتی ہیں۔ پھر اس نے فوراً ہی سر جھٹک کر ذہن کو فضول خیالات سے پاک کیا۔ کیسے الٹے سیدھے خیالات ذہن میں آ رہے تھے۔۔ جب کمبل میں سے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آوازیں آنے لگی تو وہ اٹھ کر باورچی خانہ میں آگئی۔۔ چھٹی کا دن کس طرح غارت ہو جاتا ہے۔ مصالحہ پیتے ہوئے اس نے سوچا کتنے ہی پروگرام وہ اس دن کے لئے بناتی مگر کچھ پتہ ہی نہ چلتا کہ اتوار کا دن کس طرح گزر جاتا ہے۔ چھ دن اسکول کی کوڑ مغز لڑکیوں سے سر کھپاؤ اور جب ایک دن آرام کا آئے تو گھر کے الابلا کام اس کی جان کو دوڑے ہوتے۔۔ ہُنہ۔۔! یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ اس نے نفرت سے منہ سکوڑ لیا۔

آج بھائی جان اور چھوٹے بھیا آئیں تو وہ انہیں الٹی میٹم دے دی گی کہ وہ اپنے گھر جلد بسائیں۔ اس سے یہ جھنجھٹ نہیں ہونے کے۔۔! اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا۔

"ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا۔
دور تک یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو۔۔ آئی تھی سمجھانے کو"

بھائی جان چھت کو تکتے ہوئے الاپ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ سلائیوں پر تیزی سے چل رہے تھے۔ بھائی جان کی آواز میں کتنا سوز ہے۔۔! اس نے سوئٹر بنتے ہوئے سوچا۔ جب کبھی وہ دلی والے مکان جیسی چھتوں کو تکتے ہوئے ایسی راگنی شروع کر دیتے تو اس کا دل بھر بھر آتا۔ اس وقت بھی اس پر عجیب سا دورہ پڑنے لگا تھا۔ اس نے سلائیاں ایک طرف رکھدیں۔ انگیٹھی میں پڑے ہوئے کوئلہ راکھ ہوئے جا رہے تھے۔ اس نے راکھ کو کریدا تو ایک دفعہ پھر سے چنگاریاں دہک اٹھیں۔ ذرا سا کھسک کر وہ انگیٹھی کے اور قریب ہوگئی اور دونوں ہاتھ آگے کر دئیے۔ چپ چاپ بیٹھی وہ چنگاریوں کو تکتی رہی۔ جن پر راکھ کی تہ پھر سے جمتی جا رہی تھی۔ کتنی دیر تک وہ بے تکے پن سے وہیں پر بیٹھی رہی۔ بھائی جان لحاف میں منہ دے چکے تھے۔ باہر گلی میں کتے بھونک رہے تھے اور ٹھنڈی ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔

"سو گئے بھائی جان۔۔!" اس کا دل خواہ مخواہ ہی امڈا آ رہا تھا۔

"نہیں تو۔۔!" انہوں نے لحاف سے باہر سر نکال کر تکیہ پر رکھ لیا۔

"کیوں بھی ــ ڈر لگ رہا ہے ــ!"

"خوب ــ!" وہ ہنس پڑی۔

"آپ مشاعرہ میں کیوں نہیں گئے ــ!" اس نے یونہی سوال کر ڈالا۔

"ارے چھوٹو بھی ان مشاعروں میں کیا دھرا ہے ــ!"

"ہُنھ ــ یہ مشاعرے ــ!" اور انہیں دلی کے مشاعرہ یاد آنے لگے ــ وہ ڈری کہ الف لیلہ کے ان افسانوں میں صبح کی اذان ہی نہ ہو جائے۔

"ساڑھے بارہ تو ہو چکے ہیں ابھی تک چھوٹے بھیا اور سلمان بھائی نہیں آئے ــ!" اس نے بات کا رُخ بدلا۔

"آتے ہی ہوں گے ــ" بھائی جان نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اور پھر یکایک چپ ہو گئے۔ اپنے ہاتھ انگیٹھی کی طرف بڑھائے۔ وہ جانے کن سوچوں میں گم ہو گئے تھے۔ وہ غیر ارادی طور پر ان کے ہاتھوں کو تکتی رہی جن میں خون کی سرخی کم ہوتی جا رہی تھی ــ

سلمان بھائی اور چھوٹے بھیا مشاعرہ سے واپس آچکے تھے اب بڑے زور و شور سے ساری روداد سنائی جا رہی تھی۔ بھائی جان مارے جوش کے اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔

"ارے آپ کی بھی غزل کسی نے سنی ــ!" وہ بستر میں لیٹی بڑی دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

"کیوں نہیں صاحب ــ! وہ داد ملی کہ کچھ نہ پوچھئے ــ" چھوٹے بھیا نے بڑے تیز لہجے میں کہا۔

"سلمان بھائی ــ! چھوٹے بھیا ٹھیک کہہ رہے ہیں ــ!" اس نے بے یقینی سے سلمان سے پوچھا۔ سلمان صرف ہنس کر رہ گیا۔ چھوٹے بھیا نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔

اب کسی سعید صاحب کا ذکر ہو رہا تھا ــ وہ بھی شاعر حضرت تھے اور بھائی جان کے نئے دوست ــ بھائی جان سلمان کی چھوٹی سی ڈائری لئے سعید کے اشعار پر خوب سر دھن رہے تھے ــ سلمان اور چھوٹے بھیا ہر شعر کا مذاق اڑا رہے تھے۔ کمرے میں خوب ہنگامہ مچا ہوا تھا۔

"سلمی بہن ــ!"

"جی ــ!" اس نے لحاف کے اندر ہی منہ دیئے ہوئے کہا۔ وہ چھوٹے بھیا کے اس خوشامدانہ طرزِ تخاطب کو اچھی طرح پہچانتی تھی۔

"ایک ایک کپ کافی ملے گی ــ!" ان کے لہجے میں بڑی لجاجت تھی۔ اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر کافی بنا دے۔ اتنی ٹھنڈ میں وہ باہر سے آئے تھے مگر وہ بڑی ڈھٹائی سے لیٹی رہی۔

"نہ بابا ــ!" سلمی نے بڑی صاف گوئی سے کہدیا۔

"ثواب ہوگا" سعید کے کلام پر سلمان اچھی طرح تنقید کر چکا تھا۔ اور بھائی جان اسے باور کرا رہے تھے کہ سعید کا کلام واقعی معیاری شعراء کے پایہ کا ہے۔

"وہ تو صرف تک بندی کرتا ہے" چھوٹے بھیا ابھی تک قائل نہیں ہوئے تھے۔

"ارے یار ــ یہ امیر لوگ شعر و شاعری نہیں کر سکتے۔ ان کے کثیف دماغ تو صرف سکوں کی جھنکار ہی کو محسوس کر سکتے ہیں۔ شعر کی فنی باریکیاں کو تو ہم فاقہ مست ہی جانتے ہیں" سلمان مذاق کے موڈ میں تھا۔

"اچھا تو وہ کافی کا پروگرام ختم ہو گیا" بھائی جان نے سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے کہا۔

"ڈیڑھ بج چکا ہے لڑو ــ چپ چاپ سو جاؤ" سلمی نے اپنی جان بچانی چاہی۔

"اچھا بھئی معاف کیا۔ چلو ہم خود ہی بنا لیتے ہیں۔" سلمان انگڑائی لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"عجیب عادتیں ہیں۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

کافی کا دور چلنے لگا۔

"سنا ہے تیری محفل میں رت جگا ہے۔" چھوٹے بھیا بڑی ترنگ میں تھے۔

بھائی جان اور سلمان کارخانہ کے متعلق کچھ باتیں کر رہے تھے۔ سعید کا بھی ذکر بار بار آ رہا تھا۔ بھائی جان بڑی بشاشت سے باتیں کر رہے تھے۔ البتہ سلمان کی آواز اسے کچھ گھٹی گھٹی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کب سے آنکھیں بند کئے پڑی ہوئی تھی۔ نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ آنکھوں میں کنکریاں سی چبھ رہی تھیں۔ اسے ان پر غصہ بھی آ رہا تھا مگر وہ لحاظ کے مارے کچھ نہ بولی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ ضرور ان سب سے لڑ پڑتی مگر آج تو جانے کیوں اسے بھائی جان پر بیحد ترس آ رہا تھا۔ سعید کا ذکر وہ پہلے بھی سن چکی تھی۔ شہر کا مشہور بزنس مین تھا۔ متعدد مہاجروں سے کلیم خرید چکا تھا۔ کئی بڑی کمپنیوں کا حصہ دار تھا۔ بھائی جان سے خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ چھوٹے بھیا اور سلمان اکھڑے اکھڑے سے رہتے تھے۔ جب بھی اس کا ذکر آتا کچھ نہ کچھ مین میخ نکالتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی سلمان تو مروت کے مارے ان کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا مگر چھوٹے بھیا اچھی طرح مخالفت کے بعد بستر میں جا گھسے۔

"چلئے بھی آؤ گلستن کا کاروبار چلے۔" چھوٹے بھیا نے لحاف میں منہ دیئے تان اڑائی۔

"یار ابھی تو اپنی "کو اپنے کاروبار کی فکر ہے۔" بھائی جان نہایت خوشدلی سے بولے۔ ان کا موڈ سعید کے ذکر ہی سے بہت خوشگوار ہو جاتا تھا۔

"ارے میاں۔ سعید کے سرمایہ کے چکر و کر میں نہ پڑنا۔ کلیم بوگس ثابت ہو گیا تو حضرت کی گاڑی ٹھپ ہو جائے گی۔" چھوٹے بھیا نے ناصح بن کر مشورہ دیا۔ وہ سعید کے متعلق کچھ اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔

"برخوردار تم ابھی ان معاملات کو نہیں سمجھتے۔" بھائی جان چپ رہنے والے نہیں تھے۔

"آج کل بہت سے ایسے گھپلے ہو رہے ہیں جناب۔" چھوٹے بھیا بولے۔

"آس پاس ہی دیکھئے کتنے چوپٹ ہو گئے ہیں۔ امجد صاحب ایک۔ حبیب اللہ خاں دو۔ رئیس احمد صاحب تین اور . . ."

سلمان نے بھی بھائی جان کی مخالفت کی تمہید باندھی مگر ان کی پیشانی پر بل دیکھ کر چپ ہو گیا۔ سلمیٰ کا دل دکھ گیا۔ بیچارہ سلمان کھسیانا سا ہو کر ٹانگ ہلا رہا تھا۔ بیزار ہو کر اس نے کروٹ بدل لی اور آنکھیں بند کر لیں۔

چار افراد پر مشتمل اس چھوٹے سے کنبہ کے لئے سعید فرشتہ رحمت بن کر آیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی کایا پلٹ کر رکھدی۔ گھر کی حالت سدھر گئی۔ "آرائش سنگ" واقعی چمک اٹھا تھا۔ ہزاروں کا کاروبار ہونے لگا تھا۔

"بزنس کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے۔" بھائی جان ٹھیک ہی تو کہتے تھے بعض وقت وہ سوچتی۔ رات گئے وہ گھر آتے۔ سارا دن اس قدر مصروف رہنے کے باوجود وہ بیحد ہشاش بشاش رہتے۔ کھانے پر اچھے اچھے مذاق ہوتے۔ بڑی سنجیدگی سے لطیفے سنائے جاتے۔ اب وہ چھوٹے بھیا اور سلمان سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر نہ الجھتے۔ سلمان کو الٹے سیدھے طعنے نہ سننے پڑتے۔ گھر میں امن ہی امن تھا۔ یہ اور بات تھی کہ سعید نے بیس ہزار کا سرمایہ لگا کر نہ صرف کارخانہ کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ بلکہ خود اس کی بولی بھی دے دی تھی۔ اور اس نے بھی چپ سادھ کر نیم رضامندی دے دی تھی۔ حرج ہی کیا تھا کوئی تو یہ بولی بولتا۔ چلو اچھا ہی ہوا سعید نے فیصلہ کر دیا۔ اس کے بھائیوں کا وہ محسن بھی تو تھا۔ وہ

اکثر سوچتی۔ دُنیا میں بہت کم ایسے لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں کے کام آنے کی کوشش کریں۔ سعید کے لئے اس کے دل میں بے حد احترام تھا۔ بھائی جان کی اس تیزی سے گرتی ہوئی صحت کو اسی نے تو سنبھالا تھا۔ ورنہ غم روزگار نے بری طرح انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ چھوٹے بھیا بظاہر ہنستے مذاق کرتے رہتے مگر وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ان کے دل میں جو غم چھپا ہوا ہے وہ اکثر ان کی سیاہ چمکیلی آنکھوں سے چھلک اٹھتا تھا۔ کاروبار چلنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی تھی۔ سعید واقعی سمجھا ہوا اور تجربہ کار بزنس مین تھا۔ ساتھ ہی انسانیت دوست بھی تھا۔ کتنی جلدی سارے شہر میں کارخانہ کی ساکھ بیٹھ گئی تھی۔ شہر کے باہر سے بھی مال سپلائی کرنے کے لئے آرڈر آنے لگے تھے۔ چیزیں بے حد نفیس اور اعلیٰ بننے لگی تھیں۔ خود اس نے کتنی چیزیں منگوا کر گھر میں سجائی تھیں۔ خوبصورت ڈیزائن والے جپس کے گملے۔ کرسیاں۔ میزیں۔ بطخوں کی شکل جیسے گلدان اور رجانے کیا الابلا۔

کنول کے پھول جیسے کناروں والے گملے پر کہنی ٹکائے کب سے بیٹھی جانے وہ کیا سوچ رہی تھی کہ اچانک قدموں کی چاپ سنکر وہ چونک اٹھی۔۔۔ سلمان جو اپنی قمیض کے بٹن لگوانے چلا آ رہا تھا اس کو اس قدر محو دیکھکر رُک سا گیا تھا۔

"سلمان بھائی۔۔۔!" وہ خیالات کے تانے بانے سے نکلی۔

سلمان قریب آ گیا۔ سلمیٰ کو محسوس ہوا کہ وہ بیحد اداس ہے۔ اس کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔

"کیا بات ہے سلمان بھائی۔۔!" وہ اس کے پریشان بالوں اور اداس آنکھوں کو دیکھے جا رہی تھی۔۔۔ ضرور آج بھی بھائی جان نے کچھ کہا ہوگا۔۔۔ اس نے دل میں سوچا اور اس کا اپنا دل بھی اداس ہو گیا۔ تقسیم نے خاندان کے افراد کو تسبیح کے دانوں کی طرح بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ دو چار جو اکٹھے رہ گئے تھے وہ بھی ایک دوسرے کے دوست نہیں رہ گئے تھے اور سلمان کے ساتھ تو ہمیشہ ہی زیادتی ہوئی ہے۔ اس کا ذہن ماضی میں الجھ گیا تھا

"ذرا قمیض کے بٹن لگا دینا۔" وہ بے حد رکھائی سے بولا اور قمیض سلمیٰ کے ہاتھوں میں پکڑا کر تیز قدموں سے واپس چلا گیا۔۔۔ وہ برآمدے میں دور تک اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔۔ ان دنوں وہ کس قدر اداس اور پریشان رہتا تھا جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ خالی خالی نگاہوں سے خلا میں تکتی رہی۔۔ جوہی کی چند کلیاں مسل کر اس نے غیر ارادی طور پر پھینک دیں۔

اس کے لئے سلمان ایک معمہ سا بنتا جا رہا تھا۔ ہر وقت اداس اور پریشان۔۔۔ کمرے میں بند کچھ لکھتا یا سگریٹ پھونکتا رہتا۔ جب بھی وہ کچھ پوچھنا یا کہنا چاہتی۔ الٹا سیدھا جواب دے کر وہ کھسک جاتا۔۔ ان دنوں اس کے دل میں ہمدردیوں کے کیسے کیسے طوفان پل رہے تھے۔ دل کے جانے کن گوشوں سے محبت کے چشمے اُبل پڑے تھے۔ جوں جوں شادی کے دن قریب آتے جاتے اس کا بے اختیار جی چاہتا کہ گھنٹوں بھائی جان کے پاس بیٹھی انہیں تکتی رہے۔ چھوٹے بھیا کی بے وقت کی راگنیوں کو اپنے ذہن میں اچھی طرح محفوظ کر لے اور سلمان سے اتنی باتیں کرے کہ پھر کہنے کے لئے کچھ نہ رہ جائے۔ مگر سلمان کو تو شاید اس بات کا بالکل احساس ہی نہیں تھا کہ وہ بہت جلد سب سے جدا ہونے والی ہے۔ سلمان کی بے حسی پر اکثر اس کا دل بے حد کڑھتا اور بعض اوقات تو آنکھیں بھیگ جاتیں۔۔ جانے کتنی دیر تک مسلسل آنسوؤں کی بارش ہوتی رہتی۔ اور وہ بے خبر سی بیٹھی رہتی۔ کتنے دنوں سے جدائی کا احساس اسے بے تاب رکھتا۔۔ ویسے تو وہ ہر طرح سے خوش اور مطمئن تھی پھر بھی اسے جانے کیا ہو جاتا۔۔۔

بٹن ٹانکتے ہوئے وہ یہی سوچے جا رہی تھی کہ اس قسم کے چھوٹے موٹے کام اب کون کیا کرے گا۔ سلمان تو ان معاملوں میں اس کا سخت محتاج تھا کوئی معمولی سا کام بھی ہوتا تو اسے کیسی الٹی سیدھی سنا ڈالتے تھے۔۔۔ وہ ان سے الجھ پڑتی۔۔ ناراض ہو جاتی اور اب۔۔ اب۔۔! سوچوں کا یہ سلسلہ منقطع ہوا جا رہا تھا۔۔ آنکھیں دھندلائی جا رہی تھیں اور یادوں کے افق پر ایک بھولی بسری شام الجھ رہی تھی۔۔۔

ابا جو کھلائے سے گھر میں گھسے۔۔۔ اماں بولائی جا رہی تھیں۔ کبھی ایک کمرے میں کبھی دوسرے کمرے میں جا گھسیں۔ اور بڑی حسرت سے بڑے

کمروں کو دیکھتیں کبھی ہاتھوں کو ملتیں اور کبھی سینہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر گہری سانس لیتیں۔ اَبّا کے گاڑھے پسینہ کی کمائی اور اماں کی سلیقہ سے جوڑی ہوئی گرہستی کس طرح آج چھوٹ رہی تھی۔ ان کا بس چلتا تو ایک ایک چیز کو سینہ کے اندر ہی محفوظ کر لیتیں۔ اس نے گھبرا کر کھڑکی کے باہر جھانکا۔ زندگی سے بھرپور اور بارونق سڑک کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ کوئی ویرانی سی ویرانی تھی۔ اسے دہشت سی ہونے لگی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ کھڑکی کے پٹ بند کر دے سڑک کے آخری سرے پر دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں تھک سی گئی تھیں۔ سلمان بھائی کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ یہ وہی سڑک تھی جس کو عبور کرنے کے لئے ابا کی انگلی پکڑے اسے چند منٹ تک کھڑا رہنا پڑتا تھا۔ اور یہ بات اسے بیحد گراں گزرتی تھی۔ سامنے کی دکان میں ہر قسم کی اور ہر سائز کی گڑیاں رنگ برنگے کپڑے پہنے شیشہ کی الماریوں میں سے جھانکتی ہوئی اسے بیحد اچھی لگتیں۔ مگر وہاں تو اتنا بڑا تالا جھول رہا تھا۔ چوک پر کھڑے ہوئے سپاہی کے بے مقصد اشاروں پر چند دن پہلے موٹر، تانگے اور بسیں لائنوں میں رک جاتیں۔ مگر ان دنوں میں سڑکیں کیسی ویران ہو گئی تھیں۔ اس بے کراں سناٹے میں کسی سپاہی کی سیٹی کی آواز گونج جاتی تو دل دہل جاتا۔ کتے بھونکتے تو ان کی آواز کیسی خوفناک لگتی۔ پاس کی گلی سے اس نے گھٹی گھٹی سی چیخ سنی تو اسے ایسا لگا تھا گویا دل حلق میں آن اٹکا ہو۔ اتنی زور زور سے دھڑ دھڑ کر رہا تھا کہ وہ خود بھی سن سکتی تھی۔ مگر وہ تو اسی سمت تکے جا رہی تھی جدھر سے سلمان بھائی واپس آنے والے تھے۔ کھڑے کھڑے اس کے پیر سُن سے ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں بری طرح جلن ہونے لگی۔ اور آہستہ آہستہ ہر چیز آنسوؤں میں ڈوب گئی تھی۔ ابا آوازیں دیتے ہوئے اسی کمرے کی طرف آ رہے تھے۔ وہ کھڑکی کے پٹ کھلے چھوڑ کر باہر آ گئی۔ صحن میں سب لوگ عجیب بے سر و سامانی اور پریشانی کے عالم میں اسی کے منتظر تھے۔ ابا نے لپک کر اس کی انگلی پکڑ لی۔ اور سب ان کے پیچھے باہر نکل گئے "ابا مگر سلمان بھائی!" اس کی آواز شاید حلق ہی میں ڈوب گئی تھی کسی نے بھی تو اس کی بات کا نوٹس نہ لیا تھا۔ ابا بہت تیز چل رہے تھے۔ وہ ان کو اپنے ساتھ گھسیٹ رہے تھے۔ چپل پہنے ہوئے ان کے پیر اسے عجیب سے لگ رہے تھے۔ شاید وہ بوٹ پہننا بھول گئے تھے۔ ایک گلی کے موڑ پر اس نے مڑ کر دیکھا شاید کہیں سے سلمان بھائی اس قافلے کے ساتھ آ ملے ہوں۔ بھائی جان اس کے عین پیچھے تھے۔ اسے بڑا سہارا ملا۔

"بھائی جان۔ سلمان بھائی!" وہ رندھے ہوئے گلے سے تقریباً چیخ پڑی۔ بھائی جان نے جانے اس کی بات کو سنا کہ نہ سنا مگر ابا نے زور سے اسے گھسیٹا۔ "اس ایک کے پیچھے ہم سب کا قیمہ بنے گا۔" ان کے لہجے میں عجیب سی گھبراہٹ اور لرزش تھی۔ امڈتے ہوئے آنسو اس کی آنکھوں ہی میں ٹھہر گئے تھے۔ ویران گلیوں اور سنسان راستوں پر سے گزرتے ہوئے وہ سب ایک بڑے میدان میں آئے۔ جہاں اسی طرح کے اور بہت سے قافلے بکھرے ہوئے تھے۔ یہاں ہر شخص اسے بیحد گھبرایا ہوا اور پریشان معلوم ہو رہا تھا۔ شاید یہی حشر کا میدان ہوگا جس کے متعلق اس نے اپنی دینیات کی کتاب میں پڑھا تھا کہ باپ کو بیٹے کی فکر نہ ہوگی۔ بھائی کو بھائی کی۔ اسی لئے تو شاید سلمان بھائی کی کسی کو خبر نہ تھی۔ ابا تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس میدان کے وسط میں آئے۔ جہاں ایک بڑا سا جہاز کھڑا تھا۔ ابا نے اپنے لمبے لمبے مضبوط بازو پھیلا کر راستہ بنایا۔ آگے بڑھتے لوگوں کو پیچھے دھکیلا اور سب ہڑبڑا کر جہاز کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگے تھے۔ وہ بھی جلد کسی سے اندر گھس گئی اور اس طرح جہاز پر بیٹھنے کا ارمان پورا ہوا۔ کسی کے بوٹوں کے نیچے اس کا پیر کچل گیا بہت اسے احساس ہوا کہ ایک پیر کا چپل تو کہیں راستہ ہی میں رہ گیا تھا۔ درد کی شدت سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ آنسوؤں کو اس نے جلدی جلدی فراک کے دامن سے صاف کیا۔ ادھر ادھر دیکھا شاید اسی ہجوم میں سلمان بھائی بھی ہوں۔ مگر سب ہی تو نئی اور اجنبی شکلیں تھیں۔ جہاز جب حرکت کرنے لگا تو اس نے ایک دفعہ پھر سے سب کو یاد دلایا اور "سلمان بھائی" کہہ کر زور زور سے رونے لگی تھی۔

"وہ بھی آ جائے گا۔" ابا نے اس کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرا اور زور سے سسکی لی۔ اس نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا۔ دو موٹے موٹے آنسو ان کی پلکوں پر لرز رہے تھے۔

کئی سال گزرنے کے بعد ایک دن سلمان بھائی جانے کہاں سے آ ٹپکے۔ جب وہ اکیلی ہوتی اور سلمان پاس آ بیٹھتا تو اسے یہی خوف لگا رہتا تھا کہ وہ

اسے یوں چھوڑ کر آ جانے کا طعنہ نہ دے۔ اسی نے تو ان کو شیلا کے گھر کہانیوں کی کتاب لینے کے لئے بھیجا تھا۔ مگر سلمان نے کبھی اس قسم کا کوئی ذکر نہیں چھیڑا تھا۔ بہت سا وقت گزرنے کا اسے اچانک احساس ہوا تو وہ قمیض ہاتھ میں لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا جی چاہا کہ سلمان سے کہہ دے کہ اب وہ پھر اسے چھوڑ کر جانے والی ہے۔ اس خیال ہی سے اس کا دل بے حد اداس ہو گیا تھا۔ کمرے کے دروازے کو اس نے آہستہ سے کھولا۔ سلمان پلنگ پر لیٹا سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہا تھا اس کی نگاہیں چھت پر جمی ہوئی تھیں۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی وہ اس کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

"سلمان بھائی۔ یہ قمیض لے لیجئے۔"

"کرسی پر رکھ دو۔" سلمان نے بغیر اس کی طرف دیکھے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے سے اجنبیت اور بے حسی ٹپک رہی تھی۔ جیسے اس سے انہیں دور کا تعلق بھی نہ ہو۔ سلمان بھائی کے اس سرد رویہ پر اسے بڑی چوٹ لگی اور اس کی آنکھیں خود بخود ہی بھیگ گئیں۔

سگریٹ کا دھواں فضا میں تحلیل ہو رہا تھا وہ بے مقصد دھوئیں کو دیکھتی جا رہی تھی۔ بعض چیزیں کتنی بے حقیقت ہوتی ہیں۔ اس نے سوچا۔

کتنی دیر تک وہ یونہی بے حس سی کھڑی رہی۔ سلمان کی اس بے رخی کے باوجود اس کا وہاں سے جانے کو جی نہ چاہا۔

"سلمان بھائی۔ طبیعت تو ٹھیک ہے!" اس نے فضا بدلنے کے لئے کہا۔

"شکریہ!" سلمان نے اسے بڑی گہری نگاہوں سے دیکھا۔ وہ سر سے پاؤں تک لرز گئی۔۔۔ ان نگاہوں میں کتنی گہرائی تھی۔ شکایتوں کی کتنی بڑی داستان تھی۔۔۔!

"آج یہاں آنے کی کیسے فرصت مل گئی۔۔!"

"کیوں۔۔!" سلمیٰ کو کوئی جواب نہ سوجھا۔

"آج کل ذرا مصروفیت زیادہ رہتی ہے۔ ذہنی طور پر بھی اور۔۔!"

وہ یکلخت چپ ہو گیا جیسے کوئی ایسی بات کہہ دی ہو جو وہ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ سلمیٰ کا جی چاہا کہ کہہ دے اس مصروفیت کے باوجود کسی وقت بھی تم لوگوں کا خیال دل سے نہیں نکلتا۔ کہیں اور جا کر بھی جانے کس طرح چین آئے گا۔ مگر فرط حیا سے وہ کچھ نہ بول سکی۔ نگاہیں جھکائے ناخنوں سے کھیلتی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے نگاہیں اٹھائیں تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سلمان اسے عجیب طرح دیکھے جا رہا تھا۔۔۔ وہ دل ہی دل میں کانپ اٹھی۔

"سلمان بھائی۔۔!"

"سلمیٰ۔۔!"

سلمیٰ کا جی چاہا کہ سلمان کے ہاتھ کو آنکھوں پر رکھ کر زور سے رو دے۔ برسوں کا ساتھ چھوٹ رہا تھا۔ وہ بھی تو اس قدر افسردہ نظر آ رہا تھا اس کا یہ خیال کس قدر فضول تھا کہ بھائیوں کو اس کے چلے جانے کی کوئی پروا نہیں تھی۔ سلمان کو اتنا اداس دیکھ کر اس کے دل سے یہ شکایت جاتی رہی تھی کہ بھائی جان اور چھوٹے بھیا کو کارخانہ سے فرصت نہیں ملتی اور سلمان کو اپنی کہانیوں سے۔۔ سلمان کی پرنم آنکھیں دیکھ کر اُسے ایک گونہ تسکین سی ہوئی۔

"کارخانہ اب کیوں نہیں جاتے۔۔!" وہ ان نگاہوں کی شدت سے گھبرائی سی جا رہی تھی۔

"میرا اب وہاں کیا کام۔۔!"

"کیوں۔۔؟" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ اس کا جی چاہا کہ کہہ دے کہ جب کام ٹھپ پڑا ہوا تھا تو تم تینوں وہاں سارا دن ڈنٹے مکھیاں مارتے رہتے تھے۔ جب کام چل گیا ہے اور زیادہ سے زیادہ کارکنوں کی ضرورت ہے تو تم کمرے میں بند ہو کر اوندھی سیدھی کہانیاں لکھتے رہتے ہو۔ بھائی جان کی ناراضگی بجا ہی تو تھی۔ مگر سلمان کی نگاہوں میں بلا کی وحشت اور ویرانی تھی۔

"میں اب اس گھر سے بھی چلا جاؤں گا۔" سلمان کے لہجے میں دکھوں کا ایک جہان آباد تھا۔ سلمیٰ کو اپنا دل ڈوبتا سا محسوس ہوا۔ اس کا جی چاہا کہ کہدے میرے جانے کے بعد جائیے گا۔ ابھی نہیں۔ تھوڑے ہی سے دن تو رہ گئے تھے۔ مگر وہ کچھ نہ بول سکی۔

"سلمیٰ ۔! میں تمہیں کس قدر غلط سمجھا۔" اس نے ایک گہرا کش لے کر بہت سا دھواں فضا میں چھوڑ دیا۔ لمحہ بھر کے لئے اس کا چہرہ دھوئیں کی اوٹ میں ہو گیا۔

"کیا ؟" اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"مگر غلطی تو میری ہی تھی۔ شاندار بنگلے۔ چکیلی موٹریں اور زرق برق کپڑے کتنے اچھے نہیں لگتے۔ میں تمہیں سوائے ایک پُرخلوص دل کے کیا دے سکتا تھا۔ میرے ساتھ تم بھی دکھ اور تکلیف سہتیں۔ دنیا کی نعمتوں سے محروم رہتیں۔ اچھا ہوا جو تم نے اپنی جھلمل کرتی ہوئی منزل خود تلاش کر لی۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ جس راستہ کو چاہے اپنائے۔"

سلمیٰ سُن سی ہو گئی۔ سلمان کے لہجے میں طنز کے چھپے ہوئے تیر تھے۔

"مگر ۔!" اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"تم نے ٹھیک سوچا ہے۔" سلمان نے ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ خالی خولی الفاظ پیٹ نہیں بھر سکتے۔ میری جھوٹی سچی کہانیاں تمہارے جسم کے لئے لباس نہیں مہیا کر سکتی تھیں اور ۔ اور میرا پاگل دل تمہیں کیڈلک میں بٹھا کر سیر کے لئے نہیں لے جا سکتا تھا۔ ہائی سوسائٹی۔ کلب۔ رقص گاہیں ایک لستنے اچھے ممبر سے محروم رہ جاتیں۔" سلمان تیز تیز بول رہا تھا۔ اس کی آواز میں لرزش اور چہرے پر گہرا کرب تھا۔

"سلمان بھائی ۔! لیکن یہ سودا تو میں نے تم لوگوں کی خاطر منظور کیا تھا۔" سلمیٰ روہانسی سی ہو رہی تھی۔

"یوں کہو کہ سِکّوں کی مدھر جھنکار پر تم نے ایک پُرخلوص دل کو بھینٹ چڑھا دیا۔ چکیلی لمبی کار کے پہیوں کے نیچے تم نے اس جسم کو کچل دیا جس نے تمہاری خاطر ہر دکھ جھیلا۔ ہر تکلیف برداشت کی۔ تم نے دولت کا سہارا لے کر اس ذہن کو نظر انداز کر دیا جو تمہیں چاہتا تھا ۔ پوجتا تھا اور ۔!"

"سلمان بھائی ۔! خدا کے لئے چپ ہو جائیے ۔!"

سلمیٰ نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ رکھ لئے۔ کمرے میں ایک کربناک سناٹا چھا گیا۔

سلمان نے اس کے دونوں ہاتھ چہرے پر سے ہٹا کر پکڑ لئے۔

سلمیٰ لرز کر رہ گئی۔ اس نے آہستہ سے اپنے ہاتھ چھڑا لئے۔

"سلمیٰ ۔!" سلمان نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ پکڑ لیا۔

"خدا کے لئے سلمیٰ تم انکار کر دو ۔! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ۔!" سلمان کی آواز بے حد بوجھل ہو رہی تھی۔

سلمیٰ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ یہ وہ سلمان نہ تھا جو بھائی جان کی جلی کٹی سنتا۔ ہنستا مسکراتا رہتا۔ یہ وہ سلمان نہ تھا جو کمرے میں بند ہو کر الٹی سیدھی کہانیاں لکھتا تھا۔ اس کی آنکھ چشم آدم تھی جو اس وقت صرف حوا کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے لرز کر آنکھیں بند کر لیں ۔ اور کرسی کا سہارا لے لیا۔ اسے اپنی نگاہوں کے سامنے سرخ و سفید دھبے ناچتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ سلمان نے صرف اپنی کیفیت ہی نہیں بیان کی تھی بلکہ اس کے دل پر ہمدردی کا جو غلاف چڑھا ہوا تھا وہ بھی اتار پھینکا تھا ۔ لاشعوری طور پر وہ بھی سلمان کو کس قدر پسند کرتی تھی اس کا احساس اب اسے ہوا تھا۔ اس کے دل نے اسے کتنا بلند مقام دے دیا تھا۔ اور اپنی سادگی سے وہ جس چیز کو محض ہمدردی سمجھ رہی تھی۔ اب اسے پتہ چلا کہ وہ ہمدردی سے بلند کوئی چیز تھی ۔ مگر اب ۔ اب ۔ کیا ہو سکتا تھا ۔! اب تو وقت کی کمان سے تیر نکل چکا تھا۔ سلمان نے جتنی آسانی سے اسے انکار کا مشورہ دے دیا تھا۔ انکار کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ اپنے آرام اپنے سکون کی خاطر سارے کنبہ کا سکون تباہ کرنا کچھ ہنسی کھیل نہیں ۔ کیا سلمان کو یہ معلوم ہے ۔؟ سو نہ دو سو

لویے جیسی ہزار کی دین داری ہے اگر انکار کر دوں تو کیا سعید سے گلو خلاصی ہو جائے گی ۔ انکار کے بعد جو کچھ ہوگا اس کے تصور ہی سے سلمیٰ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جیل کی کال کوٹھری اور لمبی سزا ۔ گھر بار اور اثاثہ کی ضبطی ! سلمان نے ان سب باتوں پر شاید غور نہیں کیا۔ اپنی خوشی کے لئے انسان سب کی مسرتوں کو پامال کر دے۔ ایسے آدمی اور ایک وحشی درندے میں کیا فرق ہے؟ دوسروں کی خوشیوں اور سکون کا خون چاٹ کر اپنی تسکین ۔! اس کی نگاہ میں ایک کوندے کی طرح سلمان کا سراپا لپکا ۔ ایک لحظہ کے لئے اس نے دیکھا اور دل ہی دل میں آنکھیں پھیر لیں ۔ اب وقت نکل چکا ہے ۔!

اسے یکایک عجیب سا احساس ہوا۔ ابھی ذرا دیر پہلے اس کے دل پر جو سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے وہ چشم زدن میں چھٹ گئے۔ اور اس کا بوجھل دل ہلکا ہو گیا۔

اس نے میز پر سے سر اٹھایا کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل رہا تھا ۔ اس نے آنکھیں خشک کیں اور باہر آ گئی۔

سلمان کے قدموں میں سگریٹ کے بے شمار ادھ جلے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ وہ اس کے قریب جا کر رک گئی۔

"سلمان بھائی ۔!"

سلمان چونک کر پلٹا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا اور رنگ بے حد زرد تھا۔

سلمیٰ کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے جذبات اور الفاظ ایک دوسرے کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔

"کیا ہے تمہارا فیصلہ ۔ ؟" سلمان نے آگے بڑھ کر اس کا آنچل تھام لیا ۔ اس کی آواز میں بے حد لرزش تھی۔

"سلمان بھائی ۔! میرا کیا فیصلہ ہوتا ۔ میری حیثیت بساط کے اس مہرے سے مختلف نہیں جس کی گردش کا دارومدار شاطر کی چال پر ہوتا ہے ۔ پہلے بھی میرا کوئی فیصلہ نہیں تھا اور ۔ اب تو کیا ہو سکتا ہے ۔!"

سلمان کے ہاتھ سے اس کا آنچل چھوٹ گیا ۔ اس نے ایک نگاہ سلمیٰ پر ڈالی ۔ وہ بے حس و حرکت خاموش سی کھڑی ہوئی تھی۔ اسے یوں لگا کہ جیسے وہ بھی چونے سیمنٹ اور ریت کا بنا ہوا ایک مجسمہ ہو جسے سعید نے اپنے ڈرائنگ روم کی زینت کے لئے کارخانہ میں تیار کروایا ہو۔ اس کی خاموش جھکی ہوئی نگاہیں اس سے جانے کس بات کی شکایت کر رہی تھیں ۔ سلمان نے گردن جھکا لی اور تیز قدموں سے کمرے سے باہر نکل گیا ۔!

X

ڈاکٹر معز الدین

بنگالی اور اردو

بنگالی اور اردو کا رشتہ صدیوں کا پرانا ہے۔ نہ اردو بنگالی کے لئے اجنبی ہے اور نہ بنگالی اردو کے لئے۔ بنگال کی سرزمین اپنی بساط بھر اردو کو ہمیشہ سے اپنے دامن میں سمیٹے رہی ہے۔ سچ پوچھئے تو جان پہچان کا یہ سلسلہ اردو زبان کے ابتدائی دور سے ہی جاری ہے۔ آٹھویں صدی ہجری سے ہی بنگال میں شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ دسویں صدی ہجری میں بنگال کا سلطان حسین شاہ بڑا ادب نواز سلطان گزرا ہے۔ اس کے عہد میں بنگالی اور اردو دونوں زبانوں کو فروغ حاصل ہوا۔

اگر ایک طرح مبلغین اسلام کے ذریعہ اردو بنگال میں لوگوں کے دلوں میں اترتی رہی تو دوسری طرف برطانوی عہد حکومت میں اردو کو عیسائی مذہب کی تبلیغ کے لئے بھی استعمال کیا گیا۔ یہاں اردو نہ صرف روزمرہ کے کاروبار کے لئے استعمال ہوتی رہی ہے۔ بلکہ جلسہ میں انجمنوں اور علمی اداروں میں تقریریں ہوتی رہیں۔ مسجدوں میں واعظ و خطیب اردو ہی کا سہارا لیتے اور محفل میلاد میں اردو لوگوں کے دلوں میں عقیدت رسول پیدا کرتی رہی۔ امرا اور عوام دونوں میں اردو کا استعمال عام تھا۔ بنگالی تو یہاں کی خاص زبان رہی ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کا بنگالی کے ساتھ اختلاط اور ارتباط کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ عرب، مصر، ترکی وغیرہ ممالک سے تجار، درویش اور مذہبی پیشوا یہاں آتے، لوگوں سے ملتے۔ اپنی بولی ان کو سناتے اور ان کی زبان کا خود بھی اثر قبول کرتے۔ اس طرح اردو اور بنگالی کا رشتہ اور مضبوط ہوتا گیا۔ بنگالی پوتھی ادب میں عربی، فارسی اور اردو کے بے شمار الفاظ ملتے ہیں۔

نشاۃ ثانیہ کے تحریک ودیا ساگر، رام موہن رائے اور کیشب سین کی قیادت میں آگے بڑھی۔ اس دور میں سنسکرتی اثرات زیادہ نمایاں ہوئے۔ مگر ۱۹۱۱ء میں بنگال کی عارضی تقسیم کے بعد مسلمانوں نے اپنی ادبی تحریک شروع کی۔ اور سنسکرتی اثرات کم کرنے کی جد و جہد کی۔ بنگالی زبان کو عربی رسم الخط میں لکھنے کی کوشش بھی ہوئی اور سنسکرت کی جگہ فارسی اور اردو کے الفاظ کو ترجیح دی گئی۔ اس طرح اسلامی بنگالی کی تحریک ہوئی۔ "مسلم بنگیو شاہتو سمیتی" کی تحریک جس میں قاضی نذر الاسلام اور قاضی عبدالودود وغیرہ شامل تھے زور پکڑنے لگی۔ بنگالی زبان میں قرآن حکیم کے متعدد ترجمے ہوئے۔ قصص الانبیا، یوسف زلیخا، شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، الف لیلہ وغیرہ داستانیں بنگالی میں منتقل ہوئیں۔

بنگالی مسلمان عربی، فارسی اور اردو کو شروع ہی سے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد اردو بولنے والوں کی کثیر تعداد یہاں آئی جن کی بدولت دونوں زبانوں کا میل ملاپ اور بڑھا۔ قومی یک جہتی اور وحدت کا تقاضا تھا کہ دونوں زبانیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوں۔ جس طرح بنگالی میں اردو ادب کی قابل قدر تصانیف ترجمے کے ذریعے منتقل ہوتی رہی ہیں، اسی طرح اردو ادیبوں اور شاعروں نے بھی بنگالی زبان کے ادبی سرمائے کو اردو ادب میں سمیٹنے کی باضابطہ کوشش کی ہے۔ فکری ہم آہنگی کے لئے یہ ضروری ہے کہ دونوں بازوؤں کے ادیب و فنکار میں ذہنی ارتباط ہو۔ کسی قوم کے اندرونی اختلافات کو دور کرنے کا ایک بہترین ذریعہ یہ بھی ہے کہ ایک علاقہ کے ادبی سرمایہ سے

دوسرے علاقے کو روشناس کرایا جائے۔ قومی وحدت کی تعمیر میں یہ اقدام نہایت خوش آئند ہیں۔ اور یہ امر قابلِ تسکین ہے کہ اردو زبان کے شاعر اور ادیب نہ صرف یہاں کے پرسکون ماحول، دلکش مناظر اور رومان پرور فضا سے متاثر ہوئے ہیں، بلکہ اس قلیل عرصے میں جہاں تک ممکن ہو سکا ہے، ان لوگوں نے بنگالی ادب کے قیمتی جواہر پاروں سے اپنے ادب کے خزانے کو مالا مال کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ان کی یہ ادبی کاوش ادب کی کسی مخصوص صنف تک محدود نہیں رہی بلکہ یہ ناول، افسانے، ڈرامے، شاعری ہر صنفِ ادب کی طرف متوجہ ہوئے۔

پاکستان کی علاقائی زبانوں کا اپنا الگ ادبی سرمایہ ہے جو آہستہ آہستہ اردو ادب میں داخل ہو کر قومی وحدت اور فکری آہنگ میں معاون ہو رہا ہے۔

اب آیئے ذرا ان ادبی سرمایوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔ ادارۂ مطبوعات پاکستان، ماہِ نو، افکار، ساقی، بنگالی اکیڈمی اور دوسرے ادارے اور رسائل قابلِ تحسین ہیں جنہوں نے نہایت ذمہ داری اور پوری دلچسپی کے ساتھ اس کام کو آگے بڑھایا ہے۔ ادارۂ مطبوعات پاکستان نے ایک کتاب "خیابانِ پاک" شائع کی جس میں بنگالی، سندھی، پنجابی، پشتو، بلوچی اور کشمیری شاعری کا انتخاب کر کے انہیں اردو کا جامہ پہنایا۔ دولت قاضی، علاول، قاضی نذر الاسلام کے منتخب کلام کا اردو ترجمہ پیش کر کے بنگالی کو مغربی پاکستان کی علاقائی زبانوں سے قریب لائے۔ اب خوشحال خاں خٹک، شاہ عبداللطیف بھٹائی، رحمٰن بابا اور سچل سرمست کے ہمدوش کیقباد، نذرل اور جسیم الدین بھی ہیں۔ اسی طرح مشرقی بنگال کا "پوتھی" ادب بنگال کی قومی داستان کا لازوال سرچشمہ ہے۔ اس کے ذریعہ ہم بنگال کے عوام کی روح تک پہنچ جاتے ہیں۔ "ثقافتِ پاکستان"، "ارمغانِ پاک" اور "نوائے پاک" اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

ڈاکٹر انعام الحق کی کتاب "مسلم بنگالی ادب" کا اردو میں ترجمہ ہوا ہے۔ اس میں بنگالی زبان اور ادب کی تاریخ اور اس کی عہد بعہد ترقی میں مسلمانوں کے کارناموں کا نہایت تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ اسی طرح احسن احمد اشک اور یونس احمر نے براہِ راست بنگالی سے اردو میں ترجمہ کر کے پچھلے چھ سو سال میں مسلمان شعراء نے بنگالی ادب میں جو بیش بہا اضافے کئے ہیں ان کا ایک انتخاب عہدِ قدیم سے دورِ حاضر تک پیش کیا ہے۔ ادارہ مطبوعات پاکستان ہی کی جانب سے قاضی نذر الاسلام کی منتخب شاعری کا منظوم اردو ترجمہ "صورِ اسرافیل" کے نام سے ہوا۔

عبداللہ، بنگالی زبان کے مشہور ناول کا ترجمہ اردو میں ہوا۔ اس کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے دونوں حصوں کا تاریخی ارتقا کس طرح ایک ہی نہج پر ہوا۔ اور ہم ایک دوسرے سے کتنے قریب ہیں۔

"خونِ جگر ہونے تک" فضل کریم فضلی کا ناول طبعزاد ہے۔ مگر اس ناول کے کردار، اس کا ماحول، بلکہ پوری فضا بنگال ہی کی ہے۔

اردو کو بنگالی سے قریب لانے میں، یونس احمر، افسر ماہ پوری، سلیم اللہ فہمی، احسن احمد اشک، عابد ناپوری، کلیم اللہ فہمی، سعد منیر، رفیع احمد فدائی، اقبال عظیم، وفا راشدی، اے ڈی اظہر وغیرہم کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

جسیم الدین کے کئی بنگالی ڈراموں کے ترجمے اردو میں ہو چکے ہیں۔ عاصمہ حسین نے ان کا ایک ڈرامہ "بنسری" کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ اور حبیب فاطمی نے بھی چند بیش بہا ترجمے کئے ہیں۔

بنگالی زبان و ادب کی تاریخ اردو میں ڈھاکا یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے مترجم مولوی عبدالرحمٰن بیخود ہیں۔

بنگالی افسانوں کے ترجمے بھی اردو میں کثرت سے ترجمہ ہوئے ہیں۔ شوکت عثمان، ابوالفضل، محبوب العالم، علاء الدین آلآزاد، حسن حفیظ الرحمٰن وغیرہ کے افسانے خاص طور سے اردو میں پسند کئے گئے ہیں۔ پروفیسر سعد منیر نے ابوالفضل کے افسانے "ماٹیر پرتھوی" کا ترجمہ "مٹی کا سنسار" کیا ہے۔ اور محبوب العالم کے خود نوشت سوانحی ناول "مومنر جبان بندی" کا ترجمہ "مجھے اعتراف ہے" کے نام سے اور شوکت عثمان کے "جونو آپا" کا ترجمہ "زینی آپا" کے نام سے پیش کیا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ جتنے ترجمے اردو میں منتقل ہوئے ہیں وہ سب کے سب بنگالی زبان کے شاہکار ہیں۔ اس لئے کہ کتابوں کے انتخاب میں ذاتی پسند اور ناپسند کو بڑا دخل ہے۔ تاہم یہ اقدام بجائے خود قابل تعریف ہے۔

ابھی حال میں افسر ماہ پوری نے نذرالاسلام کی اسلامی نظموں کا منظوم ترجمہ جام کوثر کے نام سے پیش کیا ہے۔ ان کے علاوہ اردو کے شاعر و ادیب شعوری اور غیر شعوری طور پر بنگال کی سرزمین اور یہاں کے ادب سے دلچسپی لے رہے ہیں اور اپنی نظموں اور غزلوں میں مقامی رنگ بھر رہے ہیں۔ مخمور اکبرآبادی کی نظم "مشرقی بنگال کا ملاح" اور "بوڑھی گنگا کے کنارے شفق کا منظر" یا جمیل الدین عالی کے چند دوہے خاص بنگال سے متعلق ہیں۔

ابن انشا کی کتاب "بنگال میں اجنبی" اور دوسرے ادیبوں کے بنگال کے سفرنامے شاہد ہیں کہ سرزمین بنگال نے ہمارے ادیبوں کو کس طرح لبھایا ہے۔ شاہد احمد دہلوی نے "ساقی" کا "مشرقی پاکستان نمبر" شائع کر کے مشرقی پاکستان کے ماحول اور ادب کو مغربی پاکستان والوں سے روشناس کرایا ہے۔ ان کی یہ کاوش قابل صد تحسین ہے۔

یہ فہرست بہت طویل ہو سکتی ہے اور گو "حکایت لذیذ" ہے۔ مگر "دراز تر" کہنے کی گنجائش نہیں۔

آخر میں میں یہ کہوں گا کہ قومی یکجہتی، فکری ہم آہنگی اور دونوں زبانوں کے رشتۂ اتحاد کے لئے ضروری ہے کہ بنگالی ادب زیادہ سے زیادہ اردو زبان میں اور اسی طرح اردو ادب زیادہ سے زیادہ بنگالی زبان میں منتقل ہو تاکہ ہمارے ادیب ایک دوسرے کے مسائل، طرز فکر، رجحان طبع اور حیات افروز روایتوں سے واقف ہو کر زیادہ سے زیادہ قریب ہو سکیں۔ اور ان کے ذہن و شعور میں کشادگی پیدا ہو سکے۔

بقیہ: آخر کیسے ہو؟ (سلسلہ ص ۲۹)

رخسانہ: خالہ اماں، ڈاکٹر آ گیا ہے۔ اسے یہاں بھیج دیجئے۔ سلیمہ کو دیکھ لے پھر ہم لوگ ناشتہ کریں گے۔

(ڈاکٹر آتا ہے)

ڈاکٹر: وانڈرفل۔ مس سلیمہ آپ کے چہرے ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اب بالکل ٹھیک ہیں نیند نے آپ کی سب پریشانی دور کر دی۔ اب آلہ والہ لگا کر دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو خوب نیند آئی۔

سلیمہ: خوب نیند آئی اور پھر میں کچھ دیر ہی اٹھی کہ جاگ رہی تھی تو مجھے یہ شعر سنائی دیا۔

نکی بیرمغاں میں کہ بیا بستان و ہرچہ کردیم بچشم کرمش زیبا بود

ڈاکٹر: خوب خوب۔ ہرچہ کردیم بچشم کرمش زیبا بود۔ یہی ہوتا ہے۔ سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ میرا بھی زندگی کا تجربہ یہی کہتا ہے۔ جو کچھ کر لیا آخر میں اگر وہ ٹھیک ہی نکلا، بس ہمت نہ ہارنا چاہئے۔ افسردہ نہ ہونا چاہئے پریشان نہ ہونا چاہئے۔ بس ہرچہ کردیم بچشم کرمش زیبا بود۔ میں نے ویسے تو سائنس اور میڈیسن پڑھی۔ مگر والد مرحوم کو فارسی کا بڑا شوق تھا۔ خاص طور پر حافظ کا۔ یہ شعر حافظ کا ہے جو آپ نے سنا یہ شعر میری دعاؤں سے بہتر ہے۔ آپ اس سے تسکین حاصل کیجئے۔

رخسانہ: مگر ان کے مستقل علاج کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر: یہی میں نے کہا مرض ان کے ہاں کرنے کی دیر ہے۔

رخسانہ: ایسی باتیں نہ کیجئے ڈاکٹر صاحب۔ دیکھئے وہ شرمانے لگیں۔ کہیں پھر دورہ نہ پڑ جائے۔

ڈاکٹر: کیسے پڑے گا۔ میں موجود ہوں۔ حاضر ہوں۔ ان کو کوئی پریشانی کی ضرورت نہیں ہے۔

والدہ: (باہر سے آواز آتی ہے) لڑکیو ناشتہ کر لو۔ ڈاکٹر بھی ناشتہ کر لیں۔ سلیمہ کے ابا آ گئے ہیں۔ انتظار کر رہے ہیں۔

سلیمہ: چلئے۔ ہمارے ساتھ ناشتہ کر کے مطب جائیے گا۔

ڈاکٹر: کوئی بات نہیں مطب کو دیر ہو جائے گی۔ آپ کا علاج پہلا فرض ہے۔

فرحت انوار

ٹرانزسٹر کے سامنے

"اب ہم آپ کو حامد میاں کے ہاں لئے چلتے ہیں"۔
"بیگم آؤ حامد میاں کے ہاں شروع ہو رہا ہے"۔
آئی فرحت اور راحت کو بھی تو بلا لو۔
ہم دونوں موجود ہیں اگر کسی اور کی ضرورت ہو تو اس کو بھی بلا لیں۔
راحت لپک کر بلبل احمد اور نور کو بلا لے۔ میرا بچہ بڑے کام کا ہے۔
کبھی راحت کی امی سے پوچھئے کتنے کام کے ہیں یہ؟
اور تم فرحت مس پٹیل کو پکار لو۔ ان کا ریڈیو خراب ہے۔ یہ پروگرام ان کے گھر والے بھی شوق سے سنتے ہیں۔
یہی تو ایک پروگرام ایسا ہے جس کی خوبیاں قائم ہیں۔
نہیں سلمیٰ باجی "بھی اچھا ہوتا ہے۔
ہوتا ہوگا مجھے تو اب کوئی دلچسپی رہ نہیں گئی۔
ارے سنو تو تم لوگ تنقید بعد میں کرنا۔
چلو اچھا ہوا ریحانہ آگئیں۔ اب ان کے ماموں جان کو پھل مٹھائیاں اڑانے کو خوب ملیں گی۔
لو بھئی حامد میاں کا نیا لحاف بھی بن رہا ہے۔
شاہد کا تو جواب نہیں۔
اور بندو کے ابا؟
بھئی میرا تو جی چاہتا ہے ان کرداروں کو دیکھوں۔
آپ فلم دیکھتے نہیں ہیں۔
تو کیا یہ لوگ سینما میں بھی کام کرتے ہیں؟

جی ہاں حامد میاں اور ان کی بیوی کو آپ چراغ جلتا رہا میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر آپ کو ان کی زیارت کرنی ہے تو "ایسا بھی ہوتا ہے" دیکھ لیجئے۔
"ان کون؟
لے حامد میاں کے بھائی احسان اور کون۔
آدمل کنگا میں۔
بند کر دو۔
لے واہ وہ کیوں؟
ڈھنگ کے گانے کا ایک پروگرام ہوتا تھا۔ اس میں بھی فلمی گانے ٹھونس دیئے۔
بھئی آج کل کے لڑکے لڑکیوں کو فلمی گانے پسند ہیں اس لئے ریڈیو والوں نے یہ کیا ہے۔
ریڈیو صرف لڑکے لڑکیاں ہی تو نہیں سنتے۔ ہمارے جیسے بڈھے بھی سنتے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی کہ صرف لڑکے لڑکیوں ہی کی پسند کا خیال کیا جائے۔
پسند کا خیال وہ صرف اپنی کرتے ہیں۔ آپ لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ وہ ہم نوجوانوں کی پسند کا خیال کرتے ہیں۔

یہ ریڈیو پاکستان کراچی ہے"۔ کمرشل سروس"۔ لے واہ بھیا تم کو کمرشل سروس کی اردو بھی نہیں جڑتی؟
جی ہاں اردو کا دامن اتنا تنگ نہیں ہے کہ کمرشل سروس کے لئے کوئی خوبصورت لفظ یا الفاظ نہ مل سکیں۔

اے تم لکھنؤ جوان کو۔
جواب ملے گا کہ چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر ایسا کرنا ممکن نہیں۔
یہ بھی ٹھیک کہتی ہو۔
کریں گے وہی جو ان کا اپنا جی چاہے گا۔
اے اُن بیچاروں کا کیا قصور جیسا حکم ملتا ہے کرتے ہیں۔
بھئی کمرشل سروس کو اردو کا جامہ پہنا تو وہ سکتے ہیں۔ مگر ذرا صاحبی میں فرق پڑ جائے گا۔
کیا مطلب ہے تمہارا ؟
آپ نے وہ خبر نہیں پڑھی ؟
کون سی خبر ؟
دہلی کی ایک پاکستانی صاحبزادے نے فیض صاحب سے فرمایا تھا کہ اردو تو بیروں اور خانساموں کی زبان ہے۔
آزادی مل گئی۔ مگر ذہن ابھی تک متاثر ہیں۔ سو برس بہت ہوتے ہیں اثر جاتے جاتے جائے گا۔
نہیں جی یہ سب فضول بات ہے کہ اثر جاتے جاتے جائے گا آخر بھارت نے کیسے ہندی کو اپنا لیا۔ ان پر تو برسہا برس مسلمانوں نے حکومت کی۔ اور پھر سو سال انگریزوں نے۔ اتنی طویل مدت غلامی میں گزارنے کے بعد بھی ان کی آزادی کی حس مردہ نہیں ہوئی۔
اب آپ نے صحیح فرمایا۔ سوال موت اور زندگی کا ہے۔
کالا گورا کی خوبیاں دیکھو کر دیا زلفِ یار کو کالا۔
مجھے آپ سے بیحد ہمدردی ہے ؟
خدانخواستہ مجھے کیا ہوا جو تم ہمدردی کرنے لگے۔
ارے بھی جان میں تو ان سے مخاطب تھا جن بیچاروں کو یار بھی ملا تو چٹے سر والا۔
اے بیٹا تعجب کی کیا بات ہے اس زمانے کے بوڑھے دیوانے ہوئے جاتے ہیں۔
اب دیکھو لو بیٹا تم اپنی پھوپھی کی باتیں۔ میں نے کیا دیوانہ پن کیا جو یہ مجھ پر چوٹ کر رہی ہیں۔
میں نے تو زمانے کی بات کی مجھے کیا خبر تھی کہ چودھری کی داڑھی میں تنکا۔
اچھا بھئی یہ بحث ختم۔ پروگرام سنئے، سب کی پسند ہے کریلین شرٹ۔
قبلہ مجھے تو قطعی پسند نہیں، آپ اپنے اشتہار میں تبدیلی کروا لیں۔
جی ہاں اب آپ یوں کہا کریں۔
"سب کی پسند ہے کریلین شرٹ سوا صاحبزادے صاحب کے۔"
دراصل بھائی جان گرمی کی شدت سے منّا بھی پریشان ہے اور آپ بھی . . .
جواب نہیں حضرت آپ کا رجنوری کا مہینہ، کوئٹہ کی ہوا چل رہی ہے اور آپ فرماتے ہیں گرمی کی شدت۔
تم سمجھتے نہیں ان کی بات فضول ہی اعتراض کرنے لگے۔
آپ بڑی عقلمند ہیں آپ ہی سمجھا دیجئے۔ میں تو ٹھہرا بے سمجھ۔
ان کا گھر دوزخ کے قرب و جوار میں ہوگا ورنہ پاکستان کے تو کسی حصے میں آج کل شدید گرمی ہے نہیں۔
اب آپ مرزا غالب کی غزل سنئے
"لائی حیات آئی قضا لے چلی . . .
واہ صاحبزادے بڑے قابل ہیں آپ، جب ریڈیو سے چھٹی ملے تو اپنی گھر والی سے کہنا کالا دانہ اتار دیں گی۔ کہیں خدانخواستہ کسی کی نظر لگ جائے تو ؟
اب تم زبان پکڑنے لگے غلطی انسان سے ہوتی ہے۔ آخر میں جب شاعر کا تخلص آئے گا تو اپنی غلطی کا اعتراف کر لیں گے۔
کرچکے شرط بدیجے
شرط بدنا ناجائز ہے۔
ابھی ہم فتویٰ لے آئیں گے کہ جائز ہے۔
آپ شرط بدیئے تو
ایسا فتویٰ کون دے گا ؟
"ابن الوقت" سے
تصویر بناتا ہوں تصویر نہیں بنتی۔

سن لیجئے وہاں تصویر بننے لگی۔ غلطی کا اعتراف بالکل نہیں کیا۔

ایم۔ ایف۔ آئس کریم۔۔۔۔

آپ شرطیہ ہار گئیں آئس کریم کھلائیے۔

خوب تو کیا تمہارا روزہ نہیں ہے؟

ہے کیوں نہیں۔ افطار شرط کی آئس کریم سے کریں گے۔

تو یہ ناجائز چیز سے افطار روزہ بھی جاتا رہے گا۔

نکسوڈرم آج ہی خریدیئے۔۔۔۔

بالکل نہیں خریدیں گے۔ ہماری آپا کے کھلی ہے اس کو بالکل فائدہ نہیں ہوا۔

چپ کرو یار، اپن بھی بزنس کرتا ایسی بات نہ بولیں تو اپن کا تو سالا کباڑا ہو جائے۔ بزنس میں سب چالو ہے۔

تو یہ تو یہ بیٹیل تم روزہ رکھ کر گالی بکتے ہو اور بزنس میں جھوٹ کو جائز قرار دیتے ہو تمہارا روزہ تو گیا۔

میں نے تم تینوں بہنوں کے جوڑے تو تیار کروا لئے۔ مگر تم نے بچوں کی ناپ اب تک نہیں بھیجی۔

لے لو فرحت وہاں جوڑے بھی بننے گئے۔ تم نے دیر سے ٹرانزسٹر کھولا۔ پتہ نہیں پہلے کیا ہوا۔

ہوتا کیا بقول انگریزوں کے اب یہ پروگرام بور کرنے لگا ہے۔

وہ کیوں؟

اس کے جد و بہتر یہ کہ دار تھے ایکبرا سے اور کریم ان کو چلتا کر دیا پھر سلمیٰ باجی کے میاں اور دیور کو بھی اڑا دیا۔ بچوں کی حرکتوں سے بھی اب جی اچاٹ ہے کبھی ہاں کبھی نہیں۔

بھئی عقد ثانی میں عورت کو یوں ہی ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے، ہماری بھابی جان کو اللہ بخشے۔ ہم سب نے یعنی سسرال والوں نے کتنا چاہا کہ بھائی جان کے بعد وہ شادی کرلیں۔ مگر وہ تیار ہی نہیں ہوئیں۔

آپ جب کا ذکر کر رہی ہیں اس کو چالیس برس گزر چکے۔ تقریباً نصف صدی اور پھر انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ یہ نہیں کہ آج ہاں اور کل نہیں۔ نئے زمانہ تو ایسی عورت ملے گی نہیں۔

ہاں آج کل تو خوب دھڑا دھڑ عقد ثانی ہو رہے ہیں۔

"اقبالیات"، اب آپ علامہ اقبال کا کلام قوالی کے انداز میں سنیئے۔

اللہ کے واسطے ٹرانزسٹر بند کر دو۔

کیوں آپ کو علامہ کا کلام پسند نہیں؟

کیوں پسند نہیں۔ میرے پاس ان کی سب کتابیں ہیں جو میں اکثر پڑھتی رہتی ہوں۔

تو پھر کیا آپ کو ان سے عقیدت نہیں؟

بے کراں عقیدت ہے۔

پھر ان کا کلام کیوں نہیں سنتیں؟

بھئی مجھے یہ گوارہ نہیں کہ لوگ علامہ کے کلام سے بیزار ہو جائیں۔ اور ان کے رقیب اٹھ کھڑے ہوں۔

یہ آج آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ رقیب کیسے؟

بھئی جس طرح عوام کو بیدار کرنے کا کام علامہ نے کیا۔ اسی طرح اور بہت سے شعراء نے کیا۔ اور قوم کے لئے بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں۔

کل کلاں کو ریڈیو والوں نے "جوہریات"، "حسرتیات"، "نظیریات"، "حالیات"، "ندویات"، "حفیظیات" شروع کر دیا تو ہم ان کا کیا بگاڑ لیں گے مگر پھر شعراء کم اور "یات" زیادہ ہو جائے گا۔

مگر علامہ نے پاکستان کا خواب دیکھا تھا۔ دوسروں کا اور ان کا کیا مقابلہ؟

مقابلہ کرنا ہی غلط، ہر انسان اپنا ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ رہی خواب کی بات تو بیٹا بقول کمرشل سروس والوں کے تمہاری معلومات بہت محدود ہیں۔ علامہ سے قبل کئی اشخاص نے پاکستان کی تجویز پیش کی تھی اور اس طرف بار بار رسائل اور اخبارات میں مع تاریخی حوالوں کے یہ بات شائع ہو چکی ہے۔ مگر ریڈیو والے وہی پرانا راگ گائے جاتے ہیں۔

جی تو یہ کہئے کہ پاکستان کے خواب کی علامہ نے تجدید کی، یہ کارنامہ بھی اپنی جگہ پر بہت بڑا ہے۔ مگر ریڈیو سے اسکول براڈکاسٹ میں بھی یہی تکرار ہوتی ہے۔

علامہ کی روح کو اس قسم کی غلط بیانیوں سے سخت اذیت ہوتی ہوگی۔"

ریڈیو والوں کو لکھنا چاہیئے۔

عجب ہے ہفتے میں دو بار درس قرآن کا پروگرام تھا۔ جمعہ کے دن تو بہت سے لوگ "معارف القرآن" باقاعدگی سے سنتے تھے۔ مگر تفسیر پوری بھی نہ ہونے پائی اور سلسلہ بند ہو گیا۔ اور اتوار کا بھی۔ مسلمانوں کو تو اس سے سخت اذیت پہنچی۔

اے دلو تجّی یہ تم نے کیا کہا؟ مسلمانوں کو؟ تمہارے خیال میں کیا پاکستان میں گنتی کے مسلمان ہیں؟

آپ ناراض نہ ہوں تو عرض کردوں کہ پاکستان میں نام نہاد مسلمان زیادہ اور حقیقی مسلمان کم ہیں۔ اس کی ذمہ داری ہمارے علمائے کرام پر عائد ہوتی ہے۔

علماء پر نکتہ چینی کرنا منع ہے۔ یہ بری بات ہے کہ تم علماء تک پہنچنے لگیں۔

میری کیا مجال کہ میں علماء کی شان میں گستاخی کروں۔ ان کی خاک پا کے برابر بھی نہیں۔ مگر اس وقت میری مراد علمائے سُوء سے تھی یا پھر ایسے علماء سے جو چبا چبا کر بات کرتے ہیں جس سے لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

یہ تمہارا سراسر الزام ہے۔

جی نہیں میں ثبوت پیش کر سکتی ہوں۔

پیش کرو۔

رات آپ نے سحری کا پروگرام سنا تھا یا نہیں؟

سنتی کیوں نا۔

کسی صحابیؓ کے اقوال سنائے جا رہے تھے کہ اللہ کی اس کے رسول کی اور حاکم وقت کی اطاعت کرو۔

اے بیٹا یہ حکم تو کلام پاک میں بھی دیا گیا ہے۔ اور حضور پر نورؐ نے بھی حدیث شریف میں دیا ہے۔ اس میں کیا برائی ہو گئی۔

مگر یہ پروگرام صرف ہم نہیں سنتے۔ دوسرے ممالک میں بھی سنا جاتا ہے۔ خاص طور پر بھارت اور کشمیر میں۔ یہ سنکر کشمیری مسلمان جدوجہد آزادی ترک کر کے حاکم کی اطاعت کرنے لگیں تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟

اگر یہ قول سناتے ہوئے پورا قول سنا دیتے کہ حاکم کی اطاعت جب فرض ہے، جب حاکم متقی پرہیزگار اور انصاف پسند ہو۔ ظالم کی اطاعت فرض نہیں ہے۔ بلکہ ایسے لوگوں کے لئے جو ایسے حاکم کے خلاف آواز نہ اٹھائیں، آزادی کی کوشش نہ کریں۔ ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں جہنم کی بشارت دی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں نیک توفیق دے (آمین)

واہ یہ آپ نے خوب کہا۔ ہمیں کیوں ریڈیو والوں کو نیک ہدایت دے۔

مگر بیٹا ریڈیو والے بھی تو ہم میں ہی سے ہیں۔ وہ بھی اپنے ہیں۔

جی ہاں یعنی "ہم" آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نیک ہدایت دے۔ اور ہمیں اس کی توفیق دے کہ دوسروں پر اعتراض کرنے کے بجائے اپنا محاسبہ کیا کریں۔

(آمین ثم آمین)

ڈاکٹر احسن فاروقی

آخر کیسے ہو؟

کردار: سلیمہ: جوان لڑکی جو کالج میں پڑھاتی ہے
رخسانہ: اس کی خالہ زاد بہن جو ابھی پڑھ رہی ہے
ڈاکٹر: کچھ سن رسیدہ کامیاب ڈاکٹر
والدہ: سلیمہ کی ماں۔

منظر ۱: ایک جدید گھر کا ڈرائنگ روم

رخسانہ: میری سمجھ میں نہیں آتا سلیمہ تم اتنی خاموش اتنی چپ الگ الگ کیوں رہنے لگی۔ آخر اب تم نے ایم۔ اے کر لیا۔ اچھی خاصی تنخواہ پر لکچرر ہو۔ تمہارے اوپر کوئی دباؤ نہیں۔ اب تو مزے ہی مزے ہیں۔ اور تم پڑا دس پڑ گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا؟

سلیمہ: جانے بھی دو۔ کچھ نہیں۔ میری... اب کیا بتاؤں جانے بھی دو... ہم عورتوں کو بے زبان کہا گیا ہے، تو ہم چاہے کتنا پڑھ جائیں کتنے ہی اڈوانسڈ ہو جائیں بے زبان ہی رہنا پڑتا۔ ہمارا ماحول ایسا ہے کہ ہمیں بے زبان ہی ہونا پڑتا... اس لئے خاموش ہی رہنا اچھا ہے۔

رخسانہ: تم کوئی بات چھپا رہی ہو۔ اور مجھ سے بھی۔ میں نے تم سے اپنی کوئی بات کبھی نہیں چھپائی۔ اور پھر ہم تم بچپن سے ساتھ ہیں۔ آخر کون سی ایسی بات ہے کہ مجھ سے بھی چھپاتی ہو۔

سلیمہ: کوئی بات نہیں۔

رخسانہ: کیسے نہیں ہے ضرور۔ مجھ سے بھی شرم کرو گی۔ میں نے تم سے کبھی شرم نہیں کی۔ میں کئی دن سے کوشش کر رہی ہوں کہ تمہارے دل کی بات تک پہونچوں۔ اس وقت تمہیں بتانا ہی پڑے گا۔

سلیمہ: ایک عجیب مسئلہ ہے۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے کہوں۔

رخسانہ: آخر کچھ تو۔

سلیمہ: اچھا سنو ہم لوگوں کی شادی عجیب مسئلہ ہے۔

رخسانہ: ہم لوگوں سے کیا مطلب۔ میری شادی میں تمہیں بتا چکی کہ ٹھہر گئی ہے۔

سلیمہ: تمہاری اور بات ہے۔ میرا مطلب ان لڑکیوں سے ہے۔ جو پڑھ لکھ کر ملازم ہو گئی ہیں۔ میرے کالج میں جتنی پڑھانے والیاں ہیں ان سب کے سامنے یہی مسئلہ ہے۔ کوئی انہیں شادی کرنے والا ملتا ہی نہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ میں بھی اسی دائرے میں آ گئی۔

رخسانہ: یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ لڑکیوں کو پڑھایا اسی لئے جا رہا ہے کہ ان کو زیادہ اچھے شوہر ملیں۔

سلیمہ: میں اسی خیال سے پڑھتی رہی۔ اب پڑھ لکھ کر ملازم ہو گئی تو کسی طرف سے کوئی شادی کرنے کو آتا ہی نہیں دکھائی دیتا۔ کہیں سے کوئی بات چیت نہیں آتی۔ جب پڑھتی تھی تو ساتھ پڑھنے والے لڑکے بہت جھکتے تھے۔ اکثر خواہ مخواہ باتوں میں لگا لیتے تھے۔ میں سب سمجھتی تھی کہ یہ باتیں واتیں تو بہانہ تھیں۔ ان کے دل میں کچھ اور ہی تھا۔ مگر وہ نگاہ پر نہ چڑھے۔ میں نے انہیں اس قابل ہی نہ سمجھا کہ ان کو لفٹ دیتی۔ وہ الگ الگ ہو گئے۔ اور اب کوئی بات کرنے کو بھی نہیں آتا۔ ملازم ہو جانے کی وجہ سے مجھ کو ڈسکارڈ سا سمجھا جانے لگا ہے۔ مجھے یہ یقین ہو گیا ہے کہ اب میری طرف بڑھ کر کوئی مرد نہ آئے گا۔ کوئی مجھے پسند کر کے شادی کر لے اس کا بالکل امکان نہیں رہا۔

رخسانہ: کیا معلوم کوئی آجائے۔

سلیمہ: آسمان سے ٹپک پڑے تو دوسری بات ہے۔ ملنے جلنے کا اب کوئی موقعہ ہی نہیں رہا۔ جیسے ہماری پرنسپل ہیں، چالیس سے اونچی ہوں گی۔ اور اب تک مس ہی ہیں، وہی حشر میرا بھی ہونے والا ہے

رخسانہ: کہہ تو تم سچ ہی رہی ہو، مگر اب کیا کیا جائے۔

سلیمہ: تمہاری تو شادی تمہارے ماں باپ نے ٹھہرا لی۔ میرے باپ کہیں آئیں نہ جائیں۔ میری ماں گھر کے کاموں میں اتنی محو ہیں کہ کسی اور چیز کا انہیں دھیان ہی نہیں۔ میں آٹھ بجے اٹھ کر کالج گئی، تین بجے واپس آگئی۔ پھر گھر ہی گھر میں رہنا۔ اگر میں شادی کرنا چاہتی ہوں تو مجھے ہی تلاش کرنا چاہئے۔ جیسے اور لڑکیاں سنگھار کرکے شام کو گھومتی ہیں۔ میں بھی گھوموں، سینما جاؤں۔ کوئی مجھے پسند کرے اس سے شادی کر لوں۔

رخسانہ: مگر ایسا کرنے سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ زرینہ کو دیکھو اس نے یہی کیا۔ مگر کیا ہوا۔ بیکار کے لڑکے پیچھے لگ گئے۔ جن کا مقصد شادی کرنا تھا ہی نہیں۔ اور شادی کر لیتے تو بیوی کو رکھتے کہاں کوئی مستقل ملازمت نہ تھی نہ کوئی خاص گھر بار۔ عہدہ داروں کی شادیاں یوں پیچھا کر کے نہیں ہوتیں۔ ہمارے یہاں وہی پرانہ طریقہ ہے۔ میری شادی کے لئے کچھ لوگوں کو ابا جان نے لگایا۔ کچھ عورتیں ایک دن دیکھنے آگئیں۔ ان لوگوں نے پسند کر لیا اب وہ لوگ کہہ رہے ہیں۔ امتحان وِمتحان چھوڑ دو شادی کر لو۔ پھر چاہے پڑھیں یا نہ پڑھیں کوئی نوکری تو کرانا نہیں ہے۔

سلیمہ: تمہاری حالت اسی لئے مجھ سے بہتر ہے کہ تم نے پڑھائی ختم نہیں کی اور کہیں نوکر بھی نہیں ہو۔ ہمارے وہ ڈاکٹر چچا ہیں نہیں، وہ پرسوں یہاں آئے تھے۔ اماں نے کہا بھیا کہیں سلمہ کی شادی ٹھہرا دو۔ بولے بھابی جو لڑکیاں ملازم ہو جاتی ہیں ان کی شادی بڑی مشکل سے ہوتی ہے۔ آپ کو پاس کرنے سے پہلے ہی شادی کا انتظام کر لینا تھا۔ اماں نے کہا اچھا نوکری چھڑا لوں، تو بولے، نہیں نوکری بھی نہ چھڑائیے۔ مجھے ایسے منفی لوگوں سے نفرت ہے جو ہر بات میں نہیں کرینگے ہمیشہ پرانی باتوں کا ذکر کریں گے۔ یہ کیا ہوتا وہ نہ کیا ہوتا۔ اور رہائے ہائے یہ نہ کیا ہوتا اور وہ نہ کیا ہوتا کہنے لگتی ہیں۔

رخسانہ: مگر تم اتنی مغموم اور متفکر کیوں ہو، اللہ مالک ہے۔

سلیمہ: ہاں اللہ ہی مالک ہے۔ پڑھ لکھ کر سوچنے کی اور معاملات کو دیکھنے کی ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ اب پرانی باتوں پر عقیدہ ہی نہیں جمتا۔ دل میں کہتی ہوں کہ دعا مانگوں مگر بے ایمان دل یہ کہتا ہے کہ یہ سب کیسے ہوگا۔ میں دیکھتی ہوں کہ عقیدہ جمانے کے لئے بھی مجھے بڑی کوشش کرنا ہوگی۔ اس وقت کیسے ہوگا سر پر سوار ہے، دل بیٹھ جاتا ہے اور ناامیدی چھا جاتی ہے۔ پرابلم ہے۔ بڑا پرابلم۔

رخسانہ: اچھا۔ وہ ڈاکٹر صاحب جن کی لڑکی تمہارے یہاں پڑھتی ہے۔

سلیمہ: ان کے خیال ہی نے تو مجھے اور بھی زیادہ افسردہ کر دیا۔ وہ لڑکی کو روز موٹر میں لے کر کالج آتے ہیں۔ صحت اچھی ہے۔ ڈاکٹر ہیں، کمائی بھی اچھی ہوگی۔ اتنا اچھا نیا موٹر ہے۔ مگر چالیس سے اوپر ضرور ہوں گے۔ وہ کوئی نہ کوئی بہانہ مجھ سے ملنے کا اور باتیں کرنے کا نکال لیتے ہیں۔ کل کہنے لگے میری لڑکی کا آپ ٹیوشن کر لیجئے۔ میں گھر پر لڑکی کو پہونچا دیا کروں گا۔ میں نے صاف انکار کر دیا... رخسانہ ہائے۔ پڑھ لکھ کر نوکر ہو کر میں اس درجہ پر آگئی ہوں، بڈھوں ہی کے قابل ہو گئی ہوں۔ میرا دل چاہتا تھا کہ کوئی ہم نفس ہوتا جوانی کی امنگیں جذبات۔ یہ ڈاکٹر صاحب رنڈوے ہیں۔ دس برس ہوئے بیوی کو مرے۔ ایک یہ لڑکی ہے کوئی تیرہ چودہ برس کی ہوگی۔ اتنے عرصے میں انہیں شادی کا خیال ہی نہیں آیا۔ اب آیا جا کے۔ ان کی دوڑ دھوپ نے مجھے اور بھی پریشان کیا۔ یا اللہ۔ اب میں ان بڈھوں کے سر تھوپی جانے کے قابل رہ گئی ہوں۔ اور کوئی میرے لئے راہ ہی نہیں ہے۔

رخسانہ: نہیں، نہیں، تم رونے کیوں لگیں۔ ارے یہ اتنے بڑے بڑے آنسو۔

سلیمہ: (روتی آواز میں) میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی مگر...

رخسانہ: مگر کیا کوئی زبردستی تو نہیں ہے۔

سلیمہ: ہے۔ تم کو معلوم نہیں وہ ابا جان سے سب کچھ طے کر چکے۔ اماں نے انہیں دیکھ کر پسند بھی کیا۔ کل میں نے اماں کو ملازمہ سے کہتے سنا۔ کچھ دن اور گزر گئے تو ایسا بھی نہ ملے گا۔ لڑکی کی قیمت سن کے

ساتھ بڑھتی تھوڑی ہے، گھٹتی ہے۔ میری قیمت میری تعلیم نہیں ہے حالانکہ میں اسی کو اپنی سب سے بڑی قیمت سمجھتی تھی۔ سمجھتی رہی کہ جو جو میں بڑھتی جاؤں گی وہ وہ بہتر شادی ہونے کے موقعے ملیں گے مگر الٹا ہوا۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ مجھے اس ڈاکٹر ہی سے شادی کرنا پڑے گی۔

رخسانہ: تم سے کوئی زبردستی تو نہیں کرے گا۔ آخر تم خود نوکر ہو۔

سلیمہ: کوئی اور زبردستی کرے یا نہ کرے مجھے خود اپنے ساتھ زبردستی کرنا پڑے گی۔ ایک دل کہتا ہے کہ اسی کو غنیمت سمجھو۔ دوسرا دل خوابوں کو یاد دلاتا ہے۔ ایک ہوک اٹھتی ہے۔ دل پر چوٹ لگتی ہے۔ (آہ بھرتی ہے)

رخسانہ: ارے تم پھر رونے لگیں۔ یہ تم کس عالم میں ہو۔ میں کہتی ہوں کہ اس ڈاکٹر کو بلا کر تمہیں دکھایا جائے۔ وہ تمہارا علاج کرے۔ تمہارے چہرے کا رنگ اس قدر پیلا ہے۔ یہ کوئی کمزوری ہے۔ تمہیں دوا کی ضرورت ہے۔

(موٹر کے ہارن کی آواز آتی ہے....)

سلیمہ: یہ اسی کے موٹر کی آواز ہے۔ وہ آگیا۔ روز ابا جان کے پاس آتا ہے اپنے مطب جانے سے پہلے۔

رخسانہ: مگر تمہیں یہ کیا ہوا جا رہا ہے۔ ایں۔ ایں۔ ارے۔ ارے۔ خالہ جان آیئے دیکھئے۔ سلیمہ کو کیا ہوا جا رہا ہے... سلیمہ! سلیمہ!

والدہ اور نوکرانی آتی ہیں۔

والدہ: ارے۔ ارے یہ تو بے ہوش ہو گئی۔ ادھر تخت پر لا کر لٹا دو۔ تخت پر۔ رخسانہ تم ادھر سے پکڑو۔ میں ادھر سے سہارا دیتی ہوں... نوجا میاں سے کہہ دو، دالان میں بیٹھے ہیں کہ جلد کوئی ڈاکٹر بلائیں۔ سلیمہ بیٹی بے ہوش ہو گئی ہیں۔

نوکرانی باہر جاتی ہے۔

والدہ: دوڑ کے رخسانہ بیٹی فریج میں سے پانی لے آؤ۔ میں جب تک پاؤں سونتی ہوں۔

رخسانہ جاتی ہے اور پانی لے کر آتی ہے۔

رخسانہ: لیجئے یہ پانی۔

والدہ: ذرا سا اس کے منہ پر چھڑک دو... ہاں... دیکھو آنکھیں کھولیں۔ لے بیٹی یہ پانی پی لے۔

نوکرانی آتی ہے۔

نوکرانی: ڈاکٹر صاحب میاں کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ آ رہے ہیں۔ آئیں؟

والدہ: ہاں آ جائیں... میں اب کیا پردہ کروں گی۔

(والد اور ڈاکٹر آتے ہیں)

والد: آئیں سلیمہ کیا ہوا۔ دیکھو میاں ڈاکٹر۔

ڈاکٹر: (پاس آکر آلہ لگا کر) کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔ دل کی حالت بالکل ٹھیک ہے۔ نبض بھی ٹھیک ہے۔ تھکن، پریشانی۔ ان کو کالج سے کچھ دنوں کی چھٹی دلوا دیں۔ آنا جانا، پڑھنا ایک پریشانی۔ ان کو یہاں سے ہٹا کر بستر میں لٹا دیں۔ میں ایک انجکشن دونگا۔ آرام سے سو جائیں گی۔ کوئی انہیں ڈسٹرب نہ کرے۔ صبح کو مطب جاتے وقت پھر آؤں گا۔ ان کی عرضی بھی کالج لیتا جاؤں گا اور اپنا سرٹیفکٹ بھی دیدوں گا۔ ایک ہفتے کی میڈیکل لیو۔

منظر ۲۔ سلیمہ کا بیڈروم

والدہ: بہت سوئی بیٹی۔

سلیمہ: پورے سولہ گھنٹے سوئی۔ اب میری طبیعت بحال ہے۔ رخسانہ نہیں ہے؟

والدہ: منہ ہاتھ دھو رہی ہے۔ تمہارے لئے ناشتہ تیار کر رہی ہے۔ ڈاکٹر آئے تھے۔ تم سو رہی تھیں۔ کہا سونے دو۔ میں دو گھنٹے کے بعد پھر آؤں گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

(رخسانہ آتی ہے)

رخسانہ: اب تو بحال معلوم ہو رہی ہو۔ لو میں تمہارے لئے لوٹا اور تسلہ لے آئی ہوں۔ ہاتھ منہ دھو لو۔

سلیمہ: میں باتھ روم میں جا کر ہاتھ منہ دھوؤں گی۔ کوئی میں بیمار تھوڑی ہوں۔ مجھے بالکل کمزوری نہیں محسوس ہو رہی ہے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ مجھ میں نئی طاقت آگئی۔

(اٹھ کر چلی جاتی ہے)

والد: رخسانہ تم نے سنا ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ سلیمہ کی جلد سے جلد شادی کر دینا چاہئے۔ یہ کچھ ہسٹریا کا اثر تھا۔ تمہارے خالو نے

کہا کہ کہاں شادی کریں تو کہنے لگا یہ غلام حاضر ہے۔ پہلے بھی وہ کہہ چکا تھا۔ میں سمجھتی ہوں بہت مناسب ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے؟

رخسانہ: سلیمہ کو یہی تو پسند نہیں ہے۔ اسی پر تو بے ہوش ہونے لگی تھیں۔

والدہ: آخر کیوں؟

رخسانہ: کہتی ہیں کہ اب یہ دن آگئے کہ میں بڈھوں کے سر تھوپی جاؤں۔

والدہ: ہونہہ۔ یہ وہم ہے۔ آخر تمہارے خالو مجھ سے پندرہ برس بڑے ہوں گے۔ اور تمہارے باپ تو تمہاری ماں سے بیس برس سے کم بڑے نہیں۔ یہی ہوتا ہے۔ اور دیکھو جمیلہ کا میاں اس کے برابر تھا دو سال میں مرگیا۔ بیوہ بیٹھی ہیں اور ہم لوگوں کے بڈھے اب تک زندہ ہیں۔ یہ کوئی بات نہیں۔ ڈاکٹر سلیمہ سے یہی کوئی پندرہ برس بڑا ہوگا۔ مگر ڈاکٹر ہے۔ یہ ڈاکٹر اپنی تندرستی کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ وہ کیسا تندرست ہے تم نے دیکھا نہیں۔ پچیس برس سے زیادہ کا نہیں معلوم ہوتا۔ سلیمہ اور وہ ساتھ کھڑے ہوں تو لوگ سلیمہ ہی کو بڑا بتائیں گے۔ میں تو کہتی ہوں کہ اسی سے شادی کردو۔ تم سلیمہ سے کہو کہ یہ وہم دل سے نکال دے۔ اس کا کسی جوڑے کے ساتھ شادی کرنے کا خیال ہے، میں نہیں جانتی تھی۔ اس کے والد اور میں دونوں ڈاکٹر کے ساتھ شادی کرنے پر راضی ہیں۔ تم اس کو سمجھاؤ... اچھا میں جاتی ہوں ناشتہ لگواتی ہوں... ڈاکٹر بھی آتا ہوگا۔

(سلیمہ آجاتی ہے)

رخسانہ: سلیمہ اب تو بڑی خوش معلوم ہو رہی ہو۔ اور وہ ڈاکٹر آتا ہوگا۔ اب کہیں وہ نہ بیہوش ہوکر گر جائے، تم کو دیکھتے ہی۔

سلیمہ: وہ بیہوش ہو جائے گا۔ تو اس کا میں علاج کروں گی۔

رخسانہ: اچھا۔ تم علاج کروگی۔ تم علاج۔ اب وہ تمہیں برا نہیں لگتا۔

سلیمہ: جانے دو۔

رخسانہ: نہیں، نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب کچھ معاملہ بدل گیا۔

سلیمہ: کیا مطلب؟

رخسانہ: تم کو اس سے نفرت نہیں ہے اب اتنی۔

سلیمہ: نفرت؟ یہ میں نے کب کہا کہ مجھے اس سے نفرت تھی۔ مجھے اس کے عمر رسیدہ ہونے پر اعتراض تھا۔

رخسانہ: جو شاید اب نہیں رہا۔ تم کو کل وہ کس پیار سے دیکھ رہا تھا نا۔ دس برس سے وہ بے بیوی کے تھا۔ اور تم کو دیکھ کر اس کے دل میں گہری محبت جاگی ہے۔ ایسی محبت بڑی دیرپا ہوتی ہے۔

سلیمہ: اور وہ صبح ہی مجھے دیکھنے آیا۔ میں جاگ رہی تھی مگر سوتی بن گئی۔

رخسانہ: اور رات میں بھی دو دفعہ آکر پوچھ پوچھ گیا۔ تم بے خبر سو رہی تھیں۔

سلیمہ: میری آنکھ تڑکے کھل گئی تھی۔ مجھے ان سب لڑکوں کا خیال آرہا تھا جو میرے ہمسن تھے اور میرے پیچھے دوڑے تھے۔ سب پھٹک کر الگ ہوگئے ان کی محبت شدید تھی۔ مگر جتنی شدید تھی اتنی ہی جلدی غائب ہوگئی۔ ہماری ملازمہ جو ہے نہیں وہ کہتی ہے بڈھوں سے شادی اچھی۔ بڈھے محبت بہت کرتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ ڈاکٹر برا نہیں رہے گا۔

رخسانہ: بس تو پھر کیا ہے سب ٹھیک ہوگیا۔ تمہاری ہی رائے بدلنے کی دیر تھی۔ مگر تم نے اپنی رائے بدل ہی دی۔

سلیمہ: رات میں بہت دیر بے خبر سوتی رہی۔ مگر پھر میں نے خواب دیکھا وہ سب لڑکے جمیل اختر، احسان کرمانی، احمد شفیع دکھائی دیئے، ان کے چہرے بڑے ڈراؤنے معلوم ہونے لگے۔ مجھے ڈر لگنے لگا۔ یکدم سے ڈاکٹر آگیا۔ ان سب کو کوڑے مار کر بھگا دیا۔ ڈاکٹر بڑا خوبصورت اور تندرست لگ رہا تھا۔ اور کسی طرف سے کسی کے یہ شعر پڑھنے کی آواز آئی۔ حافظ کا شعر:

نیکی پیر مغاں بیں کہ بما بد مستاں
ہرچہ کردیم بچشم کرمش زیبا بود

ہائے کیا بات کہی ہے ہرچہ کردیم بچشم کرمش زیبا بود۔ میں اس شعر کو برابر گنگنا رہی ہوں۔

والدہ کی آواز آتی ہے:

والدہ: آؤ لڑکیوں آؤ۔ ناشتہ لگ گیا ہے۔

موٹر کے ہارن کی باہر سے آواز آتی ہے۔

رخسانہ: وہ آگیا۔

سلیمہ: اسی کے موٹر کا ہارن ہے۔

(بقیہ صفحہ ۲۱ پر)

حسرت کاسگنجوی

پاکستان کے ممتاز ناول نگار

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

ناول نگاری کے سلسلے میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے عرصہ تک بڑی تیاری کی اور خاصی حد تک اس فن کے بابت نظریات اور مثالوں سے واقف ہو کر ناول نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر فاروقی نے ناول نگاری کی پہلی کوشش کی لیکن جو کچھ بھی انہوں نے لکھا انہیں خود مضحکہ خیز معلوم ہوا اور ان کے ساتھ جو حضرات رہتے تھے وہ ان سے سن اور شعور دونوں میں زیادہ تھے۔ ان کو بھی بہت ہنسی آئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ڈاکٹر فاروقی نے ناولیں لکھنے کے بجائے ناولیں پڑھنے اور ناول پر تنقید پڑھنے پر اپنا وقت صرف کیا۔ جو لوگ ان کی ناول نگاری پر ہنسے تھے انہوں نے جن ناولوں کو پڑھنے کا مشورہ دیا وہ بہت اونچے معیار کی تھیں ورنہ عام مذاق کی بازاری ناولوں کو پڑھنے میں وقت صرف کرتے تو گمراہ ہو جاتے۔ چنانچہ سب سے پہلے جن ناولوں کی طرف ان کی توجہ لگائی گئی۔ وہ والٹر اسکاٹ کی ناولیں تھیں۔ وہ والٹر اسکاٹ کی اٹھائیس ناولوں کو یکے بعد دیگرے کئی سال تک پڑھتے رہے۔ انہوں نے ان کتابوں کو نہ صرف دلچسپی سے پڑھا بلکہ ان پر جتنی بھی تنقیدیں تھیں وہ بھی دیکھ ڈالیں۔ اسی بنا پر انہوں نے انگریزی ادب میں مخصوص کورس بھی پورا کیا اور اس میں اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ناول پڑھنے کی چونکہ عادت پڑ چکی تھی اور ساتھ ہی ساتھ معیاری ناول سے نیچے اترنے کا خیال نہ تھا کیونکہ انکی صحیح رہنمائی کی گئی تھی۔ اس لئے انگریزی ادب کی جدید و قدیم ناولیں انہوں نے پڑھیں جو معیاری قرار دی جا چکی تھیں۔ اس طرح ان کی نظر سے ہر بڑے فنکار کی ناولیں گذریں اور ان کی واقفیت ان ناولوں سے محض دلچسپی تک ہی محدود نہیں رہی۔ بلکہ تنقیدی معیار تک بھی پہونچی لہذا اپنی مرغوب ناولوں اور ناول نگاروں پر اکثر و بیشتر بحثیں کرتے رہے۔ نئے خیالات کا اظہار بھی کیا اور کچھ نہ کچھ لکھتے بھی رہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ناول لکھنے والوں کو ناول کا پڑھنے والا بھی ہونا ضروری ہے یہ کلیہ ان کے سلسلے میں پورا اترتا ہے اور دریافت سے معلوم ہوا کہ کم از کم پندرہ برس تک دنیا کی بہترین ناول نگاری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ عملی ناول نگاری کے دائرے میں داخل ہوئے۔

مگر ناول لکھنے سے پیشتر ناول پر تنقید کے سلسلے میں انہوں نے خاصا کام کر لیا تھا۔ ناول کے فن پر جتنی بھی کتابیں اور مقالے اٹھارویں صدی سے اب تک لکھے گئے ہیں۔ تقریباً ان سب کا انہوں نے بغور مطالعہ کیا اور ان سب سے نوٹس بنا کر ان کو ترتیب دے لیا تھا جو اردو میں ترجمہ ہو کر "ناول کیا ہے" کی صورت میں شائع ہوئے۔ یہ کتاب آج بھی مقبول ہے اور عام طور سے ناول کے تکنیک پر مستند سمجھی جاتی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اردو ناول کی تنقیدی تاریخ لکھی۔ جس کے دیباچے میں وہ کہتے ہیں کہ "یہ کتاب میں نے اپنے لئے لکھی۔ یورپ کی ناول نگاری سے مکمل واقفیت حاصل کرنے کے بعد مجھے یہ خیال ہوا کہ اپنی روایات کی بہترین ناول نگاری سے واقفیت حاصل کر لوں۔ تب عملی طور پر ناول کے میدان میں قدم رکھوں"۔ ڈاکٹر صاحب کی ان دونوں کتابوں سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ ناول نگاری کے میدان میں اپنے علم اور اپنے شعور کو پورے پورے طور پر مکمل کرنے کے بعد داخل ہوئے۔ یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اکثر تنقیدی مضامین ناول نگاری اور ناول نگاروں پر ہی نظر آتے ہیں۔ اپنے مضمون "نقاد کے منصب" میں انہوں نے لکھا ہے کہ میں تنقید اس طرح کرتا ہوں جیسے کوئی مٹی کی ہنڈیاں بنانے والا ہنڈیا بناتے بناتے ہنڈیا بنانے کی ترکیبوں پر غور کرنے لگے

یعنی یہ کہ وہ ناول سے متعلق موضوعات کو اپنی تنقید کا دائرہ بنا چکے ہیں۔ اور ناول پر ہی اپنی تنقید کو زیادہ اہم تصور کرتے ہیں، کیوں کہ —— T. S. ELLIOT کے نظریئے کے مطابق وہ بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ کسی فن کا نقاد اس فن کا ہی عامل ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ —— T. S. ELLIOT کے دوسرے قول یعنی کوئی تخلیقی ادب بغیر مناسب تنقیدی شعور کے وجود میں نہیں آسکتا، اس پر بھی ان کا عقیدہ راسخ ہے چنانچہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ وہ ناول نگاری کے عالم باعمل ہیں۔ پروفیسر شفیق علی خاں نے اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر فاروقی کے متعلق یہ لکھا ہے کہ انہیں اردو ناول نگاری کا HENRY JAMES مان لینا چاہیے۔ نقاد کی رائے میں دخل نہیں دینا چاہئے۔ اس کو آزادی ہے کہ وہ جو چاہے لکھے، دوسرے لوگ اتفاق یا اختلاف کر سکتے ہیں۔ مگر مصنف کی اپنے متعلق رائے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ ڈاکٹر فاروقی کو اس نظریئے سے کہیں کہیں اختلاف ہے مگر عام طور پر وہ اس سے اتفاق کرتے ہیں۔

جب ہم اردو ناول نگاری کا مطالعہ بغور کرتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اردو میں اس وقت جتنے ناول نگار نمایاں ہیں ان میں ڈاکٹر فاروقی تنقیدی شعور کے نقطۂ نظر سے سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ وہ ناول نگاری کے لئے سب سے زیادہ تیار ہو کر عمل پیرا ہوئے تو غلط نہ ہوگا۔ جہاں تک پروفیسر عزیز احمد کا تعلق ہے وہ بھی اس شعور میں کم نہیں لیکن عزیز احمد کو اتنا انہماک نہیں جتنا ان کو ہے۔ قرۃ العین حیدر نئے فن کی بہت دلدادہ ہیں مگر اس فن کو برتنے میں غلطیاں قرۃ العین حیدر سے بھی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نئے فن کی طرف بھی متوجہ ہیں مگر اس سلسلے میں ان کا نظریہ یہ ہے کہ یہ فن ابھی تکنیک ہی تک ہے۔ اس لئے کہ اس کو چھپانے اور اس کے ذریعے سے وجود میں آنے والی چیزوں کو اب تک عام فہم اور دلچسپ نہیں بنایا جا سکا۔ HENRY JAMES کی رائے کا اقتباس کرتے ہوئے وہ کہا کرتے ہیں کہ کسی ناول کو وجود میں آنے کا حق ہی نہیں ہے اگر وہ دلچسپ نہ ہو۔ عام طور سے بھی ان کی یہ رائے ہے کہ اگر فن نمایاں ہو تو بناوٹ ہو جاتی ہے۔ اردو شاعری کی مثال دے کر انہوں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ جن شاعروں کے یہاں شیخ ناسخ یا ذوق، زبان اور عروض کی خوبیاں جذباتی اثر سے پہلے مرکز توجہ ہوتی ہیں وہ ناکام ہیں، اسی طرح اگر ناول میں قصہ اور کردار کی دلچسپی کے بجائے تکنیک پر پہلے نظر جائے تو ناول بھی بناوٹی اور ناکام ہے۔ خدیجہ مستور کی ناول "آنگن" پر مضمون میں انہوں نے یہی واضح کیا ہے کہ اس میں فن موجود ہے، مگر عام نگاہوں کو دکھائی نہیں دیتا اور اسی لئے یہ ناول کی فن کاری کی کامیاب مثال ہے۔ بہر حال اس نظریئے کے مطابق انہوں نے ناول نگاری شروع کی اور انہوں نے یہی کوشش کی کہ عام آدمی ان کی ناولوں کو محض دلچسپ چیز سمجھ کر پڑھے۔ خاص آدمی اس میں فن کو دیکھ سکے۔ مگر فن کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ خود نمایاں ہو کر دلچسپی کو ختم کر دے۔ کیونکہ فن کا مقصد دلچسپی کو بڑھانا ہے۔ فن کے اصول کوئی الگ سے اصول نہیں ہیں بلکہ اس جائزے سے اخذ کئے گئے ہیں جو نقاد نے عام طور پر مقبول ناولوں کا لیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو جب ہی کامیاب سمجھتے ہیں جبکہ ان کی ناول مقبول خاص و عام ہو جائے۔ اس نظریئے کے تحت وہ "شام اودھ" کو کامیاب اور "رہ و رسم آشنائی" کو ناکام کہتے ہیں، حالانکہ فنی عمل کے سلسلے میں دونوں کو ایک ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر فاروقی کا پہلا ناول "شام اودھ" ہے جو ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا اور اس پر تقریباً ہر رسالے میں تعریف کے ساتھ ریویو ہوئے۔ اس سلسلے میں بہت ہی سیر حاصل مضمون جلال الدین احمد کا شائع ہوا۔ ان کے مضمون کی سرخی تھی "تین ناولیں"۔ تین ناولوں پر الگ الگ ریویو تین قسطوں میں شائع ہوئے۔ پہلا ریویو "شام اودھ" پر تھا، دوسرا "میرے بھی صنم خانے" پر، تیسرا "ایسی بلندی ایسی پستی" پر۔ "شام اودھ" پر ریویو میں جلال الدین احمد نے اس کی ماحول کی عکاسی اور کردار نگاری پر بہت کچھ لکھا تھا اور مثالیں بھی دی تھیں۔ اس کے بعد جمیل جالبی صاحب کا "ساقی" میں مضمون شائع ہوا جس میں اس کی ہیروئن نوبہار کے کردار کی بڑی تعریف کی گئی۔ آل احمد سرور نے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے اس پر ریویو کیا اور اس کے ہیرو بڑے نواب صاحب کے کردار کی مٹتی ہوئی شان کی بڑی تعریف کی اور نوبہار کے لئے یہ کہا کہ اتنا اعلیٰ و صالح کردار اس ماحول میں نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے اس ناول کی ہیئت پر "ساقی" میں ایک مضمون سپرد قلم کیا جس میں انہوں نے یہ دکھایا کہ اس ناول میں یونانی ڈرامے کے

مخصوص فن کو ناول کی ضروریات کے مطابق بلزاک کی طرح تبدیل کرکے پیش کیا گیا ہے۔ اتحاد زمان و مکاں اور ترتیب واقعات کے اوپر انہوں نے خاص روشنی ڈالی۔ فضائی تاثر کی اکائی کی طرف بھی اس میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ صمد شاہین، اختر حسین رائے پوری، مولوی عبدالحق، نیاز فتح پوری نے اس کی بابت بہت اچھی رائے دی ہے۔ صمد شاہین نے اس کا شمار اردو کی چند اچھی ناولوں میں کیا ہے۔ ضمیرالدین احمد نے اس کو تقسیم کے بعد کی تین کامیاب ناولوں میں شمار کرتے ہوئے اس کا نام پہلے لیا ہے۔ عام لوگ بھی اس ناول سے دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں اور اکثر گھریلو کے پڑھے لکھے افراد نے اسے پوری دلچسپی سے پڑھا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے اس کو اس ترقی پسند ادب کی مثال کہا ہے جس کا مقصد عوام تک پہنچ جاتا ہے۔ سب راؤں کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب اس ناول کو دیکھا جائے تو سب سے پہلے یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ اس میں کیا بات ہے جو یہ مقبول خاص و عام ہے؟ جو لوگ ناول میں فن کاری تلاش کرتے ہیں انہیں اس میں فن کے نمونے ملتے ہیں اور جو فن سے بے بہرہ ہیں وہ محض دلچسپ سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ڈاکٹر فاروقی تنقید لکھتے ہیں تو فن کا بہت خیال کرتے ہیں اور فن کے دائرے سے باہر نہیں نکلتے۔ مگر جب ناول لکھتے ہیں تو فن کو بالکل بھول جاتے ہیں اور عام دلچسپی ہی کی طرف توجہ دیتے ہیں اور دلاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے اس طرح کی رائیں بڑی سطحی نظر پہ مبنی ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ "شام اودھ" کو فن کاری ڈھونڈنے والوں نے دیکھا ہے اور اس میں فن کا وجود بتایا ہے۔ دوسری طرف ان لوگوں کو جن کو فن کا کوئی خاص احساس نہیں انہوں نے بھی اس کو دلچسپ پایا ہے۔ یہ ان چند کامیاب ناولوں میں سے ہے جن میں فن کے ساتھ فن کو اس آمد سے برتنے کی بھی مثال قائم ہوتی ہے جس کی بنا پر فن صحیح معنوں میں کامیاب فن ہو جاتا ہے۔ یہ اصول محض ناول نگاری پر ہی عاید نہیں ہوتا بلکہ ہم شعر و شاعری میں بھی یہ دیکھتے ہیں کہ موثر ترین شعر وہی ہوتا ہے جس پر نگاہ پہلے عروض کی طرف نہ جائے بلکہ شعر کی آمد جذبات کی رو میں ہمارے دل کو اپنے عالم میں لے جائے اور جب ہم اس عالم سے باہر آکر دیکھیں تب ہم یہ کہہ سکیں کہ ہاں فلاں فلاں خوبی کی وجہ سے یہ کیفیت طاری ہوئی۔ "شام اودھ" میں بھی یہی بات ہے جیسا کہ ڈاکٹر مصطفےٰ کمال نے لکھا اور مصنف نے خود تسلیم کیا کہ اس میں یونانی اور انگریزی ڈرامے کے فن کو شروع سے آخر تک برتا گیا ہے۔ مگر چونکہ اس فن کو برتنے میں کوئی آورد نہیں ہے لہذا عام آدمی اس کو دلچسپ چیز سمجھ کر پڑھ جاتا ہے اور سطحی نظر والا اس میں فن کا کوئی وجود نہیں پاتا۔ بہرحال ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ناول کے فن کو پوری آمد کے ساتھ برتنے کی یہ ناول بہت اچھی مثال ہے۔

"شام اودھ" کی مخصوص خوبیوں میں اس کی وحدت تاثر اور وحدت فضا خاص طور سے توجہ کے قابل ہے۔ ناول کا قصہ ایک محل سے باہر نہیں آتا۔ صرف شروع میں اس محل کا مقام مقرر کرنے کے لئے دریائے گومتی کا کنارہ دکھایا جاتا ہے اور آخر میں اس کو ختم کرنے کے لئے محل سے باہر محل کے مالک کا خاندانی مقبرہ دکھایا گیا ہے۔ خاص پلاٹ پرانی روایات اور نئے رجحانات کی کش مکش سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک پرانے لب گور نواب پرانی تہذیب کے حامی ہیں اور اپنے گھر ہی میں بچوں ہی میں سب سے زیادہ اُن رجحانات کو ابھرتے دیکھ رہے ہیں جو ان کی تہذیب کو ختم کر دیں۔ ان رجحانات کا مرکز اور اشارہ اس ناول کی ہیروئن نو بہار کے کردار کے ذریعے ہمارے سامنے آتا ہے مرکزی کش مکش نواب صاحب اور نو بہار کے درمیان چلتی ہے۔ اور اس سے ناول کا سب سے دلچسپ قصہ یعنی حیدر نواب اور انجمن آرا کی محبت کا قصہ وابستہ ہو جاتا ہے۔ اس قصے سے ملے جلے لاتعداد چھوٹے چھوٹے قصے ہیں کیوں کہ ہر کردار جو اس ناول میں آیا ہے اس کا کچھ نہ کچھ قصہ ضرور ابھرتا ہے، مرکز پر پہنچتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔ یہ سب قصے مل جل کر ایک نہایت پُرپیچ جال سا بنتے ہیں جس میں تنوّع بھی سامنے آجاتا ہے کیونکہ مرکزی قصہ تو نہایت سنجیدہ اور مقصدی ہے مگر کچھ قصے نہایت درجے رومانی ہیں، کچھ واقعاتی ہیں اور کچھ مضحک۔ اس طرح ایک متحد فضا کے درمیان گوناگوں تنوّع بھی وجود میں آجاتا ہے۔ اور فن کے لحاظ سے ناول اتحاد اور تنوّع کے آہنگ کی مثال ہو جاتی ہے اور عام پڑھنے والوں کے لئے ایک ایسی دلچسپی کی چیز جسے وہ ہاتھ میں لیتے ہیں تو ختم کئے بغیر نہیں چھوڑتے۔

اس کے علاوہ انگریزی ناول نگاری کی طرح اس میں قصہ سے زیادہ کردار نگاری پر زور دیا گیا ہے۔ جب ہم اس کا بغور مطالعہ کرتے

ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ فضا زیادہ تر کرداروں کے ذریعہ قائم کی گئی ہے۔ اس میں بیانات بہت ہی کم ہیں اور جو ہیں بھی وہ بہت مختصر۔ مگر ہر کردار اس زمانے اور اس ماحول کا نمائندہ ہے جو یہاں پیش کیا گیا۔ قصر الفضا کے روح رواں بڑے نواب صاحب ہیں۔ ان کے دو لڑکے بھی اس فضا کی نمائندگی کرتے ہیں۔ محل کے اندر بیگمات کے بھی الگ الگ کردار ہیں جو کسی نہ کسی پہلو کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے نوبہار، نواب حیدر اور انجمن آرا کا کردار ایک طرف اس ماحول کی نمائندگی بھی کر رہا ہے اور دوسری طرف اس سے بغاوت کی راہ پر بھی چل رہا ہے۔ قصر الفضا ایک چھوٹا سا مقام ہے۔ مگر جیسا کہ ناول کے آخر میں بتایا گیا ہے۔ یہ ایک پوری کائنات ہے یعنی اس میں بھی طبقے ہیں۔ اور ہر طبقے کے نمائندہ کردار سامنے لائے گئے ہیں۔ نواب صاحب اور ان کے قریب کے اعزا اعلیٰ طبقے کے کردار ہیں۔ وہ ملازمین جو نواب صاحب کے مصاحبین میں شامل ہیں، اوسط درجے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان میں میر عنایت حسین روایتی سنجیدگی کے ساتھ پابندی اور میر کلو مضحک طریقے پر پیروی کی مثال ہیں، تیسرا طبقہ اُن ملازمین کے ذریعہ سامنے آتا ہے جن کے سردار ٹھاکر بلدیو سنگھ ہیں جن میں مضحک کردار چھوٹا اور جوان لنگڑا سپاہی حیدر ہے۔ یہ سب کردار مل جل کر ایک ایسی دنیا تخلیق کرتے ہیں جو کہ لکھنؤ کی تہذیب کی ایک خاص وقت میں نمائندہ ہو جاتی ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب پر جو ناول لکھے گئے ان میں پنڈت رتن ناتھ سرشار نے زیادہ تر سڑکوں، سراؤں اور خاص تہواروں کی زندگی کے نقشے پیش کئے ہیں۔ مرزا رسوا نے امراؤ جان ادا میں طوائف کے ماحول کو اپنایا ہے۔ "شام اودھ" میں لکھنؤ کی زندگی کا وہ سب سے زیادہ اہم اور مرکزی نقطہ لیا گیا ہے جو یہاں کی تہذیب کی جان تھا۔ اودھ کی حکومت کے زمانے میں بھی اور اس کے مٹ جانے کے بعد بھی لکھنؤ میں نوابوں کے گھر تھے جن میں لکھنوی تہذیب اپنی اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ مکمل طور پر موجود تھی۔ ان گھروں میں سے کسی ایک کو مرکزی بنا کر ہی اس ماحول کی سوشل تاریخ بہترین طریقے پر پیش کی جا سکتی تھی۔ سڑکوں اور سراؤں کی زندگی کی تہذیب کو چھو کر ہی گزر جاتی تھی۔ نواب ذو الفقار علی خاں اور ذو القدر جنگ کے قصر الفضا کو مرکزی بنا کر لکھنوی تہذیب کو مکمل طریقے پر اس ناول میں سامنے لایا گیا ہے۔ اس کے مرکزی کردار یعنی نواب صاحب کو آل احمد سرور نے سب سے زیادہ پُر اثر مانا ہے اور اس کردار کی تخلیق ہی ماحول کی تخلیق بھی ہے اس لئے یہ ناول اُنیسویں صدی کے ناولوں کی طرح کردار نگاری کی مثال بھی ہے اور بیسویں صدی کے ناولوں کی طرح ماحول کی تخلیق کی بھی مثال ہے۔ اس سلسلے میں اس پر احمد علی صاحب کی ناول "دلی کی شام" کا اثر بھی توجہ کے قابل ہے۔ اس ناول کی بابت خود احمد علی صاحب نے کہا ہے کہ انہوں نے کرو سے زیادہ دلی کے ماحول کو تخلیق کرنے کی کوشش کی۔ فاروقی صاحب نے "دلی کی شام" پر ریویو میں بتایا کہ یہ ناول کس طرح "شام اودھ" کو بھی ماحول کی ترجمانی کی طرف لے گئی اور اس طرح انہوں نے احمد علی صاحب کی اُستادی کا اعتراف کیا ہے، بہرحال ماحول کی ترجمانی کی حیثیت سے یہ ناول اشاریاتی ادب کے دائرے میں بھی آ جاتی ہے۔ اس کا ماحول محض لکھنؤ کا ماحول نہیں رہ جاتا بلکہ مسلمانوں کی اس تہذیب سے روشناس کراتا ہے جو شمالی ہند کے ہر شہر میں سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد وجود میں آئی تھی۔ اس سے آگے بڑھ کر ہم اس کو اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھ سکتے ہیں کہ دُنیا کی ہر تہذیب اپنے تخریبی عالم میں آ کر کیسی صورت اختیار کر لیتی ہے اور کس طرح اس میں آنے والے زمانے کے رجحانات بھی آپ سے آپ ابھرنے لگتے ہیں یہاں تک کہ پرانے ماحول کے خاتمے پر نئے تعمیری رجحانات ماحول پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح زندگی پہلو بدلتی ہوئی، مٹتی اور بنتی ہوئی چل رہی ہے۔ ہیگل کا نظریہ کشمکش اور برگساں کا نظریہ وقت سامنے آتا ہے اور ناول کا محض دلچسپ ماحول فلسفی نقطۂ نظر سے معنی خیز ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اس ناول کی تعریف میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بے جا نہیں معلوم ہوتا اور عوام کے دلوں میں اس کی جو جگہ ہو گئی ہے وہ اس کے دوام کی ضامن نظر آتی ہے۔

(ج) ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے "شام اودھ" کے بعد مقصدی ناول نگاری کی طرف توجہ دی چنانچہ اس سلسلے میں جو کتاب ہمارے سامنے آتی ہے وہ "رہ و رسم آشنائی" ہے۔ ڈاکٹر موصوف کی اپنی رائے کے مطابق یہ ناول برنارڈ شا کے ڈراموں سے متاثر ہے۔ برنارڈ شا کے ڈراموں کی طرح اس میں بھی ہندوستان کی سوشل زندگی کا ایک مسئلہ زیر بحث لایا گیا ہے۔ ایک مسلمان لڑکے کا ہندو لڑکی سے ناکام عشق دو قوموں کے درمیان باوجود محبت کے

ربط اور آہنگ نہ ہونا ثابت کرتا ہے۔ آگے بڑھ کر بہت سی لڑکیاں مختلف مذاہب اور مختلف خیالات کی ایک پکنک پر جاتی ہوئی دکھائی گئی ہیں۔ اس میں ہیرو کو سب ہی کسی نہ کسی وقت پسند آچکی ہیں۔ مگر اس پکنک کے بعد وہ ہیروئن ـــــ جس کو زیادہ تر پری کہتا ہے اس سے زیادہ وابستہ ہو جاتا ہے۔ اب ان دونوں کے درمیان اس قسم کی بحثیں ہوتی ہیں جو برنارڈ شا کے ڈراموں میں ملتی ہیں اور جن کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ دو مختلف قوموں کے افراد ہونے کی وجہ سے یہ دونوں کامیاب شادی نہیں کر سکتے۔ آخر میں یہ دونوں ایک رات جی بھر کے مل لینے کے بعد جدا ہو جاتے ہیں۔ آخری سین میں جاتی ہوئی ریل گاڑی کا دھواں ہیرو کو آسمان پر ایک شیشے کی بوتل کی طرح دکھائی دیتا ہے جس میں اس کو اپنی پری قید نظر آتی ہے۔ یہ تاثر تہذیب کے حسن کو قید کرنے کی طرف اشارہ ہے اور ہیرو کے لئے اور زیادہ کچھ نہیں رہ جاتا کہ وہ روحانیت میں پناہ لے اور روحانی عمل میں اپنی محبوبہ کو یاد کرتا رہے۔

یہ ناول کچھ مفکروں نے تو شوق سے پڑھا۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے اسے "شام اودھ" سے بہتر کہا اور کچھ لوگوں نے ان کی تائید بھی کی مگر عام طور سے یہ ناکام ہی رہا۔ "شام اودھ" کو دلچسپی سے پڑھنے والے لوگ "رہ رسم آشنائی" کو تھوڑا سا پڑھ کر ہی الگ رکھ دیتے ہیں۔ اس میں پلاٹ کی تعمیر بالکل ڈرامے کے انداز پر کی گئی ہے اور اس میں سقم نکالنا مشکل ہے۔ کردار دو مرکزی رکھے گئے ہیں اور ان کی نفسیات کو بھی پوری پوری تحلیل کے ساتھ سامنے لایا گیا ہے، اس لئے فن کو دیکھنے والے اس کی کسی طرح بھی برائی نہیں کرتے مگر اس کی یہی صفات جو انٹلیکچوئل (مفکرین) کے لئے اہم ہیں عوام کے لئے اس کو غیر دلچسپ بنا دیتی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ خاص و عام فن کا وہ توازن جو "شام اودھ" میں فاروقی صاحب نے حاصل کیا تھا یہاں بگڑ گیا اور یہ ناول پورے طور پر خود ان کے نقطۂ نظر سے بھی کامیاب نہیں کہا جا سکتا۔

ان سب سے زیادہ پُرحوصلہ ناول "تماشے اللہ سے ایم۔ اے" ہے جو پانچ جلدوں میں لکھی گئی ہے۔ جس کی دو جلدیں ابھی تک کتابت شدہ ہی ہیں اور شائع نہیں ہوئی ہیں۔ پانچوں جلدوں کا اعلان اور ان کا مقصد پہلی جلد کے ساتھ بتا دیا گیا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ مصنف کا مرکزِ توجہ لکھنؤ کا ماحول ہے جو سنہ ۱۹۳۰ء سے لے کر سنہ ۱۹۶۰ء تک اپنی صورت بدلتا رہا اور جس کو پیش کرنے کے لئے "شام اودھ" کے ایک گھر کے بجائے پانچ گھر لئے گئے ہیں اور ان میں بدلتی ہوئی زندگی آپس کی کشمکش نئے مسائل کے ذریعے "شام اودھ" کی پرانی تہذیب کی جدید دور میں حالت کا نقشہ سامنے لایا گیا ہے۔ پہلی چیز "آبلہ دل کا" سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۱۹۳۲ء تک جو نقشہ سامنے لاتی ہے ہم اسے عشقیہ ناول کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس میں پانچوں مخصوص کردار پانچ مخصوص لڑکیوں سے محبت کرتے دکھائے گئے ہیں جس قسم کا عشق یہاں واضح ہوتا ہے اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اس ناول کا موٹو امیر خسروؒ کا یہ شعر رکھا گیا ہے ؎

رقیباں گوش برآواز او در ناز و من ترساں ‌ ‌ ‌ ‌ سخن گفتن چہ مشکل بود شب جائیکہ من بودم

پانچ قصوں میں جعفر نواب کا نرملا سے مضحک عشق، کمار کا نرملا سے المیہ عشق اور اسی طرح یوسف نواب کا انور جہاں سے المیہ عشق سب سے زیادہ دلچسپ ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی پہلو دکھائے گئے ہیں اور منیر میاں کا اپنی ذات سے عشق، مرزا بسم اللہ جان بیگ کا ایک صاحبزادے سے عشق اور متعدد لوگوں کے وقتی اور جذباتی ہر قسم کے واردات سے عشق کو سامنے لے آتے ہیں۔ ناول کے ختم ہونے تک مرکزی کردار عارف ہو جاتا ہے جس کا عشق سب سے زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے۔ وہ ایک اپنے سے بڑی لڑکی کی یاد میں مر رہا ہے جو مر چکی ہے مگر یہ عشق ختم ہو رہا ہے، اس کی اپنی بھابی سے چہلیں بھی عشق کی ایک نوعیت ہیں مگر خلوص کے ساتھ عشق اسے انور جہاں سے ہو جاتا ہے جس کو وہ ایک دفعہ اپنے موٹر کے آئینے میں دیکھتا ہے۔ ان المیہ یا فلسفیانہ قصوں کے ساتھ ساتھ ایک مضحک کردار نواب مرزا بہادر کی رنڈی بازی کا قصہ آتا ہے اور ان کو بہت مضحکہ خیز بنا دیتا ہے۔ دوسرا ناول "سنگ گراں" اور پورے طور پر داستانی ہے۔ اس میں پانچ کردار تلاش معاش میں سرگرداں ہو کر دنیا کی تلخ حقیقتوں سے واقف ہوتے دکھائے گئے ہیں۔

اس ناول میں سب سے زیادہ دلچسپ قصہ ایک راجہ کا ہے جو ایک میم سے شادی کر لائے ہیں اور جس سے ہر وقت جھگڑتے بھی رہتے

ہیں اور دبتے بھی رہتے ہیں کیونکہ وہ بہرحال حاکم قوم کی فرد ہے۔ میم کے بھاگنے کے واقعات نہایت درجہ سنسنی خیز ہو گئے ہیں، خاص طور سے میم کا جھانسی میل پر لکھنؤ سے روانہ ہونا اور راجہ کا رولس رائس کار پر میل کو پکڑنے کی کوشش کرنا بالکل ویسا ہی سنسنی خیز ہے جیسا کہ ہمیں فلموں میں ملتا ہے۔ مگر قصے کی تان یہاں بھی عارف کی دنیاوی کامیابی پر ٹوٹتی ہے اور جنو نواب بھی ایک مستقل نوکری پر فائز ہو جاتے ہیں۔ تیسرا حصہ "یہ وہ بہار یں تو نہیں" طنزیہ ناول ہے بلکہ ایک علم و ادب کے ماحول کو پیش کرنے کے سلسلے میں اس قسم کی ناول نگاری پر واپس آجاتی ہے جیسی کہ "گلیور ز ٹراولز" میں کی ہے۔ ناول سوئفٹ کی کتاب کے چوتھے حصے سے شروع ہوتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ جیسے سوئفٹ نے علمی لوگوں کا ایک جزیرہ دیکھا تھا ویسے ہی عارف نے ایک دوسرا جزیرہ دیکھا جس کا نام ملاح بدا ہے۔ اس کو الٹ دیجئے تو علم و ادب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جیسے جدید طنز نگار سیموئل بٹلر کے شاہکار آئری ہورن کو الٹ دیجئے تو معنی خیز لفظ NO WHERE بن جاتا ہے، یہاں ایک یونیورسٹی اور ایک انجمن ادب کے واقعات اور کردار پیش کئے گئے ہیں۔ ان کی نالائقیوں اور حماقتوں پر چوٹیں کی گئی ہیں اور ان کو اس قدر تکلیف دہ دکھایا گیا ہے کہ آخر میں عارف اس جزیرے کو ترک ہی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس ماحول کی سب سے اہم کردار ترقی بیگم ہیں جو افسانہ نگار ہیں اور اشتراکی ہیں، ان کا نواب مرزا بہادر سے مزاحیہ تعلق ناول کے طنزیہ اثر کا سب سے خاص جزو ہے۔ چوتھی جلد "رخصت اے زنداں" ہے جو سیاسی ناول ہے۔ یہ ہندوستان کی تقسیم کے دن سے شروع ہوتا ہے اور جنو نواب پر ایک ہندو کے پیک تھوک کر یہ کہنا کہ "بن گیا پاکستان اب جاتے کیوں نہیں ہو یہاں سے؟" وہ سیاسی ماحول شروع ہوتا ہے جس نے ہندوستان کے مسلمانوں میں سے ہر فرد کو ایک عجیب کشمکش اور بے کسی کے عالم میں ڈال دیا ہے۔ جنو نواب ہندوستان چھوڑ کر کراچی چلے آتے ہیں۔ نواب مرزا بہادر کسی شرط پر بھی لکھنؤ چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتے اور آخر میں مر جاتے ہیں۔ عارف بار بار پاکستان آتا ہے اور واپس جاتا ہے، اس سلسلے میں ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں کے خیالات اور ان کی ذہنیت کا تضاد برابر سامنے آتا رہتا ہے۔ آخر کار عارف بھی پاکستان آ ہی جاتا ہے اور یہاں وہ جنو نواب کو اندھا اور ان کی بیوی کو حد سے زیادہ پریشان پاتا ہے۔ جنو نواب بھی لکھنؤ کی یاد میں مرتے ہیں اور آخر کو مر جاتے ہیں اور ان کی بیوی معہ بچوں کے واپس لکھنؤ چلی جاتی ہے، عارف کو محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان اگر ایک قسم کا زنداں ہے تو پاکستان دوسرے قسم کا زنداں ہے۔ وہ سمندر کے کنارے جا کر اقبال کے سیاسی خیالات پر غور کرتا ہے اور آخر میں یہ شعر پڑھتا ہوا کسی طرف چلا جاتا ہے ؎

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد!　　مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

پانچویں جلد میں محض عارف ہی عارف رہ گیا ہے، مگر اس کے پانچ کردار ہیں اور ان پانچوں کرداروں کا پاکستان کے ماحول میں اپنی اپنی صورت سے پریشان ہونا دکھایا گیا ہے۔ ناول پورے طور پر جذباتی اور تصوراتی ہے، اسے ناول کے بجائے یوٹوپیا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کیونکہ اس میں واقعاتی مناظر کے بجائے اصنام اور عجیب بے ڈھنگے خوابوں سے کام لیا گیا ہے۔ پریشان ہونے کے بعد عارف ایک سکوت کے عالم میں آجاتا ہے، خود کو سچ مچ عارف بنا لیتا ہے، نہایت معمولی زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔

ان پانچوں ناولوں کو ملا کر جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں نور الحسن ہاشمی کا یہ قول یاد آتا ہے کہ اس میں تین بڑے کرداروں کی تخلیق اہم ہے۔ ایک عارف کی جو شیکسپیئر کے ہیملٹ اور گوئٹے کے فاسٹ کی طرح ہے، دوسرے نواب مرزا بہادر جو شیکسپیئر کے فالسٹاف اور ڈکنس کے سیم ویلر کی طرح مزاحیہ ہے، اور تیسرے محبوب عالم یا جنو نواب جو لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب کے ہر پہلو کا مجموعہ ہے۔ "شام اودھ" میں ڈاکٹر نار وتی نے فضا کو قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ "رہ رسم آشنائی" میں مقصد کو برتنے کی کوشش کی مگر کردار نگاری کے سلسلے میں اس طویل ناول میں وہ جتنا کامیاب ہوئے ہیں اتنے کہیں اور نہیں ہوئے۔ جن تین کرداروں کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ اردو ناول کے بہترین کرداروں کے ہم پلہ کہے جا سکتے ہیں۔ روسی ناول نگار اور خاص طور سے ٹالسٹائی کی طرح زندگی کا کرانیکل پیش کرنے میں وہ کتنے کامیاب ہیں کم از کم وہ اس سلسلے میں اردو ادب میں پہلی مثال ضرور قائم کرتے ہیں۔

۱۹۶۰ء میں ان کی ناول "سنگم" شائع ہوئی، اسے کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ روزنامہ "ڈان" کے جمیل صاحب نے ریویو کرتے ہوئے اس کو اس طرح جدیدفن کا شاہکار کہا جیسے "شام اودھ" قدیم فن کا شاہکار ہے۔ دیباچے میں مصنف نے خود یہ بتایا ہے کہ ورجینا وولف کی ناول "آرلینڈو" کے طریقے پر ہندوستان کی پوری تاریخ کو محمود غزنوی سے لے کر ایوب خاں کے پاکستان میں برسر اقتدار آجانے تک پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول کے مرکزی کردار دو ہیں، ایک ہیرو ابن مسلم جو محمود غزنوی کی فوج میں ایک معمولی سپاہی ہے، محمد غوری کے ساتھ آکر ہندوستان میں رہ جاتا ہے اور ہر بادشاہ سے وابستہ ہوتا اور نام بدلتا اور کردار بدلتا دکھایا گیا ہے۔ اپنی پہلی آمد میں سنگم پر وہ ایک بُت کو عورت میں تبدیل ہوجاتے دیکھتا ہے اور اس پر عاشق ہوجاتا ہے۔ یہ عورت جس کا نام اُما پاروتی ہے اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے تمام ادوار طے کرتی ہے۔ مسلمانوں کے دور میں اس کا نام ام پروین ہوجاتا ہے۔ اور انگریزوں کے دور میں وہ یوپی مسلم کہلاتی ہے۔ یہ اس صوبے کا جہاں گنگا اور جمنا کا سنگم ہے، اہم اشارہ ہوکر ان سب جغرافیائی اثرات کا مجموعہ ہوجاتی ہے جن سے مسلم کی زندگی وابستہ رہی۔ فلسفی نقطۂ نظر سے یہ ناول ہندوستان میں مسلمانوں کے کلچر کا جائزہ ہے اور فنی نقطۂ نظر سے وہی کچھ کیا گیا ہے جو قرۃ العین حیدر نے "آگ کا دریا" میں کیا۔ مگر اس طریقے پر کیا گیا ہے کہ ہر شخص ناول کو دلچسپی سے پڑھ سکتا ہے، اس لئے مصنف کا خود دعویٰ ہے کہ جدید ترین فن کو انہوں نے یہاں عام فہم بنانے کی کوشش کی اور ان کے ریویو گواہ ہیں کہ وہ اس سلسلے میں کامیاب ہوئے۔

سہیل بخاری نے اپنی کتاب اردو ناول نگاری میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کی ناولوں کی بابت لکھا ہے۔ فاضل مصنف نے تین کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ "شام اودھ"، "زلفیں اور زنجیریں"، اور "رہ رسم آشنائی"۔ لیکن تعجب تو اس بات پر ہوا کہ سہیل صاحب نے "زلفیں اور زنجیریں" ڈاکٹر محمد احسن فاروقی سے منسوب کی ہے جبکہ ڈاکٹر موصوف نے اس نام سے کوئی ناول نہیں لکھا۔ لہذا انہوں نے "زلفیں اور زنجیریں" کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ خارج از بحث ہے۔ سہیل صاحب فاروقی صاحب کی ناولوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "مصنف کی زبان بھی نہایت ناقص ہے۔ وہ نثر میں شاعری کرتے ہیں اور اردو میں اس کثرت سے انگریزی الفاظ ملاتے ہیں کہ طبیعت بیزار ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے یہ ناول خاص طبقے میں محدود ہوکر رہ گئے ہیں۔ یہ صرف ان ہی لوگوں کی تشفی کا سامان فراہم کرتے ہیں جنہوں نے مغربی تعلیم پائی ہے یا جو ابھی کالجوں میں تعلیم پا رہے ہیں"[۱]

"رہ و رسم آشنائی" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "کتاب میں انگریزی الفاظ جملوں اور نظموں کی بھرمار ہے۔ انگریزی ادب کے شاہکاروں کی طرف نہ صرف اشارے ہیں بلکہ ان کے اقتباسات بھی ہیں گویا ایک ایسی دنیا ہیں جس میں مشرق والے مغرب کی زبان میں سوچتے ہیں، گفتگو کرتے ہیں اور اسی انداز میں عمل بھی کرتے ہیں۔ پورے ناول میں ادبی اور فلسفیانہ مکالمے ہیں۔ یہ ماحول سراسر مصنوعی ہے جو نہ خالص مشرقی ہے نہ مغربی"[۲]

سہیل صاحب نے جو نظریہ قائم کیا ہے اس میں کسی قدر سچائی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ انگریزی الفاظ زیادہ استعمال کرتے ہیں لیکن اگر ہم ایک لمحے کے لئے بھی ٹھنڈے دل سے غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ناول کو ہم نے مغرب سے لیا اور ان ہی اصولوں کے تحت لیا جو کہ مغرب میں رائج تھے۔ ڈاکٹر موصوف کے سامنے کوئی ایسا نمونہ نہ تھا جس کی وہ خاص طور سے پیروی کرتے۔ انگریزی ادب کے فاضل ہونے کی حیثیت سے انہوں نے انگریزی کی معیاری ناولوں سے استفادہ کیا۔ سروالٹر اسکاٹ، ٹالسٹائی، گالزوردی، ہنری جیمس، ڈکنز، تھیکرے، جیمس جوائس اور برناڈشا کو نہ صرف انہوں نے غور سے پڑھا بلکہ ان کو سمجھا بھی۔ انہوں نے "رہ و رسم آشنائی" میں برناڈشا کے ڈراموں سے اثر لیا۔ ان نظریات کے تحت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اردو ناول نگاری میں نئی راہیں متعین کی ہیں اور ناول کے فن کو کسی حد تک وسعت دی ہے۔ انہوں نے اردو ناول نگاری کو مقصدی علمی ر

---

[۱] اردو ناول نگاری — سہیل بخاری صفحہ ۲۶۲ — [۲] اردو ناول نگاری — سہیل بخاری صفحہ ۲۶۰

ادبی بنانے کی جدوجہد میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ وہ نثر میں شاعری ضرور کرتے ہیں لیکن اپنے مقصد سے نہیں ہٹتے۔ وحدتِ تاثر میں فرق آتا ہے۔ سہیل بخاری کی طبیعت بیزار ہونے کی وجہ شاید تکنیک ہے جو انہیں پریشان کرتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے عام ناول نگاری سے کچھ ہٹ کر سوچا ہے اور ناول کے تعمیری ہونے پر زیادہ زور دیا ہے۔ ان کے سامنے انگریزی ناولوں کے اعلیٰ نمونے تھے۔ یہ بات ذرا مشکل ہے کہ یہ معلوم ہوسکے کہ ڈاکٹر صاحب کہاں کہاں اور کس کس سے متاثر ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں مجموعی اثر زیادہ غالب ہے۔ سہیل صاحب کا یہ قول بھی صداقت پر مبنی نہیں کہ ان کی ناولیں ایک خاص طبقے میں مقبول ہیں۔ اس کی زندہ مثال "شام اودھ" ہے۔ شام اودھ مقبولِ خاص وعام ہے، کسی بھی مصنف کی ہر ناول شاہکار نہیں ہوتی۔ "رہ ورسم آشنائی" میں ڈاکٹر صاحب وہ فضا قائم نہیں رکھ سکے ہیں جو انہوں نے شام اودھ میں قائم کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عام پڑھنے والوں میں یہ کتاب مقبول نہیں ہوئی۔ حالانکہ "رہ ورسم آشنائی" فن کے لحاظ سے اپنی جگہ بڑا اہم ہے اور ڈاکٹر منور الحسن ہاشمی نے تو اسے "شام اودھ" سے بھی بہتر بتایا ہے۔ رہا اقتباسات کا سوال، سو ہمیں اس قدر تنگ نظر نہیں ہونا چاہئے۔ ہمارے ہاں ناول پڑھنے والا طبقہ اتنا زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہے کہ وہ انگریزی ناولوں سے براہ راست استفادہ کرسکے۔ اگر کسی اچھی چیز کے اقتباسات پیش کردیئے جاتے ہیں تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے۔ دراصل ہمیں تنقید کرتے ہوئے جذبات پرستی سے کام نہیں لینا چاہئے۔ جذبات پرستی ہمیں سنجیدگی سے سوچنے میں مدد نہیں دیتا۔

ہاں ایک بات ضرور ہے کہ ڈاکٹر فاروقی ایک اونچے پلیٹ فارم سے لوگوں کو مخاطب کرتے ہیں۔ وہ جو بات کہتے ہیں اس میں علمیت، ادبیت اور فلسفہ زیادہ ہوتا ہے، اس لئے عام قاری کے پلے کبھی کبھی کم ہی پڑتا ہے۔ ابھی ہمارے عام ناول پڑھنے والے اتنی اونچی سطح پر نہیں آئے ہیں۔ کچھ ایسی ہی بات قرۃ العین حیدر کے ساتھ بھی ہے، ان کی تکنیک تو بہت زیادہ ہی پریشان کرتی ہے۔ اور بہت سے پڑھے لکھے بھی کبھی کبھی ان کی بات نہیں سمجھ پاتے۔

ڈاکٹر فاروقی نقاد بھی ہیں اور ان کی تنقید جدید اصولوں پر مبنی ہے۔ اس میں علمیت کا پہلو زیادہ نمایاں ہے، انہوں نے ناول کے فن کو اچھی طرح سے سمجھا ہے، اس لئے وہ ناول کے اچھے پرکھنے والے بھی ہیں۔ وہ اپنے تجربوں اور علمیت کے بل بوتے پر آگے قدم بڑھاتے ہیں۔ ان کی باتوں میں بڑی سنجیدگی ہے ان کے کردار اصلاحی پہلو تو رکھتے ہیں لیکن واعظانہ انداز اختیار نہیں کرتے۔ اچھا خیال اپنی افادیت ہر پہلو سے برقرار رکھتا ہے ڈاکٹر صاحب کے مکالمے پُرمعنی ہوتے ہیں، بیانات نہایت مختصر مگر پُرتاثیر، کہانی آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے۔ وہ ہر لحاظ سے ایک بڑے ناول نگار ہیں۔

———X———

ش۔ د۔ شارق

"شوقِ ناتمام"

بڑھ چلا ہے کس قدر سوزِ نہانی یہ نہ پوچھ
رُک گئی کیوں میرے اشکوں کی روانی یہ نہ پوچھ
ہے یہ بے تعبیر خوابوں کی کہانی یہ نہ پوچھ
کس طرح ہم نے گزاری نوجوانی یہ نہ پوچھ
سُرخ ہو کر زندگی کے ولولے بجھتے رہے
کس طرح بنتی رہی ہے آگ پانی یہ نہ پوچھ
کتنی صُبحوں کا تبسّم کتنی شاموں کا جمال
رہ گیا ہے بن کے صرف اِک نقشِ فانی یہ نہ پوچھ
زندگی خود دے رہی تھی دعوتِ صد انبساط
زندگی کی صُبح تھی کتنی سہانی یہ نہ پوچھ
چند تارے جگمگا اُٹھتے ہیں چشمِ فکر میں
کیوں غم افزا ہے خیالِ شادمانی یہ نہ پوچھ
ایک جانب شوقِ بیحد، ایک جانب جبر ہے
کون ہوگا ہمکنارِ کامرانی یہ نہ پوچھ
اَدھ کھلی کلیوں کے مُرجھانے کا بھی نظارہ کر
کیوں ہے یہ بھی اِک مآلِ زندگانی یہ نہ پوچھ
دھڑکنوں سے قلبِ فطرت کی جو ہم آواز تھی
کیا ہوئی شارق وہ میری نغمہ خوانی یہ نہ پوچھ

سید حرمت الاکرام

غزل

ٹھہرے گا وہی رن میں جو ہمت کا دھنی ہے
یہ معرکۂ خودگری و خود شکنی ہے
ہو خیر کہ اے عظمتِ یزداں! تری خاطر
انساں ازل سے ہدفِ اہرمنی ہے
تیور مرے کچھ بھانپ لئے لوگوں نے ورنہ
دنیا میں بنائے سے کہاں بات بنی ہے
ناداں! یہ حقائق کی سُلگتی ہوئی دنیا
خوابوں کے مہکتے ہوئے پھولوں سے بنی ہے
پہنچیں گے تری بزمِ دلآرا میں بھی اک روز
تاریک خلاؤں میں ابھی خیمہ زنی ہے
اے اہلِ جنوں! دور نہیں منزلِ شیریں
ہاں! بیچ میں اک مرحلۂ کوہ کنی ہے
منجملۂ تقصیر نہ ہو یہ بھی کہ حرمت
مدت ہوئی بے وجہ زمانے سے ٹھنی ہے

رستم علی خاں

خوشی کے آنسو

دوپہر ڈھل چکی تھی۔ موضع کھرک کے تانگوں کے اڈے پر ایک بوڑھا آدمی زار و قطار رو رہا تھا۔ میں لٹ گیا۔ میں تباہ ہو گیا۔ ان الفاظ میں بیحد درد تھا۔ سینکڑوں لوگ جمع ہو گئے۔ اسے کسی نے ستایا، وہ کون ظالم ہے جس نے بوڑھے آدمی پر ظلم ڈھایا۔ سرگوشیاں ہونے لگیں۔ ایک تانگہ والا بولا یہ بوڑھا موضع سے رپواڑی کا لوہار ہے۔ پچھلے سال مکان کی چھت گرنے سے اس کے دو جوان بیٹے مر گئے۔ اب صرف ایک بیٹی ہے۔ اگلے مہینہ اس کی شادی ہے۔ بوڑھے نے بنئے سے قرض لیا۔ اور صبح جہیز کا سامان خرید کر روہتک سے آ رہا تھا۔ جب گلاب خاں والی پیپلی کے سامنے سڑک پر پہنچا تو دو ڈاکوؤں نے زدوکوب کیا۔ اور بندوق سے ڈرا کر تمام سامان چھین لیا۔ بیس دن میں ڈاکوؤں کی دست درازی کا یہ چھٹا واقعہ ہے اس مقام پر وہ لوگوں سے ہزاروں روپے کا مال لوٹ چکے ہیں، اور ان کی آج کی لوٹ نے تو بہت غریب مار کی ہے۔ ان تمام سنسنی خیز واقعات کی پولیس میں رپٹ درج ہو چکی ہے۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ تانگے والے کے بیان سے متاثر ہو کر ایک اٹھارہ انیس سالہ نوجوان آگے بڑھا۔ اور بوڑھے کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ اٹھو بابا رونے سے کیا فائدہ، پہلے روٹی کھا، پھر میں کچھ اپاؤ کروں گا۔ بوڑھا اٹھ کر نوجوان کے ساتھ چل پڑا، نوجوان بوڑھے کو بیٹھک میں بٹھا کر گھر پہنچا تو اس کی ماں نے کہا۔ پھول سنگھ تو تو کھیت میں گیا تھا۔ اتنی جلدی واپس کیوں آیا۔ پھول سنگھ نے بوڑھے کے لئے روٹی مانگی اور اس کے جوان بیٹوں کی ناگہانی موت اس کی اکلوتی بیٹی کی عنقریب شادی اور اس کے لٹنے کی تمام روداد ماں کو سنائی۔ روداد سن کر پھول سنگھ کی ماں کو بیحد صدمہ ہوا۔ اور جب پھول سنگھ بوڑھے کو کھانا کھلانے چلا گیا تو اس کی ماں کے ذہن میں خیالات کی شدت سے ہلچل مچ گئی۔ پھر اس کے ذہن میں خیالات کے ملبے تلے سے ایک خیال ابھرا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس پر فالج گر گیا ہے۔ یہ وہ خیال تھا۔ جب ۱۹۱۴ء کی جنگ میں پھول سنگھ کا باپ ارجن سنگھ سمندر پار گیا ہوا تھا اور پھر ایک دن کسی نے بتایا کہ ارجن سنگھ ایک زخمی ترک سپاہی کو پکڑ کر اپنے مورچوں میں لایا۔ وہاں ایک گورے نے اس ترک سپاہی کے سینہ میں اپنی سنگین گھونپ کر اسے ہلاک کر دیا۔ ارجن سنگھ ایک جنگی قیدی کے ساتھ یہ بزدلانہ سلوک برداشت نہ کر سکا اور اس نے اسی وقت اپنی تلوار سے گورے کو قتل کر دیا پھر ارجن سنگھ کا کورٹ مارشل ہوا اور اسے ایک دشمن ملک کے سپاہی کی حمایت کے جرم میں گولی مار دی گئی۔ یہ لرزہ خیز خبر سنتے ہی اس نے اپنی چوڑیاں بیدردی سے توڑ ڈالیں اور اس کا سہاگ لٹ گیا تھا۔ ان دنوں پھول سنگھ ایک سال کا تھا۔ وہ خوش تھی کہ اس کا بیٹا اس شخص کی نشانی ہے جس نے فوجی اصول کی خلاف ورزی کرنے کی پاداش میں اپنے زندگی آقا کی جان لے لی اور حق کی راہ میں اپنی جان دے دی تھی۔ اس نے پھول سنگھ کو اپنا خون جگر پلا کر پالا تھا۔ وہ اسی خیال میں تھی کہ اس بوڑھے کو کھانا کھلا کر پھول سنگھ آ گیا۔ ماتا جی آپ مجھے بتائیں، میں اس بوڑھے کی کیا مدد کروں؟ اگر آپ اجازت دیں تو میں نمبردار کو ساتھ لے کر تھانہ جاؤں۔ غصہ میں اس کی ماں شیرنی کی طرح گرجی۔ پھول ڈاکوؤں نے شارع عام سڑک پر اودھم مچا رکھی ہے۔ مجھے یہ بتا کہ پولیس اور عوام نے کیا تدارک کیا ہے۔ میں تو یہ سمجھی ہوں کہ یہ خود غرض زمانہ ہے اور لوگوں میں غیرت ہی نہیں ہے۔ میں بچی سی تھی ان دنوں جنگل میں ہمارے گاؤں کے نائی کی گائے چھین لی گئی۔ اس واقعہ سے گاؤں کے تمام نوجوان مشتعل ہو گئے اور انہوں نے اس حادثہ کو اپنی بے عزتی

تصور کیا۔ وہ دوسرے دن گائے واپس لائے اور گائے چھیننے والے کو ادھ موا کر کے پولیس کے حوالہ کر دیا۔ پھول سنگھ پولیس کا تو فرض ہے لیکن کچھ عوام پر بھی فرض عائد ہوتا ہے۔ عوام مردہ دل اور بے حس ہو چکے ہیں۔ ایک کو لٹتا اور مرتا دیکھ کر دوسرا اُس کی مدد کرنے کی بجائے خوش ہوتا ہے۔ یہی حال رہا تو وہ دن دور نہیں کہ ڈاکو ریل گاڑی اور موٹروں کو روک کر مسافروں کو بے دھڑک لوٹا کریں گے۔ دیہات اور شہر کا ہر گھر ڈاکوؤں سے غیر محفوظ ہوگا۔ پھول سنگھ تمہارے پتا انسان پر انسان کی زیادتی دیکھ ہی نہیں سکتے تھے اور انہوں نے محض انسانیت کی خاطر اپنی جان دیدی۔ میں خوب جانتی ہوں، تو ظلم کی راہ میں اپنی جان دینے کے لائق بھی نہیں ہے۔ تو نے ارجن سنگھ کے گھر پیدا ہو کر اُس کے نام پر بٹّہ لگا یا ہے۔ ان الفاظ نے تیر بن کر پھول سنگھ کے دل میں شگاف ڈال دیا۔ اور وہ خاموشی سے گھر سے باہر نکل گیا۔ رات کو جب گھر نہیں آیا اور اُس کی ماں نے تلاش کیا تو لوگوں نے بتایا کہ پھول سنگھ ہمارے پاس بندوق مانگنے آیا تھا۔ ہم نے اُسے بندوق نہیں دی۔ اُس کی گفتگو سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اُس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ پھر دن ڈوبنے کے بعد ایک چمار نے اُسے کندھے پر لاٹھی اور سر پر گٹھڑی رکھے ہوئے گاؤں سے جنگل کی طرف جاتا ہوا دیکھا ہے۔ انتظار کے باوجود پھول سنگھ دوسرے دن بھی گھر نہیں آیا۔ تیسرے دن علاقہ میں شور مچ گیا کہ آج دوپہر کے وقت پھول سنگھ نے دو ڈاکوؤں کو پکڑ کر پولیس کے حوالہ کر دیا ہے۔ اُس کی ماں نے تفصیلات دریافت کیں تو ایک شخص نے بتایا کہ گلاب خاں والی پیپلی کے سامنے سڑک پر پھر رہا تھا۔ جھاڑیوں میں سے ایک ڈاکو نے نکل کر پھول سنگھ کے سینے پر بندوق رکھدی۔ اور اُس سے کہا کہ اگر زندگی عزیز ہے تو گٹھڑی زمین پر رکھدے۔ پھول سنگھ نے گٹھڑی زمین پر رکھدی۔ جب ڈاکو گٹھڑی اٹھانے لگا تو پھول سنگھ نے اچانک ڈاکو کے سر پر ایسی لاٹھی ماری کہ وہ وہیں گر پڑا۔ اور اُس کے ہاتھ سے بندوق چھوٹ کر دور جا پڑی۔ اور بجلی کی سی پھرتی سے دوسرے ڈاکو نے جھاڑی سے نکل کر بندوق اٹھالی۔ پھول سنگھ اس کی طرف بڑھا۔ معاً اُس نے بندوق کی لبلبی دبادی۔ گولی سنسناتی ہوئی پھول سنگھ کے کان کے پاس سے گزر گئی۔ اُسی دم پھول سنگھ نے ڈاکو پر لاٹھی کا بھرپور وار کیا۔ وہ گر پڑا۔ اتنی دیر میں سڑک پر ایک تانگہ آگیا۔ تانگہ کے مسافروں نے پھول سنگھ کی مدد کر کے دونوں ڈاکوؤں کو تھانہ پہنچا دیا۔ تفتیش سے پتہ چلا، دونوں ڈاکو موضع کیلنگہ کے مشہور جرائم پیشہ کنجر ہیں۔ لوٹا ہوا تمام مال پولیس نے برآمد کر لیا ہے۔ ڈاکوؤں نے یہ بھی اقرار کیا ہے کہ دو ماہ قبل ہم نے تین مسافروں کو ہلاک کر کے زمین میں دفن کر دیا ہے۔ اب پولیس نشان دہی کے لئے ڈاکوؤں کو لے کر اُس مقام پر گئی ہوئی ہے۔ یہ خبر سُنکر پھول سنگھ کی ماں اپنے سہاگ اُجڑنے کا غم بھول گئی اور اُس کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔ چند ماہ بعد پولیس نے پھول سنگھ کو سند اور دو ہزار روپیہ انعام دیا۔

X

تبصرہ (بسلسلہ صـــ ۶۴)

اور آزاد پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اُسے تنقیدی نظر سے جانچ کر کھرا کھوٹا الگ کر دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ آزاد پر یہ پہلی مستند کتاب ہے۔ آزاد کی زندگی کے ساتھ اُن کی تصانیف کا ضمناً بیان ناگزیر ہے۔ لیکن یہ بیان محض برسبیل تذکرہ ہے۔ اس کتاب کے دوسرے حصّے میں (جو زیر طبع ہے) آزاد کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

کتاب میں کتابت کی بہت غلطیاں رہ گئی ہیں۔ خصوصاً سنوں میں۔ انجمن کی مطبوعات میں تصحیح کا خیال زیادہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ کتابت اچھی خاصی ہے مگر طباعت قابل اطمینان نہیں ہے۔ حالانکہ یہ کتاب انجمن کے اپنے پریس میں چھپی ہے۔ قیمت آٹھ روپے ہے اور گلڈ انجمن کتاب گھر، وکٹوریہ روڈ، کراچی سے منگائی جاسکتی ہے۔

"ش"

سلام مچھلی شہری

غزل

صُبحدم بھی یوں فسُردہ ہوگیا
اے دلِ نازک! تجھے کیا ہوگیا

رات تھا کتنا سحر کا انتظار
اب یہ غم ہے، کیوں سویرا ہوگیا

اُس سے پوچھو ظلمتِ نورِ خلوص
چار ہی دن میں جو رُسوا ہوگیا

صحنِ مسجد میں کھلا تھا اِک گلاب
وقت کے ہاتھوں وہ کانٹا ہوگیا

شکریہ اے گردشِ جامِ شراب!
میں بھری محفل میں تنہا ہوگیا

سینۂ بربط سے جو شعلہ اُٹھا
غم زدوں کے دل کا نغمہ ہوگیا

بُجھ گئی کچھ اِس طرح شمعِ سلامؔ
جیسے اک بیمار اچھا ہوگیا

شبیر افضل جعفری

غزل

دیکھ کر وقت کے سیہ بادل
پُھوٹتی ہے ضمیر سے کونپل

جب لہو سے ہو زندگی جل تھل
جھلملاتے ہیں "آب رو" پہ کنول

کوچۂ کربلا میں حُورِ ازل
کیوں چباتی ہے نور گیں آنچل

بھر گئی ظلمتِ غمِ دوراں
آدمیت کی آنکھ میں کاجل

ہر ابد مست کی تمنّا میں
ناچتی ہے عروسِ وار اجل

آدمی ہو اگر حسینؑ پرست
گنگناتا ہے جاں کنی میں غزل

تیغ ہے، تشنگی ہے، تابش ہے
مرد یزداں شکار جھوم کے چل

سید ضمیر حسن دہلوی

انگنا کہار

سید تفضل حسین کی کھڑکی کے پاس جو چماروں کا چھتّہ ہے اُس کے قریب ہی دو تین بوسیدہ سی دوکانیں، اللہ بخشے، دادا ابا مرحوم کی تھیں۔ اِن دکانوں کو غالبًا سدا سے رہائش کے لئے ہی استعمال کیا جاتا تھا اور سچ پوچھو تو دکانداری کا یہاں موقع بھی نہ تھا۔ بہت مختصر سی آبادی اور وہ بھی فقط اُن لوگوں کی جنہیں بیشتر ضروریاتِ زندگی جنس کی شکل میں اپنے ججمانوں کے گھروں سے مل جاتی تھیں۔ پھر ایک اور بات یہ کہ جگہ بھی کچھ اندھیری سی تھی۔ ہم جیسے کمزور دل آدمی کو اگر کوئی لاکھ روپے بھی دے تو سچ جانو جھٹپٹے کے بعد اُدھر کا رُخ نہ کریں۔ اس جگہ کے متعلق کئی سنسنی خیز روایتیں بھی مشہور تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ ان دکانوں کے بائیں طرف جو بڑا سا نالہ تھا وہ ایک نکٹے بھوت کا مسکن تھا۔ چاندنی راتوں میں جب نوعمر لڑکے پالے کا میدان جماتے تو یہ مردار بھی نالے سے نکل ان میں شامل ہو جاتا تھا۔ گھنٹوں کھیلتا رہتا تھا۔ پر کیا مجال جو کسی کی گرفت میں آئے۔ اچھے اچھے پہلوان چھو کرتے ہانپتے ہانپتے نڈھال ہو جاتے لیکن اسے زیر کرنے کی حسرت ہی رہتی۔ جہاں کسی نے کولی بھری اور وہ یوں نکل گیا جیسے ہوا کا جھونکا۔ ہاں اگر دو تین مل کے لپٹ گئے تو موری میں گھس غنغنانے لگتا۔ پھر بھلا کون جی دار تھا کہ سامنے ٹکتا۔ ذرا دیر میں میدان صاف ہو جاتا۔ خدا جانے سچ یا جھوٹ ہم نے تو یاں تک سنا کہ اس نے کئی راہگیروں کی جانیں بھی لے لیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ نکٹا بھتنا آدمی کا بھیجا کھاتا تھا۔

خیر یہ سب باتیں تو اب پرانی ہوئیں، نہ وہ نالہ رہا، نہ اندھیریا چھتہ، نہ چھتّے کے بسنے والے چمار، اب تو اسی جگہ بڑی بڑی کشادہ گلیاں ہیں۔ دائیں بائیں خوبصورت پختہ اور گنجان آباد مکانات نیچے گودام دُکانیں۔ غرض سولہ سترہ برس کے الٹ پھیر میں دنیا بدل گئی۔ البتہ یہاں کے رہنے والے بتاتے ہیں کہ رات گئے ایک سر کٹا بھتنا اب بھی اس علاقے میں چکر لگاتا ہے۔ سنا ہے کہ آدھی رات سے پچھلے پہر تک اس کا سر سامنے والے چوراہے کے بیچوں بیچ پڑا رہتا ہے۔

انگنا کہار اسی چوراہے کے نزدیک، کاکن دودھ والے کے سامنے، ایک چھوٹی سی دکان میں رہتا تھا۔ کہار کا پیشہ تو اُس نے کافی دنوں پہلے ہی چھوڑ دیا تھا جب ہاتھ کی رکشا چلنے پر ڈولیاں تقریبًا بیکار ہو چکی تھیں۔ البتہ ایک پرانی سی ڈولی دکان کے باہر بڑی پھولدار کیل میں ہمیشہ ٹنگی رہتی۔ بالکل اسی طرح جیسے میوزیم میں پرانے زمانے کے آلاتِ حرب لٹکے رہتے ہیں۔ انگنا کی گذر اوقات اب مدّت سے ان گھرانوں کے لین دین پر تھی جن کے دروازوں پر عمر بھر اُس نے "ڈولی آگئی ہے" کی صدا لگائی تھی۔ سستا زمانہ، دیالو اور وضعدار لوگ، بیچارہ انگنا لشتم پشتم زندگی کی گاڑی گھسیٹ ہی لیتا تھا۔ میرے بچپن میں اس کی عمر کوئی ستر بہتّر برس کی ہوگی۔ ہڈیوں کی ساخت جوانی کی توانائی کا پتہ دیتی تھی۔ اور اس بڑھاپے پر بھی محلّے کے اکثر گھرانے اس کی خدمت گذاریوں کے ممنونِ احسان تھے۔ کسی کا سودا سُلف لا دیا۔ کسی کے گھر کی چوکسی کی اور کسی کا حصّہ بخرا پہنچا دیا۔ بڈھوں اور بیماروں کے لئے پرانی ڈولی کیل سے اتار اپنے بھائی بند کو ساتھ لے فورًا حاضر ہو جاتا تھا۔ زندگی کا آخری حصّہ انگنا نے خدمتِ خلق اور دین دھرم کے لئے وقف کر دیا تھا۔ جو وقت لوگوں کی ہانک پکار سے بچتا وہ گیتا کے پاٹھ میں لگا دیتا۔ منگل برہسپت اور شنی وار کو جو گیا

لباس پہن، ایک بڑی سی مالا ہاتھ میں لے، نہ جانے کیا کیا جپتا رہتا۔ لیکن اگر اُس وقت بھی کوئی بُلانے آتا تو مالا زمین پر رکھ، آسن توڑ، اُس کے ساتھ ہولیتا۔ پہلے انسانوں کی خدمت کرتا اور پھر بھگوان کی پوجا۔ مجھے اُس وقت تو اتنی تمیز کہاں تھی کہ انگنا کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتا۔ البتہ آج جب اس کا خیال آتا ہے تو سوچتا ہوں کہ انگنا ایک عظیم انسان تھا، ایک مہاپُرش تھا۔ اتنا مہاپُرش کہ دیش کے نام نہاد بھگت بھی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

انگنا ایک کہار تھا۔ اور کہاروں میں میں نے آج تک کوئی گورا تو گورا سانولا بھی نہیں دیکھا۔ سب ایسے کالے بھجنگ ہوتے ہیں جیسے کولتار کے مجسمے۔ انگنا بھی اماوس کی رات کی طرح سیاہ تھا۔ خوب پختہ۔ جیسے اُلٹا توا، ہاں چمک دمک بلا کی تھی۔ اُس کی جلد پر ہمیشہ ایک تازگی رہتی تھی، جیسے گھنٹوں تیل کی مالش کی گئی ہو۔ سیاہ فراخ ماتھے پر جب وہ صندلی تلک لگاتا تو یوں لگتا جیسے مُشکی گھوڑا سنہری ساز پہنے کھڑا ہے۔ جوگیا لباس، جو وہ اکثر پوجا پاٹھ کے سمے پہنتا تھا، اُس کے جسم پر ایسا کھلتا جیسے چاند کی کرنیں جاڑوں کی ٹھنڈی رات میں جگمگ جگمگ کرتی ہوں یا پہاڑ کی سیاہ وادیوں میں زعفران کے خوبصورت کھیت مسکرا اُٹھیں۔

چوڑا طباقی چہرہ، کھلی ہوئی چمکدار پیشانی، ابھرا ہوا گول مول سر جس کے چاروں طرف سفید چھدرے بالوں کی ہلکی ہلکی جھالر قلمیں گالوں کے وسط تک، جن میں ایک معشوقی اُریب دیا گیا تھا۔ دہانہ ذرا بڑا مگر اس کا زائد حصّہ گل مچھوں نے ڈھک لیا تھا جن پر سر کے بالوں کی طرح بڑھاپے کی برف گر چکی تھی۔ بڑی بڑی روشن اور چمکدار آنکھیں، ان میں کاجل کے لمبے لمبے ڈورے، سُرخ اور ذرا سوجھے ہوئے پپوٹے، سفید جھوال بھنویں جو ناک کے اوپر ایک دوسرے سے مل گئی تھیں۔ آنکھ اور ناک کے درمیان اُبھری ہوئی ہڈی کے پاس ایک بڑا سا مسّہ، کوئی مٹر کے دانے کے برابر سیاہ رنگ کا، اس میں دو چھوٹے چھوٹے سفید بال۔ مسّے کے قریب ہی ناک کی پھننگ، گُھلکی کی گھلکی، بڑے بڑے کشادہ نتھنے جو ہر سانس کے ساتھ پھیلتے اور سکڑتے تھے۔ ناک کا اوپری حصّہ آنکھوں کے درمیان خم آلود، ایسا ٹیڑھا میڑھا جیسے املتاس کی پھلی، دانت اگر ہونگے تو زیادہ سے زیادہ چھ سات اور وہ بھی اتنے اندر کہ ان تک نظر کا پہنچنا محال، البتہ ہونٹ گھنی مونچھوں سے ہر وقت اپنے وجود کا اعلان کرتے تھے نیلے نیلے گُردے کے گُردے، آگے سے یوں مڑے ہوئے جیسے کونڈے کے کنارے کا نچلا ہونٹ عموماً لٹکا رہتا تھا۔

چوڑا چکلا ابھرا ابھرا سینہ اس پر اتنے سارے بال جیسے دیسی کمبل پہ کھڑا کھڑا رواں، بدن پر اکثر گہرے رنگ کی بنڈی، دونوں طرف جیبیں لگی ہوئی۔ ایک جیب میں بڑا سا بٹوہ، دوسری میں ایک چھوٹی سی کتاب، بھگوت گیتا، جسے ہم اُن دنوں ہندوؤں کا قرآن شریف کہتے تھے۔ بازو آدھے آدھے کھلے ہوئے جو کبھی سخت، صحت مند اور سڈول رہے ہوں گے۔ کہنی کے جوڑ نمایاں، چپٹی چپٹی چوڑی چوڑی کلائیاں، انگلیاں اوپر سے کالی اندر سے سفید، کچھ کچھ پیلاہٹ لئے ہوئے، ہتھیلی کی کھال ایسی جیسے بھینس کی چمڑی، ٹانگوں میں ایک میلی سی دھوتی، گھٹنوں سے ذرا نیچی، پیچھے سے اُڑسی ہوئی۔ جہاں دھوتی اُڑسی جاتی تھی وہاں کمر میں خاصی گہری نالی، گُھٹی ہوئی پنڈلیاں، ان میں ہلکے ہلکے خم جو غالباً ڈولی اٹھانے کے باعث پڑے ہوں گے، کدال جیسے پیر، انگلیاں انگوٹھے کی مخالف سمت میں کافی مڑی ہوئی جس سے بڑی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان ایک خلا پیدا ہو گیا تھا۔ غرض یہ کہ انگنا کہار کسی کونے سے بھلا لگنے کے لائق نہ تھا۔ نرا بھوت ناتھ، کالا پیلا، بدشکل، بد وضع لیکن اگر تاثر کی بات کریں تو اُس نے بڑی دلکش اور جاذب نظر شخصیت پائی تھی۔ اُس کا سراپا مکمل ایثار، اُنس اور محبت کا سراپا تھا۔ اُس کی نرم نرم گفتگو سننے والوں کے کانوں میں رس گھولتی تھی۔ کہتے ہیں انسان کی شکل پر اُس کے اعمال کا عکس پڑتا ہے۔ سو انگنا کی صورت بھونڈی اور بھدّی ہونے کے باوجود اس کی روحانی پاکیزگی سے جگمگائی رہتی تھی۔

انگنا سے میرا تعلق محض رسمی نہیں ہے بلکہ مجھے اُس کی ذات سے ایک جذباتی لگاؤ ہے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو انگنا کو اپنی ڈیوڑھی پر کھڑا پایا۔ میں انگنا کی گود میں کھیلا ہوں میں نے اُس کی مونچھ کے بال نوچے ہیں۔ اس کی گنجی چندیا پر سینکڑوں چپت لگائے ہیں۔ اُس کے کاندھے پر

چڑھا چڑھا پھرا ہوں، اُسے گھوڑا بنا کر اُس کی سواری کی ہے اور نہ جانے کتنی بار بے جا ضدیں کر کے اس کے منہ پر دو ہتڑ لگائے ہیں۔ میں انگنا کو بھول ہی نہیں سکتا۔ وہ میرا پہلا دوست، پہلا غمگسار، اور پہلا دمساز تھا۔ اُس نے میری اس درجہ خدمت کی ہے کہ میرا رُواں رُواں اس کا احسانمند ہے۔ میں رویا تو اس نے مجھے ہنسانے پر ساری قوت صرف کردی، میں ہنسا تو اُس نے میرے ساتھ مصنوعی قہقہے لگائے، میں کھیلا تو وہ بھی میرے ساتھ بچوں کی طرح کھیلنے لگا۔ میں گر پڑا یا میرے چوٹ لگی تو وہ گھنٹوں تڑپا کیا۔ میری تکلیف کے آثار اُس کے چہرے پر نظر آئے۔ بلبلا بلبلا کے پوچھتا تھا "چوٹ تو نا ہی لگی سرکار" میں نے جو خلوص، جو ہمدردی، جو محبت اور جو ایثار انگنا میں پایا وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہوگا۔

۱۹۴۷ء میں بٹوارے کے بعد جب فسادات ہوئے تو انگنا بیچارہ قریب المرگ تھا۔ تندرست اور توانا جسم گھل گھل کے نزار ہوگیا تھا اور اعصابی اضمحلال نے اُس میں ہلنے جلنے کی سکت کم چھوڑی تھی۔ کوٹھری میں پڑے ہوئے اندھے بہرے اور مفلوج انگنا کو باہر کے شور شرابے کا غالباً علم بھی نہ ہوتا لیکن جب سر سیتارام اپنی حویلی مقفل کر، محلّے کو خیرباد کہہ گئے اور باگو وبنئے نے بھی اپنے بال بچوں اور قیمتی اسباب کے ساتھ کسی ہندو علاقے میں جانے کا فیصلہ کیا تو محلّے کے شرفا نے انگنا کے کان میں بھی ساری بات ڈال دی اور صاف صاف کہہ دیا کہ کل کلاں کو خدانخواستہ اگر کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو ہم ذمّے دار نہیں۔ ہماری مانو تو کسی دوسری جگہ چلے جاؤ۔ انگنا غریب کو اوّل تو حالات کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ دوسرے وہ عمر کی اُس منزل سے گذر رہا تھا جہاں پہنچ کے آدمی کے ہر سانس سے یہ صدا آنے لگتی ہے کہ ع

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

چنانچہ اس نے لوگوں کے اِس مشورے کو کان دھر کے سنا تک نہیں۔ آنکھیں کھول اپنے محسنوں پر ایک نظر ڈالی اور کہنے لگا "یہاں سے سرکار اب ہمرا لہاس ہی جائے گی۔ ساری عمر آپ لوگن کی سیوا میں گذار دئی، اب ہم کون جگہ جائی سکت ہیں، ہم کا کون مار دئی گا ہجور، آپ سب ہمری گود دین کے کھلائے ہیں۔" لوگوں نے سوچا۔ بات تو ٹھیک ہے۔ انگنا میں اب رکھا ہی کیا ہے جو کوئی اس کا خون اپنے سر لے گا، لہٰذا بہت اصرار نہ کیا اور خاموش ہو لوٹ آئے۔

حالات بگڑتے رہے۔ شہر کی فضا دن بدن خراب ہونے لگی۔ نظم و نسق برقرار رکھنے کے لئے فوج طلب کی گئی۔ دن رات سڑکوں پر مسلح دستوں کا گشت ہونے لگا۔ گلی کوچوں کے نکڑ پر آہنی دروازے اور پھاٹک چڑھا دیئے گئے۔ ان تمام حفاظتی تدابیر کے باوجود ہر شام آسمان سُرخ ہو جاتا۔ چاروں طرف آگ کے شعلے لپکتے۔ سڑکوں پر بے گور و کفن لاشیں پڑی ملتیں۔ مذہبی جنون جو ہر دوسرے جنون سے بازی لے جاتا ہے، سارے انسانی معاشرے پر حکمرانی کر رہا تھا اور اس کی حکومت میں دنیا جہنم بن گئی تھی۔

ایک دن دوپہر کے وقت جب رستم خاں چوکیدار مع اپنی ڈاڑھی کے جسے وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، دریا گنج کے ڈپو پر محلّے والوں کے لئے اناج لینے گئے تو انہیں مفسدوں نے گھیر لیا۔ پہلے تو اُس آفندی پٹھان نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن جب دیکھا کہ سارا جسم زخموں سے چور ہو چکا اور سیروں خون بہہ گیا ہے تو لاش کی بے حرمتی کے خوف سے گھر کی طرف بھاگ لیا اور محلّے والوں کی گود میں فسانۂ جور بمشکل سُناتے سُناتے دم توڑا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ جب میں نے اسے دیکھا تو جی چاہا کہ ساری دنیا کو آگ لگا دوں۔ کوئی چالیس پچاس زخم کاری اس کے جسم پر لگے تھے جن سے رِس رِس کر جیتا جیتا خون بہہ رہا تھا۔

رستم خاں چوکیدار کی حسرتناک موت نے علاقے والوں کے ذہن ماؤف کر دئے۔ ظلم کا جواب ظلم سے دینے کے منصوبے بننے لگے۔ مجاہدوں کی پُرجوش تقریریں ہوئیں۔ اسلامی غیرت اور حمیّت کو للکارا گیا، بہادروں نے بزدلوں کو شرمسار کیا۔ ہتھیار جمع ہوئے اور ان تمام باتوں کے بعد فیصلہ ہوا کہ اجتماعی جتھے بنا کر قریب کی ہندو آبادیوں پر یورش کر دی جائے۔ کچھ دیر پہلے جو لوگ رستم خاں چوکیدار کے قاتلوں کی بہیمانہ ذہنیت اور درندگی پر طعنہ زن تھے اب وہ خود بھی اُن ہی حرکتوں پر آمادہ ہو چلے تھے۔ اس کے علاوہ چارہ بھی کیا تھا۔ انصاف کی میزان برابر رکھنے

کا بس یہی ایک طریقہ تھا۔

جب بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کا سوال اٹھا اور پہلے مورچے یعنی باہر ٹہلتی ٹہلتی ہوئی فوج کے سامنے ڈٹنے کے لئے غازیوں کی تلاش ہوئی تو سب کی گردنیں ڈھلک گئیں۔ جوش و خروش سرد ہوا اور ولولوں پر اوس پڑ گئی۔ آخر ایک گروہ نے دل ہی دل میں کچھ فیصلہ کر فضل دین بدمعاش کی قیادت میں کھڑکی کا رخ کیا۔ لوگ سمجھے کہ غالباً یہ وکٹوریہ اسپتال کی جانب سے ٹھنڈی ہاؤس پر ہلہ بولیں گے لیکن کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ انہوں نے جھگڑا گھر کے اندر ہی نمٹا لیا ہے۔ سنا ہے کہ دو آدمی سہارا دے کر انگنا کہار کو اس کی تربمنا کو کھڑکی سے باہر لائے اور فضل دین بدمعاش نے اپنا رامپوری چاقو اس کے جھریوں بھرے پیٹ میں بھونک دیا۔ انگنا ایک حیرانی کے عالم میں یہ سب کچھ دیکھا کیا اور زبانِ حال سے صرف اتنا کہا۔

ع قتل کیا آن کر اچھا کیا

آج اس واقعہ کو سترہ اٹھارہ برس گزر گئے۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔ انگنا کی زندگی، انسانی عظمت بھلمانسی اور پرخلوص خدمت کا جب بھی خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ انگنا کی موت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اس کے انتم بلیدان نے انسانوں کے ایک گروہ کو روحانی آسودگی بخشی، ان کے انتقامی جذبے پر تسکین کے چھینٹے دئے۔ اس نے جیتے جی جن کی خدمت کی آخر انہیں ججمانوں کی خاطر ایک دن وہ جان سے گزر گیا۔ انگنا کی موت بھی فضل دین جیسے ہزاروں لاکھوں کی زندگی سے بہتر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میں انگنا کو مردہ نہیں جانتا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ آج بھی زندہ ہے۔ اس دنیا میں موجود ہے اور شاید کھڑکی تفضّل حسین کے چوراہے پر پچھلی رات کو جو سر پڑا دکھائی دیتا ہے وہ انگنا کہار کا سر ہے۔

انگنا بیچارے کو اپنے ججمانوں کے قدموں سے لگے رہنے کی خواہش پامال تک نہیں ہونے دیتی۔ ؎

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو (میرؔ)

X

چندر پرکاش شاد

یہ عرصۂ حیات

بادِ رواں کے ساتھ اُڑی ریت ہر طرف
راہوں کے جو نشاں تھے مٹاتی چلی گئی
جو سایہ دار پیڑ تھے ڈھاتی چلی گئی
طوفان بھی آئے آگ بھی برسی فضاؤں سے
تاریکیوں کے ناگ بھی پھُنکارتے رہے
منزل کی سمت بڑھنے کا جب حوصلہ کیا
ہر گام پر فریب کے کانٹوں نے ڈس لیا!

جو حال کل تھا آج بھی ویسا ہی حال ہے
اس حال میں تو سانس بھی لینا محال ہے

انسان بے نوا ہی سہی ایسے حال میں
اُلجھا ہوا ہے لاکھ فلاکت کے جال میں
ہر لمحہ ایک شورشِ بارانِ قہر ہے
اس عرصۂ حیات میں ہر سمت زہر ہے
لیکن نگارِ شوق کو پانا ضرور ہے
جینے کی کوششوں میں ابد کا سُرور ہے

صحرائے بے کنار کو زخمِ شکست اور
لے آ ہوئے اُمید ذرا ایک جَست اور

—X—

اکبر کاظمی

دو غزلیں

وہ آفتاب جو دیکھا تھا تیری راہوں میں
تپش ہے اس کی ابھی تک مری نگاہوں میں
کسی کی آنکھ میں اک روشنی سی دیکھی تھی
لگی ہے آگ مرے دل کی بارگاہوں میں
نہ ماہتاب میں دیکھی نہ عارضِ گل میں
وہ چیز جو ہے تری شبنمی نگاہوں میں
نہ مجھ کو ذوقِ طلب ہے نہ تجھ میں فیاضی
جبیں سیاہ کروں کیوں میں سجدہ گاہوں میں
تجھے تلاشِ سکوں ہے تو کاظمی سُن لے
نہ میکدوں میں ہے یہ شے نہ خانقاہوں میں

جو لوگ اپنی آگ میں جل کر تباہ ہوئے
شعلے اُڑے جو اُن کے وہ عنوانِ راہ ہوئے
کٹی زندگی وہی جو تیری یاد میں کٹی!
لمحے جو تیری دھن میں نہ گزرے گناہ ہوئے
سنورے انہیں کے فیض سے کچھ نقشِ زندگی
جو ولولے دلوں میں کبھی بے پناہ ہوئے
ہم نے انہیں کی لَو میں شبِ غم گزار دی
شب کے وہ رنگ جو تری زلفِ سیاہ ہوئے
ہم نے دیا حیات کو اندازِ دلبری
ہم نے بہت گناہ کئے بے گناہ ہوئے
دیکھا ہے انتہائے تصور میں وہ سماں
صدیاں سمٹ کے ساتھ ہوئیں سال ماہ ہوئے
جو لوگ اپنے عزم کے پکّے تھے کاظمی!
وہ آسمان کے مہر و ماہ ہوئے

—X—

شاہد احمد دہلوی

دلّی کی ایک پُرانی حویلی

کوچہ نواب مرزا میں نواب آغا مرزا کی حویلی کون نہیں جانتا؟ کھڑی آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ اس حویلی نے بھی کبھی اچھے دن دیکھے تھے۔ شہر آبادی کے زمانہ میں اس حویلی کی ڈیوڑھی پر بھی ہاتھی جھولتے تھے۔ صبح شام نوبت جھڑتی تھی۔ نواب مرزا پوتڑوں کے رئیس تھے۔ ان کے پُرکھے صدیوں پہلے ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ صاحب سیف ہونے کی وجہ سے انہیں شاہی افواج میں پنج ہزاری کا عہدہ مل گیا تھا۔ ان کی بہادری کے کارناموں نے انہیں اور فروغ دیا۔ تلوار کے دھنی تھے کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھا بھلا جو شخص ہتھیلی پر سر لئے پھرتا ہو اس سے کون جیت سکتا ہے؟ ان کی فتوحات نے انہیں بادشاہ کے مقربین میں شامل کر دیا تھا۔ سپہ گری پشت در پشت ان کے ہاں چلتی رہی۔ آخر میں جب شاہی بے جان ہوگئی تھی تو ان کے آبا و اجداد کی تلواریں بھی لہو چاٹنا بھول گئی تھیں مگر ان کے اعلیٰ منصب شاہی درباروں میں قائم رہے۔ گاؤں گراؤں اور جاگیریں آخری تاجدار دہلی تک ان کے خاندان میں رہیں۔ ۱۸۵۷ء میں جب فرنگیوں کو نکال باہر کرنے کی جدوجہد ہوئی تو نواب مرزا نے کئی محاذوں پر جی توڑ کر داد شجاعت دی۔ ان کا دستہ شب خون مارنے میں اس قدر مشہور ہوگیا تھا کہ ان کا نام سنکر ہی غنیم کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے۔ فوجی فراست کے باوجود فرنگی بھی حیران ہوتے کہ مرزا کو کیسے ان کے کمزور پہلوؤں کی خبر ہو جاتی ہے اور مرزا اس طرح ان کی فوجوں میں گھس آتا ہے جیسے بھیڑوں کے گلے میں بھیڑیا گھس آئے اور دم کے دم میں سب کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر ڈال جاتا ہے۔ دراصل مرزا کے گوئندے طرح طرح کے بھیس بدل کر گھومتے پھرتے تھے۔ اور ذرا ذرا سی بات مرزا کو پہونچاتے رہتے تھے۔ مرزا کا دستہ اپنی کامیابیوں کی وجہ سے چھلاوا مشہور ہوگیا تھا مگر ایک مرتبہ یا تو صحیح حالات معلوم نہیں ہوئے یا مرزا نے اندازہ لگانے میں غلطی کی۔ ہوا یہ کہ دشمن کی صفوں میں ضرورت سے زیادہ آگے بڑھ گئے اور دشمن کے نرغے میں آگئے۔ جب اس میں سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو انہوں نے اپنے دستے کو للکار کر بتایا کہ "غازیو! تم ان میں سے نہیں ہو جو دشمن کو پیٹھ دکھاتے ہیں۔ تمہیں اپنا قول یاد ہے نا؟ تخت یا تختہ! جیو تو غازی، مرو تو شہید۔" اس للکار سے غازیوں میں وہ جوش و خروش پھیلا کہ انہوں نے دشمن کے دانت کھٹے کر دیئے۔ مگر مقابلہ سینکڑوں اور ہزاروں کا تھا، پھر غنیم کو برابر کمک پہنچ رہی تھی۔ مرزا کا ایک ایک آدمی کٹ مرا اور جب صبح کاذب نے مشرق میں اپنا دھندلکا پھیلانا شروع کیا تو کسی نے مرزا کی پشت میں ایسی سنگین ماری کہ مرزا کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے گر پڑے۔ اور بندوں نے ان کی تکا بوٹی کردی۔ جب مشرق میں خونیں شفق پھولی تو مرزا کے دستے کا ایک فرد بھی زندہ نہیں تھا۔

جب ایسے جانباز نہیں رہے اور اقتدار و اختیار کے لئے کمانڈروں میں پھوٹ پڑی تو دیسی فوجوں کو پے در پے شکستیں ہونے لگیں یہاں تک کہ فرنگیوں کی فوجیں کشمیری دروازے سے آلگیں۔ جب بادشاہ کو اندازہ ہوگیا کہ اب شکست یقینی ہے تو لال قلعے سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں چلے گئے۔ لال قلعہ سے نکلنا اور دیسی فوجوں کے پاؤں اکھڑنا جس کے جہاں سینگ سمائے بھاگ کھڑا ہوا اور فرنگیوں کی فوجیں دندانہ شہر میں گھس آئیں۔ اب جو بے گناہ شہر والوں کا قتل عام شروع ہوا تو نادر شاہ کا قتل عام ان کے آگے گرد ہوگیا۔ لوٹ ایسی مچی کہ دلّی کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور دفینوں اور خزینوں کی تلاش میں دلی پر گدھوں کے ہل پھروا دیئے گئے۔ وہ تو کہیئے کہ ایک فوجی دستہ پادریوں کی حفاظت کے لئے قریب ہی متعین کر دیا گیا تھا جس کی وجہ سے کوچہ نواب مرزا لٹنے والی

فوجوں کی دست برد سے بچ گیا۔ ورنہ آج آغا مرزا کی حویلی میں بسنے والوں کا نام و نشان تک نہ ہوتا۔

دلّی پر جب یہ غضب ٹوٹا تو آغا مرزا کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ باپ تو میدان کارزار میں کام آ ہی چکے تھے۔ آغا مرزا کو اندازہ ہو گیا تھا کہ دلّی کے بُرے دن آ گئے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنے سارے خاندان کو لے کر کسی نہ کسی طرح الور پہنچ گئے تھے۔ شہر سے نکلتے ہی رات کے اندھیرے میں ایک طرف سے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ آغا مرزا نے شکرم میں رکوائیں۔ عورتیں "ہائیں ہائیں" کہتی رہیں اور یہ کود کر اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ایک پنڈہ اٹھلائے آ گئے اور اپنی شکرم میں اس پلندے کو ڈال پھر روانہ ہو گئے۔ یہ دراصل ایک زخمی میم تھی جسے اس کے ساتھیوں سمیت باڑھ مار دی گئی تھی۔ میم زخمی تو بہت ہوئی تھی مگر مری نہیں تھی۔ اب جو کئی گھنٹے بعد اُسے ہوش آیا تو "پانی پانی" کہہ رہی تھی۔ مرزا نے بگھارے میں سے پانی کٹورے میں ڈال کر اس کے منہ سے لگایا۔ اس نے پانی پی کر آنکھیں کھول دیں اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ دیسی آدمیوں میں گھری ہوئی ہے تو دوبارہ بے ہوش ہو گئی۔ مرزا نے پانی کا چھینٹا دیا اور اسے انگریزی میں سمجھایا کہ تم دوستوں میں ہو۔ رات بھر سفر کرنے کے بعد صبح کو آبادی سے دور پڑاؤ ڈالا۔ مرزا کی والدہ اور بہنوں نے میم کے زخموں کو پانی سے صاف کر کے پٹی باندھ دی اور اُسے دلاسا دیا کہ ہم تمہیں تمہارے آدمیوں میں پہنچا دیں گے۔ مگر ابھی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ پھر اسے سمجھا بجھا کر اپنے کپڑے پہنائے اور بیگم نے کہا "آج سے تم میری بیٹی ہو۔ جو کوئی پوچھے تو یہی بتانا" میم اچھی خاصی اردو بولتی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایک کرنل کی لڑکی ہے اور میرٹھ میں پیدا ہوئی تھی۔ باپ پنشن لے کر ولایت جانے والا تھا کہ میرٹھ کی فوجوں نے انگریزوں کی حکومت کے خلاف سرکشی شروع کر دی اور کئی انگریز افسروں کو مار ڈالا۔ کرنل گھوڑے پر سوار ہو کر ایسے گئے کہ پھر گھر نہ آئے۔ یہاں حالات اتنے خراب ہو گئے کہ اس لڑکی کو اپنی ماں کے ساتھ میرٹھ سے نکل کر دلّی روانہ ہونا پڑا تاکہ جنرل نکلسن کے فوجی کیمپ میں پہنچ جائے۔ مگر دلّی کے قریب جب ان کا قافلہ پہنچا تو ایک دیسی فوجی دستے نے انہیں روک کر باڑھ مار دی۔

الور پہنچ کر نواب مرزا نے ایک مکان کرایہ پر لیا اور ایک جرّاح سے میم کے زخموں کی مرہم پٹی کرائی۔ اس کے زخم بھرنے لگے۔ ادھر یہ ہوا کہ ایک جاسوس نے مرزا کا کھوج نکال کر فرنگیوں کو خبر کر دی کہ مرزا چھلاوا کا خاندان الور میں چھپا ہوا ہے۔ چھلاوا کا نام سنتے ہی صاحب کے تیور بگڑ گئے۔ حکم جاری کیا کہ پورے خاندان کو گرفتار کر کے الور سے لایا جائے۔ اور ان کی شناخت جاسوس سے کرائی جائے۔

یہ جاسوس دلّی کا ایک نامی بدمعاش تھا۔ جو کوچہ نواب مرزا ہی میں رہتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے اپنے محلّہ ہی میں کسی کی بہو بیٹی پر آوازے کسے تھے۔ اس کی شکایت نواب مرزا کو پہنچی تو انہوں نے محلّے کے چوراہے ہی میں اس بدمعاش کا منہ کالا کر کے جوتے لگوائے تھے اور اس سے کہہ دیا تھا "اگر آئندہ کبھی اس محلّے کا رُخ کیا تو یاد رکھنا گولی مار دوں گا۔" اسے اب بدلہ لینے کا اچھا موقع مل گیا تھا اور گھاتے میں انعام بھی ملنے والا تھا۔ لہٰذا اس کو نواب مرزا کے خاندان کی تلاش رہی اور رفتہ رفتہ اس نے پتہ لگا لیا۔

لو صاحب حکم کی دیر تھی کہ ایک فوجی دستہ اس جاسوس کو لے کر فوراً الور پہنچا۔ جیسے ہی آغا مرزا باہر آئے جاسوس نے کہا "یہی ہے۔ یہی ہے۔" آغا مرزا پوچھتے ہی رہے "کیا بات ہے؟ آپ کو کس کی تلاش ہے؟"

اور انہیں فوراً ہتھکڑی ڈال دی گئی۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ دو بہلیوں میں سب کو بھر کے فوجی دستہ دلّی روانہ ہو گیا۔ بیگم کو غش پر غش آتے رہے اور میم انہیں دلاسے دیتی رہی کہ آپ بالکل نہ گھبرائیں۔ جب انگریز افسر کے سامنے ہمیں پیش کیا جائے گا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر بیگم کا دم ہوا ہوا جاتا تھا۔ اور وہ رہ رہ کے کہے جاتی تھیں "میرا بچہ۔ ہائے میرا بچہ۔"

راستہ بھر کسی کے منہ میں کھیل تک اُڑ کے نہیں گئی۔ تھکن اور بھوک سے نڈھال یہ قافلہ جب دلّی پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ انہیں فوجی بارک کے قریب ایک کوٹھری میں اُتارا گیا اور ایک اردلی ان پر پہرہ دار مقرر ہوا۔ مرزا کو حوالات میں بند کیا گیا۔ بیگم اور بہنوں نے نمازیں پڑھ پڑھ اور دعائیں مانگ مانگ کر رات کاٹی۔ صبح ہوئی تو ان سب کو فوجی عدالت میں حاضر کیا گیا۔ وہاں اور بھی بہت سے مسلمان گرفتار کر کے لائے گئے تھے۔ ان کی پیشی ہوتی بغیر کچھ سنے فوجی حاکم توپ دم کرنے یا پھانسی کی سزا فوراً سنا دیتا۔ ان بے گناہوں کو توپ کے منہ سے باندھ کر اڑا دیا جاتا یا جنگی پھانسی پر لٹکا دیتا۔ جب

آغا مرزا کی باری آئی تو جاسوس نے بیان دیا کہ یہی وہ شخص ہے جس کا باپ چھلاوا کہلاتا تھا۔ چھلاوے کا نام سنتے ہی حاکم کا منہ سرخ ہو گیا بولا "ہم اسے اپنے سامنے توپ دم کرائے گا۔" اتنے میں برقعہ پوش خواتین میں سے ایک نے آگے بڑھ کر اپنا نقاب اتار پھینکا اور انگریزی میں حاکم سے کچھ گٹ پٹ کی۔ غالباً اسے یہ بتایا کہ اس شخص نے میری جان بچائی ہے۔ حاکم نے حیران ہو کر میم کی طرف دیکھا۔ پھر مرزا کی طرف دیکھا کہا "اچھا ہم میم صاحب کی سفارش پر تمہیں چھوڑتا ہے مگر ہم تم کو سزا ضرور دے گا۔ تمہارے باپ کا سارا جاگیر ضبط۔" میم صاحب نے پھر کچھ حاکم سے کہا۔ اس نے سوچ کر کہا "ول تم نے میم صاحب کا جان بچایا۔ ہم نے تمہارا جان بچایا۔ تم نے میم صاحب کو اچھا کیا ہم بھی تمہارے ساتھ اچھا کرے گا۔ تمہارے باپ کا آدھا جاگیر تمہیں دے گا۔"

یہ فیصلہ سن کر سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ بیگم تو وہیں سجدے میں گر پڑیں۔ اور دونوں بہنیں میم صاحب سے لپٹ کر رونے لگیں۔ حاکم کے حکم سے مرزا کی ہتھکڑی کھول دی گئی۔ صاحب نے کہا "ہم گورنمنٹ سے تمہاری سفارش کرے گا تم اپنے گھر جا سکتا ہے۔ ہم تم کو پروانہ لکھ کر دیتا ہے۔"

لو صاحب یا تو مرزا توپ دم ہو رہے تھے، یا اعزاز کے ساتھ اپنے آبائی گھر پہونچا دیے گئے۔ حویلی ڈھنڈار پڑی تھی۔ فوجیوں نے اسے ایسا لوٹا تھا کہ اس میں تنکا تک نہیں چھوڑا تھا۔ جان بچی لاکھوں پائے، یہ وہی حویلی تھی جہاں چپے چپے پر رونق رہتی تھی یا اب در و دیوار سے ویرانی ٹپک رہی تھی۔ ایک تھکی ماندی کنبے کا لٹا ہوا قافلہ بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میم صاحب آئیں تو ان کے ساتھ کھانے پینے کا بہت سا سامان تھا۔ فوجی دستہ باہر ٹھہر رہا۔ میم صاحب نے کہا "آپ پریشان نہ ہوں۔ میں نے سب انتظام کر دیا ہے۔ فوجی گارڈ آپ کی حفاظت کرے گا۔ اور میں ابھی آپ کے ساتھ رہوں گی۔ میں کمانڈر صاحب سے مل کر آئی ہوں۔ وہ آپ سے بہت خوش ہیں۔ میرے فادر کو بھی انہوں نے کرنال پیغام بھیج دیا ہے۔"

قصہ مختصر کمانڈر صاحب کے حکم سے حویلی پھر سج سجا کر دلہن بن گئی۔ کرنل صاحب کرنال سے آئے تو بیٹی کو زندہ دیکھ کر ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری ہو گئے۔ بار بار آغا مرزا کا شکریہ ادا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ "میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ اجازت دو کہ میں اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔ ملکہ نے معافیوں کا اعلان کر دیا ہے۔ اب دہلی پھر آباد ہو جائے گی۔ میں کچھ عرصہ دلی میں رہوں گا۔ پھر پنشن لے کر ولایت چلا جاؤں گا۔" سب نے میم صاحب کو خوش دلی سے رخصت کیا مگر وہ جب تک دلی میں رہیں برابر ملنے آتی رہیں۔ حکومت کی طرف سے آغا مرزا کو نواب کا خطاب اور دو ہزار کا وثیقہ ملا۔ ان کے نوابی ٹھاٹ پھر قائم ہو گئے۔

دلی بھی عجیب شہر ہے کہ اس کے ہر بگاڑ میں ایک بناؤ ہے۔ بیسیوں دفعہ لٹی اور ایسی لٹی کہ کھنڈر ہو گئی۔ مگر پھر آباد ہو گئی اور ایسی آباد ہوئی کہ پہلے سے بھی اس کی رونق بڑھ گئی۔ معافی کے بعد بچے کھچے دلی والے شہر میں واپس آ گئے۔ پھر باہر والے جوق در جوق آ کر آباد ہونے لگے۔ باہر والوں کو دلی ہمیشہ راس آئی۔ یہ بھی اسی شہر کی خصوصیت ہے۔ ڈپٹی بہاء الدین مرحوم کے صاحبزادے سلطان الدین صاحب نے اس خصوص میں ایک بڑی دلچسپ بات بتائی۔ انہوں نے کہا کہ "میری دادی صاحبہ فرماتی تھیں کہ دلی دلی والوں کی بیوی ہے اور باہر والوں کی ماں۔" میں نے دادی صاحبہ سے پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا "بیوی کی نگاہ شوہر کی جیب پر رہتی ہے اور ماں کی نگاہ اولاد کے پیٹ پر رہتی ہے۔"

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد دلی کی رونق بڑھتی ہی چلی گئی۔ فرنگیوں نے دلی کی مرکزی حیثیت کو نظرانداز کر کے کلکتہ کو نیا پایہ تخت قرار دیا۔ مگر دلی کی رونق میں کوئی فرق نہیں آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کتنے ہی مسلمان امیروں اور رئیسوں کے خاندان دلی میں پھر قائم ہو گئے۔ انہیں میں سے ایک وضعدار خاندان نواب آغا میر کا تھا۔ جب شہر میں جم جمی ہو گئی تو بڑی بیگم کو آغا میر کی شادی کی فکر ہوئی اور ایک دن انہوں نے بیٹے سے اس کا تذکرہ کیا۔ سعادت مند بیٹے نے کہا "امی جان مجھے بھلا آپ کی کسی تجویز سے اختلاف کرنے کی مجال ہو سکتی ہے؟ میں بسر و چشم حاضر ہوں۔ مگر کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ پہلے لڑکیاں اپنے اپنے گھر کی ہو جائیں؟" بیگم نے توقف کے بعد فرمایا "ہاں تمہارا خیال صحیح ہے۔ مجھے لڑکیوں کا بھی فکر ہے مگر ابھی ان کی طرف سے گنجائش ہے۔ جہاں آرا ماشاء اللہ پندرہ برس پورے کر کے سولہویں میں پڑی ہے۔ پھر اعزاز و رزنوں ابھی بچہ ہے۔ ابھی خیر سے اس نے بارہواں بھی پورا نہیں کیا۔"

آغا میر: "امی جان آپ فرمایا کرتی ہیں کہ لڑکی پرایا دھن ہوتی ہے۔"

بیگم :۔ ہاں بیٹا، لڑکیاں تو ماں باپ کے پاس امانت ہی ہوتی ہیں۔

آغا میر :۔ تو امی جان، جس کا یہ دھن ہے اور امانت ہے اسے سونپ کر پہلے سبکدوش ہو جائیے اور رہا، آپ یہ بھی تو فرماتی ہیں کہ لڑکی لکڑی کی بیل ہوتی ہے۔ تو یہ بیل اگر منڈھے چڑھ جائے تو بہتر۔

بیگم :۔ آغا بیٹے مجھے اس سے کب انکار ہے؟ اگر تمہاری مرضی یہی ہے کہ پہلے مہر افروز کا بیاہ ہو جائے تو چلو یونہی سہی۔ مگر ساتھ ساتھ اگر میں اپنی بہو بھی تلاش کر لوں تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔

آغا میر :۔ جیسی آپ کی مرضی امی جان۔

اس گفتگو کے بعد بیگم نے رشتوں کی تلاش شروع کر دی مگر انہیں اندازہ ہو گیا کہ بیٹے کی مرضی یہ ہے کہ پہلے بہن کا رشتہ ہو جائے۔ لہٰذا انہوں نے بیٹی کا جہیز تیار کرنا شروع کر دیا۔ لڑکے کا کیا ہے۔ لڑکے کی بری بازار میں کھڑی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو جائے گا۔

جس گھر میں بیری ہوتی ہے وہاں پتھر آتے ہی ہیں۔ آغا میر کے خاندان کا دیکھنا ہی کیا۔ اور ان کی دولت کا پوچھنا کیا؟ ان کا خاندان تو آفتاب ماہتاب تھا۔ ایسے ویسے رئیس کی تو ہمت بھی نہ پڑتی تھی کہ اس گھر میں رشتہ بھیجے۔

ایک دن ایک بڑی بی میلا سا برقعہ پہنے سٹر پٹر کرتی ڈیوڑھی میں آ پہنچیں۔ دربان نے پوچھا "بڑی بی تم کون ہو؟"

بڑی بی :۔ اے آدمی ہیں، اور کون؟

دربان :۔ یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ تم آدمی ہو مگر تم منہ اٹھائے کہاں گھسی چلی جا رہی ہو؟

بڑی بی :۔ اے ہے بھائی مجھے بڑی بیگم سے ملنا ہے۔

دربان :۔ تو ٹھہرو اپنا نام اور کام بتاؤ۔ میں اندر اطلاع کراؤں۔

بڑی بی :۔ اے اوئی! آدمی ہے کہ بچے کے بچے کرتا ہے۔ کوئی کام ہوگا۔ جبھی آئے ہیں۔

دربان :۔ ان فضول باتوں سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ نام اور کام بتاؤ۔

بڑی بی نے دیکھا کہ دربان پسیجنے والا نہیں تو خود پسیج گئیں۔

بڑی بی :۔ اے بیٹا میرا نام بستی ہے۔ میں مشاطہ ہوں، دنیا جانتی ہے مجھے۔

دربان نے اندر کے دروازے پر جا کر دستک دی۔ گل چمن نے آ کر پوچھا "کیا بات ہے؟"

دربان :۔ ایک بڑی بی آئی ہیں نام بستی بتاتی ہیں۔ کہتی ہیں میں مشاطہ ہوں۔ بیگم صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتی ہیں۔

گل چمن :۔ میں بیگم صاحب کو اطلاع کرتی ہوں۔

یہ کہہ کر گل چمن چلی گئی اور تھوڑی دیر میں واپس آ کر دربان سے بولی "بیگم صاحب نے فرمایا ہے کہ بڑی بی کو آنے دو۔"

دربان :۔ بڑی بی اب تم اندر جا سکتی ہو۔ ہم بغیر اجازت کے کسی کو اندر جانے نہیں دیتے۔

بڑی بی بغیر کچھ جواب دیئے برقعہ اٹھا کر اندر چلی گئیں۔ گل چمن نے انہیں بیگم صاحب کے پاس پہنچا دیا۔ بی بستی نے بیگم صاحب کو دیکھتے ہی دعائیں دینی شروع کر دیں۔ اللہ سلامت رکھے۔ بچوں کی خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں۔

بیگم بڑے دالان میں گاؤ تکیے سے لگی بیٹھی تھیں۔ سامنے پٹاری دھری تھی۔ کٹنے میں سے چھالیا نکالتیں اور کترتی جاتیں۔ بولیں "آؤ بیٹھو کیسے آنا ہوا؟"

بی بستی پسکڑا مار پائیں پر بیٹھ گئیں۔

بی بستی :۔ اے اللہ رکھے، ہمارا تو کام ہی خدمت کرنا ہے۔ ماشاء اللہ جیتے نواب کا کار کرنے کا کب ارادہ ہے؟

بیگم :۔ آہ میاں کی تو مجھے کچھ ایسی جلدی نہیں ہے خود ان کی بھی ابھی مرضی نہیں ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ پہلے بہنوں کے فرض سے ادا ہو جائیں۔

بی بستی :۔ بیگم آپ کا بچہ ہیرا ہے ہیرا۔ بڑے سے بڑے گھر والے ہاتھ جوڑ کر اپنی بیٹی دیں گے۔

بیگم نے پان بنا کر بوا بستی کو دیا۔ انہوں نے اپنا کلّا تازہ کیا۔ زردے کا بکّا بھرا اور دو چار دفعہ اپنا پوپلا منہ چلا کر پان گلّے میں سرکا لیا۔

بیگم :۔ یہ جو خان صاحب ہمارے محلے ہی میں رہتے ہیں ان کے لڑکے کا رشتہ تم ہی نے کرایا تھا۔

بی بستی :۔ کون سے خان صاحب؟ چٹکی پڑے میری یاد پر، کوئی بات نگوڑی یاد ہی نہیں رہتی۔

بیگم :۔ کریم اللہ خاں ہیں نا، گوڑگانوے میں تحصیلدار تھے۔ جن کا لڑکا سلیم اب نائب تحصیلدار ہے۔

بی بستی :۔ اے یہ اپنے تحصیلدار صاحب جن کا مکان کنوئیں کے سامنے ہے؟

بیگم :۔ ہاں وہی۔

بی بستی :۔ ہاں بیگم، تیورس کے سال میں نے ہی میاں سلیم کی شادی کرائی تھی، چیلوں کے کوچے والے ٹھیکیدار سلیمان کی صاحبزادی ہے۔ اسی کی بیٹھ پر کی ایک لڑکی ہے، بھلا سا نام ہے اس کا۔ خیر بیگم کیا بتاؤں۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے۔ ایسی سگھڑ کہ دسوں انگلیاں دسوں چراغ۔ اللہ نے بہت پیسہ دے رکھا ہے۔ لین دین بھی اچھا کریں گے۔ اگر آپ کہیں تو میں چھوٹے نواب کے لئے وہاں بات لگاؤں۔

بیگم :۔ بوا میں نے کہا نا تم سے ابھی، لڑکے کی جلدی نہیں ہے۔ البتہ لڑکی سیانی ہو گئی ہے۔ پہلے اس کا فکر کرنا ہے۔

بی بستی :۔ اے اس میں فکر کی کیا بات ہے بیگم؟ ہم آخر کس دن کام آئیں گے۔ میں تو رشتوں کا ڈھیر لگا دوں گی اپنی ننھی کے لئے۔

بیگم :۔ (ہنس کر) خیر بی ڈھیر تو نہ لگاؤ۔ ایک رشتہ لاؤ۔ مگر اچھا لاؤ۔ ہمیں تم جانتی ہی ہو۔

بی بستی :۔ بوا ایک میں کیا؟ سارا شہر جانتا ہے۔ دولت، عزت، شہرت، اللہ کا دیا سب ہی کچھ ہے۔ میں دو ایک ہی دن میں نام نویسی لے کر آتی ہوں۔ اللہ نے چاہا تو دیکھ کر آپ کا جی خوش ہو جائے گا۔

بیگم :۔ میں نے تحصیلدارنی سے تمہاری تعریف سنی ہے۔

بی بستی :۔ یہ ان کی مہربانی ہے۔ بستی اور رشتہ داؤں کی طرح نہیں ہے کہ زمین آسمان کے قلابے ملا کر ایسے ویسے رشتے کرا دے۔ نواب مجھے اجازت دو یہ کہہ کر بی بستی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور سلام کر کے رخصت ہوئیں۔ وہ تو نواب خورشید مرزا کے ہاں سے آئی ہی اس لئے تھیں کہ بڑی بیگم سے عندیہ معلوم کریں کہ لڑکی کی شادی کرنے پر آمادہ ہیں یا نہیں۔ نواب خورشید مرزا کا لڑکا رشید مرزا ماشاء اللہ ستر ہویں سال میں تھا۔ اس کے لئے دلہن کی تلاش تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ نواب مرزا مرحوم کی دو لڑکیاں ہیں۔ مرحوم نواب سے ان کی دوستی تو نہیں تھی۔ ہاں صاحب سلامت ضرور تھی۔ معاً انہیں ان لڑکیوں کا خیال آیا اور انہوں نے بی بستی کو بلوا کر اس رشتے کی ٹٹول کرنے کو کہا۔ بی بستی کے تو اب دونوں ہی میٹھے ہو گئے۔ ادھر نواب خورشید مرزا نے ان سے رشتے کے لئے کہا اور ادھر بڑی بیگم نے دونوں گھر کھرے تھے۔ بی بستی کی تو پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہو گیا۔

مسعود قمر تاباں

عظیم بیگ چغتائی

اُردو ناول میں ہمیشہ سے ظرافت کا عنصر شامل رہا ہے۔ ظرافت کے بغیر کسی بھی قصّے کو دلچسپ نہیں بنایا جا سکتا اور جب کوئی قصّہ دلچسپ ہی نہ ہوگا تو اسے قبول عام کی سند ملنا بھی مشکل ہوگی۔ شرر کے ناولوں کو اسی عنصر کی کمی نے روکھا پھیکا اور خشک بنا دیا۔ لیکن سرشار نے اسی عنصر کی بدولت شہرتِ دوام حاصل کرلی۔

منشی سجاد حسین نے پہلی بار اردو میں ایک مکمل ظریف ناول لکھ کر ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی۔ منشی سجاد حسین کی یہ روایت چراغ سے چراغ جلنے کے مصداق ایک نحیف و نزار مصنف کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اردو مزاح نگاری ایک طویل عرصے جس مزاح نگار کی منتظر تھی وہ عظیم بیگ چغتائی کے روپ میں ظاہر ہوا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنی ظریفانہ تصانیف سے اردو ادب میں ایک تہلکہ مچا دیا۔

عظیم بیگ چغتائی کے ظریف ناولوں اور قہقہوں سے بھرپور افسانوں نے اردو کے مزاحیہ لٹریچر کو وہ سب کچھ دے دیا جس کے لئے ایک زمانہ درکار تھا۔ اگر ہم عظیم بیگ کی مختلف تصانیف پر نظر ڈالیں تو چمکی، کمزوری، فل بوٹ، کھرپا بہادر، خطوط کی ستم ظریفی اور روحیہ پائر جیسے ناولوں سے لے کر خانم اور چغتائی کے دوسرے افسانوں تک مزاح کا ایک جہانِ رنگ و بو آباد نظر آتا ہے، جس کی سیر کرنے پر محسوس ہوتا ہے کہ مزاح کا کونسا گلِ شگفتہ ایسا ہے جس کی مہک ان کی ادبی تخلیقات میں موجود نہیں۔ عظیم بیگ نے مزاح نگاری کے تمام حربے بڑی چابکدستی سے استعمال کئے ہیں۔ اُن کے ہاں نہ تو آورش ہے اور نہ وہ الفاظ کو توڑ مروڑ کر مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ وہ زندگی کی چلتی پھرتی تصویروں کا جائزہ لیتے ہیں اور اپنے اردگرد کے واقعات سے پلاٹ تیار کرتے ہیں اور ان واقعات کو کچھ اس ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں کہ مزاح نگاری اُن کا قلم چومنے لگتی۔

مزاحیہ صورت واقعہ ایک مزاح نگار کا بہترین ہتھیار سمجھا جاتا ہے۔ عظیم بیگ نے اس ہتھیار سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے۔ اس ضمن میں "لفٹنٹ" اور "خطوط کی ستم ظریفی" کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔ جن میں مصنف نے اس حربے کو بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ مثلاً "لفٹنٹ" میں جب ڈاکٹر صاحب کے اعزازی لفٹنٹ ہونے کا تار آتا ہے تو ان کی بیگم اس کو اپنے بھائی کے یہاں لڑکا پیدا ہونے کی خوشخبری سمجھ کر خوشی سے پھولی نہیں سماتی ہیں، لیکن جب حقیقت ظاہر ہوتی ہے تو اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی ہیں۔ اس موقعہ پر عظیم بیگ نے وہ مزاحیہ صورت واقعہ پیدا کی ہے کہ قارئین کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ بالکل یہی حال خطوط کی ستم ظریفی کا ہے۔ اس ناول میں چغتائی ایک کھلنڈرے مزاح نگار کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک مالدار فلم ایکٹریس کی خوبصورت لڑکی کی شادی کا فرضی اشتہار اور پھر اس کے ہزاروں امیدواروں میں سے دو امیدواروں کو اس طرح ملاتا کہ ہر ایک خود کو امیدوار اور دوسرے کو لڑکی کا ماموں سمجھتا ہے۔ اس موقعہ پر چغتائی کے قلم نے ظرافت کی وہ گلکاریاں کی ہیں کہ بے ساختہ قہقہے جاگ اٹھتے ہیں۔

زبان و بیان کی بازیگری سے مزاح پیدا کرنا بھی مزاح نگاری کا کامیاب ہتھیار سمجھا جاتا ہے۔ عظیم بیگ چغتائی نے اس حربے سے بھی

کافی فائدہ اٹھایا ہے۔" خطوط کی ستم ظریفی" میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :

شادی کی پہلی ناکام کوشش کے بعد تو یہی دل چاہتا تھا کہ عمر شیریں تجرّد میں گذار دیں لیکن بدقسمتی یا خوش قسمتی سے شاعروں والے ہاتف غیبی نے یہ صدا دی ؎

اگر پہلے حملے میں شادی نہ ہو کئے جاؤ کوشش مرے دوستو

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

" پھر منہ بولے بھائی بہن کے رشتے کی بے چارگی " کمزوری " کی طرف توجہ دلا کر قاضیوں کی ان " چنگیزی کارگزاریوں کا ذکر کیا جو عموماً وہ رشتے کے بہن بھائیوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں اور پھر مفصل کیفیت ان مذبوحی حرکات کی بیان کی جو ناظرین پڑھ آئے ہیں کہ کس طرح ایک " جڑنگی " قاضی نے دو چچاؤں کی اولاد کو جو بہن بھائی کہلاتے تھے " بہ یک جنبش ریشں " گڈمڈ کر دیا۔

عظیم بیگ فطرتاً مزاح نگار تھے ، یہی وجہ ہے کہ ان کے اصلاحی اور حزنیہ فضا میں لکھے گئے ناول اور افسانوں میں بھی مزاح کی چاشنی ضرور موجود ہے " تفویض " ان کا ایک خالص اصلاحی افسانہ ہے۔ لیکن دلچسپی کے اعتبار سے کسی بھی اچھے مزاحیہ افسانے کے مقابل رکھا جا سکتا ہے وہ " تفویض " کو اگر خالص اصلاحی بنا دیتے تو شاید کوئی پڑھنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کرتا۔ لیکن عظیم بیگ نے اصلاح کی کونین کو بقول غلام احمد فرقت قہقہے کی شکر میں لپیٹ کر دیا ہے جس سے منہ بھی کڑوا نہیں ہو پاتا اور فائدہ بھی خاطر خواہ ہو جاتا ہے۔

عظیم بیگ چغتائی نے سرشار یا امتیاز علی تاج کی طرح کسی مخصوص مزاحیہ کردار کی تخلیق نہیں کی۔ لیکن ان کے تخلیق کئے ہوئے زندہ رنگ کردار ہماری آپ کی طرح اسی دنیا کے رہنے والے ہیں۔ ان کی کردار نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ فطرت سے بہت قریب ہیں جن میں کوٹ کوٹ کر زندگی بھری ہوئی ہے۔ " فل بوٹ " کا ہیرو عظیم بیگ کے وضع کئے ہوئے کرداروں میں ایک ممتاز خصوصیت کا حامل ہے۔ وہ ایک آئیڈیل مرد ہے جو اپنے سینے میں عاشق کا دل رکھنے کے ساتھ ساتھ عقل و شعور بھی رکھتا ہے۔ جب عقل و عشق کی لڑائی ہوتی ہے تو عقل کی فتح ہونا اس کے تدبر اور ذہانت کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔ " کمزوری " میں عظیم بیگ نے رانی شفقت جہاں کا کردار تخلیق کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان کو کردار نگاری پر کتنا عبور حاصل ہے اور وہ عورت کی نفسیات سے کس حد تک واقفیت رکھتے ہیں۔ سوانہ کی روحیں ، ایک خالص تخیلی ناول ہے۔ لیکن اس کے تمام کردار زندگی سے اتنے ہی قریب ہیں جتنے کہ ہم اور آپ۔ " تفویض " میں عظیم بیگ نے ایک مولوی کا کردار وضع کیا ہے اور صرف دو جملوں میں اس کے کردار کے تمام پہلوؤں کو ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے :۔ مولوی صاحب اپنی بیوی سے کہتے ہیں کہ :۔

" آپ میری منکوحہ بیوی ہیں۔ پانچ وقت کی نماز پڑھواؤں گا۔ بلکہ مارے نفلوں کے گھٹنے تڑوا دوں گا۔"

مولوی صاحب کے کردار کا دوسرا رُخ بھی دیکھئے :۔

" یاد رکھیو اگر تو نے پھر اس قسم کی باتیں کیں تو کفر کا فتوی دے کر اُدھیڑ کر رکھ دوں گا۔"

" خانم کے کردار کو اردو دنیا مشکل ہی سے فراموش کر سکے گی۔ خانم جو ہمہ صفت موصوف ہے۔ اور جس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے مسلسل افسانوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ خانم کی زندگی کا ہر رُخ اس کے کردار کی مخصوص نفسیات کو پیش کرتا ہے۔

عظیم بیگ کے ذہنی اور جذباتی مزاح کا پس منظر ہمیشہ اصلاح ہوتا ہے۔ حالانکہ ان کے یہاں طنز سے زیادہ ظرافت ہے۔

لیکن جہاں انہوں نے معاشرے پر طنز کیا ہے تو ایک مصلح یا واعظ بن کر نہیں بلکہ ایک مزاح نگار کے تیور دل سے۔ اور یہی ان کے طنز کا کمال بھی ہے کہ وہ بڑی گہری سے گہری چوٹ کر جاتے ہیں لیکن کوئی شخص اس پر ناگواری محسوس نہیں کرتا۔

عظیم بیگ کو مشرق سے محبت ہے۔ یہاں کے رسم و رواج سے ان کو عشق ہے۔ لیکن یہ عشق دیوانگی کی سرحدوں کو نہیں چھوتا ان کی ظرافت میں زہرناکی کی جگہ ایک معتدل لب و لہجہ اور ہلکا پھلکا مزاحیہ انداز ہے۔ "خانم" ہلکے پھلکے مزاح کا بہترین نمونہ ہے۔ خانم میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

> "تین چار روز تک خانم سے سخت ترین جنگ رہی، یعنی خاموش جنگ اِدھر وہ چُپ اُدھر میں چپ........ خاموش جنگ سے خدا محفوظ رکھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے گیس کی لڑائی ہو رہی ہو۔ عظیم کا گیس دم گھونٹے دیتا تھا...... چھ دن گزر گئے اور اب میں جنگ مغلوبہ لڑ رہا تھا۔ بہت کوشش کی مگر ہار گیا۔ سفر اُلٹا بھی بہت خراب تھیں۔ شاید معاہدۂ ورسائی جس طرح ترکوں کے لئے ناقابل پذیرائی تھا۔ اسی طرح میرے لئے بھی، مگر بقول کسے بزورِ شمشیر و بنوکِ سنگین مجھکو مجبوراً صلح نامہ پر دستخط کرنا پڑے۔"

عظیم بیگ فطرتاً مزاح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی شگفتہ طبیعت کے مالک تھے۔ جس کے باعث انہوں نے ایک مختصر عرصے ہی میں اردو ادب میں اپنے لئے وہ جگہ بنالی جو اتنی کم مدت میں کسی کسی خوش نصیب کو ہی حاصل ہوتی ہے۔ آج بھی ان کی بیشتر تصانیف کے نئے نئے ایڈیشن برابر شائع ہو رہے ہیں جس سے ان کی تخلیقات کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ دراصل عظیم بیگ نے کسی خاص طبقہ کے لئے نہیں لکھا بلکہ ان کی تمام تحریریں ہمارے سماج کے ہر طبقہ کے لئے یکساں طور پر تفریحی، اصلاحی اور افادی نقطۂ نظر کی حامل نظر آتی ہیں۔

عظیم بیگ کی تصنیفات کا جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ انہوں نے فن کی ترقی اور فنی روایات کے مغربی رجحانات کے دور میں جس طرح اپنے ادبی سرمائے سے اردو ادب کی خدمت کی ہے وہ متعدد لکھنے والے مل کر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس حیثیت سے عظیم بیگ ادبی دنیا میں اپنی ذات سے ایک انجمن نظر آتے ہیں۔ وہ زمانہ جب بقول مُلّا رموزی "رونے والے تو بہت تھے مگر روتوں کو ہنسانے والے آٹے میں نمک کے برابر تھے۔" عظیم بیگ چغتائی نے اپنے ناولوں، کہانیوں اور مضامین سے بسورتے ہوئے لوگوں کو باقاعدہ قہقہے لگانے پر مجبور کیا اور اپنے مخصوص اسلوب بیان کے ذریعہ مزاح پیدا کرکے اردو ادب کو ایک نئی روایت سے آشنا کیا۔ وہ خود ہنسوڑ اور شوخ طبیعت کے مالک تھے اور ان کی یہی شوخی ان کی تخلیقات میں بھی نظر آتی ہے۔ عظیم بیگ کا مطمح نظر صرف ہنسنا ہنسانا ہی نہیں تھا بلکہ وہ اپنے سماج کی اصلاح کے بھی متمنی تھے۔ چنانچہ ان کے مزاح کا محور سماج اور اس کی اصلاح ہے۔ یہ ان کا کمال تھا کہ انہوں نے مقصد کی قربان گاہ پر کبھی اپنے فن کو بھینٹ نہیں چڑھایا۔

حالانکہ عظیم بیگ چغتائی ظرافت کے میدان میں بہت بعد میں آئے مگر اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے مطلعِ ادب پر بڑی جلدی چھا گئے۔ وہ اپنے دور کے مقبول ترین ناول و افسانہ نگار تھے۔ انہوں نے جہاں پڑھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ پیدا کر لیا وہاں اردو کو ایک ایسی روایت بھی عطا کی جس نے اردو میں طنز و مزاح کے روشن مستقبل کی نوید سنائی۔ آج کے اکثر مزاح نگاروں کی تخلیقات میں ہم چغتائی کے پرتو کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔

مزاح نگاری سے قطع نظر عظیم بیگ چغتائی نے اردو ناول اور افسانے کو بھی ایک نئی روایت عطا کی اور ان فرسودہ روایات سے چھٹکارہ دلایا جو دامن ادب کی دین تھیں۔ اس حیثیت سے عظیم بیگ کا شمار ان گنے چنے ادیبوں میں کیا جاسکتا ہے جنہوں نے اردو ناول اور افسانہ نگاری کو ایک نئی ڈگر پر چلانے کے لئے زمین ہموار کی۔

—— X ——

علیم اختر مظفر نگری

غزل

دل ہے کس کا حریمِ جلوۂ ناز
کون ہے یہ درونِ پردۂ راز

نگہِ حُسن ہے نوا پرداز
اک زمانہ ہے گوش بر آواز

اُٹھ گئی رسم و راہِ ناز و نیاز
اب دلوں میں نہ سوز ہے نہ گداز

بن گیا خود ہی ایک پیکرِ ناز
عالمِ حلقہ ہائے زلفِ دراز

آج نم ہے وہ چشمِ سحر طراز
نگہِ یاس تیری عمر دراز

ہائے وہ عالمِ تغافلِ ناز
التفاتِ مخاطبت انداز

رازدارِ نگاہِ شوق تو ہیں!
عشوہ و ناز و غمزۂ غماز

رہ روِ راہِ شوق کیا جانے
راہ کے پیچ و خم، نشیب و فراز

آج یوں اُن کی یاد آئی ہے!
جیسے آتی ہو دور کی آواز

سازِ خاموشِ چشمِ نغمہ فروش
خود ہی نغمہ ہے، خود ہی نغمہ نواز

ہائے وہ آرزو کہ پنہاں ہے
دلِ پُرشوق میں بہ صیغۂ راز

دل کی ویرانیوں کا حال نہ پوچھ
سن رہا ہوں صدائے بے آواز

سازِ بے تابِ نغمہ و آہنگ
نغمۂ شوق، بے قرار ساز

ہائے وہ چشمِ مست، بادہ بہ جام
اُف وہ رطلِ گرانِ عشوہ و ناز

وہ خرامِ زمانۂ گزراں!
اُف وہ رفتار تیز و بے آواز

تیرے جور و ستم میں پوشیدہ
تیرے لطف و کرم کے ہیں انداز

ہائے کب موسمِ بہار آیا
پر ہیں باقی، نہ ہمتِ پرواز

کیا پھر ان کا خیال آیا ہے!
کون ہے، کس نے دی ہمیں آواز

دوستوں کی نوازشِ پیہم
ہائے اختر، وہ جامِ زہرہ گداز

مودود صابری

چُوڑیاں

الحذر! اے شاعرِ شیریں دہن شیریں زبان
امردوں کے ذکر سے رنگین ہے تیری داستان

آہ! یہ ایران کے دانشوروں کا ارمغان
حیف! ایسمائے ادب پر یہ سیاہی کا نشان

مرد کو پیدا کیا قدرت نے خدمت کیلئے
جوہرِ تسخیر بخشا عقل کے موتی دئے

ممکناتِ زندگانی سے اُسے واقف کیا
جرأت و ہمت عطا کی علم کا زیور دیا

لیکن اس بدراہ کی آشفتگیٔ شوق سے
عظمت و کردار کے روشن دئے گل ہوگئے

ابتذالِ ذہنِ انساں الحفیظ و الاماں!
مرد ہی نے مرد کو پہنا کے چھوڑی چوڑیاں

کارگاہِ زندگی میں مرد عورت ہوگیا!
بوالہوس دانشوروں نے فن کو کیا رسوا کیا!

—X—

نصیر سرواز

غزل

نغمات کی خوشبو لبِ اشعار میں کیا ہے
میں سوچ رہا ہوں تری آواز میں کیا ہے

مہکی ہوئی پرچھائیاں نکھرے ہوئے سائے
خوابوں کی طرح انجمنِ ناز میں کیا ہے

الفاظ کے بربط پہ زباں ڈول رہی ہے
اس پُرسشِ لب ہائے سخن ساز میں کیا ہے

آئینۂ فطرت کو کیا جس نے منوّر
دیکھ آئیں چلو اُس نگہِ ناز میں کیا ہے

اک شام کی افسردہ المناک سیاہی
مایوس سی بیٹھی ہے دربار میں کیا ہے

کیوں منزلِ ہستی کا پتہ بھول گیا ہے
آخر غمِ دوراں مرے انداز میں کیا ہے

میں کھول چکا گردشِ تقدیر کا عقدہ
جو مجھ پہ بھی کھلتا نہیں اس راز میں کیا ہے

کیوں شوق کی بانہوں میں کوئی جسم سا مہکا
آخر مری تخئیل کے اعجاز میں کیا ہے

جو فن کا شناسا نہ تخئیل کا صنم گر
اک شاعرِ آشفتہ سے پرواز میں کیا ہے

—X—

م۔ ح۔ زیدی

ہمارے ادیبوں اور شاعروں کا اخلاق

میں اس مضمون کو تبرکاً متقدمین سے شروع کرتا ہوں۔ اُن کے معاملہ میں یہ مشکل درپیش ہے کہ اُن کی زندگیوں کے اخلاقی پہلو ماضی کے دھندلکے میں ماند پڑ گئے ہیں۔ پھر بھی پرانے تذکروں میں ہمیں اُن کی کچھ جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مثلاً میرؔ کی بددماغی اور بدمزاجی مشہور ہے۔ اُنہوں نے خود بھی اپنے اشعار میں اپنی اِن عادات کا ذکر قابلِ ستائش صاف گوئی کے ساتھ کیا ہے۔ چونکہ اُن کی اِن عادات کی بنیاد سیرچشمی اور بے نیازی پر تھی اس لئے اس کو کج خلقی کہا جا سکتا ہے، بداخلاقی نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ غالبؔ کی شراب نوشی اظہر من الشمس ہے۔ وہ اُن شعرا میں سے نہیں تھے کہ جو محض زیبِ داستان کے لئے اپنے اشعار میں ساغر و مینا کا ذکر کیا کرتے ہیں۔ بلکہ وہ واقعی شراب خوار تھے۔ چونکہ شراب نوشی اسلامی معاشرہ میں کبھی جائز قرار نہیں پائی۔ اس لئے وہ اپنی اس اخلاقی کمزوری اور پُرمعصیت زندگی پر ہمیشہ پشیمان رہتے تھے اور یقیناً یہ پشیمانی ان کے کردار کا ایک خوبصورت پہلو تھا۔ جہاں تک شراب نوشی کا تعلق ہے، یہ کچھ زیادہ قابلِ گرفت گناہ نہیں۔ کم از کم اس دُنیا میں تو نہیں۔ عاقبت میں ہو تو ہو ؎ این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔ مگر شرابیوں میں بھی دو قسم کے گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو اعتدال کے ساتھ شراب پیتے ہیں اور شراب نوشی کے ساتھ کوئی دوسرا عیب نہیں کرتے۔ ایک وہ ہیں کہ جو اور بہت سی بے اعتدالیوں اور بداخلاقیوں میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔ موخر الذکر گروہ اخلاقی اعتبار سے بہت زیادہ قابلِ گرفت ہے۔

غالبؔ کی شخصیت میں صرف شراب نوشی کی بداخلاقی نظر آتی ہے۔ مگر سید انشا کی شخصیت ہر قسم کی اخلاقی قدروں سے معرا دکھائی دیتی ہے۔ ان کی ذہانت اور طباعی میں تو کسی کو کلام نہیں۔ مگر یہاں ذکر اُن کے اخلاق کا ہے۔ شاہِ اودھ کی مصاحبت میں وہ اخلاق سے کوسوں دور محض ایک بھانڈ بن کے رہ گئے تھے اور یہ مصرع اُن پر صادق آتا تھا ؎ واللہ کہ شاعر نہیں تو بھانڈ ہے بھڑوے۔

متقدمین کے اِس گروہ سے اگر ہم اور ماضیٔ بعید میں چلے جائیں تو قدامت کا دھندلکا اور بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً امیر خسرو اور حسن دہلوی کا معاشقہ بداخلاقی کی بجائے ایک روحانیت کا معجزہ تصوّر ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ شہزادہ سلطان محمد حاکم ملتان نے جس کی سرکار سے یہ ہر دو شعرا وابستہ تھے ایک مرتبہ اُن کی خراب شہرت پر ناراض ہو کر حسن کے ہاتھوں پر بید لگوائے جس سے اُن کے ہاتھ زخمی ہو گئے اور اُن سے خون جاری ہو گیا۔ امیر خسرو آدابِ دربار کے مطابق آستینوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے کھڑے تھے۔ جب شہزادہ نے برافروختگی کے ساتھ اُن سے بازپرس کی تو آستینوں سے ہاتھ باہر نکال کر دکھا دیئے اور یہ مصرع پڑھا ؎

گواہ عاشقِ صادق در آستیں باشد

شہزادہ اور اُس کے درباری یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ خسرو کے ہاتھوں پر بید کے نشانات موجود ہیں اور اُن سے خون ٹپک رہا ہے۔

متقدمین کی یہ چند مثالیں لکھنے کے بعد میں متاخرین کا ذکر کرتا ہوں جن میں زمانۂ حال کے ادیب و شعرا شامل ہیں۔ درحقیقت یہ مضمون لکھنے سے موجودہ ادیبوں اور شاعروں کی اخلاقی حالت کا اظہار مقصود ہے۔ موجودہ فنکاروں کا ذکر کرتے ہوئے یہ مشکل درپیش ہے کہ میں نام لے کر ان کا ذکر نہیں کر سکتا۔ متقدمین کا میں نے نام بنام اس لئے ذکر کر دیا کہ چونکہ وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اس لئے میری تنقید ان کے لئے دل آزاری کا باعث نہیں بن سکتی۔ اگر میں اپنے موجودہ فنکاروں کا نام بنام تذکرہ کروں تو ان کی یقیناً دل آزاری ہوگی اور میں بھی ہدفِ ملامت بنوں گا۔ علاوہ ازیں میرا مقصد اس مضمون سے اصلاح ہے نہ کہ دل آزاری و فتنہ انگیزی۔ اس لئے میں بغیر نام لئے موجودہ زمانہ کے کچھ مشہور ترین ادیبوں اور شاعروں کا ذکر کرتا ہوں کہ جو آج کل آسمانِ شہرت پر ستاروں کی مانند چمک رہے ہیں۔

برِصغیر کے ایک مشہور ترین شاعر اپنی شراب خواری اور بدکرداری کی وجہ سے اس قدر رسوائے زمانہ ہیں کہ ان کے ایک معاصر نے انکی ہجو و تحقیر میں اپنے ادبی جریدہ کا ایک بڑا ضخیم خاص نمبر نکال ڈالا۔ اگرچہ اس معاصر نے بھی اپنے ہم پیشہ و ہم مشرب فنکار پر کیچڑ اچھال کر کوئی مستحسن اقدام نہیں کیا، تاہم شاعر موصوف کو بالکل عریاں کر ڈالا۔ یہ شاعر صاحب بڑی حد تک صاف گو رند مشرب بھی واقع ہوئے ہیں اور اپنی غلط کاریوں کا اعتراف خود بھی بانگِ دہل کیا کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کی بدکرداری مسلم الثبوت ہے۔

پنجاب کے ایک صاحب کہ جو اردو کے مایۂ ناز ادیب و شاعر ہیں اور ایک ڈگری کالج کے پرنسپل بھی رہ چکے ہیں۔ انہوں نے چند سال پیشتر ایک عورت کے پیچھے خود کو اتنا ذلیل و رسوا کیا کہ جس سے ان کے احباب شرم سے زمین میں گڑ گڑ گئے۔ مگر وہ خود ایسے چکنے گھڑے واقع ہوئے ہیں کہ بوند پڑی اور پھسل گئی۔ اس پر طرّہ یہ کہ ادھیڑ عمر بال بچوں والے آدمی ہیں۔ وعدہ خلافی اور بدعہدی کا یہ عالم ہے کہ آپ کسی جاہل گنوار کا اعتبار کر سکتے ہیں مگر اس عالم و فاضل کے قول و فعل کا اعتبار نہیں کر سکتے۔

برِصغیر کے ایک نہایت مشہور غزل گو شاعر کی شراب نوشی کا یہ عالم تھا کہ بدمست ہو کر گلیوں میں مارے مارے پھرتے تھے اور بالآخر بے ہوشی کی حالت میں کسی گندی نالی میں پڑے ہوئے اٹھائے جاتے تھے۔ شراب نوشی میں یہ بے اعتدالی ایک شاعرِ نغز گو کے لئے یقیناً بڑی توہین آمیز تھی۔ ایک ایسے ہی شہرت یافتہ شاعر کا قصہ سنئے کہ اپنے ایک دوست کے ہاں جا کر مہمان ہوئے۔ دوست نے جملہ فرائضِ مہمانداری کو جن میں شراب پلانا بھی شامل تھا، نہایت پُرخلوص طریقے سے پورا کیا، حالانکہ غریب میزبان خود شراب نہیں پیتے تھے۔ صبح کو میزبان کے کوٹ کی جیب میں سے ایک سو روپے کے نوٹ چرا کر چمپت ہوئے۔ یہ بداخلاقی کی معراج تھی۔

برِصغیر کے ایک ترقی پسند افسانہ نویس کہ جن کا لوہا آج تک مانا جاتا ہے اخلاقی اعتبار سے بالکل صفر تھے اور دنیا بھر کے عیوب اُن کی ذاتِ گرامی میں موجود تھے۔ بعض لوگ تو اُن کے افسانوں کو بھی مخربِ اخلاق اور عریاں کہتے ہیں مگر میرا موضوع اس وقت یہ نہیں ہے کہ میں کسی فنکار کی تخلیقات پر تنقید کروں۔ میں تو صرف اُس کے ذاتی کردار پر تنقید کر رہا ہوں اور یہ رونا رو رہا ہوں کہ ایک فنکار ایسا ہی بھلا مانس کیوں نہیں ہوتا جیسا کہ ایک غیر فنکار عموماً ہوتا ہے۔

برِصغیر کے ایک مشہور ترین ڈرامہ نویس جن کو انڈین شیکسپیئر بھی کہا جاتا تھا، اخلاقی اعتبار سے مادر پدر آزاد تھے۔ شراب نوشی تو خیر کوئی عیب ہی نہیں۔ ان کی ذاتِ ستودہ صفات ہر قسم کے عیوب کا مظہر تھی۔

پنجاب کے ایک شہرۂ آفاق شاعر کا قصہ سنئے۔ آپ ایک مشاعرہ میں شرکت کے لئے کہیں باہر تشریف لے گئے۔ سردی کا زمانہ تھا۔ بانیٔ مشاعرہ سے رات کو پہننے کے لئے نائٹ گاؤن عاریتاً مانگا۔ صبح کو جاتے ہوئے گاؤن کو بستر میں لپیٹ کر چلتے ہوئے۔ جو نذرانہ بانیٔ مشاعرہ نے خدمتِ اقدس میں پیش کیا وہ مزید برآں۔

اب ذرا صحافیوں کا بھی تھوڑا سا ذکر خیر کرتا چلوں، کیونکہ وہ بھی ادیبوں اور شاعروں کے زمرہ میں شامل ہیں۔ جو مضمون نگار اُن کے اخبارات و رسائل میں شائع کرنے کے لئے مضامین ارسال کرتے ہیں اُن کا شائع کرنا یا نہ کرنا تو اُن کی اپنی پسند پر منحصر ہے لیکن مسترد شدہ مضامین کا واپس بھیجنا صحافیوں کا اخلاقی فرض ہے خصوصًا ایسی صورت میں جبکہ غریب مضمون نگار واپسی کے لئے جوابی ٹکٹ یا لفافہ بھی مضمون کے ہمراہ بھیجتے ہوں اور استدعا کرتے ہوں، کہ اگر مضمون قابلِ اشاعت نہ ہو تو براہِ کرم واپس بھیج دیا جائے۔ لیکن مشاہدہ میں یہ آیا ہے کہ ناقابلِ اشاعت مضامین کو اکثر صحافی حضرات ردّی کی ٹوکری میں پھینک کر جوابی ٹکٹوں یا لفافوں کو ہضم کر جاتے ہیں۔ اور یاد دہانیوں کا بھی جواب نہیں دیتے۔ ایڈیٹر صاحبان کا یہ طرزِ عمل نہایت گھٹیا قسم کی بداخلاقی ہے۔ انہوں نے انگریزی طرز پر اخبار و رسائل چھاپنا تو سیکھ لیا مگر انگریز صحافیوں کے اخلاق کی اُن کو ہوا تک نہیں لگی۔

ہمارے ادیبوں اور شاعروں کی بداخلاقیوں کا سلسلہ ایسا لامتناہی ہے کہ کہیں ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ میری انگلیاں فگار ہیں اور خامہ خونچکاں۔ صاحبِ علم اور صاحبِ ذوق لوگ قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ اگر جاہل اور گنوار لوگ بداخلاق ہوں تو اتنا گراں نہیں گزرتا جتنا کہ اہلِ علم لوگوں کا بداخلاق ہونا۔ جو لوگ اخلاق کے علم بردار ہوتے ہوئے بداخلاق ہوں تو اُن پر تو وہی مثل صادق آئے گی کہ ؎ چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔ آپ یقین کریں کہ ہمارے ملک کے شاعر عمومًا بدچلن اور بدقماش سمجھے جاتے ہیں۔ شراب نوشی۔ شاہد بازی اور دھوکہ بازی اُن کا معمول ہے۔ آپ کہیں گے کہ پانچوں انگلیاں کبھی برابر نہیں ہوتیں۔ ادیبوں اور شاعروں میں بداخلاق بھی ہوتے ہیں اور بااخلاق بھی۔ آپ کا کہنا کسی حد تک درست ہے مگر ہمیں اُس تناسب کو دیکھنا ہے کہ جو فنکار اور غیر فنکار لوگوں کی تعداد میں ہے۔ فنکاروں کی تعداد غیر فنکاروں کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسا آٹے میں نمک۔ اتنی تھوڑی نفری میں بداخلاق لوگوں کی اتنی بڑی تعداد بہت روح فرسا ہے۔ شاید اس میں مبالغہ نہ ہوگا کہ ادیبوں اور شاعروں میں مشکل سے ایک چوتھائی لوگ بااخلاق اور نیک چلن ہوں گے۔ ورنہ تین چوتھائی شراب خوار، بدچلن اور بدمعاملہ نکلیں گے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کیونکہ میں بھی کم و بیش اُسی گروہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں ادیبوں اور شاعروں سے ولی اللہ ہونے کی توقع نہیں رکھتا کہ وہ ہر عیب سے بری ہوں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ وہ "بد" بیشک ہوں مگر "بدنام" نہ ہوں۔ عیب تریب قریب ہر شخص کرتا ہے۔ مگر اُس کو ایک بُری بات سمجھتے ہوئے اُس کو حتی الامکان چھپا کر کرتا ہے اس لئے اُس کے عیوب منظرِ عام پر نہیں آتے۔ برخلاف اِس کے ادیبوں اور شاعروں کے عیوب بالکل طشت از بام ہوتے ہیں کیونکہ وہ اُن کو چھپانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ شاید اُن کا فلسفہ یہ ہو کہ عیب کو چھپا کر کرنے کی بجائے اُس کو ڈنکے کی چوٹ کرنا زیادہ ترین اخلاق ہے۔ اِس فلسفہ کے صحیح یا غلط ہونے کے متعلق میں ایک نئی بحث کا آغاز کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ مندرجہ ذیل سوالات پر اپنے ادیب مفکروں کو دعوتِ فکر دیتا ہوں۔

(۱) کیا ہمارا شعر و ادب بداخلاقیوں کا سرچشمہ ہے اور بُرائیوں کو جنم دیتا ہے ؟

(۲) اگر ایسا ہے تو ہمیں اپنے شعر و ادب میں کونسی اصلاح کی ضرورت ہے ؟

(۳) اگر ایسا نہیں ہے اور یہ بداخلاقیاں ہم میں پہلے سے موجود ہیں تو تحصیل علم و ادب کے بعد یہ رفع کیوں نہیں ہو جاتیں ؟ کیا ہمارے علم و ادب میں بداخلاقیوں اور بدکرداریوں کے دُور کرنے کی صلاحیت نہیں ہے ؟

ناشر حامدہ بیگم نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر پی، آئی، بی کالونی ۵ سے شائع کیا

مجبوب اللہ مجیب

غزل

حوصلے تیز ہوئے، بے سر و ساماں ہوکر
لذتِ درد بڑھی، چاک گریباں ہوکر

شامتِ ہجر، مہکنے لگے گیسو تیرے
یا صبا آنے لگی، کوچۂ جاناں ہوکر

وادیٔ غم میں بڑی دیر سے پہونچی تھی سحر
حسرتیں پھیل چکی تھیں، شبِ ہجراں ہوکر

شہ نشینی بھی گئی، صحرا نوردی بھی گئی
زندگی رہ گئی، بس آپ کا ارماں ہوکر

ہر قدم پر یونہی گر آپ، سہارا دیتے
زندگی ہم سے نہ ملتی، کبھی نالاں ہوکر

پھر ترے ذکر سے آنے لگی، خوشبو تیری
کھل گئے، زخم جگر، شمعِ فروزاں ہوکر

عشق کہتے ہیں کسے، آبلہ پائی کیا ہے
ہم نے سیکھا ہے اسے، آپ پہ، قرباں ہوکر

مظہر امام

غزل

جسم و جاں کے کانچ سے نازک رشتے ٹوٹ ہی جاتے ہیں
دل کے پھپھولے وقت آنے پر اک دن پھوٹ ہی جاتے ہیں

میری رقابت میں ہی آخر تم آئے تو منزل تک
راہِ وفا میں ورنہ اکثر ساتھی چھوٹ ہی جاتے ہیں

دل کو پتھر کر لینے کا ہم نے کچھ فن سیکھا ہے
اک ذرا سی ٹھیس پہ ورنہ شیشے ٹوٹ ہی جاتے ہیں

طوفانوں میں کود پڑیں ہم، کشتی کا غم کرنا کیا؟
ساحل سے ٹکرا کے سفینے یوں بھی ٹوٹ ہی جاتے ہیں

چاہو تو ہشیار رہو، ہشیاری سے کیا ہوتا ہے!
لوٹنے والے دل کے نگر کو اک دن لوٹ ہی جاتے ہیں

تعارف کتب

سفر

نتیجۂ فکر:۔ ایس، اے، رحمان　　　　ناشر:۔ مرکزی مجلس ترقی اردو، لاہور
زیبائش:۔ عبدالرحمن چغتائی　　　　حجم:۔ ۸۰ صفحے. قیمت تین روپے ۵۰ پیسے

یہ کتاب ٹائپ کی مطبوعات کا بہترین نمونہ، اعلیٰ درجہ کے دبیز کاغذ پر عبدالرحمن چغتائی کی دستی تصویروں سے مزین، اس قدر جاذب نظر ہے کہ اس کی نظیر اردو مطبوعات میں دو چار ہی ملیں گی. موضوع بھی دلکش ہے. یعنی ۱۹۴۷ء کی تقسیم ہندو پاکستان کے فسادات کے دوران ایک تہی دست مسافر کا ایک لاوارث بچے کے ساتھ مشرقی پنجاب سے مغربی پنجاب کا سفر اور اُس کا خواب. اس نظم کی ترتیب میں جن اصحاب سے مفید مشورے لئے گئے اور سند قبول حاصل کی گئی ان میں سید امتیاز علی تاج، فیض احمد فیض، فضل احمد کریم فضلی، کرنل مجید ملک کے نام نامی بھی شامل ہیں اور ان سے قاری کی آتش شوق تیز ہو جاتی ہے. مگر افسوس ہے کہ مطالعہ کے ساتھ یہ آتش دھیمی ہوتے ہوتے ٹھنڈی ہو جاتی ہے.

محاورات اور زبان کی غلطیاں، ہندی الفاظ کے بے محل استعمال، واقعاتی غلطیاں، فنی، عروضی غلطیاں، تنغّص و تکدّر کا باعث ہو جاتی ہیں، اور تعجب ہوتا ہے کہ شعرا و ادبا موصوف نے اسے کس طرح خلعت قبول بخشا؟

ایسی بے شمار غلطیوں میں سے بطور نمونہ صرف چند کی نشان دہی کی جاتی ہے:۔

محاورات:۔ جاتی بندھن سخت کڑے ہیں. خدا حکمتیں اپنی خود آپ جانے. پاؤں جما کے صورت سنگین حصار اُٹھ جو گرد بیٹھی تو تنگ گھاٹی کے مُکھ سے اک رتھ سوار اٹھا (بجائے نکلا)

بے موت جب کہ مر چکی ہے زندگی کی لو. ملت کے خود شناس. مقدر نگار اُٹھ. سبک تھا قدم اور سفر مست راہی قریب آیا. اک جھنڈ کے دن نکلتے (کس کا جھنڈ؟). تراز و مذکر.

راجہ کی جمع راجے اور راجوں. پنڈت آئے لالے آئے.

بے محل ہندی: گاندھی جی کی بو بو ہے. افرنگی کی ہو گی کھے. خونریزیوں کو تجکر کشکو بنا اشوکا.

دن کو اجالے مرے شمس النہار اٹھ. نئی من لگن ہے جو مکا ہے ہو. کہ اک جیب میں ملا ٹھنڈا پانی ہے. دیکھا میں اس کی نیادار پانی (دیکھا بھالا کے مفہوم میں)

واقعاتی غلطیاں: کھدر کی دو پلی ٹوپی. سر چڑھ کر جلسوں میں ابھری دیہ ٹوپی دو پلی نہیں تھیلی سی ہوتی ہے. جو موڑ موڑ کر ٹوپی بنائی جاتی ہے، لمبی سی گنجی سی گردن اٹھائے.

ناموزوں: بکھرے ہیں پھول ہر طرف نشتر بھی ساتھ ہیں. سدا بہ بیت کی ریت ہم نے نبھائی. نعرے گونجے اللہ اکبر، ہے بڑا دھرم یتیم گرہ بھی تھپنا ہے پڑا. ملک بادشاہ سلامت کا حکم کمپنی بہادر کا.

حرفوں کا دہنا : گوتم دکھوں کی دنیا سے منہ موڑ کر چلا۔ لیکن تھا دور آسماں اور سخت تھی زمیں۔
قوافی : ٹیکتا اور دیکھنا۔ شمشیریں چمکیں۔ زنجیریں چھنکیں۔ تڑپتے رہ گئے اور پرکھتے رہ گئے ۔ دائیں بائیں اور نگا ہیں۔
رہا موضوعِ نظم کی دلچسپی کا سوال، تو کشتی میں تنہا مسافر کے خواب میں تمام ہندو مسلم ادوارِ تاریخ کی سرسری سیر کے بعد انجام پھُس پھُسا سا رہ جاتا ہے۔ ساحلِ پاکستان پر پہنچ کر ؎

پیام آشنا کو ملا آشنا سے — صدا آ رہی تھی یہ ارض و سما سے
مبارک سفر تیرا حق کے مسافر — پرے چرخ سے ہے تری ترکتازی
"ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں"

یعنی تماشا ختم اور پیسہ ہضم۔ خیالی کشکول ہاتھ سے اکھڑ گیا۔ بچے کا کیا بنا؟ کوئی ذکر نہیں۔ اس کے بعد چند غیر متعلق نظمیں ہیں۔

م۔ عظیم آبادی

قدسیہ :- ادیبِ شہیر حضرت ایم۔ اسلم ہمارے اُن بزرگ ادیبوں میں سے ہیں۔ جنہوں نے گزشتہ پچاس سال میں سینکڑوں افسانے اور بیسیوں ناول لکھ کر اُردو کے افسانوی ادب کو وزن دار بنایا اور آگے بڑھایا۔ اسلم صاحب اس قدر ہر دلعزیز ادیب ہیں کہ ان کے ناول انگریزی محاورے کے مطابق "گرم روٹیوں کی طرح" ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد انہوں نے فسادات کو اپنا موضوع بنایا اور "رقصِ ابلیس" جیسے ناولوں کے ذریعہ ان مظالم کو آشکار کیا جو بے قصور مسلمانوں پر توڑے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اسلامی تاریخ کو اپنے ناولوں میں اس خوبی سے سمویا کہ قصے کی دلچسپی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے کارنامے بھی ذہن نشین ہوتے چلے گئے۔ ظہورِ اسلام سے پہلے اور بعد کی تاریخ کو آپ نے اپنے سلسلہ وار ناولوں میں پیش کر کے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ مولانا شرر نے جو روایت قائم کی تھی اُسے اسلم صاحب نے حیاتِ تازہ دی۔ حال ہی میں ان کا ایک رومانی ناول "قدسیہ" عرصۂ دراز کے بعد شائع ہوا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ابتدا میں چند مکالموں کے ذریعے موجودہ حکومت کی کامیاب پالیسی اور پاکستان کے لئے استحکام کی جدوجہد کو واضح کیا ہے۔ اور دورِ ایوبی کی اصلاحوں اور کارناموں کو سراہا ہے۔ مگر اس پیرایہ میں کہ یہ سیاسی موضوع بھی ناول ہی کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ قدسیہ کی کہانی بڑی دردناک ہے۔ وہ اپنے غم کے داغوں کی وجہ سے سر و چراغاں بن گئی اور دنیا کے لئے تماشائے عبرت۔ جس طرح ناممکن صورتِ حال کو مصنف نے ممکن کر دکھایا۔ وہ اس کی چابکدستی پر دال ہے۔ اتنے بڑے ناول میں پڑھنے والے کی دلچسپی شروع سے آخر تک کم نہیں ہونے پائی۔ اس کامیاب نگارش پر حضرت ایم۔ اسلم مستحقِ مبارک باد ہیں۔ کتاب انجمن حمایت الاسلام لاہور نے شائع کی ہے۔ قیمت آٹھ روپے۔

شعلۂ نوا :- محترم جناب منشی تلوک چند محروم کا نام نامی ہم بچپن سے سنتے چلے آ رہے ہیں۔ اور ان کا کلامِ گرامی اسکول کی چھوٹی جماعتوں سے پڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ اُن کے متعلق ہمارا کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات۔ اکبر الہ آبادی جیسے بزرگ شاعر اُن کے متعلق فرما گئے ہیں ؎

ہے داد کا مستحق کلامِ محروم — لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے اُن کا سخن مفید و دانش آموز — اُن کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم

اس رُباعی میں نظموں سے اکبر کی مُراد جملہ اصنافِ شعر ہیں۔ کیونکہ حضرت محروم صرف نظم گو نہیں ہیں۔ انکی رباعیاں، قطعے، اور

غزلیں بھی کم و بیش پچاس سال سے ہم دیکھتے آرہے ہیں، کتابوں میں بھی اور رسائل میں بھی۔ شعلۂ نوا حضرت محروم کے دورِ اوّل ۱۹۰۶ء سے ۱۹۳۰ء تک، دورِ دوم ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک اور دورِ سوم ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک کی ڈیڑھ سو منتخب غزلوں کا مجموعہ ہے یعنی ان کی نصف صدی کی غزلیہ شاعری کا انتخاب ہے۔ اِس مجموعہ سے پہلے چار مجموعے اور شائع ہو چکے ہیں: گنجِ معانی۔ رُباعیات محرومؔ، کاروانِ وطن، اور نیرنگِ معانی۔ "شعلۂ نوا" کا پہلا ایڈیشن پانچ سال پہلے شائع ہوا تھا۔ دوسرا ایڈیشن اس سال شائع ہوا ہے۔ درمیانی عرصے میں دو اور مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ایک "بہارِ طفلی" اور دوسرا "بچوں کی دُنیا"۔ ان میں وہ نظمیں شامل ہیں جو لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے کہی گئی ہیں۔ اس صنف میں سوائے مولانا اسمٰعیل میرٹھی کے اور کوئی ان کا ہم سر نظر نہیں آتا۔ ہماری شاعری کی سب سے محبوب صنف غزل ہے جسے سدا سہاگن کہنا چاہئے۔ اس کی ادائیں زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی چلی آرہی ہیں۔ خسروؔ سے لے کر جگرؔ تک سبھی نے اس کے روپ کو سنوارا ہے۔ اب اس کے حُسن کا سکّہ زندگی کے ہر شعبے میں چلتا ہے۔ حضرتِ محرومؔ کا کلام اِس کا آئینہ ہے۔ سنجیدگی و شائستگی کے ساتھ مطالب کو پیش کرنا حضرت محرومؔ کا وصفِ خاص ہے۔ ان کی غزل قدیم و جدید کا سنگم ہے۔ اردو غزل نے فارسی غزل کے اثر سے آزاد ہو کر اپنا جو منفرد مزاج بنایا ہے اس کی نمود کلامِ محرومؔ میں دیکھئے! حضرت محرومؔ نے فارسی میں بھی بہت کچھ کہا ہے۔ اُن کے سپوت جگن ناتھ آزادؔ نے خوش خبری سنائی ہے کہ موصوف کا فارسی کلام بھی اُن کے دو اور مجموعوں کے ساتھ زیرِ ترتیب ہے۔ "شعلۂ نوا" کا انتساب جگر مرادآبادی مرحوم کے نام کیا گیا ہے، جن کے بارے میں حضرت محرومؔ نے کہیں فرمایا ہے ؎

تغزّل گوئی میں عدیم المثل ہیں جوشؔ و فراقؔ　　　پہلے حسرتؔ تھا، جگرؔ ہے آج سُلطانِ غزل

یہ کتاب بہت صاف سُتھری اور خوشنما شائع ہوئی ہے۔ قیمت چھ روپے، پچاس پیسے۔ ناشر:۔ مکتبۂ جامعہ، اُردو بازار، دہلی (۶)

آسان بنگلہ تعلیم:۔ قیامِ پاکستان کے بعد ایک ایسی کتاب کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی جس کے ذریعے اردو والے بنگلہ زبان سیکھ سکیں۔ کیونکہ مشرقی پاکستان کی قومی زبان بنگلہ ہے، اور جب تک ہم بنگلہ زبان سے واقف نہ ہوں گے ہم اپنے مُلک کی بڑی آبادی سے مُغائرت ہی محسوس کرتے رہیں گے ؏ زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم۔ سیّد وحید قیصر ندوی نے "آسان بنگلہ تعلیم" لکھ کر اس اہم ضرورت کو بڑی حد تک پورا کر دیا ہے۔ کتاب ٹائپ میں چھاپی گئی ہے اور اردو کے ساتھ بنگالی کا ٹائپ بھی لگایا گیا ہے۔ کتاب کا اندازِ بیان عام فہم ہے۔ اگر ذرا توجہ سے اس کا مطالعہ کیا جائے تو کسی پڑھانے والے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوگی۔

یہ کتاب جناب الطاف گوہر، سکریٹری وزارت اطلاعات و نشریات کے نام نامی سے معنون کی گئی ہے۔ گوہر صاحب کئی سال تک مشرقی پاکستان میں عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز رہے ہیں۔ اور بنگالی خوب روانی سے بول لیتے ہیں۔ فارسی میں بھی دستگاہ رکھتے ہیں اور اُردو اور انگریزی کے تو مُسلّم الثبوت ادیب ہیں۔ اس کتاب کے انتساب کے لئے اُن سے زیادہ موزوں اور کون ہوگا؟ یقین ہے کہ اِس کتاب کا نام بھی گوہر کی طرح چمکے گا۔ قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ العرفان۔ سی/۲۷ ایوب ایونیو۔ محمد پور۔ ڈھاکہ (۷)

مرحوم دلّی کی ایک جھلک:۔ شمیم احمد دہلوی نے پچاس ساٹھ سال پہلے کی دلّی پر دلّی والوں ہی کے لکھے ہوئے مضامین کا ایک مجموعہ اس نام سے شائع کیا ہے۔ اس میں دس مضمون شامل ہیں جو بڑی تلاش و جستجو کے بعد نایاب رسائل سے حاصل کئے گئے ہیں۔ مضمون نگاروں کے نام یہ ہیں:۔ اشرف صبوحی دہلوی۔ فیض احمد دہلوی (غالباً منشی فیض الدین دہلوی) ناصر نذیر فراقؔ دہلوی۔ آغا حیدر حسن دہلوی۔ میر باقر علی داستان گو۔ مُلّا واحدی۔ شاہد احمد دہلوی۔ خواجہ محمد شفیع دہلوی۔ یوسف بخاری۔ اور عبدالغنی۔ خواجہ حسن نظامی

مرزا فرحت اللہ بیگ اور سید وزیر حسن دہلوی، اس محفل میں اپنی عدم موجودگی سے نمایاں ہیں۔ تاہم شمیم صاحب کی یہ کاوش بھی مشکور ہے کہ انہوں نے ان بکھرے ہوئے اور نایاب مضامین کو یکجا کر کے دہلی مرحوم کی ایک جھلک ہمیں دکھا دی۔ کتاب مجلد ہے۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے۔ ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ ادبیات دلی۔ ۲۰۰۹۔ گلی قاسم جان۔ دہلی (٦)

دلّی سے دلّی تک:۔ دلّی کی ایک مخصوص زبان تھی جسے ٹکسالی کہا جاتا تھا۔ اس کے لکھنے والے الشاذ کالمعدوم تھے اور قیام پاکستان کے بعد دلّی میں معدوم ہو گئے تھے۔ مگر دلّی سے دلّی تک پڑھنے کے بعد معلوم ہوا ایک نوجوان سید ضمیر حسن دہلوی نے اس روایت کو دلّی میں حیات تازہ دی ہے۔ دلّی کی عام بول چال کو ادبی مرتبہ میر امّن دلّی والے نے دیا۔ مگر ڈپٹی نذیر احمد تک اس زبان کو کوئی اور ادب میں نبھا نہیں سکا۔ ان کے بعد ایک اچھا خاصہ سلسلہ دہلوی لکھنے والوں کا قائم ہوا۔ جس کی آخری کڑی ہم سید ضمیر حسن دہلوی کو کہہ سکتے ہیں۔ پیش نظر مجموعے میں آٹھ مضمون ہیں۔ جن میں سے بعض انشائیہ، بعض خاکے، بعض رپورتاژ اور بعض افسانوی مضامین ہیں۔ مضامین دلکش، زبان ٹکسالی اور بیان شگفتہ ہے۔ دہلوی ادیبوں پر تحقیقی کام کر کے ایک جامع کتاب شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ "دلّی سے دلّی تک" میں یہ اعلان دیکھ کر ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ سید ضمیر حسن صاحب نے اس کام کو انجام دینے کا بیڑا اٹھایا ہے اور آج کل دلّی کا دبستان نثر ان کے زیر غور ہے۔ سید صاحب اس کام کے لئے نہایت موزوں ادیب ہیں۔ ہم ان کے لئے یہی کہہ سکتے ہیں کہ ؏ این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

دلّی سے دلّی تک کی قیمت دو روپے پچاس پیسے ہے۔ ناشر:۔ مکتبۂ انجمن ترقی اردو۔ اردو بازار۔ دہلی (٦)

"سش"

محمد حسین آزاد:۔ مولانا محمد حسین آزاد اپنی البیلی نثر کی وجہ سے آقائے اردو کہلائے۔ آزاد اپنے انداز تحریر کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ۔ بلا شکست دروان شدہ ان کے بعد ان کے رنگ میں لکھنے والا آج تک پیدا نہیں ہوا۔ وہ اردو کے واحد انشا پرداز ہیں جو صرف اپنی طرز نگارش کے سہارے رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔ اس خصوص میں اور نو اور نک چڑھے امد مُدّ مغ شبلی نے بھی ان کا لوہا مانا ہے۔ آزاد کا منفرد انداز سالہا سال کی محنت کے بعد بنا تھا۔ آب حیات اور نیرنگ خیال سے پہلے کی نگارشات اس خوبی و محبوبی سے محروم نظر آتی ہیں۔ آزاد کی زندگی کے ابتدائی ۲۵ سال دلّی میں اچھے گزرے۔ اس کے بعد وہ گردش زمانہ کی چپیٹ میں آ گئے، اور ایسے آئے کہ مرتے دم تک سنبھلے نہیں پائے۔ بلکہ حالات ابتر ہی ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ آخری بیس سال دیوانگی میں گزرے۔ دنیا کا کوئی غم ایسا نہیں تھا جو آزاد کو نہ پہونچا ہو۔ وہ صبر و جبر سے انہیں جھیلتے رہے۔ مگر جب ان کی حد نہ رہی تو دیوانگی نے اس فرزانے کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ مگر اس تعطلّ ہوش و حواس کے زمانے میں بھی آزاد کا قلم آب حیات ٹپکاتا رہا۔ ان کے بیسیوں مسودے ناقابل فہم ہونے کی وجہ سے ناقابل اشاعت سمجھے گئے۔ مگر ان کے لائق پوتے آغا محمد باقر نے انہیں محفوظ رکھا۔ اور آئندہ کے لئے محفوظ کرا دیا۔ شاید کوئی دیوانہ آئندہ ایسا بھی آ جائے جو ان تحریروں میں سے حکمت کے موتی رول کر ادب کے جوہریوں کے سامنے پیش کر سکے۔ مرزا غالب نے ایسی ہی صورت حال کو اس طنز کے اس شعر میں پیش کیا ہے ؎

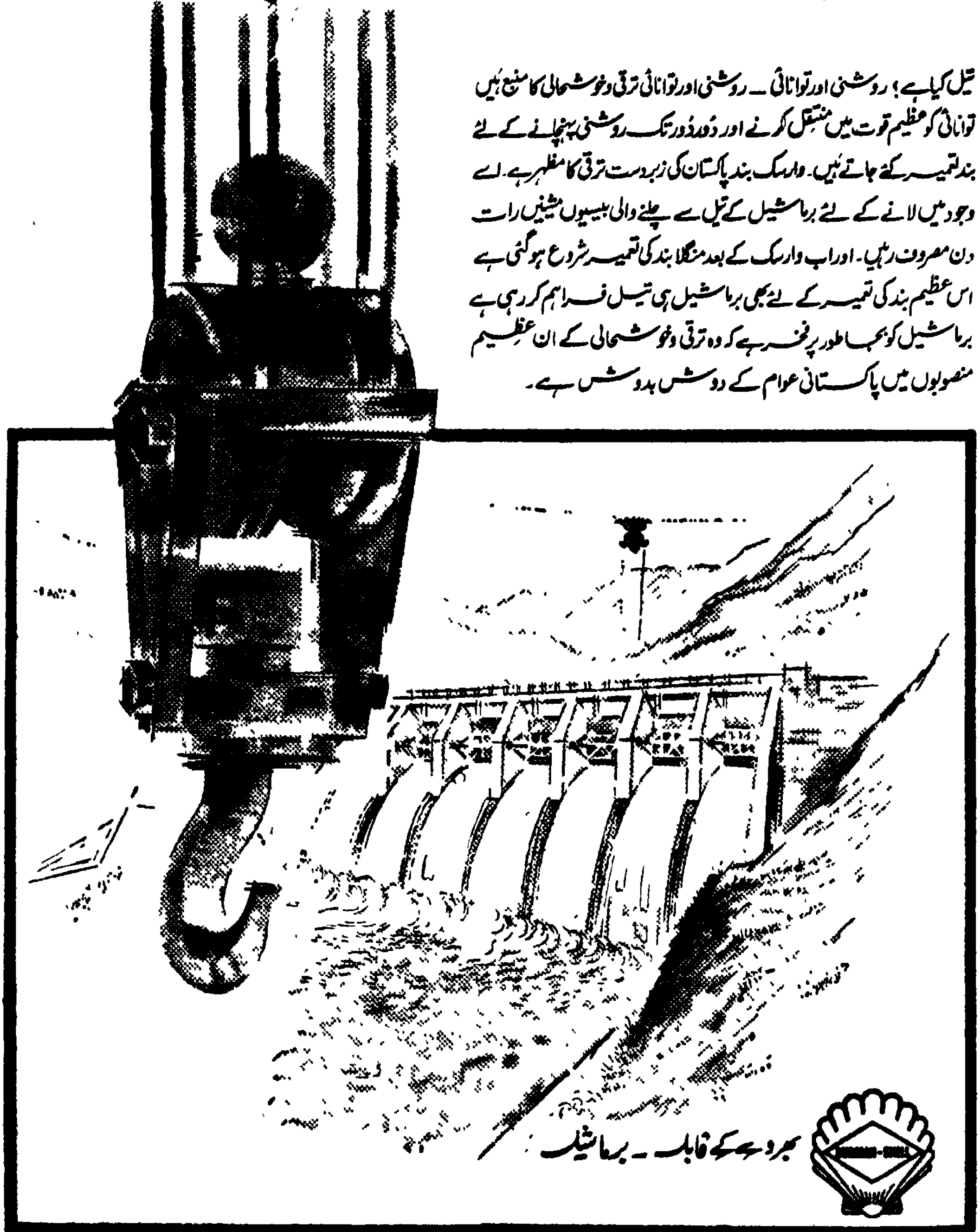
بک گیا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

کراچی کے ایک جواں سال ادیب و شاعر اسلم فرخی نے تین چار سال تک شب و روز محنت کرنے کے بعد آزاد پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ جسے واقعی ایک کارنامہ کہنا چاہئے۔ اس تحقیقی کام پر کراچی یونیورسٹی نے انہیں پی ایچ ڈی کی سند دی ہے۔ انجمن ترقی اردو نے اس کا پہلا حصّہ شائع کر دیا ہے۔ اس میں آزاد کی زندگی کے واقعات اندرونی و بیرونی دستاویزی شہادتوں کی بنا پر لکھے گئے ہیں۔

(باقی صفحہ ۴۰ پر)

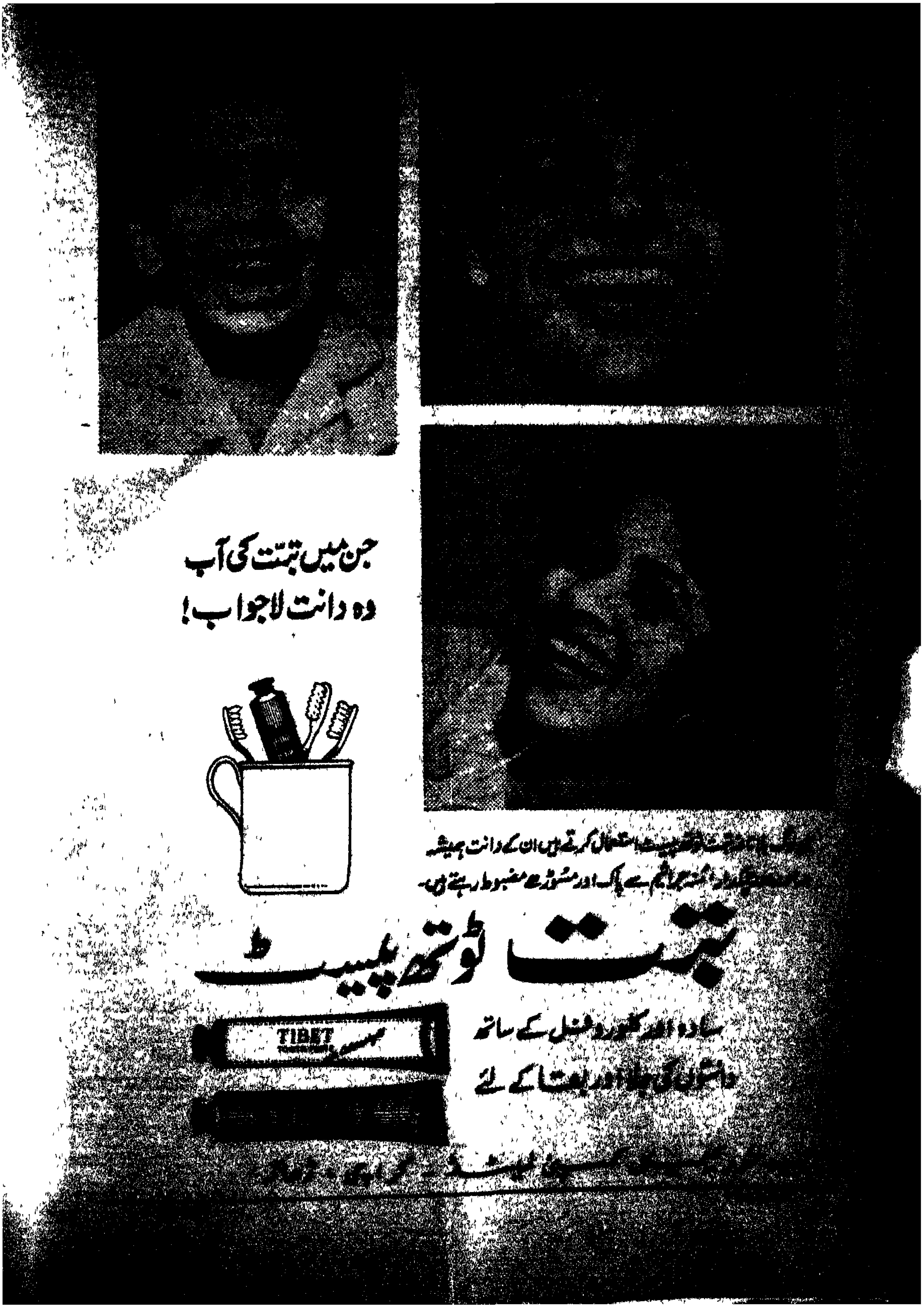
ترقی میں دوش بدوش

تیل کیا ہے؛ روشنی اور توانائی ۔ روشنی اور توانائی ترقی و خوشحالی کا منبع ہیں
توانائی کو عظیم قوت میں منتقل کرنے اور دور دور تک روشنی پہنچانے کے لئے
بند تعمیر کئے جاتے ہیں۔ وارسک بند پاکستان کی زبردست ترقی کا مظہر ہے۔ اسے
وجود میں لانے کے لئے برماشیل کے تیل سے چلنے والی بیسیوں مشینیں رات
دن مصروف رہیں۔ اور اب وارسک کے بعد منگلا بند کی تعمیر شروع ہو گئی ہے
اس عظیم بند کی تعمیر کے لئے بھی برماشیل ہی تیل فراہم کر رہی ہے
برماشیل کو بجا طور پر فخر ہے کہ وہ ترقی و خوشحالی کے ان عظیم
منصوبوں میں پاکستانی عوام کے دوش بدوش ہے۔



SAQI Karachi (Pakistan) Regd. No. S. 1166





جن میں تبت کی آب
وہ دانت لاجواب!
استعمال کرتے ہیں ان کے دانت ہمیشہ
جراثیم سے پاک اور مسوڑے مضبوط رہتے ہیں۔
تبت ٹوتھ پیسٹ
TIBET
سادہ اور کلوروفل کے ساتھ
دانتوں کی جلا اور بقا کے لئے

مدیر | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | سالانہ چندہ

(رکن انجمن ادبی رسائل پاکستان)

شاہد احمد دہلوی

معاون
عاصمہ بیگم

مع خاص نمبر
پاک و ہند چھ روپے
قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

جرعات

جلد ۲۷ | ساقی کراچی، بابت ستمبر ۱۹۶۵ء | نمبر ۳

بھارت میں ساقی کا چندہ بھیجنے کا پتہ: عظیم کتاب گھر ۲۲۶۳ رنگ محل خورد، پھاٹک حبش خاں۔ دہلی۔

ناشر عاصمہ بیگم نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر پی۔ آئی۔ بی کالونی (۵) سے شائع کیا

مُلّا واحدی

عارف ہسوی

۱۹۱۵ء کی بات ہے، حکیم اجمل خاں کو خیال ہوا کہ اپنے اکلوتے بیٹے جمیل خاں کی انگریزی تعلیم کا کچھ بندوبست کرنا چاہیے۔ حکیم صاحب کے خاندان کا کوئی لڑکا اُس زمانے تک انگریزی مدرسوں میں داخل نہیں کیا گیا تھا۔ حکیم صاحب نے بھی یہ وضع باقی رکھی اور بیٹے اور خاندان کے لئے خود مدرسہ کھول دیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورے سے نیاز فتحپوری اُس مدرسے کے کرتا دھرتا بنائے گئے۔ مجھ سے نیاز صاحب کی ملاقات تھی۔ مدرسے کا کام انجام دے کر باقی وقت وہ میرے ساتھ گزارتے تھے۔ چھ ماہ بعد اُنہوں نے غریب خانے کے قریب ایک مکان کرائے پر لے لیا اور بیوی بچّوں کو بلا لیا۔ اور مولانا عارف ہسوی نیاز صاحب کے بیوی بچّوں کو پہنچانے فتحپور ہسوہ سے دلّی آئے۔ میں اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹھا خواجہ فضل احمد شیدا سے باتیں کر رہا تھا کہ عارف صاحب وارد ہوئے اور فرمایا: "میرا نام عارف ہے۔ نیاز صاحب کے بیوی بچے باہر تانگے میں ہیں۔ کسی سے کہئے کہ نیاز صاحب کا گھر بتا دے"۔

نیاز صاحب اب میرے ہاں رہتے تو نہ تھے، لیکن شام کی نشست غریب خانے پر جاری تھی۔ لہٰذا عارف صاحب اور کہاں جاتے۔ کبھی نیاز صاحب کے ساتھ اور کبھی تنہا اُنہوں نے بھی آنا شروع کیا۔ چھ مہینے یوں ہی سلسلہ چلتا رہا۔ نیاز صاحب دلّی میں بس ایک سال پورا کرنے پائے تھے کہ ریاست بھوپال کی نوکری مل گئی۔ ملک حبیب احمد بھوپال کی بیگم کے پرائیوٹ سکریٹری تھے۔ اچھی نوکری کے علاوہ ملک صاحب میں بڑی کشش تھی۔ دونوں کششوں نے نیاز صاحب سے دلّی چھڑوا دی۔ جانے لگے تو عارف صاحب سے پوچھا کہ بھوپال کا قصد ہے یا دلّی میں رہئے گا؟ عارف صاحب نیاز صاحب کے خاص الخاص دوستوں میں تھے۔ ہسوہ جس طرح فتحپور کے نام کا جز ہے۔ خالی فتحپور کے معنی فتحپور سیکری بھی ہو سکتے ہیں اسی طرح عارف صاحب اور نیاز صاحب یک جان و دو قالب تھے۔ نیاز کے ادبی معتقد میں نے بہت دیکھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین (نائب صدر جمہوریہ ہند)، مسٹر عبدالرؤف (ڈپٹی کلکٹر)، مسٹر نورالرحمٰن (انشورنس والے) اور خدا جانے کون کون اُن کی خاطر علی گڑھ سے دلّی کے پھیرے لگاتا تھا۔ لیکن عارف صاحب کو نیاز صاحب سے جیسا والہانہ لگاؤ تھا دیسا شاید ہی اوروں کو ہو۔ نیاز صاحب کا بیان ہے کہ "میرے قیام فتحپور کے زمانے میں عارف صاحب ہسوہ کم رہتے تھے، میرے پاس فتحپور زیادہ رہتے تھے۔ اُس وقت وہ اپنی شاعرانہ زندگی کے انتہائی تنوطی دور سے گزر رہے تھے۔ دردؔ اور میرؔ اُن کے رگ و پے میں سرایت کر گئے تھے۔ پان کھانا اور میرؔ کے ایک ایک شعر پر گھنٹوں رونا یہی اُن کے دو مشغلے تھے۔ اُنہیں فتحپور چھوڑ کر دہلی آجانا مجھ پر بہت شاق تھا"۔ مگر اللہ عارف صاحب سے دلّی میں قوم و ملک کی عظیم خدمت لینی چاہتا تھا۔ بھوپال چلتے وقت نیاز صاحب نے عارف صاحب سے پوچھا کہ بھوپال کا قصد ہے یا دلّی رہئے گا تو عارف صاحب کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ دلّی میں قیام کا انتظام ہو سکے تو دلّی مجھے بھا گئی ہے۔ میں نے وہی کمرہ جو نیاز صاحب کو دے رکھا تھا عارف صاحب کی نذر کر دیا۔ پھر عارف صاحب ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۱ء تک میرے ہاں رہے" اور میرے گھر میں یہ الفاظ نیاز صاحب "اُن کی صحافت کا وہ دور شروع ہوا جس میں سیاست اُن کی ادبیت پر غالب آگئی، یہاں تک کہ وہ کئی بار جیل گئے اور صوبہ دہلی کی کانگریس کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے اُنہوں نے وہ سب کچھ کیا، جو ایک راسخ العقیدہ کو کرنا چاہئے تھا۔"

۱۹۳۲ء میں عارف صاحب میرے ہاں دوبارہ تشریف لائے اور اُسی کمرے میں انتقال فرمایا جہاں پہلے دن ۱۹۱۵ء میں، میں نے اُن کا استقبال کیا تھا۔ جب وہ نیاز صاحب کا پتہ دریافت کرنے کے لئے پہنچے تھے۔

(باقی ص ۳۳ پر)

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

ادب اور علوم

ادب کے علوم سے تعلق کے سلسلے میں پہلا سوال یہ اٹھتا ہے کہ علم و ادب میں کیا بنیادی تعلق ہے۔ دونوں میں بنیادی اشتراک یہ ہے کہ دونوں زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ادیب اور عالم دونوں مبصر حیات ہوتے ہیں، زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں اور اپنی عقل اور نظر کے مطابق اس کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ مگر ادیب تخیل سے کام لے کر اپنے تجربہ حیات کی ایک تخلیق پیش کرتا ہے جو حیات سے بالکل موافق ہوتی ہے۔ عالم اپنے تجربے کی تحلیل کرتا ہے اور ان کو کلیات اور نظریات میں تبدیل کر دیتا ہے۔ عالم اور ادیب کا فرق ارسطو اور افلاطون کا فرق ہے۔ افلاطون نے ایک مثالی جمہوریہ کا نقشہ پیش کیا۔ ارسطو نے وہ سب اصول اخذ کئے جن پر اس جمہوریہ کی بنیاد اسے نظر آئی۔ افلاطون نے سقراط کو بحث کرتے ہوئے دکھایا۔ ارسطو نے اس سے علم منطق بنا لیا جس میں بحث کے حصے اور ان کے حصے الگ الگ کر کے ہر حصہ کی تعریف کی، اس کی مثالیں دیں اور اس طرح عقل کی بنائی ہوئی ایک پوری عمارت کھڑی کر دی۔ اسی طرح یونانی ڈرامہ نگاروں نے ڈرامے تخلیق کئے اور ارسطو نے ان کے اصولوں کو جمع کر کے بوطیقا بنا دی۔ اسی طرح اخلاقیات، سیاسیات، مذہبیات وغیرہ کے الگ الگ علوم بن گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لئے کائنات کا علم حاصل کرنے کا پہلا ذریعہ ادبی ہی تھا۔ انسانی تاریخ کی سب میں پہلی تصانیف جو ہیں وہ ہومر کی نظمیں ہی ہیں۔ ان میں مذہب بھی ادبی ہی ہے۔ یعنی کائنات کی عظیم طاقتوں کو بھی اصنام کی شکلیں دے کر پیش کیا گیا ہے۔ ہیلنک لوگ زبردست تخیل کے مالک تھے اور یہ تخیل ہی ان کے تمام عمل کی رہنما تھی۔ سقراط پہلا شخص تھا جس نے ذہنی قوت کا مظاہرہ کیا۔ اسی لئے اس کے بابت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ فلسفے کو آسمان سے زمین پر لایا۔ افلاطون کی تصانیف بنیادی طور پر ادبی ہیں۔ مگر ان میں سقراط کے وجود نے علمی جزو کا اضافہ کر دیا ہے۔ ارسطو نے ان علمی اجزا کو بالکل الگ کر لیا اور علوم کی بنیاد رکھی۔ علم اور ادب کے دو الگ الگ دائرے ہو گئے جو عرصے بعد بالکل الگ الگ ہو کر نمایاں ہوئے۔ ایک حد تک افلاطون نے ہی ادیب کو علمی دنیا سے برطرف کر دیا تھا کیونکہ اس کے حساب سے ادیب محض قیاس آرائی کرتا تھا اور اس لئے محض عکسوں کا پجاری تھا۔ مگر ارسطو نے یہ واضح کیا کہ شاعر جن عکسوں کو سامنے لاتا ہے وہ بھی حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں لہذا شاعری کو بھی ایک قسم کا علم مان لینا چاہئے۔ اصل میں علم اور ادیب کو بالکل الگ کر دینا مشکل ہی رہا۔

افلاطون نے علم کا نام فلسفہ رکھا تھا اور اس کو ادب کا متضاد ٹھہرایا تھا۔ مگر ادب اور فلسفے کا تعلق اہم رہا۔ عام لوگ ہومر کے ساتھ ساتھ سقراط کو بھی اہم مانتے رہے، بہترین شاعر فلسفی بھی مانا گیا اور بہترین فلسفی کو شاعر بھی کہا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ پست شاعر جو اپنے توہمات ہی کو پیش کرتے تھے محض شاعر کہے جاتے اور اسی وجہ سے شاعر فلسفی کا متضاد بھی مانا گیا۔ افلاطون کا شاعر سے جو کچھ مطلب تھا اس کے دائرے میں وہی شاعر آتے تھے جن کو فلسفے سے نہیں بلکہ حسین الفاظ میں بے تکان باتیں بنانے سے سروکار تھا۔ غرض ایک سطح پر شاعری اور فلسفہ یا علم کو ایک ہی چیز مانا گیا اور دوسری سطح پر دونوں کو متضاد کہا گیا۔

اس کے بعد پیغمبروں کا دور آیا۔ پیغمبر روح القدس سے تعلق رکھتے تھے جس کو عقل کل بھی کہا گیا ہے۔ اور جس کو بلیک نے قوت تخیل سے تعبیر

گیا ہے۔ ان کو بھی عام لوگوں نے پہلے پہلے شاعر ہی کہا اور اس بنا پر انہیں ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کی باتوں کا انداز شاعرانہ ضرور تھا مگر جو باتیں انہوں نے کہیں وہ ایک طرف بڑے گہرے فلسفی نکتے رکھتی تھیں اور دوسری طرف عمل صالح کی ہدایت کرتی تھیں۔ ان کی ہدایت سے شاعری کی بھی اصلاح ہوئی اور شاعری ان کے علم کی ترجمان ہو گئی۔ مذہب اور شاعری میں تعلق اصنامی مذہب کے دور سے ہی چلا آتا تھا۔ کیونکہ جو اصنام ہومر سے پہلے مانے جاتے تھے وہ شاعرانہ تخلیق بھی تھے اور مذہبی عقائد کے حامل بھی تھے۔ عقلمندی کی دیوی منروا ایک حسین اور شاندار عورت تھی جو ڈھال اور تلوار سے مزین تھی۔ اور پھر اس کی ہر ادا دانش وری کے صفات کو بھی ذہن میں لاتی تھی۔ پیغمبروں کے مذاہب نے اصنام کو توڑا اور اخلاقی قدروں پر زور دیا۔ مذہب کا اہم جزو اخلاقیات ٹھہرا اور شاعری اخلاقی ہو گئی۔ قصائد میں اعلیٰ مرتبہ اور اعلیٰ اخلاق والے لوگوں کی مبالغہ آمیز تعریف شاعری کے اخلاقی مذہب سے متاثر ہونے کی مثالیں ہیں۔ قرون وسطیٰ میں مذہب کو قوانینِ فقہ میں تبدیل کیا گیا اور دینیات کا علم وجود میں آیا۔ یہ علم تمام شاعری پر حاوی رہا۔ اور اس میں دب کر شاعری پہلے فنا ہو گئی۔ مگر پھر مذہبی شاعری کا جامہ پہن کر آئی۔ چنانچہ چودھویں صدی عیسوی میں ہم کو مغرب میں دانتے نظر آتا ہے جس کی ڈیوائن کیمڈی عیسائیت کا مکمل اور کامل تصور پیش کرتی ہے۔ اور مشرق میں مولانا روم کی مثنوی ہے جس کے بابت یہ کہا گیا ہے کہ "ہست قرآں در زبان پہلوی"۔ یہاں پہونچ کر علم مذہب اور شاعری ایک ہو جاتے ہیں۔

قرون وسطیٰ کو علم اخلاق کا دور کہنا چاہیئے اور اس دور کی شاعری تمام تر تمثیلی ہے۔ اخلاقی اصولوں کو خوبصورت زبان میں نظم کر دیا جاتا ہے یا قصے سنائے جاتے ہیں تو اخلاقی قدروں کی تشخیص ان میں کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ محض غنائی یا محض تخیلی شاعری بھی رائج ہے۔ اور ردیو پری کے افسانے بھی عام ہیں جن کو اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر زیادہ اہم اخلاقی ادب ہی ہے چاہے اخلاق اس پر اس قدر حاوی ہو کہ شاعری دب کر ہی کیوں نہ رہ جائے۔ آگے چل کر ادب اخلاق کی بندشوں سے آزاد ہوتا گیا مگر اخلاقی اثر کی شاعرانہ اثر سے ہم آہنگی اعلیٰ ادب کا طرۂ امتیاز رہی اور آج بھی ہے۔ انیسویں صدی میں رسکن نے یہ بتایا کہ کامل حسن کامل نیکی کا ہی ایک پہلو ہے۔ حسن، حق ایک ہی چیز ہیں۔ حالانکہ دو مدرسۂ خیال ہو گئے جن میں سے ایک ادب برائے ادب اور ایک ادب برائے اخلاق کا قائل تھا مگر آخر کار نتیجہ یہی نکلا کہ اعلیٰ ترین ادبی چیز کا اثر اخلاقی ہونا لازمی ہے۔ آج بھی ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی یہ رائے ہے کہ شاعرانہ تجربہ مذہبی یا اخلاقی تجربہ بھی ہوتا ہے اور شاعر کو جن دائمی قدروں سے تعلق ہوتا ہے وہ شاعرانہ قدروں کے ساتھ ساتھ اخلاقی قدریں بھی ہوتی ہیں۔ یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ یونانی ادب کا بھی اثر اخلاقی ہی تھا۔ ارسطو نے ٹریجڈی کا اثر جو کتھارسس یا تذکیہ بتایا ہے، وہ جمالیاتی اثر کے ساتھ ساتھ اخلاقی اثر بھی ہے۔

سترہویں صدی سے سائنس کی ترقی ہوئی۔ فلسفہ بھی سائنس کے ماتحت آیا اور منطق کو بھی بجائے کلیوں کے تجربوں پر مبنی کیا گیا۔ فلسفہ کی شاخیں ہونے لگیں اور مختلف قسم کے علوم وجود میں آنے لگے۔ یوں تو علوم کی شاخیں ارسطو ہی نے الگ الگ کر دی تھیں۔ مگر اب تک ایک ہی شخص تمام علوم کا مالک ہو سکتا تھا۔ مگر اب الگ الگ علوم کی صاف صاف حد بندیاں ہوئیں۔ صنعت اور حرفت کے عروج نے سیاسیات، اقتصادیات اور سماجیات کے علوم کو اہمیت دی اور ان کے الگ الگ مفکر وجود میں آئے۔ فلسفہ اور اخلاق کے بجائے سماج اور سوسائٹی پر توجہ ہوئی۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بحث و تنقید عام ہوئی۔ ادب میں واقعیت آ گئی جو اس کے سماجی علم سے متاثر ہونے کی مثال ہے۔ چنانچہ اٹھارویں صدی کی شاعری زندگی کے تمام پہلوؤں پر طنز کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ قصہ گوئی ناول میں تبدیل ہوئی اور ناول کے موجد فیلڈنگ نے اپنے فن کو سماجی تاریخ کہا۔ محض تفریحی ادب بھی چلتا رہا۔ مگر اہم ادب وہی ٹھہرا جس میں تنقید حیات ہو۔ انیسویں صدی کا تمام ادب علم سماجیات کی شاخ ہے اور اس صدی کے اہم ترین نقاد نے شاعری کی یہ تعریف کی کہ وہ تنقید حیات ہے۔

اس نظریہ کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ادب کو جدید سیاسی اور سماجی مسائل سے سروکار ہو گیا۔ اور ادب کی ایک اور شاخ وجود میں آئی جسے صحافت کہا گیا۔ عام آدمی کے لئے ادب اور صحافت میں کوئی فرق نہ ہوا۔ مگر ادب کا سچا مذاق رکھنے والوں نے دیکھا کہ صحافت کو محض وقتی قدروں سے تعلق

ہے۔ جبکہ ادب ہمیشہ دائمی قدروں پر مبنی رہا۔ دائمی قدریں وہی آفاقی یعنی فلسفی یا اخلاقی قدریں تھیں جن کو یونانی زمانے سے مانا جاتا تھا۔ مگر مارکیست نے ان قدروں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ادب سوسائٹی کے بدلتے ہوئے حالات کا مطالعہ ٹھہرا۔ اور اب بھی اس نظریہ کو ماننے والے ادیب کو سوشل سائنس کا عالم سمجھتے ہیں۔ ادب اپنے زمانے کی سوشل تاریخ پیش کرتا ہے اور اس کا وجود سوشل رجحانات سے ہوتا ہے۔ ادب وہی بہتر ہے جو سوشل حالات سے واقف ہو۔ ایک حد تک اسے سوشیالوجی کا عالم کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

سوشل حالات کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت کا مطالعہ بھی ضروری ہوا ادب کو نفسیات انسانی کے مطالعہ کا ذریعہ سمجھا جانے لگا اور ادب علم نفسیات سے متعلق ہوگیا۔ ڈراموں میں ہمیشہ سے کردار اہم ترین چیز سمجھے جاتے تھے یونانی ڈرامے اپنے ہیروؤں کے نفسیاتی عالم کی بنا پر زندہ ہیں۔ عہد الزبیتھ کے انگلستان میں ڈرامہ کا مقصد زندگی کے سامنے آئینہ رکھنا ہوا۔ چنانچہ شیکسپئر کے ڈراموں میں کردار انسانی کے نفسیاتی مطالعے نظر آتے ہیں۔ آگے چل کر شاعروں اور ناول نگاروں نے رائج نفسیاتی نظریات کے مطابق زندگی کی ترجمانی کی۔ مثلاً انیسویں صدی میں ہارٹلے کا یہ نفسیاتی نظریہ عام ہوا کہ بچے میں ہر اس قسم کی صلاحیت پیدائشی ہوتی ہے جو کسی انسان میں بلوغ پر نظر آتی ہیں۔ چنانچہ ورڈزورتھ نے کہا CHILD IS THE FATHER OF THE MAN اور اپنی نظموں میں بچپن کی مبالغہ آمیز تعریف کی۔ ڈکنز نے اپنی ناولوں میں جو بچوں کے کردار نمایاں کئے ان میں بالغ انسان کے تمام جذبات دکھلائے۔ جدید ادب علم نفسیات سے اتنا ہی قریب ہے جتنا کہ قدیم اخلاقیات سے تھا۔ تحلیل نفسی ادب کا اہم ترین جزو ہوگئی ہے۔ نفسیاتی نظریئے ادب کو نیا رنگ دے رہے ہیں۔ فرائڈ کی جنسی نفسیات کی نظر سے زندگی کو دیکھنے کی بنا پڑی۔ ایچ لارنس کی ناولوں میں جو کردار دکھائے گئے ہیں وہ سب جنسی محرک کا کرشمہ ہو گئے ہیں۔ ولیم جیمس کے نظریۂ شعور کی رو کی بنا پر ناول نگار کردار کی انفرادیت نمایاں کرنے کے بجائے ان کے شعور کا عالم ایک دھارا کی طرح چلتا ہوا دکھاتے ہیں۔ تنقید بھی نفسیاتی نقطۂ نظر سے ادب پاروں کی تحلیل ہوگئی ہے۔ ادب کا کام نفسیاتی نظریوں کو زندگی میں کارفرما دکھانا ہے۔

اس وقت ہر علم کی لاکھوں شاخیں ہوگئی ہیں اور ہر شاخ کے بابت اتنا علم ہے کہ ایک شخص ایک ہی شاخ کے مطالعہ میں اپنی ساری زندگی صرف کر دیتا ہے۔ ہر شاخ کا ماہر الگ اور دوسری شاخ کے ماہر سے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔ علوم ہمارے سماجی ورثہ کا اہم ترین حصہ ہیں۔ ہر علم سے کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل کئے بغیر کسی شخص کا انسانوں میں شمار نہیں ہو سکتا ہر شخص کے لئے ہر علم کے بابت کچھ نہ کچھ اور کسی ایک علم کے بابت سب کچھ جاننا ضروری ہے یہ تعلیم یافتہ ہونے کا معیار ہے۔ تعلیمی نظام کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ادیب کا گریجویٹ ہونا لازمی ہے۔ برنارڈ شا وغیرہ گریجویٹ نہیں تھے مگر ان کو ہر سیاسی، سماجی اور نفسیاتی نظریہ کا علم ضرور تھا۔ علوم کی ترقی کی بنا پر انسان ارتقا کے جس درجہ پر پہونچا ہے اس تک ادیب کا پہونچنا لازمی ہے ورنہ اس کا ادب پست اور سطحی کہلائے گا۔ اگر وہ زندگی کے سیاسی پہلو میں دلچسپی رکھتا ہے تو سیاسیات کے تمام اہم نظریوں سے اس کی واقفیت ضروری ہے۔ اگر وہ اقتصادی امور سامنے لانا چاہتا ہے تو اس کے زندگی کا نقشہ ہرگز اہم نہ ہوگا جب تک کہ وہ اقتصادی نظریات سے پوری واقفیت کے ساتھ اسے واضح نہ کرے۔ سب سے زیادہ ادیب کو نفسیات کے علم سے واقفیت ضروری ہے کیونکہ انسانی کردار وہ اہم ترین نقطہ ہے جس پر اس کی نظر سب سے زیادہ جمتی ہے۔

اس تمام جائزے سے جو کتنا ہی سطحی اور سرسری سہی ہم یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ وقیع ادیب ہمیشہ علم کے ساتھ ساتھ چلا۔ ادبی صلاحیت علمی قابلیت سے بالکل مختلف اور بالکل الگ چیز ضرور ہے۔ ادیب علم سے بالکل الگ ہو کر اپنے مخصوص تجربوں کی تخلیق کر سکتا ہے اور کرتا آیا ہے مگر علم کی ترقی انسانی ذہن کو بھی ترقی دے رہی ہے۔ اور کوئی شخص عام ذہن انسان کے دائرے میں لانے کا اہل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ ہر علم سے کماحقہٗ واقفیت نہ رکھتا ہو۔ جو ادیب اس ذہنی درجہ پر نہیں پہونچے ہیں ان کی تخلیق محض سطحی اور سنسنی خیز ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اور ان کو ادب کے دعبے سے گرا ہوا شمار کیا جاتا ہے۔ اس لئے ادبی صلاحیت کا علمی قابلیت سے امتزاج ضروری ہوگیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ علم کی

زیادتی ادب کے حق میں نقصان دہ ٹھہرتی ہے۔ حد سے زیادہ عالم شاعر جیسے ملٹن مخصوص عالموں ہی کے لئے دلچسپ رہ جاتے ہیں۔ جدید دور کے انٹلکچول ادیب زیادہ تر لوگوں کے پلے نہیں پڑتے۔ ادیب کا ضرورت سے زیادہ عالم ہونا بھی ادب کے حق میں مضر ہے۔ سنجیدگی، خشکی، ابہام وغیرہ کی سی صفات عالمانہ ادب میں آجانا لازمی ہیں۔ لہٰذا اصل معیار یہ ہے کہ ادیب کو عالم ضرور ہونا چاہئے مگر علم کو اپنے ادب پر حاوی نہ ہونے دینا چاہئے بہترین ادب کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں۔ ایک سطح پر وہ عام قاری کی محض دلچسپی کا سامان بہم پہونچاتا ہے اور دوسری سطح پر وہ عالموں کو فکر میں ڈالتا ہے اور گہری معنی خیزی کی طرف لے جاتا ہے۔ ادیب کا کام یہ ہے کہ وہ علم کو بھی عام فہم سطح پر لے آئے۔ اور اگر وہ یہ نہ کرسکے تو اس کو کامیاب ادیب نہیں کہا جا سکتا۔

جدید دور میں ادب بھی تمام علوم سے الگ ایک علم ہوگیا ہے۔ اس کا بھی مطالعہ ہوتا ہے۔ اس کی بھی الگ الگ شاخیں ہیں اور ہر شاخ کا الگ مطالعہ اسی طرح کیا جاتا ہے جیسے علوم کے الگ الگ شعبوں کا۔ ادب کا شروع سے اب تک جو ارتقا رہا اور اس سے جو صورتیں وجود میں آئیں ان سے پوری واقفیت ادیب کے لئے ضروری ہے۔ مثلاً کوئی ادیب ناول نگاری کی طرف رجوع ہے تو اسے ناول نگاری کے شاہکاروں کا صحیح مطالعہ ضروری ہے۔ ورنہ اس کی ناول نگاری پست درجہ پر ہی رہ جائے گی۔ جب ہم عبدالحلیم شرر کی ناول نگاری کو دیکھتے ہیں تو فوراً ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ جس صنف کو ہمارے ادب میں رائج کر رہے ہیں اس کے لوازمات سے بالکل واقف نہیں ہیں۔ انہوں نے اسکاٹ کی ناول "طلسمان" ضرور پڑھی اور اسکاٹ کے بیانات اور مکالمے کے طریقوں کو برتنا ضرور سیکھا۔ مگر جن صفات کی بنا پر اسکاٹ کی ناولیں ناولیں کہی جاتی ہیں۔ ان تک نہیں پہونچے۔ ان کا ناول نگاری پر ایک مضمون بھی نظر پڑا جس میں انہوں نے ایسی بے پر کی اڑائی ہے کہ ان کی کم علمی پر ترس آتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہماری ناول نگاری بالکل یورپین ناول نگاری کی طرح ہو۔ ہر ملک کی ناول نگاری دوسرے ملک کی ناول نگاری سے مختلف ہے۔ مگر ناول کی ایک بنیادی اور امتیازی صفت ضرور ہے جو تمام دنیا کی ناول نگاری میں مشترک ہے۔ وہ صفت مطالعہ ہی سے واضح ہوتی ہے۔ اور مطالعہ کے بعد ادیب کو یہ طے کرنا ہے کہ آیا اس میں اس صفت کو پیدا کرنے کی صلاحیت ہے کہ نہیں۔ اگر عبدالحلیم شرر ناول نگاری کے عالم ہوتے تو اتنی ساری نام نہاد ناولوں کا ڈھیر لگا کر تضیع اوقات نہ کرتے۔ مطالعہ نہ صرف بنیادی صفات سے ہمکنار کرتا ہے بلکہ اچھے اور برے کی تمیز بھی سکھاتا ہے۔ مرزا محمد ہادی رسوا حالانکہ ان کی امراؤ جان ادا کو مثالی ناول کہا جاسکتا ہے۔ ناول نگاری کا صحیح ذوق نہیں رکھتے۔ انہوں نے سنسنی خیز اور جاسوسی ناولوں کو بھی سی انہاک سے لکھا جیسے امراؤ جان ادا کو۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ ان کی ایک کامیابی محض اتفاقی ہے۔ ورنہ ناول کے سلسلے میں وہ کوئی مذاق نہیں رکھتے تھے۔

شاعری کے سلسلے میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اپنی روایات کی شاعری کا علم نہیں رکھتے وہ اول فول بکنے لگتے ہیں۔ قواعد، عروض، بیان و بدیع کا علم شاعر کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا اور اس کا عملی درس یوں ہوتا تھا کہ شاعر عرصے تک اپنا کلام کسی استاد کو دکھایا کرتا تھا۔ مگر اب یہ قاعدہ ختم ہوگیا اور ہر جاہل محض موزونی طبع پر ٹیک لیکر جو کچھ چاہتا ہے بک جاتا ہے اور اس کو جاہل لوگ جدت اور نئی شاعری کہتے ہیں۔ ادب پیدا کرنے والے ہی کے لئے نہیں بلکہ ادب سے متاثر ہونے والے کے لئے بھی صحیح علم ضروری ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اردو کے پروفیسر جب کسی ناول پر تنقید کرنے آتے ہیں تو کیا اول فول بکتے ہیں۔ مثلاً ایک معروف پروفیسر نقاد نے ایک ناول کے بابت یہ کہا کہ اس میں کردار نگاری نہیں ہے۔ اصل میں وہ ناول زندگی کا نقشہ کردار ہی کے ذریعہ کھینچتی ہے اور اگر اس میں کردار نگاری نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر ان ہی صاحب نے ایک پست ناول کے سلسلے میں جس میں کردار نگاری بالکل نہیں ہے یہ کہا کہ اس میں کردار ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ پروفیسر صاحب نہیں جانتے کہ کردار کیا ہوتا ہے اور کردار نگاری کسے کہتے ہیں۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ اردو ادب کا ہماری یونیورسٹی میں جس طرح مطالعہ کرایا جاتا ہے اس سے کردار نگاری کی پرکھ پیدا ہوجانا ناممکن ہے۔ جن لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ مراۃ میں کردار ہیں یا نذیر احمد کے تمثیلی فسانے ناولیں ہیں وہ کیا سمجھ سکتے ہیں کہ کردار کیسے ہوتے ہیں اور انفرادی نفسیات ادب میں کیسے آتی ہیں۔ اس حالت میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ادب کا علم بھی کتنی ضروری چیز ہے تاکہ صحیح ذوق ادب پیدا ہو۔

اس کے علاوہ جس علم سے ادب کو اس وقت سب سے زیادہ سروکار ہے وہ علم نفسیات ہے جو اس صدی کا سب سے اہم علم کہلایا جا سکتا ہے اور جو فلسفہ اخلاقیات، سماجیات، سائنس غرض کہ ہر مادی اور ذہنی علم کو اپنے دائرے میں لے لیتا ہے۔ ادب کا مواد زندگی ہے اور اس زندگی کے بارے میں جیسے خیالات اور تجربات ہمیں نفسیات سے مل رہے ہیں ویسے اب کسی شعبہ علم سے نہیں ملتے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اہم بات ہے کہ آج ہم ہر علم کو نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھنے پر مجبور ہیں اور جب تک اس نقطۂ نظر کو سامنے نہ رکھیں ہماری نظر کو فرسودہ سمجھا جاتا ہے۔ ادب پر جو تنقید آج کل ہوتی ہے اگر اس کا مقابلہ انیسویں صدی کی تنقید سے کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اب مابعد الطبیعات کی جگہ نفسیات نے لی ہے۔ ادیب اور ادب نواز کو نفسیات کے اہم نظریات سے واقفیت کی ضرورت ہے۔

ادب اور علم کے تعلق کے دو مدارج ہیں۔ ایک درجہ جبکہ ادیب ہر علم سے واقف ہو کر اپنے مواد کو اس کے موافق پیش کرتا ہے۔ جیسے جدید دور میں جنسی نفسیات سے واقف ادیب انسان کو تمام تر جنسی محرک کا کرشمہ دکھاتے ہیں یا شعور کی رو کے نقشے پیش کرتے ہیں۔ پرانے زمانے کا عالم ادیب اپنے زمانے کے اہم خیالات کو نظم کر دیا کرتا تھا جیسے ورڈسورتھ نے ہارٹلے کے فلسفے کے مطابق بچوں کے نفسیات کو رقم کیا۔ یا پھر اپنے علم کا اندازہ تلمیحات کے استعمال سے کیا کرتا تھا۔ کچھ شاعر ایسے بھی ہوئے جو زندگی کو کتابوں کی عینک سے دیکھنے لگے۔ جیسے مرزا دبیر کو صبح کا سماں کی اسی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔

فرعون شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب   دن تھا کلیم اور ید بیضا تھا آفتاب

وہ شاعر جن کو مابعد الطبیعاتی METAPHYSICAL کہا گیا ہے۔ اپنی شاعری میں ہر مادی اور سماجی علم کے تصورات اس طرح رقم کرتے تھے کہ نزاکت بیان، لطافت معنی، تعقید لفظی اور معنوی اس کے فن کا اہم حصہ ہو گئی تھی۔ غالب کا مشہور مطلع۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا   کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

یا یہ شعر

نقش نازبت طناز بآغوش رقیب   پائے طاؤس پئے خامہ مانی مانگے

عجیب علمی پیچوں میں لے جاتے ہیں۔ ان پیچوں کے کھولنے کے بعد ان کا شاعرانہ اثر محسوس ہوتا ہے، شاعری علم کا مظاہرہ ہو جاتی ہے اور محض عالموں ہی کے لئے رہ جاتی ہے۔ جدید دور میں شاعری بلکہ ہر قسم کے ادب کو اسی طرح پر علمی چیز بنا دینے کی طرف خاص رجحان ہے اور اس لئے ادب سے عام شکایت یہ ہو گئی ہے کہ وہ بھی ایک مخصوص دائرے کی چیز ہو گیا ہے۔

دوسرا درجہ وہ ہے جبکہ ادیب علم کا حامل رہتے ہوئے بھی اس دائرے سے بالاتر ہو جاتا ہے، اصل میں ادیب کی کامیابی یہی ہے کہ علم کو اپنے ذاتی تجربے میں اس طرح کھلائے کہ وہ نہایت عام تجربہ ہو جائے۔ اور اس طرح وہ مخصوص علم سے بالاتر ہو کر اس علم تک پہونچے جو آفاق کی سیر اس طرح کراتا ہے کہ جاہل بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے اور عالم اس پر سر دھنے۔ اس کی بہترین مثال گوئٹے کی شاعری ہے۔ اس کی اہم تخلیق مفسٹوفلیس کو دیکھئے جو ایک ایسے ڈرامے کا کردار ہے جو عام طور پر بہت مقبول ہے۔ مفسٹوفلیس اپنی حرکتوں اور باتوں سے ہر شخص کو متاثر کرتا ہے اور بنیادی طور پر مضحک کردار ہو جاتا ہے۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو فلسفہ اخلاق نے جو جو صفات بھی بدی یا شر سے وابستہ کی ہیں وہ سب اس کے کردار میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ اس کردار کو بدی یا شر پر ایک مکمل مقالہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ وہ بدی یا شر کے فلسفہ کا نچوڑ ہے۔ مگر ہر ترتیبی، ہر مکاری، ہر شر اور ہر حماقت اس کے کردار میں اس طرح مل کر ایک قدرتی کل بن گئی ہیں کہ وہ فلسفہ کے بجائے تخلیقی یعنی جیتی جاگتی چیز ہو گیا ہے۔ اس طرح ادب علم کو اپنے دامن میں سمیٹ کر اس سے بالاتر ہو گیا ہے اور ظاہری طور پر دلچسپی ہی کی چیز رہا ہے۔ ادیب اور ادب نواز کا عالم ہونا لازمی ہے۔ مگر یہ بھی لازمی ہے کہ ادب علم سے بالاتر نکل جائے۔ اصل میں علم کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو زندگی کو محدود ہی کر دیتا ہے۔ ادب اسے اس کے محدود دائروں سے نکال کر آفاقی بنا دیتا ہے یہی ادب کا کمال ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ادبی تخلیق تمام علوم کو گھیر لیتی ہیں۔ یہ یقین ہے کہ شیکسپیر کو کسی طرح عالم نہیں کہا جا سکتا۔ مگر اس کی تخلیقوں میں تمام علوم نکال لئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ شیکسپیر کے علم نباتات اور علم حیوانات تک پر کتابیں لکھ دی گئی ہیں اور ماہرین نفسیات تو اس کے کرداروں کی باتوں سے نہ معلوم کتنے نظریے اخذ کر لئے ہیں۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ آفاقی شاعر تمام علوم سے واقف ہوتا ہے؟ نہیں وہ اس مقام پر ہوتا ہے جہاں سے تمام علوم کا مخرج ہے۔ وہ ان آفاقی قدروں سے تعلق رکھتا ہے جن سے تمام علوم کی الگ الگ قدریں مقرر ہوئی ہیں۔ اس کے نقشے سے محض تفریح بھی لی جا سکتی ہے اور پھر اس کو ہر نظریے سے واضح بھی کیا جا سکتا ہے۔ ہر مذہب والا اسے اپنے مذہب کا پیرو ثابت کر سکتا ہے۔ ہر سیاسی نظریہ اس کے یہاں پورا اترتا ہے اور انسانی زندگی کا ہر پہلو اس کے یہاں سامنے آتا ہے۔ ادیب کا مقام اس معنے میں تمام عالموں کے مقام سے اعلیٰ ہے۔ ادیب جو بات کہتا ہے وہ ایسی ہوتی ہے کہ اس کو جتنے اور جیسے معنی پہنائے جائیں ویسے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب یہ کہا کرتے تھے کہ غالب نے ہر بات کی پیش گوئی کر دی ہے جب تقسیم ہند وجود میں آئی تو ان سے پوچھا گیا اس پر بھی غالب نے کچھ کہا تھا تو انہوں نے شعر پڑھا ؎

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا   واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

غور کیجئے تو یہ اس نظری رجحان کی بنیاد پر پہنچتا ہے جو تقسیم کی محرک ہوئی۔ تکرار تمنا میں غالب نے اس دائمی اور آفاقی حقیقت کو بند کر دیا ہے جو ہر سیاسی کشمکش پر چاہے وہ قومی ہو یا صوبہ جاتی یا پارٹی بندی کی عائد کہا جا سکتا ہے۔ پھر یہ ذاتی کشمکش کے لئے بھی لایا جا سکتا ہے۔ ہمارے یہاں غالب اور اقبال کے اشعار جن جن موقعوں پر اقتباس کئے جاتے ہیں ان کا ان شاعروں کو خیال تک نہ آیا ہوگا۔ مگر یہ شعر حقیقت میں ادب ہیں۔ کیونکہ ان کے معنی کا احاطہ اتنا آفاقی ہے کہ ہر علم اور ہر قدر اس میں سما جاتی ہے۔

جدید دور میں سیاسی قدروں کے زور نے اور علوم کی طرف حد سے زیادہ رجحان نے ادب کو محدود کر دیا ہے۔ مثلاً ویلز کی ناولوں اور شا کے ڈراموں میں یا اشتراکیت کی طرف مائل لوگوں نے افسانوں اور نظموں میں سماجی حالات سے اور سماجی نظریات سے گہری اور وسیع معلومات کا ثبوت ملتا ہے۔ مگر ساتھ ساتھ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ تخلیقات نظریہ تک ہی محدود ہو گئیں اور نظریہ سے باہر ان کے کوئی معنے نہیں ہیں۔ علم کی زیادتی کی وجہ سے ادب صحافت کے درجہ پر اتر آیا۔ کردار سماج اور سماجی رجحانات کے نمائندے ہوئے مگر آفاق کے نہیں۔ وہ نظریات کے ادا کرنے والے ہوئے مگر انسان نہ رہے۔ اس وقت آفاقی شاعروں کی کمی کی وجہ یہی ہے کہ شاعر آفاق میں گم ہونے کے بجائے مسائل میں گھر گیا ہے۔ زندگی کے وہ پہلو جو علوم دکھاتے ہیں ان کی سطح ہی پر تیر رہا ہے۔ اس کے نیچے چھپے ہوئے آفاقی پہلوؤں میں غوطہ زن نہیں ہو پاتا۔ یہ ایک کلیہ تھا کہ جو جو علم بڑھتا جائے گا وہ وہ شاعری کم ہوتی جائے گی۔ آج اس کے معنی یہی سمجھ میں آرہے ہیں کہ علوم شاعری کو دیمک کی طرح کھا رہے ہیں اور ان آفاقی قدروں کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں جن پر پچھلے ادوار کے عظیم شاعر ٹیک لئے ہوئے تھے۔

ادب تمام کائنات اور ہر ذرہ کو ایک کل کی حیثیت سے دیکھتا ہے جبکہ علوم اسے زیادہ سے زیادہ ٹکڑوں میں تقسیم کر دینا چاہتے ہیں۔ ان معنوں میں ادب علوم کا متضاد ہے اور مذہب کا ہمنوا ہے۔ مذہب کے بابت کچھ عرصہ ہوا کہ یہ نظریہ رائج تھا کہ جن جن چیزوں سے مذہب کو سروکار ہوتا تھا وہی سب الگ الگ ہو کے علوم بن گئے ہیں اور کیونکہ ہر علم پر اتنی زیادہ معلومات حاصل ہو گئی ہیں کہ مذاہب کی بتائی ہوئی چند باتیں گرد نظر آتی ہیں اس لئے مذہب کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ جو شخص جس معاملے کے بابت ہدایت چاہے وہ اسی معاملے کے متعلق علم سے لے لے۔ مگر جنگ عظیم کے بعد محسوس ہوا کہ علوم کوئی چیز نہیں ہیں۔ جب تک کہ انسانیت پر عقیدہ نہ ہو۔ اور انسانیت پر عقیدہ مذہب ہی سے حاصل ہوتا ہے یا پھر ادب سے۔ اس لئے جدید ادب میں مذہب اور ادب کا رشتہ مضبوط کیا گیا۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے یہاں تک کہا کہ شاعری بھی ایک مذہبی رسم ہے اور اس نے اپنی شاعری کو ایسا بنا کر بھی دکھا دیا کہ مذہب اور شاعری ایک نظر آئے۔ شاعر کا کام بھی پیغمبروں کی طرح آفاقی قدروں تک پہنچنا ہے۔ اور اس لئے جدید ادب محض اپنے مذہب ہی سے نہیں بلکہ تمام عظیم مذاہب سے خیالات اور اشارات لے کر اپنے فن کی تعمیر کرتا ہے۔ یورپ میں کچھ مخصوص اثرات کی بنا پر ہندومت

(باقی صفحہ ۳۴ پر)

بلعیہ دیوان

مجاز

دسمبر ۱۹۵۵ء کی ایک خنک شام تھی. فضا میں ہلکی ہلکی اُداسی جیسے بوجھل ہوتی جا رہی تھی. یہ جانے کہاں سے ناگہانی آوازیں بلند ہوتی گئیں۔

" مجاز چل بسے "

" مجاز رحلت فرما گئے۔"

" مجاز اس دنیا میں نہیں رہے "

" مجاز اپنی تمام شاعری لئے ملک عدم کو روانہ ہو گئے "

یقین نہ ہوتا تھا کہ یہ سچ بھی ہو سکتا ہے. لیکن خود فریبی سے حقیقت کو کب تک جھٹلایا جا سکتا ہے. اور حقیقت یہ تھی کہ وہ جوان سال شاعر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُفق کی منزل پار کرتا ہوا کہیں دور بہت دور چلا گیا تھا.

اسرار الحق مجاز کی تمام تر زندگی ایک غزل مسلسل ہے. اور وہ خود بھی زندگی بھر غزلیں گاتا رہا. گنگناتا رہا. ترنم اُس کی غزل کی جان تھی. اگر غزل کو تھوڑی سی دیر کے لئے اس کی زندگی سے الگ کر دیا جائے تو اس کی ہستی ایک مشتِ خاک رہ جاتی ہے جس کے ارد گرد کانچ کے بکھرے ٹکڑے، کچھ رنگین اور کچھ بے رنگ. یہ کانچ کے ٹکڑے بھی کبھی شاید جام ہی تھے. اور پھر مشتِ خاک سے غبار سا اٹھ رہا ہو اور غبار میں بھی ناکامی ایک مسلسل دھڑکن کی طرح موجود ہو.

مجاز اکتوبر ۱۹۱۱ء میں ردولی ضلع بارہ بنکی میں چودھری سراج الحق صاحب کے یہاں پیدا ہوئے. سراج صاحب خود بھی گریجویٹ تھے اور بچوں کو تعلیم دلانے کے بہت دلدادہ. سرکاری ملازمت میں ہونے کی وجہ سے عرصے سے رہائش لکھنؤ میں تھی شاید یہی وجہ تھی کہ مجاز کو بارہ بنکی سے کہیں زیادہ وابستگی لکھنؤ سے تھی. لکھنؤ ان کا وطن تھا جہاں کی ہر شے، ہر جگہ، ہر گوشے سے مجاز کو لگاؤ تھا. لکھنؤ کا کافی ہاؤس شاید اب بھی اپنے بھاری بھاری ماحول میں اس کی کمی محسوس کرتا ہے. وہ کمی جو اب پوری نہیں ہو سکتی. نہ وہ شعر ہیں، نہ غزلیں اور نہ ہی وہ باتیں جو اس بھاری بھاری ماحول کے جمود کو منتشر کر سکیں۔

امین آباد ہائی اسکول سے مجاز نے میٹرک پاس کیا اور پھر سینٹ جانس کالج آگرہ میں ایف. ایس. سی کے لئے داخلہ لیا. سائنس اور حساب سے قطعی اُنسیت پیدا نہ ہو سکی تھی. امتحان میں ناکام رہے. اور علی گڑھ چلے گئے. وہاں ۱۹۳۵ء میں بی. اے کیا اور اسی سال آل انڈیا ریڈیو کے جریدہ "آواز" کی ادارت کرنے لگے لیکن جریدہ وہ زیادہ عرصہ چل نہ سکا. اور مجاز بھی اپنے وطن لکھنؤ لوٹ آئے. کچھ عرصہ تک ایک ادبی پرچے "نیا ادب" کی ادارت کی. پھر دلی کی ہارڈنگ لائبریری میں اسسٹنٹ لائبریرین کی حیثیت سے دلی چلے گئے. دلی کی فضا کچھ راس نہ آئی. کتابوں کے انبار میں دبے دبے کچھ گھٹن سی محسوس ہوئی. تو مجاز کا لاابالی پن اُنہیں بمبئی لے گیا لیکن کہاں بمبئی اور کہاں لکھنؤ، لکھنؤ کی فضا وہاں کہاں! زیادہ دیر بمبئی میں نہ جم سکے. پھر واپس وطن پہنچ آئے. یہ واپسی مستقل واپسی ہی تھی کیونکہ پھر وہ ذریعۂ معاش کی خاطر لکھنؤ چھوڑ کر کہیں نہ گئے.

اسی دوران میں تین بار جنون کا حملہ ہوا. پہلی بار ۱۹۴۰ء میں جب ان کی بہن صفیہ کا ناگہانی انتقال ہوا تو صدمہ کو برداشت نہ کر سکے. کہا جاتا ہے کہ پہلا دورہ انہیں اسی وقت ہوا. علاج معالجے سے اچھے بھلے ہو گئے لیکن مکمل طور پر اُن کی صحت پہلے دورے کے بعد درست نہ ہو سکی.

ایک دن احباب کے ساتھ شراب خوری کے عالم میں اپنی کچھ خبر نہ رہی اور کڑکتی سردی میں کھلے آسمان تلے رات بھر پڑے رہے۔ ہسپتال پہنچائے گئے لیکن حالت بگڑ چکی تھی۔ اور وہ لاابالی مجاز ۵ دسمبر ۱۹۵۵ء کو لکھنؤ کے بلرام پور اسپتال میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو گیا۔ لکھنؤ اس کا وطن تھا اور وطن کی گود میں خاموشی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو گیا۔

❖ ❖ ❖

شاید اکتوبر ۱۹۵۴ء کی بات ہے۔ مجاز اور دیگر چند شعرا کو شاہ نگر لکھنؤ میں مدعو کیا گیا تھا۔ ایک چھوٹے سے حلقہ میں شعر و سخن کا پروگرام تھا۔ جب مجاز کی اپنی باری آئی تو شعر کا ایک مصرعہ زبان پر آئے اور دوسرا نہ آئے۔ شراب کی فرمائش ہوئی۔ وہ شراب پیتا گیا اور شعر پہ شعر غزل پہ غزل سناتا گیا۔ لیکن پھر ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ مجاز شراب تو پیتا گیا لیکن شعر اس کے بعد نہ سنا پایا۔ زبان میں لکنت سی آگئی۔ اور الفاظ ایک دوسرے میں خلط ملط ہوتے گئے۔

اس معمولی سے واقعہ کا مجاز کی زندگی پر کوئی گہرا اثر تو نہ سہی، لیکن اس کی زندگی کا ایک عکس ضرور ہے۔ شراب مجاز کی روحِ رواں تھی، اور مجاز دنیا کو اس کے بدلے میں ایک تحفہ دے رہا تھا۔ تحفہ تھا غزل جس میں حقیقت کا سا ترنم ہے، جس میں دھڑکن ہے، ایک چبھن ہے۔ نیا پن نہ سہی لیکن ایک انوکھا پن ضرور ہے۔ جہاں شراب مجاز کی زندگی ہے، وہاں غزل بھی اس ربطِ زندگی سے نکلا ہوا ہیم نغمہ جس کا دم دسمبر ۱۹۵۵ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گھٹ گیا۔

اگر مجاز افلاطون کے یونان میں جنم لیتا تو اس کے نغمہ کا دم، دمِ پیدائش ہی گھونٹ دیا جاتا۔ اگر وہ شاعر نہ ہوتا تو ایک مصور ہوتا اور زندگی بھر شوخ رنگ تصویریں بناتا رہتا۔ جامِ صبوحی کی، خوبصورت محبوب کی، آوارگی کی، تاریک گلیوں کی، نہ جانے کس کس کی۔ اور اگر وہ مصور بھی نہ ہوتا تو پاگل ہوتا اور دن رات حضرت گنج میں سرگرداں گھومتا رہتا۔ اُس کے بال لٹوں میں بدل گئے ہوتے، اور شاید وہ صوفی نظر آنے لگتا اور کچھ نہ کچھ مزید گنگناتا رہتا، کوئی دھن جس کے بول تو شاید سمجھ میں نہ آتے لیکن ترنم ضرور معلوم ہوتا۔

مجاز کو ایک بدقسمت شاعر کہنا چاہئے۔ اس کی مٹی میں تو جیسے حسن اور شعر مادر کا خمیر پوری طرح رچ گیا ہو۔ بچپن میں بھی اگر کوئی خواہش اس کے دل میں تھی تو وہ بھی کسی کے دل میں رہنے کی، محفلِ سوز و ساز میں شریک ہونے کی۔ جیسے اُس نے خود طفل کے خواب میں کہا ہے۔

طفلی میں آرزو تھی کسی دل میں ہم بھی ہوں
اِک روز سوز و ساز کی محفل میں ہم بھی ہوں
دل ہو اسیرِ گیسوئے عنبر سرشت میں
الجھے انہیں حسین سلاسل میں ہم بھی ہوں

❖ ❖ ❖

دیوانہ وار ہم بھی پھریں کوہ و دشت میں
آشفتہ گانِ عشق کی منزل میں ہم بھی ہوں

مانا کہ اس چھوٹی سی نظم میں انہوں نے حسن و عشق کی دنیا کے علاوہ اور بھی کچھ چاہا ہے۔ لیکن سب سے پہلی خواہش مجاز کی اگر کوئی تھی تو وہ محبت ہی کی تھی۔ اور اسی کی ناکامی شاید ان کے دل و دماغ پر بہت ہی گہرا اثر چھوڑ گئی۔ درماندگی کی حلاوت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک تڑپ ایک چبھن کے علاوہ ہلکی سی شیرینی بھی چھوڑ گئی۔ کئی جگہ اور مجاز نے خود ہی تسلیم کیا ہے۔ اپنی جوانی کی سرگذشت میں کہتے ہیں

خاک میں آہ ملائی ہے جوانی میں نے
شعلہ زاروں میں جلائی ہے جوانی میں نے
شہرِ خوباں میں گنوائی ہے جوانی میں نے
خوابگاہوں میں جگائی ہے جوانی میں نے
حُسن نے جب بھی عنایت کی نظر ڈالی ہے
میرے پیمانِ محبت نے سپر ڈالی ہے

❖ ❖ ❖

اِن دنوں مجھ پہ قیامت کا جنوں طاری ہے
سر پہ سرشاریٔ شدت کا جنوں طاری ہے
ماہ پاروں سے محبت کا جنوں طاری ہے
شہریاروں سے رقابت کا جنوں طاری ہے
بسترِ مخمل و سنجاب تھی دنیا میری
ایک رنگین و حسین خواب تھی دنیا میری

مجازؔ نے جو کچھ بھی محسوس کیا، لکھا۔ حالات کی روش کے ساتھ ساتھ نرمیٔ گفتار، سوز و گداز میں بدلتی گئی۔ اور خواہشات کی دنیا ایک حسین خواب کا روپ لیتی رہی۔ طرزِ گفتار بھی یونہی بدلتا رہا۔ لیکن شعوری طور پر مجازؔ اولاً ایک غزل گو ہے۔ اور اُس کے بعد کچھ اور۔ وہ عہدِ حاضر کا بہترین شاعر نہ سہی لیکن اُس کے طرزِ بیان میں کچھ اور ہی بات ہے۔ میرؔ کی سی سادگی بھی ہے اور مرزا غالبؔ کی سی بلند پروازی بھی ہے۔ یہاں بھی ایک آمیزش ہے۔ شاید اُس کی تمام تر زندگی ایک آمیزش کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس نے خود ایک جگہ کہا ہے:

دیکھ شمشیر ہے یہ، جام ہے یہ!
جو تو شمشیر اٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

لیکن یہ بڑا کام شاید کبھی نہیں ہو پایا۔ مجازؔ کی زندگی انہیں اجزا کا مرکب بنی رہی۔ یہ دوسری بات ہے جز شمشیر کا کم ہے اور جام کا کہیں زیادہ۔ شمشیر کے لئے شاید زہد اور عبادت کی ضرورت ہے۔ جو زہد کی دہکتی بھٹی میں سے آبدار ہو کر نکلا وہ انقلابی ہو گیا۔ لیکن مجازؔ کے ہاں زہد ممکن نہیں۔ کہیں کہیں مجازؔ نے بھی انقلابی شعر کہے ہیں لیکن اُن میں اتنی رنگینی نہیں جتنی اُس کے باقی کلام میں ہے۔ طبیعت کا لااُبالی پن ہمیشہ مجازؔ کے ساتھ ہے۔ زندگی ایک نغمہ ہے اور ترنم۔ حالات کی نوعیت بدلنے کے ساتھ ساتھ الفاظ اور واقعہ کا محور دبیش ضرور بدل گیا ہے۔ لیکن نغمہ وہی ہے، تڑپ وہی ہے جو اُس کی زندگی کا سرمایہ ہے۔ رنگِ محفل، سوز و ساز، محبت و عشق، جام و سبو۔ اور وہ زندگی بھر بے فکرانہ خوشنما غزلیں گاتا رہا۔ بلکہ یوں کہئے کہ گیت گاتا رہا۔

⁂

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے، کچھ کہہ نہ سکے، کچھ سُن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی، واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے
رُودادِ غمِ الفت اُن سے، ہم کیا کہتے کیونکر کہتے
اِک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے

⁂

اے شوقِ نظارہ کیا کہئے، نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصور کیا کہئے، ہم صورتِ جاناں بھول گئے

اب گُل سے نظر ملتی ہی نہیں، اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو، ہم لطفِ بہاراں بھول گئے
سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے، اپنا ہی گریباں بھول گئے
یہ اپنی وفا کا عالم ہے اب اُن کی جفا کو کیا کہئے
اک نشترِ زہر آگیں رکھ کر نزدیکِ رگِ جاں بھول گئے

اور پھر دل کی وحشت، دل کا مبہم سا غم کچھ چین نہیں لینے دیتا۔ ایک اکساہٹ سی ہونے لگتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے دل ملول ہونے لگتا ہے۔ مے خانے کی یاد ستانے لگتی ہے۔ اور آبادیوں سے کہیں دور کہیں بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے۔ رسوائی کا ڈر بدستور ہے لیکن بے باکی حد سے گزر چکی ہے۔ "کچھ بھی ہو اکسے" والے دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ اور مجازؔ اعلانیہ کہنے لگتا ہے:

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ مے خانے میں چل
پھر کسی شاہنازِ لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست کسی ویرانے میں چل
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں
ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہے گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

دنیا سے ڈرنے والی حد کو وہ کب کا پار کر آیا ہے۔ جھجک مٹ گئی جو بھی محسوس کرتا ہے کہتا ہے اور کہنے کا ڈھنگ بھی کچھ ایسا ہے کہ حقیقت اور صداقت بن کر جاتی ہے۔ اپنی نظم "تعارف" میں وہ کچھ اس طرح اعلان کرتا ہے:

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں
جنسِ اُلفت کا طلبگار ہوں میں
عشق ہی عشق ہے دنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں

عیب [illegible] خیام میں تھا
ہاں مجھے اس کا بھی گنہ گار رہوں میں
زندگی کیا ہے گناہ آدم
زندگی ہے تو گنہگار رہوں میں

مذہب سے اُسے کوئی لگاؤ نہیں۔ انسان کو صرف انسان ہی کی نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ مذہب کے پردوں کی آڑ کو وہ نوچ کر رکھ دینا چاہتا ہے۔ اور مذہب کا ذکر بھی اُسے بیزار کر دیتا ہے۔ اُس کے نزدیک کفر ہے محبت، یہ سچ ہے۔

کفر و الحاد سے نفرت ہے مجھے
اور مذہب سے بھی بیزار ہوں میں

جب ملک کا بٹوارا ہوا۔ مذہب کے نام پر بھی کیچڑ اچھل اور خوب اچھلی۔ خون کی ندیاں بھی بہہ نکلیں۔ اب مجاز بمبئی کی سڑکوں پر سرگوشیاں سنتا رہا۔ دیکھتا رہا اور روتا رہا۔ آنسو ٹپکتے رہے لیکن نغمہ جاری رہا۔ وہ انسان کو یہ بتاتا رہا کہ وہ صرف انسان ہے۔ گاندھی جی کی ناگہانی موت سے وہ اس قدر متاثر ہوا کہ ایک نیا پیام لے کر پھر سے چہک اٹھا۔

دورِ غمِ حیات کا درماں چلا گیا
وہ خضرِ عصر و عیسائے دوراں چلا گیا
ہندو چلا گیا نا مسلماں چلا گیا
انساں کی جستجو میں اک انساں چلا گیا

پھر ایک دور ایسا بھی آیا کہ اُس نے زہد کو اپنانے کی کوشش کی شمشیر کو اٹھا پھینکنے کی کوشش کی۔ مریضانہ ذہنیت مٹ گئی۔ جوشِ مردانہ کی ایک لہر آئی، انقلابی رنگ جھلکا۔ غیر ممکن کو ممکن کر دکھانے کی ایک سعی پھر سے شروع کی۔ شاید پھر سے ایک سعی ناکام لیکن جوش بدستور وہی رہا۔

جی میں آتا ہے یہ مُردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اُس کنارے نوچ لوں
کوئی آتا تھا یا نہ تھا میں ہی بڑھ کر توڑ دوں

لیکن وہ نقوش پھر سے مٹنے لگے۔ دیوانگی کا عالم پھر سے طاری ہوگیا۔ افسردگی پھر سے چھا گئی۔ وحشت کی ہوگئی۔ ستارے نوچ لئے گئے۔ پھر ستاروں کی رخشندگی کی خواہش ہونے لگی۔ اپنے تئیں جانے نیچے پھر پکار بلند ہوئی۔ افسردگی —

میں نے سوچا تھا کہ دشوار ہے منزل اپنی
اک حسیں بازوئے سیمیں کا سہارا بھی تو ہو
دشتِ ظلمات سے آخر کو گذرنا ہے مجھے
کوئی رخشندہ و تابندہ ستارہ بھی تو ہو

کتنی ہی رنگینی کیوں نہ ہو اس میں حسرت کی خلش ضرور ہے۔ اُن خواہشات کا ایک مدفن ہے جو کبھی پروان نہ چڑھ پائیں۔ وہ امنگیں جھانک رہی ہیں جو شاید شعر و نغمہ میں نہ جھانک سکیں۔ دل میں ایک کسک ہے، ایک نامعلوم سی خلش۔

مجاز کو دورانِ حیات میں (دورانِ حیات اس لئے کہہ رہا ہوں، کہ شاید مجاز کی روح اب بھی سرگرداں ہے۔ اور نیض آباد روڈ کے مغموم دار السلام میں منڈلا رہی ہے۔ کبھی حضرت گنج کی رنگینیاں اچٹتی نگاہ سے دیکھ لیں تو کبھی کافی ہاؤس میں جھانک لیا) تین بار جنون کا دورہ ہوا۔ پہلی بار ۱۹۴۰ء میں اور دوبارہ اس کے بعد۔ اصلیت تو شاید یہ ہے کہ پہلے حملے کے بعد وہ مکمل طور پر کبھی ٹھیک نہ ہو پایا۔ رانچی کے اسپتال میں معالجہ کے لئے گیا تو وہاں نرس "نورا" کی ہمدردی دل پر ایک گہرا اثر کر گئی۔ لکھنؤ لوٹا تو عہدِ حاضر میں انسان کی تلاش میں بھٹک گیا۔

اگرچہ شعر و نغمہ مجاز کے خمیر میں تھا لیکن یہ کہنا بھی غیر واجب نہ ہوگا کہ جہاں جنون کے پہلے غلبہ کے ساتھ مجاز مر گیا، وہاں اس کے ساتھ شعر بھی۔ اس کے بعد مجاز نے شعر ضرور کہے۔ لیکن پہلے کی سی تڑپ شاید نہیں رہی۔ "نمائش"، "رات اور ریل"، "خانہ بدوش"، پہلے دور سے تعلق رکھنے والی نظمیں اردو ادب میں مجاز کے لئے ایک خاص جگہ بنا گئیں۔ بعد کے اشعار کو پڑھ کر شدت سے احساس ہوتا ہے کہ نغمہ شروع ہوا تھا۔ لیکن شعر پوری طرح حرکت میں [illegible] کے ہاتھ میں ٹوٹ کر رہ گئی۔

محمد منوّر

عجزِ تعبیر

کھائے نہ اگر فریبِ ہستی! / کیسے کوئی زندگی گزارے
"کیا کیا ہیں مسرتیں خیالی" / خواہش نے عجب محل اُسارے
ڈھلتے رہے غم مسرتوں میں / بنتے رہے فائدے خسارے
یوں دل کی صدا عیاں نہاں ہے / جیسے کوئی دور سے پکارے
کب راز کے شعبدے کھلے ہیں / کھلتے رہے عقل کے پٹارے
پوشیدہ ہے کیوں مآلِ انساں / انساں نہیں سوچنے سے ہارے

احساس، شعور، فکر، دانش!
آلامِ حیات کے شرارے!

تصویر ہو، شعر ہو کہ نغمہ / حساس دلوں کے درد پارے
یہ زندگی اور یہ فن کے مظہر / روشن شبِ تار میں ہیں تارے
فنکار جہاں میں جس قدر ہیں / کھوئے ہیں کسی جنوں میں سارے
تخلیق میں بھی رہے ہیں کوشاں / تزئین میں بھی روز و شب گزارے
فنکار نے ہر شبیہِ فن پر! / ڈھیروں گہرِ سرشک وارے

یہ آہ، یہ نالہ، یہ خموشی!!
حرماں زدگاں کے ہیں سہارے

ہے وقت کی موج بے نہایت / ادوار بھنور بنے سدھارے
فطرت کی زبان ہے اجنبی سی / غامض ہیں بلیغ بھی اشارے
فطرت وہ ستار ہے کہ ہر دم / آہنگ نئے نئے ابھارے!
فطرت وہ نگار ہے کہ ہر دم / زلفیں نئے رنگ سے سنوارے
فطرت وہ بہار ہے کہ ہر دم / نادیدہ گل و سمن نکھارے
کیا بحر کی وسعتیں عیاں ہوں / موجوں کے جہاں نہ ہوں کنارے
ہو رنگ کہ سنگ، ادا کہ آہنگ / دور ان سے ہیں روح کے نظارے

فن زائرِ سحر زارِ فطرت!
فن حیرتیِ نگارِ فطرت!

ڈاکٹر سید عبداللہ

ادبی مسائل

ادبی مسئلے سے مراد، ادب کے مسئلے پر بحث کرنے یا ادب کو سمجھانے کے طریقوں کی گفتگو ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ گفتگو کوئی نئی چیز نہیں۔ بڑی دیر سے بلکہ ہمیشہ سے یہ گفتگو ہوتی آئی ہے۔ چنانچہ آج بھی یہ قیل وقال جاری ہے۔ اور نئی الجھنیں پیدا ہوتی جارہی ہیں۔ درآنحالیکہ پرانے مسئلے اور الجھنیں بھی ابھی غیر حل شدہ موجود ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض ایسی بحثیں جو ہمارے خیال میں مرچکی تھیں۔ اب پھر سر اٹھا رہی ہیں۔ اور ان کو نئے سرے سے اٹھایا بھی جارہا ہے۔ بظاہر تو اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ پھر بھی ان مغالطوں کی وجہ سے بعض خدشے پیدا ہوتے ہیں جن کا دور کرنا لازم ہے۔

ادبی مطالعہ یا طریقِ مطالعہ کے چند مسئلے آج کل خاص طور سے زیرِ بحث ہیں جو اگرچہ بالکل تازہ نہیں پھر بھی ان کو زیرِ بحث لایا جارہا ہے مثلاً ـــــ

۱۔ ادب اور ادبی ہیئتوں میں تغیر کا مسئلہ اور زمانے کی بحث۔

۲۔ ادب اور تہذیب کا رابطہ۔

۳۔ پاکستانی ادب کا سوال۔

ایک زمانے میں تغیر اور تبدیلی کا سوال بڑے زور شور سے اٹھایا گیا تھا۔ یہ تک کہہ دیا گیا تھا کہ روایت کی ہر چیز فرسودہ ہے۔ اور جوش کے عالم میں اقبال کو محض اس لئے ٹھکرائے جانے کی سفارش کی تھی کہ وہ روایت سے بہرحال وابستہ رہنا چاہتا تھا۔ انگارے کے مصنفین میں سے ایک یعنی احمد علی نے لکھا تھا:۔

> اقبال کی شاعری حالانکہ وہ اس سے کہیں زیادہ زوردار ہے۔ زیادہ خیالی۔ اس ماضی کے عشق میں جو اپنے مردے کبھی کے دفن کرچکا ہے۔ اقبال اسلام کے رنج ومحن کے ترانے گاتے ہیں۔ ایک ناممکن اور بے معنی پین اسلامزم کی دعوت دیتے اور چیختے چلاتے، روتے دھمکاتے، قدیم گل وبلبل کے گیت گاتے (اکثر بڑی خوش الحانی سے، اس مرکز کی طرف آجاتے ہیں۔ جو بڑی حد تک اس شاعری کے وجود کا بانی مبانی ہے ـــ یعنی۔ اسرارِ خودی۔ لیکن باوجود سیکڑوں شکووں اور جواب شکووں کے باوجود آہ وبکا کے اور آنسوؤں اور التجاؤں کے وہ جو تھا کبھی واپس نہیں آسکتا۔ اقبال تو اس میں کامیاب نہیں ہوئے اور حقیقت جو ہے رہے گی۔"

محولہ بالا مضمون رسالہ اردو میں (جو اس وقت اورنگ آباد سے نکلتا تھا) ۱۹۳۲ء کی کسی اشاعت میں چھپا تھا یعنی تقریباً تیس سال قبل۔ اس اثنا میں احمد علی کا حال تو معلوم نہیں لیکن نقادوں کے بڑے حصے نے اس قسم کے انتہا پسندانہ خیالات کا اظہار ترک کردیا ہے۔ یہ لوگ اب ماضی اور روایت کے مسئلے میں بھی اعتدال کا لہجہ اختیار کرنے لگے ہیں۔ عزیز احمد نے جن کی ترقی پسندی کچی پکی سی تھی۔ اپنی کتاب ترقی پسند ادب میں خاصا معتدل نقطۂ نظر اختیار کیا۔ مگر خود علی سردار جعفری نے اپنی اسی نام کی ایک کتاب میں اقبال کو خاصا سراہا۔ اور روایت کے صالح حصوں کو

زندہ رکھنے کی تجویز کی۔ اسی طرح اکثر دوسرے لوگ ہیں۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال، معتدل انداز میں سہی مگر زندہ ضرور رہا۔ زندگی اور ادب میں تغیّر ایک مسلّم حقیقت ہے۔ جس طرح زمانہ کا ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے اسی طرح زندگی بھی تغیّر قبول کرتی رہتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود زندگی اپنی تبدیلی کا ایک خاص اسلوب رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں ہر نیا لحظہ ہر پرانے لحظے سے اس تدریج کے ساتھ بدلتا جاتا ہے کہ اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ ماضی، بڑے سکون اور بڑی آہستگی سے، حال میں اور حال مستقبل میں تبدیل ہوتا ہے۔ اس میں تبدیلی اور نیا پن کا عمل بھی جاری رہتا ہے اور تسلسل بھی نہیں ٹوٹتا۔ اسی کا نام حیات ہے۔

جو لوگ ادب میں روایت کی پاسداری کرتے ہیں۔ وہ اسی اصول کے تحت کرتے ہیں۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ ادب میں تازگی اور نیا پن یا تغیّر یا تبدیلی نہیں ہونی چاہئے یا نہیں ہوتی۔ نئے زمانے میں تو تفکّر کا انداز ہی یہ ہے۔ پرانے زمانے کے بھی بہت سے لوگوں نے اس اصول کو (ادب میں بھی) تسلیم کیا ہے۔ شیر خاں لودھی جو شاہجہانی عالمگیری دور کے بزرگ تھے، تذکرہ مراۃ الخیال کے مقدمے میں تغیّر زمانی اور تغیّر ادبی کا ذکر کرتے ہیں۔ ان سے پہلے ابوالفضل نے بڑے شد و مد سے یہ بحثیں اٹھائی ہیں۔ مولانا جامی کے بھی کچھ خیالات اس کی تائید میں ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ وہ لوگ ایک سالم اور خود آشنا تہذیب میں رہتے تھے، انہیں تغیّر کے بعد بھی اپنی ہی تہذیب کے اندر سے جدّتیں پیدا کرنی ہوتی تھیں۔ مگر آج کل کی آوارگی، خود بیزاری یا خود ناآشنائی سے اٹھتی ہے اور اکثر تقلید کے عشق سے ابھرتی ہے۔

بہر حال ادب میں تغیّر یا تازگی کا اصول، تسلسل کے اصول کے ہمراہ چلتا ہے اور چلنا چاہئے۔ یہی دستورِ حیات اور یہی دستورِ ادب ہے۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ روایت کا کوئی پاسدار، یا حامی اس اصول کا منکر نہیں ہوگا۔ پھر بھی کچھ لوگ روایت کے محض ذکر کو بھی جرم ٹھہرا کر دن رات یہ کہتے رہتے ہیں کہ "یہ روایت پرست لوگ ماضی سے چمٹے ہوئے ہیں۔ گڑے مردے اکھاڑ رہے ہیں۔ اس پرانے دور کو واپس لانا چاہتے ہیں جو مر چکا وغیرہ وغیرہ"۔ سو یہ سب باتیں تنقید کا درجہ نہیں رکھتیں۔ ان کو تنقیدی جھمیلا کہنا چاہئے۔ دراصل الزامات کے پردے میں یہ لوگ اپنے بعض خیالات پیش کرنا چاہتے ہیں، جن کو براہ راست پیش کرنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ یہ خیالات بیشتر سیاسی ہیں۔ اور اگر تہذیبی بھی ہیں تو ان کا سرچشمہ دہی ایک خاص قسم کی تہذیب ہے۔

واضح رہے کہ ترقی کا مطلب جبری انقلاب نہیں۔ ترقی تو مسلسل مگر باشعور تبدیلی کا دوسرا نام ہے۔ اگر انقلاب کے کسی عمل سے (جس کا دوسرا نام جبری تبدیلی ہے) ادب میں تبدیلی پیدا کرنا ہی مقصد ہے تو یہ ممکن تو ہے لیکن ایسی تبدیلی نہ دیرپا ہوگی اور نہ مقبول۔ مغربی ادبیات سے استفادے کی تحریک صدی ڈیڑھ صدی قبل شروع ہوئی تھی اور اس وقت کسی نے انقلاب کا نعرہ بھی نہیں لگایا تھا۔ البتہ سرسید بہت پُرجوش تھے۔ انہوں نے قدیم شاعری کے آخری دور کے بارے کچھ سخت باتیں بھی لکھی تھیں۔ لیکن ان کی آج ہر شخص تردید کر رہا ہے۔ اردو ادب میں جو مغربی اثرات آہستہ آہستہ اور خود بخود پھیلے، وہی کامیاب اور مستقل رہے۔ باقی سارا جوش اکارت گیا۔

تو کہنا یہ ہے کہ ادب میں تازگی کا عمل، جبری انقلابوں اور نعرہ بازیوں سے نہیں ہوا کرتا۔ مغربی ادبوں کی جو صنف یا ہیئت، ملکی مزاج کے مطابق ہوگی یا ملکی ذوق اسے قبول کرے گا، وہ خود بخود اپنا مقام حاصل کرے گی۔ اسی طرح معاشرہ جن اصناف یا موضوعات کو اپنے مزاج سے ہم آہنگ پائے گا، وہ اصناف یا موضوعات خود بخود مقبول ہوتے جائیں گے! اس میں نعرے بازی اور واویلے کی کیا ضرورت ہے؟ بعض لکھنے والے جنہیں اتفاق سے قدرت نے لکھنے کے وسائل مہیا کر دیئے ہیں۔ ان وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لمبے لمبے مضمون لکھتے رہتے ہیں۔ ان کی اکثر تحریریں اس عجز و نیاز سے خالی ہوتی ہیں جو ایک سچّے اور مخلص طالب علم کا شیوہ ہونا چاہئے۔ وہ سخت اور درشت الفاظ کے استعمال کو کمال فن سمجھتے ہیں، حالانکہ علم و فن دونوں کا دستور جدا ہے! اس میں دھونس اور دھاندلی کا کوئی مقام نہیں۔ انہیں پریشانی شاید یہ ہے کہ معاشرہ بعض ان چیزوں کو قبول نہیں کر رہا جن کے لئے انہیں سخت بے تابی ہے یا اگر کر رہا ہے تو قدرے تامّل یا سست روی سے کر رہا ہے

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

محمور سعیدی

خدوخال

دَر و دیوار کی خموشی نے
آج کس کے قدم، یہ کس کے قدم
خیر مقدم کے گیت گائے ہیں
عشق کے غمکدے میں آئے ہیں

طاق و محراب و سقف و بام پہ ہے
غنچہ و گل ہیں اُس کے نقشِ قدم
اک انوکھی شگفتگی طاری
گلستاں، گھر کی چار دیواری

بام و در جس سے جگمگا اُٹھے
گھر کے آنگن کو اس کے قدموں نے
روشنی اُس کے نقشِ پا کی ہے
اک نئی زندگی عطا کی ہے

نورِ معصومیت کے حلقے میں
حُسن، دوشیزگی کی قید میں ہے
یہ اچھوتا سا نازنیں چہرہ
شوخیوں پر ہے، شرم کا پہرہ

ہے یہ فیضِ تبسّمِ گلگوں!
جوت دوشیزگی کی، آنکھوں میں
نزہتِ نوبہار چہرے پر
کمسنی کا نکھار چہرے پر

اُس کی خوشبو ہی جاں نواز نہیں
عنبریں گیسوؤں کے سائے ہیں
دل فروز اُس کا رنگ روپ بھی ہے
عارضوں کی گلابی دھوپ بھی ہے

گفتگو کا رُکا رُکا انداز!
جاگتے میں بھی سوئی سوئی سی
نرم لہجہ، حجاب آلودہ!
نرگسِ ناز خواب آلودہ!

شرمگیں سی جھکی جھکی نظریں
وہ بھی قول و قرار لیں ہم سے
دیں اجازت تو کوئی بات کریں
عہد و پیماں ہم اُن کے ساتھ کریں

نقرئی بادلوں میں جیسے دھنک — دفعتاً ٹوٹ کر بکھر جائے
عشق کی اک نگاہِ سادہ سے — اُس کے چہرے پہ کتنے رنگ آئے

روشنی انگ انگ سے اُس کے — پھوٹ پڑنے کو یوں مچلتی ہے
جس طرح بے قرار ہو ہو کر — چاند سے چاندنی نکلتی ہے

متناسب، ز فرق تا بہ قدم — جیسے آذر کے خواب کی تکمیل
سر بسر حُسن، اُس کا ہر انداز — جیسے شاعر کا شاہکار جمیل

عرضِ صد اشتیاق کا یہ جواب — ضبطِ صد اضطراب کا یہ صلہ
خامشی کی زبانِ مبہم سے — شوق کی بے قراریوں کا گلہ

اُس کے لہجے میں، اُس کی باتوں میں — رم دیوانہ گر ہے خوشبو کا
لبِ رنگیں سے حرف ادا ہونا — برگِ گل سے سفر ہے خوشبو کا

بادۂ عشرتِ شبانہ کا — ہلکا ہلکا خمار آنکھوں میں!
رات کا نشہ نیند بن کے گھلا — صبح دم کیف بار آنکھوں میں!

سینۂ رہگزر میں گام بہ گام — لہر خوشبو کی دوڑتی جائے
اُس کے قدموں کا لمس، مٹی کو — غنچہ و گل کی طرح مہکائے

زلف کی چھاؤں کے گلابی دن — چٹکی چاندنی کی راتیں ہیں!
جی رہا ہے جو تیری قربت میں — دن اُسی کے، اُسی کی راتیں ہیں!

نکہت و رنگ کی فضاؤں میں
ابدیت کی ہمعناں ہوتی!
تم کو پا کر خیال آتا ہے!
زندگی کاش جاوداں ہوتی

پروفیسر حمید کوثر

اُردو کی قومی شاعری

اردو کی قومی شاعری ہندوستان کی ملّت اسلامیہ کی اُن سیاسی تحریکات کا نتیجہ ہے جن کا نقطۂ آغاز دو قومی نظریہ بنا۔ انگریز کی حکمتِ عملی نے اور خود ہندوانہ ذہنیت نے ہندو مسلم وحدت کو ختم کر کے ہندو کو مسلمان پر سبقت لے جانے کا لالچ دیا جس نے مشترکہ قومیت کے اُس تصوّر کو یکسر مٹا کے رکھ دیا۔ جسے اکبر اعظم نے پروان چڑھایا تھا اور دین الٰہی جاری کرنے کا وہ اہتمام حاصل کیا تھا جس کی بنیاد حقیقت کی بجائے متعصب ذہنوں کی غیر صحت مند روایت پر ہے۔ اس لئے اردو قومی شاعری سے مراد ہمیشہ اور ہر جگہ وہ شاعری ہوتی ہے جس کا تعلق مسلمانانِ ہند کی خالص اسلامی روایات سے ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ مسلم حکمرانوں کی ہندو دوستی کے نتیجے میں خانقاہیت کو فروغ ہوا اور اسلامی روایات سے اذہان ناواقف ہونے لگے۔ اس کا اثر شاعری میں بھی ظاہر ہوا۔ اور روایتی انداز سے بڑھ کر شیخ و برہمن طنز و تمسخر کا نشانہ بنائے جانے لگے اور قدرتی طور پر وہ خیالات عام ہونے لگے۔ جن سے ہندو مسلم اتحاد پر مبنی قومیت کا تصوّر پنپ سکے۔ یہ روش جاری تھی کہ مغلیہ تخت پر اورنگ زیب عالمگیرؒ جلوہ آرا ہوا اور خانقاہیت کے بڑھتے ہوئے غیر اسلامی تصوّرات پر قدغن لگائی جس سے ہندو مسلم یگانگت کے اس پیکر کو صدمہ پہنچا جو خود ایک بت کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ تاہم نئے احساسات کا تعلق صرف مسلمانوں سے تھا۔ اور ہندو اس سے کسی بھی طرح متاثر نہ ہوئے تھے۔ اس کے باوجود بھی چند متعصب ذہنوں نے ہندوؤں کو عالمگیر علیہ الرحمہ کے اِس خالص اسلامی نظریئے سے بدظن کرنے کی کوشش کی۔ مگر مشترکہ قومیت کا تصوّر پھر بھی قائم رہا۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ خانقاہیت کو پھر زبردست عروج حاصل ہوا۔ مرہٹوں، جاٹوں اور افغانوں کی یلغاروں نے اور خود سلطنت مغلیہ کی لرزتی ہوئی بنیادوں نے بے امنی اور بے چینی کی جو فضا پیدا کی اس میں گریز دنیا اور ترکِ دنیا کے عقائد کا جنم لینا اور ترقی کرنا ایک قدرتی بات تھی۔ ہندو مسلم قومیت کا تصور ابھی قائم تھا اس لئے اس صورتِ حال سے اس تصوّر کو اور تقویت حاصل ہوئی لیکن مفکرین قوم محسوس کر رہے تھے کہ ہندی مسلمانوں کی بے اقبالی کے دن نزدیک ہیں۔ اور وہ وقت آیا چاہتا ہے۔ جب حاکم محکوم بن کر رہ جائیں گے۔ پھر بھی اس زمانے میں مسلمان مدبرین کے لئے کسی سیاسی تحریک کا آغاز کرنا ممکن نہ تھا۔ ہندو مسلم نفاق کا خطرہ اُس کے ساتھ نام نہاد مغلیہ تاجداروں کا عناد اور ان کی حریف طاقتوں کا تعدد اس بات کی اجازت نہ دیتا تھا کہ فرزندان اسلام کو کسی ایسی تحریک سے روشناس کرایا جائے جو اُن کی حیاتِ نو کا موجب بن سکے۔

چنانچہ اُسی زمانے میں مسلمانوں میں ایک برگزیدہ ہستی کا ظہور ہوا جو حضرت شاہ ولی اللہ کے نام سے مشہور ہے۔ اُن کی مصلحت اندیشی اور دور بینی نے سیاسی یا معاشی نظریئے کو لے کر اٹھنے کی بجائے احیائے دینِ اسلام کی تعلیمات دینی شروع کیں۔ اور مسلمانوں پر چھایا ہوا سکوت توڑا۔ اُن کی خالص مذہبی تحریک نے ہندو مغل انگریز اور دیگر طاقتوں کو مسلمانوں سے بدگمان نہ ہونے دیا۔ اس صورتِ حالات میں انہوں نے احیائے دین

میں در پردہ اسلامی معاشی نقطۂ نظر کی اشاعت شروع کی اور مغلیہ سلطنت کی مضبوطی پر انحصار کرنے کی بجائے فرسودہ جاگیردارانہ نظام کی جگہ ایک مضبوط متوسط طبقے کے قیام کے لئے جد و جہد شروع کی جو دائرۂ اسلام کے اندر ہی اندر تھی جس سے کسی بھی نقطۂ نظر کے آدمی کی دل آزاری نہ ہوتی تھی۔ اور جس میں درخشاں مستقبل چھپا ہوا تھا۔ اشاعتِ دین اور معاشی استواری کا یہ سلسلہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی اولاد نے بھی قائم رکھا اور آخرکار وہ مذہبی تحریک نمودار ہوئی جسے ترکِ بدعت یا وہابی تحریک کا نام دیا جاتا ہے۔

وہابی تحریک نے مسلمانوں کو اپنی موجودہ حالت کو سمجھنے کی طرف متوجہ کیا۔ اگرچہ اس سے مراد مسلمانوں میں رد بدعت تھی۔ لیکن اس کا سیاسی پہلو یہ تھا کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں پہلی مرتبہ ہندوؤں سے اپنی علیحدہ حیثیت اور اپنی کمزور حالت کا احساس ہونا شروع ہوا۔ اور انہوں نے وہ خیالات جو مشترکہ قومیت کے قیام کے ساتھ انہیں ہندومت سے وابستہ کئے ہوئے تھے ترک کرنے شروع کر دیئے۔ اس تحریک سے اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی یاد تازہ ہوگئی اور خانقاہیت کے ایوان میں زبردست جھٹکے محسوس ہونے لگے جس کے نتیجے میں ایک شدید ردِ عمل بھی ظاہر ہوا تاہم مسلمان اپنی سیاسی معاشی اور مذہبی پستی سے آگاہ ضرور ہو گئے۔

ایک قومیت کا تصور وہابی تحریک کے ساتھ نہیں ابھرا اور نہ ہی یہ اس کی بالواسطہ عطا ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ سرسید احمد خاں کو مسلمانوں کی الگ قومیت کا احساس اسی تحریک کے نتیجے میں حاصل ہوا۔ بلکہ اگر کڑی سے کڑی ملانے کی بغور کوشش کی جائے تو پتہ چلے گا کہ ولی اللہی مسلک وہابی تحریک اور علی گڑھ تحریک اورنگ عالمگیرؒ کی خانقاہیت کے خلاف آواز کی صدائے بازگشت ہے۔ لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ بعد میں اس آواز میں طاقت پیدا ہوگئی۔ اور عالمگیرؒ کی شروع کی ہوئی زبردست نتائج کی حامل تھی۔ اور سیاسی طور پر پہلی مرتبہ کفر و اسلام میں حد بندی ہوئی۔

مشترکہ قومیت کی بے جانی کا احساس ۱۸۵۷ء کی جد و جہدِ آزادی میں ہوا۔ سلطنت اور مشترکہ قومیت میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو ہندو مسلمان کو جان و مال قربان کر دینے پر آمادہ کرتی۔ یہی وجہ تھی کہ اس زبردست کوشش کا نتیجہ سلطنت مغلیہ کے تسلط خاتمے کے سوا کچھ نہ ظاہر ہوا بلکہ اس اثنا میں یہ راز بھی کھل گیا کہ ہندوؤں کا مسلمانوں کے ساتھ الحاق خود غرضی یا اس مصلحت پر مبنی تھا۔ مبادا مسلمان پھر غالب آ جائیں یا پھر یہ خطرہ تھا کہ نہ جانے نئے آقا ان کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھیں۔ جب وقتی مصلحتیں ختم ہوگئیں تو ہندو تعصب کی آگ بھی بھڑک اٹھی۔ نیم مردہ مشترکہ قومیت کو خود ہندوؤں نے ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔ مسلمانوں اور انگریزوں کی مناقشت سے انہوں نے معاشی برتری حاصل کرنے کی کوشش کی اور مسلمان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہی نہیں، شدھی اور سنگھٹن جیسی خلافِ اسلام تحریکات کا آغاز کیا اور زبان کے مسئلے پر تو ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔

جب ہندوؤں نے مسلمانوں سے رشتہ توڑا تو قومیت کے معنی بدل گئے۔ سرسید احمد خاں نے زبان کے مسئلے پر جہاد باللسان شروع کر دیا اور واشگاف الفاظ میں ہندوؤں سے علیحدہ قومیت کا نعرہ بلند کیا۔ یہاں تک کہ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس میں شریک ہونے سے بھی منع کیا۔ اس کے بعد جہاں بھی ہندوستانی مسلمانوں میں قوم کا لفظ استعمال ہوا، اس سے مراد ہمیشہ مسلم قوم ہی لی گئی۔

دو قومی نظریے کو فروغ ہوا تو اپنی اپنی قوم کی معاشی حالت سدھارنے کی طرف توجہ دی گئی اور دونوں طرف سے نئے حکمرانوں کی حمایت حاصل کرنے کی دوڑ شروع ہوگئی۔ اور ایک قوم دوسری قوم پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگی۔ ہندو قوم کو اس معاملے میں تفوق حاصل ہوگیا تھا کیونکہ انگریزوں کی حکمت عملی بقول ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر یہ تھی کہ مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں کو اپنے اعتماد میں لیا جائے علاوہ ازیں ابھی مسلمان انگریزوں سے کوئی مفاہمت کرنے پر بھی تیار نہ تھے۔ اسی لئے سرسید احمد خاں کا کام بہت مشکل ہوگیا اور علی گڑھ تحریک کی ہر طرف سے مخالفت ہونے لگی۔

سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک جو بعد میں قیام پاکستان پر منتج ہوئی۔ اس میں بعض ایسی کمزوریاں تھیں جن کے سبب سرسید احمد خاں اور ان کے تعلیمی منشور کے متعلق غلط خیال پیدا ہوگئے۔ مسلمان سلطنت کو کبھی رعیت بننے کو تیار نہ تھے۔ اس لئے سرسید احمد کی کوششوں کو انگریز نوازی سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ سرسید احمد خاں کی ذات بھی مسلمانوں کی نظر میں قابلِ اعتراض تھی۔ اور یہ صورت ان کے بعض غلط عقائد اور انگریزی تہذیب و ...

سے گہری وابستگی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ سرسید اس حقیقت سے آگاہ تھے۔ لیکن وہ بہر حال قوم کی ناؤ کھینا چاہتے تھے۔ اس لئے وہ حالیؔ کی طرف متوجہ ہوئے جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اُن کے سوانح حیات لکھ کر اُن کے اکثر عقائد پر صاد کر چکا تھا۔ اور اچھا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام کا سچا درد اور وہی مذہبی عقائد رکھتا تھا جس کی تعلیم حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا گھرانہ دے رہا تھا جس میں خود سرسید احمد خاں بیعت تھے۔ اور جن کی روایت سینہ بہ سینہ سرسید احمد خاں کو بھی پہنچی تھی۔

حالیؔ کا یہ احساس درست تھا کہ انگریزی ادب سے اردو ادب کو بہت کچھ حاصل کرنا چاہئے۔ اسی لئے وہ انجمن ترقی پنجاب کے ان مشاعروں میں شریک ہو کر جس میں مصرع طرح کی جگہ ایک عنوان دیا جاتا تھا، انگریزی انداز کی چار کامیاب مثنویاں تخلیق کر چکے تھے۔ اب وہ علی گڑھ تحریک سے متاثر ہو کر شعر کی فنی اور تخیلی خوبیوں سے مفید معاشرہ کام لینے کی فکر میں تھے اور شاعری کو جزو پیغمبری بنا رہے تھے۔ مخرب اخلاق مضامین سے انہیں نفرت ہو گئی تھی۔ اس لئے جب سرسید احمد خاں نے اپنے تعلیمی منشور کی خامی کو دور کرنے کے لئے انہیں یہ مشورہ دیا کہ مسلمان قوم کے عروج و زوال کی داستان نظم میں بیان کی جائے تو وہ فوراً راضی ہو گئے۔ اور قوم کے سچے غم خوار کی حیثیت میں انہوں نے قومی ضرورت کا تقاضا پورا کرنے کا کام شروع کر دیا۔

حالیؔ نے مدوجزر اسلام کے نام سے مسدس لکھا اور ایسے خلوص اور جذبے کے ساتھ لکھا کہ ہندی مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کا درد پھر جاگ اُٹھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ عام قومی احساس پیدا ہوا۔ مسلمان جن کے اقبال کو رخصت ہوئے ابھی عرصہ نہ ہوا تھا وہ یہ راگ سنکر تڑپ اٹھے۔ ہر دل میں اسلام کی روح جاری و ساری ہو گئی۔ ہر مسلمان اپنی بے عملی، بے حسی اور گمراہی کا احساس کرنے لگا اور اس نظم کی مقبولیت کے ساتھ ہی اردو قومی شاعری کا ایسا چراغ روشن ہوا جس کی ضوفشانی تقریباً ایک صدی تک جاری رہی۔

بقول شیخ اکرام اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کی پہلی قومی نظم مومن کی وہ مثنوی ہے جو انہوں نے اپنے مرشد روحانی حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے جوش جہاد سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس قدر شرف قبولیت مسدس حالیؔ کے حصے میں آیا۔ اور جو دُور رس قومی نتائج اس مسدس سے حاصل ہوئے۔ اس کے پیش نظر اردو کی پہلی قومی نظم مسدس حالی ہی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ جو پاکستان کی طرح خالص دو قومی نظریئے میں پنہاں احیائے دین اسلام کی پیداوار ہے۔ اور جسے ہم ہندوستان کی مسلم دنیا کی سیاسی بیداری کا نتیجہ بھی قرار دے سکتے ہیں۔ کیونکہ مسلم قومیت جو احیائے دین اسلام کے احساس کا نتیجہ تھی۔ بلاشبہ اسلامیان ہند کی سیاسی بیداری کا نام ہے۔

اُردو قومی شاعری نے ہندی مسلمانوں کو حیاتِ نو کا پیغام دیا۔ اور یہ کہنا قطعاً بیجا نہ ہوگا کہ پاکستان کے قیام میں قومی شاعروں کا بڑا حصہ ہے۔ حالیؔ سے لیکر حفیظؔ تک سب نے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ آج بھی احیائے دین اسلام کے لئے قومی شاعروں کی ضرورت میں کمی نہیں ہوئی۔ لیکن افسوس کہ قومی شاعری کا آخری چراغ پاکستان کا قومی ترانہ ثابت ہوا۔ اور اب اس شاعری کو اشتراکیت ازم کا گھن لگ رہا ہے۔ جس کے سبب نئی پود اس سے دور تر ہوتی جا رہی ہے۔

کرشن موہن

قطعات

یاس

اس قدر حاوی ہے میرے دل پہ یاس
کچھ نہیں ہے جس کا انداز و قیاس
ہو گئی زائل مری حسِ لطیف
شاعری بھی اب نہیں آتی ہے راس

آوارگی

گردشِ پیہم میانِ کوہ و صحرا، دشت و شہر
دل کے ہاتھوں ایک مدت سے ہوں میں رسوائے دہر
شوقِ آوارہ لئے پھرتا ہے مجھکو روز و شب
بستی بستی قریہ قریہ دریا دریا نہر نہر

کم ظرفی

مجھے غم ہے کہ تم آئینِ محفل سے ہو بے بہرہ
تمہاری جیت سہ حرفی ہے میری ہار سہ حرفی
مرا بھی ظرف کم ہے کیونکہ یہ امر مسلم ہے
کسی کم ظرف کی صحبت میں پینا بھی ہے کم ظرفی

عاشق

کربِ احساس ہوں، دردِ آشفتگی
اشکِ پُرسوز ہوں، آہِ دلدوز ہوں
کرشن موہن مرا نام ہے عاشقی
کیف اندوزِ سوزِ شب و روز ہوں

جوگندر پال

اظہار

"نیلی — !"

" جی — ی ؟ "

گویا 'جی' نیلی نے اپنی زبان سے کہا ہو اور 'ی' ابھی تک اُس کی خاموشی کہہ رہی ہو۔

" ی — ی — ؟"

لیکن پروفیسر سلیم نے نہ جانے اُس سے کیا کہنے کے لئے اُسے مخاطب کیا ہو۔ شاید یوں ہوتا ہے کہ فرطِ شوق سے کسی سے بیک وقت سبھی باتیں کرنے کو جی چاہے تو اِس ہنگامے میں موضوعات بے چارے ذہن میں اپنی اپنی سمت کا جائزہ کھو کر راہ میں ہی کہیں گر پڑ جاتے ہیں۔

"کچھ نہیں۔"

پروفیسر سلیم سوچنے لگا کہ ہے تو سب کچھ، پَر اپنا کچھ نہ ہو تو سب کچھ بھی کچھ نہیں ہوتا۔ نیلی ہے لیکن نیلی نہیں ہے کیونکہ اُس کا وجود میرے لئے محض خیالی ہے جیسے میں ہوا کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھے ہوئے ہوں، ہوا سے بغلگیر ہوں۔ نیلی محض ہوا ہے پَر میں اُس کے بغیر سانس نہیں لے سکتا، جی نہیں سکتا۔ وہ میری کچھ بھی نہیں، میری سب کچھ ہے پَر کچھ بھی نہیں۔

اُس نے جی ہی جی میں نیلی کے روبرو بیٹھ کر اُس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور اپنی ملتجی آنکھوں کو اُس کے ساگر نینوں میں ڈبو کر اِن تہوں میں ڈوبی ہوئی کائنات میں نیلی نیلی، گیلی گیلی تاب کا نظارہ کرنے لگا، جیسے کوئی مچھلی کسی جھیل کی گہرائی میں پڑی ہوئی کسی روشن شئے کی طرف کھنچ کھنچ کر محسوس کر رہی ہو کہ وہ شئے یہیں تو ہے۔ یہ، بس یہیں! اور اسے پا لینے کے لئے بے چین ہو ہو کر نیچے ہی نیچے اترتی جا رہی ہے۔ یہ! — نہیں! — اب گویا وہ روشنی مزید نیچے جا پہنچی ہو۔

نیلی کے پہلو میں بیٹھے سلیم کو ہمیشہ یہی لگتا کہ وہ نیلی کا تعاقب کر رہا ہے اور اپنی جا پر بیٹھے بیٹھے دوڑ دوڑ کر اُس کا دم پھول گیا ہے اور نیلی ہاتھ نہیں آ رہی، نیلی سلیم کے ساتھ بیٹھی ہے۔ نیلی سلیم سے بہت دور ہے!

پوئٹری کی کتاب کھولو۔ صفحہ چوبیس۔ "اے ہو تی فل یشڈی ہو دآ ٹ مرسی" — وہ حسبِ معمول نیلی کو ادب پڑھانے کے لئے یہاں آیا ہوا تھا اور وہ دونوں نیلی کے باپ کے خوشنما بنگلے کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"کیٹس مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

" لیکن جو کیٹس کو بھی اچھی لگتی تھی وہ اُسے دھوکا دے گئی۔ اگر فینی کیٹس کو دھوکا نہ دیتی تو وہ اپنے نقادوں کو ہنستے ہنستے نیچا دکھا سکتا تھا، اپنی بیماری کو سلا کر دمِ حیات کی خوابنائی کو ایک خوشگوار طوالت دے سکتا تھا۔ لیکن جب فینی نے اُس کا ساتھ نہ دیا تو بھی

نے ساری عمر اپنا ساتھ دینے کا ارادہ ترک کر دیا۔ میں اُس وقت مر گیا جب خوش قسمت لوگ اپنی زندگی کو شروع کرتے ہیں۔"
نیلی کی آنکھوں میں رم جھم کا سماں بندھ رہا تھا۔ جیسے اداس سمندر نے ذرا سا رو کر اپنے جی کو خوش کر لیا ہو اور موسم بڑا پیارا ہو گیا ہو۔

سلیم کی مرجھائی سی جان تازہ دم ہونے لگی اور کیٹس کی نظم کو بھول کر اُس کی فکر نے ایک اور سمت اختیار کر لی۔

"مس نیلی، انسان کی محبت ناکام رہے تو اُسے اپنا جینا بھی معجزے سے کم معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن محبت کی کامرانی اُسے ہر معجزے پر قادر کر دیتی ہے۔ سولی چڑھ جانے کے باوجود اُس کے لبوں پر زندہ جاوید مسکراہٹ قائم رہتی ہے۔ جینے کی خواہش اُسے موت سے محفوظ رکھتی ہے۔ وہ جینے کیلئے آگ کے دریا کو بہ حفاظت عبور کر سکتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے مس نیلی، کہ محبوب آگ کے دریا کے اُس پار کھڑا ہوتا ہے اور اس آگ میں بھسم ہونے سے پہلے ہی وہ اپنی مایوسی میں جل بھن کر ڈھیر ہو جاتا ہے، پر محبوب آگ کے دریا کے اِس پار ہو تو اُس سے گلے مل کر اُس کی ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے، اُس کی کامران محبت سے متاثر ہو کر تخریب کا ہر قالب از خود بے ضرر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ قالب تخلیق کی روح کا تابع ہو جاتا ہے۔

"یہ معجزہ ہے مس نیلی، کہ ہم ننھے منے انسان لمحے لمحے کی زندگی جوڑ جوڑ کر کئی کئی سال زندہ رہتے ہیں اور ہماری نوع کو موت نہیں، حالانکہ ہماری زمین کا گولا خلا میں ٹنگا ہوا ہے اور اُس کا تخریبی چکر مسلسل حرکت پذیر رہتا ہے۔ انہدام کے اِس جزافئے میں جب خدا نے آدم اور حوا کو بھیجا تھا تو اُسے یقین تھا کہ وہ کبھی نہیں مریں گے کیونکہ وہ ساتھ ساتھ ہیں۔"

نیلی منہ کھولے، آنکھیں کھولے، کان کھولے سلیم کا ایک ایک لفظ بغور سن رہی تھی، اور اُس کے انہماک سے سلیم کا لہجہ جسیم ہوتا جا رہا تھا۔

سلیم نے سوچا کہ کاش، تیرے انہماک کا اپنا یہ علیحدہ نشان نہ ہوتا، کاش تیرا انہاک اپنے نشان سے بڑھ کر میرے لہجے کے اطراف میں چلا آتا، میرا لہجہ ہی بن جاتا، پھر میرا لہجہ پھیل پھیل کر ہالہ کا لگاتار سلسلہ بن جاتا۔ جس کی ایستادگی کی دوڑ بیک وقت کُل بر اعظم سر کر لیتی ہے۔

"مس نیلی، جب محبوب اپنی شخصیت اپنے محب کو سونپ دیتا ہے تو وحشت کو قرار آ جاتا ہے، تخریب اپنے ہتھیار ڈال کر مسلمان بن جاتی ہے اور بربریت کو مہذب جامے کی تلاش ہونے لگتی ہے۔ انسانی تہذیب کے ضمن میں عورت کی کانٹریبیوشن لاثانی نوعیت کی حامل ہے۔ اُس کی محبت کا گاکر مرد کو تخلیق و تعمیر پر آمادہ کرتی ہے اور جب وہ چپ سادھ لیتی ہے تو مرد کو اپنے خالق پر غصہ آنے لگتا ہے کہ اُس کی کھال پر بھی بھالو کی کھال کے مانند بڑے بڑے بال کیوں نہیں۔"

"میں تم سے محبت کرتا ہوں، نیلی۔" پروفیسر سلیم کے دل و دماغ نے اُس کا منہ بن جانا چاہا لیکن اُس کا منہ بولا "مس نیلی، انسانی تمدن کی نمائندگی میں ادب کو صرف اِس لئے اولین مقام حاصل ہے کہ اُسے مرد و زن کے اولین عشق پر اب بھی ایمان ہے۔ دیگر علوم یا تو محبت کو یکسر نظر انداز کر جاتے ہیں یا اُس کا ایک مصنوعی سا تصوّر رچا کر، اور چونکہ یہ تصوّر غیر فطری ہوتا ہے اِس لئے اسے محض ثانوی حیثیت دے کر فارغ ہو جاتے ہیں، لیکن محبت سے ہماری تخلیق وابستہ ہے، محبت انسانی بقا کے لئے نوعِ انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے اور اِس کا ثبوت یہ ہے کہ محبت کا نام نہ بھی ہوتا تو محبت ہوتی۔

"مس نیلی، جو چیز اپنی بقا کے لئے اپنے نام کی محتاج نہیں ہوتی، وہ بہر صورت ہوتی ہے۔ محبت بے صورت ہو، بے رنگ ہو، بے نام ہو، بہر صورت محبت ہے۔"

"تو پروفیسر صاحب، کیا یہ کہنا ٹھیک ہو گا کہ محبت کا کوئی بُرا سا نام بھی رکھ دیا جائے تو مضائقہ نہیں؟ اپنی خُو کی بدولت اُسے بہر حال

اولین مقام ہی حاصل رہے گا ؟"

" ہاں، کیوں نہیں ؟" پروفیسر سلیم نے محسوس کیا کہ نیلی کا انہماک اب تماشائی کا رول چھوڑ کر اُس کے بیچ کے مانند تماشہ بن جانے پر آمادہ ہو رہا ہے۔ (میں تم سے محبت کرتا ہوں نیلی) "جو شے اپنے وجود کے لئے کسی نام کی محتاج نہیں، اُس کا کچھ بھی نام رکھ دیا جائے، کیا ہوتا ہے ؟ ـــ" اسی اثنا میں مس نیلی کی بڑی حسین اور سمارٹ نوکرانی جمیلی اُن کے سامنے میز پر چائے کی ٹرے رکھ کر چلی گئی۔ "مثلاً اگر مجھے جمیلی سے محبت ہو تو میری یہ محبت اُسی طرح ہماری زندگی کا پہلا فریضہ ہے جس طرح آدم اور حوا کی محبت، اُن کا۔ ہر محبت کی نوعیت اولین ہے ـــ"

" تو کیا آپ کو واقعی ہماری جمیلی سے محبت ہے پروفیسر صاحب ؟" نیلی نے ہنس کر گرم گرم چائے کو ہونٹوں سے لگا لیا اور زبان پر جلن محسوس کر کے اُس کی آنکھوں میں آنسو سے آ گئے۔

" نو، مائی ڈیر گرل !" سلیم کو یہ محسوس کر کے خوشی ہوئی کہ نیلی نے شاید اُسے صرف اپنے لئے ہی مارک کر رکھا ہے۔ شاید ـــ شا ـــ ید۔ اِن ساگر نینوں میں ڈوبی ڈوبی کائنات کی کل دولت میرے لئے ہی وقف ہے۔ مچھلی بے چین ہو کر سمندر میں اور نیچے اتر آئی۔ یہ !

سلیم نے نیلی کو بتایا۔ "میں یہ کہنا چاہتا ہوں مس نیلی، کہ حوا صرف حوا ہے، حوا کسی ہائی کمشنر یا چپراسی کی لڑکی کا نام نہیں۔" نیلی ہائی کمشنر کی بیٹی تھی (اب شاید تمہاری سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ اب ـــ اب شاید ـــ) "مس نیلی، محبت کسی اور رشتے کو تسلیم نہیں کرتی۔ وہ صرف اپنے آپ کو تسلیم کرتی ہے۔" (اب میں تمہیں کیونکر سمجھاؤں ؟ تم ـــ تم آپ ہی کیوں نہیں سمجھ جاتیں ؟ ـــ) "مثلاً ـــ مثلاً" اُس نے جھجک کر جراٗت کی۔ "تم ہائی کمشنر کی بیٹی ہونے کے باوجود سب سے پہلے حوا کی بیٹی ہو اور تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ جس سے چاہو، پیار کرو۔ اُس سے" اُس نے اپنی دائیں طرف خالی خولی ہوا کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "اِس سے۔" اُس نے بائیں طرف اشارہ کیا۔ "اور ـــ اور ـــ م ـــ" "م" سے اُس کا منہ اس قدر بھر گیا کہ مجھ حلق سے باہر نہ آ پایا۔

" پروفیسر صاحب، مجھے ـــ مجھے آپ سے ـــ"

" ہاں ؛ ہاں۔ مس نیلی۔ کہو ! ـــ" سلیم نے بے چین ہو کر کہا اور شکر کرنے لگا کہ نیلی خود آپ ہی اظہارِ محبت پر تیار ہو گئی ہے۔

" مجھے آپ سے ایک بات کہنا ہے پروفیسر صاحب۔"

" ایک نہیں، سو کہو بھئی۔" اپنی بے چینی کے باوصف وہ نیلی کی جھجک سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ "پر سب سے پہلے وہی کہو جو اصل بات ہے۔"

" اصل بات یہ ہے پروفیسر صاحب۔" وہ شرما گئی اور پھر جھٹ اپنی شرم پر قابو پا کے گویا ہوئی، " آپ کی باتوں نے میرے ایمان کو تقویت دی ہے، میری محبت میں نئی حیات کی روح پھونک دی ہے ـــ"

" ہاں، ہاں، کہو !" اپنے اقرارِ محبت کی صدائے بازگشت سننے کے لئے وہ بے چین ہو ہو گیا اور اُس کی بے تابی پسینے کے قطرے بن بن کر اُس کی پیشانی پر برآمد ہونے لگی۔

" کل صبح میں اور اپنی کا ڈرائیور یہاں سے بھاگ رہے ہیں !"

شرافضل جعفری

غزل

پی کے ماضی کا جامِ دل افروز
رقص کرتی ہے دانشِ امروز

ہم نے کیا دھوم سے لگایا ہے
چشمِ فردا میں سُرمۂ دیروز

عظمتِ عشق تو ہے برق طلب
فطرتِ حُسن ہے چراغ اندوز

پہلے پہلے تو سرد سرد تھی آہ
دھیرے دھیرے ہوئی زمانہ سوز

زندگی نے تجھے پچھاڑ دیا
ہم سردار بھی ہوئے فیروز

مرگ مستانِ سرخرو کے لئے
قتل کا دن ہے غیرتِ نوروز

محمد انور حارث

غزل

میری آہ کے شرارے تیرے بام تک نہ پہونچے
یہ دلیل راہ بن کر کبھی مقام تک نہ پہونچے

مجھے کس طرح یقیں ہو کہ افق سحر نما ہے
میری صبح کے اجالے کبھی شام تک نہ پہونچے

وہی رند چشم ساقی میں بہائے میکدہ ہیں
جو کمال تشنگی میں کبھی جام تک نہ پہونچے

گئے انکی انجمن میں میرے نامہ بر سے پہلے
دل مضطرب کے نالے جو پیام تک نہ پہونچے

ہے ازل سے عالم آرا ترا حُسن بے محابا
گئے سنگ در پہ موسیٰ رہ عام تک نہ پہونچے

وہی ہیں مراد گلچیں وہی ہیں بہار گلشن
جو نکل کے آشیاں سے سر دام تک نہ پہونچے

رہ شوق میں خرد نے یہ سیاہ دن دکھائے
کہ سلام آگیا جب تو کلام تک نہ پہونچے

میری داستان دل ہے ابھی ناتمام حارث
کہ وفور شوق میں لب ترے نام تک نہ پہونچے

حسرت کاسگنجوی

پاکستان کے ممتاز ناول نگار

عزیز احمد

اس وقت ناول نگاروں میں عزیز احمد کو بہتر تعلیم یافتہ کہا جا سکتا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے ولایت کی یونیورسٹی سے بھی انگریزی ادب میں اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں۔ کچھ عرصہ عثمانیہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر رہے۔ اور اس سلسلے میں ان کے علم میں اضافہ ہی ہوگیا۔ انگریزی کا وسیع مطالعہ کرنے کے بعد انہوں نے اردو کی طرف توجہ کی۔ تنقید نگاروں میں بھی انہوں نے خاصی شہرت حاصل کی۔ طویل اور مختصر افسانے بھی لکھے۔ لیکن بقول جلال الدین احمد ان کا خاص میدان ناول نگاری ہی ہے[۱]۔ جلال الدین احمد نے انہیں اس دور کا سب سے بڑا ناول نگار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے[۲]۔ اور ان کی ناول "ایسی بلندی ایسی پستی" کو ان کا شاہکار ٹھہرایا ہے۔ لیکن مجھے اس سے اختلاف ہے۔ اور یہ اختلاف ایک لحاظ سے اصولی بھی ہے۔ عزیز احمد فحاشی اور عریاں نگاری کو حقیقت نگاری سمجھتے ہیں۔ اگر فحاشی اور عریاں نگاری حقیقت نگاری ہو سکتی ہے تو ہم اس حقیقت نگاری کو دور ہی سے سلام کرتے ہیں۔ عزیز احمد محض جنسیات میں ہی دلچسپی لیتے ہیں۔ اور جنس نگاری ہی ان کا محبوب موضوع ہے۔ ان پر جنس نگاری بھوت بن کر سوار ہوگئی ہے اور یہ زندگی کا کوئی تعمیری پہلو نہیں۔ وقار عظیم نے شاید اسی سے متاثر ہو کر کہا تھا۔

"گریز۔ دوسری عالمگیر جنگوں کے درمیانی وقفے کے پرشورش یورپ اور انگلستان کی زندگی کا ناول ہے۔ اس میں اس عہد کی سیاسی، اور معاشی پس منظر پر جنسی حقائق کا غلبہ ہے جنہیں مصنف نے مزے لے لے کر بیان کیا ہے اور اپنے قاری کو اس مزے میں پوری طرح شریک ہونے کی دعوت دی ہے۔ جنسی معاملات کے اس طرح غیر ضروری آزادی اور بے باکی سے بیان کرنے میں بظاہر فرائڈ کی جنسی نفسیات کا سہارا لیا گیا ہے۔ لیکن اس ناول میں یہ سہارا نفسیاتی یا فنی سہارا ہونے کی بجائے محض اس کا فریب معلوم ہوتا ہے[۳]"

اور یہ حقیقت ہے۔ جب جنسی حقائق مزے لے کر بیان کئے جائیں اور قاری کو دعوت دی جائے کہ وہ بھی اس میں شریک ہو تو ذہن پستی کی طرف مائل ہوگا۔ ناول نگاری کا افادی مقصد یہاں فوت ہو جاتا ہے اور ذہنی فرار کی سرحدیں شروع ہو جاتی ہیں۔

عزیز احمد کی ابتدائی ناولیں "آگ" اور "ہوس" اور "مرمر" کو چھوڑ کر جو مختصر بھی ہیں اور پورے طور پر ناولیں بھی نہیں کہی جا سکتیں۔ عزیز احمد کی شہرت اور ادبی دائروں میں مقبولیت "گریز" سے ہوئی۔

---

[۱] گزشتہ دس سال سے عزیز احمد نے ناول نگاری ترک کر دی ہے۔ ان کا آخری ناول "شبنم" ہے
[۲] تین ناولیں ___ نقوش لاہور۔ [۳] داستان سے افسانے تک ___ وقار عظیم۔

جب ہم اس ناول کی تکنیک اور فن پر غور کرتے ہیں تو ہمیں عزیز احمد کی فنکارانہ صلاحیتوں کی داد دینا پڑتی ہے۔ لیکن جب ہم اس ناول کے مواد پر دھیان دیتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی محض حسن پرستی، جنسی کشش اور جنسی تعلقات ہے۔ اس زندگی میں خود غرضی ہی خود غرضی ہے، انسانیت، ہمدردی اور اخلاق کہیں بھی نہیں ہے۔ عزیز احمد کے ہاں ہمیں شاعرانہ تخیل ملتا ہے۔ صنعت گری کے نمونے بھی مل جاتے ہیں۔ نفسیاتی اور جذباتی کیفیات کی تحلیل بھی کہیں کہیں مل جاتی ہے۔ منظر کشی بھی وہ خوب کرتے ہیں۔ مکالمے بھی مختصر اور جامع ہوتے ہیں۔ واقعات اور جذبات کو ہم آہنگ کرنے میں بھی وہ اپنی قابلیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہے لیکن جو چیز وہ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اس سے ہماری طبیعت متنفر ہوتی ہے۔ اس کی وجہ محض مواد کی خرابی ہے۔ اس سے ایک بات یہ بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اچھی ناول کے لئے اچھے مواد کی بھی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔

"گریز" اور دوسری ناولوں میں بس اتنا سا فرق ہے کہ گریز میں باقاعدہ کوک شاستر کا سا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ بعد کی ناولیں بھی اسی انداز کی ہیں۔ لیکن ان میں جنس نگاری، عریانی اور فحاشی اتنی زور دار نہیں ہے۔ جتنی کہ "گریز" میں ہے۔ عزیز احمد کا فن نکھر تا گیا ہے کہ وہ بات کو کہنے کا سلیقہ جان گئے ہیں۔ لیکن جو بات کہہ رہے ہیں وہ خود گری ہوئی ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔

"عزیز احمد تو اس رنگ پر چل گئے ہیں اور باوجود تمام علمیت اور قابلیت یہ نہ سمجھے کہ یہ عریاں نگاری کیا ہے "گریز" کا ذہنی اور فکری پہلو بہت ہی پست ہے"[۱]

ذہنی اور فکری پہلو تو ہمیں ان کے کسی ناول میں بھی نہیں ملتا۔ وہ بغیر عریاں نگاری کے نوال نہیں توڑ سکتے۔ ان کے ہیرو اور ہیروئن جنسیاتی پہلوؤں پر ہی زیادہ غور کرتے ہیں۔ بلکہ غور بھی نہیں کرتے محض کھیل تصور کرتے ہیں اور جذبات کی تسکین کو اپنا مطمح نظر بنا لیتے ہیں یہاں وہ اشتمالیت کا بھی سہارا لیتے ہیں۔ وہ مشرق کو مغرب کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں۔ ان کی جنس نگاری فرانسیسی جنس نگاری سے بہت قریب آگئی ہے۔ کشن پرشاد کول کہتے ہیں۔

"تحت الشعور کے طوفان میں سیاسی و جنسی کشتیاں سجاد ظہیر اور کرشن چندر نے بھی چلائی ہیں۔ عزیز احمد پھکڑ پن اور فحاشی میں سعادت حسن منٹو کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں"[۲]

عزیز احمد نے اگر کسی جدت پسندی یا ترقی پسندی کا کوئی کارنامہ انجام دیا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ اس نے اپنی عیاشی کے تجربے ہندوستان میں نہیں کئے بلکہ لندن اور پیرس میں کئے ہیں۔ عزیز احمد خود ترقی پسند ہیں۔ انہوں نے "ترقی پسند ادب" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ اگر ہم "گریز" کو بقول کشن پرشاد کول اس معیار سے جانچنا چاہیں جو ترقی پسند ناقدین نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے تو "گریز" کا شمار نہ اعلیٰ پائے کے ادب میں ہو سکتا ہے نہ ترقی پسند ادب میں ـــ اس ناول کا اثر بالخصوص طبیعتوں پر بجے صحت مند نشاط کا نہیں بلکہ مریضانہ تعیش پسندی کا ہوگا۔ کیونکہ اس کی عریاں نگاری بلکہ فحش نگاری جس کے داغوں اور دھبوں سے یہ ناول پٹا پڑا ہے"[۳] سمجھ میں نہیں آتا جب یہ خود ترقی پسندوں کے اصولوں پر پورا نہیں اترتا تو پھر اسے کس نظریے کے تحت پرکھا جائے۔ علی عباس حسینی نے بڑے ضبط و تحمل کے ساتھ صرف ایک جملے میں عزیز احمد کا تجزیہ کیا ہے، کہتے ہیں۔

"جنس کے معاملے میں وہ نامناسب لغراط سے کام لیتے ہیں"[۴]

---

[۱] ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔ [۲] نیا ادب ـــ کشن پرشاد کول۔ [۳] نیا ادب ـــ کشن پرشاد کول۔ [۴] ناول کی تاریخ اور تنقید ـــ علی عباس حسینی۔

> اگر عزیز احمد غور کریں کشن پرشاد کول صاحب کا دیا ہوا مشورہ برا نہیں ہے" چاہئے تو یہ تھا کہ عزیز احمد اپنے اس مریض ہیرو کو کسی ذہنی امراض کے معالج کے مطب میں لے جا کر نفسیاتی معالجہ کے طریق علاج سے صحت مند نشاط کا عادی بنواتے۔ لیکن انہوں نے غضب یہ کیا کہ اس کو ننگا بچا کر کے ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ اور ہم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہم اس کو مریض نہیں بلکہ ہیرو قرار دیں"۔[1]

عزیز احمد کی ناول نگاری کے موضوع حدود اور رمتہ گریز ہی سے قائم ہو جاتے ہیں۔ مگر ایسی بلندی ایسی پستی" میں وہ ایک خاص زندگی کو اپنا دائرہ بنا کر اپنے مقاصد کو واضح کرتے ہیں۔ اور اپنے فن پر عمل کی مثال پیش کرتے ہیں۔ اس میں حیدرآباد (دکن) کے امرا کی معاشرت کا خاکہ سامنے لایا گیا ہے۔ جہاں مغربی تہذیب و تمدن کی کورانہ تقلید کی جاتی ہے۔ تن آسانی اور عیش و نشاط کی محفلیں جمتی ہیں ہوس رانی اور مے خواری کے علاوہ وہ تمام لعنتیں جو جاگیرداری نظام کی پیداوار ہوتی ہیں۔ معاشقے، کلب، گھر، پارٹیاں دربارداریاں ضیافتیں حصول اقتدار کی ہوس سماجی تقریبیں اور لمارت کے مظاہرے اور آپس کی ریشہ دوانیاں اور رقابت کے نقشے بڑی خوبی سے پیش کئے گئے ہیں۔ اس ناول میں بجائے کسی مخصوص کردار کو لینے کے ایک پورے معاشرے کو لیا گیا ہے۔ جس میں مختلف مرد اور عورت برابر اہمیت رکھتے ہیں۔ اور ان کا وجود صرف اس لئے اہم ہے کہ وہ ایک خاص معاشرے کے نمائندے ہیں۔ زیادہ تر اس ناول میں حیدرآباد کے جاگیردارانہ طبقے کے نقوش ہیں۔ گھروں میں مستورات کی زندگی ایک طرف اور دوسری طرف مردوں کی زندگی کے بہت سے دلچسپ مناظر سامنے لائے گئے ہیں۔ مگر ان سب سے زیادہ دلچسپ عیش پرستی کی زندگی ہے۔ ان کو کمال کے ساتھ دکھلانے کے لئے ناول حیدرآباد سے وہرہ دون پر آ جاتا ہے۔ جہاں گرمیوں کے دنوں میں تفریح کے لئے ہندوستان کے ہر طبقے ہر ملت و مذہب کے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ ان سب میں ایک منظر پرستش سب سے زیادہ نمایاں ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ ان کے دو کردار ہیں۔ ایک اس وقت کا جب کہ ان کے شوہر دہرہ دون میں ہیں اور دوسرا اس وقت کا جب ان کے شوہر دہرہ دون سے کسی کاروباری مقصد کے لئے باہر چلے جاتے ہیں۔ یہاں پھر گریز کی فضا قائم ہو جاتی ہے اور عریاں سین سامنے آتے رہتے ہیں۔ اور اسی ماحول میں ناول ختم ہو جاتا ہے۔

یہ گریز کی طرح کرداری ناول نہیں۔ بقول محمد حسن عسکری یہ اردو کا پہلا اجتماعی ناول ہے۔ عزیز احمد نے اس میں ایک پورے معاشرے کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عزیز احمد نے کوئی بڑی بات کہنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ ضمنی باتوں میں الجھ گئے اور ناول کا دائرہ محدود ہوتا چلا گیا۔ اور جب ناول ختم ہوتا ہے تو ہمارے ذہن پر مجموعی طور پر جو تاثر پیدا ہوتا ہے۔ وہ ویسا نہیں جیسی کہ عزیز احمد سے توقع تھی۔

کرداروں میں سریندر کے کردار میں کہیں کہیں گہرائی پائی جاتی ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار نور جہاں کی کچی مٹی ہے۔ نور جہاں کے کردار کے متعلق ممتاز شیریں لکھتی ہیں۔

> "نور جہاں کچی مٹی ہے جس طرح اسے ڈھالا جائے ڈھل سکتی ہے۔ نور جہاں کی زندگی خام مواد ہے جو ایک طرف وراثت اور دوسری طرف خارجی ماحول کے زیر اثر تشکیل پاتی ہے۔ اس کے اردگرد کی چیزیں اس کی زندگی میں جذب ہو جاتی ہیں اس کے آبا و اجداد کی طرز زندگی ان کے کردار کی خوبیاں اور خامیاں ان کی لغزشیں سب نور جہاں کی زندگی پر اپنا اثر چھوڑتے ہیں۔ گو نور جہاں خود معصوم ہے اور اس کا اپنا کوئی واضح کردار نہیں۔ نور جہاں کی زندگی اس کے کردار سے نہیں بنتی۔ یہاں تک کہ اس کی سلطان حسین کے ساتھ ازدواجی زندگی کے جھگڑے سے المیہ کی بھی وہ خود ذمہ دار نہیں۔ بڑے قد کے کرداروں کا المیہ خود ان کے کرداروں سے پیدا ہوتا ہے۔ نور کے کردار میں نہیں۔ معاشرے میں ہے"۔[2]

---

[1] معیار۔ ممتاز شیریں

اس ناول میں بھی عزیز احمد کی فکر کا وہی انداز ہے جو ہمیں گریز میں ملتا ہے۔

جلال الدین احمد[1] نے اس ناول کی گالسوردی کے ناول "FORSYTHE SAGA" سے اس بنا پر مناسبت بتائی ہے۔ کہ اس میں بھی ایک پورے خاندان اور اس میں کئی پشتوں سے بھی بدلتے ہوئے حالات مرکز توجہ ہیں۔ مگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس ناول میں بھی صالح اخلاقی مقاصد کی کمی کی بنا پر یہ ناول پست ہی ہو جاتی ہے۔ عزیز احمد کی ہستی اور علم سے جو امید ہونا چاہئے تھیں وہ پوری نہیں ہوتیں۔ اور یہ ناول بھی ان کی سگ خوئی کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ بہرحال اختصار انتخاب اور ترتیب کی یہ ناول بہترین مثالوں میں گنی جا سکتی ہے۔ اور اگر اس میں زندگی بھی اپنے مکمل اخلاقی پہلو کے ساتھ دکھائی جاتی تو یہ مقبول خاص و عام بھی ہوتی اور اردو کی کلاسکس میں جگہ پاتی۔ زندگی کے وسیع تاثر کو پیش کرنے کی یہ ناول مثال ہے۔

ان کی آخری ناول "شبنم" اتنی ہی زیادہ محدود ہے جتنی کہ "ایسی بلندی ایسی پستی" وسیع ہے۔ یہ بھی ایک کرداری ناول ہے۔ شبنم ایک عام صورت کی مگر نوجوان لڑکی ہے۔ عزیز احمد نے اس کے کردار کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔ شبنم میں بہت کم خوبیاں ہیں۔ جو کہ ایک ناول کی ہیروئن کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ ایک طرف تو اس کی دادی یا نانی طوائف تھی۔ اور دوسری طرف اس کے نانا کسی نواب صاحب کے ہاں فراش تھے۔ والد منصف تھے اور اب ریٹائر ہو کر پنشن لے رہے تھے۔ شبنم کے رومان مشہور رہیں۔ تقریباً ہر شخص جانتا ہے کہ وہ نوازش علی خاں سے ایک ناکام عشق لڑا چکی ہے۔ اور پھر جذبات کی رو میں بہہ کر منظور حسین کے ہاتھوں تباہ ہوئی (یہ بات پروفیسر اعجاز حسین سے نوازش نے کی تھی) اس کی منظور کے ہاتھوں تباہ ہونے کی کہانی ہر شخص کو معلوم ہے۔ بلکہ کچھ لوگ تو یہاں تک سمجھتے ہیں کہ شبنم پڑھی لکھی ذرا اونچے طبقے کی طوائف ہے حتیٰ کہ ایک جگہ زینا ہیرو ارشد کی پرانی محبوبہ کہتی ہے۔ "پچھلے سال شبنم کا حمل ساقط کرایا گیا ہے۔" ان تمام باتوں کے باوجود مدیر "دکن آبزرور" ارشد علی خاں شبنم میں بے پناہ دلچسپی لیتے ہیں۔ ان کے جبینوں جیسے بال ترشے ہوئے ہونٹ انہیں بہت زیادہ پسند تھے۔ وہ خود شرابی ہیں فلرٹ کرتے ہیں۔ لڑکیوں میں دلچسپی لینا اور ان کا پیچھا کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ وہ شبنم سے دلچسپی لیتے ہیں۔ پہلے تو شبنم باوجود اس قدر بدنام ہونے کے التفات نہیں برتتی اور ارشد کی ایک ادیب ہونے کی حیثیت سے عزت کرتی ہے۔ ارشد باوجود بے حد آزاد خیال ہونے کے شبنم کے معاشقوں کی برابر چھان بین کرتا ہے۔ اور اس وقت جبکہ شبنم قطعی طور پر ارشد کی ہونے والی تھی تو اس کو محسوس ہوا کہ جسے وہ چاہتا ہے اسے کبھی حاصل نہ کر سکے گا۔ اس کا جواز اس نے یہ پیش کیا کہ جب جسم مل جاتا ہے تو وہ جسم نہیں ہوتا جس کی لو سے عشق کا چراغ جلتا ہے۔ اس کے نزدیک وصال ہو یا فراق دونوں صورتوں میں عشق کا امکان باقی نہیں رہتا۔ اور اس طرح وہ شبنم کو ٹھکرا دیتا ہے۔ کہانی کے لحاظ سے یہ بھی بات کچھ ادھوری سی ہے۔ اور جس فلسفے کو عزیز احمد نے پیش کیا ہے وہ ایک اوباش شرابی انسان پر پورا نہیں اترتا۔ شبنم کو ٹھکرانے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے اور وہ شبنم کے معاشقے ہوتے ہیں۔ منظور کے ہاتھوں شبنم کا تباہ ہونا ہوتا ہے۔ دراصل ارشد اپنے شعور کو دھوکہ دیتا رہا اور رجحانات اس کے شعور میں تھی اس کی شخصیت پر چھائی ہوئی تھی جس کی وہ تاب نہ لا سکا۔ حالانکہ شبنم اسے (ارشد کو) صاف صاف لفظوں میں بتاتی ہے اور یقین دلاتی ہے کہ وہ کنواری ہے۔ ایک دفعہ تو وہ بڑی بے حیائی سے کہتی ہے۔ شادی کی پہلی رات وہ اسے آزمالے کہ وہ پاک دامن ہے کہ نہیں۔ لیکن واقعات اور حالات ایسے ہوتے ہیں کہ ارشد کو یقین نہیں آتا اور وہ اسی تجسس میں رہتا ہے۔ کہ کوئی اور ثبوت ملے۔ ان ثبوتوں کو فراہم کرنے میں ہی ناول کا اختتام ہو جاتا ہے۔

---

[1] تین ناولیں — جلال الدین احمد — نقوش لاہور۔

ناول انتہائی محدود ہوگیا ہے۔ صرف شبنم اور ارشد کے کردار ہی ابھر سکے ہیں۔ ان میں بھی لا ابالی پن ہے۔ ارتقائی حیثیت تو ہمیں شبنم ہی کے کردار میں ملتی ہے۔ پوری ناول میں ارشد کے بے پناہ عشق کو سامنے لایا گیا ہے۔ عشق کی واردات کا جائزہ لیا گیا ہے اور خاص طور سے اس کو ایک عجیب وغریب بھید دکھایا گیا ہے جو حسن سے بھی تعلق نہیں رکھتا۔ کیونکہ شبنم کو حسین لڑکیوں کے دائرے میں نہیں لایا جا سکتا۔ ناول کی خاص دلچسپی شبنم سے لوگوں کے عریاں تعلقات کے مناظر ہیں۔ ان میں ایک پروفیسر صاحب ایک نمائندہ INTELLECTUAL کردار ابھرتے ہیں جن کی انگریزی شاعروں میں DONNE سے دلچسپی اور فارسی شاعروں میں رومی سے لگاؤ ان کو INTELLECTUAL سطح پر لے آتا ہے۔ مگر ساتھ ساتھ ان کی مے خواری اور ان کی لڑکیوں میں غلط دلچسپی ان کو ایسی پستی میں ڈھکیل دیتی ہے کہ ان کے کردار کا بھی ستیاناس ہی ہوکر رہ جاتا ہے۔ آخر تک شبنم کا کردار ہی اس ناول کی جان رہتا ہے۔ اور اس کو اگر ہم آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیوں کا نمائندہ کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ گریز کے نعیم کی طرح وہ بھی ہمارے معاشرے کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اگر نعیم میں جدید جوانی کی تمام خصوصیات یکجا ہوگئی ہیں تو شبنم میں جدید دور کی لڑکی کی پورے طور پر نمائندگی ہوگئی ہے۔ شبنم کا عشق اور شبنم سے عشق دونوں آخر میں محض خود غرضی ہی ثابت ہوتے ہیں۔ اور ناول کو بند کرنے پر ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں شبنم سے ہمدردی ہونے کی بجائے سخت ترین نفرت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ کہا کہ اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس کے مصنف کو زندگی یا اس کی کسی چیز سے محبت نہیں ہے۔ شبنم باوجود اپنی خامیوں کے دلکش ہوسکتی تھی۔ اور اردو ناول میں ایک زندہ ہیروئن کا اضافہ کرتی اگر عزیز احمد صاحب کا وہ بنیادی عقیدہ ہوتا جو فن کاروں کی تخلیقوں کو اس طرح دلکش بنا دیتا ہے کہ ہر فرد دلبشر ان کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔"

بقیہ دلّی سے دلّی تک (سلسلہ ص۵۷)

انگوٹھے کی مخالف سمت میں کانی مڑی ہوئی جس سے بڑی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان ایک خلا پیدا ہوگیا تھا۔

غرض یہ کہ انگنا کہار کسی کونے سے بھلا لگنے کے لائق نہ تھا، نرا بھوت ناتھ، کالا پیلا، بدشکل، بدوضع۔"

دلّی کے دبستان نثر میں تخلیقی نثر لکھنے والوں میں صرف دو ہی نام نظر آتے ہیں۔ پہلے مرزا محمود بیگ صاحب اور دوسرے ضمیر صاحب۔ بیگ صاحب کا تعلق اگلی نسل سے ہے ۱۹۴۷ء کے بعد جب دلّی کی بساط ادب الٹی تو ملّا واحدی، شاہد احمد دہلوی اور خواجہ محمد شفیع جیسے نثر نگار دلّی سے چھن گئے۔ بظاہر دلّی میں اس طرز خاص کا کوئی نام لیوا نظر نہ آتا تھا۔ ایسے موقع پر مرزا محمود بیگ صاحب کے قلم کو جنبش ہوئی چنانچہ ملّا واحدی اور شاہد احمد دہلوی کی دلّی سے رخصت کے وقت سے آج تک دلّی میں اس مخصوص قسم کی نثر نگاری کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا ہے۔ اسی سلسلے کی اگلی کڑی سید ضمیر حسن دہلوی ہیں جن کی کتاب "دلّی سے دلّی تک" حال میں شائع ہوئی ہے۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دلّی میں اب نہ وہ زبان رہی اور نہ زبان داں اور نہ ہی اب دلّی میں کوئی نیا ادیب اور شاعر پیدا ہوسکتا ہے اگر کوئی نیا نام سامنے آتا بھی ہے تو اسے غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ سید ضمیر حسن دہلوی بھی دلّی کے ابھرتے ہوئے ادیب ہیں۔ اگر آپ کو دہلوی ادب اور زبان سے کچھ بھی ذوق ہے تو آئندہ کے لئے نہ تو ضمیر صاحب کی شخصیت ہی کسی تعارف کی محتاج ہوگی۔ اور نہ ان کی کتاب پر کسی تبصرے کی ضرورت پیش آئے گی۔ میری اب تک کی سمع خراشی کا مطلب یہ ہے کہ سید ضمیر حسن دہلوی نئی نسل کے ایک ذہین اور حساس نوجوان ہیں۔ جو زبان بولنا جانتے ہیں، نثر لکھنا جانتے ہیں، رواں، شیریں، سادہ سلیس اور بامحاورہ نثر، وہ نثر جو ہر دور میں صرف مخصوص لوگوں نے لکھی ہے۔ اور آج کی دلّی میں یہ نثر ضمیر صاحب سے مخصوص ہے۔

چندر پرکاش شاد

غزل

جانے کیا سوچ کے پھر آج اُڑیں وہ زلفیں
اپنے بھی جی میں ہے تا عمر پریشان رہیں
اس تمنا کے سفر میں نہ تھکیں اور نہ رکیں
آنکھ میں دھول ہو اور دل میں بسی ہوں یادیں
روزِ روشن سے کہو کرے کنارا کہ ہمیں
شبِ تنہائی سے کرنی ہیں ہزاروں باتیں
آج ویرانۂ ہستی میں ہے شعلوں کا خروش
آج اے کاش تری زلف کے بادل برسیں
آج اُمید کی دُنیا میں عجب رونق ہے
صبح دم جیسے کسی پیڑ پہ پنچھی چہکیں!
لوگ تو سطحِ تصوّر ہی میں کھو جاتے ہیں
کس نے جانی ہیں مرے بڑھتے ہوئے غم کی تہیں
آج تو جی میں ہے، آموں کے کسی جھنڈ میں ہم
جا کے لیٹیں کوئی بیتے ہوئے دن یاد کریں
نہ پرندہ کوئی بیٹھے نہ مسافر ٹھہرے
میں ہوں وہ پیڑ کہ جس پیڑ کے سائے بھی جلیں
چھائی رہتی ہیں دلِ زار پہ سایوں کی طرح
آنکھ کی راگنیاں اور بدن کی لچکیں!
چھوڑتے جاتے ہیں اب ساتھ یہ گلیاں کوچے
کون بتلائے یہاں ٹھہریں تو کب تک ٹھہریں
بے تعلق سا اک احساس تھا، وہ بھی نہ رہا
لاکھ اب چاندنیاں زہر میں بجھ کر آئیں!

تصدق رسول

غزل

نغمہ و حُسن و عشق و بادہ و جام
کس خلا میں ہے گردشِ ایام
کون میکش بہ ظرفِ بادہ کشی
میکدہ مُفت میں ہوا بدنام
سخت کافر ہے جو نہ دیکھ سکے
پرتوِ حُسنِ ذات کے اصنام
آج گردوں پہ ہیں قدم تیرے
آفریں آدمِ بلند مقام
حسرتِ دامنِ طلب مت پوچھ
شعلۂ حُسنِ آرزو ناکام
اس قدر منزلیں جو طے کی ہیں!
نارسائی کہاں رہی الزام
ظلم اتنا نہ کر کہ میرا دل
غم سے ہو جائے خوگرِ آلام
موت کا انتظار کرتا ہوں
زندگی سے تو مل گیا آرام

خلیق انجم

منشی عبدالقدیر

دہلی میں اینگلو عربک اسکول کی تین شاخیں تھیں۔ ۱۹۴۷ء کے جھگڑوں میں موری گیٹ اور دریا گنج کے اسکول بند ہو گئے۔ اور اجمیری گیٹ والا باقی رہ گیا۔ میں پہلے دریا گنج کے اسکول میں پڑھتا تھا۔ اور اب مجبوراً اجمیری گیٹ میں داخل کر دیا گیا۔ اسکول آتے جاتے اردو بازار میں ایک عجیب و غریب قسم کے سکھ بزرگ کو دیکھتا۔ سر سے پیر تک سفید براق، سفید پگڑی بلکہ پگڑ، سفید داڑھی، سفید ابرو، چھوٹا سا قد گٹھا ہوا جسم، کھدر کا لمبا سا سفید کرتا۔ اور سفید کھدر کی تنگ گھیر اور چھوٹی موری کی شلوار۔ یہ بزرگ کبھی کسی دوکان پر بیٹھے ہوتے۔ کبھی کسی سے کھڑے باتیں کر رہے ہوتے۔ میں اس وقت کم عمر تھا۔ اس لئے ان سردار صاحب سے ڈرتا بھی تھا۔ اور اس طرح انہیں مسلمانوں میں گھلا ملا دیکھ کر حیرت بھی کرتا۔ ایک دن میں اپنے ماموں جان کے ساتھ جا رہا تھا۔ سامنے سے وہ بزرگ آ گئے۔ اور ماموں جان نے اسلام علیکم کہا۔ اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ سردار صاحب نے وعلیکم السلام کہہ کر میری حیرت میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ حیرت اور پریشانی کے عالم میں قطعی یہ خیال نہیں رہا کہ مجھے بھی سلام کرنا چاہیے۔ اور ماموں جان کے ڈانٹنے پر میں نے انہیں سلام کیا، تھوڑی دیر بعد جب ہم رخصت ہوئے تو میں نے پہلی بات یہی کہی "مگر یہ تو سکھ ہیں؟" ماموں جان بڑے زور سے ہنسے اور پھر بتایا کہ یہ وضع سے سکھ معلوم ہوتے ہیں۔ ورنہ یہ تو منشی عبدالقدیر ہیں۔ پھر ماموں جان نے میری توجہ منشی جی کے پٹھے بالوں کی طرف دلائی۔ جو گدی پر ایک ایک انچ باہر رہتے ہیں۔ اسی دن مجھے معلوم ہوا کہ یہ سردار صاحب نہ صرف مسلمان ہیں۔ بلکہ ان سے ہمارے خاندانی مراسم بھی بہت قدیم ہیں۔ میرے نانا منشی عزیز الرحمٰن مرحوم مؤلف "علم مجلسی" اور منشی جی کلاس فیلو تھے۔ اور ان دونوں میں اتنی دوستی تھی کہ نانا مرحوم کی والدہ منشی جی سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔

دس گیارہ سال تک منشی جی سے میرے تعلقات صرف اتنے رہے کہ جب وہ کہیں راستے میں مل جاتے تو میں مودبانہ سلام کرتا، وہ دعائیں دے دیتے اور بس۔ جب میں نے ادبی محفلوں میں شریک ہونا شروع کیا تو منشی جی سے ملاقات کے موقع ملنے لگے۔ اور تعلقات اتنے بڑھے کہ اب تو منشی جی میرے بزرگ اور دوست دونوں ہی ہیں۔

جامع مسجد کے چنڈو خانے کی تفصیل استاد رسا کے خاکے میں بیان کر چکا ہوں منشی جی اس چنڈو خانے کی ایک بزرگ اور قابل احترام ہستی ہیں۔ تمام رند بلا امتیاز مذہب و ملت، رنگ و نسل اس رند پارسا کا ادب کرتے ہیں۔ منشی جی انتہائی پابندی سے یہاں آتے ہیں۔ آندھی، مینہ اور طوفان اُن کا راستہ نہیں روک سکتے۔ بچاسی سال کے ہونے کے باوجود اُن کی دونوں آنکھیں بالکل ٹھیک تھیں لیکن ابھی کچھ دن ہوئے اُن کی ایک آنکھ کا آپریشن ہوا ہے، اس لئے رات کو سڑک پر چلنے میں دشواری ہوتی ہے۔ اس کی ترکیب انہوں نے یہ نکالی ہے کہ دن کی روشنی میں پیدل یہاں آتے ہیں اور رات کو ایک رکشہ والا انہیں گھر چھوڑ آتا ہے۔ اتنی پابندی سے یہاں آنے کی وجہ سے اُن کی ایک جگہ مقرر ہو گئی ہے۔ اُس کرسی پر کوئی بھی بیٹھا ہو۔ منشی جی کو دور سے دیکھتے ہی جگہ چھوڑ دیتا ہے۔ اور وہ بھی بغیر کسی رسمی گفتگو یا تکلف کے اپنی جگہ سنبھال لیتے ہیں۔ پہلے اپنی بید میز پر بڑی احتیاط سے رکھتے ہیں رجیسے تھوڑی ہی دیر میں سامنے بیٹھا ہوا شخص اٹھا کر

سجانا شروع کر دیتا ہے یا پگڑی اتار کر رکھتے ہیں۔ پھر جیبوں سے سامان نکالا جاتا ہے۔ بیڑی کا بنڈل، ماچس، دواؤں کے پیکٹ، رومال اور کچھ کاغذات، یہ سب سامان میز پر قرینے سے رکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد منشی جی گفتگو کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ گفتگو کے موضوع عام طور پر دو ہی ہوتے ہیں۔ ایک تو اردو زبان کے مسائل اور دوسرے نوجوانوں کی بے راہ روی۔

اردو کے لسانی مسائل پر گفتگو کا حق انہیں اس لئے پہنچتا ہے کہ وہ اردو کی لغت لکھ رہے ہیں۔ سات آٹھ سال کی لگاتار محنت کے بعد اب وہ "خ" تک پہنچ گئے ہیں۔ میر نے تو شاعرانہ تعلّی سے کام لیا تھا۔ لیکن منشی جی کو یقین کامل ہے کہ "مستند ہے میرا فرمایا ہوا"۔ اکثر الفاظ کے تلفظ پر بحث کرتے ہیں۔ اور بعض لفظوں کا تو ایسا ایسا عجیب تلفظ بتاتے ہیں کہ ہم تو کیا ہمارے بزرگوں نے بھی نہ سنا ہوگا۔ کہتے ہیں اصل زبان فارسی یا عربی میں یہی تلفظ ہے۔ اس معاملے میں منشی جی بہت سخت گیر ہیں۔ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو اگر ان کی زد میں آ گیا تو پکڑ لگائے بغیر نہیں مانتے۔ حالانکہ عام گفتگو میں منشی جی کا تلفظ بھی وہی ہوتا ہے، جو ہمارا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ میں نے آج تک کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو اردو ٹھیک بولتا ہو۔ ہر شخص کا تلفظ غلط ہوتا ہے۔ لیکن منشی جی آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس سوال کا وہ کوئی جواب نہیں دیتے۔ بلکہ ایک دم ٹال دیتے ہیں۔ زبان کے مسائل پر بحث ہو رہی تھی، ایک نوجوان نے کہا کہ اردو سنسکرت کے خاندان سے ہے۔ منشی جی ایسی غلط بات کب برداشت کر سکتے تھے! فوراً ناراض ہو کر بولے کہ لفظ اردو تک فارسی ہے، زبان کا تو خیر کیا سوال ہے۔ کسی نے کہا لفظ اردو تو ترکی ہے۔ اس پر منشی جی نے نئی نسل کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ جو طرح طرح کی اختراعیں کرتی ہے۔

منشی جی کسی کو اہلِ زبان بھی نہیں مانتے۔ اور اس میں خود کو بھی شامل کرتے ہیں۔ کہتے ہیں اردو زبان میں اگر پچاس ہزار الفاظ ہیں تو کوئی پانچ ہزار سے کام نکال رہا ہے اور کوئی پانچ سو سے۔ کوئی ایک شخص ایسا نہیں ہے جسے تمام الفاظ پر قدرت ہو، اور جسے اہلِ زبان کہا جا سکے۔ منشی جی جب بحث کرتے ہیں تو پوری طاقت سے چیختے ہیں گلے کی رگیں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اور جب وہ ایک دفعہ شروع ہو جائیں تو پھر دوسروں کو بولنے کا موقع نہیں مل سکتا۔ جب کبھی چنڈو خانے کا ماحول بے کیف ہوتا ہے، لوگوں کے پاس گفتگو کا موضوع نہیں ہوتا تو کوئی منچلا منشی جی کے سامنے کسی لفظ کا تلفظ غلط کر دیتا ہے۔ اور چنڈو خانے میں پھر زندگی آ جاتی ہے۔

نئی نسل سے منشی جی بہت ناراض ہیں۔ ان کے خیال میں اس نسل کے لوگ چور، بدمعاش، بے ایمان، جھوٹے اور نہ جانے کیا کیا ہوتے ہیں۔ دنیا بھر کی خوبیاں ان کے زمانے میں تھیں۔ اور دنیا بھر کے کیڑے اس زمانے میں پڑے ہیں۔ کچھ لوگوں نے منشی جی سے قرض لے کر واپس نہیں کیا۔ نئی نسل کی بے ایمانیوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ ان لوگوں کا نام ضرور لیتے ہیں۔ اور دو ڈھائی ہزار روپے کا حساب بتاتے ہیں۔ اس پر سب کو حیرت ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو روپیہ دیتے ہی کیوں ہیں۔ جو اپنی بدمعاملگی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں منشی جی جان بوجھ کر ایسے لوگوں کو روپیہ دیتے ہیں۔ تاکہ بعد میں ان کی شکایت کرتے پھریں۔ بعض کہتے ہیں کہ منشی جی عمر رسیدہ ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ منشی جی کو دوسروں کی تقریر اور تحریر میں غلطیاں نکالنے میں بہت مزا آتا ہے۔ چونکہ ان کا شمار دلی کے معزز شہریوں میں ہے۔ اس لئے اکثر سرکاری تقریبوں کے دعوت نامے آتے رہتے ہیں۔ جو اردو، ہندی یا انگریزی میں ہوتے ہیں۔ دعوت نامہ وصول ہوتے ہی منشی جی سب مصروفیات چھوڑ چھاڑ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور دو تین دن کی لگاتار محنت کے بعد غلطیوں کی فہرست مرتب کر کے دعوت دینے والوں کو بھیج دی جاتی ہے۔ اب اگر ان لوگوں نے اپنی غلطی تسلیم کر لی تو منشی جی تقریب میں جائیں گے۔ ورنہ نہیں جائیں گے۔ چونکہ دعوت دینے والے نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے اکثر بے شرم اپنی غلطیوں کا اعتراف بھی نہیں کرتے۔ بلکہ بعض تو بے غیرتی کی حد کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں غلطی ہو تو کوئی تسلیم بھی کرے۔ منشی جی آ بیل مجھے مار۔ نہیں مانتا تو کبھی مار پر بھی عمل کرتے ہیں۔ موقع بے موقع بڑھ جاتے ہیں وہ تو منشی جی ہیں۔ اگر کوئی ہم جیسا ہو تو سوا لاکھ کی حویلی میں پایا جائے۔ ایسے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ میں یہاں صرف ایک مثال دوں گا۔ راجندر پرشاد مرحوم جب صدر جمہوریہ ہند تھے تو منشی جی نے کوئی بہانہ نکال کر

انہیں خط لکھ مارا۔ کچھ دن میں جواب آیا۔ خط ہندی میں تھا۔ انہوں نے کسی سے پڑھوایا اور حسبِ عادت غلطیوں کی ایک طویل فہرست روانہ کر دی۔ اُن کو آج تک شکایت ہے کہ صدر جمہوریہ ہند نے غلطیوں کا اعتراف کرنا تو کجا، وصولیابی کی اطلاع تک نہیں دی۔ منشی جی اس قسم کے جو خط لکھتے ہیں اُن کی نقل اپنی جیب میں بھی رکھ لیتے ہیں۔ جس سے بھی ملاقات ہوتی ہے اُسے یہ خط ضرور پڑھواتے ہیں۔ اگر اس کا جواب آگیا تو پھر جوابی خط کے ساتھ بھی یہی عمل کیا جاتا ہے۔

منشی جی کے بدترین مخالفوں کو بھی اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ وہ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ اگر آپ اُن کا مزاج پوچھیں تو وہ جھوٹ بول کر یہ رسمی فقرہ نہیں دُہرائیں گے کہ خدا کا شکر ہے خیریت سے ہوں۔ بلکہ کہیں گے "ٹھیک ہے، نہ زیادہ اچھا نہ زیادہ بُرا۔" اگر کوئی جسمانی تکلیف ہوگی تو بیماری اور اُس کے علاج کی پوری تفصیل سُنائیں گے۔ چاہے اس میں کتنی ہی دیر لگے۔ اُن کی حق گوئی کا ایک قصہ سُن لیجئے۔ ایک دفعہ اسٹیٹسمین کے نامہ نگار نے اُن کا انٹرویو لیا۔ اُس نے آمدنی کے ذرائع پوچھے تو انہوں نے صاف صاف بتا دیا کہ میرے لڑکے پاکستان میں ہیں۔ وہ روپیہ بھیجتے ہیں۔ جب یہ بات اخبار میں چھپی تو حکومت کے کان کھڑے ہوئے۔ اُن سے پوچھ گچھ کی گئی۔ وہ لئے دئیے کے معصوم اور سادہ دل بزرگ! پوری تفصیل سنا دی۔ غیر ملکی زرِمبادلہ کیا مصیبت ہے؟ اس کے قوانین کیا ہیں؟ منشی جی کی بلا جانے۔ بدمعاشی، عیاری اور مکاری کا تو حکومت علاج کر سکتی ہے۔ لیکن معصومیت اور شرافت کا کیا کرے؟ اُن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو جیل میں پڑا حق گوئی اور صداقت کی داد پا رہا ہوتا۔ مگر منشی جی کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔

منشی جی کو اس بات پر فخر ہے کہ وہ کسی کے ملازم نہیں ہیں۔ وہ تمام ملازمت پیشہ لوگوں کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اور یہ تو برملا کہتے ہیں کہ میاں ہندوستان کے صدر ہوں یا وزیر اعظم۔ منشی عبدالقدیر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ تنخواہ دار ملازم ہیں اور میں آزاد۔ — اگر تمام ہندوستانی ملازمت ترک کر دیں تو حکومت کیسے چلے گی؟ اس کا منشی جی کے پاس صرف یہ جواب ہے کہ نوکری پھر نوکری ہے۔ آدمی اپنی نیند سو سکتا ہے نہ جاگ سکتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ خود انہوں نے نو دس سال تک نوکری کی ہے، اور ایسے ویسے کی نہیں، انگریز کی، اور وہ بھی فوج میں۔ ۱۹۰۱ء میں منشی جی فوج میں ملازم ہوئے تھے۔ اور ۱۹۱۰ء میں یہ ملازمت ترک کر دی۔ اس سلسلے میں وہ انگلینڈ اور فرانس کے علاوہ چند اور ممالک میں بھی رہے۔ بہرحال بقول منشی جی جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر رخصت ہو رہے تھے، تو ایک انگریز افسر نے ہمدردی سے پوچھا "آپ نوکری چھوڑ کر جا رہے ہیں، اب کیا کریں گے؟" انہوں نے جواب دیا "اب تک نوکر رہا ہوں، اب نوکر رکھوں گا۔" وہ دن اور آج کا دن انہوں نے کبھی کسی کی نوکری نہیں کی۔ منشی جی کے والد محمد الدین صاحب مرحوم بہترین خوش نویس تھے۔ اُن کے بھائی یوسف صاحب بھی اس فن کے ماہر ہیں (وہ آج کل پاکستان میں ہیں)۔ منشی جی نے بھی یہی پیشہ اپنا لیا۔ اور کچھ عرصے تک قطعے لکھ کر امراء و روساء کی خدمت میں پیش کرتے رہے۔ جب اس کام سے دل اچاٹ ہوا تو انہوں نے ایک پریس کھول لیا۔ اسی زمانے میں وہ کانگریس میں شریک ہوئے اور پریس کا تمام خفیہ کام اُن کے ذمہ ٹھہرا۔ جنگِ آزادی میں اُن کی جدوجہد کی کہانی بہت طویل ہے۔ مختصر یہ کہ انہیں بارہا جیل جانا پڑا۔ اور عمرِ عزیز کا اچھا خاصا حصہ تنگ و تاریک کوٹھریوں کی نذر ہو گیا۔ آخری بار اُن کی گرفتاری ۱۹۳۹ء میں ہوئی۔ الزام یہ تھا کہ کانگریس کے ایک مخالف مولوی مظہر الدین کے قتل میں اُن کا ہاتھ تھا۔ پانچ مہینے تک مقدمہ چلا اور منشی جی بری ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک آزاد ہوا تو وہ سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔ بغاوت منشی جی کا مسلک ہے۔ جب تک ہندوستان میں انگریز تھے، وہ انگریزی حکومت کے خلاف رہے، بلکہ جنگِ آزادی میں جان ہتھیلی پر لئے رہے۔ جب اُن کی محنت بارآور ہوئی اور انگریز ہندوستان سے چلے گئے تو منشی جی کانگریس کو ناپسند کرنے لگے۔ انہیں کانگریسی حکومت پر کیا اعتراضات ہیں؟ اس کا تو شاید انہیں خود بھی علم نہیں۔ لیکن بغیر کسی رُو رعایت یا لاگ لپیٹ کے وہ ڈنکے کی چوٹ کانگریس کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔

منشی جی چندریالہ ڈھاپے والا تحصیل وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ کم عمری میں اپنے والد کے ساتھ دہلی آ گئے

تھے۔ چونکہ یہاں رہتے رہتے انہیں پینسٹھ سال ہوگئے ہیں۔ اس لئے انہیں فخر ہے کہ وہ دہلوی ہیں۔ لیکن بعض لوگ کہتے ہیں منشی جی سو سال اور دہلی میں رہ لیں تب بھی دہلوی نہیں ہو سکتے۔ اور کہتے ہیں ثبوت کے طور پر دیکھ لو ان کی شلوار۔ یہاں تو ہمیں بھی قائل ہونا پڑتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہیں دہلی سے جو لگاؤ اور محبت ہے وہی اُن کے دہلوی ہونے کا ثبوت بھی ہے۔ اُن کے دو بھائی ضیاء الدین برنی اور محمد یوسف پاکستان میں ہیں۔ ان کے تین لڑکے علاؤالدین خالد، صلاح الدین احمد اور ظہیر الدین احمد پاکستان کے اچھے پبلشروں میں ہیں۔ اگر منشی جی اپنے لڑکوں کے ساتھ رہیں تو کس بات کی کمی ہے۔ لیکن انہیں اپنے بچوں سے زیادہ وطن پیارا ہے۔ کہتے ہیں جس ملک کو آزاد کرانے کے لئے میں جان پر کھیلا ہوں، اسے چھوڑ جاؤں؟ دہلی میں ایک بوسیدہ مکان میں تنہا رہنا گوارا ہے۔ لیکن وطن عزیز ترک کرنا اُن کے لئے ممکن نہیں۔ کچھ دن کے لئے بچوں سے ملنے ملانے جاتے ہیں اور پھر واپس آجاتے ہیں۔

منشی جی "حافظ" کی طرح صلح خواہ قسم کے آدمی ہیں۔ وہ اللہ اللہ اور رام رام دونوں کے قائل ہیں۔ سب لوگوں کی برابر عزت کرتے ہیں۔ کبھی کسی مذہب کو بُرا نہیں کہتے۔ اس معاملے میں اُن کا نقطۂ نظر قوم پرستوں کا نہیں بلکہ صوفیوں کا ہے۔ وہ سب کو الگ الگ سمجھتے ہیں۔ اور پھر بھی سب کی عزت کرتے ہیں۔ کسی سے لڑنا لڑانا اُن کے بس کی بات نہیں۔ اگر کسی کی بات ناگوار گزرتی ہے تو ایک دم خاموش ہو جاتے ہیں۔ اور تھوڑی دیر میں کسی دوسرے موضوع پر بات شروع کر دیتے ہیں۔ یہ گویا انتہائی ناراضگی کا اظہار ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص بد معاملگی سے کام لے یا منشی جی کوئی کام بتائیں اور وہ نہ کرے تو برسوں کے تعلقات ایک لمحے میں ختم کر دیتے ہیں۔ اور ایک دفعہ جس سے چھٹی تو بس چھٹی۔ پھر تجدید تعلقات کی کوئی صورت نہیں۔ منشی جی زندگی بھر کے لئے اس کا کھاتہ ہی بند کر دیتے ہیں اور جب تک تعلقات قائم رہیں، وہ دوستی کے تمام تقاضے پورے کرتے ہیں۔ اگر کسی دوست یا جاننے والے کا کوئی دعوت نامہ آئے تو ان کے باوضع اور بااخلاق ہونے کا یہ ثبوت ہے کہ وہ دعوت نامہ کو پولیس کا وارنٹ سمجھتے ہیں۔ کسی بھی حالت میں ہوں، کوئی بھی مصروفیت ہو، ممکن ہی نہیں کہ منشی جی رکشہ میں بیٹھ کر وہاں نہ پہنچیں۔ کھائیں گے پئیں گے کچھ نہیں، تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس آجائیں گے۔ اسی طرح اگر کوئی منشی جی کے گھر جائے تو اس کی خاطر تواضع میں کوئی کمی نہیں کرتے۔ چائے ضرور پلاتے ہیں۔ یہ چائے بھی خاصے کی چیز ہے۔ اس میں نمک، مرچ اور چائے کے علاوہ سارے مصالحے ہوتے ہیں۔ لونگ، کالی مرچ، دارچینی، بیدانہ، عناب، بنفشہ، آڑو، امرود، کیلا اور پتا نہیں کیا کیا اس میں ہوتا ہے۔ مہمان کے پہنچتے ہی منشی جی چائے بنانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اور اس دوران میں اس چائے کے فائدے بتاتے ہیں۔ اُن کا یاد رکھنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ جو شخص پہلی دفعہ گیا ہو وہ بڑے اشتیاق سے چائے کا انتظار کرتا ہے۔ اور چائے ملنے پر جب پہلا گھونٹ لیتا ہے تو چودہ طبق روشن ہوتے نظر آتے ہیں۔ لطف یہ کہ ایک طرف تلخیٔ کام و دہن کی اتنی کڑی آزمائش اور دوسری طرف اس کی تعریف کرنے کی مجبوری۔ پھر اُن کو شکایت ہے کہ لوگ مجھ سے ملنے نہیں آتے۔

منشی جی کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ عرصہ ہوا فلسطین پر ایک کتاب "بیت المقدس" لکھی تھی۔ جو اب بھی تمام کتاب فروشوں کے ہاں نظر آتی ہے۔ کشمیر پر ایک کتاب کشمیر جنت نظیر لکھی تھی۔ جو اب نایاب ہے۔ منشی جی عام طور پر مشاعروں کی صدارت کرتے ہیں۔ اور چونکہ ہر مشاعرے میں موجود ہوتے ہیں اس لئے صدارت کی پریشانی نہیں ہوتی۔ جس شخص کو صدر بنایا گیا ہے اگر وہ نہیں آیا یا اُسے آنے میں دیر ہوگئی تو پھر منشی جی تو موجود ہیں ہی۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اسی لئے تو وہ ہر مشاعرے اور ادبی جلسے میں پابندی کے ساتھ جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ سن لیجئے۔ انجمن تعمیر اردو نے پیروڈی ڈے منایا تھا جس میں بہت معقول قسم کے ادیبوں نے حصہ لیا۔ منشی جی صدارت کر رہے تھے۔ کسی نے انجمن کے سکریٹری سے کہا، آج تو پیروڈی ڈے ہے۔ کوئی ایسا شخص صدر ہونا چاہئے تھا جو طنز و مزاح کے میدان کا مرد ہوتا۔ گلزار دہلوی نے برجستہ کہا "حضرت آج ہم نے صاحب صدر کی پیروڈی پیش کی ہے۔" ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ جس میں ہمارے منشی جی کے قہقہے بھی شامل تھے۔ ایسے باوضع

لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں؟

آخر میں ایک خاص انجمن کا تفصیلی تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ یہ جامع مسجد پر آنے والے شاعروں کی انجمن ہے۔ چونکہ منشی جی کی ذات سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ اس لئے یہاں اس کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ یوں تو جامع مسجد آنے والا ہر شاعر اس انجمن کا رکن ہے لیکن بسمل سعیدی، گوپال متل، نریش کمار شاد، ممنور سعیدی، گلزار دہلوی، بہار برنی اور اسلم پرویز خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہری چند اختر مرحوم تو اس کے خاص الخاص ممبر تھے۔ مگر موت نے انہیں ہم سے چھین لیا۔ اگر کوئی شاعر کسی شخص پر فی البدیہہ اور برجستہ شعر کہہ دیتا ہے تو باقی تمام شاعروں پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ بھی اسی زمین میں اور اسی شخص پر کچھ شعر کہیں، اس طرح چالیس پچاس شعروں کا قصیدہ بن جاتا ہے۔ جس کے دو چار اشعار تو درج گزٹ ہو جاتے ہیں اور باقی ناگفتنی قرار پاتے ہیں۔ جو حیثیت سماج میں ہونہار، ذہین اور خوبصورت لیکن ناجائز بچوں کو ہوتی ہے وہی ان اشعار کی اردو ادب میں ہے۔ ان سے پیار سب کرتے ہیں۔ لیکن انہیں اپنا کوئی نہیں کہتا۔ بلکہ خالق بھی ان کی تخلیق سے انکار کرتا ہے۔ شاعر اپنا کہا ہوا قصیدہ خود بڑے فخر کے ساتھ ممدوح کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ لیکن یہ اشعار دشمن شکایت کے طور پر ممدوح کی خدمت میں پہنچاتے ہیں۔ پٹنا پٹانا کس کو اچھا لگتا ہے؟ اس لئے ان کے خالق کو جھوٹی قسمیں کھانی پڑتی ہیں کہ ان اشعار کی تخلیق سے اُن کا کوئی واسطہ نہیں۔ میں یہاں درج گزٹ قسم کے اشعار میں سے چند پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ہری چند اختر مرحوم نے اختر انصاری اکبر آبادی پر یہ شعر کہا تھا۔

اس تیرے تخلص میں کیا چیز ہے بنیادی
اختر ہے کہ انصاری، اکبر ہے کہ آبادی

مشاعرے میں ماتی جائسی ایک طویل غزل پڑھ رہے تھے۔ زمین تھی: "معدوم پہ رحم آتا ہے"۔ "مظلوم پہ رحم آتا ہے"۔ "مخدوم پہ رحم آتا ہے"۔ وغیرہ جب ماتی صاحب مقطع پر پہنچے تو اس انجمن کے ایک رکن نے فی البدیہہ مقطع کہا۔

سننے والوں پہ تجھے رحم نہ آیا ماتی
تو تو کہتا تھا کہ مظلوم پہ رحم آتا ہے

طرحی مشاعرہ ہو رہا ہے۔ زمین ہے، بس میں، قفس میں۔ ایک شاعر نے مصرع پڑھا۔

تیرے در سے ناکام جاتا ہوں لیکن

اس سے پہلے کہ وہ دوسرا مصرع پڑھے شعر مکمل کر دیا گیا۔

پھر آؤں گا واپس برس دو برس میں

جن لوگوں کے پورے نام آسانی سے وزن میں آجاتے ہیں ان کی بہت شامت رہتی ہے۔ دھرم پال گپتا اچھے خاصے سمجھدار پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ اچانک ایک صبح انکشاف ہوا کہ وہ شاعر ہو گئے ہیں۔ اور وفا تخلص رکھ لیا ہے۔ یہ خبر اس طرح دی گئی ؎

سنا تم نے کل رات کیا ہو گیا
دھرم پال گپتا، وفا ہو گیا

وفا صاحب ایک مشاعرے میں کچھ شاعروں پر ناراض ہو گئے۔ دوسرے دن صبح اطلاع دی گئی ؎

ہوئے رات سب شاعروں پر خفا
جناب دھرم پال گپتا وفا

مشاعرے میں گلزار دہلوی غزل پڑھ رہے ہیں۔ انہوں نے ایک مصرع پڑھا۔

وفا کا دہر میں نام و نشاں باقی نہ رہ جائے

اسٹیج پر کسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ گلزار نے مڑ کر دیکھا تو گوپال متل دھرم پال گپتا وفا کو دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ گلزار کا مطلب وہ نہیں تھا جو گوپال متل نکال رہے تھے۔ گلزار نے پھر مصرع دہرایا۔

وفا کا دہر میں نام و نشاں باقی نہ رہ جائے

اور گوپال متل نے شعر یوں کر دیا۔

وفا تو کیا وفا کا خانداں باقی نہ رہ جائے

ان مشاعروں کا مقصد کسی کی اہانت یا دل آزاری نہیں۔ محض ردیف اور قافیے کی مجبوری ہے۔ اس رسّی کے حلقے میں جس کی بھی گردن آ جائے۔ چنانچہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسی انجمن کے ممبر ایک دوسرے کے شکار ہو جاتے ہیں۔ گلزار کا ایک شعر ہے۔

اس قدر معیار سے ساقط ہوئی — زندگی گوپال متل ہو گئی

یہ لوگ اختراعیں بھی خوب کرتے ہیں۔ اقبال کی دو مختلف نظموں کے دو مصرعوں کو کس خوبی سے ملا کر شعر کہا ہے ؂

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

ایک مصرع اقبال اور ایک مصرع غالب کا ملا کر شعر بنایا گیا۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی — لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی

ہمارے منشی جی کا پورا نام آسانی سے وزن میں آ جاتا ہے۔ اس لئے اُن پر بھی لاتعداد اشعار کہے گئے ہیں۔ چونکہ اُن کی سب عزت کرتے ہیں اس لئے جتنے اشعار بھی ان پر کہے گئے سب "گفتنی" ہیں۔

یہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ چنڈو خانے میں منشی جی کی جگہ مقرر ہے۔ ایک دن اُن کی کرسی پر کوئی صاحب بیٹھے تھے۔ سامنے بیٹھے ہوئے ایک شاعر نے منشی جی کو آتا دیکھ کر اُن صاحب کو اطلاع دی۔

اک امیر صغیر آتے ہیں — کانگریسی سفیر آتے ہیں
چھوڑ دے اس جگہ کو ہو بیار — منشی عبدالقدیر آتے ہیں

ایک دن کچھ نوجوانوں نے منشی جی سے چائے کی فرمائش کی۔ منشی جی مان گئے۔ فوراً اُن کی شان میں شعر کہا گیا۔

منشی جی کی لغات کے آگے — وہ غیاث اللغات کچھ بھی نہیں

منشی جی ناراض ہو گئے۔ کہنے لگے۔ "تم خوشامد کر رہے ہو۔ اب نہیں پلاؤں گا"۔ بہت زور لگایا۔ منشی جی نہیں ملنے۔ چنانچہ فوراً دو شعروں کا اور اضافہ کیا گیا ؂

ہم یہ سمجھے تھے زعم میں اپنے — وہ سراج اللغات کچھ بھی نہیں
منشی جی کی لغات کے آگے — یہ غیاث اللغات کچھ بھی نہیں
پڑھ کے دیکھا تو یہ ہوا معلوم — منشی جی کی لغات کچھ بھی نہیں

ایک قطعہ اور سن لیجئے۔

پیر اور نہ فقیر ہیں ہم لوگ
اک پرانی لکیر ہیں ہم لوگ
منشی عبدالقدیر ہیں ہم لوگ
ہائے کتنے حقیر ہیں ہم لوگ

اس زمین میں بہت شعر کہے گئے تھے۔ ایک اور یاد ہے وہ بھی سن لیجئے ؂

(باقی ص۱۲۲ پر)

بقیہ عارف ہسوی (سلسلہ صہ ۲)

دلی پہنچتے ہی عارف صاحب کو نیاز صاحب نے علامہ راشد الخیری کے دفتر رسالہ عصمت کا منیجر مقرر کرا دیا تھا۔ علامہ راشد الخیری کبھی کبھی خود بھی عارف صاحب کے پاس آجاتے تھے۔ کہنا چاہئے کہ میرے اور علامہ راشد الخیری کے تعلق کی بنیاد عارف صاحب کی وجہ سے پڑی۔ علامہ راشد الخیری نہایت سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ انہوں نے عارف صاحب کو کیا، کسی ملازم کو کبھی ملازم نہیں سمجھا تھا۔ عارف صاحب سے اُن کا برتاؤ زمانہ ملازمت میں بھی دوستوں کا سا تھا۔ اور پھر تو وہ دونوں ایسے دوست ہوگئے کہ اس دوستی کی مثال دی جاتی تھی۔

میرے مخلصوں کے کئی گروپ رہے ہیں۔ پہلا گروپ مولانا احمد سعید، مسٹر آصف علی اور قاضی لطیف الحق حقی کا تھا۔ دوسرا گروپ مسٹر ضیاء الدین برنی بی۔ اے۔ مرزا یعقوب بیگ نامی ایم۔ اے (پروفیسر فلسفہ علی گڑھ کالج) اور مرزا نعیم اللہ بیگ بی اے۔ ال۔ ال۔ بی ڈپٹی کلکٹر کا۔ تیسرا خواجہ حسن نظامی، بھیا احسان الحق اور سردار دیوان سنگھ مفتون کا۔ چوتھا نیاز فتحپوری، حکیم حبیب الدین بقائی اور محمد ہلال الدین خلیقی کا۔ پانچواں علامہ راشد الخیری، عارف ہسوی اور خواجہ فضل احمد رشید کا۔ اس گروپ میں کبھی کبھی قاری عباس حسین بھی شرکت کرتے تھے۔ اور یہ گروپ (مجھ سمیت) ساڑھے چار دوستوں کا گروپ کہلاتا تھا۔ ایک گروپ کے آدمی دوسرے گروپ کے آدمیوں سے ملا جلا نہیں تھے لیکن عارف صاحب چونکہ میرے ہاں رہتے تھے اُن کا ملنا جلنا ہر گروپ کے ہر شخص سے تھا۔ وہ نیاز صاحب والے گروپ میں بھی شامل تھے۔ لیکن اُن کے جوہر صحیح پر علامہ راشد الخیری والے گروپ میں عیاں ہوئے۔ ویسے وہ میرے ہر گروپ میں موجود ہوتے تھے اور ہر گروپ کے احباب سے اخلاص رکھتے تھے۔ اولاد تھی نہیں، بیوی اور اماں وطن میں تھیں، اخلاص کا سارا خزانہ دوستوں پر خرچ کرتے تھے۔

عارف صاحب اخلاص مجسّم تھے۔ مجھے اللہ نے جو دوست دیا مخلص دیا لیکن عارف صاحب کے کیا کہنے ہیں، وہ انسانیت اور کردار کا بے حد اچھا نمونہ تھے۔ بقول نیاز صاحب "جب وہ کسی سے ملتے تھے تو اپنے پورے بطون کے ساتھ ملتے تھے اور دوستوں کے واسطے ہر قربانی پر تیار رہتے تھے۔

۱۹۰۹ء میں ماہنامہ نظام المشائخ نکالا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں میں نے دوسرا پرچہ ہفت نامہ خطیب جاری کیا۔ خطیب کی ترتیب میں مولانا ابوالکلام کے الہلال کی تقلید کی جاتی تھی۔ علمی، ادبی، مذہبی اور سیاسی ابواب مقرر تھے اور ان ابواب کو کامیاب بنانے میں مجھ سے زیادہ نیاز صاحب کا حصہ تھا۔ نیاز صاحب کے بعد میں نے خطیب کا کام عارف صاحب کے سپرد کیا۔ وہ بھی تمام قسم کے مضمون لکھ سکتے تھے اور لکھتے تھے، مگر غیر معمولی دلچسپی انہیں سیاست سے تھی۔ نیاز صاحب معتدل طبیعت اور معتدل پالیسی کے آدمی تھے۔ عارف صاحب نے جو قلم سنبھالا تو ابوالکلام سے آگے بڑھ گئے۔ میں نیز دوڑ سکتا تو مولانا ابوالکلام ہی کے ساتھ نہ دوڑتا۔ مولانا مجھے ساتھ لینے کے خواہاں تھے لیکن مجھ میں اُن کے ساتھ گھسنے کی ہمت نہیں تھی۔ خیر میں نے عارف صاحب سے ایک لفظ نہیں کہا۔ عرصہ دراز تک حرف کاٹ چھانٹ کرتا رہا۔ عارف صاحب ہمیشہ انتہا پر جاتے رہے اور میں اُن کی تحریروں کو کمزور بناتا رہا۔

اسی دوران میں میری بڑی بیٹی زاہدہ خاتون (اہلیہ قیسی رامپوری) کی ولادت ہوئی۔ عارف صاحب بے اولاد تھے۔ زاہدہ سے انہوں نے بالکل اپنی بیٹی جیسا معاملہ برتا۔ عارف صاحب کے لکھنے کا اسٹائل عین مین ابوالکلامی تھا، اُن کی انسانیت اور ابوالکلامی اسٹائل میں لکھنے کی قابلیت دل کو کھینچنے کے لئے کافی تھے، لیکن زاہدہ کے ساتھ کے برتاؤ نے بندھن کو اور مضبوط کر دیا۔ زاہدہ اُن کی گود سے نہیں اُترتی تھی اور انہیں بھی اُس کے بغیر چین نہیں ملتا تھا۔

غرض یوں ہی کئی سال گزر گئے اور میں نے عارف صاحب سے اُن کی انتہا پسندی کی بابت بات نہ کی تو آخر ایک روز وہی بولے کہ "آپ نے مجھے اپنے آرام کا خیال کر کے کام پر لگایا تھا، مگر میری انتہا پسندی آرام کی بجائے آپ کو تکلیف دے رہی ہے۔ اس کا بڑا دکھ ہے۔ لیکن کیا کروں، قلم روکے نہیں رکتا، ضمیر کے مطابق لکھنے پر مجبور ہوں۔ آپ کی کاٹ چھانٹ کا میں ہرگز بُرا نہیں مانتا۔ لکھنے کے بعد میں ہلکا ہو جاتا ہوں پھر پروا نہیں کرتا کہ کیا چھپا اور کیا نہیں چھپا۔ البتہ آپ جو ہر ہفتے کاٹ چھانٹ کی تکلیف اٹھاتے ہیں اُس سے شرمندہ اور محجوب ہوں۔"

مجھ پر اُن کے اس فقرے کا اچھا اثر ہوا کہ ضمیر کے خلاف لکھوں گا نہیں۔ میں نے کہا عارف صاحب! آپ کے چھوٹے بھائی ابراہیم حسن خواجہ حسن نظامی صاحب کے دفتر میں موجود ہیں، اُن سے ایک اور ہفتہ وار اخبار کا ڈکلریشن دلوا دیجئے۔ انقلاب اُس کا نام ہو اور اپنا نام اُس پر بحیثیت ایڈیٹر لکھوایئے اور دل کھول کر جو جی میں آئے لکھئے۔ میں انقلاب کی ضمانت کی رقم دے دوں گا اور انقلاب پریس الگ قائم کر دوں گا۔ حافظ عزیز حسن بقائی (کھی جین) جانے کے شائق ہیں وہ انقلاب پریس کے منتظم ہو جائیں گے [illegible]

اخبار انقلاب سے نہیں رکھوں گا۔ چنانچہ اپنے مکان سے میل سوا میل دور، چھتہ شیخ منگلو میں انقلاب کا پریس اور دفتر قائم کیا گیا اور بقائی صاحب وہاں جا بیٹھے۔ اور عارف صاحب نے سر پر کفن باندھ لیا۔

عارف صاحب مقرر اچھے نہیں تھے۔ بات چیت بھی واجبی سی کرتے تھے۔ پان سوتے جاگتے منہ میں رہتا تھا۔ اس نے زبان پر برا اثر کیا تھا۔ لیکن لکھتے خوب تھے۔ لکھنے میں زور تھا۔ تین مہینے میں انقلاب کے ساڑھے چار ہزار خریدار ہو گئے۔ پونے دو ہزار پنجاب میں، اور پونے دو ہزار باقی ہندوستان میں۔ ۱۹۱۹ء میں پنجاب سیاسی ہنگاموں کا مرکز تھا۔ انگریزوں کے دور حکومت کا بھیانک مارشل لا، جس میں جنرل ڈائر اور لفٹنٹ گورنر اوڈوائر نے عجیب عجیب ظلم ڈھائے تھے پنجاب ہی میں لگایا گیا تھا۔ وہی مارشل لا عارف صاحب کے اخبار انقلاب کو کھا گیا۔ پنجاب گورنمنٹ نے انقلاب کا داخلہ بند کر دیا اور انقلاب کی اشاعت یکا یک آدھی رہ گئی۔ ادھر ایک دن میرے ہم محلہ اور خیر خواہ بابو عبدالقیوم آئے۔ بابو صاحب ڈپٹی کمشنر دہلی کے اردو دفتر کے میر منشی تھے۔ انہوں نے کہا کہ انقلاب کی دو ہزار روپے ضمانت ہفتے عشرے میں ضبط ہونے والی ہے۔ آپ اسے فوراً واپس لے لیجئے۔ میں نے عارف صاحب سے ذکر کیا وہ بادل ناخواستہ انقلاب بند کرنے پر راضی ہو گئے اور ان کے بھائی ابراہیم حسن پبلشر انقلاب نے دو ہزار روپے واپس لے کر مجھے دیدیئے اور انقلاب بند ہو گیا۔

تین مہینے میں عارف صاحب کا ڈنکہ بج چکا تھا خصوصاً دلی کے تمام سیاسی لیڈر انہیں جان گئے تھے۔ لالہ شنکر لال نے جو بعد میں انشورنس والے شنکر لال کہلائے ہفتہ وار اخبار کانگریس کا عارف صاحب کو ایڈیٹر بنا دیا۔ اخبار کانگریس بند ہوا تو دوسرا اخبار، اور دوسرا اخبار بند ہوا تو تیسرا اخبار، المختصر آج اس اخبار میں اور کل اس اخبار میں نیز آج اس جیل میں اور کل اس جیل میں عارف صاحب براجتے رہے۔ جیلوں میں اے اور بی کلاسوں نے ابھی رواج نہیں پایا تھا۔ سیاسی قیدی اور اخلاقی قیدی یکساں تھے۔ عارف صاحب نے جو بخت جھٹکے کے میرا منش انسان تھے رسیاں بٹیں، چکیاں پیسیں اور گندی اور تاریک کوٹھریوں میں راتیں بسر کیں۔ پھر آہستہ آہستہ وہ دن آئے کہ بعض جیلوں کو سیاسی قیدیوں کے لئے مختص کر دیا گیا، اور سیاسی قیدی گھروں جیسی آسائش سے جیلوں میں رہنے لگے۔ آگرے کا جیل بھی سیاسی قیدیوں کے لئے مختص تھا۔ عارف صاحب نے آگرہ جیل سے مجھے لکھا کہ زاہدہ کے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ میں اور قاری عباس حسین زاہدہ کو لے کر آگرہ جیل پہنچے۔ آگرہ جیل میں کئی سو سیاسی قیدیوں کا مجمع تھا۔ پڑھے لکھے اور ایک خیال اور ایک دھن کے لوگوں کا ایسا اجتماع اور مستقل اجتماع اور کہیں نہ ہوتا ہوگا۔ بارکوں کی قطاریں تھیں۔ ہر بارک میں بتیس بتیس سیاسی قیدی رہتے تھے اور دو اخلاقی قیدی ان کی خدمت اور بارک کی جھاڑ پونچھ کرتے تھے اور شاید کھانا بھی پکاتے تھے۔ یہ وہی جیل تھا۔ جہاں پنڈت موتی لال نہرو کو بھیجا گیا اور سب ان کا خیر مقدم کر چکے تو ہندوؤں نے کہا کہ بھئی اب پنڈت جی کے بھوجن کی تیاری کرو، تو اس پر پنڈت جی نے کہا تھا کہ میں بھوجن نہیں کروں گا، کھانا کھاؤں گا۔ تصدق! کھانا لاؤ۔ تصدق سے مراد تصدق احمد خاں شروانی ہیں۔

خیر تو عارف صاحب پان دان آگے رکھے پلنگ پر براجمان تھے۔ زاہدہ کی عمر کھلونے کھیلنے کی تھی۔ عارف صاحب کے ساتھیوں نے سنا کہ عارف صاحب کی منہ بولی بیٹی آئی ہے تو چار پانچ گھنٹے کے اندر اندر اتنے کھلونے اور اتنے پھل منگا کر اس کے آگے ڈال دیئے کہ ان کا دلی لانا خاصا بوجھ ہو گیا۔

عارف صاحب اپنے اخلاص اور اپنی بردباری، کم گوئی اور بے لوثی کے باعث سیاسی قیدیوں میں دوسرے مفتی کفایت اللہ مانے جاتے تھے۔ مفتی صاحب بھی نہایت مخلص بردبار، کم گو اور بے لوث بزرگ تھے۔ عارف صاحب کو مفتی صاحب جتنی بھی پیسے کی احتیاج نہیں تھی۔ اکیلے تھے۔ جیل میں رہے تو گورنمنٹ نے خرچ اٹھایا۔ باہر رہے لکھ لکھا کر اتنا کما لیا کہ کپڑے صاف ستھرے اور ٹھیک سلے ہوئے پہن سکیں۔ بے لوثی اور بے نیازی خالی نہیں جاتی۔ تول تول کر سوچنے اور تول تول کر بولنے کی عادت تھی۔ بہت جلد آل انڈیا لیڈروں میں شمار ہونے لگا۔ دلی پراونشل کانگریس کمیٹی کے صدر منتخب کر لئے گئے۔

نہرو رپورٹ نے رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کو کانگریس سے متنفر کر دیا تھا اور مسلمانوں کی اکثریت کانگریس کی ہم نوا نہیں رہی تھی۔ مگر عارف صاحب نے کانگریس سے قطع تعلق نہیں کیا تھا۔ وہ مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر انصاری کے معتقد تھے۔ تادم آخر کانگریس کے ساتھ رہے۔ لیکن اس کے باوجود مولانا محمد علی نے عارف صاحب کی نیت کے خلوص کا ہمیشہ اقرار فرمایا۔ مولانا محمد علی عارف صاحب کی رائے کو غلط کہتے تھے۔ نیت کو خراب نہیں کہتے تھے۔

مولانا محمد علی کے کانگریس سے الگ ہو جانے کے بعد جو مسلمان لیڈر کانگریس میں شامل رہے مسلمانوں کی نظر میں وہ گر گئے تھے اور ہندوؤں میں ان کی عزت بڑھ گئی تھی۔ ہندو نوجوان مرد و عورت عارف صاحب سے چچا اور ماموں کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ لیکن مسلمانوں میں عارف صاحب کا اثر مطلق نہیں رہا تھا اور عارف صاحب اس سے واقف تھے۔ عارف صاحب کا انتقال کینسر کے مرض میں ہوا تھا۔ تردبلاغ دلی کے مشہور و معروف سرجن ڈاکٹر جوشی نے اپنے عظیم الشان پرائیویٹ ہسپتال میں ان کا آپریشن کیا اور

بہترین کمرے میں انہیں ہفتوں رکھا۔ میں کبھی تنہا اور کبھی مسٹر آصف کے ہمراہ عیادت کرنے جاتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ عارف صاحب نے کہا مسلمان مجھے شاید مسلمان نہیں سمجھتے، بہرحال میں آپ کو گواہ بناتا ہوں اور آپ کے سامنے کلمہ پڑھتا ہوں۔ میرے عقاید اور میری اسلام سے وابستگی میں ذرہ بھر فرق نہیں پڑا ہے۔ پھر ایک دن عارف صاحب نے مجھے اپنی کچھ مناجاتیں دیں، جو بیماری کے زمانے میں لکھی تھیں۔

۱۹۳۱ء میں وہ کمرہ جس میں عارف صاحب میرے ہاں رہتے تھے کسی ضرورت سے مجھے خالی کرانا پڑ گیا تھا۔ ۱۹۳۱ء سے عارف صاحب منشی عبدالمجید خاں، ایڈیٹر ماہنامہ مولوی کے ہاں رہنے لگے تھے۔ آخری دفعہ میں جو تنہی ہسپتال گیا تو عارف صاحب نے کہا، میری خواہش ہے کہ اس کمرے میں مروں جس میں پہلے روز آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ یوں ۱۹۳۶ء میں عارف صاحب دوبارہ میرے ہاں آ گئے، اور میں نے مکان کی زیریں منزل اُن کے حوالے کر دی۔ مسز اور نا آصف علی نے ضروریات کا سامان مہیا کیا اور رسالہ دیش بند ہو گیا، ایڈیٹر تیج نے علاج اور دیکھ بھال کی ذمہ داری لے لی۔ عارف صاحب کی والدہ اور بیگم اور دو تین مرد عزیز بھوپال سے پہنچ گئے تھے۔ بھائی دلّی میں تھے ہی۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ قیام رہا ہوگا کہ موت کا فرشتہ آ پہنچا۔

اس مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے اندر بھی کسی سیاسی تقریب کے سلسلے میں عارف صاحب نے اہلِ ملک کے نام پیغام دیا تھا وہ گویا مرتے وقت کا پیغام تھا۔ (DYING DECLARATION) اُس میں بھی عارف صاحب اپنے مسلک سے نہیں ہٹے تھے۔ عارف صاحب انگریزوں کو ملک بدر کرنے کے علم بردار تھے۔ یہ علم انہوں نے مرتے مرتے بلند رکھا۔

عارف صاحب میرے ہم عمر تھے۔ میں اب تک جی رہا ہوں، تو وہ کیوں نہ جی سکتے تھے، لیکن جیتے رہتے تو ہندو مسلم اتحاد کی بربادی سے اُن کا کیا حال ہوتا۔ اُن کے سامنے اتحاد کی دیوار میں دراڑ پڑ گئی تھی، لیکن خیال تھا کہ جلد بھر لی جائے گی۔ اب تو دیوار ڈھے چکی ہے۔

عارف صاحب میں اور مولانا ابوالکلام میں خاصی مشابہت تھی۔ نیاز صاحب اُن کے ادبی ذوق کے معترف ہیں، اور میں نے اُن کا سیاسی ذوق آنکھوں سے دیکھا ہے۔ نیاز صاحب لکھتے ہیں: "عارف صاحب کا ادبی ذوق نہایت پاکیزہ تھا۔ فارسی اور اُردو کے اشعار خوب سمجھتے تھے اور نقد و تبصرہ کی ماہرانہ قابلیت اُن میں تھی۔ مرحوم کی زندگی دلّی میں ادبی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے کامیاب گزری۔ دلّی کو مرحوم نے اپنا وطن بنا لیا تھا، اور دلّی کی ہر ہر ادا پر وہ جان دیتے تھے۔ ایک طرف انہوں نے احباب کی رنگین صحبتوں کا لطف اٹھایا، دوسری طرف سیاست کی بے آب و رنگ وادی طے کی۔ میں اُن صحبتوں کو کبھی نہیں بھولوں گا۔ جب دہلی کے کھنڈروں میں ہم سب جمع ہوتے تھے اور تھوڑی دیر کے لئے تمام کدورات زمانہ سے الگ ہو کر ملکوتی (گو ایک حد تک غیر معصوم) دنیا میں پہنچ جاتے تھے۔"

بقیہ ادبی مشاغل (سلسلہ صـ ۶۲)

یہ رویہ غیر ادبی تھا۔ نقادوں یا ادیبوں کا یہ منصب نہیں کہ شاعری یا ادب کو تنظیموں کے زور سے چلائیں۔ شاعری اور ادب تو آزاد ضمیر کی آواز ہوتی ہے۔ جونہی جتھے بندی سے شاعری کرانے کی مہم کا آغاز ہوا، شاعری یا ادب کی آزادی ختم ہوئی۔

میں کسی تحریک کے خلاف نہیں لکھ رہا ہوں، صرف حقیقی ادب پر زور دے رہا ہوں۔ سچا ادب نفرت نہیں پیدا کرتا، محبت پیدا کرتا ہے۔ سچا ادب منفی مقاصد کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ مثبت مقاصد اس کے مدنظر ہوتے ہیں۔ سچا ادب پروپیگنڈا نہیں بن سکتا۔ احساس کی بے ساختہ آواز ہوتی ہے۔ سچا ادب محدود مقاصد کے لئے ظہور میں نہیں آتا، اس کا کینوس وسیع ہوتا ہے۔ سچا ادب انسانی شرافتوں کو ابھارتا ہے، جو ہزارہا برس کے تمدنی تجربوں کا نچوڑ ہے۔ رزالتوں کی ترجمانی عکاسی اور وکالت نہیں کرتا۔ ۱۹۳۶ء کے بعد کی تحریکوں [illegible] تھے۔ مثلاً ادب کے ساتھ زندگی کا رشتہ، ادب کا عمل اور جدوجہد کا علم بردار ہونا، اور ادب کے ذریعے عقلی رویّے کے لئے ذہنوں کو تیار کرنا، لیکن رفتہ رفتہ یہ بے کمزور ہوتی گئی۔

یہ عقیدہ آج بھی قابلِ قبول اور قابلِ عمل ہے۔ مجہول دانشوری سے ہزار درجے بہتر ہے۔ پھر بھی پاکستانی ادب کو اپنی روش خود متعین کرنی ہوگی۔ اس کو اپنے علم الکلام اور اپنے خاص تنقیدی نظام کی ضرورت ہے، جو نہ ترقی پسند ہو اور نہ جمہوریت پسند۔ پاکستانی ادب کا اپنا ایک مسلک ہو سکتا ہے اور یہ مسلک آزاد ہوگا۔ اس میں استفادے کی بھی اہمیت ہے مگر اس پر نقش اپنا قائم ہوگا۔ پاکستانی ادب بے ساختہ طور پر ملک کے تہذیبی مزاج کا احترام کریگا، اور اس ملک کے مقامی احوال کے حوالے سے اپنے احساس کو ایسی وسیع شکل میں پیش کرے گا کہ اس کی مقامیت، آفاقیت میں تبدیل ہو جائے۔ یہ زمینی مسئلوں پر بھی نظر ڈالے گا، مگر زمینی اقدار میں جکڑ کر نہ رہ جائیگا۔ یہ سمجھا جا سکے گا کہ آسمانی قدروں سے مراد بے عملی اور محض تخیل نہیں بلکہ اس سے یہ مراد ہوگی کہ انسانی جدوجہد میں خدا کے وجود کی شرکت کا عقیدہ ضروری ہے اور جو ادب، خدا کے عقیدے سے منحرف کرے اور انسان کے اس جذبے سے [illegible]

ڈاکٹر معزالدین

نذرالاسلام کی شاعری

نذرالاسلام اس دور کا ایک عظیم شاعر ہے۔ نذرالاسلام بہت بڑا موسیقی داں ہے۔ نذرالاسلام ایک بڑا فنکار ہے۔ نذرالاسلام ایک انقلاب پسند شاعر ہے۔ اور سب سے بڑھ کر وہ ایک بڑا انسان ہے، وہ انسان جس نے انسان کی عظمت گم گشتہ کو واپس لانے کے لئے اپنے فن کو وقف کر دیا ہو۔ جس شخص کے بارے میں بیک وقت اتنی ساری باتیں کہی جائیں اور وہ تمامتر درست ہوں تو بلاشبہ وہ ایک عظیم شخصیت کا حامل ہے۔ اس کی ہر دلعزیزی اور اس کی شہرت اس کی اس عظمت کی شاہد ہے۔ آئیے چند لمحے ہم اس کی یاد میں گذاریں اور دیکھیں کہ اس بلند مرتبت ہستی نے اپنے کشت فن کو، جو اس کے خون جگر کی نمود ہے، خیالات کے کس سرچشمے سے سیراب کیا ہے۔ ہمارے خوابیدہ ذہن کو کس نوائے آتشیں سے جگایا ہے اور بے چین دلوں کو کس لحن خواب آگیں سے سکون بخشا ہے اور ساکت و جامد روح کو کس طرح بیقرار و مضطرب کر دیا ہے۔

نذرالاسلام کے ساتھ قدرت نے فیاضی بھی کی اور ستم ظریفی بھی۔ دھن دولت سے محروم رکھا پر ایک روشن دماغ عطا کیا، لیکن اس سے بہت جلد وہ دماغ جو انقلاب بداماں شاعری کا کوہ آتش فشاں تھا، چھین لیا۔

نذرل ایک فطری شاعر ہے۔ وہ ایک بیقرار اور حساس دل لیکر پیدا ہوا۔ اس کی سیماب وش طبیعت نے بچپن سے پہلے سے بیقرار کر رکھا تھا۔ آغوش قدرت میں اس کی تربیت ہوئی اور رفطرت نے اسے غربت کے گہوارے میں پروان چڑھایا۔ جنگ کی ہولناکیوں کا تماشا اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا چنانچہ فطرت کا حسن، افلاس کی تلخی اور دنیا کی ہوسناکی نے اسے ایک شاعر حقیقت بیان کا روپ بخشا۔ آزادی کی لگن اور ظلم سے نفرت اس کی شاعری کا بنیادی تصور ہے۔

زمانے کی رسم کے مطابق اس نے عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ مگر اس کی آزاد اور سیلانی طبیعت مدرسے کی پابندیاں کو برداشت نہ کر سکی اور اس نے تعلیمی سلسلہ ختم کر دیا۔ جنگ عظیم کی تباہ کاریاں، اور ہوسناکیاں اپنے شباب پر تھیں۔ وہ ایک سپاہی کی حیثیت سے بحال ہو کر میدان جنگ میں گیا۔ یہاں اس نے انسانی زندگی کا جو حال دیکھا تو اس کی حساس طبیعت اور بیقرار ہو گئی۔ اس کے جذبات متلاطم ہو گئے۔ اور دریائے تخیل بحر بیکراں ہو کر موجیں مارنے لگا۔ جذبات نے شاعری کا پیکر اختیار کر لیا اور وہ سفاکی اور درندگی کے خلاف نبرد آزما ہوا۔ ایک سپاہی کے جذبات جب شاعری کا جامہ پہن لیتے ہیں تو "طاؤس و رباب" اور "شمشیر و سناں" دونوں ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔ نذرل کی شاعری میں رعد و برق کی گرج اور تڑپ بھی ہے اور موسیقی کی دلنواز کشش بھی۔ مسلمان کی گرم گفتاری، کسان کی سادگی، سپاہی کا عزم اور مزدور کی تلخ نوائی کا حسین امتزاج اس کی شاعری میں ہمیں نمایاں طور پر ملتا ہے۔

اس کی نظم "ودروہی" یعنی باغی جب کلکتے کے ایک رسالہ "مسلم بھارت" میں چھپی تو اس کے تیز و تند لہجے نے پڑھنے والوں کو چونکا دیا۔ بنگلہ ادب میں یہ ایک نئی آواز کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے سرفروشانہ مجاہدانہ بلکہ باغیانہ تیور نے نذرل کو "ودروہی شاعر" مشہور کر دیا۔

جسے باغی کے مقابلے میں انقلابی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس وقت اقلیم ادب میں ٹیگور کا سکہ چل رہا تھا۔ ٹیگور کی خواب آگیں اور پُرسکون شاعری کے مقابلے میں نذرل کی آتش نوائی نے بہت جلد نوجوان دلوں کو گرمانا شروع کر دیا۔ آسمانِ شاعری پر وہ ایک تابناک ستارے کی طرح چمکا اور اپنی آب و تاب سے بہت جلد لوگوں کو متوجہ کر لیا۔ خود ٹیگور نے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور اپنی ایک تصنیف کو نذرل کے نام انتساب کر کے اسے خراجِ تحسین دیا۔

نذرل کی شاعری کے تین نمایاں ادوار ہیں۔ لیکن اس کی شاعری کا زرّیں دور جنگ عظیم اور جنگ عالمگیر کے درمیان محیط ہے۔ اس کی بہترین تخلیقات اسی دور کی پیداوار ہیں۔ ابتدائی دور پر اسلامی اثر غالب ہے۔ اور یہ اس وقت کی خلافت تحریک کا اثر تھا۔ "انور پاشا" اور "مصطفےٰ کمال" اسی زمانے کی نظمیں ہیں۔ زورِ بیان اور حسنِ ادا اس وقت کی شاعری کی نمایاں خصوصیتیں ہیں۔

دوسرا دور نسبتاً اہم بھی ہے اور طویل بھی۔ یہ دور دراصل "ودروہی (باغی)" کی اشاعت سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں جوش بھی ہے اور انقلاب کا جذبہ بھی، سرفروشی کا انداز بھی ہے اور مجاہدانہ شان بھی۔ للکار بھی ہے اور جھنکار بھی۔ موسیقی کی دلنوازی بھی ہے اور دار و رسن سے کھیلنے کا شوق بھی۔ آیئے "باغی" کے چند اشعار آپ کو بھی سنائیں۔

کہہ دے! اے جواں مرد کہہ دے کہ میں سربلند ہوں،

اتنا سربلند، اتنا سربلند، کہ ہمالیہ کی چوٹی بھی میرے آگے سرنگوں ہے۔

کہہ دے! اے بہادر کہہ دے کہ اس وسیع آسمان کو چیر کر، چاند سورج اور ستاروں کو توڑ کر جنت و دوزخ کو ہلا کر اور عرش کو ٹھکرا کر میں اس دنیا کے لئے مجسمۂ حیرت بن گیا ہوں

کہہ دے! اے جواں مرد، کہہ دے کہ میرا سر ہمیشہ بلند رہے گا۔

میں سرکش، سنگدل اور آتش زبان ہوں۔ میں قیامت کا ندیم ہوں۔ طوفان ہوں۔ تباہی ہوں، دہشت ہوں میں دنیا کے لئے سراپا ہلاکت ہوں!

تیسرا دور وہ ہے جب اس کی بے چین روح کو وہ روشنی مل گئی جس کی اسے تلاش تھی۔ زندگی کی حقیقت اس پر منکشف ہو گئی۔ اس کی بیقرار آتما کو سکون مل گیا۔ اس وقت وہ "نعرۂ انقلاب" میں کہتا ہے کہ "ساری دنیا کے انسان سن لیں کہ ہم سب ایک ہی کارواں کے مسافر ہیں" اپنی نظم "طوفان آگیا" میں وہ زندگی کا راز پالینے کے بعد جس طرح اقبال نے کہا تھا کہ "اگر خواہی حیات اندر خطر زی" اسی طرح وہ یوں آتش بیاں ہے کہ "اگر زندوں کی طرح جینا ہے تو سر کے اوپر طوفان کا سایہ رہنے دے اور قدموں کے نیچے دریائے موت بہنے دے۔ اونادان! زندگی پھولوں کا ہار ہے۔ موت کے گلے میں ڈالنے کے لئے"! اس کی شاعری میں ایک ایسی آگ ہے جس کی حرارت پر پڑھنے والا محسوس کرتا ہے۔ خلوص، صداقت، جانبازی اور سرفروشی کا انداز دامنِ دل کو کھینچتا ہے۔

نذرل کو عام طور سے بنگلہ ادب کا باغی شاعر کہا جاتا ہے، مگر میرے خیال میں وہ باغی سے زیادہ حقیقت پسند شاعر ہے۔ "چیر استندر" (ETERNAL BEAUTY) یعنی ابدی حُسن کی تلاش نے اسے انسانی سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ جہاں اس نے زندگی کو آئینہ وار دیکھا ہے، جہاں اس نے زندگی کو قریب سے بے نقاب دیکھا ہے۔ جہاں انسانیت سوز مظالم ہیں اور جہاں انصاف کا گلا گھونٹا جاتا ہے جہاں خود غرضی اور ریاکاری کا جال بچھا ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "اس جہان جیل میں فریب و معاصی کے سوا رکھا ہی کیا ہے" وہ اس عدم مساوات اور ظلم و تعدی کے طلسم کو توڑ کر انسان کو بہ حیثیت انسان دیکھنا چاہتا ہے اور یہی اس کی شاعری کی روح ہے، یہی اس کا پیغام۔ وہ صاف لفظوں میں کہہ اٹھتا ہے کہ "ہماری تمنا صرف یہ ہے کہ جو لوگ خلق خدا کو بھوکوں تڑپا رہے ہیں میری خونچکاں نظمیں ان کے لئے پیامِ موت ثابت ہوں!"

یوں تو ادب کا کون سا شعبہ ہے جو اس کا منت پذیر نہیں۔ نظم، نثر، ڈرامے، افسانے سب ملا کر تصانیف کی تعداد پچاس سے کم نہیں، لیکن شاعری اور موسیقی اس کے فکر کی اصل جولانگاہ ہے۔ اس نے اپنی شاعری کے زور و شور سے جہاں اضطراب و انقلاب کی لہر دوڑا دی، وہاں فارسی الفاظ کے ترنم اور موسیقی سے اس نے بنگلہ زبان کے حسن کو سنوارا اور نکھارا ہے۔ اس زبان کی شاعری کو اسلامی روایات سے قریب تر کر دیا۔ ٹیگور نے امن و عافیت کا جو حصار قائم کیا تھا، نذرل کی طوفان خیز شاعری نے اسے پُر شور بنا دیا۔

نئے دور کا آغاز صرف سیاسی تحریک ہی سے نہیں ہوا، بلکہ آرٹ اور ادب کی دنیا میں بھی ایک تغیر رونما ہوا جس کا پیشرو اور بہت بڑا علم بردار ہمارا انقلاب پسند شاعر نذرالاسلام ہے۔

حُسن اتفاق دیکھئے کہ پاکستان کی دو سرکاری زبانوں کے نمائندہ شاعر یعنی اقبالؔ اور نذرلؔ میں بڑی حد تک ذہنی مماثلت ہے۔ دونوں اپنی شاعری سے قوم کے جمود و سکون کو توڑ کر اسے ترقی کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتے ہیں۔ اقبالؔ جب "نگاہ مسلماں کو تلوار" کر دینے کی دعا مانگتا ہے یا نوجوانوں سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ ؎ "خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے، کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں"۔ تو نذرلؔ یہ پکار اٹھتا ہے کہ "شب بیدار نشاں بردار پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ کاروانِ شباب کے سو رہنماؤ! خواب سے جاگو، آنکھیں مل ڈالو۔ جاگو، جاگو کہ طوفان دروازے کی زنجیر ہلا رہا ہے"۔

خودی، فقر اور اسلامی ہیرو دونوں کے پسندیدہ موضوعات ہیں اقبالؔ کے "شکوہ" کے طرز کی نظم فریاد نذرلؔ نے بھی لکھی۔ حضرت عمرؓ، خالدؓ، اتاترک، زاغلول، امان اللہ وغیرہ پر نذرلؔ کی نظمیں بنگلہ ادب کا شاہکار سمجھی جاتی ہیں۔

قرآن حکیم اور رسول اکرم کے دونوں شیدائی ہیں۔ قرآن کے پارۂ عم کا اس نے منظوم ترجمہ بھی کیا ہے اور نعت رسول پر اس کی معرکتہ الآرا نظم ہے۔ اقبالؔ اور نذرلؔ کا مطالعہ پاکستان کے دونوں بازوؤں میں فکری ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے نہایت مفید ہوگا۔

افسوس کہ اس شاعر انقلاب پر عرصۂ دراز سے بے حسی اور خاموشی طاری ہے۔ خدا اسے اس کرب و اذیت سے نجات دے!

اب میں اس مضمون کو نذرل ہی کے پُر امید اشعار پر ختم کرتا ہوں جہاں وہ کہتا ہے کہ "ایک نئی دنیا نئے ارمانوں اور نئے مقصدوں کے ساتھ راہ حیات پر گامزن ہو رہی ہے جسے دیکھ کر خدا مسکراتا ہے اور شیطان خوف سے لرزتا ہے"۔

بقیہ:- جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی (سلسلہ ص ۴۹)

بھائی صاحب مذہب کچا دھاگہ تو نہیں ہوتا کہ کسی دوسرے مذہب کے عبادت خانے میں جانے یا وہاں کھانے پینے سے ٹوٹ جائے۔ میں خود اپنے مسلمان دوستوں کے ہاں کھاتا پیتا ہوں۔ میں نے تو اپنا مذہب نہیں تبدیل کیا۔

گھر اور مسجد میں بہت فرق ہے۔ تایا جی نے جواب دیا ہماری باتیں سُن کر مسجد کا مؤذن اپنا چہرہ کھول کر باہر آ گیا۔ پھر اس کی رہنمائی میں ہم سب ایک پنڈت کے گھر پہنچے۔ جہاں والد جی اور تایا جی نے پانی پیا۔ اور صراحی بھر لی۔

اور اب پینتیس (۳۵) برس بعد پھر میرا دوست میرے مسلمان ہونے کی پیشین گوئی کر رہا ہے۔ اس بار میں روضہ پر جا کر چلتے پِی آیا ہوں۔ پتہ نہیں ہم اتنے تنگ دل اور تنگ نظر کیوں ہیں؟ ہمیں یہ یاد ہی نہیں رہتا کہ ہم انسان ہیں۔ یہ دیکھتے ہیں کہ ہندو ہیں یا مسلمان، پاکستانی ہیں یا ہندوستانی، عورت ہے یا مرد۔ وہ چاہتی ہے کہ میں عورت یا وہ مرد ہو جائے۔ بیگی یہ نہیں جانتی کہ اگر ہمارے درمیان سے جنس کی دیوار گر بھی جائے تو ملک اور مذہب کی اونچی دیواریں موجود ہیں۔ اور پھر وہ خود بڑی کٹر مسلمان ہے اور ٹھیٹ لکھنوی۔ اور مجھے پنجابی ہونے پر فخر ہے، یہ چوتھی خلیج ہے۔

فرحت انوار

جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی

صبح خیزی کا میں قائل تو ہوں مگر عادی نہیں. آج برسہا برس کے بعد اُس کی بدولت صبح تڑکے میں اُس کے ساتھ پنجاب کے سرسبز اور شاداب قصبے میں باہر نکلا. اسٹیشن سے باہر آکر ہم نے منزل پر پہنچنے کے لئے تانگہ لیا. قصبے کے بازار میں ابھی چہل پہل نہیں شروع ہوئی. حلوائی اور چائے خانے والے البتہ اپنے چولھے اور بھٹیاں سلگا رہے ہیں. گردواروں اور مندروں سے ساز کے ساتھ خداوندکریم کی تعریف اور جاہ و جلال کے سریلے نغمے بکھر رہے ہیں. تقسیم سے قبل اذان کی آواز بھی گونجتی تھی. اب ہم بازار سے باہر آگئے ہیں. ایک نیم پختہ مکان کے سامنے چبوترے پر کوئی کھیس تانے سو رہا ہے. چبوترے کے نیچے بھینس بندھی ہے. کم عمر سکھ بنیائن اور کچھا پہنے بھینس دوھ رہا ہے. اس سے کچھ دور ہٹ کر سردارنی اُپلے پاتھ رہی ہے. منا سا بچہ اس کے قریب کھڑا ریں ریں کر رہا ہے۔

آج مدت کے بعد اتنی صبح میں باہر نکلا ہوں. صبح کی ہوا واقعی بہت خوشگوار ہوتی ہے تم نہ آئیں تو یہ ہوا آج بھی مجھے میسر نہ آتی۔

ہوں. نسیم سحر تو مشہور ہے. مگر آج مدت کے تم نے آدھی رات سڑکیں ناپیں. اس سے پہلے میرے انتظار میں پلیٹ فارم ناپا. اتنی اذیت کے بعد تو نسیم سحر بے مزا ہو گئی ہوگی.

نہیں اس ہوا سے ساری کلفت دور ہو گئی. اور آج پہلی بار میری وجہ سے تم کو عبادت خانہ کے پھاٹک تک چلنا پڑ رہا ہے ۔

پھاٹک تک کیوں میں اندر چلوں گا. اب ایسا بھی کیا.

نہیں گوپی میں تم سے کوئی ایسا کام نہیں کروانا چاہتی جو تم دل پر جبر کر کے کر دیا جو تمہارے مذہب کے خلاف ہو۔

تم جانتی ہو کہ میرا مذہبی عقیدہ کیا ہے. پھر ایسی باتیں کرتی ہو. جبر کی کیا بات ہے. تم کو اکیلا دیکھ کر خانقاہ والے کیا خیال کریں گے کہ رات کے وقت دوسرے ملک میں تنہا سفر کیا.

خانقاہ والے مجھے اکیلا دیکھ کر تو شاید کچھ نہ سوچیں مگر "دوکیلا" دیکھ کر ضرور سوچیں گے۔

کیا مطلب ؟

مطلب یہ کہ تم کو ساتھ دیکھ کر وہ فوراً سوالات کی بوچھار کر دیں گے. یہ کون ہیں ؟ تم سے کیا رشتہ ہے ؟ پاکستانی ہیں یا ہندوستانی ؟ کیا مذہب ہے ؟ وغیرہ وغیرہ۔

تو یہ کہو ڈرتی ہو ؟ اور احسان مجھ پر رکھ رہی ہو۔

بھئی دنیا میں رہنا ہے تو اس سے ڈرنا بھی پڑے گا. یہ آج پہلی بار سنا ہے ورنہ تم تو کبھی دنیا سے نہیں ڈرتی میری جوتی کی نوک سے. "آج کیا جوتی پیر میں نہیں ہے۔"

ہے تو مگر ہر وقت تو جوتی نہیں ماری جا سکتی. یہ دنیا بڑی خراب ہے جن کی دوستی گندگی سے آلودہ ہوتی ہے. ان کو کچھ نہیں کہتی. اور ہماری بے لوث دوستی کو شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے کل رات تانگے والے کی طنزیہ مسکراہٹ تم نے نہیں دیکھی تھی ؟

دیکھی تھی !

ایسے ہی وقت میں تو میرا جی بے اختیار یہ چاہنے لگتا ہے کہ

تم عورت ہو جاؤ یا میں مرد ہو جاؤں۔

بہت اچھے! کیا کہنے ہیں اس تمنا کے۔ روضے پر دعا مانگ لینا اگر ایسا ہو جائے تو آمدنی بھی خوب ہوگی۔

آمدنی؟

ہاں جس کی جنس بدل جائے۔ اس پر ٹکٹ لگا دیں گے۔

"آئیے جناب"۔ "دیکھئے جناب"۔ "زندہ طلسمات"۔

میری آنکھوں میں خاک آج تو خوب چہک رہے ہو ورنہ تمہارے منہ کے دُور سے کم ہی ٹوٹتے تھے۔ تمہیں ملے ہوئے بھی تو مدت گزر گئی۔

ہاں تقریباً سترہ برس۔ لو پھاٹک آگیا میں اتری جا رہی ہوں، میرا سامان اندر اگر تم ہی اس تانگے میں لوٹ جاؤ۔

جو حکم سرکار کا۔

ہم تانگے سے اترے ہی تھے کہ کھٹ سے، پھاٹک کھلا۔ السلام علیکم! غالباً آپ پاکستان سے تشریف لائی ہیں۔ میں اس خانقاہ کا خادم عرف عام میں خلیفہ ہوں۔

ہمارے سامنے ایک لحیم شحیم مولانا کھڑے تھے۔

ہم دونوں بوکھلا گئے۔

"جس سے ڈر رہے تھے وہی بات ہوئی" میں نے تانگے والے کی مدد سے جلدی جلدی اس کا سامان اتروایا اور اس کو خدا حافظ کہہ کر تانگے میں بیٹھنے لگا۔

آدے گئے مندے ایسے نہیں جانا۔ خلیفہ صاحب نے مجھے مخاطب کیا۔

قبلہ میں اس ہی تانگے میں چلا جاؤں تاکہ واپسی کے لئے پہلی ٹرین مل جائے۔

ابھی گاڑی میں دیر ہے۔ اگر یہ تانگے والا نہ ٹھہرے گا تو تم بس سے چلے جانا۔ میں تم کو اسٹیشن پہنچوا دوں گا۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ تم چلتے پھرتے چلے جاؤ۔ یہ کہہ کر وہ ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے پھاٹک میں داخل ہو گئے۔

"برے پھنسے"۔ اس نے چپکے سے مجھے چھیڑا۔ تم اپنی خیر مناؤ۔ میں گھنٹہ آدھ گھنٹہ ٹھہر کر واپس ہو جاؤں گا۔ تم پندرہ دن تک اپنی خطائیں معاف کرواتی رہنا۔

ہوں۔ وہ سنجیدہ ہو گئی۔

مجھے تمہارا یہ کٹر مذہبی ہونا قطعی پسند نہیں۔

تمہیں میری کوئی بات پسند بھی ہے؟ وہ پھر اپنی اصلی حالت پر آگئی۔

اب ہم خلیفہ صاحب کے مکان تک پہنچ چکے تھے مجھے باہر بٹھا کر خلیفہ صاحب اس کو زنان خانے میں لے گئے اور ذرا دیر بعد چائے کی ٹرے لئے ہوئے برآمد ہوئے۔ چائے پیکر میں نے سوچا جب یہاں تک آگیا تو مزار پر بھی حاضری دے دوں۔ اس خواہش کا اظہار میں نے خلیفہ صاحب سے کیا۔

ہاں جی ضرور یہ تو دربار ہے تو دربار عام ہے۔ یہاں ہر مذہب اور ملت کے لوگ آتے ہیں۔

اور جب میں مزار سے باہر آکر خلیفہ صاحب سے رخصت ہونے لگا تو وہ بولے۔

ذرا ٹھہرو، ان محترمہ کو زنان خانے میں سے لے آؤں۔ ان سے بھی خدا حافظ کہہ لو۔

یہ تو مزار پر بھی حاضری دے آئے۔ خلیفہ صاحب نے اس کو مخاطب کیا۔

مگر خلیفہ صاحب یہ تو ہندو ہے میرا مطلب یہ خود تو کٹر ہندو نہیں ہیں۔ مگر ہندو والدین کی اولاد ہیں۔ اس نے ہکلا کر کہا۔

ہاں جی میں سمجھ گیا۔ مگر اس سے فرق کیا پڑتا ہے۔ مزار پر ہندو سکھ سب ہی جاتے ہیں۔ ویسے یہ لڑکا خاندانی لگتا ہے ملنے تو منڈ پسند آئیں۔ اچھا میں آپ کا سامان اندر بھجواؤں یہ کہہ کر خلیفہ صاحب پھاٹک کی طرف چلے گئے۔

مبارک ہو جناب تمہاری خیریت نہیں ہے خلیفہ صاحب کو تم پسند آگئے ہو۔ اس نے شرارت سے کہا۔

میں اس کو خدا حافظ کہہ کر چل پڑا۔ اور سوچنے لگا کہ اکثر جو نظر آتا ہے وہ ہوتا نہیں ہے۔ یعنی ہم گمان کچھ کرتے ہیں اور

ہوتا کچھ اور ہے۔ ہم میں دوستی ہے، خلوص ہے۔ ایک دوسرے کے دکھ سے ہمیں تکلیف ہوتی ہے اور خوشی سے مسرت اس کی شفقت میں دوست کے خلوص سے زیادہ ماننا جھلکتی ہے۔ اب تو خیر ہم آدھی عمر گزار چکے ہیں۔ مگر جب ہم کم عمر تھے ان دنوں بھی اس کا برتاؤ میرے ساتھ ایسا ہی تھا جیسے بزرگوں کا بچوں سے ہوتا ہے۔ اور کیے ہیں؟ میں نے کبھی اس کی بزرگی نہیں تسلیم کی۔ مگر یہ عجیب سی بات ہے کہ میں جو اپنے خول میں رہنے کا عادی ہوں۔ بہت کم کسی سے بے تکلف ہوتا ہوں۔ ایسے دوست جو میرے ہم جنس ہیں۔ بچپن سے ساتھ کھیلے کودے۔ اب بھی ساتھ اٹھنا بیٹھنا، ہنسنا بولنا، کھانا پینا، ان میں سے کسی کو میں نے راز داری کے قابل نہ سمجھا۔ مگر اس سے ملتے ہی اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ غم جاناں اور غم دوراں سب ہی بیان کر دیا۔ بیان کیا کر دیا۔ وہ بغیر کچھ سنے ہوئے ہی سمجھ گئی اور پورے اعتماد کے ساتھ میری دلی حالت میرے سامنے بیان کر دی۔ میں نے دیکھا کہ جب اس پر سب آشکارا ہی ہو چکا ہے تو چھپانے سے فائدہ کیا۔ میں نے اس کے گمان پر صاد کر دیا۔ پاکستان بنتے ہی وہ چلی گئی۔ مگر ہم میں خط و کتابت کا سلسلہ چلتا رہا۔ دوسرے تیسرے مہینے ایک خط اس کا آیا۔ اور ایک میرا چلا گیا۔ مگر یہ ضرور ہوا کہ جب کبھی میری زندگی میں کوئی اہم واقعہ ہوا تو اس کی اطلاع میں نے اس کو فوراً دی۔ حالانکہ ان باتوں کا علم نہ میرے والدین کو ہوا نہ بہن بھائی کو نہ کسی عزیز دوست کو میرے دل پر جو کچھ بیتا۔ اس کا علم سوا اس کے کسی کو نہیں ہوا اکثر تو اس ہستی کو بھی خبر نہ ہوئی۔ جو مجھے اس دنیا میں سب سے زیادہ عزیز اور پیاری ہے۔ غرض کہ وہ میری رازدار ہے۔ مگر دنیا اس کو کیا رنگ دے رہی ہے، سنئے۔

کل شام میں اسٹیشن پر اس کا منتظر تھا۔ میل ایک گھنٹہ لیٹ تھی۔ اور جھنجھلایا ہوا کبھی بیٹھ جاتا کبھی ٹہلنے لگتا کہ خدا خدا کر کے گاڑی پلیٹ فارم پر داخل ہوئی۔ وہ دروازہ کھولے کھڑی تھی۔ میں نے پہلی نظر ہی میں اس کو پہچان لیا۔ حالانکہ سترہ سال بعد دیکھا تھا۔ اس کے رنگ و روپ اور جسامت میں بھی خاصہ تغیر ہو گیا ہے۔ پہلے وہ الھڑ لڑکی تھی۔ اب ادھیڑ عورت صرف ایک بات ایسی ہے۔ جو نہیں بدلی اور اس ہی لئے میں نے فوراً اس کو پہچان لیا۔ وہ ہے اس کے متبسم لب اور غم برساتی آنکھیں وہ ہمیشہ کی طرح اب بھی خوب ہنستی ہے۔ اور باتیں کرتی ہے۔ مگر اس کے دونوں جہان میں الٰہی توبہ ان میں بے کراں غم و اندوہ موجیں مارتا رہتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کی زندگی ہی سراپا غم ہے۔ اس بھری دنیا میں اس کا کوئی نہیں اکیلی آئی، اکیلی ہے اور شاید اکیلی ہی چلی جائے گی۔ ماں، باپ بچپن میں مر گئے ہیں۔ بھائی کوئی نہیں یعنی اپنوں کی محبت سے محروم۔ اور بظاہر تو غیروں میں سے بھی کسی نے اس کو نہیں چاہا۔ یا کبھی چاہا ہو جس کا کسی کو علم نہیں۔ مجھ سے ملنے کے بعد تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ نہ پہلے کا کوئی واقعہ سنا مگر اس کی آنکھوں سے یہ غم کی برکھا یہ تو محبت کی چوٹ کھانے ہی کے بعد ہوتی ہے۔ میں نے کئی بار کریدنا چاہا۔ مگر وہ ہمیشہ ٹال گئی۔

ارے دوست یہ سب تو فرصت کی باتیں ہیں۔ مجھے اتنا وقت ہی نہیں ہے کہ کسی پر عاشق ہو جاؤں یا کسی کو اس کا موقعہ دوں۔ کبھی فرصت ملی تو دیکھا جائے گا۔ وہ قہقہہ لگا کر جواب دیتی ہے،

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے اس کو پہلی نظر میں پہچان لیا۔ اور وہ میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔

کہو کیا پروگرام ہے؟ میں نے جھٹ سے سوال کیا۔ کیسا پروگرام؟ اس نے مجھے حیرت سے دیکھا! میرا مطلب ہے یہاں آج کل "سنگم"، "بے نظیر"، "کشمیر کی کلی"، "آئی ملن کی بیلا" اور "وہ میرے محبوب" چل رہا ہے۔

قبلہ گھڑی کی طرف دیکھئے۔ اس نے طنز سے کہا۔ ہاں شو شروع ہو چکے ہیں۔ مگر تین چوتھائی فلم مل سکتا ہے۔ میری رائے میں "میرے محبوب"۔۔۔ ارے گولی مارو میرے محبوب کو میرا بھوک کے مارے برا حال ہے۔ اور تمہیں پڑی ہے میرے محبوب کی اس نے خوش دلی سے کہا، ارے تم نے ابھی تک

کھانا نہیں کھایا؟ آج کل بی بی بھی گھر پر نہیں، میں خود بھی بازار میں کھانا کھاتا ہوں، چلو کسی ریسٹوران میں چلتے ہیں۔

نہیں بھئی بازار چلنے کی ضرورت نہیں، کھانا میرے ساتھ ہے ٹرین میں بھیڑ اتنی تھی کہ کھانے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ کھڑی کھڑی تو آئی ہوں۔ ویٹنگ روم چلو، جب گھر پر بی بی جی نہیں ہیں۔ تو جانا فضول ہے مگر وہ تم کو چھوڑ کر چلی کہاں گئیں؟

میں ان کی تنہا اولاد تو ہوں نہیں کہ ہمیشہ میرے پاس رہیں بڑی بہن کے خسر کا انتقال ہو گیا۔ وہاں پُرسے کو گئی ہیں۔

تم کو میری وجہ سے رکنا پڑا۔ ورنہ تم بھی افسوس کر جاتے۔

نہیں یہ بات نہیں تم نہ بھی آتیں تو میں نہ جاتا۔ بی بی چلی گئیں بس کافی ہے۔ یہ باتیں کرتے ہوئے ہم ویٹنگ روم میں آگئے۔ اس نے منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھایا۔

اب کیا ارادہ ہے؟

ارادہ کیا ہوگا، ظاہر ہے کہ اب فلم کی دم پکڑنے سے کیا فائدہ۔

مگر ویٹنگ روم میں رات گزارنا۔ اس سے بھی تو کوئی فائدہ نہیں۔ ٹرین ساڑھے چار گھنٹے بعد ملے گی۔

پھر کہاں جائیں، تمہارے گھر پر بھی تو کوئی نہیں ہے؟

چلو تم کو اپنے شہر کی سیر کرالائیں۔

چلو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا سامان کلوک روم میں رکھوایا اور ہم اسٹیشن سے باہر آگئے۔ رات آدھی بیت چکی تھی۔ رکشے اور تانگے والے اونگھ رہے تھے۔ میں نے ایک تانگے والے سے پوچھا چلوگے؟

کہاں بادشاہو؟ اس نے آنکھیں مل کر جواب دیا۔

کسی خاص جگہ نہیں شہر کا چکر لگا کر واپس آجائیں گے۔

اس نے طنز سے مسکرا کر ہمیں دیکھا! غالباً جی میں کہہ رہا ہوگا۔ یہ عمر اور یہ حرکتیں۔ جوان مرد اور عورت اگر رات میں آوارہ گردی کرتے پھریں تو جوانی دیوانی کہہ کر معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ مگر ہماری عمر والے اگر ایسی باتیں کریں گے تو خواہ مخواہ ہی لوگ اُلّو بنائیں گے اس کو تانگے والے کی مسکراہٹ چبھ گئی۔

چلو کچھ دور پیدل چلتے ہیں۔ پھر رکشہ یا تانگہ لے لیں گے۔

اس نے قدم بڑھا دیئے۔ اور میں اس کے ساتھ ہو لیا۔

سامنے سڑک کے کنارے کچھ لوگ شامیانہ لگا کر بیٹھے تھے۔ بہت سے دیوی دیوتاؤں کے فوٹو لگے تھے۔ اور بہت زور شور سے بھجن گائے جا رہے تھے۔

شاید کیرتن ہو رہا ہے اس نے سوال کیا۔

ارے روز ہی ایسے ہنگامے ہوتے رہتے ہیں۔ عوام کی نیند حرام کرنے کو۔

مجھے بتاتے چلو، اب ہم کس سڑک پر ہیں؟ پہلے سواری لے لیں، ورنہ تم تھک جاؤگی۔ اور میں نے ایک تانگہ لے لیا۔ پھر میں شروع ہو گیا۔ یہ کیلاش سینما۔ یہ کیوالٹی ریسٹوران۔ یہاں آئس کریم اچھی ملتی ہے کراچی میں بھی کیوالٹی ہے۔ مگر آئس کریم عام سی ہوتی ہے یہ صدر ہے۔

ریتا مشین کی ایجنسی، کمپنی باغ۔ سونی صاحب کا بنگلہ۔ یہ گورنمنٹ کالج۔ یہ سیول لائنز۔ اس کے بعد ہم ماضی کی طرف لوٹ گئے۔ اپنی بیماری کے دوران جو دن ہم نے سینی ٹوریم میں گزارے تھے۔

تمہیں وہ عاشق مزاج یاد ہیں۔ کیا نام تھا ان کا؟ اس نے سوال کیا۔

کون عاشق مزاج وہاں تو کئی عاشق اور ان کی متعدد معشوقائیں تھیں۔

ارے بھئی وہی جو تمہارا مزاج پوچھتے تو تم کہتے "عنایت ہے آپ کی" اور وہ جز بز ہو کر رہ جاتے۔

مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ نرس عنایت پر جیتے جی مرتے ہیں اور اس کی خاطر صحت یاب ہو کر بھی سینی ٹوریم سے ٹلنے کا نام نہیں لیتے۔ جی ہاں ان کی حرارت سینی ٹوریم والوں کے لئے درد سری ہوئی تھی۔

مصنوعی حرارت کہو۔

ہاں وہ حرارت جو عنایت کی عنایت کردہ تھی۔ مگر تم نے اکثر ان کو خاصہ جز بز کیا تھا۔ جہاں تمہارا اور ان کا آمنا سامنا ہوا سلام

کے بعد تم نے ان کا مزاج پوچھا۔ مجبوراً ان کو بھی کہنا پڑا۔

"مزاج شریف"

عنایت ہے آپ کی تمہارا جواب ہوتا۔ یہ سنکر ہم سب مریضوں کے لبوں پر تبسم کھیلنے لگتا۔ اور ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ ہمارے منہ نوچ لیں۔

ہاں خوب چیز تھے وہ بھی۔ مجھے تو نرس سوئیٹی نے کافی دن کے بعد بتایا کہ یہ قصہ ہے۔

نرس سوئیٹی کی عنایت تم پر تھی۔ مگر تم نے اس کے ساتھ سرد مہری برتی۔

سرد مہری کا کیا سوال، میری تیمارداری کرنے میں جو امتیازی سلوک وہ میرے ساتھ کرتی۔ اس کا میں اب بھی شکر گزار ہوں۔

عجیب لوگ ہیں آپ بھی۔ وہ شکریہ نہیں کچھ اور بھی چاہتی تھی۔ عنایت کا قصہ سنانا کیا معنی رکھتا تھا۔ مگر تم نے بے التفاتی کی اس کے ساتھ۔

جی ہاں قربانی کا بکرا بننے کو میں ہی رہ گیا تھا۔

قربانی کا بکرا کیوں بنتے۔ مگر کسی کے جذبات کی پذیرائی نہ کرنا یہ بھی بری بات ہے۔

سوئیٹی تھی تو کچھ احمق۔ مگر ایسے لوگوں کا مذاق اڑانا مجھے پسند نہیں تھا۔ اس ہی لئے میں نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی کہ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے۔

مذاق اڑانے کا کیا سوال؟ احمق تھی یا کچھ تم سے محبت تو کرتی تھی۔ آج کل چاہنے والے ملتے کہاں ہیں۔ اگر ہم ان کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتے تو کم سے کم ان کا احسان ہی مانیں۔ رہ گیا اس کا احمق پن تو میاں بھائی یہ محبت کمبخت چیز ہی ایسی ہے جو اچھے بھلے عقلمند کو احمق، غیرت دار کو بے غیرت اور خود دار کو اوندھے منہ گرا دیتی ہے۔

مگر تم کو گرتے ہوئے دیکھنے کا شرف مجھے تو حاصل ہوا نہیں کبھی تو احمق پن کا ثبوت تم بھی دے دیتیں۔

اچھا تو اب آپ قربانی کی بکری مجھے بنانا چاہتے ہیں۔ وہ زور سے ہنس پڑی۔

پھر ہم نے ایک دکان پر جا کر شربت پیا۔ اس کے بعد مکمل ڈیڑھ گھنٹہ ہم نے خاموشی سے شہر کا چکر لگایا۔ وہ کیا سوچ رہی تھی اس کا مجھے علم نہیں۔ مگر میرے ذہن میں اب سے دو دن پہلے کا واقعہ گھومتا رہا۔

یہ پاکستانی لفافہ؟ میرے دوست نے سوال کیا۔

ہاں جی! میں مختصر جواب دے کر بگڑے ہوئے ریڈیو کو ملنے کی کوشش کرنے لگا۔

کسی تجارتی فرم کا ہے؟ وہ میری بے نیازی کو نظر انداز کر کے پھر بولا۔

نہیں جی!

پھر؟

کچھ نہیں!

ارے میں پوچھتا ہوں یہ پاکستانی لفافہ کس کا ہے؟

جس نے بھیجا ہے، میں نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ دراصل یہ میرے کاروبار کا وقت تھا۔ دو دن سے میکنک نہیں آیا۔ اور آج سیلز مین بھی غائب۔ خریداروں کے ساتھ مغز پچی کرنے کے علاوہ بگڑی چیزوں کی مرمت بھی میرے سر پڑ گئی۔ میں جلد از جلد ریڈیو کی مرمت کر لینا چاہتا تھا۔ اور میرے دوست کو پاکستانی لفافے کی پڑی تھی۔ سیدھی طرح بتلاتے ہو یا پھر... میرے دوست نے دھمکی دی۔

میں نے غصے سے لفافہ اس کے منہ پر مار دیا۔ وہ خوش ہو کر خط پڑھنے لگا۔

ہیں! یہ کیسا خط ہے نہ القاب نہ آداب اور نہ ہی بھیجنے والی کا نام۔

میرا دوست پھر مجھے تنگ کرنے آگیا۔ میرے اس دوست کی عادت عورتوں جیسی ہے۔ بات پوچھے گا، اس کی جڑ پوچھے گا۔ شاخیں اور پتے گنے گا۔ پھل پھول معلوم کرے گا۔ ورنہ کھانا ہی ہضم نہ ہوتا۔ میں نے سوچا اس کو مطمئن کر دوں۔ ورنہ وہ ٹلے گا نہیں اور میرے کام یوں ہی پڑے رہ جائیں گے۔ اس لئے کہا۔

میری ملاقاتی ہیں۔

ملاقاتی یا دوستی؟

دوست ہی سمجھ لو۔ میں نے جل کر کہا۔

ان صاحبہ کا نام اور مذہب؟

احمق ہیں آپ۔ پاکستان سے آرہی ہے۔ روضہ پر جارہی ہے آپ پوچھتے ہیں مذہب؟

ہاں خیر یہ تو میں سمجھ گیا کہ وہ مسلمان ہے۔ بڑی جلدی سمجھ گئے۔ چلنے کی باتیں کرو۔ نظر لگ جائے۔ بیوی جان سے کہنا نظر اتار دے گی۔

کیا تم اس کے ساتھ روضے تک جاؤ گے؟ میرا دوست میرے طنز کو نظر انداز کر کے بولا۔ جانا ہی پڑے گا۔

مگر روضہ کے احاطہ میں مت گھسنا۔ جیسا اس نے لکھا ہے کہ بس الگ تک پہنچا کر لوٹ آنا۔

کیوں؟ میں نے غصے سے کہا۔

سنا ہے اگر کوئی غیر مسلم روضہ پر چلا جائے تو مسلمان ہو جاتا ہے۔

تب تو میں ضرور جاؤں گا۔

تمہارا دوست نے خود ہی منع کیا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ میں اپنے عبادت خانوں اور زیارت کی جگہوں پر کم ہی جاتا ہوں، اس لئے اس نے احتیاطاً لکھ دیا۔

بھئی مجھے ماسی سے کہنا پڑے گا۔

کیا؟

یہی کہ تم گئے ہاتھوں سے۔

ایک تو پاکستانی مسلمان کے ساتھ روضہ پر جانا، اوپر سے دوست اور دوست بھی کون لڑکی۔

اطلاعاً عرض ہے کہ وہ میری ہم عمر ہے۔ اور آپ لڑکی کی رٹ لگائے ہیں۔

شادی شدہ ہے؟

آپ کو کیا فکر؟ آپ تو یہ کارِ خیر فرما چکے ہیں۔

سمجھ گیا اس کی شادی نہیں ہوئی۔

میری سمجھ میں نہیں آتا، تمہیں اس کی نجی زندگی سے کیوں دلچسپی ہے؟

بھئی دلچسپی یوں ہے کہ میرا یار بھی کنوارا ہے۔ اس نے دانت نکال کر کہا۔

دماغ صحیح ہے؟ میرے غیر شادی شدہ ہونے سے اس کا کیا تعلق؟

تعلق ہے یا نہیں یہ تو تم جانو۔ یا بھگوان جانے۔ ہم تو کوڑی سے کوڑی ملاتے ہیں۔

بہت ہو گیا۔ اب آپ چلتے پھرتے نظر آئیں۔ ورنہ مجھے آپ کی گولیاں الگ کرنی پڑیں گی۔

میرا دوست ہنستا ہوا چلا گیا۔ اور مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ جب میرے تایا جی نے میرے مسلمان ہونے کی پیش گوئی کی تھی۔ قصہ یہ تھا کہ ایک بار میں والد صاحب، بی بی اور تایا جی کار سے مسوری جارہے تھے۔ گرمی کے دن اور ہمارے ساتھ جو پانی تھا، وہ ختم ہو گیا۔ میں پیاس کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ اس وقت ہم ایک گاؤں سے گزر رہے تھے۔ گرمی کی وجہ سے ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ کنواں ملا مگر پانی کیسے نکالا جائے؟ ہمارے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ والد صاحب نے گاڑی روکی، تاکہ کسی کا دروازہ کھٹکھٹا کر پانی کا سوال کیا جائے۔ سامنے مسجد تھی۔ گاڑی رکتے ہی میں موٹر سے باہر آگیا اور سیدھا مسجد میں جا گھسا۔ وہاں مٹی کے گھڑوں میں پانی رکھا تھا۔ ان کے قریب مٹی کے لوٹے رکھے تھے۔ میں نے لوٹے میں پانی انڈیلا اور ٹونٹی منہ سے لگالی۔ میرے پیچھے والد صاحب بی بی اور تایا جی بھی آئے۔ جب تک میں سیراب ہو چکا تھا۔

تمہارا بیٹا گیا ہاتھوں سے تایا جی نے بگڑ کر کہا۔

کیا مطلب ہے بھائی صاحب آپ کا، میرے والد پنجابی ہوتے ہوئے بھی عموماً اردو بولتے تھے۔ اگر کبھی مجبوراً پنجابی بولنی پڑتی تو یہ محسوس ہوتا کہ کوئی غیر پنجابی، پنجابی بولنے کی کوشش کر رہا ہے۔

مسجد کے گھڑے سے پانی پی لیا، دیکھ لینا یہ مسلمان ہو جائے گا۔

(باقی صفحہ ۱۴۳ پر)

دو غزلیں

یوں تیرگی ہے رات کی تاروں کے ساتھ ساتھ
جوں موسمِ خزاں ہو بہاروں کے ساتھ ساتھ

دیکھو تو کیا گزرتی ہے راہِ خلوص میں
آؤ تم بھی درد کے ماروں کے ساتھ ساتھ

زاہد تھا بیقرار کہ ایمان کی کرن!
دیکھی گئی ہے بادہ گساروں کے ساتھ ساتھ

وہ خاک جس کو تیرے کفِ پا سے پیار تھا
اُڑتی رہی ہے راہ گذاروں کے ساتھ ساتھ

گو مطمئن ہے عاظمی پر تیری آرزو
رہتی ہے زندگی کے نظاروں کے ساتھ ساتھ

وہ سماں جیسے ہو اندازہ ہوا کا کوئی
ہائے وہ جسم کہ جلوہ تھا خدا کا کوئی

تیری زلفیں ہیں کہ تصویرِ ارم ہو جیسے
تیرا چہرہ ہے کہ پیکر ہے ضیا کا کوئی

دل کے بازار میں رونق تو بہت ہوتی ہے
گاہک آتا نہیں پر جنسِ وفا کا کوئی

رات وہ شہر تصور میں کچھ ایسے آیا
جسطرح روپ ہو بے دین قضا کا کوئی

زندگی ہے یا کوئی تیز ہوا ہے غم کی
آدمی ہے یا دیا حُسنِ فنا کا کوئی

آج شعروں میں سُنا عاظمی افسانۂ زیست
لوگ کہتے ہیں تو شاعر ہے بلا کا کوئی

اسلم پرویز

دلّی سے دلّی تک

ضمیر صاحب پرانی دلّی کے نئے ادیب ہیں۔ "دلّی سے دلّی تک" ان کے انشائیوں کا مجموعہ ہے، جو ان کی دوسری کتاب ہے۔ لیکن ضمیر صاحب کے مخصوص فن کے پیش نظر اسے ان کی پہلی ہی کتاب سمجھنا چاہئے۔ اس کتاب کی سب سے نمایاں خصوصیت دلّی کی وہ زبان ہے، جسے سننے کو اب کان ترستے ہیں۔ چند بزرگوں، بڈھوں کے علاوہ نوجوان طبقہ اور خصوصاً تعلیم یافتہ نوجوان تو اس زبان کے چٹخاروں سے ناواقف ہی نظر آتا ہے۔ لیکن ضمیر صاحب اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ضمیر صاحب نئی نسل کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس کی گھٹی میں دہلویت بلکہ "دلّی پن" ضرور شامل ہے بقول ڈاکٹر خلیق انجم:

> "ضمیر صاحب نئی نسل کے حساس اور ذہین نوجوان ہیں۔ ان کے انشائیے ٹھیٹھ دلّی کی زبان میں ہیں۔ وہ روزمرہ کی لطافتوں اور نزاکتوں سے بخوبی واقف ہیں اور ان اہل زبان میں ہیں۔ جن کے لئے کتابیں، لغتیں اور اساتذہ کا کلام سند نہیں ہوتا بلکہ وہ خود سند ہوتے ہیں۔"

دلّی میں اب چند ہی محلّے ایسے رہ گئے جہاں پرانی دلّی کی زبان اور بدزبانی، تہذیب اور بے تہذیبی، اچھائیاں اور برائیاں باقی ہیں لیکن یہاں بھی ملاوٹ کی رفتار اتنی تیز ہے کہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ چند برسوں میں اس رہی سہی دلّی کا کیا حشر ہوگا۔ ایسے موقعوں پر دلّی کا ذکر کرتے ہوئے حوالہ کے لئے ضمیر صاحب کی کتاب ہی معاون اور مددگار ثابت ہوگی۔ یوں تو کہنے کو دلّی میں مَیں بھی رہتا ہوں اور ضمیر صاحب کے کئی ہم عمر ایسے ہیں جو دلّی والے ہیں اور لکھنے لکھانے بھی ہیں مگر وہ سب ایک غیر مخصوص میدان کے مرد ہیں۔ ہم لوگ تو صرف اتنی ہی اہلیت رکھتے ہیں کہ ضمیر صاحب کے مضامین سے وہی لطف اٹھا سکیں جو دلّی والے اٹھا سکتے ہیں۔ ہم ضمیر صاحب کے مضامین کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خرابیوں پر بھی بحث کر سکتے تھے۔ لیکن ایسے مضمون شاید خود نہ لکھ سکیں۔ اور یہی ضمیر صاحب کا کمال ہے۔ ان کے مضامین میں تجربات و مشاہدات کے ساتھ شگفتگی اور خوش بیانی کا جو امتزاج ہے اس نے ان کی تحریر میں جان ڈال دی ہے۔ اسی لئے پروفیسر احتشام حسین نے ان کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "ضمیر صاحب کے یہ مضامین شخصی اور ذاتی انداز میں شگفتہ طبعی اور خوش بیانی کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ اور لطف زبان و بیان کے حامل ہیں۔"

ضمیر صاحب کی اس کاوش کو دلّی کے دبستان نثر کا نشاۃ ثانیہ سمجھنا چاہئے۔ انہوں نے اپنے لئے جس صنف کا انتخاب کیا ہے اور جس زبان و اسلوب کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے وہ یقیناً دلّی کے نوجوان ادیبوں کے حلقے میں مقبول ہوگا اور آئندہ چند برسوں میں اس پر اضافے کی نظیر [illegible]

ضمیر صاحب کے ان تمام مضامین کا ایک اجمالی جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ جو ان کے زیر نظر مجموعے میں شامل ہیں۔ [illegible]

"گالیاں" اس کتاب کا سب سے پہلا مضمون ہے۔ بعض اوقات گالی کے بغیر آپ اپنے جذبات کا پوری طرح اظہار نہیں کر سکتے اور اس کے ساتھ ہی آپ بغیر مہارت کے گالی دے بھی نہیں سکتے۔ ہم نے اپنے ہوش میں اس فن کا ماہر دو ہی اشخاص کو دیکھا۔ ایک تو آغا طاہر مرحوم نبیرۂ آزاد اور دوسرے استاد رسا دہلوی۔ گالی کی اسی اہمیت کا ذکر ضمیر صاحب نے اپنے مضمون میں بڑے فلسفیانہ ڈھنگ اور پُرلطف انداز بیان کے ساتھ کیا ہے۔ گالی کے بارے میں ان کا فلسفہ ملاحظہ ہو:

"گالی تو بے سہاروں کا سہارا ہے۔ گالی محمود و ایاز کو ایک سطح پر لے آتی ہے۔ گالی دل کی بھڑاس نکالنے کا واحد ذریعہ ہے۔ طاقت اور دولت کا اگر کوئی منہ توڑ جواب ہے تو گالی۔ تشنہ جذبات اور ناکام حسرتوں کی اگر تلافی ممکن ہے تو گالیوں کی بدولت۔ غرض گالیاں بے زروں کو زردار، بے طاقتوں کو طاقت ور اور نہتوں کو مسلح کر دیتی ہیں۔ اگر آپ انسان کے سماجی حالات اور ارتقا کا بغور مطالعہ کریں تو آپ پر بھی یہ انکشاف ہو سکتا ہے کہ گالی نے ہمیشہ دلدہی، دلداری اور پشت پناہی کی ہے۔ کسی مغرور پہلوان نے کسی نحیف پر ہاتھ اٹھایا ہے، تو اس کی تلافی گالی نے کی ہے۔ کسی دولت مند نے کسی غریب کو جیل بھجوایا ہے تو گالی ہی نے اس کا بھی بدلہ چکایا ہے۔ ظالم بادشاہ نے کسی بے گناہ معصوم کو سزائے سخت دی ہے تو گالی ہی اس معصوم کی دل بستگی کو آئی ہے۔"

اسی مضمون میں ایک اور جگہ گالی کے فیوض و برکات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اور ہر بات خدا لگتی کہی ہے۔ میری بات کا یقین نہ کیجیے خود ہی پڑھیے اور فیصلہ کر لیجیے۔

"گالی انسان میں عملی قوت، چستی اور تحریک پیدا کرتی ہے۔ مزدوروں کو دیکھیے۔ دس بیس ہوائی گالیاں دیں۔ "ہیّا سا" کا نعرہ لگایا اور مشکل سے مشکل کام آسان کر لیا۔ ہماری روزمرہ زندگی میں ان تجربوں کی کمی نہیں۔ نوکر منشا اہل ہو، کام کاج میں آلکسی برتتا ہو، ذرا گونجتی آواز میں ایک دو پھڑکتی ہوئی سنا دیجیے۔ گھنٹوں کا کام منٹوں میں ہو جائے گا۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے۔ گھر کی نوکرانیوں کو عادت ہوتی ہے کہ چُپ سادھے کانوں میں روئی ٹھونسے آرام سے بیٹھی رہتی ہیں۔ آپ حکم دیے جائیے۔ مجال ہے ان کے کانوں پر جوں بھی رینگے۔ ایک چُپ سو کو ہرائے۔ اب یا تو آپ اپنا خون جلائیے۔ بات بات پر غصہ کھائیے۔ یا پھر زبان کو دشنام آشنا کیجیے۔ میں سمجھتا ہوں جلنے اور کڑھنے سے بہتر یہی ہے کہ آگے پیچھے گالی لگا کے اپنی بات میں وزن پیدا کر دیجیے۔ پھر دیکھیے ایک بولی تین کام اور لطف یہ کہ ہاتھوں ہاتھ ادھر آپ کے منہ سے بات نکلی اور ادھر پوری ہوئی۔"

"ہماری دنیا" بھی دلی کے ان گلی کوچوں کی کہانی ہے۔ جہاں ضمیر صاحب رہتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ دلی اب اتنی بدل چکی ہے کہ ان گلی کوچوں سے نکل کر دیکھیے تو زمانہ صدیوں آگے نظر آتا ہے۔ لباس، زبان، تہذیب، رہن سہن، عمارات، سڑکیں غرض بقیہ دلی کی ہر چیز اس چھوٹی سی دلی سے بالکل مختلف ہے۔ جس کا ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے۔ یہاں کی تفریحات و مشاغل، یہاں کی گلیاں، یہاں کے سینما گھر، یہاں کے لوگ غرض تمام چیزیں عجائب روزگار ہیں۔ یہ دنیا نئی دلی تو کیا قرول باغ اور پہاڑ گنج والوں کے لئے بھی اتنی ہی عجیب ہے۔ جتنا کہ امریکہ والوں کے لئے ہندوستان۔ ان گلی کوچوں کی اس دنیا میں چند قابل ذکر سینما گھر بھی ہیں۔ ان میں سے ایک کا ذکر ضمیر صاحب نے بھی کیا ہے۔ اس سینما گھر کے بارے میں تھوڑا بہت میں بھی جانتا ہوں۔ اسے تعارف کے طور پر سن لیجیے پھر اصل مضمون کا لطف لیجیے۔ سینما ہال میں اسٹیج کے دونوں طرف شیشے کے بڑے بڑے سائن بورڈ لگے ہیں، جن پر بڑے بڑے حرفوں میں "خاموش" لکھا ہے۔ یہ عبارت تمام وقت روشن رہتی ہے۔ اور عوام کو حتی الامکان خاموش رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ سینما ہال میں چلتے ادھر سوڈا لیمن والوں کا کاروبار ہر وقت جاری رہتا ہے۔ فلم کے بیچ میں ۔۔۔ [illegible]

مشین کی خرابی کے سبب یا حفظانِ صحت کے اصول کے پیشِ نظر۔ ایک مرتبہ سینما کے ٹکٹ کے ساتھ ہر شخص کو ایک ہاتھ کا پنکھا بھی دیا جا رہا تھا جس کا ایک آنہ الگ تھا۔ یہ پنکھا فلم دیکھنے کے بعد واپس بھی کیا جا سکتا تھا۔ معلوم ہوا کہ ہال کے تمام پنکھے ایک ساتھ خراب ہو گئے ہیں اس لئے یہ سسٹم چالو ہے۔ بہر حال اب ضمیر صاحب کے تجربات ملاحظہ ہوں:

"تھوڑی دُور چل کر امرِ ما کیسر آئے گا۔ یہ سینما امر ہے اور رہے گا۔ بڑے بڑے بورڈوں پر چند تصویر بتاں لگی ہوئی ہیں آپ کو باہر ہی سے نظر آ جائیں گی۔ ہم اس میں جا کر اپنا دل بہلاتے ہیں۔ اس مڈوے میں دھوپ اور ہوا کا پورا پورا آرام ہے۔ البتہ گرمیوں میں کھٹمل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہوا اس میں کسی کا کیا دوش۔ پھر یہ کہ آرام اور تکلیف کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہمارے ابّا میاں کہتے ہیں کہ اس سینما کی مشین بھی اسی کی طرح امر اور لازوال ہے۔ یعنی ان کے زمانے سے آج تک چلتی ہے اور اللہ چاہے گا تو ہمیشہ چلے گی۔ یہاں اللہ دین کا چراغ، خدا کا بندہ، نیک پردین، اور حاتم طائی جیسی فلمیں چلتی ہیں۔ ہم لوگ یہی دیکھتے ہیں۔"

"ہماری دنیا" کی جغرافیائی حدود اگرچہ بہت سمٹی ہوئی ہیں۔ لیکن یہاں ہر ہر قدم پر ایک عہد ایک تہذیب اور ایک دنیا ملے گی جس کی جزئیات پر اگر غور کرنے بیٹھ جائیں تو عمر خضر بھی اس کی تفصیل بیان کرنے کے لئے کم ثابت ہو گی۔ ہر گلی کوچہ کی اپنی ایک آن بان ہے اور اسی سے ہماری دنیا کی شان قائم ہے۔ بازاروں میں چتلی قبر بھی اپنی نوعیت کا ایک ہی بازار ہے۔ اس بازار میں ایک بڑے بانکے قسم کے سبزی فروش ہیں۔ ایک مرتبہ میں ان کی دکان پر سبزی خریدنے گیا۔ میں نے ہرا گھیا تلوایا جو اس وقت ڈیڑھ روپیہ سیر تھا۔ ابھی گھیا تل ہی رہا تھا کہ ایک اور صاحب دکان پر آ گئے۔ انہوں نے جو گھیا ترازو کے پلڑے میں چڑھا دیکھا تو شامت کی مار بیچاروں نے دام پوچھ لئے۔ دکاندار صاحب غالباً ان صاحب کے مزاج اور حیثیت سے اچھی طرح واقف تھے۔ لہٰذا گھیے کا بھاؤ بتلانے کے بجائے انتہائی تیکھے انداز میں اس گاہک سے یوں گویا ہوئے "میاں گھیا تو وہ کھائے گا جو کوئین بیچے گا۔ تم تو آلو لے جاؤ چھ آنے سیر ملیں۔" اس واقعے سے میرا مدعا یہ ہے کہ ضمیر صاحب نے محض ہوائی باتیں نہیں کی ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش سے بخوبی واقف ہیں۔ انہی کی زبان میں بازار چتلی قبر کے تاثرات بھی ملاحظہ ہوں:

"لیجئے صاحب بازار چتلی قبر آ گیا۔ یہاں کچھ پھل فروش اور سبزی فروش کنجڑے دیکھئے۔ اگر آپ سنیں تو ہم ان کا بھی کچھ حال بتائیں۔ یوں تو ان میں سب ہی رستم کے سالے ہیں لیکن کچھ بہت ہی تیکھے مزاج رکھتے ہیں۔ ان سے بات کیجئے تو وہ کہیں گے "بابو جی کیا کرو گے پھل کھا کے، پتلون میلی ہو گئی ہے ان پیسوں سے اسے دھلوا لو۔" سبزی والے کہتے ہیں "میاں بیسٹ کا کھایا کون دیکھتا ہے، دال کھاؤ دال۔" کم بڑھتی کرنے یا دام چکانے کی مجال بھلا میاں کیسے ہو سکتی ہے۔ ایک صاحب جو بد مزاجی میں میر بد دماغ سے بھی کچھ آگے ہیں بڑے مزے کی باتیں کرتے ہیں۔ ایک دن اتفاق سے ہم نے ان سے کچھ سودا خریدا اور دو روپے کا نوٹ دیا۔ انہوں نے ہمیں ایک روپیہ گلٹ کا اور کچھ آنے واپس کئے۔ گلٹ کا روپیہ ذرا کھوٹا لگا اور ہم نے کہا "حضرت اسے بدل دیجئے۔" انہوں نے روپیہ تو لے لیا اور سولہ آنے دیتے ہوئے فرمانے لگے "صاحب زادے روپیہ دیکھا ہی آج ہو گا کھوٹے کھرے کی کیا پہچان۔ لو تمہارے مقدر میں روپے نہیں پیسے ہی ہیں۔"

"محتاج اجل کیوں ہے" ایک دلچسپ مزاحیہ مضمون ہے۔ اس مضمون میں اس فلسفے کو بڑے دلچسپ انداز بیان کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ آدمی کو موت کا انتظار کرنے کے بجائے مناسب موقعے اور محل دیکھ کر سہولت اور سکون کے ساتھ خود ہی مر جانا چاہئے۔ موت کے بعد جو سہنا پڑے ... کہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں، نہ جانے کب آ دبوچے اور آپ اس وقت کس عالم میں ہوں۔ مشترکہ ... مناسب ...

بوجھ ہو کر غسل کر رہے ہوں، کسی جلسے میں تقریر کر رہے ہوں، کسی تجہیز و تکفین کے دوران پڑھ رہے ہوں. یہ تمام حالات ایسے نازک ہیں جہاں مرنا کچھ زیادہ مناسب نہیں لیکن ایسے ہی ایک موقعے کو ضمیر صاحب نے عبرت کے واسطے اس طرح بیان کیا ہے:

" یا اگر یہ نہیں تو یوں کہ آپ بس میں بیٹھے ہیں، دفتر کا فائل پاس پڑا ہے یا ایک قلب پر دباؤ ہوا، چیخنے چلانے کی بہت کوشش کی مگر فرشتۂ اجل نے اس کی بھی مہلت نہ دی. پیغام آخر سنایا اور یہ کہہ کے ہاتھ بڑھایا ۔

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے

آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں. بدن بیٹھے بیٹھے سرد ہو گیا. لیجیے صاحب قبر کی استراحت سے بھی گئے اب یونہی نوے کے زاویے پر حشر کا انتظار کیجیے. احباب کو دفنانے میں جو دقت ہوئی اس کا تو ذکر ہی کیا سر نکالا تو ٹانگیں فلک نمائی کرنے لگیں، ٹانگیں سیدھی کیں تو آپ کھڑے ہو ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے. غرض یہ کہ جان ہلکان ہو گئی ساتھ والے پریشان ہو گئے. آخر گورکن نے اشارہ پا کے بڑی کشتم کشتا کے بعد چت کیا اور سب کا پیچھا چھڑایا توبہ توبہ ہماری بات مان لیتے تو یہ دن کاہے کو دیکھنا پڑتا کم سے کم یوں مٹی خراب نہ ہوتی."

"بی عورت کی کہانی" پڑھیے تو پھر دلی کے روز و شب تر و تازہ ہو جاتے ہیں. بی صداقت زمانی ایک جیتا جاگتا کردار ہیں. ضمیر صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "بی صداقت زمانی سے ہمارا دور رپرے کا رشتہ ہے." میں سمجھتا ہوں کہ دلی کے ہر گھرانے سے کسی نہ کسی بوا صداقت زمانی کا تعلق ہے. اور ہر بوا صداقت زمانی سے اس خاندان کا دور رپرے کا رشتہ ہے اور یہ ساری بوا صداقت زمانیاں ایک دوسری سے اتنی مماثل ہیں کہ ان میں امتیاز کرنا مشکل ہے. اگر آپ کا تعارف ضمیر صاحب کی بوا صداقت زمانی سے ہو جائے تو سمجھ لیجیے کہ آپ دلی کی ہر بوا صداقت زمانی سے مل لیے. ضمیر صاحب بوا صداقت زمانی کا تعارف اس طرح کرتے ہیں:

"کوئی پچاس برس کی عمر ہو گی. سفید سر، کمر میں ہلکا سا خم، پوپلا منہ جس میں اب صرف عقل ڈاڑھیں ہی باقی بچی ہیں. چہرے پر معمولی سی جھریاں، مگر رنگ ایسا جیسے انڈے کا چھلکا. سفید سفید گال میں سرخی یوں جھلکتی ہے جیسے دودھ کی نہر میں سیندور گھلا ہو. ہاڑ کہاڑ بھی ماشاء اللہ خوب ہے. لمبے لمبے ہاتھ پاؤں، چوڑی تختہ سی کمر اور آواز کا تو کہنا ہی کیا. بس جیسے شیر کی گرج. اللہ جانے اگر ہم چیخ کر بولیں تو ان کے آگے ممیانے لگیں . . . . . کبھی چپکے چپکے غیبت کرتی ہیں تو سات گھر پرے آواز جاتی ہے یوں تو بوا صداقت میں ہزاروں خوبیاں ہیں مگر دوسروں کو برا بھلا کہنے سے انہیں بادشاہ بھی نہیں روک سکتا. خود کہا کرتی ہیں "اے بوا حلق کا حلق کس نے پکڑا ہے بات منہ تک آتی ہے تو کہی جاتی ہے. اب بھی کوئی برا مانے یا بھلا. واہ جی یہ خوب بات ہے کہ دل میں رکھو تو کینہ ور کہلاؤ منہ پر کہو تو دل آزاری کا ڈر. پیٹھ پیچھے کہو تو غیبت کا الزام. میں تو جنت میں جاؤں یا دوزخ میں کہے بغیر نہیں رہا جاتا."

"ہم ہے جاسے نوجوان" نئی اور پرانی نسل کے ٹکراؤ کی بڑی کامیاب عکاسی ہے. اس تعصب سے ہٹ کر کہ میرا تعلق بھی ضمیر صاحب والی نسل سے ہے. یہ بات پوری ذمہ داری کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ضمیر صاحب کا تجزیہ سو فیصد صحیح ہے. آج کے صنعتی دور میں زندگی گزارنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، خصوصاً اس صدی میں سماجی، سیاسی اور سائنسی ترقی اور تبدیلی کی رفتار تیز رہی ہے. اس نے پچھلی صدی کو کہیں پیچھے دھکیل دیا ہے. آج کے دور میں روزگار کم امیدوار زیادہ، اناج کم لوگ زیادہ اور ملک کم آبادی زیادہ. یہ ایک ایسی صورتحال [illegible]

پیدا ہوئے جب گلی کے چراغ جلتے تھے۔ آج کھانے کے لئے گلو یا تیل بھی خالص ملنا ممکن نہیں۔ مثنوی پہلے سے دولتی اور چوکنی اور فضا مفقود پھر بھلا ہم پچاس برس سے پہلے کیوں نہ ملک عدم کو سدھار جائیں۔ ضمیر صاحب کی زبانی نئی نسل کے نوجوانوں کی روداد سنئے اور فیصلہ کیجئے کہ ہم کہاں تک حق بجانب ہیں:

"پیدا ہوتے ہی ہمیں جو شہد چٹایا گیا وہ خالص چینی اور سکرین کا مرکب تھا بس اسی وقت سے ہماری غذا میں ملاوٹ کا رواج ہو گیا۔ آج ہماری عمر بائیس سال کی ہے اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو منوں دودھ پیا ہوگا، منوں گھی کھایا ہوگا۔ البتہ جس اصلی گھی اور دودھ کی باتیں بزرگ لوگ چٹخارے لے لے کر سناتے ہیں اس سے نہ ہم آشنا نہ ہماری زبان۔ ہیئت گریس کا بنا سو فی صدی خالص گھی کھایا اور مشین سے بنا تازہ دودھ پیا۔ اس پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ جب بھوک لگتی ہے ہم روٹی کھاتے ہیں۔ یہ روٹی کہاں سے آئی؟ امریکہ نے بھجوائی۔ یقین کیجئے جس وقت یہ خیال آتا ہے نوالہ حلق میں پھنسنے لگتا ہے۔ ہماری غیرت، حمیت، خودداری سب کچھ سفید گیہوں کی خشک روٹی میں الجھ کر رہ جاتی ہے جسے ہم پانی کے ایک گلاس سے بمشکل نگل جاتے ہیں۔ ہماری سیر تفریح کیا ہے ایک قسم کا فریب ہے جو ہم کھاتے آئے ہیں اور مسلسل کھاتے رہیں گے۔ نہ کوئی میلا نہ ٹھیلا، نہ رنگین اور پُر لطف محفلیں نہ چاندنی رات میں شغل نا و نوش، ایک لے دے کر سینما ہے جہاں دو گھڑی بیٹھ کر اپنے مردہ قلب پر زندگی کے چھینٹے دے لیتے ہیں۔ سالہا سال کی دہرائی ہوئی کہانیاں پھر دہراتے ہیں اور کسی حسین تصور کے ساتھ تیرہ و تاریک حال سے نکل کر زندگی کی ظلمت اور تیرگی میں تیرنے لگتے ہیں۔ ہمارا حلیہ دیکھئے آپ خود کہیں گے کہ ہم پر ضرور بیتا پڑی ہے۔"

اب آپ خود ہی سوچئے کہ اس پر بھی اگر کوئی یہ کہے کہ جوانی اور مانجھا ڈھیلا تو غصہ آئے گا یا نہیں؟ خیر اب ذرا ہمارے بزرگوں کے ماضی کے اوراق الٹ کر دیکھئے اور خود ہی فیصلہ کیجئے کہ وہ جو ہمیں بات بات پر ستاڑتے ہیں اس میں کہاں تک حق بجانب ہیں:

"بچپن بڑی بڑی حویلیوں میں گزرا۔ دروازے پر بندھی گائے بھینس کا دودھ پیا۔ گھر کا بلو یا گھی اور مکھن کھایا۔ پھل پھول اور میوہ جات کی کبھی کمی نہ ہوئی۔ ہم عمر دوستوں کے ساتھ کھیل کھیل کر دن بدن فربہ ہوتے گئے۔ پندرہ سال تک تو خیر بچے ہی رہے۔ اس کے بعد جوانی دیوانی نے رانڈ کا سانڈ بنا دیا۔ بڑا سا کلہ جبڑا گونج دار آواز، گینڈے کی سی گردن، سڈول اور بھرا بھرا جسم، فراخ اور کشادہ سینہ، چمک دار نشیلی آنکھیں، بھرا بھرا سا سرخ چہرہ، جدھر سے گزرے زبان حال سے جسم کے ہر ہر عضو نے شباب، مست شراب کا اعلان کیا۔ سال دو سال یونہی اینڈتے پھرے، کسی مکتب میں استاد سے تعلیم پائی اور بیس سال کے اندر اندر ایک حسین دوشیزہ کے شوہر نامدار ہو گئے۔

اول اول تو بیوی کے گرد بھنورے کی طرح منڈلاتے رہے بعد میں گھر آئے تو شوہر ہو گئے اور باہر نکلے تو دنیا بھر میں نظر بازی اور حسن نوازی کرتے پھرے۔ چاندانی کی شہر والی اور نیچے کا چت یا جادہ ہیں کہ ہمیشہ ہی نوشہ نظر آئے۔ شام ہوئی اور انہوں نے نیم گرم پانی سے غسل کر کے ایک عمدہ سا دیدہ زیب جوڑا زیب تن کیا۔ عطر منگایا جو اعطر خلوت اور سینے پر ملا۔ لیک پھویا بنا کان میں اڑسا، چوڑی دار پاجامہ اور چکن کا کرتا، شاہین سلے ستارے کی ٹوپی اور ڈھو دھری دستے کی چھڑی ہاتھ میں لی اور ننھا جسم کو تولا۔ بیوی نے چودھویں رات کی چاند پر نظر ڈالی اور مرادآبادی ڈبیہ پانوں سے بھرا بھرا لا حاضر کی اور میاں صاحب اسے ٹھلاتے ہوئے چلتے بنے۔

پہنچے، ساقنوں سے چہلیں کیں۔ شوق ہوا تو سفید سفید چینی کی پیالیوں میں کھلی چنیا بیگم کی ایک آدھ چسکی لی اور آنکھوں میں اور زیادہ کیفیت چھا گئی۔ ورنہ صرف نورنگے حقّے کے دو چار کشوں پر اکتفا کیا۔ موتیوں یا پھولوں کا گجرا لے کر ہاتھ میں لپیٹا اور قلفی یا فالودے والے کی دکان پر جا بیٹھے۔ یہاں پہلے سے بے فکرے خاصی تعداد میں موجود تھے۔ سب نے مل کر فالودے اور ملائی کی برف کا ذائقہ لوٹا۔ یہاں سے اٹھ کر کوئی کسی یار دوست کے گھر کی طرف چلا، کسی نے خانقاہ کا رُخ کیا اور کوئی پرانی چاوڑی کی جانب مڑ گیا۔"

"سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" کے موضوع پر پطرس مرحوم کا بھی ایک مضمون ہے جو اپنی جگہ بہت دلچسپ ہے۔ یہاں ضمیر صاحب سے اس کا مقابلہ کرنا مقصود نہیں۔ تاہم ایک بات پھر بھی کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ پطرس کی صبح کا لطف تو ہر وہ شخص اُٹھا سکتا ہے جو سویرے اٹھنے کا عادی ہے، یہ صبح ہر نگری اور ہر بستی میں ایک ہی سی ہوتی ہے۔ ضمیر صاحب نے جس ماحول میں سویرے سویرے آنکھ کھولی ہے، وہ ایسا ہے جس سے محظوظ ہونے کے لئے محض سویرے اٹھنے سے کام نہیں چلے گا۔ اسی لئے کہ وہ سویرا وہاں نہ ہوگا جس کا ذکر انہوں نے کیا ہے بلکہ یہاں مچھروں کا سنگیت، گلی کے کتوں کی آہ سحر گاہی اور گرمی کی شدت آپ کو آہستہ آہستہ بیدار کرے گی۔ کبھی کبھی ان بیدار کُن چیزوں میں گلی کی نالی صاف کرنے والے کی یہ صدا بھی شامل ہوگی "اے ذرا نلکا کھولنا"۔ آپ کان کھجاتے منہ بناتے اور کھرّی چارپائی پر اپنی ننگی پیٹ رگڑتے ہوئے اٹھیں گے۔ آپ سے اگلے مکان میں کوئی تان سین کا سالا راگ الاپ رہا ہوگا۔ اور آپ غنودگی میں یہ سمجھیں گے کہ شاید گلی کی مسجد میں کوئی نومسلم اذان دے رہا ہے۔ سامنے والی بیٹھک میں تین چار آدمی متواتر درقی کوٹ رہے ہیں اور عالم نیم خوابی میں اشہب یوم کی ٹاپوں کی آواز سن رہے ہیں۔ اسی اثنا میں گھر کا کوئی فرد آپ کو جھنجھوڑ کر اٹھانے کی کوشش کر رہا ہوگا۔ آپ نیم خوابی سے نکل نیم بیداری کے عالم میں داخل ہو جائیں گے۔ اس کے بعد آپ اپنے ذہن میں شیخ چلی کے خوابوں کے اس سلسلے کی کڑیاں ملائیں گے۔ جو رات بھر آپ دیکھتے رہے ہیں انہی خوابوں کی ایک کڑی یہ ہے:

"قریب جا کے جو دیکھا تو ایک فوج لڑکیوں کی آصف علی پارک میں کھچا کھچ بھری ہے۔ ہر طرح کی لڑکیاں اور عورتیں ہیں، جوان، خورد سال ادھیڑ، کالی لڑکیاں، گوری لڑکیاں، سرخ و سفید لڑکیاں، سانولی و گندمی لڑکیاں، موٹی لڑکیاں، دُبلی لڑکیاں، ٹھنگنی لڑکیاں، لمبی لڑکیاں، معصوم لڑکیاں، عیار لڑکیاں غرض جتنی قسمیں اس جنس کی ہو سکتی ہیں سبھی تو وہاں دیکھنے میں آئیں۔ سروں پر بڑے بڑے برقی لیمپ روشن جوان حسینانِ پری رو کے جمال دلفریب کو دو آتشہ کئے دیتے تھے۔ اللہ اللہ کیا منظر تھا جیسے کوہ قاف کی پریاں اندر کے اکھاڑے میں یا حوران بہشت گلزار جناں میں مصروف خرام ناز ہوں۔ کافی دیر عالم حیرت میں ہم انہیں تکتے رہے۔"

"دلّی سے دلّی تک" ایک رپورتاژ ہے اور اس حشر خیز دور کی آواز بازگشت ہے۔ جب ہندستان تقسیم ہوا تھا ہزاروں لوگ بے گھر ہو گئے۔ لاکھوں غریب الوطن ہو کر بدیس چلے گئے۔ دلّی سے بھی بہت سے لوگ گئے لیکن جن کا آب و دانہ نہیں اٹھا تھا وہ بھلا کہاں جا سکتے تھے۔ گئے بھی تو کچھ دن پریشان حالی کا شکار ہو پھر واپس دلّی آ رہے۔ کال محل نہ سہی پہاڑی بھوجلہ ہی سہی۔ دلّی تو آ گئے جو دلّی چھوڑ گئے وہ کراچی اور لاہور میں پڑے ہائے دلّی کرتے ہیں اور جو واپس آ گئے وہ ان گلی کوچوں کو یاد کرتے ہیں جن میں وہ تقسیم سے قبل آباد تھے:

"آج بھی اکثر وہ دن آنکھوں میں پھر جاتے ہیں۔ جب ہم اپنے قدیمی محلے میں رہتے تھے۔ محلّے کی عورتیں بوڑھے جوان سب ہمیں اپنے عزیزوں کی طرح پیار کرتے تھے۔ کبوتر یا گڑیوں کے شوق میں ہم جس گھر میں گھس جاتے حافظ جی کا پوتا کہہ کر گودیوں میں اٹھا لئے جاتے۔ گلی محلّے والے اس طرح پیار کرتے کہ آج عزیز و اقربا بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن وہ دن

نیرنگیِ زمانہ وہ دن اب کہاں؟ نہ جانے وہ لوگ کہاں گئے اور کس حال میں ہوں گے"۔

"انگنا کمہار" اس کتاب کا آخری مضمون ہے۔ یہ ایک خاکہ ہے جو ضمیر صاحب نے بڑی کامیابی کے ساتھ رقم کیا ہے انہوں نے خاکہ نگاری کی تمام ضروریات کو ملحوظ رکھا ہے اور یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ اس فن میں بھی کسی سے پیچھے نہیں یہ خاکہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ ان میں ایک اچھا خاکہ نگار بننے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ گمنام یا نیم معروف شخصیتوں کے خاکے لکھنے میں مصنف کو بڑی عرق ریزی کرنی پڑتی ہے۔ کیوں کہ یہاں کردار کی شخصیت کے بجائے اپنے قلم کی سحر طرازی سے کام لینا پڑتا ہے۔ جس کے ذریعہ اس کردار کو گمنامی کے اندھیرے غار سے نکال کر شہرتِ عام کے دربار میں لا کر بٹھانا ہوتا ہے۔ اگر یہ کوشش کامیاب رہے تو خاکہ بھی بے نظیر ہوتا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے بہت سے معروف لوگوں کے خاکے لکھے ہیں لیکن میرے نزدیک ان کا خاکہ "کُندن" جو ایک غیر معروف شخص سے متعلق ہے، ان کا بہترین خاکہ ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا سب سے اچھا خاکہ بھی غالباً "گدڑی کا لال نور خاں" ہی ہے۔ انگنا کمہار بھی ایک ایسے ہی گمنام شخص کا خاکہ ہے۔ جسے مصنف کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ انگنا کمہار کا حلیہ بیان کرتے ہوئے ضمیر صاحب نے جن جزئیات کو ابھارا ہے وہ بڑی مہارتِ فن کا کام ہے۔ میرا خیال ہے ان جزئیات کو سامنے رکھ کر جتنے مصور بھی انگنا کمہار کی تصویر بنائیں گے وہ سب ایک ہی جیسی ہوں گی اگر کچھ فرق ہوگا تو بس اتنا جتنا کہ ایک ہی شخص کی مختلف کیمروں سے کھینچی ہوئی تصویر میں ہو سکتا ہے۔ آپ میری بات کو مجذوب کی بڑ نہ سمجھیں اور نہ یہ ہی سمجھیں کہ میں میٹھا شاہ بڑے کی چھوڑ رہا ہوں۔ میں تو ثبوت کے ساتھ بات کرتا ہوں۔ اب تک جتنی باتیں کی ہیں ان کا بھی ثبوت بہم پہنچایا ہے اور اس بات کا بھی ثبوت حاضر ہے:

"چوڑا لمبا تِکی چہرہ، کھلی ہوئی چمکدار پیشانی، ابھرا ہوا گول مول سر جس کے چاروں طرف سفید چھدرے بالوں کی ہلکی ہلکی جھالر، قلمیں گالوں کے وسط تک، جن میں ایک مصنوعی اُریب دبا گیا تھا۔ دہانہ ذرا بڑا مگر اس کا زائد حصہ گل مچھوں نے ڈھک لیا تھا۔ جن پر سر کے بالوں کی طرح بڑھاپے کی برف گر چکی تھی۔ بڑی بڑی روشن اور چمک دار آنکھیں، ان میں کاجل کے لمبے لمبے ڈورے سرخ اور ذرا سوجے ہوئے پپوٹے سفید بھوؤں بھویں جو ناک کے اوپر ایک دوسرے سے مل گئی تھیں۔ آنکھ اور ناک کے درمیان ابھری ہوئی ہڈی کے پاس ایک بڑا سا مسّہ کوئی مٹر کے دانے برابر سیاہ رنگ کا اس میں دو چھوٹے چھوٹے سفید بال مسّے کے قریب ہی ناک کی پھُننگ پھولی پھولی بڑے بڑے کشادہ نتھنے جو ہر سانس کے ساتھ پھیلتے اور سکڑتے تھے۔ ناک کا اوپری حصہ آنکھوں کے درمیان خم آلودہ ایسا ٹیڑھا میڑھا جیسے املتاس کی پھلی دانت اگر ہوں گے تو زیادہ سے زیادہ چھ سات اور وہ بھی اتنے اندر کہ ان تک نظر کا پہنچنا محال، البتہ ہونٹ گھنی مونچھوں سے ہر وقت اپنے وجود کا اعلان کرتے تھے۔ نیلے نیلے گردے کے گردے آگے سے یوں تڑے ہوئے جیسے گرنٹے کے کنارے نچلا ہونٹ موٹا لٹکا رہتا تھا۔

چوڑا چکلا بھرا ابھرا سینہ اس پر اتنے سارے بال جیسے دیسی کمبل پر کھڑا کھڑا روآں، بدن پر اکثر گہرے رنگ کی بنڈی، دونوں طرف جیبیں لگی ہوئی ایک جیب میں ایک بڑا سا بٹوہ دوسری میں ایک چھوٹی سی کتاب، بھگود گیتا جسے ہم ان دنوں ہندوؤں کا قرآن شریف کہتے تھے۔ بازو آدھے آدھے کھلے ہوئے جو کبھی سخت، صحت مند اور سڈول رہے ہوں گے۔ کہنی کے چوڑ غدیاں، چھوٹی چھوٹی چوڑی کلائیاں، انگلیاں اوپر سے کالی اندر سے سفید، کچھ کچھ پیلا ہٹ لئے ہوئی، ہتھیلی کی کھال ایسی جیسے بھینس کی چمڑی، ٹانگوں میں ایک میلی سی دھوتی گھٹنوں سے ذرا نیچی، پیچھے سے اڑسی ہوئی جہاں دھوتی اُڑسی جاتی وہاں کمر میں خاصی گہری نالی سی کھنچی ہوئی پنڈلیاں نالا میں بچپنے کے غم جھنا باؤ دہلی اچھلنے کے باعث پٹھے ہوں گے، کمال جیسے پیر، انگلیاں

(باقی ص ۳۰ پر)

بقیہ ادبی مسائل (بسلسلہ صفحہ ۱۵)

مثلاً کون نہیں جانتا کہ غزل کی صنف کو مردود و مسترد کرانے اور آزاد نظم کو مقبول عام بنانے کے لئے غیر معمولی تنقیدی جتھے بندی اور منظم پلیٹ فارم سے کام لیا گیا، لیکن غزل سے اس کا مقام کوئی نہ چھین سکا اور آزاد نظم بلکہ خود نظم ــــ (اور میں دونوں کے مداحوں میں ہوں) اب صرف حوالے کے کام آتی ہے۔ اب ن۔م۔ راشد بلکہ میراجی کی اچھی نظمیں بھی محض حوالے کے طور پر یاد ہیں۔ عوام بلکہ خواص کو بھی اس طرح بہت کم یاد ہوں گی کہ فرفر پڑھتے چلے جائیں۔ جیسے مثلاً مسدس حالی اور شکوہ جواب شکوہ کو لوگ پڑھا کرتے تھے۔ بلکہ اب تک پڑھتے ہیں۔ ترقی پسندی کے دور میں افسانہ بہت مقبول ہوا۔ مگر جونہی وقتی موضوعات ختم ہوئے افسانہ یا تو زیر زمین (نفسیاتی)، داخلیت کی الجھنوں میں پھنس گیا یا اب پڑھو تو کوئی بات دل کو نہیں لگتی ــــ ادھر ناول پھر ابھرا۔ اس کا باعث یہ کہ معاشی اور معاشرتی تبدیلیوں کے علاوہ، افسانے کے ارتقاء کی اگلی منزل بڑا ریاض چاہتی تھی۔ رومانی افسانے کے بعد حقیقت نگاری تو آگئی۔ مگر اس سے آگے فلسفیانہ کہانیوں کا مرحلہ تھا، اس کے لئے کوئی محنت نہ کر سکا۔ محض جبری تبدیلی کے نعرے سے تو یہ کام نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ ناول، ہماری روایتوں کے زیادہ قریب ہے۔ اس کا تعلق یا اس کی ایک مماثلت (یعنی طوالت) اسے داستانوں کا ہم رنگ بناتی ہے (جو ملک کے ذوق کے مطابق ہے) میں ملک کے ذوق اور معاشرے کے مزاج اصلی پر اس لئے زور دے رہا ہوں کہ انتہا پسند طبیعتیں اس کو نظر انداز کر کے فوری تبدیلیوں کی متمنی ہیں ــــ اور وہ بھی محض اس دلیل کے سہارے کہ یورپ یا امریکہ یا روس میں ایسا ہوتا ہے اور چونکہ وہ ملک بہت بڑے ملک ہیں اور تہذیب کے مرکز ہیں اس لئے ان کی ہر چال بانکی اور ان کی ہر ادا دل فریب ہے۔ مگر میں کہتا ہوں۔ یہ دلیل نہیں چلے گی۔ ملکی مزاج اور روایت سے نفرت نہیں ہونی چاہئے۔ پھر تازگی اور جدت کے آرزو مند رہنے میں بڑی بات ہے۔ انہی روایتوں کے اندر سے ملکی مزاج کے مطابق اصناف ابھریں گی اور ادب میں تازہ بہار آجائے گی۔

انہی جبری تبدیلیوں میں سانیٹ کا ظہور تھا۔ یہ نوع نظم اگرچہ خاصی مانوس ہے، پھر بھی مقبول نہ ہو سکی۔ اختر اور چند شاعروں کے سوا اس کو کوئی اپنا نہ سکا، نہ مقبول بنا سکا۔ وجہ کیا؟ وجہ وہی جس کا تفصیلی ذکر کر چکا ہوں۔ اسی طرح ڈرامے کا مسئلہ ہے ــــ میں خود ڈرامے کے عشاق میں سے ہوں، اور اکثر ڈرامے کی ترقی کی آرزو کرتا رہتا ہوں ــــ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آغا حشر کے کھیلوں کے بعد کہ وہ بھی تجارت کے گھر سے ابھرنے والا ڈرامہ تھا ہمارے ملک میں، اس فن کو وہ زوال ہوا کہ گفتنی بھی ہے اور نگفتنی بھی! انارکلی ایک عمدہ ڈراما ہے، مگر مزاجوں میں کچھ نہ کچھ یہ کھٹک سی ہے کہ یہ اسٹیج کے لائق نہیں۔ اور اگرچہ بار بار قطع و برید کے بعد اسٹیج بھی ہو چکا پھر بھی لوگ مطمئن نہیں۔ اب لے دے کر ایکانکی پر گزارا ہے۔ اور لکھنے والے محنت سے لکھتے ہیں۔ اور ان کی کوشش قابل ستائش بھی ہے۔ مگر ایکانکی مکمل بھرپور ڈرامے کا قائم مقام کہاں؟ اس لئے شکایت برابر جاری ہے کہ اردو میں ڈراما نہیں) زیادہ بڑھے تو یہ طعنہ دے دیا کہ مسلمان قوم ہی بدمذاق ہے! صاحب! جس قوم میں ڈراما نہیں وہ بھی کوئی قوم ہے، اور وہ بھی کوئی تہذیب ہے۔

یہ سب بجا و تسلیم۔ مگر آپ ہی فرمایئے کہ تعلیم جدید اور تہذیب مغرب کی سب شرطیں پورا کر چکنے کے بعد ڈراما کیوں پیدا نہیں ہوتا۔ ڈرامے کو پسند تو سب کرتے ہیں مگر پیدا کوئی نہیں کرتا!

سبب اس کا کیا؟ سبب یہی کہ ڈراما ہمارے معاشرتی مزاج کی فطری امنگ کا درجہ نہیں رکھتا۔ ہمارا تہذیبی مزاج (جو تخلیقی بھی ہے) نقالی کی اس قسم سے تسکین حاصل نہیں کرتا۔ ڈرامے کی نقالی، شاعری کی نقالی سے مختلف نوعیت کی ہے۔ شاعری میں تخیل، زندگی کی وسیع تر بوقلمونیوں اور رنگا رنگیوں کی مصوری کرتا ہے، ہمارا تصور اپنے آپ سے اوپر، اور بلند تر مرحلوں کی جانب بڑھتا ہے، ہر وہ قدم یا ہر وہ عمل جو خدا کی ارفعیت کی نشاندہی کرے، اس کی لاانتہائیت کا اشارہ مہیا کرے، خدا کی بے کرانی اور وسعت کا سمت نما ہو، مسلمانی تہذیب اسی میں فرحت محسوس کرتی ہے۔ شاعری اور تعمیر کے فنون یہ کرتے ہیں ــــ ڈراما یہ نہیں کرتا۔

میں افلاطون کی دلیلوں کو دہرانا نہیں چاہتا۔ میری دلیلیں اپنی ہیں۔ ڈرامے میں مسلم معاشرے کی اختراعی امنگ اس لئے بھی تسکین نہیں پاتی

کہ یہ ایک عام واقعہ کی نقل ہے۔ واقعات دنیا میں ہوتے رہتے ہیں۔ مسلمانی تہذیب اس معمولی کی اس تکرار سے خوش نہیں ہوتی۔ ڈرامے کا شاہکار المیہ واقعات سے مرتب ہوتا ہے۔ ڈرامے میں جو المیے پیش کئے جاتے ہیں، ان سے سنگین تر اور المناک تر حقیقتیں ہمارے ارد گرد ہر روز رونما پذیر ہوتی رہتی ہیں اور اگر کوئی شخص دردمندی سے دنیا میں چلے تو اصل زندگی، افسانے اور ڈرامے سے زیادہ حقیقی ہوتی ہے۔ اور یہ زیادہ غور کے قابل — اور زیادہ عبرت انگیز — !

ارسطو نے "CATHARSIS" پر زور دیا ہے۔ مگر کتنے ڈراما بین یا فلم دیکھنے والے ہیں جو اصلاح کی غرض سے یا جذبات کی ہمواری و اعتدال یا دردمندی کی غرض سے تماشا دیکھتے ہیں یا اس سے متاثر ہو کر نیک بن جاتے ہیں، ایک فی صد بھی نہیں!

یہ تو اصلاً ایک تفریح ہے۔ البتہ طبعاً، اس میں کچھ اصلاح کا پہلو نکلتا ہوگا۔ مگر مسلمانوں کی تفریحات اور طرح کی ہوتی ہیں۔ غرض یہ کہ مسلمانوں نے بے ذوقی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے مخصوص فکر اور سنجیدہ حقائق شناسی کی وجہ سے ڈرامے سے اعراض برتا ہے — اور اب جبکہ کچھ اخلاف اس کو بزرگوں کا عیب خیال کر کے، اسلاف کی اس کمی کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو کر نہیں سکتے۔ حالانکہ سب اسباب مہیا ہیں۔ پھر اپنی کوتاہی کے لئے عذرات تلاش کرتے ہیں۔ مثلاً سوسائٹی میں پردہ ہے، لڑکیاں سامنے نہیں آتیں، وغیرہ وغیرہ — حالانکہ اب سوسائٹی میں پردہ خال خال ہے، سینکڑوں لڑکیاں اسکول اور کالجوں میں اس فن کی تربیت پا رہی ہیں، اور بفراغ خاطر، ہر کام میں حصہ لے رہی ہیں۔ پھر بھی ڈراما وجود میں نہیں آتا۔ تو یہ سب سوچنے کی بات ہے اور قصہ اصل میں وہی ہے کہ یہ فن ہمارے ہیں نہیں محض سیکھے ہوئے ہیں۔ ہم ان میں جتنا کمال بھی پیدا کر لیں گے اپنے استادوں سے آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔

ایک صاحب نے اس سلسلے میں بڑا انکشاف کیا ہے کہ چونکہ اُردو کے استاد، فورٹ ولیم کالج کی پیدا کردہ اصناف پڑھاتے ہیں اس لئے ہمارے ادب میں ڈراما پیدا نہیں ہوتا! خوب فرمایا!

اس منطق کے تقضیئے تو وہ خود ہی بنائیں — مگر بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج نے کون سی اصناف پیدا کی ہیں؟ جہاں تک میں جانتا ہوں فورٹ ولیم کالج میں زیادہ تر، داستانیں لکھی گئی ہیں، اور آج کل داستانیں کہاں ہیں؟ ناول نے اس کی جگہ لے لی ہے یا پھر تذکرے لکھے گئے، کچھ ترجمے ہوئے — اور یہ بھی پرانی اصنافِ ادب سے متعلق ہیں جن کو دانایانِ فرنگ نے اس لئے انتخاب کیا کہ یہی ملکی مزاج کے مطابق تھے، تبدیلی صرف یہ کی کہ اسلوب کا تکلف ترک کر دیا —!

فورٹ ولیم کالج کے بعد صدہا کتابیں، نئے انداز کے مطابق اور نئے موضوعات پر لکھی گئیں — ان کے حوالے کی ضرورت نہیں۔ مگر فورٹ ولیم کالج کا طعنہ دینے والے دوست ابھی اسی خیال میں ہیں کہ لوگ فورٹ ولیم پڑھ رہے ہیں — اس لئے اُردو میں ڈراما پیدا نہیں ہوتا۔ اگرچہ یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ فورٹ ولیم کالج کی کتاب باغ و بہار اگر کسی نصاب میں آجائے تو مضائقہ کیا ہے؟ آخر انگریزی کے نصابوں میں بھی تو کلاسیکی حصہ غالب ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ فورٹ ولیم کا قصہ تو صرف پردہ داری ہے۔ مقصد دیگر ہے جس کا ذکر چھپا کر کیا ہے — صاف نہیں کیا۔ کھلا کہ پریشانی پاکستان میں روایتوں کے محکم ہونے کی وجہ سے ہے اور یہ بات ان کے لئے تکلیف دہ ہے (واضح رہے کہ میرا اشارہ کسی خاص گروپ یا کسی خاص ادبی ترقی کی طرف نہیں، میں نظریے کی بات کر رہا ہوں) تو قصہ اصل میں روایت کی سخت جانی کا ہے جس کا غم کھائے جا رہا ہے۔

ایک صاحب نے تو یہ بھی اعلان کر دیا کہ مسلمانی تہذیب مر چکی ہے — لہٰذا مسلمان تہذیب کی وہ اصناف اور روایات سب بیکار اور متروک ہو گئیں۔ اب تو زمانے کو ان صفات کی ضرورت ہے جو جدید بین الاقوامی تہذیب یا جدید علاقائی معاشرتوں سے ہم آہنگ ہوں — جدید بین الاقوامی تہذیب کا ذکر تو تھوڑی دیر بعد آئے گا۔ پہلے اس علاقائی تہذیب کا تجزیہ کر لینا مناسب ہوگا، جس کا ذکر اکثر ہوتا رہتا ہے۔ پاکستان کی علاقائی تہذیب کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا جا رہا ہے گویا یہ اس مسلمان تہذیب کی کوئی مخالف شکل ہے جو مسلمانی عناصر سے برسرپیکار رہی اور اب جبکہ مسلمانی عناصر مر چکے ہیں اس لئے اس کے

دوبارہ ابھر [illegible] آگئے۔

تاریخی نقطۂ نظر کی رُو سے یہ غلط ہے۔ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ علاقائی معاشرتیں، الگ معاشرتیں نہیں تھیں۔ مسلمانی تہذیب نے ہمیشہ اصول انتخاب سے کام لیا۔ زمین اور علاقے کے مواد سے فائدہ اٹھایا۔ اس کے جو عناصر، تہذیب کے اساسی افکار کے خلاف تھے، ان کو مٹا دیا۔ جو عناصر ہم رنگ یا بے ضرر تھے، اُن پر اپنی مُہر لگادی۔ اور جاری رہنے دیا۔ اسی وجہ سے مسلمان ملکوں میں وضع و اطوار کی رنگا رنگی ہے۔ مغربی تہذیب جابرانہ اور نظریاتی غیر رواداری تہذیب ہے اور خارجی یک رنگی اور یکسانی پر زور دیتی ہے۔ چنانچہ وضع و اطوار کی یک رنگی کے معاملے میں ان کے یہاں انتہائی جبر ہے (میں اس کو تشدد خیال کرتا ہوں)

غرض علاقائی معاشرت نئی اصطلاح ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے تو ہم نے کبھی یہ لفظ نہیں سنا۔ مگر یہاں بات ادب کی ہو رہی ہے۔ ادب میں فارسی، اُردو کے علاوہ پنجابی، سندھی، پشتو وغیرہ میں شاعری ہوئی۔ اب بھی ہو رہی ہے۔ ان ادبوں کی اگر کچھ اصناف ایسی ہیں جو اُردو میں جذب ہو سکتی ہیں تو اس کی کوئی ممانعت نہیں۔ رفیق خاور نے ہیر کا منظوم اُردو ترجمہ پنجابی بحر میں کیا ہے۔ کسی نے اسے نہیں ٹوکا۔ اگر آئندہ بھی کوئی ایسے نمونے اردو میں داخل کرے گا تو ملک اس کا خیر مقدم کرے گا۔ اس کے ہوتے ہوئے یہ پراپگنڈا کہ اردو والے (فورٹ ولیم کالج کے زیر اثر۔ او رخدا معلوم اس کا مطلب کیا ہے؟) علاقائی اصناف کو اپنانے نہیں، سخت زیادتی ہے۔ علاقائی ادبوں کے بارے میں بھی یہ غلط فہمی ہے کہ ان کی تخلیق میں محض علاقے کی منفرد (GENIUS) نے حصہ لیا۔ اور یہ بین الاقوامی اسلامی ادبوں سے مطلقاً جدا چیز ہے۔ تطویل کا موقع نہیں۔ علاقوں سے منسوب بزرگان کرام کی تخلیقات، بین الاقوامی اسلامی ادب کا حصہ ہیں۔ ان میں وحدت و دعمل کے عناصر چھائے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کبھی علاقوں کے نقطۂ نظر سے سوچا ہی نہیں۔

میں ادب کو ایک تغیر پذیر حقیقت جانتا ہوں۔ اس لئے مجھے ذاتی طور پر اس آرزو پر کوئی اعتراض نہیں کہ نئی اصناف وجود میں آئیں — اور لوگ نئے ذوق سے آراستہ ہوں۔ اور یہ ہوتا بھی رہا ہے۔ مگر جبری عمل تو — یہ نہیں کہ کسی کے حکم سے فوراً ہو جائے۔ یہ تو اسی قانون کے تابع ہے جس کا میں ذکر کر آیا ہوں۔ یعنی یہ کہ زندگی، اصولاً تدریجی ترقی اور ارتقا کی پابند ہے۔ انقلابی جبر ہو سکتا ہے مگر وہ زندگی پر تشدد ہے جس کا ردعمل، اس رجعت پسندی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، جو یقیناً خوش آئند اور اچھا نہیں ہوتا۔!

دراصل یہ ساری گھن گرج اس لئے ہے کہ ہم ایک ایسی بات مان لیں جو مانی نہیں جا سکتی — یعنی یہ خیال کہ پاکستان میں فوراً وہ سب کچھ نظر آنے لگے۔ جو امریکہ یورپ یا روس میں نظر آرہا ہے۔ فوراً مگر اس انقلاب خیال کے لئے یہ طعنہ یا یہ دھمکی تو ہوتی نہیں کہ پرانا معاشرہ مر گیا ہے۔ پرانی تہذیب مر گئی ہے! — اجی صاحب! آپ کو یہ مغالطہ ہے کہ پرانی تہذیب مر گئی ہے یا پرانا معاشرہ مر چکا ہے! اگر اس کا الزامی جواب دوں تو کہہ دوں کہ مغرب کی تہذیب تو جنگ عظیم دوم میں خود برباد ہو چکی ہے۔ اگرچہ اس کی موت کی بشارت نطشہ نے، اور اس کے بعد شپنگلر نے پہلے ہی دے دی تھی۔ غرض یورپ دوسری جنگ عظیم میں مر چکا اور ہم ابھی تک اس کے بچے کھچے کھنڈروں کے ستائش گر ہیں۔ باقی رہا امریکہ اور روس — سو دونوں نیم جان ہیں اور اضطراب موت میں عقائد کی نمائش کر کر کے لوگوں کو اپنا طرفدار بنا رہے ہیں اور مخاصمت باہمی اور مخاصمت باہمی کے ناقابل فہم اصول کے باعث دنیا کے لئے مصائب بنے ہیں اور عذاب بھی۔ فقط ان نمائش گروں کے ظاہری جلوے پر نہ جائیے۔ اپنے ہی معاشرے سے مل کر دیکھئے۔ اور یاد رہے کہ صرف چند تعلیم یافتہ افراد کو قوم نہ سمجھ بیٹھئے — دیہاتوں میں گھوم جائیے۔ آپ کو ہر جگہ مسلمان قوم بحمد اللہ زندہ نظر آئے گی!

میری یہ گفتگو بظاہر معاندانہ ہے اور اس میں میرے قارئین کو تعجب ہوگا۔ کیونکہ میں ملائم لفظوں کا آدمی ہوں، محبت کا پرستار اور محبت سے بات کہنے کا عادی۔ لیکن —

کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں لیوے نہ کوئی نام ستم گر کہے بغیر

بہر حال میں ذہن نشین یہ کرانا چاہتا ہوں کہ پاکستان جس تہذیب کا مدعی ہے وہ موجود ہے، زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ میں اس تہذیب کی ظاہری تبدیلیوں کا منکر بھی نہیں ہوں اور ان میں سے بعض کو برا بھی نہیں سمجھتا۔ لیکن تہذیب اس ظاہر کا نام نہیں۔ تہذیب ان چند بنیادی افکار سے عبارت ہے جو تہذیب کے اندر بمنزلہ روح کام کرتے ہیں، پاکستان کی تہذیب (جو کثیر آبادی کی زندگیوں اور عقیدوں میں موجود ہے) اپنی اقدار رکھتی ہے۔ اور وہ ایسی اقدار ہیں جن کی عزت و تکریم اور جن کا احترام ہر وقت ہر شخص کے دل میں موجود ہے۔

دینی عقیدوں کی بات الگ ہے۔ اس تہذیب کے افکار میں خدا کی خدائی اور انسان کی انسانیت کا اب بھی گہرا اعتقاد ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ جو قوم عالم میں خدا پر اور زمین پر انسان اور اس کے شرف پر اعتقاد رکھتی ہے وہ دنیا کی سب سے مہذب قوم ہے۔ دنیا میں اور قومیں بھی مہذب ہوں گی لیکن جو قوم سچے دل سے خدا اور انسان کو عملاً اور عقیدتاً مانتی ہے اس سے برتر قوم دنیا میں کوئی نہیں۔ اور مسلمان قوم بھی شریف اور مہذب اقوام میں سے ہے۔ اس میں کمزوریاں ہوں گی مگر کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں؟

غرض ادب میں "جبری" تبدیلیوں کا مسئلہ دراصل اپنی معاشرت سے بیزاری کے مسئلے سے وابستہ ہو گیا ہے اور اس کا اظہار ہمارے ادب میں بڑی دیر سے ہو رہا ہے۔ سرسید کی بات چھوڑیئے وہ تو ایک دوسرے ارادے سے ملامت کرتے تھے، رومانی دور کے بعض غیر معتدل رویے اس بیزاری کے شدید مبلغ رہے ہیں۔ نیاز فتح پوری (جن کا تنقید ادب میں مقام مسلّم ہے) اپنی معاشرت کے سب سے بڑے معترض تھے۔ ترقی پسندی کے زمانے میں قریباً سبھی ادیبوں نے حقیقت نگاری کا زور اپنے معاشرے کی تنقیص پر صرف کیا۔ اس میں منٹو اور عصمت چغتائی کے قلم سے تو وہ زہر ٹپکا کہ آج تک فضا سم آلود ہے۔

اپنی معاشرت سے بیزاری کا سب سے بڑا مظاہرہ بعض آزاد نظم لکھنے والوں نے کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ پچھلی معاشرت مر چکی ہے۔ اب اس کی جگہ نئی معاشرت نے لے لی ہے اور اس نئی معاشرت کی سب سے بڑی ادبی صنف آزاد نظم۔ اور آزاد تسلسل ہے۔ اور چونکہ معاشرے میں ابھی تضادات باقی ہیں اس لئے شاعری کی زبان بھی اپنی ہے اور رمز کے بغیر شاعر اپنی بات کہہ نہیں سکتا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اب زمانہ صرف آزاد نظم کا ہے۔

آزاد نظم لکھنے والوں میں بعض اہم اور قابل قدر شخصیتیں بھی ہیں، مگر ایک طبقہ اس اعلان کے ساتھ آزاد نظم لکھ رہا ہے کہ وہ پرانے طور طریقوں سے الگ ہے۔ وہ دھرتی میں اعتقاد رکھتا ہے اور پرانے بہت ہی پرانے دیوتاؤں اور دیویوں اور بزرگوں کو اپنا مقتدا اور اپنے لئے سرچشمۂ فیض سمجھتا ہے۔ اس میں وشنو، شیو، کرشن، بدھ اور نانک سر فہرست ہیں۔ پھر ان بے نام رشیوں منیوں کی عقیدت بھی ظاہر ہوتی رہتی ہے جو ہڑپا اور موہنجوڈارو سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے نام تاریخ میں افسوس ہے کہ محفوظ نہیں۔

یہ مذہب میرا جی سے شروع ہوا پھر اس کے بعد آگے بڑھتا ہوا آج کی آزاد نظم تک پہنچا۔ اس سرگذشت کو پڑھ کر جو کچھ کوئی سوچ سکتا ہے کم از کم ادب کے میلانات کا اندازہ لگانا تو مشکل نہیں اور یہ سمجھنا بھی مشکل نہیں کہ اس ملک میں ادب کے نام سے قوم کی کیا خدمت ہو رہی ہے۔

ادب میں نئی ہیئتیں اور نئی اصناف ممنوع نہیں، مگر ان کو وجود میں لانے کے لئے سچے احساس اور ضمیر داری کی ضرورت ہے۔ مغرب کی اصناف کی نقل کرنا بھی کوئی عیب کی بات نہیں۔ بشرطیکہ نقل کرنے والے اس کی روح تک پہنچ کر مستعار مواد کو اپنے مزاج میں جذب کر سکیں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ ساری پاکستانی قوم جب تک بین الاقوامی ذہن کی (یعنی امریکی اور روسی) نہ ہو جائے اس وقت تک نئی ہیئتیں پیدا ہی نہیں ہو سکتیں۔ انتظار میں وقت گنوانے کی بجائے اپنی ہی تہذیب سے دل لگانا چاہئے۔ اور تسلسل کے قانون کے تحت تبدیلیوں کے عمل سے امید کے باغ کو (بشرطیکہ آپ اس کو بھی مانتے ہوں) [illegible]

تہذیب کا مسئلہ چونکہ بہت ہی [illegible] رہے کہ ہماری تنقیدی تحریروں کے ایک بہت بڑے حصے میں، تہذیب کے وہ معنی نہیں جو ہمارے آج کے

ذہن میں ہیں۔ ان تحریروں میں، تہذیب میں، ماضی کا وہ سرمایہ غالب ہے جو موہنجوڈارو کی سطح تک ہمارے یہاں موجود تھا۔ رعایتاً کبھی کبھی اسلامی دور کا بھی ذکر آجاتا ہے۔ تاریخی لحاظ سے تو یہ بات غلط نہیں اور اس کو جزوی طور پر اپنی تاریخ مان لینے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ پھر بھی سوال قابل بحث ہے!

ہم اگر پاکستان میں نہ ہوتے تو اس نظریے کو بلا تکلف تسلیم کر لیتے۔ لیکن پاکستانی جدوجہد اور اس کے تاریخی حقائق کے پیش نظر یہ نظریہ تسلیم کرنے میں کچھ دشواریاں ہیں۔ کیا اس کا مطلب یہ بھی ہو سکے گا کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان، قدیم آریاؤں اور ان کے رشیوں، منیوں کو اپنا پیشوا ماننے میں اب حق بجانب ہوں گے؟ جس طرح ہم اپنا سلسلہ کنیعض قدیم ترین تہذیبوں سے ملانے لگے ہیں۔ اور ان سے روحانی اور جذباتی رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی کیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ سب روشن ہے،

تہذیب کے متعلق یہ زاویۂ نظر، بڑے خطرناک نتائج کا حامل ہے اور پاکستان کے نقطۂ نظر سے (نیز ہندوستانی مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے) اس سے زیادہ افتراق انگیز چیز کوئی ہو نہیں سکتی کہ اپنی قومیت کو قدیم تہذیبوں اور ان سے تعلق رکھنے والی آبادیوں کے اندر مدغم کر دیا جائے۔

اس ملک کی تاریخ کا اہم ترین واقعہ یہ ہے کہ اس میں ایک قوم، ایک نیا دین لے کر آئی۔ اس قوم نے اپنے دین کی قدروں کو جبر سے نافذ نہیں کیا لیکن یہ ضرور اعلان کیا کہ ان قدروں نے اگلی تمام تہذیبوں کو منسوخ کر دیا۔ اس ملک کے کچھ لوگوں نے اس تہذیب کو قبول کیا، کچھ نے نہیں کیا، مگر یہ واقعہ ہے کہ اس ملک کی نئی تہذیب نے پچھلی سب عقیدتوں کے بدلے اپنی قدروں کی عقیدت پیدا کی۔ اور یہی اب پاکستان کی تہذیب ہے۔

پاکستانی تہذیب کے قبل از اسلام والے حصے کی عقیدت پیدا کرنے والا ادب، اردو اور علاقائی زبانوں میں پیدا کیا جا رہا ہے۔ جدید ترین نظم کا بڑا حصہ اس تبلیغ کے لئے وقف ہے۔ رسالوں، اخباروں اور ماہناموں میں اس تہذیب کے ساتھ اس نئے ادب کے رشتے جوڑے جا رہے ہیں۔ اور حالات کا یہ پہلو قابلِ توجہ ہے!

یاد رہے کہ اس نئے ادب کا اپنا خاص علم الکلام ہے، قدیم ادب اور قدیم معاشرہ کی ہجو اس کا موضوع خاص ہے۔ افسانے، ناول، ڈرامے، اس تحریک کا جزو اعظم ہیں۔ یہ عوامی سطح پر ہے۔ تعلیم یافتہ طبقے کی سطح پر بحثوں کا انداز علمی رکھا جاتا ہے۔ اور مغربی فکر کے نت نئے بدلتے ہوئے خیالات کی مدد سے، اپنے موقف کو بنایا جاتا ہے۔ اور چونکہ ہمارے ملک میں مطالعہ کی عادت کم ہے اس لئے تعلیم یافتہ طبقے کا حساس حصہ بھی، اس استدلال سے مرعوب ہو جاتا ہے۔ اور بے عیب سمجھ کر اس استدلال کو قبول کرتا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں دھرتی کا نظریہ ایک نئے روپ میں سامنے آیا ہے۔ بظاہر اس میں کوئی عیب نظر نہیں آتا۔ مگر اس میں پیچ یہ ہے کہ معصوم محبت کے راستے سے ہمیں علاقائیت اور خطوں کی محبت تک پہنچایا جاتا ہے۔ یہ سب وہ خیالات ہیں جن کا منتہا، ان عقیدتوں کو کمزور کرنا ہے جن پر ہماری قومی زندگی کی اساس استوار ہے۔

آخر میں وضاحت کی خاطر میں پھر عرض کروں گا کہ ادب میں جدت اور تازگی کا سوال بالکل زیر بحث نہیں۔ ادب میں جدت مسلّم ہے مگر اس کے لئے بیا ضت ہونی چاہئے۔ مجھے اس طرز فکر اور طرز احساس سے بحث ہے جو بڑی ہنر وری سے ادب میں عام کیا جا رہا ہے۔ میرے نزدیک ہر صنف ٹھیک ہے بشرطیکہ اس میں فکر کی روح درست ہو، اس میں ضمیر کی آواز ہو۔ ادب کو ہر حال میں قلبِ انسانی کے ساتھ چلنا چاہئے۔ اور صحیح ادب، قلب انسانی کے ساتھ چلتا ہے مگر جھگڑا صرف دو باتوں کا ہے۔ ایک تو ادب میں جبری تبدیلی کی دھمکی اور دوسرا، ادب اور ادیب کے منصب کا۔ ترقی پسند تحریک جب شباب پر تھی تو اس کے ہمراہ میراجی کی منفعل اور مجہول داخلیت بھی چل رہی تھی۔

اس میں ذکر کے قابل بات یہ ہے کہ اکثر ادیب اس دور میں، میراجی کے اس لئے مداح ہو گئے تھے کہ وہ ایک طرف دھرتی پوجا اور روشنو پرستی کے پرچارک تھے اور دوسری طرف جنس پرستی کے ایسے رویے کے مبلغ تھے جس کو کسی طرح صحت مند نہیں کہا جا سکتا۔ یہ دونوں باتیں قوم کے مسلّم اخلاقی مزاج سے ٹکراتی تھیں اور ترقی پسندی کے صحیح نظریے سے بھی ٹکراتی تھیں۔ مگر نقادوں کے ایک گروہ نے میراجی کو بھی ملکی روایتوں پر پرورش کرنے میں شریک سمجھ کر ان کی حوصلہ افزائی کی۔

(باقی صفحہ پر)

(بقیہ ادب اور علوم (سلسلہ صفحہ ۸)

اور بدھ مت ادیبوں کے مواد کا اہم حصہ ہو گئے ہیں اور وہ مذہبی روایات اور رسمیں جو عوام میں رائج تھیں۔ اور عیسائیت کے متضاد تھیں ادیبوں کے عقائد میں شامل ہو کر ان کو نئے اشارے دے رہی ہیں۔ مذہبی عقائد کی روشنی اس وقت ادب کو روشن کر رہی ہے۔

بہرحال ادب اور علم کا تعلق چاہے وہ کسی وقت کسی مخصوص علم سے ہو یا آفاقی علم سے ہو ایک حد تک لازمی چیز ہے۔ بغیر علم کے گودے کے ادب محض چھلکا ہی چھلکا رہ جاتا ہے۔ علم ادبی تصورات کو خیال کی مستحکم بنیاد پر ایستادہ کرتا ہے اور محض تخیلی کھیل کو آفاقی قدروں کا وسیع کھیل بنا دیتا ہے۔ محض سنسنی خیز اور محض فرضی چیزیں پرمغز اور پُرمعنی ہو جاتی ہیں۔ مثلاً شیکسپیر کا ہیملٹ ایک پریشان شاہزادہ ہی نہیں ہے جو اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ بلکہ انسانی ذہن کی اس کشمکش کا بھی عالم ہے جو علم کی زیادتی اور عمل کی کمی سے ظہور میں آتی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ ہیملٹ ادبی تخلیق کے بجائے فلسفی خیال ہے۔ اصل میں تو شیکسپیر کے ڈرامہ دیکھنے والے ایک سنسنی خیز انتقام کی تصویر دیکھنا چاہتے تھے۔ اور شیکسپیر نے ان کی محض سطحی دلچسپی کا سامان مہیا کر دیا۔ مگر اس کے گہرے علم نے ایک سطحی چیز ہی میں وہ وقعت پیدا کر دی کہ ماہر نفسیات اسے بڑے گہرے معلومات کا انکشاف سمجھتے ہیں۔ علمی بنیاد ہی پست ادب کو اعلیٰ بنا دیتی ہے اور صاحبان ذوق کے لئے سرمایہ دلچسپی بہم پہونچاتی ہے۔ جدید دور کے اشاریاتی ادب کو اس کی بہترین مثال کہا جا سکتا ہے۔ پروست کی عظیم ناول کے پس منظر میں برگساں کا فلسفۂ زمان ایک ایسے کرشمہ کی طرح موجود ہے جو کائنات کی دلچسپ اور آفاقی حقیقت ہے۔

ورڈسورتھ نے شاعری کو وہ پرجذبات اظہار بتایا تھا جو ہر علم کے چہرے کی زینت ہے۔ اصل میں شاعر یا ادیب کا عالم ہونا ضروری ہے کم از کم اپنے تجربے کے دائرے کی چیزوں کا علم اگر اسے نہیں ہو گا تو اس کا کلام پست ہی رہ جائے گا۔ ہمارے یہاں شاعر کو جاہل اور جھوٹا ہی سمجھا جاتا رہا۔ آتش نے کہا تھا

آتش برا نہ مانیو حق حق جو پوچھیو　　شاعر ہیں ہم دروغ ہمارا کلام ہے

اور جب اقبال ایسا شاعر ظہور میں آیا تو اس کو فلسفی کہا گیا۔ اور اب بھی زیادہ تر ان کے فلسفہ ہی پر زور دیا جاتا ہے۔ اصل میں وہ شاعر ہیں اور شاعر ہی ہیں۔ وہ شرق اور غرب کے تمام علوم سے واقف ہیں۔ مگر ان کا کام ان علوم میں وہ روشنی پیدا کر دینا ہے جو اس کے جذباتی پہلو کو سامنے لا کر انہیں پڑھنے والوں کے دلوں تک پہونچا دے۔ ان کی مخصوص قابلیت یہ ہے کہ وہ ہر علم کے چہرہ کو زینت بخش دیتے ہیں۔ ان کے شعر ہمیں آفاق کی گہرائیوں اور اونچائیوں میں لے جاتے ہیں۔ اور پھر بھی شعر رہتے ہیں۔ وہ عقل کو فلسفیوں کے حوالے کر کے محض جذبات پرست اور جذبات کے اظہار کرنے والے نہیں رہ جاتے وہ جانتے ہیں اور ہمیں محسوس کرا دیتے ہیں کہ

عقل خود بیں دگر و عقل خدا بیں دگر ست　　بال بلبل دگر و پنجہ شاہیں دگر ست

ان کی نگاہ تمام علوم پر تنقیدی ہے مگر ہر علم کی روح کو نکال کر وہ ایسے الفاظ کا جامہ پہنا دیتے ہیں جو ہمیں اپنے راگ سے اسی طرح لے اڑتے ہیں جیسے کوئی ہوائی جہاز اپنے اڈے سے پرواز کرے۔ شاعری علم میں ایک روح پھونکنے کا ذریعہ ہے اور اس درجہ کی شاعری پر ہماری روایات میں رومی، عرفی، غالب اور اقبال ہی ہیں۔ ان کی شاعری ہمارے لئے ایک عجیب علم کا ذریعہ ہے جس کو بصیرت کہا جائے۔ یورپ کے عظیم شاعروں کا طرۂ امتیاز یہی رہا ہے کہ وہ علوم کے بابت عام قاری کی بصیرت بڑھاتے ہیں۔ وہ ہمیں اس دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں اعلیٰ ترین علم پہونچے ہیں اور اس دنیا کی روح سے ہمکنار کرتے ہیں۔ کائنات کے بابت جو کچھ ہمیں مختلف علوم بتاتے ہیں وہ بحثوں اور الجھاؤں میں ہی رہ جاتا ہے۔ اگر شاعر ان کو تخیلی رنگ دے کر ایک نئی زندگی نہ بخشے۔ مثلاً گوئٹے کے "فاسٹ" کی پہلی اٹھائیس سطریں جن میں میکائیل، جبرئیل اور اسرافیل خدا کے حضور میں گیت گاتے دکھائے گئے ہیں۔ پوری کائنات کے اصولوں سے ہمیں واقف کر دیتے ہیں جیسے کوئی فلسفی نہ کر سکا۔ حالانکہ جو باتیں بیان کی گئی ہیں۔ وہ فلسفیوں ہی سے

ماخوذ ہیں۔ فرشتوں کے گیت میں جو سطور دو ہرائی گئی ہیں وہ یہ ہیں۔

DGR ANBLICL GIBT DEN ANGLN STARKG
DA KEINER DICH URGRUNOBN MAG
UND ALLGS DEINE HOHEN WERK
SIND HERRLISH WIE AM ERSTEN TAG

تمام دینیات اور فلسفہ کا نچوڑ ان بیدھی سادی لائنوں میں اس زور کے ساتھ آگیا ہے کہ پڑھنے والے کے ساتوں طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علم الہیات اور اصل کائنات کے بابت سب سے بہتر علم شاعروں ہی کے یہاں ملتا ہے۔ عیسائی دینیات دانتے کی نظم سے زندہ ہیں۔ اسلامی دینیات اور فلسفہ رومی اور اقبال کی وجہ سے دلوں کو گرماتا ہے۔ اقبال نے شاعر کو دیدۂ بینائے قوم کہا ہے۔ شاعر یا ادیب قوم ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لئے ان کی آنکھیں کھولنے کا سرمایا بہم پہونچاتا ہے۔ براؤننگ کے یہ اشعار کائنات کی تنظیم کے بابت جس طرح ہماری آنکھیں کھولتے ہیں اس طرح کوئی فلسفی اس کام میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

HAVE I KNOWLEGE, CONFOUNDED IT
SHRIUELS AT WISDOM LAID BARE!
HAVE I FORE THOUGH, HOW PURBLIND, HOW
BLANK TO THE INFINITE CARE

سائنس اور علوم ہمیں کائنات کی سیڑھی کرا کر رہ جاتے ہیں۔ مگر شاعر کہتا ہے۔

ترا جہاں مہ و پرویں سے ہے بہت آگے قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں

علوم اس کے لئے محلے سنگ و خشت ہیں اور وہ ان سے بے نیاز ہو کر ہمیں بتاتا ہے۔

ترا جہاں ہے وہی تو جسے کرے پیدا یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

شاعری ہی نہیں بلکہ ہر اعلیٰ ادبی چیز ہمیں اس دنیا کی مکمل تصویر دکھاتی ہے جو علوم نے خرد سے ٹکڑے ٹکڑے کر رکھی ہے۔ ٹالسٹائی کی "وار اینڈ پیس" روس کی نپولین سے لڑائی کے منظر میں ہمارے لئے یورپ کے تمام فلسفی تاریخ و سیاست وغیرہ کا منظر سامنے لاتی ہے۔ ناول محض دلچسپ قصہ سے بڑھ کر علوم کا سرچشمہ اسی طرح ہو جاتی ہے۔ جیسے شاعری محض خوبصورت الفاظ کے کھیل سے بڑھ کر راز کائنات کی تصویر کشی بن جاتی ہے۔

بقیہ منشی عبد القدیر (سلسلہ صفحہ ۳۰)

آفتِ ناگزیر ہیں ہم لوگ
منشی عبد القدیر ہیں ہم لوگ

منشی جی دلّی کی پرانی تہذیب، اخلاق اور وضع داری کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ ایک ایک کر کے تمام پرانی قدروں نے دم توڑ دیا ہے۔ لیکن منشی جی اُن قدروں کی لاش اپنے سینے سے لگائے پھر رہے ہیں۔ میری دعا ہے کہ خدا انہیں ہمیشہ ہمارے سروں پہ سلامت رکھے۔ لیکن چراغ سحری کا کیا بھروسہ؟ کون جانے کب گل ہو جائے۔

دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے منشی عبد القدیر کی صورت



تندرست، توانا اور ہنس مکھ ہوتے ہیں
تندرست جسم، شاداب چہرہ اور چمکتی ہوئی نگاہیں اس حقیقت کی دلیل ہیں
کہ بچہ کی پرورش گلیکسو پر ہو رہی ہے۔ پشتہا پشت سے ہوشیار اور
تجربہ کار مائیں اپنے بچوں کے لئے گلیکسو ہی کو منتخب کرتی ہیں۔ یہ خالص اور
غذائیت سے بھرپور دودھ نہ صرف ہڈیوں اور دانتوں کو مضبوط بناتا
ہے بلکہ بچوں کی نشوونما اور تندرستی کا بھی ضامن ہے۔ عام تازہ دودھ کے
برعکس گلیکسو ہر قسم کی آمیزش سے پاک ہے اور بچوں کے نازک معدے
اسے بآسانی ہضم کر لیتے ہیں۔
گلیکسو
بچوں کو



تجربہ شاہد ہے

آپ کے دانت اور مسوڑھے آبگینوں
کی طرح نازک ہوتے ہیں۔ ذرا سی
لاپروائی اُن میں کیڑا لگنے اور پائریا
جیسی بیماریوں میں مبتلا ہوجانے کا
سبب بن سکتی ہے۔ اس حقیقت سے
کبھی غافل نہیں ہونا چاہیئے۔
کی معمولی صفائی اور خالی خولی چمک
اُن کو گلنے سڑنے سے نہیں بچا سکتی۔ اس کا تو
ایک ہی علاج ہے، وہ یہ کہ مسوڑھوں کو برابر طاقتور اور
صحت مند رکھا جائے اور مُنہ میں پرورش پانے والے ان زہریلے
عناصر کا قلع قمع کیا جائے جو دانتوں کے جوہر کے لئے سم قاتل ہیں۔ اس غرض
کے لئے ہمدرد منجن استعمال کیجئے جسے ہمدرد دواخانے نے سالہا سال کے تجربوں
کے بعد مکمل کیا ہے۔ یہ دانتوں کی مضبوطی اور مسوڑھوں کی صحت کے لئے اکسیر ہے۔
ہمدرد منجن دانتوں کو قدرتی طور پر چمکاتا ہے اور اُن تیزابی مادّوں کو ختم کر دیتا ہے جن سے
زہریلے جراثیم مُنہ میں پرورش پاتے ہیں۔



ہمدرد منجن

مسکراہٹ میں کشش اور دانتوں میں سچے موتیوں کی چمک پیدا کرتا ہے

ہمدرد

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان

کراچی۔ لاہور۔ ڈھاکہ۔ چٹاگانگ







مدیر
شاہد احمد دہلوی
معاون
عاصمہ بیگم

بسم اللہ الرحمن الرحیم
(رکن انجمن ادبی رسائل پاکستان)

جُرعات

سالانہ چندہ
مع خاص نمبر
پاک و ہند چھ روپے
قیمت فی پرچہ ۵۰ پیسے

جلد ۲۷ | ساقی، کراچی، بابت اکتوبر ۱۹۶۵ء | نمبر ۴

ناشر عاصمہ بیگم نے ضیاء برقی پریس کراچی میں چھپوا کر پی، آئی، بی کالونی ۵ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شاہد احمد دہلوی

نگاہِ اوّلین

(وہ مختصر تقریر جو کراچی کے ادیبوں کے اجتماع کے لئے لکھی گئی تھی)

جناب صدر، معزز خواتین و حضرات۔

۶ ستمبر کو ہندوستان نے بغیر کسی اعلان جنگ کے ہمارے ملک پر حملہ کر دیا۔ یہ ایک ایسی بزدلانہ کارروائی ہے جس کی مثال کسی متمدن ملک کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ دنیا کے تمام امن پسند ملکوں نے اس بین الاقوامی قانون شکنی کی مذمت کی ہے مگر ہندوستان نے اپنی طاقت کے نشے میں ہر ضابطۂ اخلاق کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ اسے زعم ہے اپنی کئی گنی افواج کا اور گھمنڈ ہے امریکہ کے دیئے ہوئے اسلحہ کا۔ مگر وہ اس حقیقت کو بھول گیا کہ لڑنے کے لئے اسلحہ کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی کہ دل کی۔ اور یہ دل صرف ان کے پاس ہوتا ہے جو حق کے لئے لڑتے ہیں، باطل کو شکست دینے کے لئے لڑتے ہیں، طاغوتی قوتوں کو نیچا دکھانے کے لئے لڑتے ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے جنگ کرنے میں پہل کبھی نہیں کی۔ مگر جب دشمن ان پر آن پڑا تو انہوں نے دشمن کی کثیر تعداد اور نفیس اسلحہ کا کوئی اندیشہ نہیں کیا۔ اور دم کے دم میں اپنی پرانی تلواروں ہی سے دشمن کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ یہ دل، یہ جذبہ، یہ جرأت اور یہ شجاعت صرف ان کو ودیعت ہوتی ہے جو راہ حق میں سر لینے اور سر دینے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے۔ مسلمانوں کو یہ بشارت دی جا چکی ہے کہ جہاد میں اگر فتحمند ہوئے تو غازی اور اگر جاں بحق ہوئے تو شہید کا مرتبہ حاصل کر لیں گے۔ لہٰذا مسلمان سربکف میدانِ کارزار میں آتا ہے اور جان کی بازی لگاتا ہے اور تائیدِ ایزدی سے فتح و نصرت پاتا ہے۔

ہمارے علما اور مذہبی رہنماؤں نے بہ یک آواز جہاد کا فتویٰ دے دیا ہے۔ جہاد کی کئی قسمیں ہیں۔ یہاں صرف دو کا مذکور ہوگا۔ جہاد بالسیف اور جہاد بالقلم۔ اہل سیف اس وقت متعدد محاذوں پر دشمن کو پسپا کر رہے ہیں اور اہل قلم؟ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان ہنگامی حالات میں ہمارے اہلِ قلم اپنے فرائض کی طرف سے غافل نہیں ہیں۔ ان کے قلم دشمن کے لئے زہریلے خنجر بن گئے ہیں اور اپنے جیالے اہل سیف کے لئے آبِ حیات ٹپکا رہے ہیں۔ ہمارے اہلِ قلم اچھی طرح جانتے ہیں کہ قلم سیف سے قوی تر ہوتا ہے۔ یہ قلم ہی تھا جس نے انقلابِ فرانس برپا کرایا۔ یہ قلم ہی تھا جو انقلابِ روس کا محرک ہوا۔ پاکستانی شاعروں اور ادیبوں نے ملک اور قوم میں حوصلے اور ولولے کی ایک نئی لہر دوڑا دی ہے۔ ہمارے نغمے اور مضامین ریڈیو پاکستان اور اخباروں کے ذریعے دلوں کو گرما رہے ہیں اور اہلِ سیف کو دادِ شجاعت دے رہے ہیں۔ مگر میں آپ کو اس کا بھی یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے ادیب صرف ترانے اور مضامین لکھنے پر مطمئن و قانع نہیں ہیں۔ وہ مختلف النوع معاشرتی خدمات بھی انجام دے رہے ہیں، مثلاً شہری دفاع کے کام میں ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ جنگ کے صحیح حالات سے عوام کو آگاہ کر کے ان کا حوصلہ بڑھا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ جو خدمت بھی انہیں سونپی جاتی ہے اسے نہایت تن دہی سے انجام دے رہے ہیں۔ ان تمام امور کے باوجود میں اپنے کل ادیب بھائیوں اور بہنوں کی اجازت سے سربراہِ پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خاں کی خدمت میں یہ عرض داشت پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اپنی تمام تر خدمات قوم اور ملک کے تحفظ کے لئے ان کی صوابدید کی نذر کرتے ہیں، اور ضرورت پڑنے پر محاذِ جنگ پر جانے کے لئے بھی ہم انشاءاللہ کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے ؎

نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پشتِ من — آں منم کندر میانِ خاک و خوں بینی سرے

ملک اسماعیل حسن خاں

یاسؔ عظیم آبادی

(یہ مضمون ۱۹۶۳ء میں لکھا گیا تھا)

ستمبر ۱۹۶۳ء کے شمارہ اُردو ادب میں راہیؔ معصوم رضا صاحب کا مضمون بعنوان یاسؔ عظیم آبادی "فن اور نظریہ فن" شائع ہوا ہے۔ مضمون خاصا طویل ہے۔ اور اُس میں بکثرت امور ایسے ہیں جو متنازعہ فیہ ہیں۔ اور بعض ایسے جن پر نزاعِ لفظی بھی ہو سکتی ہے۔ میرا پہلے یہ خیال تھا کہ اِس مضمون پر اور یاسؔ یگانہ کی شاعری پر تفصیل سے اُردو ادب کے آئندہ شمارہ میں بحث کروں گا۔ لیکن یہ ارادہ دو وجوہ سے ملتوی کرنا پڑا۔ اول یہ کہ میں ابھی حال ہی میں یگانہ پر ایک طویل و بسیط مضمون لکھ چکا ہوں جس میں میں نے اُن کی غزل گوئی اور بعض دیگر امور کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور اِس مضمون میں جو باتیں موردِ اختلاف ہیں وہ اُس میں آ گئی ہیں، اس مضمون کے اقتباسات اہم، حبیب خاں نے اپنی تالیف اُردو کے کلاسیکی شعراء جلد سوم (حسرت سے فراق تک) میں شامل کئے ہیں اور نگار رام پور دسمبر ۱۹۶۳ء میں وہ تمام و کمال شائع ہوا ہے ـــ امرِ دیگر یہ کہ میرے پاس اس وقت اتنا وقت نہیں ہے کہ معصوم رضا صاحب کے بعض بیانات اور دعووں سے اختلاف کرتے ہوئے اتنا طویل مضمون لکھوں، اُسے پھر دہراؤں، اور پھر مسودہ کو صاف کرنے کی صبر آزما اور دل خون کر دینے والی منزل سے گذر کر اُسے منظرِ عام پر لا سکوں، سردست یہی مناسب معلوم ہوا کہ بعض اہم اور موٹے موٹے اختلافات ہی کو بیان کر دیا جائے عجب نہیں ہو سکتا ہے کہ یگانہ کے متعلق بعض نئے اور قابلِ لحاظ گوشے روشنی میں آ سکیں اور ہو سکتا ہے کہ اگر کہیں مجھے مغالطہ یا غلط فہمی ہوئی ہو تو وہ دور ہو سکے۔ اور راہیؔ صاحب مجھے مطمئن کر سکیں ـــ یہ مضمون کسی کی تحریک پر یا کسی اور وجہ سے نہیں لکھا گیا بلکہ اپنے مطالعہ کے دوران میں مجھے جو باتیں محلِ نظر معلوم ہوئیں انہیں نوٹ کرتا گیا اور بعد میں اپنی پریشان خیالی کا اظہار کر دیا گیا۔ اِس سے راہیؔ صاحب سے کوئی چشمک، یا نکتہ چینی برائے نکتہ چینی ماشا و کلا مقصود و منظور بلکہ وہم و گمان میں بھی نہیں، راہیؔ صاحب سے میرے بڑے خوشگوار اور پُر لطف تعلقات ہیں اور اکثر و بیشتر ان ـــ علمی مسئلوں اور نکات پر تبادلۂ خیال ہوتا رہتا ہے لیکن ہمیشہ یہ بحث "ہنسی خوشی" پایۂ اختتام کو پہنچتی ہے!

مذکورہ مضمون راہیؔ صاحب کا DESERTATION ہے جو انہوں نے ۱۹۵۹ء میں ایم، اے کے امتحان کے لئے لکھا تھا۔ مضمون میں جو خاص اور قابلِ لحاظ بات ہے وہ یہ کہ اِس میں یگانہ کے دوسرے نقادوں سے ہٹ کر وہ اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کی بنا یگانہ کو یہ سب پاپڑ بیلنے پڑے، اور ان سب دشواریوں، چشمکوں، لڑائی اور جھگڑوں سے گذرنا پڑا اور جن کے باعث یگانہ اپنی راہ چھوڑ کر دوسری وادیوں میں بھٹکنے لگے اور یاسی جھلاہٹ اور ردِ عمل میں "غالب شکن" لکھی، یاسؔ عظیم آبادی سے یگانہ چنگیزی لکھنوی ہوئے، اپنے اصل رنگ سے ہٹ کر محاورہ بندی، ضرب الامثال نگاری، روزمرّہ گوئی اور زبان دانی کے جوہر دکھلانے کے چکر میں پڑ کر شاعر سے زیادہ فنکار ہو کر رہ گئے عروض میں اپنی انتہا پسندی اور "ہم چو من دیگرے نیست" کے باعث اپنی انفرادیت جتلانے کے لئے "چراغِ سخن" لکھی۔ اپنے کلام کو اردو دنیا کے لئے ایک نئی اور آسمانی چیز ثابت کرنے کے لئے "یگانہ آرٹ" کے عنوان سے اپنے اشعار کے محاسن بیان کر ڈالے۔ اپنی رباعیات کی اہمیت و انفرادیت کو واضح کرنے کے لئے اتنا زورِ قلم صرف کیا کہ حدِ اعتدال سے آگے نکل گئے، وغیرہ ـــ راہیؔ صاحب نے ان سب باتوں کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ کیوں یگانہ کو ایسا کرنا پڑا؟ اس کے وجوہ کیا تھے؟ اور ان سب امور کے بارے میں اُن کا نظریہ کیا تھا؟ اور وہ کہاں کہاں

اور کیسے کیسے انتہا پسندی، انانیت اور خود سری کا شکار ہوتا گیا؟ راہی صاحب نے اسی سلسلے میں داخلی شواہد کے علاوہ خارجی شواہد کا سہارا لے کر ان سب کا راز جاننے اور اُن کی تہ تک پہنچنے کی حتی الامکان سعی کی ہے، اور اُس میں وہ بیشتر و اکثر جگہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ لیکن اس مضمون میں انہوں نے محض "فن اور نظریہ فن" ہی سے بحث نہیں کی ہے بلکہ بعض دوسری باتیں اور اُمور بھی آگئے ہیں جن کو مضمون کے عنوان کے پیشِ نظر غیر ضروری کہا جاسکتا ہے اور اُن سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا، بات در اصل یہ ہے کہ یہ راہی صاحب کا مقالہ (DESERTATION) ہے جس کے بعض حصے یا (شاید) کوئی حصہ اُنہوں نے اُردو ادب میں اشاعت کی غرض سے دے دیا ہے، لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کوئی ایک حصہ ہے جو اپنی جگہ مکمل ہے یا اِدھر اُدھر سے کئی حصوں کو کاٹ چھانٹ کر ملا کر ایک کر کے پیش کیا گیا ہے جس سے خلطِ مبحث کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں اس سے ملتا ہے کہ اس میں "فن اور نظریہ فن" کے علاوہ اور بھی بہت سے پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے، جن کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور جس کے سبب سے مضمون میں انتشار اور بے ربطی راہ پاگئی ہے؛ اور بہت سی باتیں آپس میں گڈ مڈ ہوگئی ہیں، جس کے باعث قاری کا ذہن بار بار بعض غیر ضروری اور غیر متعلق اُمور میں اُلجھ جاتا ہے اور مضمون کا تسلسل مجروح ہوتا ہے!

ذیل میں بعض اس قسم کی مثالیں نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ پیش کی جارہی ہیں:-

صفحہ ۹۳ پر راہی صاحب کہ: "غزل میں ہندوستانی عناصر کا سراغ تو حالی ہی کے زمانے میں ملنے لگا تھا۔ لیکن یاس کے عہد کی غزل میں ان عناصر کا تناسب بہت بڑھ گیا، اُردو غزل کی "فارسی نژادیت" تقریباً ختم ہوگئی اور غزل ایک خالص ہندوستانی صنفِ سخن بن گئی"۔

معلوم نہیں راہی صاحب کا "ہندوستانی عناصر" سے کیا مدعا ہے؟ جس کی وضاحت کی ضرورت تھی، اگر اس سے مراد غزل کے رمز و ایما اور اصطلاحات و موضوعات سے ہے۔ تو یہ دعویٰ "ادعائے محض" ہی ہے، غزل کی زبان ہمیشہ سے رمز و ایما اور استعارہ و کنایہ کی زبان ہے؛ بقولِ غالب ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
مطلب ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام — چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

اور یہ عمل دخل اُس میں عہدِ ولی کے قبل سے ملتا ہے۔ مسعود حسن صاحب رضوی نے اپنی تصنیف "ہماری شاعری" میں اردو کے غزل گو شعرا کے اشعار سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غزل گو بات کسی اور طرح سے کہتا ہے اور اُس سے مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔ مثلاً پروفیسر مسعود حسن رضوی نے میر کے اس شعر کے متعلق ؎

آئی بہار گلشن پھولوں بھرا ہے لیکن — ہر گوشۂ چمن میں خالی ہے جائے بلبل

لکھا ہے کہ "ایک بار میرے گھر میں تقریب تھی، ہر شخص شاداں و فرحاں تھا۔ لیکن میری بہن جو انتقال کر چکی تھیں، وہ گھر میں نہیں تھیں، اور ان کی وجہ سے ایک کمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ پس اس شعر کو ایسے موقعوں پر منطبق کر کے دیکھا جاسکتا ہے"[۱]۔ اسی طرح غالب کے ان اشعار میں ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے
دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب — اس رہگذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں — اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

[۱] یہ لفظ بہ لفظ مسعود صاحب کی عبارت نہیں ہے بلکہ میں نے اُن کا مفہوم جو میرے ذہن میں تھا اپنے الفاظ میں لکھ دیا ہے (اسمٰعیل)

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں — آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے — ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

لوگوں کو اس دور کی مشق، جھلملاتی اور دم توڑتی تہذیب و معاشرت کا نقشہ اور ماتم نظر آتا ہے اور مغلیہ حکومت کے ٹمٹماتے ہوئے "چراغ یعنی بہادر شاہ ظفر کی آخری سانسوں اور ہچکیوں کی داستان، غزل میں "فارسی نژادیت" سے راہی صاحب کا کیا مطلب ہے؟ اور غزل ایک خالص ہندوستانی صنفِ سخن کیسے بن گئی، میرؔ سے لیکر فیضؔ تک یہ ہوتا آیا ہے کہ غزل کے اشعار میں گل و بلبل، آشیاں و قفس، جام و مینا، سموم و صبا، سنبل و سلاسل، شیخ و محتسب، طوق و دار، جیب و گریباں، اور صحرا و جنون وغیرہ سے کچھ اور معنی بھی لئے جاتے ہیں، مثلاً اقبال احمد خاں سہیلؔ کے ان اشعار میں ؎

وہ چشمِ فتنہ گر ہے ساقیٔ میخانہ برسوں سے — کہ باہم لڑ رہے ہیں شیشہ و پیمانہ برسوں سے
اسی میں خیر ہے ساقی مے رنگین پلائے جا — یہ میکش ہوش میں آئیں تو سمجھوتہ نہ ہو جائے
چشمک کرے مجھی سے یہ ایسی کہاں کی ہے — بجلی تو خانہ زاد مرے آشیاں کی ہے
صیاد مژدہ باد عنادل میں چل گئی — اس کشمکش میں فکر کسے آشیاں کی ہے
خدا سمجھے بتِ سحر آفریں سے — گریباں کو لڑا یا آستیں سے
پہنچی یہاں بھی شیخ و برہمن کی کش مکش — اب میکدہ بھی سیر کے قابل نہیں رہا
قفس میں رہتے ہو کیا طعنِ سُست پروازی — فضا کھلی ہوئی ملتی تو امتحاں ہوتا

بقول سرورؔ صاحب "مولانا سہیلؔ نے تغزل کے پیرایہ میں ہماری سیاسی کش مکش کے سارے پہلو بڑی خوبی سے بیان کردئے ہیں۔ نیز یہ کہ غزل کے علامات اس رنگ آمیزی اور داستان سرائی کے لئے گویا وضع ہی ہوئے تھے، نہ صرف ان اشعار میں انگریزوں کی حکمتِ عملی کے مختلف پہلو، ہندو مسلمانوں کے اختلافات، نرم و گرم پالیسی، اصلاحات کے کھلونوں اور سیاسی جدوجہد کی مختلف منزلیں ملتی ہیں۔ بلکہ ان کے متعلق ایک گہری بصیرت حاصل ہوتی ہے"۔ حالانکہ ان کی زبان اور ان کا انداز وہی قدیم رنگ لئے ہوئے ہے، اور اس پر فارسیت کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اس میں وہی گل و بلبل، قفس و آشیاں، صنم و گریباں، ساقی و مے، شیشہ و پیمانہ وغیرہ الفاظ اور وہی مضامین ہیں، لیکن یہ اس دور کے آئینے میں مخصوص SYMBOLS کی حیثیت رکھتے ہیں، اسی طرح فیضؔ تک آتے آتے یہ SYMBOLS کچھ اور بدل گئے، اور اب طوق و دار، دستِ صبا، شیخ، بادِ صبا، چمن، کلی، آشیاں، گل چیں، قفس، مرغانِ چمن، بہار، زنداں، شراب، بزم، انجمن، اسیر، مقتل، واعظ، محتسب، وغیرہ بعض دوسرے موضوعات کی غمازی یا نشاندہی کرتے ہیں، بلکہ فیضؔ کی تو پوری شاعری ہی (SYMBOLISM) کی شاعری ہے، تو کیا ان سب صورتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو غزل سے "فارسی نژادیت" ختم ہوگئی۔ اور غزل ایک خالص ہندوستانی صنفِ سخن بن گئی؟ یہ تو آغاز کار سے ہوتا آیا ہے کہ کہا کچھ جاتا ہے اور مطلب کچھ لیا جاتا ہے، پھر اس میں حالیؔ کے زمانے کی قید کیوں لگائی جائے؟ — آرزوؔ لکھنوی نے ایک "خالص اردو" کی تحریک چلانے کی کوشش کی تھی اور خود عملاً ایک پورا مجموعہ مرتب کیا جس میں یہ التزام کیا گیا تھا کہ کوئی ترکیب و لفظ عربی و فارسی کا نہ آنے پائے لیکن اول تو جہاں تک موضوعِ سخن اور مضامین کا تعلق تھا وہ سب فارسی شعرا کی آوازِ بازگشت تھے، دوسرے سرورؔ صاحب کے بقول "چونکہ یہ کوشش خود غیر فطری ہے اس لئے کبھی کبھی اس میں حد درجہ پھیکا پن اور تصنع پیدا ہو جاتا ہے.... اردو زبان کی اصلیت اور ترکیب پر غور کیجئے تو خالص اردو کے کوئی معنی نہیں"۔ راہی صاحب کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ "یاسؔ کا لہجہ بھی ٹھیٹھ ہندوستانی ہے"۔ یاسؔ کے لہجہ و انداز بیان کو فارسی نژاد نہیں کہا جاسکتا وہ اپنے زیر و بم، اپنے آہنگ و لے، اور گلے کی ساخت کے اعتبار سے ہندوستانی ہے، لیکن یہ بات صحیح نہیں کہ "یاسؔ کے عہد تک اردو غزل کی

فارسی نژادیت ختم ہوگئی، اور غزل ایک خالص ہندوستانی صنفِ سخن بن گئی۔"

راہی صاحب نے صفحہ ۹۵ پر یگانہ کے ہر لحاظ سے ایک بہت ہی معمولی اور پست شعر کا اقبال کی نظم کے ایک شعر سے مقابلہ کیا ہے اور لطف یہ کہ مفہوم و معنی کے اعتبار سے دونوں شعروں میں کوئی بات مشترک نہیں۔ یگانہ کا شعر ہے ؎

توسہی پھونک دوں یہ پاپ کی بستی لیکن　　کیا کہوں بیچ میں اک آپ کا گھر پڑتا ہے

راہی صاحب فرماتے ہیں کہ پھونکنے کی بات اقبال نے بھی کی تھی۔ کاخِ امراء کے در و دیوار انہوں نے بھی ہلائے تھے، انہوں نے بھی نعرہ لگایا تھا ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی　　اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

بھلا یگانہ کے اس بھونڈے بھٹکے ہوئے شعر کا اقبال کے اس نظم کے شعر سے کیا تعلق؟ اقبال اپنی نظم میں ایک مستقل نظریہ کے تحت یہ خیال پیش کرتے ہیں اُس میں ایک بات یہ بھی کہہ دیتے ہیں، یگانہ غزل کہہ رہے ہیں اُس میں جھلا کر دُنیا کو پاپ کی بستی ٹھہراتے ہیں اور اُس کو پھونکنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں، اور پھر محبوب کا گھر راہ میں پڑ کر اُن کے اس ارادہ میں مانع آجاتا ہے — راہی صاحب یگانہ کے اس پھُس پھُسے اور انتہائی معمولی شعر کے پیشِ نظر اُن کو فکر و موضوع کے اعتبار سے، اقبال کے پہلو بہ پہلو لا بٹھاتے ہیں اور اس شعر کی آڑ لے کر اُن کو اقبال سے ٹکرانے کی کوشش کرتے ہیں، کیا مجھے یہ پوچھنے کی اجازت ہے کہ کوئی شاعر غالب اور اقبال سے ٹکرائے بغیر اپنی شعری خصوصیات کے بل بوتے پر بڑا یا اہم نہیں بن سکتا؟ کیا کسی بڑے شاعر سے مشابہت یا مماثلت دکھلا کر ہی اُس کی بزرگی و عظمت کا فتویٰ حاصل کیا جا سکتا ہے؟ کیا ان اشعار کے تقابل سے راہی صاحب کا یہ مقصد ہے کہ یگانہ کے یہاں بھی "سرمایہ و محنت" کی کشمکش اور "نظامِ اشتراکیت و مساوات" کا وہی نظریہ ملتا ہے جو اقبال کے "فلسفۂ خودی" کا ایک جزو ہے اور جس کو اقبال نے اسلامی تعلیمات اور اسلامی اصول و آئین کی روشنی میں سمجھنے، سمجھانے کی کوشش کی ہے؟ یہ دوسری بات ہے کہ اُس میں گرمی و تازگی انقلاب روس کے اثر سے پیدا ہوئی ہے۔ کیا اُس وقت تک کسی شاعر کے یہاں عظمت کے نقوش نہیں اُبھرتے جب تک اُس کے یہاں کاخِ امرا کو ہلانے کا تصور موجزن نہ ہو اور جب تک وہ جھونپڑوں کے خواب نہ دیکھے؟ اس قسم کے موازنہ سے مقالہ نگار کے ذوق و ظرف و ذہنیت اور نظر کے انداز سے کے ساتھ شاعر کی نظر کے حدود کا پتہ چلتا ہے نہ یہ کہ اُس کی عظمت کی نشاندہی ہو۔ یگانہ دنیا کو محض اس لئے پھونکنا چاہتے ہیں کہ اُن کی نظر میں "پاپ کی نگری" ہے۔ اور اقبال خوشۂ گندم کو جلانے کا مشورہ ایک مستقل "نظامِ حیات" کے پیشِ نظر دیتے ہیں۔ دونوں نظریوں میں "بُعد المشرقین" ہے۔ اقبال سے موازنہ محض اس لئے کیا گیا کہ یگانہ اپنی پرواز میں اقبال کی سرحدوں تک پہونچ سکتے ہیں۔" درآنحالیکہ وہ کسی طرح نہیں پہنچے۔ ؏ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔

ص ۹۸ پر راہی صاحب رقمطراز ہیں کہ: "اُن کے (یاس کے) یہاں بھی متضاد تصورات کا ایسا ہجوم ہے کہ خیالات کا سرا نہیں ملتا۔ اور ان کا مطالعہ کرنے والا اس ہجوم میں پریشان ہو جاتا ہے۔"

یہ بات بھی خلافِ حقیقت ہے، یگانہ کے یہاں دوسرے شعرا کی بہ نسبت تضاد بہت کم ہے، شاید ہی اُن کے پورے کلام میں تین چار جگہ متضاد بیانات و خیالات میں تضاد نظر آئے، لیکن راہی صاحب نے تو یہ لکھ دیا کہ "متضاد تصورات کا ایسا ہجوم ہے۔" کاش راہی صاحب اس ہجوم کی کچھ مثالوں سے صراحت و وضاحت فرما دیتے تو اس چیلنج کی نوبت نہ آتی۔

ص ۱۰۰ پر راہی صاحب رقم طراز ہیں: "غزل کا وہ شعر جو سب سے پہلے کہا جاتا ہے، غزل کا بنیادی شعر ہوتا ہے کیونکہ یہ شعر قیدِ بحر و ردیف و قافیہ سے آزاد ہوتا ہے، پھر یہ پہلا شعر باقی اشعار کو بحر و ردیف و قافیہ کی زنجیر پہناتا ہے۔ غزل کے باقی اشعار اس شعر کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔"

اس عبارت کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں، اربابِ نظر خود غور فرما سکتے ہیں کہ غزل کے پہلے شعر یعنی "مطلع" میں نہ بحر ہوتی ہے اور نہ ردیف و قافیہ۔ مثلاً ایک غزل کا پہلا شعر یہ ہے ؎

تجھ سے بچھڑ کے دل کی صدا گو بہ گو گئی　　　　لے آج دردِ عشق کی بھی آبرو گئی

کیا یہ شعر کسی بحر میں نہیں ہے۔ کیا یہ ردیف و قافیے کی قید سے آزاد ہے۔ تو پھر "کو بہ کو" اور "آبرو"۔ اور "گئی" کیا ہے؟ لیکن راہی صاحب آگے خود اپنی رائے کا بطلان یا تکذیب کرتے ہیں، جن کو دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ "دروغ گو را حافظہ نہ باشد"۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ پہلا شعر باقی اشعار کو بحر و ردیف و قافیہ کی زنجیر پہناتا ہے"۔ اس کا یہی مطلب ہوا کہ باقی اشعار بھی اسی بحر اور اسی سے ملتے جلتے قوافی اور اسی ردیف میں کہے جاتے ہیں جس میں پہلا شعر کہا گیا ہے، اب اس پر مزید اور کیا لکھا جائے ع "بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست"۔ پھر آخر میں موصوف فرماتے ہیں کہ "باقی اشعار اس شعر کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں"۔ گھومنے سے فاضل مقالہ نگار کا کیا منشا ہے؟ میری نرد بانِ عقل وہاں تک پہنچنے سے قاصر ہے!

آگے چل کر راہی صاحب کا ارشاد ہوتا ہے کہ: "ویسے تو نظم گو شعرا کے کارواں میں بھی ایسے مسافر بہت سے مل جائیں گے جن کے یہاں کوئی جامع تصورِ حیات نہیں ملتا۔ اس سلسلے میں فیض احمد فیض۔ جوش ملیح آبادی۔ ن۔ م۔ راشد۔ میراجی۔ اختر الایمان۔ سلام مچھلی شہری۔ یوسف ظفر، قیوم نظر، ابن انشا۔ شاذ تمکنت وغیرہ کے علاوہ اقبال تک کا نام لیا جا سکتا ہے"۔

اوّل تو راہی صاحب کو یہ واضح کرنا چاہئے تھا کہ "جامع تصورِ حیات" سے اُن کی کیا مراد ہے؟ دوسرے راہی صاحب کا یہ قول کہ "فیض، جوش اور اقبال کے پاس بھی کوئی جامع تصورِ حیات نہیں ہے"۔ نیا اور حیرت انگیز انکشاف ہے۔ معلوم نہیں کہ "جامع" سے راہی صاحب کی کیا مراد ہے اور اُس کے "حدود" کیا اور کہاں تک ہیں؟ راہی صاحب کو چاہئے تھا کہ "جامع تصورِ حیات" کی وضاحت فرما دیتے۔ تاکہ کسی قسم کے ابہام کی گنجائش باقی نہ رہتی۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اس وجہ سے وضاحت نہ کی ہو کہ پھر اُس حالت میں اُس کا جواب فوراً صاف اور مدلّل طریقے سے دیا جا سکتا۔

اِسی کے آگے رقمطراز ہیں:۔

"غزل گو شعرا کے یہاں کوئی جامع فلسفۂ حیات اس لئے نہیں ملتا کہ اُن کے پاس کوئی فلسفۂ حیات ہے ہی نہیں"۔

کسی غزل گو شاعر کے پاس کوئی فلسفۂ حیات نہیں ہوتا، وہ محض جذبات کے سہارے شاعری کرتا ہے، حقائقِ عالم اور مسائلِ حیات و کائنات سے اُسے کوئی غرض نہیں ہوتی، وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتا۔ اور رمادرائیت کا شکار ہوتا ہے، اُس کو لینڈر کی طرح اسی میں مزا آتا ہے کہ

"THERE IS JOY IN SINGING WHEN NONE HERE BESIDE THE SINGER,"

اُس کے ذہن میں غور و فکر کا سیل (CELL) نہیں وہ دماغ سے نہیں دل سے شاعری کرتا ہے، اس کے پاس نہ نظر ہے نہ نظارہ۔ اس کا کوئی نظریۂ حیات، کوئی نصب العین، کوئی مطمحِ نظر نہیں۔ وہ رینۂ خیالی کا اسیر ہے۔ افسوس کہ راہی صاحب ممتاز و مقتدر غزل گو شعرا سے واقف ہوتے ہوئے بھی اس قسم کا ارشاد فرما رہے ہیں کہ "ان کے پاس کوئی فلسفۂ حیات ہے ہی نہیں"۔ یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ دو چار شاعروں کے فلسفۂ حیات سے بحث کی جائے، البتہ ناموں پر اکتفا کیا جا سکتا ہے، اور بعض اشارے کئے جا سکتے ہیں، سنا ہے کہ عقلمندوں کے لئے اشارے ہی کافی ہوتے ہیں، کیا غالب۔ آتش۔ فانی، اصغر۔ اقبال۔ جوش۔ فیض اور آل احمد سرور کے پاس کوئی فلسفۂ حیات نہیں ہے، واضح باد کہ یہاں راہی صاحب نے "جامع" کی قید نہیں لگائی ہے، جامع کی قید بھی لگائی جائے تو کیا کہا جا سکتا ہے کہ کیا اقبال اور جوش کے پاس "جامع فلسفۂ حیات" نہیں ہے؟ اس سلسلے میں تضاد کو نہیں دیکھنا چاہئے۔ تضاد تو ہر شاعر کے کلام میں ملتا ہے اور ذہنی ارتقا کے دوران میں شاعر کو اپنی پہلی رائے سے آگے بڑھنے اور رائے بدلنے میں تضاد کا شکار ہونا ہی پڑتا ہے، مثلاً اپنی شاعری کی ایک منزل میں اقبال نے یہ کہا ہے ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا　　　　ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

یا وہ خمسہ جس کا پانچواں مصرعہ یہ ہے ع "میرا وطن یہی ہے میرا وطن یہی ہے"۔ جو اُن کی شدید وطن پرستی کا ترجمان ہے، لیکن آگے چل کر یہ بھی کہتے ہیں ؎

مومن کا وطن کہیں نہیں ہے　　　　مومن کا مقام ہر کہیں ہے

یا نظم "وطنیت" میں "وطن پرستی" کی شدید مخالفت کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اِس سے — قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

یا ایک جگہ کہا ہے ؎ سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

لیکن اس کے بعد یہ فرماتے ہیں ؎

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں — بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

یا :۔ ع از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید۔"

یہ ضرور ہے کہ ہر غزل گو شاعر کے پاس کوئی جامع اور لائقِ قدر "فلسفۂ حیات" نہیں ہوتا، لیکن اکثر ایسے ہیں جن کا ایک مطمحِ نظر، ایک فلسفۂ حیات اور زندگی کے متعلق ایک نقطۂ نظر ہے، وہ ہر شے کو ایک خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ اُن کے پاس اپنا کوئی مخصوص نظامِ فکر نہ ہو، یا وہ ایک منتشر زاویۂ نگاہ سے زندگی بسر کرتے رہیں، اصغر کا فلسفۂ تصوف وجمالیات، فانی کا فلسفۂ غم، اقبال کا فلسفۂ خودی، جوش کا فلسفۂ حرکت و انسانیت اور فلسفۂ تلذذ و مسرت، اور غالب کا فلسفیانہ دماغ اور زندگی کے امور پر حکیمانہ اشارے اِس کی روشن مثالیں ہیں۔

صفحہ ۲۰ پر راہی صاحب نے یگانہ کی "بت شکنی" کے ثبوت میں یہ شعر پیش کیا ہے ؎

وہ ہم سے نہیں ملتے ہم اُن سے نہیں ملتے — اک نازِ دل آویز اِدھر بھی ہے اُدھر بھی۔

اس شعر میں یاس نے ایک پرانا بُت توڑا ہے۔ یہ عشق وہ عشقِ محروم نہیں ہے، یہاں نیازمندی نہیں، عشق کو خود اپنے وجود پر ناز ہے"۔

لیکن غالب یہ بُت اب سے سو سال پہلے توڑ چکے ہیں، غالب کے یہ شعر ملاحظہ کیجئے ؎

واں وہ غرورِ عزّ و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع — راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر — دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچئے

تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو — مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا — تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں — سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے — رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونچکاں کے لئے

نہ اتنا برّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ — مرے دریائے بیتابی میں ہے اِک موجِ خوں وہ بھی

مجنوں صاحب لکھتے ہیں کہ "حُسن اور عشق کے میدان میں بھی غالب کا انداز مجتہدانہ ہے، وہ حُسن کی برتری کو تسلیم کرتے ہوئے عشق کے وقار اور اُس کی عظمت کا قائل ہے۔ دیوانِ غالب میں اس عنوان سے متعلق جتنے اشعار ہیں، اُن کے تیور سے ظاہر ہوتا ہے کہ عاشق و معشوق شریکِ ازلی ہیں اور دونوں اپنا اپنا منصب اور اپنا اپنا مقدر رکھتے ہیں، اُس کا پیغام یہ ہے کہ معشوق کا مقام اپنی جگہ مسلّم، لیکن عاشق بھی اپنی ایک حیثیت اور ایک حُرمت رکھتا ہے اور اُس کی انسانی فطرت کے بھی کچھ مطالبے ہیں"۔

صفحہ ۱۰ پر راہی صاحب فرماتے ہیں: "ایک لمحے کے لئے یاس پر مایوسی کا ایک شدید حملہ ہوتا ہے ؎

کبھی نہ پرورشِ نخلِ آرزو کرتے — ثمر سے پہلے جو اندیشۂ نمو کرتے

یہ حملہ اتنا شدید ہے کہ یاس کو اصغر گونڈوی کے قریب کر دیتا ہے ؎

فتنہ سامانیوں کی خو نہ کرے — مختصر یہ کہ آرزو نہ کرے

لیکن پھر یاس کا بانکپن سنبھالا لیتا ہے ؎

زرد رو تشنہ لبی باشکستہ دل نہ شوم　　طلسم بندیٔ موجِ سراب از من مپرس

" اصغر گونڈوی کے قریب کر دینے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اصغر کے یہاں "نہ فتنہ سامانیوں کی خو" ہے اور نہ "آرزو کی خلش" وہ زندگی اور مراحلِ زندگی سے دامن کش اور گریزاں ہیں اور "جمود و سکوت" کے طلسم میں گرفتار۔ اُن کی شاعری مایوسیوں کی شاعری ہے۔ لیکن یگانہ کے یہاں ایسے شعر نہیں ملتے وہ زندگی کے شاعر ہیں۔ کارزارِ حیات میں برابر سے شریک اور نبرد آزما ہیں، اور اصغر اُس سے کوسوں دور ہیں۔ اس رائے کے بعد یہی کہا جا سکتا ہے کہ یا تو اُنہوں نے اصغر کا اک سرے سے مطالعہ ہی نہیں کیا یا پھر یگانہ کے مقابلہ میں اُن کی نظر میں کوئی سماتا ہی نہیں اور وہ اصغر کو بھی یگانہ سے پست درجے کا شاعر ثابت کرنے کے لئے ایسی غیر ذمہ داری و ناانصافی سے کام لے رہے ہیں۔ اصغر کے متعلق اس قسم کی رائے کا اظہار کر کے اُنہوں نے خود اپنا مضحکہ اڑانے کی کوشش کی ہے، کیونکہ اصغر کے متعلق یہ رائے قطعاً حقیقت سے معرّا اور یکسر غلط ہے۔ زندگی اور مسائلِ زندگی کا جیسا صحیح شعور اور عرفان اصغر کو حاصل تھا وہ اُن کے معاصرین میں بہت کم (غزل گو) شعراء کے یہاں ملتا ہے۔ اُن کا تصوف جمود و سکوت اور رہبانہ نشینی کی ترغیب نہیں دیتا۔ اُن کی صوفیانہ شاعری میں "تگاپوئے دمادم" اور "رد و کاوش" کی روح جاری و ساری ہے، وہ آلامِ روزگار سے فرار اختیار نہیں کرتے بلکہ اُس کو "غمِ جاناں" سمجھ کر برداشت کر لیتے ہیں۔ "کوتاہیٔ ذوقِ عمل" اُن کے مسلک میں کفر ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اُن کے یہاں بھی ایک آدھ جگہ متضاد تصویریں ملتی ہیں۔ لیکن یہ ذہنی ارتقاء کا تضاد ہے۔ جو تقریباً ہر شاعر کے یہاں ملتا ہے جبکہ وہ کسی وجہ سے اپنی فکر کے بعض محوروں کو بدلتا ہے۔ سرور صاحب کے بقول "اصغر کی تمام غزلوں میں موجِ زندگی نظر آتی ہے، رجائیت، شگفتگی اور رنگینی اصغر کی شاعری کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ اصغر کے رجائی اور شگفتہ نغموں نے اپنے کیف و ترنم سے اُردو شاعری کی محرومی، ناکامی، اور یاس کی کاوش کو گوارا بنا دیا" مجنوں گورکھپوری کی رائے بھی اصغر کے متعلق کچھ ایسی ہی ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

" وہ (اصغر) زندگی کے دردناک سے دردناک حقائق کی طرف بڑے نرم اور رکھے ہوئے لہجے میں اشارہ کرتے ہیں، اور ہم کو زندگی سے برداشتہ خاطر یا بیزار نہیں ہونے دیتے۔ بلکہ ہمارے اندر ہستی کے آغاز و انجام اور اُس کی ناگزیر رفتار کا درک پیدا کر کے دلوں میں زندگی کی ایک نئی نشاط انگیز تاب پیدا کرتے ہیں۔ اور اس سے ہم اپنی روح میں ایک پائیدگی محسوس کرنے لگتے ہیں"۔

اصغر زندگی کے بارے میں ایک سوچا سمجھا نظریہ رکھتے ہیں، اُن کی جدت پسند طبیعت نے تصوف میں اصلاح اور ترمیم و اضافہ کیا ہے۔ اس کو زندگی سے ملانے، حقائق و حوادث کی کڑی دھوپ میں نکلنے اور اُس کو نباہنے کا یقین و ولولہ دیا ہے، اُن کے خیال کے مطابق یہ زندگی ارتقا پذیر ہے، نمو اور پائیدگی اس کے لئے ضروری۔ "تگاپوئے دمادم" ان کے نزدیک زندگی کی دلیل ہے "تڑپ و تپش" ہی میں زندگی کا راز مضمر ہے، جمود و سکوت موت کے مترادف ہے، ذرا ذیل کے نغمے دیکھئے اور زندگی کے بارے میں اصغر کے نظریہ و خیال اور "فتنہ سامانیوں کی خو" کا اندازہ کیجئے۔

میخانۂ ازل میں جہانِ خراب میں　　ٹھہرا گیا نہ ایک جگہ اضطراب میں
وہ موت ہے کہ کہتے ہیں جس کو سکون سب　　وہ عین زندگی ہے جو ہے اضطراب میں

یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری　　جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے　　اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

مار ڈالے گی مجھے عافیتِ کنجِ چمن　　جوشِ پرواز کہاں جب کوئی صیاد نہ ہو

بلبل بیتاب و نالۂ گل مستِ رنگ و بو　　مجھ کو شہیدِ رسمِ گلستاں بنا دیا

اک شعلہ اور شمع سے بڑھ کر ہے قیس میں　　تم جس کو قیدِ سینۂ پروانہ سمجھے !

میری محرومی کے اندر سے یہ دی اُس نے صدا — قرب کی راہوں میں میری راہ اک دوری بھی ہے
یہاں تو عمر گذری ہے اسی موج و تلاطم میں — وہ کوئی اور ہوں گے سیرِ ساحل دیکھنے والے

یہ چند اشعار جو حافظہ میں موجود تھے، پیش کئے گئے، ورنہ اِس قسم کے اشعار اصغر کے یہاں اور بھی مل سکتے ہیں۔

ص ۱۰۱ پر اسی کے آگے راہی صاحب رقمطراز ہیں: "سماجی اور سیاسی شعور کی کمی نے یاس کو عظیم ہونے سے نہیں روکا۔ اُن کی عظمت کی راہ میں یہ "ایک ہی پہلو سے بے قرار رہنے" کی عادت حائل ہوئی"۔

قبل اس کے کہ اس پر اظہار خیال کیا جائے اِس سلسلے کے راہی صاحب کے دو تین جملے اور ملاحظہ فرما لیجئے۔ صفحہ ۹۵ پر راہی صاحب نے لکھا ہے کہ (۲) "سیاسی اور سماجی شعور کی اس ناپختگی نے یاس کو اقبال جیسا شاعر نہ بننے دیا"۔ لیکن صفحہ ۱۰۸ پر راہی صاحب فرماتے ہیں کہ:۔ (۳) "وہ بھی (یگانہ) سماجی اور سیاسی طور پر اُتنے ہی باشعور تھے جتنے باشعور اُردو غزل کے بڑے شعرا تھے"۔

عبارت کے اِس تضاد کو ملاحظہ فرمائیے، پہلی عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گویا یاس میں سیاسی و سماجی شعور کی کمی تھی۔ لیکن اُس کے باوجود یاس عظیم ہونے سے نہ رک سکے، بلکہ ایک ہی پہلو سے بیقرار رہنے کی عادت نے اُن کو عظیم نہ ہونے دیا — یہ کیا بات ہوئی، آپ کو میں سمجھ نہیں سکا کہ عظیم ہونے سے وہ کبھی نہیں رکے اور عظمت بھی نہ حاصل ہو سکی "ایک ہی پہلو سے بے قرار رہنے کی عادت کی وجہ سے"۔ دوسرے نمبر کی عبارت سے بھی کچھ یہی مترشح ہوتا ہے، یہاں راہی صاحب نے اُن کے سماجی و سیاسی شعور کے متعلق "کمی" کے علاوہ "ناپختگی" کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُن میں سیاسی و سماجی شعور اور سوجھ بوجھ تو کم تھی ہی اور جو تھی وہ پختہ نہ تھی یعنی خام و ناقص تھی۔ لیکن تیسری عبارت سے ان بیانات کی نفی و تردید ہوتی ہے، کیونکہ اُس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یگانہ سماجی اور سیاسی طور پر اتنے ہی باشعور تھے جتنے باشعور اُردو غزل کے بڑے شعرا تھے۔

یہ عبارت مبہم اور گمراہ کن ہے، راہی صاحب نے صاف صاف نہیں بتایا کہ اُردو غزل کے "بڑے شعرا" سے اُن کی کیا مراد ہے؟ اور وہ کس طرح اُردو کے بڑے غزل گو شعرا کی طرح باشعور تھے؟ نیز اُن بڑے غزل گو شعرا کا سماجی و سیاسی شعور کیا اور کیسا تھا؟ اور کیا وہ مثالی حیثیت رکھتا تھا؟ وغیرہ یہ سب الجھنیں اِن جملوں سے قاری کے ذہن میں پیدا ہو کر سوالیہ نشان بن جاتی ہیں، ان سب کی وضاحت کی ضرورت ہے۔ سرور صاحب کے لفظوں میں "تنقید وضاحت ہے، صراحت ہے، ترجمانی ہے، تفسیر ہے، تشریح ہے، تحلیل ہے، تجزیہ ہے"۔ یہاں "حسابِ دوستاں در دل" والے معاملہ سے کام نہیں چل سکتا۔

ویسے یگانہ نے اِس شعر میں کوئی نئی بات نہیں کہی ہے۔ اس مفہوم میں عرفی کا شعر پہلے سے موجود ہے ؎

ملالِ عالمیانم ز عدم بدم دگرگون است — منم کہ مدتے عمرم بہ یک ملال گزشت

ص ۹۸ پر راہی صاحب کا ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

"اِس دور کے اکثر قابلِ ذکر شعرا کے تخلصوں پر ایک نگاہ ڈالنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہ لوگ اپنے حالات سے کس قدر متاثر تھے۔ اِس دور میں ہمیں اصغر، فانی، حسرت، آرزو، سائل، نوح، سیماب، ثاقب، محشر، فراق، جگر اور یاس قسم کے تخلص نظر آتے ہیں، ان میں دور دور استقامت اور مستی اور یقین کا پتہ نہیں چلتا۔ ان سب پر ایک بے یقینی، مایوسی، اور طوفانی حالات کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اِس دور کے شعرا کے نظریۂ فن و زندگی کو سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ یہ کہیں ایک جگہ نہیں ٹکتے اور اگر کسی ایک جگہ ٹکتے بھی ہیں تو وہ منزل جنت نہیں اور وہ ہے مایوسی کی"۔

۱؎ نظامِ دہر نے کیا کیا نہ کروٹیں بدلیں — مگر ہم ایک ہی پہلو سے بے قرار رہے (یاس)

اِس کی صحت و عدم صحت یا اختلاف و اتفاق پر بحث پھر کی جائے گی، پہلے یہ واضح کر دینا مناسب ہے کہ تقریباً یہی رجحان اور اسی قسم کی رائے کا اظہار جوش نے اپنے ایک مضمون "اُردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت" میں بھی کیا ہے۔ جوش صاحب لکھتے ہیں:-

"ایک بار نہیں ہزاروں مرتبہ، طویل راتوں کے سکون اور سناٹوں میں میں نے اردو شاعری کا مطالعہ کیا۔ میں نے نہایت احتیاط کے ساتھ اپنے اساتذہ کے سینے ٹٹول کر دیکھے۔ میں نے پوری دیانت کے ساتھ اپنے شعرا کی نبضوں پر ہاتھ رکھ کر اُن کی ضربات کا شمار کیا، لیکن افسوس کہ مجھے اُن کے اندر زندگی، شعلہ فشاں زندگی، آگ اور بجلی سے کھیلنے والی زندگی، گرجتی، گونجتی، ہر قدم پر مچلتی اور اُبھرتی ہوئی سرخ خون والی زندگی کا کہیں نام و نشان تک نہ ملا۔۔۔ ذرا اپنے شعرائے کرام کے تخلص ہی ملاحظہ فرما لیجئے اور کسی ماہر نفسیات سے دریافت فرمائیے کہ یہ تخلص کس نوع کی ذہنیت پیش کرتے ہیں؟ آپ جانتے ہیں اس کا جواب کیا ہوگا؟ وہ غیر مشتبہ الفاظ میں بتا دے گا کہ اس نوع کے تخلص صرف وہی لوگ پسند اور اختیار کر سکتے ہیں جن کے دلوں کی کمریں ٹوٹ چکیں اور جن کی ہمتوں کے سینے ڈھل چکے ہیں۔ سُنئے اور عبرت کے کانوں سے سُنئے۔ مجروح۔ نفتہ۔ ملول۔ درد۔ سوز۔ ذرہ۔ داغ۔ حزیں۔ عدم۔ بسمل۔ الم۔ اشک۔ آہ۔ زخم۔ فلق۔ سائل اور یاس وغیرہ۔"

جوش اور راہی دونوں کی رایوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن یہاں اِس کی ضرورت نہیں۔ یہاں تو یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ راہی صاحب کی اِس ناموں کی پیش کردہ فہرست میں کیا اصغر، حسرت اور جگر میں بھی "درد و استقامت، روشنی اور یقین کا پتہ نہیں چلتا" اور کیا ان پر بھی "ایک بے یقینی، مایوسی، اور طوفانی حالات کے اثرات صاف نظر آتے ہیں"۔ اور کیا "یہ اگر کسی ایک جگہ ٹکتے بھی ہیں تو وہ منزل ہے اپنے امروز سے مایوسی کی۔"

اصغر کے متعلق سرور صاحب کا ارشاد تو یہ ہے: "اصغر کی تمام غزلوں میں موجِ زندگی نظر آتی ہے، رجائیت، شگفتگی اور رنگینی اصغر کی شاعری کے اجزاے ترکیبی ہیں۔ یہ شگفتگی اور رنگینی خیال میں بھی ہے اور بیان میں بھی، اصغر کے رجائی اور شگفتہ نغموں نے اپنے کیف و ترنم سے اُردو شاعری کی محرومی، ناکامی اور اُداسی کو خوش گوار بنا دیا۔"

اصغر کی زندہ دلی، نفاست پسندی، شگفتہ طبعی، خوش مزاجی وغیرہ کے سلسلے میں رشید صاحب فرماتے ہیں کہ "اُن کے کلام کو اُن کی زندگی سے علیحدہ بھی نہیں کر سکتا۔ مرحوم کا ذکر چھیڑتا ہوں تو بار بار اُن کا کلام سامنے آتا ہے اور اُن کے کلام کی طرف رجوع ہوتا ہوں تو اصغر صاحب جیتے جاگتے مسکراتے سامنے آموجود ہوتے ہیں، اُن کے کلام کو جسم و جاں میں منتقل کیجئے، تو اصغر صاحب اور اصغر صاحب کو الفاظ و عبارت میں تحویل کیجئے تو اُن کا کلام۔"

جگر کے متعلق سرور صاحب نے تحریر کیا ہے کہ "حسرت و جگر سے غزل کو وہ سرمستی واپس مل گئی جو زندگی کی تلخیوں میں کھو گئی تھی۔ وہ کیف و انبساط پھر ہاتھ آ گیا جو زندگی کی روح ہے اور جس کی وجہ سے زندگی روشن اور گوارا ہے۔"

حسرت کے متعلق بھی سرور صاحب، نیاز صاحب اور احتشام صاحب[1] نے کچھ اسی قسم کی رایوں کا اظہار کیا ہے، جس سے حسرت پر بے یقینی اور مایوسی کا الزام عاید نہیں ہوتا۔ حسرت کی عشقیہ، غنائی شاعری انتہائی خوش گوار، نغمہ ریز، اور طرب انگیز ہے۔ اُس میں فراق سے زیادہ وصال اور کیفیاتِ وصال کی شیرینیوں کا ذکر ہے۔ وہاں مایوسی، تڑپ اور جلن، بے یقینی اور بے دلی کا گذر نہیں۔ وہاں یقین، امید، حوصلہ، اور انبساط کے چراغ ہر جگہ روشن ہیں۔ عبادت بریلوی "غزل اور مطالعۂ غزل" میں رقم طراز ہیں۔

جدید غزل میں آج رجائیت اور رجولانی کی فضا ملتی ہے۔ اُس میں گھٹن کا احساس نہیں ہوتا، انفعالیت نظر نہیں آتی۔

---

[1] احتشام صاحب نے غالباً اپنے مضمون حسرت کی شاعری میں نشاطیہ عناصر میں کچھ اسی قسم کا اظہار کیا ہے جس کا حوالہ اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہے۔

احساس میں درد ضرور ہے لیکن مایوسی نہیں ہے، اس میں گداز ضرور ہے لیکن ناکامی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ جدید غزل میں جو تصورِ عشق پیش کیا جاتا ہے اس میں قنوطیت کی جگہ رجائیت نظر آتی ہے۔ تاریکی کے بجائے روشنی کا احساس ہوتا ہے۔ ناکامی کے باوجود اس میں مسکراہٹیں ملتی ہیں، ماحول کی ناسازگاری اس میں ایک سوز ضرور ابھرتی ہے۔ اور ایک گداز ضرور پیدا کرتی ہے۔ لیکن یہ سوز اور گداز اس پس منظر میں حقیقت بن جاتے ہیں۔ حسرت، جگر، اصغر، اثر، فراق سب کے سب رجائی ہیں۔ صرف فانی ایک ایسے ہیں جن کے یہاں قنوطیت کا اثر ملتا ہے، ان کی قنوطیت تمام تر ان کے ناسازگار ماحول کی پیدا کردہ ہے لیکن انہیں اس تاریکی میں کہیں کہیں روشنی کی کرن بھی ضرور نظر آتی ہے۔ ویسے مجموعی اعتبار سے جدید اردو غزل کا رجحان جہاں تک عشقیہ شاعری کا تعلق ہے رجائیت کی طرف ہے اور اسی رجائیت کے باعث اس میں خالیت اور جولانی کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔"

ص ۱۲۱ پر راہی صاحب نے لکھا ہے کہ: ان باتوں کی روشنی میں یگانہ باطلی مذہب کی طرف ان کے رویہ کی وضاحت کر دیتی ہے ؎

خبطِ مذہب ہو خواہ تحفۂ کفر — جس سے پایا اسی کے سر دے مار
بندگی کا ثبوت دوں کیوں کر — اس سے بہتر ہے کیجئے انکار"

یہ ان کی ایک غزل کے دو متفرق شعر ہیں، پھر ان کو رباعی کیوں کہا گیا ہے؟ کیا ان کا وزن رباعی کا ہے؟ اگر یہ رباعی کے وزن میں ہوں تو راہی صاحب ان کی بحر متعین کر کے تقطیع کرنے کی زحمت فرمائیں!۔ میرے خیال میں ان اشعار کی تقطیع اس طرح ہو سکتی ہے۔ اس بحر کا نام ہے "بحرِ خفیف مسدس مخبون محذوف یا مقصور"۔ اس کا وزن یہ ہے:۔ فاعلاتن مفاعلن فعلن یا فعلان"۔ اب تقطیع ملاحظہ ہو:۔

فاعلاتن	مفاعلن	فعلن یا فعلان
خبطِ مذہب	ہو خواہ تح	فۂ کفر
جس سے پایا	اسی کے سر	دے مار = اگر دے گرا دیں تو فعلن کے وزن پر ہوگا
بندگی کا	ثبوت دوں	کیونکر = اگر کیوں کا رکر دیں تو فعلان کے وزن پر ہوگا
اس سے بہتر	ہے کیجئے	انکار

صفحہ ۱۳۲ پر رقمطراز ہیں:۔ "اپنی منتشر الخیالی کے باوجود یاس نے واقعات یا مقامات کو اپنی شاعری کا موضوع کبھی نہیں بنایا۔ یاس کیفیات کے شاعر تھے۔ ان کا وطن کسی جغرافیائی وحدت کا نام نہیں ہے۔ جب وہ گھر کہتے ہیں تو اس سے وہ گھر مراد نہیں لیتے، وطن ہو یا گھر یہ دونوں علامتیں ہیں۔ اور یاس نے ان دونوں علامتوں کو بڑی چابکدستی سے استعمال کیا ہے۔۔۔۔ یاس کی شاعری میں وطن اس جذبہ کی علامت ہے جو کسی ہم وطن کو دیکھ کر محبت کا اظہار کرتا ہے۔"

لیکن راہی صاحب اپنے اس دعوے کو یگانہ کے اشعار کے ذریعے ثابت نہ کر سکے، اس لئے کہ انہوں نے اس دعوے کے ثبوت میں جو اشعار پیش کئے ہیں ان سے یہ مطالب کی طرف ذہن کسی طرح منتقل نہیں ہوتا۔ یاس کے یہاں "وطن و گھر" کا کوئی نیا اور انوکھا تصور نہیں ملتا، وہی روایتی اور پامال خیالات ہیں۔ علاوہ ازیں راہی صاحب نے اپنے دعوے کے ثبوت میں جو شعر پیش کئے ہیں وہ یہ ہیں ؎

کس نے کا محل بھی نہیں قبر سے بد تر — آرام کہیں گھر کے برابر نہیں ملتا
پھیلا کے پاؤں سوئیں گے تربت میں آج ہم — بس اب سفر تمام ہوا گھر قریب ہے
وطن کی ہے ہوا سر پہ وطن کی خاک اس میں — گریباں چاک کر لیتا ہوں لیلیٰ دوست دشمن ہیں

آرام سے سونے کی جگہ ہے تو لحد ہے — دنیا میں تو راحت کا کوئی گھر نہیں ملتا

وہ وحشت ہولناک وہ حبِ وطن کا جوش — پھر پھر کے دیکھنا وہ کسی بے دیار کا

صحرا کی ہوا کھینچے لئے جاتی ہے مجھ کو — کہتا ہے وطن دیکھ ذرا پھر کے ادھر بھی

غربت کی موت بھی سببِ ذکرِ خیر ہے — گر ہم نہیں تو نام رہے گا زمانے میں

سپتی ہے بہت یادِ وطن جب دامنِ دل سے — پلٹ کر اک سلامِ شوق کر لیتا ہوں منزل سے

شامِ غربت بھی ہے روشن واہ ری یادِ وطن! — یاد کیا ہے اک اندھیرے کا اُجالا دل میں ہے

اندھیرے اُجالے کہیں تو ملیں گے — وطن سے ہمیں بے وطن کرنے والے

غور فرمائیے اِن اشعار میں گھر اور وطن کا کون سا نیا تصور موجود ہے؟ آئیے دو چار اشعار کا تجزیہ کر کے بھی دیکھ لیں تاکہ کوئی بات اَن کہی نہ رہے۔

پہلے شعر میں ایک عام اور پرانا مضمون بیان کیا ہے کہ گھر میں جو ہر بات کا آرام ملتا ہے وہ کسی غیر کے گھر خواہ وہ کسریٰ کا محل بھی ہو، نہیں مل سکتا۔ اس لئے کہ یہاں ہر چیز جانی بوجھی اور ہر بات کی آزادی اور بے تکلفی ہوتی ہے۔ بقول راہی صاحب "گھر والوں سے ہر بات کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ گھر والے چہرے کے آثار چڑھاؤ سے، لہجے کے نازک فرق سے اور کبھی کبھی خاموشی سے گفتگو کا کام لے لیتے ہیں، ادھورے جملوں میں ایک لفظ ایک آواز میں مفصل باتیں کہہ دی جاتی ہیں"۔

دوسرے شعر میں بھی ایک پیش پا افتادہ مضمون کے علاوہ نئی کون سی بات ہے؟ یہ ہزاروں بار شاعروں نے کہا ہے کہ اصل گھر تو عالمِ آخرت میں ہے، یہ دُنیا تو ایک سرائے ہے، یہ بے ثبات اور ناپائدار ہے اور اس کی زندگی یعنی حیات مستعار ہے، اُس کی حیثیت پانی کے بلبلے کی طرح ہے۔ وغیرہ۔ یگانہ اِسی کے پیشِ نظر فرما دیتے ہیں کہ "اب دُنیا کا سفر یا دُنیا کی منزل ختم ہونے والی ہے اب موت کے بعد تربت میں پاؤں کو پھیلا کر اطمینان سے سوئیں گے اور اپنے گھر کو پہنچ جائیں گے"۔ شاعر نے دُنیا کو منزلِ سفر اور قبر کو گھر سے تعبیر کیا ہے، اور چونکہ مُردے کو سیدھا سیدھا قبر میں لٹا یا جاتا ہے اِس نسبت سے اُس کو "پاؤں پھیلا کر سوئیں گے" کہا ہے، اِس میں گھر کے مضمون میں کون سی نئی بات پیدا کی گئی ہے؟

تیسرے شعر میں وطن کی یاد کی کیفیت کو بیان کیا ہے کہ جب اُس کے دوست دشمن کی یاد آتی ہے تو تم وغصہ میں گریباں پھاڑ ڈالتا ہوں۔ اِس کے علاوہ شعر میں کیا جدت اور نزاکت پیدا کی گئی ہے؟ اور وطن کا لفظ اور کس طرف خیال کو لے جاتا ہے؟ کیا یگانہ ان غریب الوطنی اور ان صبر شکن، روح فرسا اور جاں گُسل حالات کے باوجود جو اُن کو وطن سے باہر پیش آئے۔ وطن اور گھر کو اتنا بھی یاد نہ کرتے؟ قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنے وطن اور گھر سے دور کسی دوسری جگہ ہوتا ہے اور وہاں کی زندگی بھی اس کو راس نہیں آتی اور "خارِ کلفت" اور "نشتر یاس" سے گھبرا جاتا ہے تو اُس کو وطن کی وہ باتیں، جب وہ وہاں تھا، کمی اور تکلیف دہ معلوم ہوتی تھیں، اب عزیز ہو جاتی ہیں۔ اور یہ احساس اس کے دل میں تیز سے تیز تر ہو کر دو صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ اول یہ کہ وہ غریب الوطن ادھر سے گھبرا کر گھر کی یاد کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔ دوسرے وطن والوں کے گھر سے ایک نوع کا رشک بھی اُس کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ طنز کے تیروں سے اُن کو نوازنا شروع کر دیتا ہے۔ دو دیکھنا چاہئے۔ اس پہلو سے فانی کو دیکھئے، فانی کے یہاں غریب الوطنی کے بعد اور اپنی زندگی کے آخری دور میں یہ دونوں کیفیتیں پیدا ہو گئی تھیں، انہوں نے وطن کو یاد بھی کیا ہے اور غم و غصہ میں اہلِ وطن پر طنز و رشک کے تیر بھی چلائے ہیں، مثلاً یہ شعر

گردش وہی یہاں بھی ہے اسیرِ کہن میں تھی — غربت میں بھی وہی ہے جو قسمت وطن میں تھی

قاتل جو بیٹھے ہی وہ بہت ہی بے گور و کفن — غربت جو کر راس نہ آئی تو وطن یاد آ گیا

دعویٰ حشر فانی کیا قیامت ہے معاذ اللہ — مجھے اپنے وطن کی سرزمیں معلوم ہوتی ہے

وہ آج جو مرگِ فانی بے کس سے مٹ گئی — وہ اک خلش جو خاطرِ اہلِ وطن میں تھی
دیارِ عمر میں اب قحطِ مہر ہے فانی — کوئی اجل کے سوا مہرباں نہیں ملتا

یا حسرت کے بعض شعر بھی اِس ضمن میں قابلِ ذکر ہیں مثلاً ؂

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی — جو روشنی کہ شامِ سوادِ وطن میں تھی

پھر یگانہ نے اگر وطن، اپنی وطن اور اپنے گھر کو یاد کر لیا یا دل کا بخار نکالنے کے لئے کچھ وطن اور گھر کے متعلق کہہ دیا تو اُسے کیوں کچھ اور سمجھا جائے؟ جیسے غالب کے بعض اشعار کو کھینچ تان کر وہ معنی پہنانے کی کوشش کی جاتی ہے جو غالب غریب کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوں گے اور وہ اشعار خود اُن معنی کی چوڑیوں کو پہنتے وقت پہلو تہی کرتے اور کسمساتے ہیں۔ یگانہ نے اگر یہ کہہ دیا کہ ؂

اندھیرے اُجالے کہیں تو ملیں گے — وطن سے ہمیں بے وطن کرنے والے

تو وطن کی آڑ میں کون سی نئی بات کہہ دی یا کون سا تیر مار دیا؟ ہاں جہاں تیر مارا ہے وہ قابلِ قدر ہے، یا اگر وہ چوتھے شعر میں یہ کہتے ہیں کہ اگر آرام کہیں مل سکتا ہے تو وہ صرف قبر میں، ورنہ دُنیا میں کوئی آرام و سکون کی جگہ نہیں ہے۔ تو اس میں کون سی نئی اور نرالی بات کہی ہے، ہاں زندگی سے فرار اور موت کی تمنا کا اظہار ضرور ہے، اور یہ اشعار یگانہ کو قنوطی ضرور ثابت کر سکتے ہیں، باقی اشعار پر بھی اِسی طرح غور کر کے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے!

ص ۱۲۴ پر راہی صاحب نے لکھا ہے کہ:۔ یاس مذہب کے خلاف نہیں تھے۔ جبلِ مذہب کے خلاف تھے وہ کلمہ پڑھ لینے کو مسلمان ہونے کے لئے کافی نہیں سمجھتے تھے، جب تک کلمہ کی اُن اخلاقی ذمہ داریوں کا احترام نہ کرے جو اسلام قبول کرنے کے بعد از خود عاید ہو جاتی ہیں۔ کیوں کہ ؂

پڑھ کے دو کلمے اگر کوئی مسلماں ہو جائے — پھر تو حیوان بھی دو روز میں انساں ہو جائے

یہاں پھر یاس کی شیعیت نے ایک روایت کا سہارا لیا۔ روایت غالباً یہ ہے کہ امام علی رضا حج کرنے گئے۔ بہت حاجی آئے ہوئے تھے۔ ایک صحابی نے خوش ہو کر کہا کہ اِس سال تو بہت حاجی آئے ہوئے ہیں۔ امام علی رضا نے کہا کہ انہیں تو صرف چند حاجی نظر آ رہے ہیں۔ جب صحابی نے حیرت کا اظہار کیا تو امام نے انہیں اپنی انگلیوں کے جوف سے حاجیوں کے مجمع کی طرف دیکھنے کا حکم دیا۔ صحابی نے دیکھا کہ چند حاجی ہیں اور باقی جانور"۔

یہاں راہی صاحب نے شیعیت کی روایت کے سہارے کا جو ذکر کیا ہے وہ بالکل بیکار اور بے موقع اور اہلِ سنت والجماعت پر زبردست حملہ اور تبرا ہے۔ کیونکہ اُن میں نجف کے راستے سے آنے والے زایرینِ حرم (یعنی اہلِ تشیعہ) تو "حاجی" ہیں اور باقی سب (یعنی سنت والجماعت) "جانور" ہیں۔ شعر کے نفسِ مضمون کا اِس روایت سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں، ہاں اگر راہی صاحب کو شیعیت کا پروپگنڈا اور سُنیوں پر تبرا مقصود ہو تو وہ دوسری بات ہے، اگرچہ اُس کے لئے کوئی اور صورت ہو سکتی ہے۔ ادبی و تنقیدی مضامین میں اس کی قطعی قسم کا اِس کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتی، اور پڑھنے والے کو مقالہ نگار کی نیت پر شبہ ہونے لگتا ہے، نقاد کو تو بہت کھلا ہوا ذہن رکھنے اور نہایت غیر جانبدار (DISINTRESTED) ہونے کی ضرورت ہے مگر وہ اِن چھوٹی چھوٹی باتوں میں اُلجھ گیا، اور تنگ نظری سے کام لینے لگا تو وہ "تاثرات و تعصبات" کہ جو تنقید کے لئے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں، کا شکار ہو جائے گا اور اِس طرح ہمیشہ نیاز فتح پوری کی طرح خلیل جوش کے مقابلہ میں جو آذر تراشے گا وہ "اختر حیدر آبادی" ہی نکلے گا، یا غالب جیسے "مہرِ نیمروز" کے سامنے جو "ماہِ نیم ماہ" لایا جائے گا وہ "مومن" ہو گا ـــــ یگانہ کا یہاں اِس روایت سے کوئی مطلب نہیں، انہوں نے اسلام کے صحیح تصور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ظاہری مذہب پرستی اور دکھاوے کی مذہبیت و پارسائی پر طنز کیا ہے۔ اُن کی نظر میں لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ پڑھ لینا اور داڑھی رکھ لینے سے کوئی مسلمان نہیں ہو جاتا، داڑھی تو سکھوں کے بھی ہوتی ہے، یا محض مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے سے وہ مسلمان نہیں کہا جا سکتا جب تک اُس میں اسلام کی وہ تمام آفاقی اور اعلیٰ خصوصیات اور اقدار یعنی اسلام کی اصل روح موجود نہ ہو، محض زبان سے خدا اور رسول کا نام لے کر مشرف بہ اسلام ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ شعر غالباً قطعہ بند ہے، اس سلسلے کا دوسرا شعر یہ ہے ؂

پڑھ کے دو کلمے اگر کوئی مسلماں ہو جائے
پھر تو حیوان بھی دو روز میں انساں ہو جائے
آگ میں ہو جسے جلنا تو وہ ہندو بن جائے
خاک میں ہو جسے ملنا وہ مسلماں ہو جائے

راہی صاحب نے محض شیعیت کے اظہار یا پروپیگنڈے اور اپنے دل کا بخار نکالنے کے لئے اس سیدھی سادی بات کا سلسلہ "جیسے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی" کی طرح امام علی رضا کی روایت" سے ملا دیا، اس کے علاوہ دوسرے دو تین مقامات پر بھی راہی صاحب نے شیعیت کا ذکر "نقاب پوش پروپیگنڈے" کی شکل میں کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ص ۱۲۰ پر لکھتے ہیں کہ:۔

ا۔ اس شعر میں صرف یہ بناوٹ ہی نہیں ہے کہ بھگوان کرشن اور "خدائے نصیری" کی رعایت سے شانِ خدا کہکر شعر بنا دیا گیا ہے۔

ب۔ اُن کی شیعیت نے اُن سے کہا کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ جس طرح یہودیوں کے باغ میں سینچائی کرنے والے کو نصیریوں نے خدا مان لیا اسی طرح مدھوبن میں گائے چرانے والے کو ہندوؤں نے بھگوان مان لیا ہو اور کیا یہ ممکن نہیں کہ جس طرح نورِ محمد ایک پیغمبر سے دوسرے پیغمبر کے صلب میں منتقل ہوتا رہا۔"

اب آخر میں مجھے ایک بات اور کہنا ہے، وہ یہ کہ اس مضمون میں راہی صاحب نے یگانہ کے بعض انتہائی پست اور معمولی درجے کے شعر بھی پیش کئے ہیں۔ اور ان کی بنیاد پر بڑے بڑے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے، ظاہر ہے کہ ہر شاعر کے یہاں اونچے، اوسط اور پست ہر درجے کے شعر ملتے ہیں، اور نقاد کو پست اشعار کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے، اس لئے کہ ہر شاعر کا کلام "دسوں انگلیاں دسوں چراغ" نہیں ہوتا، ورنہ پھر میر کے یہاں کیا کچھ موجود نہیں اور ناسخ کے ایک ایک شعر کو گنا جائے تو اس کے کیسہ میں موضوع اور مضامین کے لحاظ سے غالباً ہر قسم کے جواہر ریزے نکل آئیں گے، لیکن ایسا نہ آج تک ہوا ہے نہ ہوتا ہے کہ ہر شاعر کے گھٹیا، پست اور نہایت معمولی اشعار سے بھی کچھ نتیجے نکالے جائیں، اگر محض (THOUGHT CONTENT) کا جائزہ لیکر کسی شاعر کو اہم اور برگزیدہ ثابت کیا جائے تو پھر شعری کیفیت و شعریت و تاثیر اور بعض دوسری خوبیاں جن کی بنا پر وہ "شعر" کہلائے جانے کا مستحق ہوتا ہے بے کار ہیں۔ ہر منظوم کلام "شعر" کہا جا سکتا ہے۔ اور اس کی بنا پر اس کے خالق کی عظمت کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ اس لحاظ سے میر کے چھ دیوان مصحفی کے آٹھ دیوان غالب کا سارا کلام ناسخ کے دیوان کا ایک ایک لفظ اور ؎

نہر پر چل رہی ہے پن چکی
دُھن کی پوری ہے کام کی پکّی

قسم کے شعر بھی ہماری آنکھوں کا نور اور ہمارا بیش قیمت علمی و ادبی سرمایہ ہیں۔ اور اپنے خالق کی عظمت کے ضامن ہیں، پھر اس سے یہ بھی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ناسخ بھی آتش سے کم درجے کے شاعر نہیں، اور ان کے یہاں بھی آتش سے کم نشتر نہیں "کیا کہا ہے اور کیسے کہا ہے"؟ ان دونوں کے توازن پر شعر کی عظمت و اہمیت کا دارومدار ہے، اگر اس میں سے صرف ایک چیز پر ایمان لے آیا جائے اور کسی ایک کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر جو صورت ہوگی وہ ظاہر ہے، شاعر کا شعور "گفتار" یعنی اندازِ بیان ہی عام اور گھٹیا ان میں روح پسندیدگی پھونک دیتا ہے، ورنہ بات تاثیر و کیفیت سے معرا رہے گی۔ مثلاً یہ مضمون کہ "زمین میں نہ جانے کتنے اور کیسے کیسے حسین و جمیل پیکر دفن ہو گئے، جبھی زمین سے اتنے خوبصورت و دیدہ زیب گلہائے رنگ رنگ پیدا ہوتے ہیں"۔ غالب سے پہلے میر اور ناسخ نے اپنے اپنے طریقے سے بیان کیا ہے۔ میر کہتے ہیں ؎

ہر قطعۂ چمن پہ ٹک اک غور کر نظر کر
بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنائے

ناسخ کا شعر ہے ؎

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں
اس لئے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا

لیکن غالبؔ جب اسی مفہوم کو بیان کرتے ہیں تو بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے، اب لوگوں کو اس میں فلسفے کے نکات نظر آنے لگتے ہیں، سلوب احمد انصاری اس شعر کے متعلق رائے زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

غالبؔ نے ایک جگہ مادہ کی غیر فنا پذیری کے مسئلہ کو غزل کی زبان میں یوں بیان کیا ہے ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

لیکن اب اگر کوئی غالبؔ کے بعض ایسے معمولی اور پست اشعار کی بنیاد پر بھی انہیں بڑا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کرے تو اس پر کیا کہا جائے گا، غالبؔ کے یہ شعر ؎

پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب — اِس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ — ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں — ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو — کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیمتن کے پاؤں — رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

دہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا — کھل گئی ہیچمدانی میری

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں — میری آواز گر نہیں آتی

داغِ دل گر نظر نہیں آتا — بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

یا اُن کے "بیسنی روٹی" اور "روغنی روٹی" اور "ربعی ہے مجھے جو شاہِ جم جاہ نے دال" قطعات کو بھی اُن کی عظمت کا ضامن قرار دیا جائے تو پھر سوائے تحسینِ ناشناس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

راہی صاحب نے اِس مضمون میں اِس قسم کے جو شعر پیش کر کے اُن کی بنا پر یگانہ کی عظمت کو دکھانے اور منوانے کی کوشش کی ہے ان میں سے بعض ذیل میں آپ کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کئے جاتے ہیں، اِن کو دیکھ کر فیصلہ فرمائیے کہ کیا واقعی یہ "شعر" ہیں، اور اِن میں کوئی بھی ایسی خوبی موجود ہے جس کی وجہ سے اِن کو کسی اوسط درجے کے انتخاب میں بھی شامل کیا جا سکتا ہو؟ ؎

تو بھی پھونک دوں یہ پاپ کی بستی لیکن — کیا کہوں بیچ میں اک آپ کا گھر پڑتا ہے

ملکے دیکھیں تم کیا ہو ہم کیا — جیتے تو جیتے ہارے تو ہارے

پیچ ڈالے کے کیا حسین بنتا ہے مجھے — اتنا ہی [illegible] میں جیسے نمک

زندہ رکھا ہے سسکنے کے لئے — واہ اچھے دوست سے پالا پڑا

خطِ مذہب ہو خواہ تختۂ کفر — جس سے پایا گئی کے سر دستار

آرام سے سونے کی جگہ ہے تو یہی ہے — دنیا میں فراغت کا کوئی گھر نہیں ملتا

ابھی اِس مقالے میں کئی مقامات اور ایسے بھی ہیں جو محض نظریں اور جن سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، اُن میں سے دو ایک یہ ہیں:۔

۱۔ یہ بات ضرور نظر آتی ہے کہ اُن کے کلام میں ایمان اور عقیدے کا حسن، استغنا [illegible] بھی خال خال ہی ہیں۔

۲۔ اقبالؔ نے بھی زندگی کو متحرک مانا تھا اور اِس بنیاد پر انہوں نے ابلیس اور مومن کی تخلیق کی تھی، یاس نے ابلیس و مومن نہیں بنائے، انہوں نے ایک انسان بنایا جو فرشتہ بھی ہے اور شیطان بھی۔

(باقی صفحہ ۲۱ پر)

کرشن موہن

دو غزلیں

عمر کاٹی بے سہارے عشق کے
گائے ہیں جی بھر کے نغمے عشق کے

بحر و دریا، شہر و قریہ، کوہ و دشت
ہر جگہ دیکھے تماشے عشق کے

حُسن کا ہر رنگ محوِ رنگ ہے
اُٹھ رہے ہیں تُند شعلے عشق کے

کس قدر سنگین ہے فرسودہ سماج
کس قدر رنگین ہیں جذبے عشق کے

خود ہے افسردہ دل و کرب آشنا
حُسن کیا ارماں نکالے عشق کے

بے نیازِ عشق ہو جب چشمِ ناز
کیا کریں مارے تمہارے عشق کے

حُسن تھا غمگین تھک کر سو گیا
کب تلک سُنتا فسانے عشق کے

دُور کر دیں گے ترا بھی اضطراب
سُن ذرا اے حُسن شکوے عشق کے

کام نے غالب نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے عشق کے

طنز سے، طعنوں سے گھبراتا ہے کیوں
کرشن موہن یہ ہیں تحفے عشق کے

خرد کا عشق سے یہ بُغض و کینہ بھی قیامت ہے
یہاں مرنا بھی مشکل اور جینا بھی قیامت ہے

وہ منظر ہم نے دیکھے ہیں کہ جو دیکھے نہیں جاتے
تری دُنیا میں یا رب چشم بینا بھی قیامت ہے

لطافت کو کثافت میں بدل دیتی ہے کم ظرفی
کسی کم ظرف کی صحبت میں پینا بھی قیامت ہے

ملن کی شب، غضب ہے تیرے اپنے پن کی شوخی بھی
ترے شرمیلے پن کا یہ پسینہ بھی قیامت ہے

کسی کا ہوش رہتا ہے نہ اپنا، پینے والوں کو
یہ شغلِ کیف و مستی، جام و مینا بھی قیامت ہے

مکمّل بے خودی رہتی ہے طاری روز و شب ہم پر
نہ ہوش آئے کبھی اپنا یہ جینا بھی قیامت ہے

عجب دیوانہ پن ہے کرشن موہن کا، سنبھالیں کیا
ہے دامن تار تار ایسا کہ سینا بھی قیامت ہے

آمنہ ابوالحسن

شانو

پندرھواں سال بمشکل ختم ہوا تھا ——— ماں کا خیال تھا شانو کو اسکول سے اٹھا لیا جائے مگر شانو لڑ رہی تھی۔ "میں آگے پڑھونگی، مزید پڑھوں گی۔"

شانو کو یہ بات بلقیس آپا نے سکھائی تھی کہ ہمت کامیابی کا پہلا زینہ ہے۔ ہر بات پر شکست کھا جانے والے اور اپنی مات کا واویلا کرتے رہنے والے اصل میں بزدل ہوتے ہیں ——— اور بزدل کبھی زندگی کی بازی نہیں جیت سکتے۔

اُدھر اماں کے بہی خواہ اُسے دیکھ دیکھ کر دانتوں تلے انگلیاں دباتے۔ "ہائے یہ بن باپ کی بچی" تو شانو کو بے حد غصہ آتا اور اماں ہولا ہولا کر کہتیں۔ "تیری اسکول کی پڑھائی ختم ہو گئی ہے۔ تو اب بڑی بھی ہو گئی ہے۔ کالج والج نہ جا۔ سنا ہے وہاں لڑکیاں بگڑ جاتی ہیں۔" تو وہ پہلے سے زیادہ جذبے کے ساتھ اپنی بات پر اڑ جاتی۔ بے حد کشمکش کے بعد کالج میں داخلہ ملتے ہی وہ خود کو دنیا کی بالاترین ہستی سمجھنے لگی۔ بلقیس آپا نے اس کی پیٹھ ٹھونک کر کہا۔ "شاباش تم ضرور لائق بنوگی۔" تو سہانے خواب دیکھتے دیکھتے چھ مہینے ہوا کی طرح گذر گئے۔

شانو کے چہرے پر الہڑپن کی معصومیت تو ضرور تھی۔ لیکن اس کے طور طریق ور رکھ رکھاؤ میں بزرگوں ایسا جلال۔ جب وہ کالج جانے کے لئے باہر نکلتی تو لوگ اُسے دیکھ دیکھ کر ٹھٹھک جاتے۔ محلے کے دو چار لڑکوں نے فحش فقروں اور گندہ گھٹیا گانوں سے اس کا راستہ روکنا چاہا تو شانو نے جوتی سے ان کی اس طرح مرمت کی کہ سارے محلے میں اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ صرف اماں ہولاتی رہیں۔ "میری بات مان۔ گھر گرہستی سیکھ۔ اس طرح آنا جانا اچھا نہیں۔" مگر شانو نے کبھی پرواہ نہ کی۔

اُسے اُس دن کا بے حد انتظار تھا۔ جب وہ لائق فائق بن کر اُس پر ترس کھانے والوں کے مونہہ پر تھوک دے گی۔ اور پھر کھر مٹھیوں روپے اماں کی ہتھیلی پر لا دھرے گی تو اماں بھی کیا یاد کریں گی کہ انہوں نے بیٹی کے جنم میں بیٹے کو پروان چڑھایا۔

بلقیس آپا سچ کہتی تھیں کہ مایوسیوں کو محسوس کرو تو وہ پہاڑ بن جاتی ہیں۔ اور ان کی پرواہ نہ کرو تو زیرے جیسی بے حقیقت۔

وہ بڑی عجیب سی سہ پہر تھی۔ بادل بھنور کی طرح گہرے تھے۔ رات کی طرح گھٹا ٹوپ۔ برسات کے آثار بے حد شدید۔ شانو وقت سے پہلے ہی کالج سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُسے جلدی گھر پہونچ جانا چاہئے۔

تیز تیز قدم اٹھاتی جب وہ کالج کے پھاٹک سے نکل کر گلی میں مڑی تو اس کی آنکھوں کے آگے یک لخت اندھیرا چھا گیا۔ گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اس کی چیخیں حلق ہی میں گھُٹ کر رہ گئیں اور آنکھیں شکنجے کے اندر کھل بھی نہ سکیں۔ موٹر اُسے لیکر نہ جانے کہاں گھومتی پھری۔ وہ بار بار سر پیر ہاتھ پٹک پٹک کر خود کو آزاد کرانے کی کوشش کرتی رہی۔ مگر سب بے سود۔

کئی گھنٹے بعد جب اس کی آنکھیں کھلیں ——— تو وہ ایک بند کمرے میں تھی۔ ایک بڑھیا جو اپنی پھٹی ہوئی گدڑی سینے میں بے طرح مصروف تھی۔ رہ رہ کے زیر لب مسکرا رہی تھی۔ شانو کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے کسی ایسے خطرے کا احساس ہو رہا تھا جس میں اس کی

کامیابی بڑی مشکوک تھی۔ اس نے بڑھیا کے پیر پکڑ لئے اور بڑی لجاجت سے بولی "میں کہاں ہوں۔ کہاں" لیکن بڑھیا جواب دینے کی بجائے گدڑی سیتی مسکراتی اور کوئی سمجھ میں نہ آنے والا گیت گنگناتی رہی۔ بادل گرجتے رہے۔ آسمان کی آنکھیں بھیگتی رہیں۔ تاریکی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی رہی۔ اچانک چند مکروہ شکل لوگ کمرے میں آ گئے۔

بڑھیا نے گدڑی سمیٹ لی اور اٹھ کر جانے لگی۔ شانو دوڑ کر بڑھیا سے لپٹ گئی۔ منت سے بولی "مجھے بھی لے چلو۔ مجھے بھی لے چلو۔" لیکن بڑھیا نے اسے دھکیل دیا اور دروازہ بڑھیا کے پیچھے بند ہو گیا۔ چند قہقہے گونجے۔ چند آوازیں۔ شانو چیختی چلاتی رہی۔ لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔

اگلے دن جب وہ دوبارہ کالج کے بس اسٹینڈ پر لاکر چھوڑ دی گئی تو ظلم و ستم نے اس کی ہیئت اتنی تبدیل کر دی تھی کہ وہ خود کو پہچانتے ہوئے خوف کھانے لگی۔

اماں نے پہلے تو اپنی گیلی آنکھیں پونچھ کر اسے چھاتی سے لگا لیا۔ پھر اس کی شکل صورت اور اجڑی ہوئی ہیئت دیکھ کر دو ہتڑ اس کی پیٹھ پر رسید کئے اور پلو آنکھوں پر رکھ کر سسک پڑیں "میں نہ کہتی تھی۔ اب جا دہیں مر۔" اور سارے گذرے ہوئے واقعات کو یاد کر کے شانو ایک بار زور سے کانپی پھر ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح گر پڑی۔

اس نے عقل و فہم سے بار بار پوچھا۔ یہ سب کیا، کیوں اور کس لئے ہوا مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔ اور جان پہچان والوں نے اماں کو صلاح دی "اس کا رشتہ وہیں کر دو۔ کم از کم کلنک کچھ تو مٹے۔" مگر ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر اور بلک بلک کر شانو نے اماں سے کہا "نہیں نہیں، ہرگز نہیں۔"

دنوں وہ اور اماں روتے رہے۔ لوگوں نے انہیں تسلیاں دیں۔ لوگوں نے انہیں طعنے دیئے۔ کچھ لوگوں نے رسم و راہ ترک کر دی۔ کچھ نے ازراہ ہمدردی مشورہ دیا۔ یہاں سے کہیں اور منتقل ہو جاؤ کسی ایسی جگہ جہاں دنیا تم لوگوں کے لئے اور تم دنیا کے لئے اجنبی ہو۔ تبھی زندگی گذر سکتی ہے اور وہ بادل نخواستہ نئے محلے میں اٹھ گئے۔

شانو پھٹی پھٹی آنکھوں سے خلاؤں میں گھورتی رہتی اور اماں مشین کی ہتھی پر انگلیاں جمائے آنکھوں سے آنسو ٹپکاتی رہتیں۔

مینا کی طرح چہکنے والی، مور کی طرح ناچنے والی شانو ایسی خاموش ایسی بے حس بن گئی کہ ساری خفگی کے باوجود اماں اسے دیکھ کر بوکھلا جاتیں۔ تو کچھ بولا کر کچھ کام کر۔ مگر اماں کی آواز سے غافل کونوں کھدروں میں دبکی وہ نہ جانے کیا کیا سوچا کرتی۔ زندگی سے اس کا رویہ یکسر تبدیل ہو گیا۔ محلے ٹولے کی ہم عمر لڑکیوں سے خود کو بچانا اس کے لئے ضروری ہو گیا۔ اور شادی بیاہ کی بات پر تو وہ اس قدر کانپ جاتی جیسے یہی ساری خرابیوں کی جڑ ہو۔ مردوں سے اسے شدید نفرت ہو گئی۔ وہ بیشتر وقت ان کے مرنے کی دعائیں مانگا کرتی۔ خدا کرے دنیا کے سارے مرد تہس نہس ہو جائیں۔ ایک بھی منہ دکھانے کو باقی نہ رہے۔

پھر الیکشن کی دھوم دھام میں اس کی ملاقات اچانک بلقیس آپا سے ہو گئی۔ "بلقیس آپا۔ بلقیس آپا۔" اس نے دوڑ کر انہیں تھام لیا۔ "جو ہمت کرنے پر بھی ہار جائے اس کا دنیا میں کیا مقام ہوتا ہے بلقیس آپا۔۔؟"

بلقیس آپا نے حیرت سے اسے دیکھا پھر اسے اپنے ساتھ لے گئیں۔ جب انہوں نے سارا قصہ سنا تو پھر اس کی پیٹھ ٹھونکی اور بولیں "پروا نہ کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔" پھر بلقیس آپا نے اسے نئے سرے سے کالج میں بٹھایا اور اپنی سواری میں لاتی لے جاتی رہیں۔ پھر جس دن شانو نے سارے امتحان کامیاب کر لئے اور زندگی کو جیتنے کے قابل بن گئی۔ اس دن بلقیس آپا اچانک رو پڑیں۔

اسی دن شانو کو معلوم ہوا بلقیس آپا خود دنیا کے مکر کا شکار ہیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے ایک ننھی سی جان کا گلا گھونٹا ہے۔ ایک محبوب ہستی کا قتل کیا ہے۔ ایک خوش حال بے فکر بھرپور زندگی سے کنارہ کیا ہے پھر بھی وہ مایوس نہیں۔ وہ اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتیں۔ جب تک دنیا کی

ساری عورتیں اس حقیقت کو نہ سمجھ لیں کہ وہ حادثات کا مقابلہ کر سکتی ہیں،

اس کربناک حقیقت کو جاننے کے بعد شانو کے دماغ میں جس خیال نے سب سے پہلے انگڑائی لی، وہ ایک اٹل مستحکم ارادہ تھا۔ وہ بڑے شد و مد کے ساتھ نئی زندگی کی بنیاد ڈالنے آگے بڑھی۔ اس کے ساتھ لڑکیوں کا ایک جم غفیر تھا جنہیں وہ بلقیس آپا کی طرح سکھا رہی تھی۔

"ہمت — ہمت — ہمت —!!! حادثات راستے کے پتھر ہیں جن سے غافل رہو تو زخمی کر دیتے ہیں ورنہ خود ایک ٹھوکر کے محتاج"۔

اماں چلا چلا کر مر گئیں "پاگل نہ بن اپنا ایک گھر بسا لے"۔ مگر اُسے تو گھر کے نام ہی سے نفرت تھی۔ ایسی ہر بات سے شدید چڑ جس سے مرد کا ذرا سا وجود بھی وابستہ ہو۔

بلقیس آپا کی کنپٹیوں پر بڑھنے والا ایک ایک سفید بال شانو کو اُن بے شمار لڑکیوں کی طرح نظر آتا جو زندگی کے گرداب میں بلا وجہ پھنس کر ہمیشہ کے لئے ڈوب گئیں۔ تب وہ نئے سرے سے عزم کرتی کہ بلقیس آپا کے ایک ایک سفید بال کا انتقام زمانے سے لے گی۔ کہ اچانک ہی اس کی سب سے ذہین اسٹوڈنٹ مہر کالج سے نکل گئی۔ اور شانو کو یہ سن کر بے حد اضطراب محسوس ہوا کہ مہر کی شادی ہو گئی۔ شانو کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ وہ سوچتی رہی۔ کیا وقت ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتا رہے گا۔ جو لوگ اُسے فراموش کرنے کے لئے جُٹے ہوئے ہیں وہ صرف بھٹکتے رہیں گے؟؟ کہ مہر ایک دن کالج آئی۔

شانو نے ناقابل یقین کیفیت کے ساتھ دیکھا۔ مہر کا چہرہ مُرجھا جانے کی بجائے شگفتہ پھول کی طرح تازہ اور شاداب تھا۔ جیسے دُنیا بھر کے گلاب اس کی ہستی میں سمٹ آئے ہوں۔ شانو کو یقین نہ آیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے ہکا بکا مہر کو دیکھتی رہی — شادی ایسی بھی ہوتی ہے؟ پھر جب کئی ماہ بعد مہر دوبارہ کالج آئی تو اس کے ساتھ ایک اور ننھا وجود تھا۔ شانو کوشش کے باوجود اپنی نظریں نہ پھیر سکی۔ اُس نے دفعتاً بچے کو مہر کی گود سے لے لیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے مہر کا وجود بلقیس آپا کے وجود میں تحلیل ہو گیا۔

بلقیس آپا جو فاتح تھیں۔ مگر دُنیا کی سمت اب تک اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے۔ اُس وجود کو تھام لینے کے لئے بے قرار جسے کبھی انہوں نے خود گلا گھونٹ کر ختم کر دیا تھا۔

بچیوں کی کھیپ کی کھیپ ان کی کنپٹیوں پر سفید بالوں کا اضافہ کرتی جا رہی تھی مگر...

بے اختیار شانو نے اپنے جسم میں ایک لہر سی محسوس کی۔ زندگی کی ساری اذیتیں۔ ساری کربناکیاں محو ہو گئیں۔ اور اگلے دن لڑکیوں نے حیرت سے دیکھا

شانو آپا کا وجود باغ و بہار بنا ہوا تھا جسم پر کپڑوں کے گلزار کھلے ہوئے تھے۔ بالوں میں خوش رنگ پھول مسکرا رہے تھے۔ وہ بات بات پر مسکرا رہی تھیں اور بہت پر سکون اور خوبصورت دکھائی دے رہی تھیں۔

اور لڑکیوں کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ سمجھ کر شانو سوچ رہی تھی۔

پگلیو حیرت سے کیا دیکھ رہی ہو۔ میں تو بلقیس آپا سے چھینی ہوئی مسرت انہیں واپس لوٹانا چاہتی ہوں — !!

———

بقیہ پاکستان کے ممتاز ناول نگار (سلسلہ صفحہ ۲۸)

"خون جگر ہونے تک" میں فضلی صاحب نے بنگال کی تہذیب، تمدن اور ثقافت کا ایک گہرا مطالعہ ناول کی شکل میں پیش کیا ہے اردو ناول نگاری میں اس اہم اور گراں قدر اضافے کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

———

ظفر ضیائی

مثنوی غنیمت کا ہیرو

مولانا محمد اکرم المتخلص بہ غنیمت کی مثنوی نیرنگ عشق جو مثنوی غنیمت اور مثنوی شاہد عزیز کے نام سے بھی مشہور ہے ایسا شاہکار ہے جس نے اپنے خالق کو شہرت عام اور بقائے دوام کا تاج عطا کیا ہے۔ آج سے تقریباً تین سو سال قبل ۱۰۹۶ ہجری میں یہ مثنوی حیطۂ تحریر میں لائی گئی اور اس وقت سے اب تک چشم فلک نے سیکڑوں انقلاب دیکھے اور ان انقلابات سے اذہان اہل جہان میں بھی تغیرات رونما ہوئے، مرور ایام سے ہمارے ہاں فارسی زبان کی وہ قدر و منزلت بھی نہ رہی لیکن اس کے باوجود غنیمت کی یہ مثنوی فارسی دان طبقہ میں پسندیدہ نگاہوں سے دیکھی جاتی رہی۔ مقبولیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ نول کشور نے دسمبر ۱۹۲۵ء تک آٹھ مرتبہ اسے اپنے مطبع میں شائع کیا۔ اب ایک عرصہ سے یہ مثنوی نایاب تھی۔ چنانچہ پنجابی ادبی اکادمی لاہور نے اس مثنوی کو پہلی بار ٹائپ میں شائع کر کے علاقمندان زبان فارسی کے ذوق کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ پچھلے چند سالوں میں اہل قلم نے پھر اس پر قلم اٹھایا ہے جن میں جناب شریف کنجاہی صاحب اور گوہر نوشاہی صاحب کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس مختصر مقالہ میں ان کے چند اعتراضات کا جواب عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔ جو انہوں نے داستان عشق عزیز و شاہد کے ہیرو اور ضمنی طور پر مصنف مثنوی پر کئے ہیں۔

سبب تصنیف

اس مثنوی کی تصنیف کا سبب اگرچہ صراحتہً معلوم نہیں، لیکن کنایتہً غنیمت نے مثنوی کے خاتمہ پر یوں بیان کیا ہے ؎

حدیث عشق بود از گفتنم دور   دلی بودم بحکم امر معذور
نیاز و ناز حرف گفتنی نیست   گہر از بس نزاکت سفتنی نیست
سخن گفتم بامید تمیزی   گہر سفتم بہ تکلیف عزیزی

اس شعر اور بعض تذکرہ نگاروں کے بیان کی بنا پر شارح حاشیہ مثنوی پر رقم طراز ہے:

"بایں امید سخن گفتم کہ کسی قدر دانی کند و نیز مراد از یک عزیز پسر نواب مکرم خاں کہ عاشق شاہد بود و با مولانا غنیمت اتحادی و اعتقادی داشت بعد از فوتش شاہد توجہ عزیز از مجاز بہ حقیقت از مولانائی معروف فرمود کہ اگر ایں قصہ کہ بچشم دیدہ است بقید قلم درآرد ہر آئینہ باعث یادگاری ما و ایشان ہرد و باشد بریں معنی مولانا اشارت فرمودہ۔"

ایک اور جگہ بھی جہاں شارح نے غنیمت کی زندگی کے حالات سپرد قلم کئے ہیں وہاں اسی مضمون کو دہرایا ہے۔

شریف کنجاہی صاحب اشعار مذکور پر شرح شارح کو صرف نظر کرتے ہوئے اسے موشگافوں کی موشگافی سمجھتے ہیں اور اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ عزیز سے افسانے کا ہیرو ہی مراد ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نے اس قصہ کو نظم کرنے کے لئے کب کہا؟ جب اسیر دست آباد جونہ ہوگیا تھا یا اس سے پہلے جب وہ اس مقام پر نہیں پہنچا تھا جہاں غنیمت اسے لے جانا چاہتے ہیں اور وہ محو شاہد آفریں ہو جاتا ہے"[1]

جناب شریف کنجاہی صاحب کے اس اعتراض کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ مولانا غنیمت کو داستان مثنوی یعنی عزیز و شاہد کے عشق کا عینی شاہد تسلیم ہی نہیں کرتے اور اس طرح وہ تمام تذکرہ نگاروں (خواہ حسینی دوست ہوں اور خواہ شفیق اور اُن کے مقلد) کے بیانات کو درست ماننے سے انکار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"مثنوی کے خاتمہ میں ایک شعر ہے جس نے ایک غلط فہمی کو جنم دیا ہے۔ غنیمت کہتے ہیں سے

سخن گفتم بامیدی تمیزی ۔۔۔ تہ سر سفتم بہ تکلیف عزیزی

اس شعر میں عزیز کے نام سے ایک پوری داستان گھڑی جا چکی ہے کہ عزیز صوبیدار لاہور کا بیٹا تھا اور اس کے اشارے پر یہ داستان لکھی گئی (جس طرح خسرو نے خضر خاں کی داستان عشق لکھی تھی) تذکرہ حسینی اور نشتر عشق میں اسی خیال کو پیش کیا گیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح "موشگافوں" نے "اسیرم کرد کا فرماجرائی" سے یہ قیاس کر لیا کہ شاہد کنجاہ کے قریب ایک گاؤں ماجرہ کا رہنے والا تھا اسی طرح عزیز کے نام کو اس شعر میں انہوں نے "ہیرو" کے ساتھ ملا دیا حالانکہ اس کا مطلب اسی قدر ہے کہ انہوں نے ایک عزیز کے کہنے پر اس مثنوی کو لکھا"[2]

اقتباس بالا میں محترمی شریف کنجاہی صاحب نے چند موشگافوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس داستان عشق کو حقیقت پہ مبنی تصور کرتے ہیں۔ لیکن نہ جانے کس مصلحت کے تحت اُن موشگافوں کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا جو شاہد کو ماجرہ کا رہنے والا بیان کرتے ہیں۔ سیاق و سباق کے لحاظ سے قطعی طور پر اس مصرع سے اس امر کا انکشاف نہیں ہوتا جو کسی "موشگاف" نے منکشف کیا ہے۔ چند شعر عرض کرتا ہوں جو میرے دعویٰ کی تصدیق کریں گے۔ یہ اشعار نعت سرورکائنات ﷺ میں ہیں سے

ہوس از بسکہ ہر سو جوشش دارد ۔۔۔ دلم بت خانہ در آغوشش دارد
بدست نفس کافر کیش خونخوار ۔۔۔ گرفتارم گرفتارم گرفتار
اسیرم کرد کافر ماجرائی ۔۔۔ رہائی یا نبی اللہ رہائی!
تو باشی قبلہ و من غیر زائر ۔۔۔ تو باشی کعبہ و من دیر سائر
مرا ای جان جان از روی ایمان ۔۔۔ مسلماں کن مسلماں کن مسلماں

شارح موصوف نے مصرعہ مذکور کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے "کسی کہ ماجرائش ہجو کافر باشد" محترمی شریف صاحب نے مبہم الفاظ میں ایک ناقابل تسلیم واقعہ کو بیان کیا ہے۔

عزیز کے بارے میں نقاد موصوف کا استدلال یہ ہے کہ مندرجہ ذیل شعر میں کون سا عزیز مراد لیا جائے گا سے

عزیزی دوش با من نقل می کرد ۔۔۔ کہ ہجراں گرد از عاشق برآورد

[1] روزنامہ امروز ۹ فروری ۱۹۵۸ء [2] ایضاً

"یہاں ہیرو کے شاہد کی جدائی میں بے قرار ہونے کا ذکر ہے اور غنیمت اسے بروایت کسے بیان کرتے نظر آتے ہیں گویا اُن کے نزدیک عزیز کے ساتھ جو "ی" ہے وہ یائی تنکیری ہے۔ اس سے کم از کم یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ بیان کرنے والا عزیز (ہیرو) اور غنیمت کا ہمعصر ہے لیکن برائے بحث یہ کہیں کہ راوی غنیمت کا ہمعصر تو ہے لیکن عزیز یا ہیرو کا ہمعصر نہیں تو داخلی شواہد اس بات پر دال ہیں کہ عزیز اور غنیمت ہمعصر ہی نہیں بلکہ ہم پیالہ و ہم نوالہ ہیں۔

ہمیں اس کے تسلیم کرنے میں قطعاً انکار نہیں کہ جہاں عزیز کا ذکر آیا ہے۔ اس سے صرف وہی عزیز مراد لیا جائے جو داستان کا ہیرو ہے کیونکہ غنیمت نے شاہد و عزیز کے کلمات کو مختلف معانی میں استعمال کیا ہے۔ دور کیوں جائیں۔ مثنوی کا پہلا شعر ؎ بنام شاہد نازک خیالاں ؍ عزیز خاطر آشفتہ حالاں، اس کی تصدیق کرتا ہے۔ لیکن جہاں عزیز سے مراد عزیز (داستان کا ہیرو) ہے اس سے انکار کرنا بھی نامناسب ہے۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

عزیز از جان اسیر ناز او شد　　خراب شیوۂ انداز او شد

عزیز آن شعلہ زار عشق خوباں　　کف خاکستری بر شکل انساں

عزیز آں شیشۂ افتادہ بر سنگ　　چنیں بی خویشتن سر کرد آہنگ

لگے ہاتھوں یہ بھی عرض کرتا جاؤں کہ ملا غنیمت نے "عزیز" کے کلمہ کے ساتھ حرف "ی" کا استعمال بھی کئی ایک مقام پر کیا ہے۔ اس لئے "ی" کے استعمال اور لفظ عزیز کے مختلف معانی کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔ نمونہ کے طور پر دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

برنگ فکر خود صاحب تمیزی　　چو نام خویشتن در دلہا عزیزی

عزیزی راکہ می خواہی نشستہ　　دلی ہوشش بصد انگیز جستہ

اب رہا سوال عزیز کے حسب و نسب کا تو اس پر بحث بعد میں کریں گے۔

اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہوئے یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ اگر کسی عزیز کے کہنے پر ہی یہ مثنوی ضبط تحریر میں آئی ہے تو اس سے یہ نتیجہ کیسے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ نواب یا مربی کے کہنے پر لکھی ہے۔ نواب اور مربی کو عزیز کہنا یقیناً مناسب نہیں۔ تذکرہ نگاروں میں بھی نارائن تحریر مثنوی کی ذمہ داری مربی غنیمت پر ڈالتے ہیں[1] لیکن بہر صفتم بہ تکلیف عزیزی سے مراد وہی عزیز ہے جو داستان کا ہیرو ہے۔ کیونکہ ابتدائے داستان میں اور بعد میں بھی مولانا نے اپنے تعلقات کا ذکر اس عاشق شاہد سے جس انداز میں کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ ہم پیالہ و ہم نوالہ تھے۔ اور مولانا نے یہ مثنوی لکھ کر حق دوستی و رفاقت ادا کیا۔

مثنوی کے جن اشعار سے عزیز اور غنیمت کی دوستی کا اظہار ہوتا ہے اس کے بارے میں یہ کہہ کر کہ یہ سب انداز بیان ہے۔ حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثنوی میں ایک مقام پر عزیز خود قاصد کے لباس میں شاہد کے پاس جاتا ہے اور شاہد عزیز سے اپنے عاشق زار کے حالات دریافت کرتا ہے اور آخر میں اُس کے دوستوں کے بارے میں سوال کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

بگفتا از رفیقانش خبر دہ　　بگفتش بی خبر یکسر کہ دمہ

بگفتا زاں میاں موزوں جوانی　　غنیمت نام بود آتش زبانی

بگفتا کورنش تسلیم می کرد　　نیاز و ناز را تقدیم می کرد

۱۔ لچھمی نارائن۔ گل رعنا۔ نسخہ خطی ورق ۲۲۷ ب۔

شریف کنجاہی صاحب مذکورہ بالا اشعار میں سے دوسرا شعر نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"تو کیا فی الواقعہ یہ مان جائیں کہ غنیمت عزیز کے ان اہم جلیسوں میں سے تھے جن کا ذکر خیر
اس نے ابتدا میں کیا ہے"۔

اس کے جواب میں سوائے اس کے اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ نہ ماننے کی بھی تو کوئی وجہ ہونی چاہئے۔ یہاں یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا غنیمت کی ذات سے اہل کنجاہ کو ارادت و عقیدت بھی ہے اور انہیں ولی اللہ کا درجہ دیا جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے مولانا غنیمت کو عزیز کے دائرہ احباب سے خارج کرنے کی یہ کوشش ہے۔ عزیز اور اس کے دوستوں کی جو تصویر مولانا نے پیش کی ہے وہ اس قدر ناپسندیدہ ہے کہ عقیدت مند تصور تک نہیں کر سکتے کہ مولانا غنیمت اُن لوگوں میں سے ہو سکتے ہیں۔ بے شک وہ نہیں ہو سکتے۔ لیکن ایسا بھی تو ممکن ہے کہ اُن میں رہ کر بھی وہ اپنی مضبوط قوت ارادی کے بل بوتے پر اُن آلودگیوں سے اپنا دامن تر نہ کر سکے ہوں۔ نیک اور متقی لوگوں سے یہ کچھ بعید بھی نہیں وہ دنیا میں رہ کر دنیا سے کنارہ کش ہوتے ہیں۔ اس داستان میں قاضی کی مثال ہمارے سامنے ہے جس پر نہ تو حسن شاہد اثر انداز ہوتا ہے اور نہ کسی کو یہ جرأت ہوتی ہے کہ حاکم وقت کے لاڈلے کے محبوب کے لئے سفارش کر سکے۔ ہم قاضی کے روپ میں مولانا غنیمت کا تصور کر سکتے ہیں۔ جن کی سیرت بے داغ اور جن کا کردار بلند ہے۔

نقاد موصوف نے اپنے پہلے استدلال کی تائید میں پیرایۂ بیان کی دوسری مثال پیش کرتے ہوئے یہ شعر سپرد قلم کیا ہے ؎

برآمد بر در مکتب خروشم — کہ من سیپارۂ دل می فروشم

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"اس سے بعضوں نے یہی سمجھ لیا ہے کہ غنیمت سچ مچ سیپاروں کا بنچہ بغل میں دبائے اس مکتب کے
دروازے پر صدا دینے چلے گئے کہ غنیمت ایک مفتی شہر کا فرزند تھا اور صاحب علم و فضل۔"

"موشگافوں" کی طرح "بعضوں" کی نشان دہی نہیں کی گئی۔ اس موضوع پر صرف اس قدر کہنا ہی کافی ہوگا کہ ملا غنیمت نے مثنوی میں معاشرے کے بہت سے نقائص کا ذکر کیا ہے اور یہاں بھی اُن کا مقصد اتنا سا ہے کہ گھوم پھر کر کتابیں فروخت کرنے والے اصل میں شاہد پرست ہوتے ہیں۔ اور یہ کہہ کر کہ من سیپارۂ دل می فروشم معاشرہ پر بھرپور طنز کی ہے۔ نقاد محترم نے "سی پارۂ دل" کی ترکیب کو ذہن میں نہیں رکھا۔ سیپارۂ دل کے لئے بُنچہ بغل میں دبانے کی کیا ضرورت ہے اور دوسرے اگر کوئی صاحب علم و فضل "سیپارے" بیچے تو کیا اُس کے علم و فضل میں فرق آجاتا ہے؟ تجارت تو سنت رسول ہے۔ عار کی بات تو یوں ہے کہ حاکم وقت کا ندیم معیشت کے لئے گلی کوچوں میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہے۔ ایسی صورت میں غنیمت نہایت آسانی سے سیپارۂ دل ہی فروشم کی بجائے "سیپارۂ قرآن فروشم" کہہ سکتے تھے۔ سیپارۂ دل می فروشم کہہ کر انہوں نے حقائق کے چہرے سے نقاب الٹ دی ہے اور یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ مکتبوں میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ اور مکتبوں کے دروازوں پر کتابیں بیچنے والے کس قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔

محترم شریف کنجاہی صاحب نے جن شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے وہ سب کے سب قیاسی ہیں اور اُن کا خیال یہ ہے کہ یہ داستان عشق شاہد و عزیز محض ایک قصہ ہے جن کا حقائق سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اور تذکرہ نگاروں نے جو کچھ لکھا ہے وہ کذب و افترا کا ایک پلندہ ہے۔ اس مضمون سے متاثر ہو کر یا جدت طرازی کی غرض سے گوہر نوشاہی صاحب نے بھی نارائن شفیق کے بیان کی تائید میں اور پچھلی تمام تحقیقات کو غلط ثابت کرنے کے لئے ایک مضمون سپرد قلم فرمایا جو اورنٹیل کالج میگزین لاہور میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی سعی کی کہ غنیمت فوجدار سیالکوٹ کی سرکار میں ملازم تھے اور عزیز اُن کا لڑکا تھا۔

عزیز کون تھا؟

اس سوال کا حل تلاش کرنے کے لئے ہمیں داخلی اور خارجی شواہد پر پورے خلوص سے غور کرنا ہوگا۔ مولانا غنیمت کے مربی کے ضمن میں دو اشخاص کا نام لیا جاتا ہے۔ ایک تو نواب مکرم خاں حاکم لاہور اور دوسرے میرزا ارتق بیگ فوجدار سیالکوٹ۔ حسینی دوست سنبھلی جنہوں نے اپنا تذکرہ حسینی ۱۱۶۳ ہجری میں سپرد قلم کیا۔ نواب مکرم خاں کو آپ کا مربی اور سرپرست بتاتے ہیں لیکن لچھمی نارائن شفیق جن کا تذکرہ ۱۱۸۱ ہجری میں پایۂ تکمیل کو پہنچا وہ میرزا ارتق بیگ کا نام لیتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ مثنوی کا ہیرو عزیز اصل میں اُن کا بیٹا میرزا عبدالعزیز ہے۔ نواب مکرم خاں کے بارے میں شاہنواز خاں کا یہ بیان کہ "لاولد بود عبید اللہ نامی متبنای او در مشہور است"[۲] سنبھلی کی روایت کو ضعیف قرار دینے کا باعث ہے اور اس بیان نے محققین اور نقادوں میں بحث کا دروازہ کھول دیا ہے۔ ان مذکورہ بالا تین بیانات کی بنا پر جناب گوہر نوشاہی صاحب اپنے مقالہ (اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۶۱) میں یہ تین نتائج اخذ کرتے ہیں:

۱۔ مولانا غنیمت کا مربی اور سرپرست نواب مکرم خاں گورنر لاہور نہیں بلکہ میرزا ارتق بیگ فوجدار سیالکوٹ تھا۔

۲۔ مثنوی نیرنگ عشق کا ہیرو عزیز نواب مکرم خاں کا بیٹا نہ تھا بلکہ میرزا ارتق بیگ کا بیٹا تھا اور مثنوی نیرنگ عشق میرزا مذکور ہی کے ایماء سے لکھی گئی۔

۳۔ مولانا غنیمت لاہور میں رہائش پذیر کبھی نہیں ہوئے بلکہ سیالکوٹ ہی میں رہے ہیں۔ لاہور تو وہ فقط سیر کے لئے آئے ہیں اور اس شہر کے حسن کی تعریف کی ہے ؎

زین بتانی کہ بہ لاہور غنیمت دیدم — در جگر تیر کماں گر پسری کارگر است

میں مذکورہ بالا نتائج میں سے پہلے تیسرے نتیجہ کو لیتا ہوں۔

شفیق اورنگ آبادی کا تذکرہ جو صاحب مقالہ کے نزدیک معتبر ہے۔ اور جس کی عبارت انہوں نے نقل فرمائی ہے اس میں کہیں نہیں لکھا کہ وہ لاہور میں رہائش پذیر کبھی نہیں ہوئے۔ یہاں یہ عرض کرنا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ تذکرہ نگاروں کے قول کے مطابق مولانا غنیمت نے میر محمد زماں راسخ (متوفی ۱۱۰۷ ہجری ۹۶-۱۶۹۵ عیسوی) کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ضمنی طور پر میر راسخ کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرہند کے سیدوں میں سے تھے۔ محمد اعظم شاہ پسر اورنگ زیب عالمگیر کے درباری ملازمین میں سے تھے۔ ہفت صدی منصب پر فائز تھے۔ مدتوں شاہ جہاں آباد رہے اور بالآخر لاہور میں مقیم ہوئے۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو۔ مجمع النفائس ص ۵۲ - ۲۵۲۔ مرآۃ الخیال ص ۳۰۷-۳۰۶۔ شمع انجمن ص ۱۷۴۔ کلمات الشعراء ص ۴۲۔ فہرس مخطوطات انڈیا آفس لندن ص ۸۹۸۔ فہرس مخطوطات برٹش میوزیم ص ۷۰۰۔

اب شعر مذکور کی طرف رجوع ہوتا ہوں۔ اس شعر سے انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "لاہور میں تو وہ فقط سیر کے لئے آئے ہیں"۔ میری ناقص رائے میں تو قطعاً یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ شعر مذکور میں کوئی اشارہ یا کنایہ بھی ایسا نہیں جو اس امر کی طرف ہماری توجہ دلائے کہ غنیمت لاہور میں سیر و سیاحت کی غرض سے آئے اور کبھی وہاں قیام پذیر نہیں ہوئے بلکہ اگر غور کریں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ لاہور میں قیام پذیر رہے اور ایک لاہوری کماں گر نے اُن کا دل موہ لیا۔

---

۲ شاہنواز خاں، مآثر الامرا جلد سوم ص ۶۶۸

اپنے دعویٰ کی تائید میں گوہر نوشاہی صاحب نے ثواقب المناقب کا حوالہ دیا ہے۔ مولانا غنیمت کی وفات کے بارے میں صداقت نے لکھا ہے:

"ہرگاہ در راہ لاہور رقیبہ عمر آں زخمی خنجر شوق بقطع نزع کہ ہیچ کسے طاقت گریز از آں ندارد پیوست"

اپنی دلیل کو مضبوط کرنے کے لئے گوہر صاحب پس منظر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"(آپ اپنی جائے رہائش سے گاؤں کی طرف لائے جا رہے تھے) کہ لاہور کے راستے میں آپ کے رشتہ زیست کو نزع کے خنجر نے جس سے کسی کو طاقت گریز نہیں کاٹ دیا"

خطوط وحدانی میں رکھا گیا۔ جملہ ثواقب المناقب کے بیان کی تشریح ہے لیکن چونکہ وہ غنیمت کے سیالکوٹ قیام پذیر رہنے پر زور دے رہے ہیں۔ اس لئے قیاس کہتا ہے کہ "اپنی جائے رہائش" سے مراد سیالکوٹ کا شہر ہوگا اور مولانا کا گاؤں کنجاہ ہی تھا جو گجرات سے سات آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ گویا غنیمت سیالکوٹ سے کنجاہ لائے جا رہے تھے کہ لاہور کے راستے میں فوت ہو گئے۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ جب غنیمت مرض الموت میں مبتلا ہیں اور اُن کے لواحقین انہیں گاؤں لے جا رہے ہیں تو کیا ان کے لئے مناسب نہیں تھا کہ وہ سیالکوٹ سے وزیر آباد اور وہاں سے گجرات ہوتے ہوئے کنجاہ کی راہ لیتے اور یہ راستہ تیس بتیس میل تھا۔ لاہور آنے اور وہاں سے گجرات اور کنجاہ جانے کے اسباب کیا تھے اس پر فاضل مقالہ نگار نے کچھ روشنی نہیں ڈالی۔ اقتباس مذکور سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ وہ لاہور ہی میں سکونت گزین تھے اور وہاں سے جب انہیں بیماری کی حالت میں گاؤں لے جایا جا رہا تھا وہ راہ ہی میں جاں بحق تسلیم ہوئے۔

اب اگر مولانا غنیمت کے سال وفات (۱۱۰۸ ہجری) اور نواب مکرم خاں کے دوبارہ گورنر لاہور مقرر ہونے کے سنین (۱۱۰۶ - ۱۱۰۸ ہجری) کو پیش نظر رکھیں تو یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ غنیمت جب مرض الموت میں گرفتار ہوئے تو وہ اپنے مربی نواب مکرم خاں کے پاس لاہور ہی میں تھے۔ اس استدلال کی روشنی میں گوہر نوشاہی صاحب کا اخذ کردہ پہلا اور تیسرا نتیجہ غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

ان دو نتائج کے غلط ثابت ہو جانے کے بعد تیسرا نتیجہ (جو اُن کے ترتیب دیئے ہوئے نتائج میں دوسرے نمبر پر ہے) از خود غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے نیرنگ عشق کے ہیرو یعنی عزیز کو موضوع بناتے ہیں۔

جناب گوہر نوشاہی صاحب نے میرزا ارتق بیگ پر روشنی نہیں ڈالی۔ اور شفیق کے بیان کو اس لئے قابل اعتبار سمجھا کہ اُسے نئی راہ سجھائی ہے۔ ارتق بیگ فوجدار سیالکوٹ کب سے کب تک رہا؟ کب فوت ہوا؟ اُس کی اولاد کس قدر تھی؟ اس کے سوانح حیات کے مآخذ کون کون سے ہیں؟ نواب مکرم خاں کو مولانا غنیمت کا مربی اور سرپرست صرف اس وجہ سے نہیں مانتے کہ شاہنواز خاں نے مآثر الامرا میں اُسے لاولد لکھا ہے اور اُن کے ایک متبنیٰ عبید اللہ نامی کا ذکر کیا ہے۔ یہاں صاحب مآثر الامرا کے بیان کا متعلقہ حصہ نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ شاہنواز خاں لکھتے ہیں:

"بتازگی در سال بیست و ششم بادراک ملازمت ناصیہ سعادت برافروخت و بحکومت لاہور تعین گشت و در سال سی ام معزول یافت و پس ازاں بصاحب صوبگی ملتان کمر عزیمت بربست و ازاں باز بتنظیم صوبہ لاہور معین گردید و در سال چہل و یکم معزول گشتہ استعفائی نوکری نمودہ در دارالخلافہ منزوی و منزلت گردید۔۔۔ در زمان محمد فرخ سیر بصیر عدم قدم برداشت۔ لاولد بود عبید اللہ خاں نام متبنائے او مشہور است۔ سید حشمت اللہ خاں (کہ دریں ایام از جانب آصف جاہ بوکالت دربار

پادشاہی متعین است، پسر اوست[1]"

اقتباس مذکورہ سے واضح ہے کہ ۱۰۹۳ - ۱۰۹۴ ہجری میں پہلی بار لاہور کے گورنر مقرر ہوئے اور چار سال تک اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہے یعنی ۱۰۹۷ - ۱۰۹۸ ہجری تک۔ ان سنین کے پیش نظر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مولانا نے یہ مثنوی ۱۰۹۶ ہجری میں سپرد قلم کی تو قیاس کہتا ہے جیسا کہ ولاوری صاحب نے فرمایا ہے کہ "یہ واقعہ نواب موصوف کے عہد میں اور اُن کی مملکت میں رونما ہوا۔"[2] اس دعویٰ کی دلیل یہ بھی ہے کہ خود غنیمت کے بیان کے مطابق عزیز نواب موصوف کا فرزند اور ولی عہد تھا ؎

مہین فرزند والا شان امیری　　سکندر شوکت افلاطون وزیری
درآن فرمانروائی ہائی موجود　　ولی عہدش اگر بود آں پسر بود

مغلیہ عہد میں فوجدار یا منصب دار کی وفات کے بعد یا اُس کی عین حیات میں اُس کے بیٹے کو وہی عہدہ شاذ و نادر ہی تفویض کیا جاتا تھا البتہ گورنروں کے بیٹے اُن کی زندگی میں بھی اُن کی بجائے بطور نائب حکمرانی کرتے تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ۱۰۲۳ ہجری میں جب خواجہ ابوالحسن تربتی کابل کا گورنر مقرر ہوا تو اس کی بجائے اس کا بیٹا ظفر خاں احسن بطور نائب کام کرتا رہا۔ پس اگر غنیمت نے عزیز کو نواب مکرم خاں کا ولی عہد کہا ہے تو بے جا نہیں کہا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ "اسیر وحشت آباد جنون" ہوگیا اور سرکاری عہدے سے محروم رہا۔ شاہنواز خاں کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا متبنّیٰ اگرچہ ملازم سرکار نہ تھا لیکن اس کا لڑکا حشمت اللہ خاں ملازمین دربار میں سے تھا۔ صاحب مآثر الامرا کا یہ جملہ کہ "عبیداللہ خاں نامی متبنائی او مشہور است" کلمہ "مشہور" توجہ طلب ہے اور قیاس یہ بھی کہتا ہے کہ نواب صاحب موصوف اپنے اس متبنیٰ کو پیار سے عزیز بھی کہتے ہوں گے لہٰذا عین ممکن ہے کہ داستان انہیں سے متعلق ہو۔

آخر میں یہ کہنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں شعرا کی وہ قدر و منزلت نہ تھی جو عہد شاہ جہانی یا اُس سے ماقبل دور میں ہمیں نظر آتی ہے۔ تذکروں میں ایسے بہت سے واقعات کا ذکر ہے جن میں امرا نے شعرا کو صلہ یا انعام دینے میں بخل سے کام لیا۔ ایسے ماحول میں شاعر کا کسی معمولی فوجدار کے ہاں ملازمت اختیار کرنا قرین قیاس نہیں۔ میرزا ارتق بیگ فوجدار سیالکوٹ غیر معروف انسان ہے۔ اور تاریخ میں اُسے کوئی مقام حاصل نہیں۔ برعکس اس کے میر اسحاق جو مکرم خاں کے خطاب سے شہرت یافتہ ہیں صوبیداری کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے ہیں لہٰذا اگر ہم تعصب کی رنگین عینک اتار دیں تو حقائق واضح و لائح ہو جاتے ہیں۔

۱۔ شاہنواز خاں۔ مآثر الامرا جلد سوم ص ۴۹۷ - ۴۹۸۔　۲۔ اورنٹیل کالج میگزین جلد ۱۸ ، شمارہ ۳

اے نقوی

اپنے ــــ بیگانے ـ !

"لیاقت مرگیا ــ!" سجاد غیر متوقع طور پر گیارہ بجے آفس سے واپس آگئے۔ ان کی آنکھیں بے حد سُرخ ہورہی تھیں۔

"مگر وہ تو ــ!" اس نے جانے کیا کہنا چاہا تھا کہ باقی الفاظ حلق کی گہرائیوں میں ڈوب گئے۔

"ہاں بس ــ!" سجاد نے بھی جانے کیا کہنا چاہا تھا۔ شاید باقی الفاظ ان کے سینے کی گہرائیوں میں دفن ہوکر رہ گئے تھے۔ یا پھر اپنی آواز کی بے پناہ لرزش کو محسوس کر کے وہ اچانک ہی چپ ہو گئے تھے۔

اس خبر کو سنکر اس پر کیا گزری اس کا بالکل اسے اندازہ نہ ہو سکا بس یوں محسوس ہوا گویا آنکھوں میں سمندر کا کھاری پانی خشک ہوگیا ہو اور نمک کے ننھے منے ذرّے اتنے تکلیف دہ بن گئے تھے کہ پلک جھپکانا دشوار ہوگیا۔ حلق میں جو چیز پھنسی ہوئی تھی وہ اتنی سخت تھی کہ سانس رُک سی گئی اور دل ــ! دل نے تو بہت ساخون ایکدم پمپ کر کے اچھال دیا اور تھوڑی دیر کے لئے چھٹی کر دی۔ وطن سے ہزاروں میل دور انگریزی طرز کے ایک سجے سجائے چھوٹے سے کاٹج میں بیٹھے بیٹھے وہ لیاقت کو کفن میں لپٹا ہوا دیکھ رہی تھی۔ ذہن پر ہتھوڑے سے لگ رہے تھے اور وہ خود ماضی کے ویرانوں میں بھٹک رہی تھی۔ جہاں اب سے چند سال پہلے اس کی کتابِ زیست کا ایک زریں ورق اُلٹ گیا تھا۔

دل کی ایک تیز دھڑکن کے ساتھ اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس نے آنکھیں مل کر بار بار پلکیں جھپکا کر دبیز اندھیرے میں کچھ دیکھنا چاہا مگر سارے کمرے میں پھیلا ہوا یہ بے کراں سنّاٹا بھی اسے اجنبی سا لگا۔ بالکل نیا ماحول۔ اجنبی سی جگہ اور نامانوس سے لوگ ــ! وہ دُنیا کے اس عجیب و غریب دستور کے متعلق سوچنے لگی۔ جانے کس کے ذہن میں پہلے پہلے اس قسم کے خیالات آئے ہوں گے۔ کچھ اُلٹی سیدھی رسموں کے ساتھ کس طرح انسان ماضی کے تمام تر انسانوں کو یکسر فراموش کر کے ایک نئی دہلیز پر قدم رکھتا ہے۔ غیروں کو اپنانے اور اجنبی لوگوں سے رشتہ جوڑنے کے لئے ہی یہ سب سلسلہ شروع ہوا ہوگا۔ اس کے ذہن نے مشورہ دیا۔ قدرت اور انسانوں کے ملے جلے اس روایتی نظام کے متعلق سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں پھر سے جھپکنے لگیں تھیں کہ کمرے کے باہر قدموں کی مسلسل چاپ نے اس کی نیند پھر اُچاٹ کردی۔

"سجاد ــ!" اس نے سجاد کو جگانا چاہا کہ اس کا بڑھا ہوا ہاتھ شرم و حجاب سے رُک گیا۔

کمرے کے باہر کوئی تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ قدموں کی چاپ دور جاکر ایک دفعہ پھر سے قریب آرہی تھی۔ چند ثانیے کے بعد اسے ایسا محسوس ہوا کہ کمرے کے دروازے کے قریب آکر کوئی رُک گیا ہو۔ اس قدر خنکی ہونے کے باوجود اس کا سارا جسم پسینے میں بھیگ گیا اور اس نے سجاد کے شانے پر زور سے ہاتھ رکھ دیا

"ہمارے کمرے کے باہر کوئی ہے ــ!" مارے خوف اور گھبراہٹ کے اسے اپنی آواز خود لرزتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"ہمارا ایک بھائی پاگل ہے ــ!"

سجاد نے خواب آلود لہجے میں کہا اور ہاتھ بڑھا کر سوئچ دبا دیا۔ قدموں کی چاپ کب ختم ہوگئی۔ اسے کچھ پتہ ہی نہ چلا مگر پھر وہ نہ سو سکی۔

حجاب کے پردے آہستہ آہستہ سرکتے گئے۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی برآمدے میں اماں کے پاس تخت پر آبیٹھتی۔ وہ سلام پھیر کر پاندان کی طرف اشارہ کرتیں تو وہ نگاہیں جھکائے ہوئے پان بنا بنا کر خاصدان میں رکھتی جاتی۔ سروتہ ہاتھ میں لیکر چھالیہ کتر کر ان کے بٹوے میں رکھ دیتی۔ اماں دعا مانگ کر ایک بیڑا منہ میں رکھتیں تو وہ تو ام کی ڈبیہ ان کے سامنے کر دیتی۔ اور اگر ایسے میں سجاد آجاتے تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تیز قدموں سے اپنے کمرے میں آجاتی۔ یا وہیں سمٹی بیٹھی رہتی۔

اماں لیاقت کا ذکر کرتیں تو ان کی آنکھوں سے آنسو کے موٹے موٹے قطرے ایک دوسرے کے پیچھے لڑھکنے لگتے۔ اماں کو یوں روتا دیکھ کر گھر کے باقی افراد چپ سے ہو جاتے۔ گریہ خاموشی لمحاتی ہوتی۔ تھوڑی ہی دیر بعد مسکراہٹیں اور قہقہے سارے گھر میں بکھر جاتے اس کا دل انجانے طور پر اداس ہو جاتا۔ اور کتنی ہی دیر تک دل میں کانٹا سا چبھا رہتا۔

"شکیلہ تم خوش ہو ۔؟ سجاد نہایت التفات سے پوچھتے۔

"بیحد ۔!" اس کی آنکھیں فرطِ حیا سے جھک جاتیں۔ مگر دوسرے ہی لمحے اسے لیاقت کا خیال آجاتا اور خوف سے جھرجھری سی آجاتی۔ جس گھر میں ایک پاگل بستا ہو بھلا وہاں انسان کس طرح خوش رہ سکتا ہے ۔ وہ دل ہی دل میں کہہ پاتی۔ اور ہوش و خرد سے بیگانہ مختلف ہیئت والے پاگل عجیب و غریب سی حرکتیں کرتے ہوئے اس کے سامنے آکھڑے ہوتے۔ خوف اور دہشت سے نکلتی ہوئی چیخ اس کے سینے میں گھٹ کر رہ جاتی۔ رومال سے پسینہ صاف کر کے وہ اپنا بے جان سا ہاتھ سجاد کے بھرے بھرے ہاتھ پر رکھ دیتی۔ سجاد جانے کیا سمجھتے اور خوش ہو جاتے۔ جب وہ سجاد کی طرف دیکھتی تو اسے ڈر لگتا کہ اس کی آنکھوں میں چھپے ہوئے خوف کو پڑھ کر وہ بدظن نہ ہو جائیں۔ آخر اس گھر میں باقی لوگ بھی تو لیاقت ہی کے ساتھ رہ رہے تھے۔ بعض دفعہ تو مارے ندامت کے اس کا سر نہ اٹھتا۔ سجاد کو معلوم ہو جائے تو وہ کیا سوچیں گے۔

اسی رات سے لیاقت غائب تھا۔ شکیلہ نے ابھی تک اسے نہیں دیکھا تھا اور نہ وہ اسے دیکھنا چاہتی تھی۔ اچھا ہی ہوا جو وہ خود ہی کہیں چلا گیا تھا۔ وہ اکثر سوچتی۔

مگر جب کھانا شروع ہوتا اور پہلا نوالہ ٹوٹتے ہی اماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی سی لگ جاتی تو اس کا دل پسیج جاتا۔

"جانے کہاں ہوگا بدنصیب ۔! کچھ کھایا بھی ہوگا کہ نہیں ۔!" اندیشوں کے درمیان وہ نوالہ ہاتھ میں لئے کتنی دیر تک دوپٹے کے پلّو سے آنسو خشک کرتی رہتیں۔ انہیں اس طرح روتا دیکھ کر شکیلہ کے حلق میں بھی نوالے اٹکنے لگتے۔ وہ کتنی کتنی دیر کے بعد نوالے اٹھاتی۔

سجاد اس کو یوں پریشان ہوتا دیکھ کر بگڑ جاتے۔

"اماں ۔ بس ہوگا کہیں ۔!"

ہاں ۔ کہیں تو ہوگا ۔!" اماں اتنی گہری سانس لیتیں کہ شکیلہ کی آنکھیں چھلک جاتیں۔

"بیٹی ۔! تم اچھی طرح کھانا کھاؤ۔" وہ اس سے مخاطب ہو کر کہتیں۔ تو اسے محسوس ہوتا۔ ان کے لہجے شفقت کے بے پناہ جذبات کے ساتھ دکھوں کا ایک جہاں آباد ہوتا۔ اس کے دل میں ہمدردی کے جذبات ابھرنے لگتے۔

"ایک کے ساتھ تم لوگ سب کا سکون چھین لو ۔!" سجاد بگڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے۔

سجاد کی اس بے حسی پر اس کا دل دکھ جاتا۔ خوف کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں ہمدردی کے جذبات بھی پرورش پا رہے تھے۔

گھر میں ایک ایسے فرد کا ہونا واقعی کیسا تکلیف دہ احساس تھا۔

گھر کے تمام لوگوں کے ساتھ اجنبیت اور بیگانگی تو دور ہو چکی تھی۔ مگر پھر بھی بسا اوقات اس کا دل بے حد اداس ہو جاتا۔ وہ شام بھی بڑی اداس تھی وہ اماں کے پاس بیٹھی تھی۔ سرمئی دھندلکا ہر چیز پر چھایا جا رہا تھا۔ مغربی برآمدے سے کوئی گزرا۔ قدموں کی چاپ پر اماں نے سر اٹھایا۔

"لیاقت آگیا۔" شدت جذبات سے ان کا گلا رندھ سا گیا۔ شکیلہ نے بھی پلٹ کر دیکھا۔ چک کی اوٹ میں کھڑا وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول رہا تھا۔ کتنی دیر تک وہ اسی سمت پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ حالانکہ لیاقت اندر جا چکا تھا، کمرے کو بولٹ کرنے کی آواز بھی اس نے سنی تھی۔ مگر عجیب سا خوف اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ جب اس کی نگاہیں پلٹیں تو اماں سجدے میں جا چکی تھیں۔ اس نے چھالیہ کا ڈبہ اور سروتا ایک طرف کو سرکا دیا اور تیز قدموں سے اپنے کمرے میں آگئی۔ سجاد کے ہاتھ پر اس نے اپنا نرم سا ہاتھ رکھا تو اسے بڑا سہارا ملا کتنی دیر تک وہ بے حس و حرکت سی بیٹھی رہی۔ سجاد جانے کہاں کہاں کی باتیں کرتے رہے۔ ان کے کچھ دوست آگئے تھے اور جب وہ اٹھ کر جانے لگے تو اس کا بے اختیار جی چاہا کہ انہیں روک لے۔ مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ سجاد دروازے سے باہر نکل گئے تو اس نے چاہا کہ چٹخنی لگا دے۔ مگر پھر اپنے اس خیال پر اسے ندامت سی ہوئی۔ لیاقت نے تو اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا تھا اب وہ شاید ہی نکلے۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی دینی چاہی۔ میز پر سے رسالہ اٹھا کر وہ اس کی ورق گردانی کر رہی تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔

"شکیلہ بیٹی۔ یہ لیاقت ہے۔" اماں نے تعارف کرانے کے انداز میں کہا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔

آؤ، بیٹھو لیاقت۔" شکیلہ نے بیحد اپنائیت سے کہا اس کا سارا خوف دور ہو چکا تھا۔

لیاقت ایک ثانیہ تک یونہی چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر ذرا آگے بڑھ کر اس نے انگلیوں سے کرسی کو چھوا اور جلدی سے بیٹھ گیا۔ بجلی کی روشنی میں اس کا سفید رنگ بیحد دمک رہا تھا۔ سیاہ چمکیلے بال بڑے سلیقہ سے بنے ہوئے تھے۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کو وہ جلدی جلدی جھپکا رہا تھا۔ اس کے سیاہ قیمتی سوٹ پر بے شمار شکنیں تھیں۔ وہ عام انداز میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ وہ دل ہی دل میں نادم ہو رہی تھی کتنے خوبصورت اور دلچسپ انسان کے کیسے کیسے ہیولے اس کے ذہن میں آرہے تھے۔

اتنا باسلیقہ اور خوش پوش انسان پاگل کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ اماں سے پوچھ لے۔ مگر وہ تو جا چکی تھیں۔

"کہاں رہے اتنے دنوں سے۔" شکیلہ نے بڑی خوشدلی سے پوچھا۔

"ایک انٹرویو تھا۔" لیاقت نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ وہ زیر لب مسکرا دی۔

"تو بتا کر جاتے اماں بیچاری اس قدر پریشان تھیں۔"

وہ چپ رہا۔ سگریٹ کے گہرے کش لیتا رہا اور ہوا میں دھوئیں کے اڑتے ہوئے بادلوں کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں آہستہ آہستہ اداسی کی لکیریں ابھر رہی تھیں اور سارے چہرے پر اضمحلال تھا۔ جیسے وہ بہت تھکا ہوا ہو۔

"کیا نتیجہ رہا انٹرویو کا۔" شکیلہ نے اکتا کر اس خاموشی کو توڑا۔ اسے اس قدر اداس دیکھ کر اس کا اپنا جی بھی اداس ہو گیا تھا۔

"ایک سوال کا جواب نہیں دے سکا۔" یہ کہہ کر وہ یکلخت چپ ہو گیا۔

"کونسا سوال تھا۔" شکیلہ نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

وہ چپ رہا جیسے اس نے اس کی بات ہی نہ سنی ہو۔ لائٹر سے اس نے دوسرا سگریٹ سلگایا اور گہرے گہرے کش لینے لگا۔ میز پر رکھے ہوئے سگریٹ کیس اور لائٹر پر اس کی نگاہیں جم سی گئیں۔ دونوں چیزیں بیحد قیمتی تھیں۔

" یہ تمہارے سجاد صاحب کی نہیں ہیں۔" اس نے جلدی سے دونوں چیزیں اٹھا کر پتلون کی جیب میں ٹھونس لیں۔ وہ پھیکی سی ہنسی ہنس پڑی۔

چند لمحوں تک مکمل سکوت رہا۔ وہ بڑے سکون سے دوپٹہ میں لگی ہوئی کرن سے کھیلتی رہی اور لیاقت سگریٹ پیتا رہا۔ ایک دفعہ جو اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہ میز پر کہنیاں ٹکائے یکساں اسے تکے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غیر معمولی سی چمک تھی۔ عجیب وحشتناک سی چمک —! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا پاگل پن اس کی آنکھوں میں سمٹ آیا ہو۔ اس کا دل زور زور سے دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ ایک پاگل کے ساتھ تنہا کمرے میں بیٹھنے کے احساس ہی سے اس کا سارا جسم پسینے میں بھیگ گیا اور اس نے چاہا کہ چیخ مار کر کمرے سے باہر نکل جائے۔ مگر وہ یوں ہی بے حس سی بیٹھی رہی اس میں تو ہلنے تک کی سکت باقی نہ رہ گئی تھی۔ تمام ترقوتیں جانے کس طرح سلب ہو گئی تھیں۔

" ہاں — تو وہ کونسا سوال تھا لیاقت —!" چند لمحوں بعد اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے وہی سوال دہرا دیا۔ فضا بدلنے کے لئے اسے کوئی موضوع نہیں سوجھ رہا تھا۔ گھبراہٹ سے اس کی آواز میں جو ارتعاش پیدا ہو چکا تھا وہ خود بھی اسے محسوس کر رہی تھی۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر اس نے بے جان سی مسکراہٹ لانے کی کوشش کی۔ لیاقت نے میز پر سے ہاتھ اٹھا لئے اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ جلتا ہوا سگریٹ اس کے بالکل قریب آ چکا تھا۔ آخری کش لے کر اس نے جوتوں کے نیچے بڑی زور سے کچل دیا۔

" یہ کمیشن والے بڑے کمبخت ہوتے ہیں —!" اس کی پہلی والی کیفیت تقریباً ختم ہو چکی تھی اور اب وہ بڑی خوشدلی سے بول رہا تھا۔ " جانتی ہو — جسے نہ لینا چاہیں اس سے ایک ایسا اوندھا سیدھا سوال پوچھ لیتے ہیں کہ بس وہ چکرا ہی جائے۔" اس نے انگلی کو بڑی تیزی سے گردش دے کر ہوا میں چکر سا بنایا اور پھر اتنے زور سے ہنسا کہ وہ لرز کر رہ گئی۔

" جناب —! ایسا چکر دیتے ہیں کہ بس ساری دنیا گھومنے لگتی ہے۔ میز کرسی ٹیلی فون اور وہ خود جب میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا تو بس میں ساٹھ میل کی رفتار سے بھاگا —!" وہ بہک رہا تھا۔ ایک دفعہ پھر ہر قسم کے جذبات سے عاری کھوکھلا سا قہقہہ فضا میں بکھر کر ماحول میں وحشت ناک سناٹا بکھیر گیا تھا۔ اب اس نے کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور بال پریشان ہو گئے تھے۔ شکیلہ کی نگاہیں بار بار دروازے کی طرف اٹھ جاتیں۔ جانے سجاد نے اتنی دیر کیوں لگا دی تھی۔ لیاقت کی الٹی سیدھی باتوں سے اسے خواہ مخواہ ہول آ رہا تھا —

دوسرے دن صبح ہی صبح لیاقت اس کے کمرے میں آ دھمکا۔ سنگار میز کے سامنے کھڑی وہ بال بنا رہی تھی۔ کالے سیاہ بال اس کی ساری پیٹھ پر پھیلے ہوئے تھے۔ کنگھا سر سر کرتا ہوا بڑی تیزی سے ابھر اور ڈوب رہا تھا۔ لیاقت اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹک سی گئی۔ آئینہ کے چوکھٹے میں دونوں کا عکس کسی فریم کی ہوئی تصویر کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ ایکدم جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ لیاقت زور سے ہنسا۔

اس نے پلٹ کر مینٹل پیس کی طرف دیکھا۔ جہاں اس کی اور سجاد کی فریم کی ہوئی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ جانے کیوں اسے ایکدم ایسا محسوس ہوا کہ سجاد کے ساتھ اس کی یہ تصویر موزوں نہ ہو۔ لمحہ بھر کے لئے اس کے ذہن میں بھنور سا آ گیا۔ غیر ارادی طور پر پھر اس کی نگاہ آئینہ پر پڑی۔ فوراً ہی اسے کہ جیسے کسی نے جھنجھوڑ سا دیا اور وہ ایک عجیب احساس سے مینٹل پیس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کے بال اسی طرح شانوں پر بکھرے ہوئے تھے ہاتھ میں کنگھا لئے وہ تصویر پر نگاہیں جمائے کھڑی رہی اور جانے کب لیاقت پاس آ کھڑا ہوا۔ بالوں کی ایک لٹ اس نے [illegible] لے لی۔ شکیلہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

" لیاقت — تم تھوڑی دیر کے لئے باہر چلے جاؤ — میں —!" وہ ہکلا سی گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے کیا کہے۔

" پھر آجانا —" اس نے جلدی سے کہہ دیا۔

کچھ کہے سنے بغیر لیاقت سیٹی بجاتا ہوا کمرے سے نکل گیا — پھر سارا دن وہ نظر نہ آیا۔ برآمدے سے گزرتے ہوئے کئی دفعہ اُس نے اس کے کمرے کو بند ہی دیکھا تھا۔ جتنی دیر وہ کمرے میں رہتا اندر سے بند رکھتا اور جب باہر جاتا تو تالا لگا دیتا۔ رات کو آخری شو دیکھ کر آئے تو سجاد تو جلد ہی سو گئے مگر وہ بڑی دیر تک جاگتی رہی۔

سجاد صاحب چھٹیاں پوری کر کے واپس جا چکے تھے۔ بعض اوقات اسے تنہائی کا شدید احساس ہوتا۔ کتابیں رسالے پڑھتے پڑھتے وہ بیزار سی ہو جاتی تو باہر آکر اماں کے پاس آبیٹھتی، کبھی باغیچے میں جا بیٹھتی۔ رنگ برنگ کے خوبصورت پھول بھی اس کا دل نہ بہلا سکتے۔ اماں اسے کسی کام کو ہاتھ بھی نہ لگانے دیتیں۔ ابھی تو ہاتھوں کی مہندی بھی نہیں پھیکی پڑی تھی۔ ان کا خیال تھا۔ اسی لئے انہوں نے اسے سجاد کے ساتھ بھی جانے نہیں دیا تھا۔ بڑے شہروں میں ڈھنگ کے نوکر بھی تو نہیں ملتے۔ یہ کہہ کر انہوں نے سجاد کو لاجواب کر دیا تھا۔ بعض وقت وہ خود بھی اپنی اس کیفیت سے کوفت میں مبتلا ہو جاتی — لیاقت بھی تو ان دنوں جانے کہاں غائب رہتا — رات گئے آتا اور صبح سویرے نکل جاتا۔ اماں سے وہ اکثر لیاقت کی بیماری اور علاج وغیرہ کے متعلق باتیں کرتی رہتی۔ اماں اسے تفصیل بتاتے ہوئے گہرا سانس لیتیں تو اس کا جی بے حد اُداس ہو جاتا۔

" اماں — اب بجلی کا علاج کروائیں گے —" انہیں اس قدر افسردہ دیکھ کر وہ جلدی سے کہہ اُٹھتی۔

" ارے بچی کیا کیا نہ جتن نہیں کئے۔ جانے کون سے گناہ کی سزا میں اللہ نے یہ بچہ دیا — اس کی اس حالت کو دیکھ کر ہر وقت سینہ میں شعلے سے بھڑکتے رہتے ہیں — مامتا بری چیز ہے بچی —!" وہ بے حد دکھی ہو جاتیں۔ شکیلہ چپ چاپ ان کے چہرے کو تکتی رہتی جس پر غم کی پرچھائیاں لرز رہی ہوتیں۔

" سب اپنے اپنے گھر کے ہو لئے تو اس غریب کو کون پوچھے گا —!" ان کی آنکھوں میں فکر و اندیشے کی لکیریں گہری ہو جاتیں۔

" یوں نہ کہئے اماں — میں لیاقت کو ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گی — اور آپ ہی جتنا خیال رکھوں گی —" وہ نہایت عزم سے کہتی۔

" جسے اپنا آپ ہوش نہ ہو — اسے کون سنبھالے گا —!" اماں بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتیں تو اس کی نگاہیں جھک جاتیں۔ اماں کی باتوں میں اسے صداقت نظر آتی۔

" ایک دن نہ دو دن — ساری زندگی کا ذمہ کون اٹھا سکتا ہے — اور پھر — سجاد جیسا لاپروا بھائی —!" انہیں ہمیشہ سجاد کی بے پرواہ طبیعت سے شکایت رہی۔

" ڈاکٹر کیا کہتے ہیں اماں —!" اس نے گفتگو کا رُخ بدلنے کو کہا۔

" پہلے تو ڈاکٹر صحت یابی کا یقین دلاتے تھے مگر اب تو کوئی کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے ٹھیک نظر آتا ہے پھر کوئی ایسی اُلٹی سیدھی بات کر دیتا ہے —" ان کے لہجے میں بے حد اداسی تھی۔

" وہ تو کہو محلے والے اچھے ہیں تمہارے ابا کا لحاظ کرتے ہیں ورنہ یہ تو ہر وقت ایک آفت برپا کئے رہتا ہے۔ بچی — اب تو تم نے اس کا حال دیکھ ہی لیا ہے، نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کی فکر۔ مہینوں گھر سے غائب رہتا ہے۔ ہفتوں اپنے آپ کو کمرے میں بند رکھتا ہے۔ اچھے بُرے کی کوئی تمیز نہیں جس کی چیز ہاتھ لگ گئی غائب کر لے گا۔ سب ہی اس سے نالاں ہیں! نامراد بھائیوں کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں چھوڑتا

نہ پڑھنا نہ لکھنا جانے، کیوں قلم پنسل جمع کرتا رہتا ہے۔ ایک دفعہ تمہارے ابا کے افسر آئے۔ رات کو یہیں ٹھہرے صبح کو دردی غائب تھی۔ افسر مہربان تھا۔ لیاقت کی دماغی حالت سے بھی خوب واقف تھا ہنس کر چپ ہو رہا۔" وہ بلا تکان ساری کہانی بتائے جا رہی تھیں۔ شکیلہ کے دل میں ہمدردیوں کے طوفان پل رہے تھے۔

"مسلسل عذاب بن کر رہ گیا ہے کمبخت۔ ۔! موت بھی نہیں آتی بدنصیب کو۔ ۔!" اماں کا گلا رندھ گیا اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی ۔ ۔ ۔ اس کی بھی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ۔ قدموں کی آواز پر اس نے سر اٹھایا۔

"کمسنی میں دل پہ غم کا بار کیوں۔ ۔!"

گنگناتا ہوا لیاقت اس کے بالکل قریب بیٹھ گیا۔ ۔ وہ جھجک کر ذرا ہٹی۔

"نامراد۔ ۔!" اماں چیخ اٹھیں۔

اس نے پلٹ کر اماں کی طرف دیکھا۔ ۔ ایک لحظہ تک ان کی طرف تکتا رہا پھر ان کے ہاتھ سے پان لے کر جلدی سے منہ میں رکھ لیا۔ اب وہ اماں سے کچھ روپیوں کا مطالبہ کر رہا تھا اور اماں اسے بھائی کی انگوٹھی بیچ لینے پر لعن طعن کر رہی تھیں! اچانک اس کا لہجہ بدل گیا اور وہ زور زور سے بولنے لگا۔

"اپنے بیٹوں پہ دولت دنیا خرچ کی۔ ۔ مجھے کیا دیا۔ ۔!" اس کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت کے شعلے بھڑک اٹھے تھے۔

"کوئی ڈاکٹر بن رہا۔ ۔ کوئی مجسٹریٹ۔ ۔ کوئی۔ ۔ ۔!" شدت جذبات سے باقی الفاظ اس کے حلق میں ہی ڈوب گئے تھے۔

"لیاقت۔ ۔!" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر تخت پر بٹھا دیا۔

اس کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں اور سارا جسم بری طرح لرز رہا تھا۔ اماں اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ شکیلہ نے پانی کا گلاس دیا جسے اس چند گھونٹ ہی میں خالی کر کے زور سے میز پر رکھ دیا۔

"تمہیں اس انداز میں اماں سے گفتگو نہیں کرنی چاہئے تھی۔ ۔ ۔" جب اس کی حالت ذرا سدھری تو شکیلہ نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"شکیلہ بی۔ ۔ کیا تم کو نہیں معلوم کہ زندگی کی ضروریات میں بھی اسی شدت سے محسوس کرتا ہوں جس طرح سجاد اور۔ ۔!" وہ یکلخت چپ ہو گیا۔ شکیلہ نے سر جھکا لیا۔

پاگل بھی کیسی ہوش کی باتیں سوچ سکتے ہیں۔ ۔! وہ سوچتی رہتی اور اس المیہ کے پس منظر کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ ٹھنڈی سانس لے کر جب اس نے سر اٹھایا تو وہ جا چکا تھا۔

شام کو شاپنگ کر کے لوٹی تو وہ پلاسٹک کے تاروں کا ڈھیر اٹھا لائی۔ ۔ لیاقت کی تلاش میں وہ گلاب کے تختہ کے پاس آئی۔ جہاں وہ کبھی کبھی بیٹھ کر پینٹنگ کیا کرتا تھا۔ چند ہی دن تو ہوئے تھے جب اس نے اسے تصویریں بنانی سکھائی تھیں۔ اب تو وہ بڑی اچھی چیزیں بنا لیتا تھا اگر اس کا ذہن کسی طرف راغب ہو جائے تو شاید یہ پاگل پن بھی کسی حد تک کم ہو جائے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ اس کے بالکل قریب آ گئی۔

"کہ تم میری زندگی ہو۔ ۔ کہ تم میری زندگی ہو۔" وہ گنگنا رہا تھا اور اس کے ہاتھ بڑی تیزی سے برش چلا رہا تھا۔ اس نے اس کے ہاتھ سے تصویر لے لی۔ ۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ حیرت زدہ سی رہ گئی۔ یہ خود اس کی اپنی تصویر تھی۔ ۔ کتنی مکمل اور جامع۔ ۔ چند لمحوں کے بعد اس نے تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہوا میں اچھال دیا۔ ۔ لیاقت چپ رہا۔ چند لمحوں تک مکمل سکوت رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے بات کرے یا واپس لوٹ جائے۔ پھر اسے ایک ذہنی مریض سمجھ کر ہمیشہ کی طرح وہ اس وقت بھی ٹال گئی۔

"یہ لو۔۔!" اس نے اس کے سامنے تاروں کا گچھا ڈال دیا۔

"جھل۔۔ لوگ عیش کریں اور میں نوکریاں بنوں۔۔!" لیاقت نے دانت پیس کر شکیلہ کو گھورا۔ شکیلہ گڑبڑائی مگر جلدی سے بولی۔

"تم ان سب سے زیادہ عیش کروگے کوئی ہنر تو سیکھ لو۔" وہ وہیں اس کے پاس بیٹھ گئی۔ تار پر گرہ لگانی سکھاتے ہوئے اسے انجانی سی خوشی ہوئی

"یہ دیکھو۔۔!"

پلاسٹک کے تاروں کے بجائے لیاقت نے مضبوطی سے اس کے ہاتھوں پر اپنی انگلیاں رکھ دیں۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی۔ اس کی آنکھوں میں وہی ویرانی اور وحشت تھی۔

"کیوں۔۔ کیا اس گھر پر میرا کوئی حق نہ تھا۔۔!" اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

شکیلہ نے گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے اس کے ہاتھ سے سگریٹ کا ٹکڑا لے کر کیاریوں کی طرف اچھال دیا۔

"پہلے یہ کام کرلو۔۔!"

"مجھ سے یہ کام نہیں ہونے کا۔۔!" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"لیاقت۔۔!" شکیلہ نے اس کے کوٹ کی آستین زور سے پکڑ لی۔ وہ زور سے ہنس پڑا اور چپ چاپ بیٹھ گیا۔

"اچھا لاؤ۔۔!" اس نے مسکرا کر سر نیچے کیا اور سنجیدگی سے گرہ لگانی سیکھی۔ چند لمحوں بعد اس کے ہاتھ بڑی تیزی سے چلنے لگے۔

"لیکن ان لوگوں نے مجھے پڑھایا کیوں نہیں۔۔ میں یہ پوچھتا ہوں۔" وہ رکا۔

شکیلہ ان سنی کرتے ہوئے پلاسٹک کی تاروں سے کھیلتی رہی۔ وہ اسے خاموش دیکھ کر پھر اپنے کام میں جٹ گیا۔ وہ اسے کام میں مصروف دیکھتے ہوئے بڑا سکون محسوس کر رہی تھی۔۔ اس طرح شاید یہ اپنا کفیل خود بن سکے۔ وہ سوچتی رہی ورنہ یہ بیمار سی زندگی کس طرح اس جنون کی حالت میں گزرے گی۔ جانے کتنا وقت گزر گیا۔

"اب اپنے کمرے میں جا کر کام کرو۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دھند اور خنکی بہت بڑھ چکی تھی۔

برآمدے کے موڑ پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ لیاقت ادھ بنی ٹوکری لئے اس کے پیچھے پیچھے کسی معصوم بچے کی طرح چلا آ رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لئے ٹھٹک سی گئی۔

"مجھ سے ترقی ہو گیا۔۔!" اس نے قریب آکر اس سے پوچھا۔

"نہیں تو۔۔!" وہ زور سے ہنس پڑی۔

"تم کتنی اچھی ہو شکیلہ۔۔! میرا کتنا خیال رکھتی ہو۔۔!" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔۔

"پہلی ٹوکری میں تم سے خرید لوں گی۔" اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور موضوع بدلنے کے لئے جلدی سے کہا۔

"یہ ٹوکری میری ہوگی۔۔" اس نے دس روپے کا ایک نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ لیاقت ہاتھ میں نوٹ لئے چپ چاپ کھڑا رہا۔

"اب تو کسی کی چیز بلا اجازت نہیں لوگے۔۔!" شکیلہ نے بڑی شفقت سے پوچھا۔

"نہیں۔۔!" اس نے بچوں کی طرح نفی میں سر ہلا کر کہا۔

"اب بھابی کی انگوٹھی واپس کر دو۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ بھی تیزی سے پلٹا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد اس کے کمرے کی چوکھٹ پر کھڑا نظر آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر شکیلہ کے نرم گلابی ہاتھوں پر مٹھی کھول دی۔ اسے انگوٹھی دے کر وہ وہیں قالین پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔

"جانے کیوں ابھی تک سجاد نہیں آئے۔۔!" شکیلہ نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"خاکم بدہن۔ ایکسیڈنٹ ہو گیا ہو گا" لیاقت نے بیحد پُرسکون لہجے میں کہا۔

"لیاقت۔!" وہ تقریباً چیخ پڑی۔

"شکیلہ۔!" اس نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر سارا دھواں اس کے منہ پر چھوڑ دیا۔

"تم مجھے بھابی کیوں نہیں کہتے۔!" شکیلہ نے رومال سے دھواں دور کرتے ہوئے بڑی ناگواری سے کہا۔

وہ کھسک کر اس کے بالکل قریب آ گیا اور بازو صوفے پر ٹکا دیا۔

"سنو۔! کیا تم بھی مجھے پاگل سمجھتی ہو۔!"

"ہاں۔!" شکیلہ نے بڑی صفائی سے کہہ دیا۔

"کیوں۔" اس نے اس کا ملائم ہاتھ اپنے کھردرے ہاتھوں میں زور سے پکڑ لیا۔

"تمہاری ان پاگل پن کی حرکتوں سے۔!" شکیلہ نے آہستہ سے کہا۔

"تو۔ تو سجاد کو کیوں نہیں سمجھتیں۔!" وہ رُک رُک کر بول رہا تھا۔ شکیلہ کے رخساروں میں انگیٹھی سی دہک اٹھی۔

"سچ بتانا شکیلہ۔ تم نے سجاد کو کس بات پر فوقیت دی تھی"

"لیاقت۔ تمہیں یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔" اس نے آہستہ سے اسے سمجھانا چاہا۔

"سجاد ایک ایس۔ ڈی۔ او ہی تو ہے۔ وہ تو میں بھی بن سکتا تھا۔ میں نے تو اس لائن کو خود ہی نہیں اپنایا۔" اس نے بیحد حقارت سے کہا اور اس کا ہاتھ چھوڑ چھاڑ مارے جوش کے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ہُنہہ۔!" اس نے بُرا سا منہ بنایا۔

"یہ تمہارے قیمتی کپڑے۔ یہ خوبصورت زیور سب ایسی ویسی آمدنی سے بنے ہیں۔ خبر ہے تم کو۔!" اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کی آنکھوں میں وہی وحشت ناک چمک اُبھر رہی تھی۔

"تم یہ سب پہن کر خوش ہوتی ہو گی مگر جانتی ہو یہ سب کتنا گناہ ہے۔!" وہ بے حد غصہ میں بول رہا تھا۔ پھر وہ تیز تیز قدموں سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"بولو۔ کیا ایس ڈی۔ او ہی پسند ہیں۔!" وہ لحظہ بھر کے لئے اس کے پاس رُکا اور نہایت رُعب سے پوچھا۔ شکیلہ چُپ چاپ بیٹھی رہی وہ اس کی پاگل پن کی باتوں کا کیا جواب دیتی۔ لیاقت تیزی سے مُڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

چند لمحوں بعد وہ بڑے قیمتی سوٹ میں اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"کہیئے کیا خیال ہے۔!" وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

شکیلہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں پسند۔!" اس نے سیٹی میں کوئی دھن بجائی۔ ہوا میں انگلی سے چکر بنایا اور باہر نکل گیا۔

شکیلہ کا ذہن اُلجھ کر رہ گیا۔ لیاقت واقعی گھر والوں کے لئے ایک ایسی کربناک اذیت بن چکا تھا جس سے سب گھر والوں کا سکون یکسر ختم ہو گیا تھا۔ وہ خود اس کی حالت دیکھ کر پہروں لگو رہتی۔ تمام بھائیوں میں کوئی بھی تو اس کے پاسنگ نہ تھا۔ اس قدر خوبصورت۔ وجیہہ اور بلند قامت کہ دل چاہتا کہ پہروں اسے دیکھتا ہی رہے۔ مگر جوش و خرد سے بیگانہ۔ اس نے سلائیاں ایک طرف رکھ دیں اور اس کی نگاہیں آتشدان میں دہکتے ہوئے انگاروں پر جم گئیں۔ وہ لیاقت ہی کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔ قدموں کی چاپ پر اس نے سر اٹھایا۔

اس دفعہ وہ آپا کا یونیفارم پہنے ہوئے تھا۔ شکیلہ دم بخود سی رہ گئی۔ پولیس افسروں کی مخصوص سی ٹوپی اس پر کس قدر سج رہی تھی۔ اس کا دل یکدم بے حد افسردہ ہو گیا۔

" نہیں پسند۔ ! " اس نے اپنا سوال دہرایا وہ ابھی تک ڈنڈا ہوا میں لہرا رہا تھا۔ اس دفعہ جب وہ کمرے سے باہر نکلا تو شکیلہ کا جی چاہا کہ اٹھ کر دروازہ بند کر لے۔ مگر وہ نہ اٹھ سکی۔

" شکیلہ بیگم۔ ! " لیاقت کی آواز پر اس نے سر اٹھایا۔ سفید براق ساکوٹ پہنے گلے میں ستھسکوپ ڈالے وہ چلا آ رہا تھا۔ ہیڈ لیمپ بکس میز پر رکھ کر اس نے نبض دیکھنے والے انداز میں اس کی کلائی پر انگلیاں رکھ دیں۔

شدت احساس سے شکیلہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ قدرت کے اس بے رحم فیصلہ پر اس کا دل چیخ اٹھا۔ کیا واقعی یہ شخص دیوانہ ہونے کے قابل ہے۔ ! وہ اس کے اس قدر قریب تھا کہ اس کی تیز گرم سانس اسے اپنے رخساروں پر محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ اس کے شانوں پر سر رکھ کر اتنے آنسو بہائے کہ دل کا سارا درد آنسو بن کر بہہ جائے۔

" تم جو کچھ کہو گی وہی بن جاؤں گا۔ جو کچھ مانگو گی لاؤں گا۔ اگر تم نے آسمان کے ستارے مانگے۔ کہکشاں کے قدموں کی دھول مانگی تو یقین کرو ہرگز گریز نہ کروں گا۔ " ! اس کی آواز سرگوشیوں میں بدل گئی تھی۔ وہ مبہوت سی کھڑی رہی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وقت کی رفتار، زمانہ کی گردش سب کچھ لمحاتی طور پر رک گئے ہوں۔ لیاقت کی پاگل آنکھوں نے اسے دم بھر کے لئے پاگل بنا دیا تھا۔ وہ بے حس و حرکت سی اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔

" شکیلہ۔ ! " اس نے سرگوشی سی کی اور اپنے دہکتے ہوئے ہونٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

" لیاقت۔ ! " وہ چونکی۔ تمام توانائیاں عود کر آئیں۔ اور ایک بھرپور ہاتھ لیاقت کے رخسار پر جا پڑا۔ اس کے ہاتھ جھٹک کر وہ پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی کتنی تھکی ہوئی تھی وہ۔ ! گویا کوسوں کی مسافت پیدل طے کر آئی ہو۔ جانے کتنی منزلیں مار آئی ہو۔ جیپ کی آواز پر وہ چونکی۔ سجاد آ چکے تھے۔ اس نے گھبرا کر کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ لیاقت جا چکا تھا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

کئی دنوں سے لیاقت پھر غائب تھا۔ شام کو وہ اُداس سی کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ سامنے پارک میں سمنٹ کے بنچ پر لیاقت بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اور کپڑے بے ترتیب ہو رہے تھے۔ بچوں کا ایک ہجوم اس کے گرد و پیش تھا۔ وہ اسے ہر ہر طریقہ سے تنگ کر رہے تھے۔ وہ ایک لڑکے کو مارنے کے لئے اٹھتا تو دوسری طرف کی پارٹی کا لڑکا اس کا کوٹ پکڑ کر کھینچتا اور ہنسی کا ایک فوارہ سا چھوٹ پڑتا۔ وہ دوسری طرف متوجہ ہوتا تو کوئی "لیاقت بھائی" کہہ کر اس کے سامنے کاغذ کا ٹکڑا یا رومال لہرا دیتا۔ وہ غصہ میں اگر ایک آدھ کو دبوچ لیتا تو مختلف سمت سے پتھروں کی بارش سی ہونے لگتی۔ وہ ان سے بچنے کے لئے ہاتھوں کو آڑ بناتا مگر کوئی نہ کوئی پتھر اسے لگتا۔ بچوں کا یہ شغل جانے کب سے جاری تھا اس کی یہ حالت دیکھ کر شکیلہ بے چین ہو گئی۔

" اماں۔ ! لیاقت باہر پارک میں بیٹھا ہے "۔ وہ تیز قدموں سے اماں کے پاس آئی اور جب اماں نے اسے بلانے کے لئے نوکر کو بھیجا تو وہ جانے کدھر جا چکا تھا۔ اماں کی آنکھوں سے جھڑی سی لگ گئی اور وہ بھی ان کے پاس بیٹھی دوپٹے کے پلو سے آنسو خشک کرتی رہی۔

رات کو جب سجاد کھانے کی میز پر بیٹھے تو اماں نے ان کو خوب سنائیں "جانے کیسا زمانہ آن لگا ہے۔ بھائی کو بھائی کی خبر نہیں۔ " "جانے کہاں دھکے کھاتا پھر رہا ہوگا بیچارہ "۔ ! شکیلہ نے بھی دبی زبان سے اس قدر لاپرواہی کی مذمت کی۔ آخر وہ ان کا بھائی تو ہے۔ ! سجاد بغیر

کھانا کھائے میز پر سے اُٹھ گئے۔ اسے ندامت اور کوفت سے ہوئی۔ یہ ذکر کیوں چھڑ گیا۔ لیاقت تو پاگل ہی ہے دوسرے کس طرح اس کے ساتھ صحرا بہ صحرا مارے مارے پھر سکتے ہیں ــــ

ایک دن صبح ہی صبح اچانک لیاقت کہیں سے آگیا۔ اس کی پیشانی زخمی ہو رہی تھی اور کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ رہے تھے۔ بال پریشان تھے اور آنکھوں میں گہری وحشت تھی۔

"کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے لیاقت ــ!" شکیلہ کے دل میں ایک دفعہ پھر ہمدردیوں کا طوفان سمٹ آیا۔

وہ کچھ نہ بولا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر خلا میں تکتا رہا۔ اس نے بڑی مشکلوں سے اسے نہانے اور کپڑے بدلنے پر مجبور کیا۔ شام تک اس پر عجیب سناٹے کی سی کیفیت طاری رہی۔ اماں تو زیادہ چلا پھرا ہی نہیں اور جب اپنی جگہ سے اٹھا تو جہاں کا تہاں گھنٹوں ہی میں کھڑا رہا ــــ رات کو کھانے کی میز پر جب سب بیٹھے تو لیاقت بڑی انسانیت سے سر جھکائے کھانا کھاتا رہا۔ اتفاق سے اس نے سر اٹھایا تو نگاہ شکیلہ کے چہرے پر گئی۔ دونوں میاں بیوی بیک وقت ایک پلیٹ میں سے کباب اٹھا رہے تھے۔ ہاتھ پلیٹ پر اور نگاہیں ایک دوسرے کے چہرے پر تھیں۔ ان کی آنکھوں میں پھوٹتی ہوئی تبسّم کی لہروں کو دیکھ کر جیسے اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اس کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو گیا اور آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وحشیانہ پن سے اس نے کباب کی پلیٹ ایکدم کھینچ لی۔

"مجھ پر ہنستے ہو ــ!" پوری طاقت سے اس نے پلیٹ اٹھا کر زمین پر دے ماری۔ منع کرنے اور شور مچانے کے باوجود اس نے چاولوں کی ڈش اور سالن کے ڈونگے پھینک دیئے۔ اور پھر دونوں ہاتھوں سے باقی برتن میز پر سے نیچے گرا دئے۔ مارے وحشت کے اس نے کرسی اٹھا کر سجاد کو مارنا چاہا تو انہوں نے آگے بڑھ کر اسے پکڑ لیا ــ دوسری صبح جب سجاد اسے مینٹل اسپتال میں داخل کروانے کے لئے جانے لگے تو اماں کے ساتھ ساتھ اس کی بھی ہچکی بندھ گئی ــــ

سجاد واپس لوٹے تو بے حد بدحواس اور سراسیمہ سے تھے۔ آتے ہی نڈھال ہو کر کرسی پر گر پڑے۔

"بستر مل گیا لیاقت کو ــ!" اس نے رندھے گلے سے پوچھا

"بستر ــ!" انہوں نے آنکھیں کھولدیں۔

"وہ تو راستے ہی میں کسی اسٹیشن پر اُتر گیا ــ!" انہوں نے آہستہ سے کہا۔

اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اماں کے آنسو یک لخت خشک ہو گئے۔

پیکنگ کرتے ہوئے وہ سارا دن بے حد افسردہ رہی۔ آج وہ صحیح معنوں میں اپنے گھر سے اتنی دور جا رہی تھی۔ کئی مرتبہ اسے لیاقت کا خیال آیا۔ اور دل چاہا کہ جاتے جاتے اس سے مل لیتی تو اچھا تھا۔ صبح سے رشتہ داروں اور ملنے والوں کا ایک تانتا سا بندھا ہوا تھا۔ لیاقت کی غیر موجودگی اسے بُری طرح کھٹک رہی تھی۔ بار بار خیال آتا جانے کہاں ہوگا۔ بیچارہ ــ! اگرچہ وہ اس کی موجودگی سے خائف رہتی تھی مگر پھر بھی اس سے بغیر ملے اتنی دور چلے جانا اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کئی دفعہ شوہر سے لیاقت کا ذکر کرنا چاہا۔ مگر انہیں خاموش دیکھ کر وہ بھی چپ ہی ہو گئی۔ اماں کو صرف یہ یاد دلانے کے لئے کہ وہ اس کے خیال سے غافل نہیں۔ ایک دفعہ اس نے کہا جانے کب لیاقت سے ملاقات ہو ــ خیر جب بھی وہ گھر آئے میری طرف سے بہت بہت دعا کہئے گا۔"

سامان درست کرکے وہ تھکی ہاری بستر پر آ کر لیٹی تو بھی اسے بار بار لیاقت کا خیال آتا رہا۔ جانے بیچارہ کہاں کی خاک چھانتا پھر رہا ہوگا؟ یہ خیال اسے بے چین کئے دے رہا تھا۔ سجاد تو خراٹے لینے لگے مگر اس قدر تھکاوٹ کے باوجود اسے بالکل نیند نہیں آ رہی تھی کچھ عجیب

عجیب سے خیالات اسے پریشان کئے دے رہے تھے۔ تمام رشتہ داروں سے اس قدر دوری۔ ایک آزاد ماحول اور فضا۔ شوہروں کی بے وفائی۔ مردوں کی طوطا چشمی حسن و رنگ کے بیجا بانہ جلوؤں کے سُنے سنائے افسانے اس کے ذہن میں ہلچل سی مچا رہے تھے۔ جانے وہاں زندگی کا کیا رُخ ہو! ان خیالات کے ساتھ ہی وہ اس قدر پریشان ہوئی کہ سوئے ہوئے سجاد پر ایک نظر ڈال کر وہ دبے پاؤں کمرے کے باہر آگئی۔ کھلی فضا میں اسے کچھ سکون سا محسوس ہوا۔ یکایک اس کی نگاہ سامنے ایک کونے میں ٹمٹماتی ہوئی چنگاری پر گئی۔ اور اس کا دل حلق میں آگیا۔ "یہ کون ہے۔! غور سے دیکھنے پر اُسے برآمدے میں کوئی کھڑا ہوا معلوم ہوا اور اسے پہچاننے میں چند منٹ بھی نہ لگے۔ یہ لیاقت تھا۔

"ہائے۔!" وہ بڑی تیزی سے اس کی طرف لپکی۔

"لیاقت۔!" وہ اس کے قریب پہنچ کر رک گئی۔

لیاقت نے سگریٹ پھینک دی اور اندھیرے میں اس کی طرف مڑا۔ اس نے اپنے بھاری ہاتھ شکیلہ کے کندھوں پر رکھ دیئے۔

"شکیلہ۔! میں لیاقت نہیں ہوں۔ میں تو پروفیسر کمال ہوں۔! معلوم ہے تم کو وہ نظریہ میں نے دریافت کیا ہے۔ وہ۔ اضافت کثافت وہ۔" اس نے سر جھکا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"بیچارہ۔!" شکیلہ کا دل ڈوب سا گیا۔ جب اس نے اپنے کندھوں پر سے اس کے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی تو وہ پھیکی سی ہنسی ہنس پڑا۔

"اب یاد ہی نہیں آرہا ہے۔!"

"خیر۔ تم اندر چلو۔ آج تو میں سارا دن تم کو یاد کرتی رہی۔ معلوم ہے تم کو میں صبح جا رہی ہوں۔!"

"کہاں۔!"

"یورپ۔!"

"میں بھی تو جا رہا ہوں۔"

"کہاں۔!" شکیلہ نے جلدی سے پوچھا۔

"یورپ۔!" لیاقت نے بڑے سکون سے کہا۔

"تم کس کے ساتھ جا رہی ہو شکیلہ۔!"

"سجاد کے ساتھ۔ اور کس کے ساتھ۔!"

"سجاد کے ساتھ۔!" لیاقت نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میرے ساتھ کیوں نہیں۔ میں اس قابل نہیں ہوں۔!" اس کا لہجہ بیحد افسردہ سا تھا وہ چپ رہی۔

"ہُنہ۔! سجاد کیا ہے۔! میں تو پروفیسر ہوں۔ ڈاکٹر ہوں۔ وزیر داخلہ ہوں چیف انجینئر ہوں۔ ملک کا سب سے بڑا سائنس داں۔! یہ سب لوگ کیا ہیں۔!" وہ زور سے ہنسا۔

"کیا ہوا ان لوگوں نے مجھے کچھ نہیں بننے دیا۔ میں خود ہی سب کچھ بن گیا۔ میں مجسٹریٹ بھی ہوں۔ کیا سمجھتی ہو۔ تمہارے سجاد کو ایک منٹ میں پھانسی پر چڑھا دوں۔! ہاں۔! کیا سمجھیں۔!" وہ پھر اتنے زور سے ہنسا کہ شکیلہ لرز کر رہ گئی۔

"اندر تو چلو۔!" وہ اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے اس کے کمرے کی طرف چلدی۔ کمرے کے دروازے پر پہونچ کر اس نے بغیر ملگجی جالی شکیلہ کے ہاتھ پر رکھ دی۔ دیواروں پر ٹٹول کر اس نے بجلی جلائی۔ روشنی میں اس کا حلیہ دیکھ کر اس کا دل بے حد گھٹ گیا۔ کتنا کمزور ہو گیا تھا وہ۔! سفید رنگ کتنا پھیکا ہو گیا تھا اور ریٹ بڑی بے رونق آنکھوں کو دیکھ کر اسے ہول آرہا تھا۔

"خدا جانے کہاں کہاں ٹکریں کھاتا رہا ہوگا۔" شکیلہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"شکیلہ، تم میرے ساتھ یورپ چلوگی۔" لیاقت نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"تم لیٹ جاؤ۔" شکیلہ کے لہجے میں بے حد شفقت تھی۔ دونوں شانے پکڑ کر اس نے پلنگ پر بٹھا دیا۔ "اب سو جاؤ۔" لیاقت صاحب چپ چاپ جوتے پہنے پہنے بستر پر دراز ہوگیا۔

اس کی طرف غور سے دیکھ کر بولا۔ "چلوگی۔"

وہ کچھ نہ بولی۔

"کیا تم ناراض ہو۔ کیا واقعی میں بہت برا ہوں۔ سچ میں اتنا برا نہیں ہوں جتنا ان لوگوں نے مجھے بنا دیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے مجھے اسکول میں نہیں پڑھنے دیا۔ میں نے خود ہی پڑھ لیا۔ ابّا نے مجھے گھر پر تنگ کیا۔ ماسٹروں سے اسکول میں پٹوایا۔ شریر ہے۔ نالائق ہے۔ پاگل ہے۔" وہ اپنے آپ بولے جا رہا تھا۔

"کیا سچ مچ میں پاگل ہوں۔" وہ مارے جوش کے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ شکیلہ نے اسے بمشکل لٹایا۔

"سو جاؤ۔" اس نے محبت سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

لیاقت نے بچوں کی طرح جھٹ سے آنکھیں بند کرلیں۔ اور آہستہ سے بولا۔

"تمہارے ہاتھ اماں کے ہاتھوں کی طرح نرم ہیں۔ مگر ان میں تو بہت ٹھنڈک ہے۔ ان میں آنچ کیوں ہے۔" لیاقت نے آنکھیں کھول دیں۔ شکیلہ نے جلدی سے ہاتھ ہٹا لیا۔ یہ دیکھ کر اس کا خون خشک ہوگیا کہ اس کی آنکھوں میں عجیب بے باکانہ سی چمک تھی۔ وہ چمک جسے وہ بخوبی پہچانتی تھی۔ وہ ایکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا۔ تم سو جاؤ۔ اب میں جاتی ہوں۔" کمرے سے آئے ہوئے کتنی دیر ہوگئی تھی اب وہ پریشان سی ہوگئی تھی۔

"کہاں۔ سجاد کے پاس۔"

"ہاں۔" شکیلہ کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

"شکیلہ۔ ایک بات بتاتی جاؤ۔ کیا واقعی میں بہت برا ہوں۔" شکیلہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب وہ کیا کہے۔ اسے اب اس کے ساتھ کمرے میں آجانے پر کوفت سی ہو رہی تھی۔ اگر سجاد جاگ گئے تو کیا سوچیں گے۔ اس نے کمرے میں ادھر ادھر پریشانی سے دیکھا۔

"سجاد تمہیں کیا دے سکتے ہیں۔ یورپ ہی تو لے جائیں گے۔ یورپ تو میں بھی تمہیں لے جا سکتا ہوں۔ یہ دیکھو۔" اس نے کونے کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں سفید پتھروں کا ڈھیر تھا۔

"کتنے پتھر جمع کئے ہیں۔ جانتی ہو کیوں۔ تمہارے لئے تاج محل تعمیر کرواؤں گا۔ تاج محل۔"

شکیلہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ اس پاگل کو تو دیکھو۔ اس نے دل میں سوچا۔ "تم اس کے ساتھ نہیں جاؤ گی ہونا۔ بولو نا۔ باقی سب کے لئے تو میں مخبوط الحواس ہوں۔ تم تو مجھے پاگل نہیں سمجھتی ہونا۔ بولو۔" لیاقت نے اس کا ہاتھ زور سے جھٹکا۔

شکیلہ کا دل چاہا کہ دوڑ کر کمرے سے باہر نکل جائے۔ وہ سخت گھبرا رہی تھی۔

"بولو۔" لیاقت نے ایک دفعہ پھر اصرار کیا۔

"تمہیں کون پاگل کہتا ہے۔ تم تو اچھے خاصے ہو۔" اس نے اس کا دل رکھنے کے لئے کہہ دیا۔

"اچھا۔ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔"

"کیوں نہیں۔ تم تو مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔"

وہ ہنسا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

"دیکھو نا۔ سب لوگ جھوٹ کہتے ہیں۔ ابا کہتے تھے تیرا گھر کبھی نہیں بسے گا۔ اماں تو ہمیشہ یہی کہتیں جا نامراد۔ تجھے کون لڑکی دے گا۔ اور یہ سجاد۔ اس نے دانت پیسے۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ دیکھ لیں گے جس دن تجھ سے کوئی لڑکی محبت کرے گی۔ نالائقوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ہونہہ۔ بڑا آیا ہے لائق کہیں کا۔ صبح میں سجاد کو دکھا دوں گا کہ یہ رہی وہ لڑکی۔" اس نے شکیلہ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"یہ رہی وہ لڑکی۔" اس نے مٹھیاں بھینچ کر جیسے سجاد کو للکارا۔ اس کی آواز اتنی اونچی تھی کہ شکیلہ تھر تھر کانپنے لگی۔ پھر اس نے اسی جوش میں کہا۔

"میری زندگی سب سے زیادہ کامیاب ہے۔ میں انہیں دکھا دوں گا۔ یہ سب اپنے آپ کو جانے کیا سمجھتے ہیں۔"

"یہاں بیٹھ جاؤ۔" اس نے شکیلہ کو زور سے پلنگ پر بٹھا دیا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت کی شدت کو اس نے محسوس کیا اور پہلی مرتبہ اس کو موقع کی نزاکت کا احساس ہوا۔ جتنا اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیاقت کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے اندر کا سویا ہوا حیوان جیسے یک لخت جاگ گیا ہو۔ اس نے پوری جد و جہد سے اپنے آپ کو آزاد کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اس کے ہاتھوں کی چوڑیاں چھن چھن کر کے ٹوٹ گئیں۔ بال پیشانی پر بکھر گئے۔ ذلت۔ خوف اور رسوائی سے اس کی عجیب حالت ہو گئی۔ اگر خدانخواستہ کوئی جاگ اٹھے۔ سجاد ہی ادھر آنکلیں۔ اس کا جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ ایک دیو ہیکل پاگل سے زور آزمائی آسان بات نہ تھی۔ وہ اپنے جنون میں معلوم نہیں کیا کہے جا رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کی آواز بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔

"چھوڑ دو مجھے۔" وہ گھٹی ہوئی آواز میں چیخی۔

جواب میں ایک بھیانک قہقہہ بلند ہوا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ تمام در و دیوار۔ کل کائنات اس پر قہقہہ لگا رہی ہو۔ آوارہ۔ بے وفا۔ ہر طرف سے آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے آپ کو چھڑا لیا اور پوری طاقت سے ایک زور کا تھپڑ اس نے لیاقت کے منہ پر رسید کیا۔

"پاگل۔ واقعی تم پاگل ہو۔ سچ مچ تم پاگل ہو۔" اس کے ڈوپٹہ کی ایک دھجی لیاقت کے ہاتھ میں رہ گئی تھی۔ اپنے چپل وہیں چھوڑ کر وہ ننگے پاؤں پاگلوں کی طرح کمرے سے بھاگ نکلی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے جلدی سے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ وہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ بری طرح وہ ہانپ رہی تھی۔ اگر اس وقت کمرے میں روشنی ہوتی اور اس کے شوہر کی آنکھ کھلی ہوئی ہوتی تو شاید یہ اس کی زندگی کی آخری رات ہوتی۔ آدھی رات کو وہ کمرے میں آئی تھی۔ اس کی کلائی سے خون بہہ رہا تھا۔ بال الجھ کر منہ پر بکھرے ہوئے تھے۔ کپڑے بے ترتیب ہو رہے تھے۔ ڈوپٹہ تار تار تھا۔ بھلا کون اس کا یقین کرتا۔

جوں توں کر کے صبح ہوئی۔ سجاد کے جاگنے سے پہلے اس نے غسل کیا کپڑے بدلے اور تیار ہو کر آگئی۔ جب وہ کمرے سے باہر نکلی تو نوکر کی زبانی اسے یہ سن کر بے حد اطمینان ہوا کہ لیاقت رات کو آیا تھا اور پھر چلا گیا۔ شکیلہ کو ایسا محسوس ہوا گویا اس کے سینہ پر رکھی ہوئی سل ہٹ گئی ہو۔ وہ مطمئن ہو کر اپنے سفر پر روانہ ہو گئی تھی۔

"آخر بیچارہ لیاقت مر ہی گیا۔ ایک اچھی زندگی گزارنے کی حسرت اس کے دل ہی میں رہ گئی۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی اور ہاتھوں

میں سر تھامے ہوئے اپنے شوہر کی طرف دیکھا جو بیحد افسردہ نظر آ رہے تھے۔

ہمدردی کا وہ طوفان جو لمحاتی طور پر اس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ یکایک نفرت کے بے کراں سمندر میں تبدیل ہوگیا۔ اس تلاطم میں اسے تمام گھر والوں کے چہرے ڈوبتے اور اُبھرتے ہوئے نظر آئے۔ ہر شخص کا چہرہ ایک قاتل کا چہرہ تھا۔ کون قاتل ہے ۔! اس کا سخت گیر باپ۔ جس نے اس کی غیر معمولی ذہانت کو اپنے سخت بے لچک تربیت کے اصولوں کی چکی میں پیس دیا۔ گھر میں اس کے لئے نفرت کا ماحول پیدا کر دیا۔ وہی تھے جنہوں نے اس کے لئے گھر اور مدرسہ کو ایک جیل خانہ بنا ڈالا۔ اسکول میں اس کی شکایتوں پر سختی ہوئی۔ سزا اور مار پیٹ کی زیادتی نے اس سے گھر بار چھڑوا دیا۔ اس کو باغی بنانے میں بھائیوں نے پورا پورا حصہ لیا۔ اس کے حصہ کی محبت تمام گھر والوں نے بانٹ لی رنالاتھی۔ خودسری اور آوارہ گردی کے سرٹیفکٹ دے کر انہوں نے اس پر معاشرہ کی ہر اچھی پوزیشن کے دروازے بند کر دیئے۔ وہ جو بہت کچھ بن سکتا تھا کچھ بھی نہ بن پایا۔ اور جب اس کو محرومی کا احساس ہوا تو اس کا دماغی توازن بگڑ کر رہ گیا۔ وہ پاگل نہ تھا۔ ایک مظلوم، دھتکارا ہوا اور کچلا ہوا انسان تھا۔ جس کو غیروں نے نہیں خدا اپنوں نے لوٹ کر برباد کر دیا تھا۔ اگر اس سے کوئی محبت کرتا ۔ یکایک کسی نے جیسے اس کا دل مٹھی میں لے کر دبا دیا۔ کیا وہ خود مجرم نہیں ۔؟ وہ جو اُن سے مختلف تھی۔ الگ تھی۔ ان سب جیسی کیسے ہوگئی! تاج محل ۔! وہ اس کے لئے تاج محل تعمیر کرنے چلا تھا اُس نے اسے کیا دیا۔ اس سے آخری ملاقات اپنی تمام جزئیات کے ساتھ اس کے ذہن کے سکرین پر اُبھر آئی ۔ اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو ابل پڑے ۔ شاید وہ اس کو سمجھاتی تو وہ سنبھل ہی جاتا ۔ اگر وہ وہیں رہ جاتی تو شاید اپنے محبت بھرے سلوک سے اسے ہوشمند انسان بنا لیتی۔

"شکیلہ ۔!" سجاد نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں سرخ اور آواز بھاری ہو رہی تھی۔

"ہم شاید اسے سمجھ نہیں سکے ۔!"

"شاید ۔ لیکن ۔!" اس کے حلق میں آواز رک گئی "لیکن جنہوں نے اس کو سمجھا انہوں نے بھی اس کے لئے کچھ نہ کیا۔"

اس نے دونوں ہاتھ سے منہ ڈھانپ لیا اور کمرے کی خاموش فضا میں اس کی سسکیاں اُبھرنے لگیں ۔!

بقیہ یاس عظیم آبادی (بسلسلہ صـ ۱۶)

سردست اتنا موقع نہیں کہ ان سب پر بھی اظہارِ خیال کیا جائے، جن جن امور پر رائے زنی کی گئی ہے وہ بھی اپنی جگہ مکمل نہیں بلکہ ابھی تشنہ اور تفصیل طلب ہیں، پھر بھی ان میں کوئی بات لگی لپٹی نہیں رہتی، اور لکھنے والے کا مافی الضمیر قاری پر واضح ہو سکتا ہے۔

اس بات کا اعادہ ایک بار پھر ضروری سمجھتا ہوں کہ اس بحث سے کسی قسم کی عیب جوئی یا رنجش مقصود نہیں، یہ ادبی اختلاف ہے جس میں بحث مباحثہ کے پہلو نکلتے رہتے ہیں۔ اور اس سے ادب میں بعض اوقات بڑے مفید اور قابل قدر اضافے ہو جاتے ہیں۔ اور بعض نئے گوشے بھی سامنے آتے ہیں جو افادہ سے کسی طرح خالی نہیں ہوتے، سینٹس بری (SAINTSBURY) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:۔

"نقاد کی زندگی اس امر میں نہیں ہے کہ اُس کی سب رائیں درست ہوں اور اُن کو مان لیا جائے بلکہ اس امر میں ہے کہ اُس کی رائے کا ہمیشہ اقتباس کیا جائے اور اُس سے اختلاف کیا جائے۔"

جوش نے بھی کچھ اسی قسم کی کیا اچھی بات کہی ہے ؎

کچھ لذت بحث جس کی صحبت میں نہیں
باتوں کا مزا اُس کی رفاقت میں نہیں

جو مختلف الخیال مجلس میں نہیں ہے ملطف
وہ متحد الرائے جماعت میں نہیں

ش۔ د۔ شارق

زندگی اور سکون

شکایتیں تری معقول ہیں گِلے بھی قبول مگر شریکِ سفر اس قدر بھی ہو نہ ملول!
کہ ہم نے خواب اوائل میں جتنے دیکھے تھے وہ آج یوں نظر آتے ہیں جیسے راہ کی دھول

خیالی یہ "سرِ منزل پہنچ چکے ہوتے جو بار بار نہ ہم راہ میں رُکے ہوتے"
ہماری جان کا آزار بن گیا ورنہ ہمارے سر نہ تأسف میں یوں جُھکے ہوتے

گزر گئے ہیں جو لمحے وہ ہو گئے مہ و سال یونہی حیات کی راہوں میں کھو گئے مہ و سال
چڑھی جو دُھوپ در و بامِ زندگانی پر تو جا کے سایۂ ماضی میں سو گئے مہ و سال

بہت شدید ہے احساس نارسائی کا رہِ حیات میں اپنی شکستہ پائی کا
کہاں وہ اپنے تخیّل کا اِک جہانِ حسیں کہاں یہ حال حقیقت کی رونمائی کا

تجھے یہ فکر کہ تزئینِ گلستاں نہ ہوئی بحدِّ شوق بھی تعمیرِ آشیاں نہ ہوئی
مقامِ راہ پہ منزل کا ہر گماں تھا غلط مگر وہی غلطی پھر کہاں کہاں نہ ہوئی

یہ جذبۂ غمِ دوراں، یہ شدتِ احساس
ستارہ ہے تجھے کیوں خیالِ محرومی

نہ ہو اُداس مری جاں نہ اس قدر ہو اُداس
زیاں نہیں ہے اگر دل نہ ہو شکار یاس

خراب تر ہی سہی لیکن اِک مکاں تو ہے
ہمارے سر پہ کھلا تیز آسماں تو نہیں

ہمارے رین بسیرے کو آشیاں تو ہے
ہمارے سر پہ یہ چھوٹا سا سائباں تو ہے

اگر یونہی نئے سانچے میں فکر ڈھل جائے
یہ دیکھ میری محبت کے پھول تازہ و تر

تو کیفیت دلِ ناشاد کی بدل جائے
خدا کرے کہ طبیعت تری بہل جائے

اگر بہم نہیں ساماں خوشی کے، تو کیا غم
فضا میں پھیل گئیں سازِ درد کی لہریں

جہاں میں ایک ہمیں پر نہیں ہے تنہا غم
اُٹھا رہی ہے اسی طرح ایک دُنیا غم

یہ غم ہے قافلے آخر ٹھہر ہی جائیں گے
ابھی ترے گُلِ عارض پہ ہے ملال کی گرد

یہ شب کے فاصلے بھی تا سحر ہی جائیں گے
گرے گی اِن پہ جو شبنم نکھر ہی جائیں گے

ہو آفتاب کہ مہتاب، دونوں مظہرِ نور
مگر ہوں دن کے اُجالوں پہ رات کے سائے

ہے اِس سے دن کا اُجالا، وہ شب کو اِک اثرِ نور
تو اُن کے واسطے دل کا دیا ہے مصدرِ نور

مری رفیق! یہ باتیں ہوں تیرے دل کو قبول
یہ غم ہے اور یہ جینے کا فن ہم اپنا لیں

تو ہر قدم پہ کھلیں گے ہماری راہ میں پھول
سکونِ دل کو ہے کافی اِس ایک فن کا حصول

حسرت کاسگنجوی

پاکستان کے ممتاز ناول نگار

فضل احمد کریم فضلی

فضلی صاحب کے ناول کا نام آتے ہی ہمارا خیال ان کی شاعری کی طرف جاتا ہے۔ انہوں نے زیادہ تر توجہ شاعری کی طرف دی ہے اور غزل ان کی مقبول صنف رہی ہے۔ اردو دانوں میں وہ بہت اونچا پایہ رکھتے ہیں۔ اور ان کی غزل ایک نئے طرز اور نئے راگ کی حامل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انہیں ناول پڑھنے سے ہمیشہ سے دلچسپی رہی ہے۔ گالسورردی کی ناول نگاری سے وہ گہرے طور پر متاثر نظر آتے ہیں جب وہ انگلینڈ میں تھے تو بارہا گالسورردی سے ملے بھی اور اس سے ادبی موضوع پر باتیں بھی کیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ ان دونوں ادیبوں میں بہت کافی مناسبت ہے۔ دونوں تہذیب یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور دونوں کو آج کل کے تعلیم یافتہ لوگوں میں تعلیم اور تربیت کی وجہ سے بھی بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ دونوں میں شاعرانہ قوت ہے فضلی کا شمار ان آزاد طبع لوگوں میں نہ کرنا چاہئے جو اپنی انفرادیت کو اس کی حد تک پہنچا دیتے ہیں اور اس لئے اوّل درجے کے فن کاروں میں شمار ہونے لگتے ہیں۔ وہ ایسے فنکاروں میں ہیں جو اپنی فطرت پر زور دے سکتے ہیں۔ اپنی انفرادیت کو قابو میں رکھ سکتے ہیں اور اس کو فن کے عام اصولوں کے ماتحت لاکر ایک ٹھہراؤ بخش سکتے ہیں۔

فضلی صاحب کا قریب قریب پچاس سال کی عمر میں شاعر سے ناول نگار ہو جانا پہلے بڑا تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے مگر ان کی ناول "خون جگر ہونے تک" پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ عرصہ تک اس ناول کا مواد ان کے ذہن میں اپنی جگہ کرتا رہا اور جب اس نے ناول کی صورت میں ظہور پایا تو جو اصول انہوں نے اپنی شاعری پر عائد کر رکھے تھے ان سے باہر نہ گیا۔ صاف الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس ناول میں بھی وہ غزل گو ہی ہیں اور یہ ناول اس بات کا ثبوت ہے کہ غزل گوئی کے فن کو سامنے رکھکر کس طرح ایک قصے کو اس کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے۔ جب ہم "خون جگر ہونے تک" کو پڑھنا شروع کرتے ہیں تو ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کے تمام جملے تمام الفاظ غزل کے توازن کے ساتھ آ رہے ہیں۔ اس کے ہیرو جمعدار جلیل یا اپنی زبان میں ذلیل میاں سامنے لائے جاتے ہیں۔ مگر ان کی مختلف حرکات خاص طور سے کٹیلے چوہیا کو مار ڈالنا ان کی اپنی بیوی جان سے محبت ان کی اپنے لڑکے پر شفقت اور امو بھی ان کے بابت بیان کئے جاتے ہیں وہ سب مل کر ایک مرتب توازن سامنے لاتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے ایک غزل پڑھی جس میں تمام مناسبتیں موجود ہیں۔ یہ احساس ہر باب میں ملتا ہے۔ آگے چل کر ایک باب میں وہ خود غزل کا نام لیتے ہیں اور اپنے ناول کی فضا کا غزل سے مقابلہ کرتے ہیں۔ ناول کے ساتھ ہی ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا اختتامیہ بھی شامل ہے اس میں بھی انہوں نے ناول اور غزل کے درمیان اشتراک کا زور دیا ہے اور جب ہم ناول کے خاتمے پر پہنچتے ہیں تو بالکل ہی ویسا ہی سین سامنے آتا ہے جیسا شروع میں تھا اور جمعدار کے چوہیا مارنے کی حرکت پھر دہرائی جاتی ہے معلوم ہوتا ہے جیسے قافیہ اور ردیف غزل میں دوہرائے جاتے ہیں۔ اور ان سے ایک خاص موسیقی کا آہنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ ویسے ہی فضلی نے اس کے واقعات اور حرکات کو بھی دہرایا ہے اور اس طرح سے پوری ناول غزل کے آہنگ کا نمونہ ہو گئی ہے۔

ناول کا مرکزی تاثر جمعدار کا کردار ہے جو بنگالی مسلمان کے کردار کا پورا پورا نمونہ ہے۔ اس بات کو ہم دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ناول کا موضوع بنگالی ہے اور جمعدار اس کے نمائندہ اشارہ ہیں۔ ناول میں ماحول اور اس کے جزئیات پر نفسیات اور کردار سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔

"خون جگر ہونے تک" ایک کامیاب ناول ہے۔ یہ اردو ناولوں میں کئی باتوں کے لئے انوکھا بھی ہے۔ کہانی بہت مختصر سی ہے۔ کہیں کہیں بیانات طویل بھی ہو گئے ہیں۔ لیکن دلچسپی کا عنصر پھر بھی باقی رہتا ہے۔ جمعدار کو اپنی بہادری کے قصے سنانے کی عادت ہے۔ لوگ ان کی اس عادت سے واقف ہیں۔ جمعدار بہت معمولی پڑھے لکھے ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ضعیف الاعتقاد مذہب کے نام پر جو ظاہری رسوم ہیں ان پر بڑی سختی سے عمل کرتے ہیں۔ اپنے بیٹے چھانو سے وہ بہت محبت کرتے ہیں۔ ایک لڑکا پھول محمد ہے جو انہیں اس لئے پسند ہے کہ وہ ان ہی کی طرح خود دار ہے۔ گاؤں کی سیاست پر ایک طویل تبصرہ ہے۔ جمعدار گاؤں کی سیاست کے شکار ہو جاتے ہیں۔ مخلص اور سچے ہونے کی حیثیت سے انہیں بے شمار تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ حاکم ضلع مجید صاحب ان سے بڑے متاثر ہیں اور آخر وقت تک انہیں جمعدار اور پھول محمد سے ہمدردی رہتی ہے۔ جلو دھر ایک بے باک قسم کا کالج سے بھاگا ہوا لڑکا ہے جو کمیونسٹ پارٹی کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اور گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں کو ورغلاتا ہے۔ مذہب سے بیزاری خدا کے وجود سے انکار اور طاقت کی پوجا کا پرچار کرتا ہے۔ اس کے ساتھ مخلص بھی مل جاتا ہے۔ دوسری طرف نگن بابو ہیں جو زمیندار کے کارندے ہیں۔ تسرت ہے جو مفاد پرست بنیا ہے۔ تونیر صاحب بی اے، بی ایل، ایم ایل رہے ہیں۔ جو حاسد اور ضمیر فروش ہیں جو جمعدار کے شدید مخالفوں میں سے ہیں۔ وکالت ان کا پیشہ ہے۔ وہ بڑی بڑی بے وقوفانہ حرکتیں کرتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے گرانی بڑھتی ہے، قحط پڑتا ہے۔ وبائیں پھیلتی ہیں۔ سرت جیسے لوگ ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں۔ بھوک اور بیماریوں سے بے شمار موتیں واقع ہوتی ہیں۔ ایک کمپاؤنڈر ابناش بابو رنگین قسم کے پانی دوا کے طور پر فروخت اور ڈاکٹر مشہور ہو کر خوب خوب دولت کماتے ہیں۔ لوگ قحط میں اپنی اولادیں تک بیچ دیتے ہیں۔ مُردوں کے کپڑے اتار لئے جاتے ہیں۔ جمعدار کا بیٹا چھانو مر جاتا ہے۔ ان کی بیوی داغ مفارقت دے جاتی ہے۔ اور پھر انتہائی کس مپرسی کی حالت میں پھول محمد بھی ختم ہو جاتا ہے۔ جمعدار مجید کی مہربانیوں کی وجہ سے دوبارہ نئی زندگی شروع کرتے ہیں اور اپنے گاؤں گھوڑا مارا لوٹ آتے ہیں۔ ان کے ساتھ دو یتیم بچے اور رینا بھی ہے۔

یوں تو کہانی انتہائی سپاٹ ہے اور اس میں ایسی کوئی دلکشی نہیں کہ وہ ذہن میں بار بار ابھرے پھر بھی اسلوب بیان اور واقعات کا تسلسل ایسا ہے کہ کتاب کے بغیر ختم کئے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ جمعدار کے گھر کا نقشہ، اس کے اندر مچھلیوں کا تالاب ہے۔ اس میں خاندان والوں کی تفریح ہیں اور اس میں ان کی بیوی جان کی مختلف حرکتیں ایک نہایت ہی واقعاتی تصویر ہمارے سامنے لاتے ہیں جو ہر پہلو سے اس طرح مکمل ہے جیسے ایک مصور کی بنائی ہوئی تصویر۔ آگے چل کر نہایت دلچسپ چیزیں دی ہیں جو بنگال کی مختلف فضاؤں کی رنگین تصویریں ہمارے سامنے لاتی ہیں۔ ہنگاموں اور فضائی تبدیلیوں اور موسم کے اثرات وغیرہ کی بڑی دلچسپ تصویریں اس ناول میں ملتی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس ناول میں سب سے بڑی خوبی بیانات ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ بنگال مقام ہی ایسا ہے جس کو قدرت نے سبز و شاداب بنایا ہے۔ مناظر قدرت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہاں بڑی کشش ہے لہٰذا یہاں کے حالات لکھتے وقت یا تو ان کو ناول کا موضوع بنانے میں بیانات اور کردار نگاری اس طرح ایک دوسرے سے ہمکنار نظر آتی ہے کہ کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ اس لئے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اس ناول کی خوبی زیادہ تر بیانات میں ہے تو ہمارا یہ مطلب بھی ہے کہ یہاں جو انسان پیش کئے گئے ہیں وہ تہذیب سے زیادہ قدرت کی پیداوار ہیں اس لئے اس ناول کی بابت ہم یہ کہیں گے کہ یہ بنگال کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

سب سے بڑی بات اس ناول میں ناول نگار کا خلوص اور اس کے تجربے ہیں۔ فضلی صاحب کے مشاہدے کی بے اختیار داد دینی

پڑتی ہے کیونکہ ہم ناول پڑھتے ہیں تو بنگال کے کسی گاؤں میں اپنے کو بیٹھا محسوس کرتے ہیں اور وہاں سے اس طرح لطف اندوز ہوتے ہیں جیسے وہاں کے مقامی لوگ۔ وہاں کی عام زندگی عوام کی سادہ لوحی، مذہب سے لگاؤ، پیری و مریدی، گاؤں کے لوگوں کا سیاسی شعور، کمیونسٹوں کا پروپیگنڈا، مجید صاحب جیسے مخلص افسروں کی موجودگی، نو میر صاحب جیسے مفاد پرست، چارآلی جیسے ذہنی غلام اور مغرب پرست، نگہ، سرت اور اناش بابو جیسے انسانیت دشمن لوگوں کا خاکہ ہمارے سامنے لایا جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم گھوڑ امارا میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور ابھی ابھی جمعدار صاحب اٹھ کر اندر گئے ہیں اور ان کے ساتھ بھول محمد بھی ہے۔ ناول نگاری کا یہ ایک مشکل فن ہے کہ اصل اور نقل میں فرق مٹ جائے۔ فضلی بڑی حد تک اس میں کامیاب ہوئے ہیں۔ فضلی نے جو قحط کا نقشہ پیش کیا ہے وہ ان کا آنکھوں دیکھا حال ہے۔ اس لئے اس میں بے انتہا اثر ہے۔ پونیر میاں جیسے کردار ہمیشہ سے رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ اور رحلو دھر جیسے نہ معلوم کتنے لوگ ہیں جو آج بھی اشتراکیت کا پروپیگنڈا کر رہے۔ فضلی نے اشتراکیت کی پھیلی ہوئی وبا کا تجزیہ اس طرح کیا ہے۔ "مذہب کا موضوع خشک بھی ہے اور اس زمانے میں صدائے بے ہنگام بھی۔ لیکن کیا کیا جائے کہ بنگال کے مسلمانوں کی زندگی میں اسے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اشتراکیت بھی نوجوان طبقے میں پھیل رہی ہے۔ اور گاؤں کی زندگی پر اثر انداز ہونے لگی ہے۔ مذہب سے بھی اس کی جھڑپیں شروع ہوگئی ہیں۔ اشتراکیت کی اصل نوعیت کیا ہے وہ کیوں اور کس طرح پھیل رہی ہے لوگوں پر کیا اثر ہو رہا ہے۔ وہ اپنی فہم و فراست کے مطابق کیا سمجھ رہے ہیں کیا سوچ رہے ہیں کیا جواب دے رہے ہیں یہ سوالات دلچسپ بھی ہیں اور اہم بھی نہ محض گھوڑ امارا کے لئے بلکہ تمام ملک و ملت کے لئے بھی سیاسی و مذہبی مباحث سے بھی لوگوں کو بڑی دلچسپی رہتی ہے۔ گاؤں گاؤں بلکہ گھر گھر ذرا ذرا سی بات پر مباحثے اور مناظرے ہوا کرتے ہیں مسلم لیگ بھی اس زمانے میں لوگوں کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی اور سماجی زندگی میں اس کا بڑا عمل دخل تھا۔ ان مسائل سے چشم پوشی حقائق سے فرار کے مترادف ہوتی اور تصویر نامکمل رہ جاتی (خون جگر ہونے تک ۔ اختتامیہ)

اس بنگال کے اندر جو کچھ انہوں نے پیش کیا ہے اس میں اسلامی تہذیب اور جدید انگریزی حکومت کے اثرات بھی شامل ہوگئے ہیں۔ اپنے آپ کو ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے ساتھ ثابت کرنے کے لئے اور ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا ایک فرد ہونے کے لئے وہ اردو زبان سے اپنا ناطہ جوڑے ہوئے ہیں اور شاعری بھی فرماتے ہیں۔ حالانکہ ان کی شاعری کی حد یہ ہے کہ بلبل کی چیں چیں میں آواز مرحبا ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے اپنی بیوی اور لڑکے کو بھی وہ ہندوستان کی اسلامی تہذیب کے موافق ڈھالنا چاہتے ہیں اور لڑکے کا نام اسد کی شان رکھتے ہیں۔ حالانکہ اپنی بنگالیت پر ایسی ہو کر وہ اسے چھانو ہی چھانو پکارتے ہیں۔ اپنی بیوی کو بھی وہ اس تہذیب کے اندر آجانے کا درس دیتے رہتے ہیں۔ حالانکہ وہ ان سے بھی زیادہ اس تہذیب میں رہنے کی نااہل ثابت ہوتی ہیں۔ پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک جدید انگریزی تہذیب سے بھی ان کا تعلق ہے چونکہ وہ جمعدار ہیں یعنی انگریزی فوج میں رہ چکے ہیں اور انگریزی فوج کا ایک فرد کہلانے میں اپنی شان سمجھتے ہیں۔ اسلامی تہذیب کی تہہ پر ان کے کردار میں انگریزی حکومت کی تہہ بھی چڑھی ہوئی ہے۔ اور وہ ایک ایسی دنیا میں ہیں جس پر بہر حال انگریزی حکومت ہے۔

مذہب پر بھی فضلی نے خاصی بحث کی ہے اور مختلف انداز سے مذہب کی افادیت بتائی ہے۔ کہیں کہیں کردار واعظانہ رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے بیانات طویل اور خشک ہو جاتے ہیں۔ مولوی صاحب کا کردار بہت خوب ہے۔ جھوٹے اور سچے دونوں طرح کے پیر ہمارے سامنے لائے جاتے ہیں، خود غرضی اور بے لوثی کا اندازہ بھی بخوبی ہوتا ہے۔ فضلی جذبات کی رو میں نہیں بہتے ہیں ان کی باتیں بڑی بھیگی کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ خاص طور سے قحط کا منظر انتہائی جذباتی اور درد ناک ہے۔ سخت سے سخت دل بھی اس وقت متاثر نظر آتا ہے۔ اور بے شمار مشکلات کے دوران جمعدار صاحب کا مقابلہ کرنا پڑے۔ اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے اور پھر فضلی عام ناول نگاروں کی طرح اپنے

ہیرو کی صرف خوبیاں ہی خوبیاں بیان نہیں کرتے۔ انہوں نے جمعدار صاحب کی کمزوریوں پر بھی گہری نظر ڈالی ہے۔ ان کی ضعیف الاعتقادی اور ہری منڈل کے کھیت پر غاصبانہ قبضے کے قضیہ کو بھی بیان کیا ہے۔ بعد میں جمعدار کا ہری منڈل کے کھیت کے ہتھیانے پر افسوس بھی دکھایا ہے گویا انہوں نے جمعدار کی نفسیات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

پھول محمد کا کردار بڑا جاندار ہے وہ ایک شوخ لڑکا ہے۔ اس کی شرارتوں بے باکیوں اور بے خوفی میں بھی ایک حسن ہے وہ خوددار اور دردمند بھی ہے وہ پانیر میاں کی چالوں کو خوب سمجھتا ہے۔ جلودھر کی باتوں سے متاثر تو ہوتا ہے لیکن اس کے حق میں کسی طور پر اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتا ہے۔ جلودھر کا کردار کمیونسٹ پارٹی کی نمائندگی کرتا ہے میکلیشور من یعنی مخلص ایسے مسلمانوں کی نمائندگی کرتا ہوا نظر آتا ہے جو باوجود پڑھے لکھے ہونے کے اپنے مذہب سے قطعی بے گانہ ہوتے ہیں اور جب دوسرے لوگ انہیں ورغلاتے ہیں تو وہ آسانی کے ساتھ ان کے کہنے میں آجاتے ہیں۔ مولانا منتصر باللہ ہیں جو اسلام کی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں۔ مرغی کھانے والے پیر بھی ہیں جن کا مقصد اسلام کے نام پر لوگوں کو دھوکا دینا ہے۔ سلطان میاں جیسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے قحط میں ملنے والے سامان کو نفع کے ساتھ بیچ کر ہزاروں کمائے بہرحال ہم کو اس ناول میں ہر طرح کے کردار نظر آتے ہیں۔

مجید صاحب کا کردار ایک مثالی کردار ہے جو حاکم ضلع ہوتے ہوئے بھی معمولی سے معمولی انسان کی مدد کرتے ہیں۔ انہیں عوام اور ان کے مسائل سے گہری دلچسپی ہے۔ قحط کے زمانے میں غریب خانے دواخانے اور یتیم خانے جگہ جگہ قائم کئے لوگوں کے گھروں میں جا جا کر ان کی مدد کی لاشوں کو کفن مہیا کئے اور زندوں کو کھانا کھلوایا۔ وہ غریبوں کے غم میں برابر کے شریک نظر آتے ہیں اور مفاد پرستوں اور شرارت پسندوں پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔ مجید صاحب کے برخلاف دوسرا کردار جازآلی کا ہے۔ وہ بھی حاکم ضلع ہیں۔ جازآلی جن کا اصل نام اعجاز علی ہے ان کا کھانا پینا بولنا چالنا، رہن سہن عادات و اخلاق غرض ہر چیز انگریزوں کی نقل ہے۔ وہ ذہنی طور پر غلام ہیں انہیں غریبوں سے نفرت ہے جو شرارت پسندوں کے ساتھی ہیں۔ بے رحم بزدل اور مفاد پرست ہیں۔ انگریزوں کے ایک اشارے پر اپنے ملک کے باشندوں کو تہ تیغ کرنے پر آمادہ ہیں، حد درجہ خود سر اور مغرور ہیں۔ جازآلی کا کردار ان لوگوں کی مثال ہے جن کو انگریزی تہذیب و تمدن نے تباہ کر دیا۔ غرض مجید اور جازآلی کے کردار ایسے ہیں جو ایک ہی طبقے کے دو مختلف لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور ذہن سے ان کی یاد نہیں نکلتی۔

ناول میں جو واقعات آئے ہیں اور جس قسم کی کشمکش دکھائی گئی ہے وہ بالکل جدید دور کی ہے اور ایسی تمام باتیں ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر شہر میں ہوتی ہوئی دکھائی جا سکتی ہیں۔ مگر بنگال میں پہنچ کر یہ باتیں ایک مخصوص نوعیت اختیار کر لیتی ہیں جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ بنگال اپنی جگہ پر قدرتی ہونے کے علاوہ وہ جدید دور کے اہم اثرات سے بھی خالی نہیں رہ گیا ہے مثلاً یہاں بھی جو پہلی کشمکش سامنے آتی ہے۔ وہ اسکول کھولیں گے اور دوسری طرف وہ ہیں جو اسلامی تعلیم کا ایک مدرسہ بنائیں گے۔ یہ دونوں اپنے اپنے اداروں کا افتتاح کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور ہم دلچسپی کے ساتھ اس چیز کا انتظار کرتے ہیں کہ جھگڑا کیسے طے ہوگا۔ انگریزوں سے مدد کی دونوں طرف ضرورت ہے۔ اور آخر میں فتح اس طرف کی ہوتی ہے۔ جدھر جمعدار صاحب ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جمعدار صاحب پنشن یافتہ سپاہی ہیں۔ اس لئے انگریز حکام کو تعلیم یافتہ بنگالیوں کے مقابلے میں ان پر زیادہ اعتماد ہے۔ تعلیمی امور کی کشمکش کے بعد سیاسی حالات کی تبدیلی سے بہت سے امور نمایاں ہونے ہیں جن میں بھی جمعدار صاحب خاص حصہ لیتے ہیں۔ حالات ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ جمعدار کو گھر بار چھوڑنا پڑتا ہے۔ اقتصادی کشمکش میں مبتلا ہونا پڑتا ہے اور سفر کی پریشانیاں جھیلنا پڑتی ہیں۔ ناول کے وسط کا حصہ جمعدار کو ایک ایسا انسان دکھاتا ہے جس کی تکلیفوں سے ہمیں گہری دلچسپی ہو جاتی ہے۔ ناول پر ایسی فضا چھا جاتی ہے مگر پھر یہ فضا بدلتی ہے اور پھر وہی سکوت اور اطمینان کے حالات واپس آجاتے ہیں جن میں جمعدار شروع میں دکھائے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ فضلی نے خود سول سروس کے عہدے دار کی حیثیت سے بنگال کی مختلف سیاسی اور اقتصادی تبدیلیوں میں اہم حصہ لیا ہوگا کیونکہ جمعدار کی مشکلات میں پھنس کر جو حالت ہوتی ہے اس کے بیانات آنکھوں دیکھی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ فضلی کا اور مندل ان کے الفاظ شامل

کو قبول کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور بنگال کی پریشانیاں یا یوں کہئے کہ جدید حکومت میں بنگالی قوم کی تکلیفیں فضلی کے خود کی تکلیفیں ہو گئی ہیں اس لئے عام طور سے بنگالی نقادوں نے یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ فضلی نے بنگال کو پورے پورے طور پر ان ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھا۔

ناول چونکہ واقعیت کی سچی تصویر ہے۔ اس لئے اس میں مذاق کا آجانا بھی لازمی سا ہو جاتا ہے جس انداز پر جمعدار کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ مذاحیہ ہے۔ ان کے تمام حالات و حرکات ہمیں ہنسانے ضرور ہیں۔ مگر کمال کی بات یہ ہے کہ ہماری ہنسی طنزیہ کہیں نہیں ہونے پاتی۔ اور جمعدار صاحب سے سچی ہمدردی کہیں نہیں ٹوٹنے پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار کے مضحکہ خیز پہلو جو پریشانیوں میں دکھائے گئے ہیں تو وہ مزاحیہ کے بجائے دردناک ہو گئے ہیں۔ ہمارے ہاں مذاق عام طور پر پھکڑ پن کے درجے پر اتر آتا ہے۔ یا پھر طنز اور غصہ میں پناہ لیتا ہے۔ وہ خالص مذاق جو پورے طور پر ہمدردی پر مبنی ہو ہمارے ہاں اگر کہیں ملتا ہے تو اس ناول میں جمعدار صاحب کے کردار کو اگر ہم لطیف مزاح کی اردو میں بہترین مثال کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ فضلی صاحب کی کامیابی محض یہی نہیں کہ انہوں نے اردو ناول میں ایک کردار کا اضافہ کیا بلکہ اس میں بھی ہے کہ مزاحیہ قسم کے کردار کو پورے مذاق کے ساتھ پیش کیا۔

اس ناول میں دلچسپی لینے کے لئے اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا ضروری ہے تاکہ اس کے مختلف حصوں اور مختلف جملوں پر ہم غور کرتے جائیں ایک سے دوسرے میں جو مناسبت اور جو تضاد ہے اسے بھی دیکھتے جائیں اور یہ بھی اندازہ لگاتے جائیں کہ ان سب کے ملنے جلنے سے کس طرح پوری ناول کی تعمیر ہو رہی ہے۔ اس ناول کی ایک صفت اسے عام آدمیوں کی دلچسپی سے ہٹا دیتی ہے اور خاص طور سے ان لوگوں کے پڑھنے کی چیز بنا دیتی ہے۔ جو واقعات اور قصے سے زیادہ اس کے بیان اور اس کی ترتیب سے سروکار رکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ فضلی صاحب نے اسے بہت غور و فکر کے بعد لکھا ہے خود ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور بڑے اہتمام سے چھپوایا بھی ہے۔

مگر ناول کی روایتی کشمکش یعنی عشق و محبت کی واردات یہاں سرے سے غائب ہیں۔ اس لئے وہ لوگ جو رومان پرست ہوتے ہیں اسے غیر دلچسپ قرار دیتے ہیں۔ مگر یہ امر نقادوں کے لئے بھی ایک مسئلہ بنتا ہے کہ کیا جنسیاتی حالات کے بغیر لائے ہوئے بھی کوئی ناول، ناول کہلایا جا سکتا ہے۔ غزل کا موضوع عشق ہے، یہ ناول غزل سے اور بھی نزدیک آجاتی ہے، اگر مضحک کردار نگاری کے ساتھ ساتھ اس میں عشق کا قصہ بھی ہوتا اور اس کے مختلف حالات ارتقا کرتے ہوئے ایک منزل پر پہنچتے۔ عشق شامل نہ ہونے کی وجہ سے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس میں پیچیدگی نہیں ہے جو جدید ناول کی جان ہوتی ہے۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ پرانے قسم کے کرداری ناولوں میں سے ہے جس کا ذکر ایک سن رسیدہ آدمی ہے۔ اور اس کی زندگی سے وابستہ حالتوں میں اسے بدلتا ہوا ضرور دکھایا جاتا ہے۔ مگر وہ کوئی خاص ارتقا نہیں کرتا۔ اور آخر میں بھی وہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ شروع میں تھا۔ فضلی صاحب نے ناول کا دائرہ محدود کیا ہے اس کی بنا پر فن کاری کے تو کرشمے اس میں بہت دکھائی دیتے ہیں۔ مگر زندگی کی رگ بہت ہی آہستہ اور یکسانی کے ساتھ چلتی رہتی ہے۔

آخر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ طرز ادا کے لحاظ سے اس دور کا کوئی ناول اس کے قریب تک نہیں آسکتا۔ ان کا ایک خاص اسلوب ہے اس میں ضرورت کے موافق رنگینی بھی ملتی ہے۔ فضاؤں کے بیانات خاص طور پر رنگین اور شاعرانہ ہو گئے ہیں۔ شروع اور آخر کے حصے بیانات میں واقعاتی رنگ کی مثال ہیں۔ مخصوص طور پر ان کا رنگ بیانیہ یا DISCRIPTIVE ہے۔ ناول میں کوئی سنسنی خیز واقعات یا حالات کے تبدیل ہوتے ہوئے عالم نہیں دکھلائے گئے ہیں لہٰذا اس میں NARRATIVE اسٹائل کا سوال نہیں اٹھتا۔ بعض جگہ فلسفیانہ باتیں بھی کہی گئی ہیں۔ اور بحثیں بھی چھیڑی گئی ہیں۔ تنقیدی امور کو بھی ساتھ لے لیا گیا ہے اور ان کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ مگر ان سب میں رنگ بیانیہ ہی حاوی رہتا ہے۔ یعنی اس میں شاعرانہ بیان کی خوبیاں جھلکتی رہتی ہیں۔ طرز کے سلسلے میں بیانات کی خوبی کے رنگ کی یہ ناول بہترین مثال کہی جا سکتی ہے۔ اس رنگ کی بنا پر ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس کو DISCRIPTIVE ناول کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔

باقی صفحہ [illegible]

عفت موہانی

"رشتہ چاہ کا......!"

اپنی تقدیر پر تو وہ یوں بھی قانع ہو چکی تھی۔ مگر دھائیں دھائیں برستے اس پانی میں آگے کی راہ یوں بند ہوئی کہ ہمیشہ کے لئے اس کے پاؤں دلدل میں گڑے رہ گئے۔ ہائے میری اماں... آپ یوں تو ساتھ نہ چھوڑتیں۔ ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ۔ یکساں رفتار سے بوندیں ٹین کی چھت پر پڑ رہی تھیں جن۔ مسلسل شور باہر کی دنیا بس تھا۔ اس سے کہیں زیادہ اس کے دل کے اندر۔ آپ نے اپنی بچی کا ساتھ اتنی جلدی چھوڑ دیا۔ اماں آپ کو یہ سزاوار نہ تھا اماں کی ساری طاقت کھینچ کر آنکھوں میں آگئی... آنکھوں کی زبان بھی لڑکھڑا رہی تھی۔ ٹٹول کر اس کا ہاتھ شبو خالہ کے ہاتھوں میں دے دیا۔ پھر ان کی آنکھیں گہری نیند میں مند گئیں۔

اماں۔ اماں۔ وہ سسکتی بلکتی رہ گئی۔ بے آس بے سہارا۔ جانے شبو خالہ نے کہاں سے ایک مضبوط اور طاقتور ہاتھ ڈھونڈ نکالا۔ اسے تو رونا بھی نہیں آرہا تھا۔ ایک دکھ ہو تو آدمی چپ چاپ رو لے۔ جب دکھوں کے انبار لگے ہوں تو کس کس کو روئے۔ اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ ابھی تو اماں کی مٹی گیلی ہی تھی۔ خوشیاں کیسی باجہ گاجہ کہاں کا۔ وہاں سنگھی ساتھی کون تھا۔ شبو خالہ مٹی کے سکورے میں مہندی لائیں۔ اور روتے روتے موٹی موٹی بوندیں اس کے ہاتھوں پر تھوپی گئیں۔ اسے تو چاروں طرف اماں نظر آرہی تھیں۔ جانماز کی چوکی پر سلائی کرتی ہوئی۔ روتی ہوئی۔ کتنا ارمان تھا انہیں اس کی شادی کا۔ ہونٹ خشک۔ جلتی آنکھیں۔ دل چلا رہا تھا۔ اماں۔ میری اماں۔ نیچا سا گھر۔ محلے بھر کی عورتیں اکٹھا تھیں شبو خالہ نے اس کا ننھا سا سرد ہاتھ جانے کس کے گرم گرم اور مضبوط ہاتھ میں تھما دیا۔ نئی راہ کا مسافر اسے بھی اپنی راہ پر سے کر چل دیا۔ مردوں کے ہجوم سے سرکتی سرکتی کار نکلی۔ کچھ دور نکلی اور پھر رستے بھرتی ہوئی چلی گئی۔

اس کی سانس جہاں تہاں رک گئی۔

رات سائیں سائیں کر رہی تھی۔ چاند تاروں کا دم بھی ٹوٹ رہا تھا۔ پھولوں کی خوشبوئیں باسی ہو چلی تھیں۔ سجے سنورے بلند و بالا کمرے میں ایک مسہری پر بیٹھی وہ اپنے سہارے کا انتظار کر رہی تھی۔ جو کچھ ہوا وہ خواب سا لگ رہا تھا۔ مگر سنہری تقدیر مسکراہٹ کا روپ دھارے اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی تھی۔ جب اس نے کسی کے مضبوط اور بھاری قدموں کی آہٹ اپنے قریب محسوس کی۔ پسینے میں شرابور۔ خوف و شرم سے زرد اس نے گھونگھٹ جکڑ لیا۔ اور پھر جب دونوں ہاتھوں کے ہالے میں اس کا چہرہ ہوتے ہوتے چاند کی طرح ابھرا۔ لرزتی ہوئی پلکیں اور کانپتے ہوئے ہونٹ۔ ہزار چاہنے پر بھی وہ آنکھیں نہ کھول سکی۔ دفعتاً اس کا گھونگھٹ اس کے چہرے پر آگرا۔ ہاتھ ہٹ گئے۔ آنے والا اس سے دور ہو گیا۔ ہلکے اندھیرے میں اس نے دیکھا۔ یقیناً یہ وہی ہیں؟ اسے ان کا لمس یاد تھا۔ کتنی گرمجوشی سے انہوں نے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ ایک بھاری بھرکم جسم۔ اور حسین سا چہرہ۔ وہ مسکرائی۔ پھر وہ پاس آئے۔ بڑی آہستگی سے اس کے شانے تھام لئے اور تکیے پر سر رکھ دیا۔

"سلمیٰ...!" بھاری اور دلکش آواز اس کے رونگٹے رونگٹے میں بس گئی۔ یک بیک ننھی منی آرزوئیں ہری بھری کونپلوں کی طرح دل کی گہرائیوں سے سر ابھارنے لگیں۔ لیکن انہیں سینچنے والا باغبان انہیں ہمیشہ کے لئے روند کر چلا گیا۔

سلمیٰ۔ تم آرام کرو۔ رات بہت جا چکی ہے!"

اور ان کے پیچھے حجلۂ عروسی کا دروازہ بند ہو گیا۔

دروازے کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ کھڑکی کے باہر زرد چاند چپکے چپکے کی طرف سرک رہا تھا۔ تاروں کی پلکیں جھپکنے لگی تھیں۔ صبح کاذب کی سفید ملگجی روشنی ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہونچ گئی۔۔ دروازہ جوں کا توں بند رہا۔۔

بدقسمت۔ بدقسمت... نرم و گرم تکیوں میں اس نے چہرہ چھپا لیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ہائے ہفتہ بھر کی بیاہی دلہن ــ؟ شبو خالہ جلنے آئیں تو دانتوں تلے انگلی دبالی۔ چہرے پر وہی معصومیت۔ ہونٹوں پر روتی بسورتی مسکراہٹ۔ بے داغ پیشانی پر پسینے اور داختاں میں ملے جلے مکتے ہوئے موتی۔ سب کچھ وہی سلمیٰ سے آہستہ آہستہ باتیں کرتے دیکھ کر پروفیسر صاحب نے کہا:

"میں خود ان کی خیریت آپ تک پہونچا دیا کروں گا۔ آپ زحمت نہ کیا کیجئے۔۔!"

"میں تو تمہارے گھر میں تمہاری ماں کے وقتوں سے آتی ہوں" شبو خالہ روہانسی ہونے لگیں۔

"خالہ اماں۔ ماں کا وقت ماں کے ساتھ گیا۔۔!"

"منحوس" پہلی بار سلمیٰ کے دل نے نفرت اگلی۔ بس اپنی بات باہر نہ پھوٹے۔ ایک زندگی برباد کرنی تھی سو وہ تو کر ہی دی۔ کیوں ایک بے کس پر ترس کھایا تھا۔ لے جاتا کوئی اور جھونپڑے میں رہ کر سوکھی باسی کھا کر وہ زیادہ خوش رہتی۔ ایکا یک اس نے اپنے آنگن کی کچی سہیلیوں سے گھر کے کونے کھدروں میں چھپ کر سنا تھا۔ شادیوں کے بعد ایسی ایسی باتیں ان لوگوں نے کی تھیں کہ اندھیرے میں بھی سلمیٰ کے رخسار آگ کی مانند جلنے لگتے۔

شبو خالہ اندھی ہو گئی تھیں۔ پچاس سال کی ریخ بستہ عمر۔ اور وہ تو خود بیس سال کی پوری نہ تھی۔ وہ سب خواب جن کے زنجیرے اٹھتے بیٹھتے جوڑا کرتی۔ ایک ایک کرکے ٹوٹ چکے تھے۔ لیکن پروفیسر صاحب پر کوئی اثر ہی نہ تھا جسے اپنی بھی سچائی کوٹھی کے لئے کوئی اور سامان آرائش خرید لائے ہوں۔ وہ چاہتی، حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخے۔ آخر وہ بھی انسان ہے۔ اس کے پاس بھی دل ہے۔ نفس ہے۔ لیکن اپنے مالک کی طرح یہ فلک بوس دیواریں اور ہواؤں سے دھڑ ادھڑ کھلنے بند ہونے والے دروازے بھی بے حس بے جان تھے۔ گلو خلاصی کی کوئی صورت ہی ممکن نہ تھی۔

ویسے وہ بے حد پُر محبت تھے۔ اس کی راہ میں آنکھیں بچھانے کو تیار۔ اس کے سامنے آتے ہوئے ان کا چہرہ جھک جاتا۔ نظریں نہ اٹھتیں۔ بات بات پر اس کی ضرورتیں پوچھا کرتے۔ اور ایسے میں وہ سوچتی۔ اگر وہ اپنے جذبات پر اتنے قادر رہیں تو وہ بھی اپنے مقام سے نہیں گرے گی۔ چاہے آہوں تلے دبی دبی چنگاریاں سلگتے سلگتے اسی کو جلا کر خاکستر نہ کر دیں۔ وہ دل ہی دل میں چلانے لگتی۔ جانتے بوجھتے تم نے میری زندگی کیوں برباد کی ہے۔ میری شادی ان در و دیوار سے نہیں تم سے ہوئی ہے۔ تم بھی تو میری طرح اپنے وارث کے لئے تڑپ رہے ہو۔ وارث۔ جلی ہوئی ہنسی اس کے ہونٹوں پر بکھر جاتی۔ اولاد کیا آسمان سے ٹپکے گی یا زمین سے اگے گی؟ اور اس کا سارا جسم چیخنے لگتا۔ کہیں وہ کوئی بھیانک مذاق نہیں کر رہے تھے؟ اسے تو ان کی محبت ہی زہر لگتی۔ اس کی امنگیں سکرات میں مبتلا تھیں۔ ساری ساری رات بے تاب و خواب وہ بستر پر کروٹیں بدلا کرتی۔ جیسے پہلوؤں پر انگارے بچھا دئے گئے ہوں۔ وہ یہ بھی دیکھتی تھی۔ شادی کر کے پروفیسر صاحب نے بھی کوئی سخت ترین عذاب مول لیا تھا۔ پہروں اپنے کمرے میں ٹہلا کرتے۔ کوئی تدبیر اگر سلمیٰ کے ذہن میں نہیں آرہی تھی تو شاید ان کی سمجھ میں بھی نہ آسکتی تھی۔ شب و روز کے اضطراب نے اسے تھکا دیا تھا۔ اپنے آپ جلتے سسکتے بیمار ہو چلی تھی۔ رات رات بھر اور دن دن بھر وہ اس کی دلجوئی میں لگے رہتے۔ لیکن اس کا عجیب حال تھا۔ وہ پاس آتے تو دل کو کچھ کچھ ہونے لگتا۔ چلے جاتے تو دل ان کے لئے مچلنے لگتا۔

ایک دن اس نے شکایت کر ہی دی۔ "آپ کو تو میرے پاس بیٹھنے کی بھی فرصت نہیں ہے!"

"بیٹھا تو ہوں گا!" وہ ہنسنے لگے۔

"نہیں۔ بتائیے۔ میں اکیلی پڑی پڑی کیا کیا کروں؟"

"تفریحیں کرو۔ سیر سپاٹے کیا کرو۔ کلب تھیٹر جاؤ۔ کون کہتا ہے تم اکیلی پڑی رہو۔"!!

"نہیں نہیں۔ یہ سب کچھ میرا دل نہیں چاہتا۔" وہ مچل گئی۔ "میں رات دن آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔" پھر وہ شرما گئی۔

"میں تمہاری دل شکنی نہیں کروں گا سلمیٰ۔" پھر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

کاش وہ رات اس کی زندگی میں نہ آئی ہوتی۔ چوتھی کا جوڑا پہنے سولہ سنگھار کئے۔ اپنے آپ کو آئینہ میں دیکھ کر وہ مسکرائی۔ آنکھوں کا کاجل مسکرا رہا تھا۔ افشاں کا جگمگاتا راستہ یوں سجا ہوا تھا۔ جیسے اس کا جیون ساتھی اسی جگ مگ کرتے راستے سے اس کے دل میں اُتر آئے گا۔ انتظار کرتے کرتے دھک چلی۔ تب وہ آئے۔ جیسے ہی انہوں نے دروازے میں قدم رکھے۔ کلیوں کی سی نازک باہیں ان کے گلے کا ہار ہوگئیں۔ اُن کے دل کی دھک دھک وہ اپنے کانوں سے سُن رہی تھی۔ جسم آگ کی طرح جل رہا تھا۔ چہرہ سُرخ ہو چلا تھا اور وہ یوں کانپ رہے تھے۔ جیسے ابھی ابھی آ پڑیں گے۔ بڑی نرمی اور آہستگی سے اُنہوں نے لہکتا دہکتا ہار اپنے گلے سے نکال دیا۔

وہ یوں کھڑی رہ گئی جیسے بھرے بازار میں کسی نے لباس اُتار لیا ہو... انتقام... بدلہ... مچلتی ناگن کی طرح۔ جسے کوئی زخمی کرکے چھوڑ دے۔ وہ لڑکھڑائی اور فرش پر گر پڑی۔

"بیٹی وہ بہت شریف آدمی ہیں۔" شبو خالہ دماغ کے کسی کونے میں بیٹھی بکواس کر رہی تھیں۔

"شریف۔ شریف۔ نہیں چاہئے مجھے ایسا شریف" کانوں پر ہاتھ رکھ کر وہ چلائی۔ یوں سوکھی مٹی کی طرح وہ چٹخ رہی تھی جس پر برسہا برس سے پانی کی ایک بوند نہ پڑی ہو۔

پھر وہ بھی خاموش ہوگئی۔ دن بھر آوارہ روح کی طرح ڈھنڈار کوٹھی میں پھرا کرتی کبھی کچن میں گھُسی خانساماں کا ہاتھ بٹا رہی ہے کبھی مالی کے ساتھ باغ میں پھر رہی ہے۔ لیکن اس کا ذہن جسم کا پابند نہ تھا۔ وہ تو ہوائی پر اُڑ رہا تھا۔

اب تو تمہارا دل لگ گیا ہے سلمیٰ۔" ایک دن انہوں نے کہا۔

"کچھ نہ پوچھئے۔" وہ ہنسی اور لاکھوں بچھوؤں نے پروفیسر صاحب کے دل میں ڈنک مار دیئے۔ "یہ کوٹھی، یہ کار، اور یہ ریفریجریٹر جن سے میری شادی ہوئی ہے کتنا میرا دل بہلاتے ہیں۔ آپ نے خواہ مخواہ باورچی اور مالی رکھ چھوڑے ہیں۔ کیا میں کھانا نہیں پکا سکتی۔ باغ کو پانی نہیں دے سکتی؟"

وہ خاموش اس کی شکل دیکھتے رہے۔

"دیکھئے۔ آپ نے شبو خالہ کو کتنا منع کیا تھا۔ ہمارے ہاں نہ آیا کریں۔ مگر وہ لالچی بُڑھیا بھید لینے آن ہی مرتی ہے۔ کل اِدھر آپ گئے اُدھر آدھمکی۔ میں نے کچھ دے دلا کر ٹالا۔ ہائے اللہ کتنی دعائیں دی ہیں بے چاری نے۔ دودھوں نہاؤ۔ پوتوں پھلو۔ اللہ توبہ۔" وہ دہری ہوگئی اور پروفیسر صاحب پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

"اس نے مجھے دھوکا دیا۔ وہ اس قابل نہیں ہے کہ یہاں آسکے!" پروفیسر صاحب نے کہا

"ہاں۔ میں غریب ماں کی بیٹی تھی۔ اس نے لاکھوں کے فسانے سنائے ہوں گے۔"

"نہیں سلمیٰ۔ دھوکا تو میں نے کسی اور ہی معاملے میں کھایا تھا۔" پھر سلمیٰ پوچھتی رہ گئی۔ مگر وہ چل دیئے۔ وہ تو اور بہت سی نیچی نیچی باتیں کہہ کے دل کی بھڑاس نکال چکی۔ جیسے لاوا اُبل کر آبادیاں ویران کر دیتا ہے اور خود پُرسکون ہو جاتا ہے لیکن وہ اپنے اضطراب کو کسی طرح نہ بہلا سکی۔ بے چینی بے قراری۔ اور روح کے کچوکے۔ سرکش اور ہٹیلے خیالات۔ اور وہ بیماروں سے بدتر ہوگئی۔ پروفیسر صاحب نے جان بوجھ کر کلہاڑی اپنے پاؤں پر ماری تھی۔ اس کے زخم کی دیکھ بھال میں لگ گئے۔ پر وہ تو ٹھنڈے پھائیوں کی آنچ سے اور پھیلتا گیا۔ بڑھتا گیا۔

ایک آرزو قطب مینار کی طرح استوار و مستحکم اس کے دل کے اندر کھڑی تھی!

یک بیک ایک اجنبی چہرہ اپنے اوپر جھکا دیکھ کر اُس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں شال سر تک کھینچ لی۔ وہ چہرہ۔ روشن اور تاباں۔ جیسے دل کے اندر کوئی آتشبازی چھوٹ رہی ہو۔

یہ تو اُسے بعد کو پتہ چلا۔ وہ اس کے معالج تھے۔ ڈاکٹر محسن! محسن؟ ایک جھنکار تھی جس نے اُسے مسحور کر دیا۔

اسم بامسمّٰی ہیں! پروفیسر صاحب کی تعریف اسے یوں پیاری لگی۔ جیسے اپنے کسی عزیز کا تذکرہ ہو۔ انہوں نے بل کی رقم اُن کے آگے سرکائی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب یوں پیچھے ہٹے۔ اور اس طرح پروفیسر صاحب کو دیکھا کہ مارے خجالت کے اُن کی پیشانی پر پسینہ پھوٹ آیا۔

"دواؤں کی قیمت ہے!" سلمٰی البتہ چہک اُٹھی۔

"دواؤں کی قیمت؟ واہ بیگم فضل واہ ۔۔؟ میری اتنی بڑی ڈسپنسری میں صرف آپ کے لئے دوائیں نہیں تھیں؟!" انہوں نے قہقہہ لگایا۔ سلمٰی اس ایثار پر بک گئی۔ پروفیسر صاحب متاثر ہو گئے۔ انہیں پتہ نہ چلا کب وہ کوڑیوں کے مول ڈاکٹر کے ہاتھوں بک گئے تھے۔

وقت بے وقت وہ بیگم فضل کی خیریت پوچھنے آنکلتے۔ جیسا کہ انہوں نے کہا تھا۔ اُن کا مطب کا راستہ ادھر ہی سے ہو کر گزرتا تھا۔ سلمٰی کے دل سے۔ اور وہ وقت سلمٰی کو گزارنا مشکل ہوتا۔ اسی بے تابی سے اُس نے کبھی پروفیسر صاحب کا انتظار نہ کیا تھا۔ یہ تو وہ خود محسوس کرتے۔ ان کا وجود ایک ایسا آٹومیٹک کرنٹ تھا جس سے سلمٰی کا سارا وجود روشن ہو جاتا۔ پھر وہ تو اس کے معالج تھے۔ جانے کیسے انہیں پتہ چل گیا تھا جسمانی دکھوں کے علاوہ روحانی علاج بھی اُنہی کے پاس تھا۔ پھر وقت کے دھاروں نے دونوں کو آگے ہی آگے ڈھکیل دیا۔

انہوں نے تو سیر و تفریح کی خود اجازت دی تھی۔ گھر ہی ہر دن رات کیرم کی کھٹا کھٹ گونجتی۔ سُریلے اور بھاری قہقہے لگتے۔ مینڈولن کے نغمے گونجتے۔ ساز و نغمہ ہم آہنگ ہو جاتے۔ اُن کی مسحور کن شخصیت نے اس کے پر پُرزے ہی بدل ڈالے تھے۔ وہ تو اب پہچانی نہ جاتی۔ سلمٰی نے یہ نہیں دیکھا۔ اس کی خوش قسمتی نے کسی کے چہرے کی جھرّیوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ تو وقت کے دھارے کے ساتھ بہی جا رہی تھی۔ آزادی کے وہ طویل طویل دن۔ سرشاری۔ خوش قسمتی۔ پروفیسر صاحب تو خود بخود دان کے راستے سے ہٹ گئے تھے۔ اور وہ زبانِ حال سے بتا رہی تھی۔ وہ شوکیس میں سجائی جانے والی گڑیا نہیں تھی۔

ایک رنگین مگر خاموش سبق کی طرح پروفیسر صاحب نے حالات کا مطالعہ کر لیا تھا۔ وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ سلمٰی اتنی فارورڈ بھی ہو سکتی ہے۔ بے زبان مشرقی لڑکی جو شوہر کے رحم و کرم پر جینے مرنے کو معراج سمجھتی ہو۔ وہ تو بالکل بدل چکی تھی۔ اور رفتہ رفتہ سلمٰی کے تمام دکھ ان کے چہرے پر بکھر گئے۔ اُسے تو نیکیوں کی جزا ملی تھی پھر سوچنے کی کیا بات؟

وہ خود سوچتے تھے۔ پچاس سال کی برف جمی ہوئی عمر سے تیس سال کی آگ پگھلاتی ہوئی عمر کہیں زیادہ پُرکشش ہوتی ہے لیکن دل پر جو پہاڑ آگرا تھا۔ وہ کسی طرح نہ سرکا۔ دن بدن اس کا بوجھ دگنا ہوتا چلا گیا۔ ویسے اُن کے سلوک میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ ویسا ہی پُرمحبت۔ اور جاں نثار۔ اگر سلمٰی زندگی بھی طلب کرے تو دریغ نہ کریں!

دن بے حد عجب صورت تھا۔ موسم کے ساتھ ساتھ سلمٰی پر بھی بہار چھائی ہوئی تھی۔ برآمدے میں کھڑی وہ جھومتے لچکتے پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔ کسی نے پیچھے سے اس کی آنکھیں بند کر لیں۔

وہ چونک گئی ۔۔ ڈاکٹر محسن ہنسنے لگے۔ ادھر اُدھر کی بے کار باتوں کے بعد ڈاکٹر نے اُسے باہر چلنے کی دعوت دی اور وہ ہچکچا کر رضامند ہو گئی۔ عمر بھر میں پہلی بار وہ کسی غیر مرد کے ساتھ باہر نکلی تھی۔ رہ رہ کر اس کا دل تھم جاتا۔ ڈاکٹر نے غیر آباد راستوں پر کار کو اندھا دھند چھوڑ رکھا تھا۔ تار کے کھمبے، باغات، جھاڑیاں اور جنگلی پھولوں کے دو رویہ تختے ویران بگولوں کی طرح اُڑے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر کا چہرہ روشن تھا۔ لیکن جوابدہی کے خیال نے سلمٰی کو زرد کر دیا تھا! ان بندھنوں سے کب نجات ہو گی؟ وہ آپ ہی آپ جھنجھلا گئی۔

" بیگم فضل۔ آپ کیا سوچ رہی ہیں" کار انہوں نے سمندر کے کنارے روک دی۔ اور بیلٹ کھول کر نیچے اتر آئے۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے بھی اُتارنا چاہا۔ مگر وہ خود اتر آئی۔ ڈاکٹر صاحب جھینپ سے گئے۔ دونوں شانہ بشانہ آگے بڑھ گئے۔ سلمیٰ کا خوشنما لباس ہوا کے تند جھکڑوں سے بے ترتیب ہو رہا تھا۔ بال چہرے کو ڈھانپ رہے تھے۔ جلدی سے لباس سنبھال کر وہ ریت پر بیٹھ گئی۔

" آج کل آپ بہت کچھ سوچنے لگی ہیں۔" وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولے۔

" میرے پاس سوچنے کو رکھا ہی کیا ہے۔!"

" بہت کچھ ہے!" وہ ریت کا گھروندہ بناتے ہوئے بولے۔

" انسان کی سوچ اس کے لئے زمین پر جنت نہیں تعمیر کرتی۔ پھر اس سے حاصل بھی کیا؟!"

اُف فوہ۔" وہ ہنس پڑے۔" فضل صاحب کی ہم نشینی نے آپ کو بھی فلاسفر بنا دیا ہے!

" فضل صاحب۔!" وہ تمسخرانہ انداز میں ہنس دی۔

" ہاں۔ بہر حال وہ آپ کے شوہر ہیں۔"

" شوہر"! ابھی وہ زور سے ہنس دی۔

" سخت ناراض معلوم ہوتی ہیں آپ اُن سے۔"!

" ہاں۔ سخت ناراض۔ لیکن کیا آپ کے پاس اُن کے تذکرے کے سوا کوئی اور تذکرہ نہیں ہے"!

" بھئی۔ مجھے تو آپ دونوں پر رشک آتا ہے۔ کتنے لوگوں کو میں نے دیکھا۔ لیکن آپ دونوں کا سا حسین COUPLE میری نظروں سے نہیں گزرا۔"

سلمیٰ کی ہنسی دیر تک نہ رُکی۔" دیکھئے۔" اُس نے ریت کے گھروندے میں دو کنکریاں پھینکتے ہوئے کہا۔" یہ ہمارا گھر ہے۔ اور یہ پتھر فضل صاحب اور بیگم فضل۔ لیکن ڈاکٹر صاحب۔ کیا یہ جاندار ہیں؟ ان میں احساسات ہیں؟ یہ زندہ ہیں"؟!

" خدا کی پناہ۔!"

اور کچھ سوچ کر سلمیٰ کا چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا۔ نجانے کب ان بندھنوں سے چھٹکارا ملے گا۔" وہ بات بنانے لگی۔

" آپ چاہیں تو ابھی ہو سکتا ہے۔"

ابھی ؟!۔

" آزادی حاصل کیجئے۔ آپ کا حق ہے۔ منوا لیجئے۔ یوں تو گھل گھل کر آپ کو ٹی۔ بی ہو جائے گی۔"!

" وہ تو مجھ سے بات تک نہیں کرتے۔" بات پرائی کر کے سلمیٰ بہت پچھتائی۔

" بس ابھی کمزوریوں نے تو آپ کو ان حالوں پر پہونچایا ہے۔ وہ ناراض ہیں۔ دکھی ہیں۔ اُداس ہیں۔ ارے ہٹایئے۔ ان خیالات کو۔ جب انہوں نے آپ کی مدد نہیں کی۔ آپ کیوں اُن کی پرواہ کرتی ہیں!۔

" ممکن ہے۔ مجھ میں کوئی ایسی بات ہی نہ ہو جس کی قدر کی جائے۔"

" بیگم فضل۔" ان کی آواز سنجیدہ ہو گئی۔" آپ ایک محبت بھرے دل کا یوں امتحان نہ لیجئے۔ میرے احساسات بھی آپ سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ آپ کی قدر اس دل سے پوچھئے جس کی بے تابی اور بے چینی کی یہ آنکھیں گواہ ہیں جنہیں کئی راتوں سے نیند نہیں آئی۔" اُن کی آنکھوں میں نمی تھی۔ سلمیٰ کا سارا وجود پگھلنے لگا۔ جب وہ گھر پہونچی۔ پروفیسر صاحب برآمدے کی جالی سے پاؤں اُٹکائے تاریک خلاؤں میں کچھ دیکھ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر

وہ لرز گئی۔ لیکن وہ کچھ نہ بولے۔ اُسے دیکھ کر مُڑے اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

رات کے کھانے پر دونوں تنہا تھے۔ وہ خاموش اور سلمیٰ فکرمند۔

"خاموش کیوں ہو سلمیٰ... کیا سوچ رہی ہو؟" اُنہوں نے کہا۔

"میں سوچ رہی ہوں۔ آپ کے گھر میں میری کوئی ملکیت بھی ہے یا نہیں؟ یا میں خود بک گئی ہوں"۔ وہ پھٹ پڑی۔

"جو کچھ ہے۔ یہ سب تمہارا ہے۔ لیکن اُسی صورت میں جب تم میری ہو۔ اور جو میرا نہیں ہے۔ اس کا کچھ بھی نہیں ہے"۔ وہ کُرسی کھسکا کر کھڑے ہو گئے۔

اور شیشے کے وہ تمام شیش محل جن میں بیٹھ کر وہ پتھر چلایا کرتی تھی۔ آن کی آن میں چھن چھن کرتے زمین پر آ رہے۔ پھر ڈاکٹر محسن نے بھی یہ جواب سنا اور دم بخود رہ گئے۔ ایک بیک سلمیٰ کو نین کی گولی نظر آنے لگی۔ جسے بخار اُترنے کے دھوکے میں منہ میں رکھ لیا تھا۔ لیکن شکر گھل گئی اور کڑوی گولی یوں تالو سے چپکی رہ گئی کہ نہ اگلے بنے نہ نگلے۔

"میرے پاس بہت کچھ ہے۔ نئی زندگی گزارنے کے لئے"۔ سلمیٰ نے اندر اندر پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔ "ساٹھ ہزار نقد۔ اور وہ تحفے۔ جو انہوں نے دیئے تھے"۔

"راز کو راز رکھنے کے لئے۔۔!" ڈاکٹر محسن کے بے باک قہقہے نے سلمیٰ کو کاٹ کر رکھ دیا۔

کتنی دیر تک وہ اس قہقہے کی دھمک اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کرتی رہی۔ اس کے سوا اُسے پروفیسر صاحب کا چہرہ یاد آ رہا تھا۔ خشونت آمیز لیکن مغموم۔ ابھی وہ اتنی سخت نہیں ہوئی تھی کہ ٹوٹ ہی جاتی۔ مُڑنے کی لچک باقی تھی۔ سال بھر پہلے والا ہشاش بشاش چہرہ بھی اس کے ذہن میں محفوظ تھا۔ لیکن اب تو وہ عمر سے دس سال آگے بڑھ گئے تھے۔ پہلے نہ تو رخساروں میں گڑھے تھے نہ آنکھوں کے گرد سیاہی مائل حلقے پڑ گئے تھے۔ اور نہ کبھی بات کرتے وقت اُن کے لب یوں کانپتے تھے۔ جیسے ناقابلِ برداشت درد اور اذیت ضبط کر رہے ہوں!

اس کی پرواز بہت اونچی ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر محسن نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ صرف اُسی حد تک جہاں تک کہ عورت مرد کے لئے اور مرد عورت کے لئے ضروری ہیں۔ اس کے سوا اُسے سب کچھ میسّر تھا۔ اور اب تو اس کی اڑان ایک ننھے سے پنگھوڑے پر آکر رک گئی۔ اس تصوّر نے اُسے اور بھی دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اور اب وہ پل بھر کے لئے اس محل میں رہنے کو تیار نہ تھی۔ لیکن وہ رات اس کے لئے پہاڑ بن گئی۔ ایک طرف پروفیسر فضل کا سرد سلوک تھا۔ دوسری طرف اُن کی بے پناہ محبت کچوکے لگاتی۔ اور دل محسن کی محبت پہ جھکا پڑتا۔ صبح کو اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ جسم کا ایک ایک بند ٹوٹ رہا تھا!

ناشتے کی میز پر ملازمہ نے اطلاع دی۔ "سرکار بغیر ناشتہ کئے چلے گئے"۔

جتنی محنت سے وہ ذہن کی سطح سے پروفیسر صاحب کا چہرہ مٹانے کی کوشش کرتی۔ اتنی ہی شدّت سے اور وہ چہرہ محیط ہو جاتا۔ رہ رہ کر اُسے احساس ہوتا۔ اُن کی پُرسکون زندگی میں خلش بکھیرنے والی ہستی وہی ہے۔ شعور میں یہی خیال ہزار پا کی طرح جکڑ گیا تھا۔ وہ عریب تھی مگر بے باک نہ تھی۔ اس نے کبھی اس طرح نہ سوچا تھا۔

اچانک اس کی نظر قدِ آدم آئینے پر پڑی۔ وہ بھی کتنی بدل گئی تھی۔ وہ معصومیت اور سادگی جو پہلے اس کے وجود میں رچی بسی تھی۔ اب اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ جو رسی بن گئی۔ کیا وہ سچ مچ پروفیسر فضل کو چھوڑ جائے گی۔ چھوڑ سکتی ہے؟ زمانے کی اٹھی ہوئی انگلیوں سے بے پروا۔ شماتتِ ہمسایہ سے بے نیاز۔ اس کے آس پاس محسن کا خیال تھا اور بس...

اچانک اس کا دل دھڑکنے لگا۔ کیا ایسا ممکن ہے؟ وہ ترقی پسند ماحول کی پروردہ نہ تھی۔ اسے پتہ بھی نہ تھا۔ ترقی پسندی کس بلا کا نام تھا؟

لیکن محسن کی ہم نشینی اور اونچی سوسائٹیز کی نشست و برخاست نے اُسے ترقی پسندی کے سارے گُر سکھا دئے تھے۔ زندگی میں جب تک کوئی رومان نہ ہو۔ پبلک میں کوئی وحشیانہ سکنڈل نہ ہو۔ اور عورت کسی مرد سے وابستہ نہ ہو۔ اصلی معنوں میں لڑکی ترقی پسند مہذّب اور نئی نسل کی علمبردار نہیں ہوسکتی!

یہ بھی پبلک سکنڈل ہوجائے گا۔ مگر پروفیسر صاحب۔۔۔؟

یا خدا۔ میرا انجام کیا ہوگا؟

"بیگم نفضل۔!" ڈاکٹر کی آواز آئی اور اس نے خود کو سنبھال لیا۔ کتھئی سوٹ میں وہ بڑے سمارٹ دکھائی دے رہے تھے! اخلاقاً وہ مسکرائی۔ آپ کی آنکھوں سے پتہ چلتا ہے۔ رات آپ نے کوئی فیصلہ کُن جنگ لڑی ہے؟" وہ جھکتے ہوئے بیٹھنے لگے۔ اور یکبارگی کوئی انجانی سی ناگوار بُو اس کے حلق سے پار ہوگئی۔ پتہ نہیں کیوں... دفعتہً اسے یہ سب کچھ بے معنی اور بیکار لگنے لگا تھا۔ یہ انسان۔ انسانوں سے پُر دنیا۔ ان کی خواہش موت و زیست۔ سب بیکار۔ بے وجہ۔ اس نے اکتا کر سر پھیر لیا۔

"آج تو اتوار ہے۔ پروفیسر صاحب کہاں چل دیئے؟"

یک بیک اس کا دل بھر آیا۔ کسی انجمن میں نیک اور ہمدرد آدمی کا تذکرہ ہی دل میں آنسو بھر دیتا ہے۔

"وہ مجھ سے خفا ہیں۔ آج بغیر کھائے پئے چلے گئے۔" اس کے آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک آئے۔

"مشرقی عورت کا دل۔" محسن نے قہقہہ لگایا۔ "وہ آپ کو کچھ نہیں سمجھتے۔ لیکن آپ اُن کے خیال سے آنسو بہا رہی ہیں۔"

"وہ میرے شوہر ہیں۔" وہ خود کو ڈاکٹر کی دلیلوں سے بہلانے لگی کہ وہ گناہ نہیں کر رہی تھی۔

"لعنت بھیجئے ایسے شوہر پر۔ انہوں نے آپ کو کیا دیا ہے۔ سوائے دولت کے۔ کیا آپ دولت پر بہل جائیں۔ لیکن آج آپ یہ سب کچھ کیوں سوچ رہی ہیں؟ کیا آپ اپنا عہد بھول گئیں؟"

وہ ہچکچائی۔

"ذہن سے سب کچھ جھٹک دیجئے۔ بزدل نہ بنئے۔ ہم آج رات یہاں سے چل نکلیں گے۔ نئی دنیا ہوگی۔ نئی خوشیاں ہوں گی۔ لیکن آپ نے اپنا وعدہ فراموش تو نہیں کر دیا۔ ؟! بیگم نفضل۔ خدارا۔ زندگی کی راہوں پر میرا ہاتھ تھامنے کی بجائے مجھے موت کے غاروں میں نہ دھکیل دیجئے گا۔" محسن کے آنسوؤں پر سلمیٰ کا ایمان بہنے لگا۔ "نہیں تو۔" وہ رُکی۔ مُسکرائی۔

"آج رات ٹھیک بارہ بجے۔ یاد رکھیں گی نا؟" وہ خوش ہوگئے۔ اور وہ ضروری تیاریاں کرنے چل دئے۔ پروفیسر صاحب کو دیکھ کر پھر اس کے دل میں ہیجان برپا ہوگیا۔ سلمیٰ کو دیکھ کر لسورتی ہوئی مسکراہٹ اُن کے ہونٹوں پر دم توڑ گئی۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ اپنے دل سے ساری ہمدردیاں کھرچ ڈالنے لگی۔ لیکن وہ چیز جو اس کے دل میں آہستہ آہستہ سلگ رہی تھی۔ یکدم بھڑک اٹھی۔ وہ کیا چیز تھی؟

"آج تو چھٹی تھی۔ آپ کہاں چلے گئے تھے!" اُن کی نظروں سے گھبرا کر وہ یہی بول سکی۔

"یونیورسٹی پہنچ کر پتہ چلا کہ آج اتوار ہے۔" انہوں نے جواب دیا۔ "پھر وہیں سے بیرسٹر صاحب کے پاس چلا گیا۔ کچھ ضروری مشورے لینے تھے۔"

"آپ نے کھانا نہیں کھایا۔" دل کی دھک دھک سے پریشان ہو بمشکل اُس نے حلق سے آواز کھینچی۔

"ہاں سلمیٰ۔ اس کا بھی خیال نہیں آیا۔" یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔ سرِ شام کا اندھیرا ماحول کو اداس بنا رہا تھا۔ بے چینی کم کرنے کے لئے اُس نے ریڈیو چلا دیا۔ اداس اور زرد شام کو جب اضطراب اور بے چینیوں کا کوئی حل نہ تھا۔ پُر سوز آواز نغمے سے رلا ہی دیا

ہم سفر ساتھ اپنا چھوڑ چلے   رشتے ناطے وہ سارے توڑ چلے

ریڈیو بند کرکے وہ باہر نکلی اور فرشتوں اور شیطان کی لڑائی میں ریفری کا کام انجام دینے لگی۔ اس کے اندر رسہ کشی ہو رہی تھی۔

فرشتے بضد تھے۔ بہت بڑے لوگ بہت برے لوگوں کے ساتھ بھاگتے ہیں۔

شیطان تسلیاں دے رہے تھے۔ "بھاگ چلو۔ بھاگ چلو۔ یہاں اپنا خون پکانے اور دل جلانے کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے؟" فرشتوں نے التجا کی "یہی سہارا اٹل ہے۔ باقی سب کمزور ڈھلے گے۔"

شیطان نے رسہ اپنی طرف کھینچ لیا۔ "یہی سہارا پکڑے رہوگی تو قبر تک پہونچ جاؤ گی۔ دنیا کی کوئی خوشی تمہارے دامن میں نہ آسکے گی۔"

وہ اندر آئی۔ ٹرنک کھینچا۔ الماری کھولی۔ پہلے قیمتی مرصع زیورات کی تہہ جمائی! اوپر ملبوسات سجائے اور ٹرنک مسہری کے نیچے کھسکا دیا۔ محسن کے ساتھ نئی زندگی گزارنے کے خواب اسے کسی اور ہی جہان میں اڑا لے گئے۔ بے چینی سے وہ رات کا ایک ایک پل کاٹ رہی تھی۔ رات ستاروں کو لئے جگمگا رہی تھی۔ ابھی تو دس ہی بجے تھے۔ لیکن بے چینی نے اسے کھڑکی میں لا کھڑا کیا۔ صرف دو گھنٹے اور۔ پھر وہ اس بید حلے سے ہمیشہ کے لئے باہر ہوگی!

سرد آہ بھر کر وہ مڑی اور پھر جہاں کی تہاں یوں رک گئی۔ جیسے کسی سحر کے اثر سے پتھر کی بن گئی ہو۔

"مجھے تم سے کچھ کہنا ہے!" اس کا ہاتھ تھام کر پروفیسر صاحب نے مسہری پر بٹھا دیا۔ وہ چپ تھی۔ یک لخت سارا جسم کانپنے لگا۔ یک بیک وہ اتنی نروس ہوگئی جیسے ناقابل معافی جرم کرتی ہوئی پکڑی گئی ہو۔ دل کی بے پناہ دھک دھک سے!

"سلمیٰ...!" یک بیک وہ ٹھنڈی سانس لے کر کہنے لگے۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری کوئی مدد نہ کرسکا۔" ان کی آواز ایسی لگ رہی تھی جیسے آنسوؤں میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی ہو۔

"میں اپنی کثیر دولت کا ایک وارث چاہتا تھا۔ لیکن اس کا خیال مجھے بہت بعد کو آیا۔ جبکہ اس کا وقت ہی گزر چکا تھا۔ شبو خالہ ہمارے ہاں بہت دنوں سے آتی تھیں۔ لیکن انہوں نے مجھے دھوکا دیا۔ تمہاری عمر بہت زیادہ بتائی تھی۔ یہی میں نے تم سے کہا بھی تھا تم اسے اپنی عزت پر طنز سمجھی تھیں، نہیں سلمیٰ۔ مجھے صدمہ ہے۔ پہلی رات کو جب میں نے تمہیں دیکھا۔ اور میرے ہاتھ سے تمہارا آنچل چھوٹ گیا۔ میری توقعات سے کہیں کم عمر میں تم سے بہت بڑا ہوں۔ تم سے اجتناب کی وجہ یہی ہے۔ تم مجھے پتھر سنگدل اور جانے کیا کچھ سمجھتی ہو۔ جس کے پاس دل نہیں، جذبات نہیں۔ لیکن نہیں معلوم کیوں، تمہارے قرب سے مجھے شرم آتی ہے۔ میرے کسی جذباتی فعل کو تم کیا سمجھوگی۔"

"میں نے آپ سے شکایت کب کی؟" خدا جانے کیسے سلمیٰ بول سکی۔

"یہ شکایت زبان نہیں کرتی، آنکھیں کرتی ہیں۔ دل کرتا ہے۔ اور یہ تو قدرتی تقاضہ ہے۔ میں بھی اس سے مُبرّا نہیں۔ لیکن مجھ میں اور تم میں کوئی جذباتی وابستگی نہیں ہے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں! مگر یہ نہ سمجھنا کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔ کاش! تم میرا دل چیر کر دیکھ سکتیں۔ افسوس تو یہی ہے کہ میں جیسا ہوں۔ ویسا ہی تمہیں بھی دیکھنا چاہتا تھا اب معلوم ہوا کہ یہ ناممکن ہے!

میں نے تمہاری زندگی کھلونا بنا دی۔ مخلصی کی کوئی تدبیر میں سوچ ہی رہا تھا کہ تم نے ڈھونڈ لی۔ میں کسی بات سے تمہیں منع نہیں کروں گا۔ مجھے اس کا حق ہی نہیں ہے۔ مگر سلمیٰ، میرا مشورہ ہے کہ اپنا انتخاب اپنے برابر کا کرو۔ ڈاکٹر محسن کے بارے میں، میں نے خوب چھان بین کی ہے۔ سلمیٰ۔ یقین کرو۔ وہ صرف آدمی ہیں۔ انسان نہیں ہیں۔ اگر انسان ہوتے تو وہ تمہیں ایسا برا مشورہ ہرگز نہ دیتے۔ جہاں تک میں نے معلوم کیا ہے۔ وہ شراب بھی پیتے ہیں۔"

معاً اسے وہ ناگوار بو یاد آئی۔ وہ سرد ہوگئی۔ پروفیسر صاحب کے الفاظ کی سچائی اس پر عیاں ہونے لگی تھی۔ وہ پھر کہنے لگے۔ "میں تمہاری راہ کی رکاوٹ نہیں بنوں گا۔ چاہے اس کے بعد مجھے زندگی بھر رونا پڑے سلمیٰ۔ تمہیں خبر نہیں۔ میری ہر رات میرے آنسوؤں کی گواہ ہوتی ہے لیکن خیر

(باقی صـ پر)

شیر افضل جعفری

قطعات

(۱)

بخشا ہے مفلسی نے جلالِ ابوذری — چشمِ جفاگراں میں کھٹکنے لگا ہوں میں
کھنچ کر صلیبِ وقت پہ منصور کی طرح — سینے میں کبریا کے دھڑکنے لگا ہوں میں

(۲)

زیست اس دھوم سے افلاس میں گزرتی ہے — موت آئے تو دبے پاؤں گذر جاتی ہے
فقر وہ ابرِ غزل بار ہے جس کے دم سے — دار بھی یارِ طرحدار نظر آتی ہے

(۳)

غنا کو دیکھ کے بے تاب جعفری کے لئے — ترس رہے ہیں تونگر بھی مفلسی کے لئے
قبول تانہیں مردِ ملنگ سلطانی — کہ تاجِ کاسۂ زر ہے گداگری کے لئے

(۴)

زخم پلکوں سے زمانے کا سیا ہے میں نے — زہر کا جام بہر گام پیا ہے میں نے
جھوم کر دی ہے مقدر نے مجھے نانِ جویں — ہنس کے رزاق کا منہ چوم لیا ہے میں نے

شاہد احمد دہلوی

مولانا صلاح الدین احمد

بعض پیارے جو ہم سے رخصت ہو چکے ہیں جب ان کا خیال آتا ہے تو دھیان میں دھنک سی نکل آتی ہے۔ کسی کسی کا تصوّر بندھتا ہے تو خوشبو سے مشامِ جاں معطّر ہو جاتا ہے، کبھی کلیاں چٹکنے لگتی ہیں اور کبھی پھول کھلنے لگتے ہیں، مگر مولانا صلاح الدین احمد یاد آتے ہیں تو ذہن کے اُفق پر چاند کھیت کرتا ہے اور ٹھنڈی چاندنی پھیلتی چلی جاتی ہے۔ اپنی زندگی میں مولانا چودھویں کا چاند بن کر ادب کے آسمان پر چمکے اور مرے تو اپنے پیچھے ایک ایسی کہکشاں چھوڑ گئے جو ان کے نام کو رہتی دنیا تک پائندہ و تابندہ رکھے گی۔

مولانا کو بچپن ہی سے ادب کی چیٹک تھی۔ جب وہ اسکول میں پڑھتے تھے تو اپنے جیب خرچ میں سے پیسے بچا کر انہوں نے ایک رسالہ نکالا تھا جس میں خود لکھتے تھے اور اپنے اسکول کے دوستوں سے لکھواتے تھے، جب پیسے ختم ہوگئے تو رسالہ بھی بند ہوگیا۔ مگر ادب کی لگن باقی رہی اور اس دبی ہوئی خواہش کی تکمیل اس وقت ہوئی، جب کئی سال بعد مولانا تاجور نجیب آبادی سے انہوں نے ادبی دنیا کو خرید لیا۔

مولانا ایک آسودہ حال خاندان کے فرد تھے۔ یہ خاندان زوالِ دہلی کے زمانے میں دلّی چھوڑ کر لاہور آ گیا تھا۔ مولانا کے والد مولوی احمد بخش عربی، فارسی اور اردو کے بہت بڑے عالم اور چیفس کالج میں فارسی کے اُستاد تھے۔ مشرقی زبانوں سے انہیں بچپن ہی میں شیفتگی ہوگئی تھی۔ اور خاندان کے پنجاب منتقل ہو جانے کے باوجود ان کے گھر میں اردو ہی بولی جاتی تھی۔ اس خاندان کے افراد ملازمت پیشہ تھے اور انگریزوں کی حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر مامور رہتے، مولانا کے بڑے بھائی ضیاء الدین احمد جو مولانا سے کئی سال بڑے تھے۔ سندھ میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔ اُن کی خواہش یہ تھی کہ مولانا بھی فارغ التحصیل ہونے کے بعد پولیس سروس میں آجائیں۔ مگر مولانا ملازمت کے بندھنوں سے آزاد رہنا چاہتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ اسی میں اللہ نے اچھی خاصی برکت دیدی تھی، مگر جس کو ادب کی چاٹ لگ جائے وہ کسی اور کام کا نہیں رہتا۔ چنانچہ جب ادبی دنیا کو مولانا تاجور نے بند کرنے کا ارادہ کر لیا تو مولانا مرحوم نے اسے خرید لیا۔ لاہور ہی میں ایک اور صاحب تھے منصور احمد۔ یہ صاحب مولانا کے پرانے ہم جماعت اور دوست تھے۔ ان کا تعلق مولانا ظفر علی خاں کے خاندان سے تھا۔ انہیں بھی ادب کا چسکا شروع ہی سے تھا۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد رسالہ "ہمایوں" کے اڈیٹر ہوگئے تھے۔ کئی سال تک "ہمایوں" کو چلانے کے بعد خرابیٔ صحت کی بنا پر "ہمایوں" کی ادارت حامد علی خاں صاحب کو سونپ کر علیحدہ ہوگئے تھے۔ منصور احمد تجربہ کار اور زیرک نام ایڈیٹر تھے۔ صلاح الدین احمد صاحب نے اپنے رفیقِ دیرینہ کو اس پر آمادہ کر لیا کہ "ادبی دنیا" کا بارِ ادارت اٹھانے میں ان کے شریک ہو جائیں۔ صلاح الدین احمد کو اس وقت تک کوئی نہیں جانتا تھا، منصور احمد کو سب جانتے تھے، اُن کی ساکھ بھی تھی۔ اس سے "ادبی دنیا" کو دوبارہ چلانے میں بڑی مدد ملی۔ صلاح الدین احمد صاحب اچھے منتظم بھی تھے۔ رسالے کا کام انہوں نے بہت باقاعدگی سے شروع کیا۔ منصور احمد نے پرچے کی ترتیب اپنے ذمّے لی۔ ان کے چھوٹے بھائی مظفر احمد نے حساب کتاب سنبھالا۔ ایف۔ ایم۔ ساقی نے اشتہارات مہیا کرنے کا ذمہ لیا۔ مولانا تاجور کے زمانے میں بھی شعبۂ اشتہارات انہی کے سپرد تھا۔ صلاح الدین احمد صاحب نے انتظامیہ شعبہ بھی سنبھالا اور ادارت میں بھی ہاتھ بٹایا۔ دفتر کے مختلف کام کرنے کے لئے چار آدمی رکھے گئے۔ مال روڈ پر دفتر لیا۔

پرچہ بڑے طمطراق سے نکلنے لگا۔ اور چند مہینوں ہی میں اپنے ہم عصر رسالوں میں مقام پیدا کر لیا۔ "ادبی دنیا" سائز میں تمام ادبی پرچوں سے بڑا تھا اور اس کی ظاہری وضع قطع بھی بہت خوشنما تھی۔ نئے لکھنے والے ادبا اس کے لئے مضامین بھیجتے تھے اور اس میں چھپ جانا اپنے لئے قابلِ فخر بات سمجھتے تھے۔ رفتہ رفتہ تقریباً سارے ہی اچھے لکھنے والے "ادبی دنیا" میں جمع ہو گئے۔ اس کھیپ میں میرا جی بھی آئے۔ کرشن چندر، بیدی اور اشک بھی۔ انہیں "ادبی دنیا" سے شہرت ملی۔ اور "ادبی دنیا" کو ان سے فروغ ہوا۔ مولانا صلاح الدین احمد کی مقناطیسی شخصیت نے انہیں اپنا گرویدہ بنا لیا اور اچھے لکھنے والوں کا ایک حلقہ "ادبی دنیا" کو مل گیا۔ مولانا ان نئے لکھنے والوں کو ہمیشہ جتلاتے رہتے تھے کہ ادب میں پاکیزگی کو کبھی ہاتھ سے نہیں دینا چاہئے اور اخلاقی قدروں کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہئے۔ مولانا نے انہیں یہ بھی بتایا کہ اچھی چیزیں لکھنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کلاسکی ادب سے اپنا ناتہ نہ توڑا جائے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ بعض بہت اچھے مضامین محض اس لئے "ادبی دنیا" میں جگہ نہ پا سکے کہ ان میں فحاشی یا عریانی کا جزو شامل تھا۔ مولانا اس معاملے میں بہت سخت گیر تھے۔ خوش اسلوبی سے مضامین لوٹا دیتے۔ مجھے یاد نہیں کہ منٹو کا کوئی مضمون "ادبی دنیا" میں کبھی چھپا ہو۔

منصور احمد کے مرض نے دق کی صورت اختیار کر لی اور بہت تھوڑے عرصے بعد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ وقت صلاح الدین احمد صاحب کے لئے بڑا آزمائش کا تھا۔ مگر وہ محنتی آدمی تھے، اس صدمے کو جھیل گئے اور منصور احمد کی کمی کو انہوں نے محسوس نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ "ادبی دنیا" اسی شان سے نکلتا رہا۔

میرا جی نے اپنے زمانۂ ملازمت میں دوسری زبانوں کے مشہور شعرا پر بہت کام کے مضامین لکھے۔ بودلیئر ان کا محبوب و مثالی شاعر تھا۔ اسکی شخصیت کا زیادہ حصہ میرا جی نے اپنے کردار میں سمو لیا تھا۔ جب محمود نظامی نے میرا جی کو آل انڈیا ریڈیو میں دلی بلوا لیا تو مولانا تنہا ادارتی فرائض انجام دینے لگے۔

مولانا بیحد شریف النفس انسان تھے۔ رسالے والوں کی برادری میں اکثر آپس میں جھڑپیں ہو جایا کرتی ہیں۔ مگر "ادبی دنیا" کبھی کسی لڑائی بھڑائی میں مبتلا نہ ہوا۔ حالانکہ لاہور اس زمانے میں ادبی جدال کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مولانا عبدالمجید سالک اپنے "افکار و حوادث" میں یو۔ پی والوں سے الجھتے سلجھتے رہتے تھے۔ حفیظ جالندھری اور مولانا تاجور کی چلتی رہتی تھی۔ نیاز مندانِ لاہور نے اپنا محاذ بنا رکھا تھا۔ لیکن مولانا ان سب مناقشوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی ان سب سے الگ رہے اور خاموشی سے اپنا کام کرتے رہے۔ لہٰذا وہ اپنے سب معاصرین سے بازی لے گئے۔ صرف ایک دفعہ ایسا ہوا کہ رسائل کے جائزے کے سلسلے میں مولانا نے ساقی کے کسی مضمون پر کچھ لکھ دیا تھا۔ مجھے مولانا کا یہ تھوڑا سا لکھنا بھی بہت برا لگا تھا اور میں نے جواب میں کچھ باتیں ایسی لکھ دی تھیں جو گستاخی کی حد کو پہنچ گئی تھیں۔ مولانا نے یہ کیا کہ "ادبی دنیا" میں سے وہ سلسلہ ہی اڑا دیا اور مجھے اس کے منقطع کرنے کی اطلاع دی۔ مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اور میں نے فوراً معذرت کا خط لکھا۔ مگر مولانا نے وہ سلسلہ دوبارہ جاری نہیں کیا۔ اتنا صلح کل مدیر میں نے کوئی اور نہیں دیکھا۔ تحمل اور بردباری مولانا میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ نئے مضمون نگار ان کے دفتر میں پہنچ کر انہیں بہت ستاتے تھے۔ بعض بحث کرنے لگتے تھے، مگر مولانا کی تیوری پر بل تک نہ آتا تھا۔ بڑی نرمی اور خوش اسلوبی سے ان کے مضامین کے نقائص انہیں سمجھا دیتے تھے اور انہیں مطمئن کر کے رخصت کرتے تھے۔ بڑے دل گردے کا کام ہے یہ۔ اپنی تو کیفیت یہ تھی کہ بحث کسی سے نہیں کی۔ بس کہہ دیا کہ مضمون ٹھیک نہیں ہے نہیں چھپ سکتا اور اگر کسی نے بحث کی تو اسے چاندی باتیں کر کے بھگا دیا۔

کوئی تیس سال پہلے مولانا سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ تو ٹوٹ کر گلے ملے۔ کہلاتے مولانا تھے مگر نکلے آپ ٹھو دیٹ جنٹلمین۔ پورا سوٹ مع نکٹائی کے زیب تن تھا۔ سر وقد، کھلی پیشانی، غلافی آنکھیں۔ سواں ناک، کتری ہوئی مونچھیں، منڈی ہوئی ڈاڑھی، لبوں پر مسکراہٹ، چہرے پہ ذہانت کا نور، بڑی دلکش شخصیت تھی مولانا کی۔ اس پر ان کا حسنِ اخلاق، سونے پر سہاگہ۔ مجھ سے پانچ چھ سال بڑے تھے مگر پہلی ملاقات میں ہم عمروں کی طرح گھل مل گئے۔ مولانا کی وضع مغربی تھی۔ مگر ان کا دل خالصتاً مشرقی تھا۔ بہت خوش ہوئے اور بہت خوش کیا۔ اگلے دن شام کو دفتر ہی میں

جانے پر بلایا تو ادبی دنیا کے تقریباً سبھی مقامی مضمون نگار موجود تھے۔ اکثر سے ملاقات پہلے ہو چکی تھی۔ کرشن چندر، بیدی، اشک، عاشق بٹالوی، اور دیوندر ستیارتھی سے یہیں تعارف ہوا۔ اس واقعہ سے بھی مولانا کی وسیع القلبی کا اظہار ہوتا ہے، ورنہ ہماری برادری میں اپنے مخصوص مضمون نگاروں سے ملانا تو کجا ان کے پتے تک دوسرے ایڈیٹروں کو نہیں بتائے جاتے۔

مولانا بڑے صبر و ضبط کے آدمی تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے لاہور کے متعلق ہندوؤں کا خیال تھا کہ لاہور ہندوستان میں آئے گا۔ اس لئے ہندو لاہور میں جمع رہے۔ خنجر زنی کی وارداتوں کے بعد آتش زنی کے واقعات ہونے لگے۔ ان ہی میں مولانا کا گھر بھی جل گیا۔ میں جب دلی سے اُجڑ کر لاہور پہنچا تو ایک دن سرِ راہے ملاقات ہو گئی۔ مولانا مجھے دیکھ کر اپنی پریشانیاں بھول گئے۔ بیحد متاسف ہوئے۔ بار بار پرسشِ احوال فرماتے تھے اور ان کے چہرے پر ایک غمناک مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔ میں نے انہیں اطمینان دلایا کہ رہنے کو گھر مل گیا ہے جان بچی لاکھوں پائے۔ بعد میں مجھے ایک صاحب نے بتایا کہ مولانا پر تو خود بیحد برا وقت پڑا ہوا ہے۔ اس کے برعکس اُسی افراتفری کے زمانے میں ایک ادبی رسالے کے ایڈیٹر انارکلی میں ملے تو بڑے زور کا قہقہہ لگا کر انہوں نے فرمایا "اچھا آپ بھی آگئے۔ اب تو زبان کی ذمہ داری بھی ہم پر آن پڑی" میں نے زہر خند کے ساتھ اُن کو جواب دیا کہ آپ زبان کی طرف سے پریشان نہ ہوں، زبان تو وہاں ہے جہاں ہم ہیں۔ اس پر انہوں نے اور بھی ڈھٹائی سے قہقہہ لگایا اور چل دیئے۔

مولانا کے کچھ اپنے اصول تھے۔ اِدھر کی دنیا چاہے اُدھر ہو جائے مگر مولانا اپنے اصول سے نہیں پھرتے تھے۔ انہوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ کسی حکومت سے مالی امداد نہیں لیں گے۔ پاکستان بن جانے کے بعد بھی وہ اسی اصول پر قائم رہے۔ مولانا چاہتے تو قیام پاکستان کے بعد انہیں نہایت اعلیٰ درجے کی ایک کوٹھی لاہور کے فیشن ایبل علاقے میں الاٹ ہو جاتی۔ کسی بہت بڑے ہندو اخبار کا دفتر انہیں مفت مل جاتا، کسی بڑے پبلشر کا پورا چھاپہ خانہ کوڑیوں کے مول مل جاتا۔ مگر اُن کی غیرت و دیانت نے اسے قبول نہیں کیا۔ انہوں نے ساری عمر محنت سے اپنی روٹی کمائی۔ اس لئے انہوں نے مفت کی دولت کو ٹھکرا دیا۔ اُسی مال روڈ پر حالات سدھر جانے کے بعد ایک کمرہ کرایہ پر لیا۔ اور اللہ کا نام لے کر پھر اپنا کام شروع کر دیا۔ "ادبی دنیا" کے ساتھ ساتھ مولانا نے اب سستی کتابیں چھاپنے کا پروگرام بھی بنایا تھا۔ اپنے ادارے کا نام انہوں نے اکادمی پنجاب رکھا اور کئی سستی کتابیں چھاپیں۔ سستی سے مراد یہ ہے کہ لاگت پر بہت کم منافع رکھ کر کتاب کی قیمت مقرر کی۔ ورنہ دوسرے پبلشر لاگت کے مقابلے میں کتاب کی قیمت تین اور چار گنی تک رکھتے ہیں۔ مولانا نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ سستی اور عمدہ کتابوں کی یہ اسکیم خاصی کامیاب رہی۔ پاکستان بننے کے بعد مولانا کوئی امیر آدمی نہیں رہ گئے تھے۔ اس سستے کاروبار میں انہوں نے کئی ضخیم کتابیں بھی چھاپیں، مثلاً دیوان شیفتہ، حیات جاوید، میراجی کے نثری مضامین کا مجموعہ۔ اور ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب اردو ادب میں طنز و مزاح۔

اس سستے کاروبار نے مولانا کو سستا "ادبی دنیا" چھاپنے کی راہ سجھائی۔ رسائل کی عام روش یہ ہے کہ تقریباً سو صفحے کی قیمت ایک روپیہ رکھتے ہیں یعنی روپیہ سیکڑا۔ پانچ سو صفحے کی قیمت پانچ روپے اور ہزار صفحے کی قیمت دس روپے۔ مگر مولانا نے ادبی دنیا کے دورِ جدید میں تین سو صفحے کی قیمت ایک روپیہ رکھی۔ ایک تو رسالہ ویسے ہی گھاٹے کا سودا ہوتا ہے۔ اوپر سے مولانا نے قیمت ؎ رکھدی۔ پرچہ تو ایکدم سے چھلانگیں بھرنے لگا۔ مگر اس کے ساتھ گھاٹا بھی چھلانگیں بھرنے لگا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ مولانا اس نقصان کو کہاں سے پورا کرتے تھے۔ اغلب امکان یہ ہے کہ اس تجربے پر لگا دینے کی دھمکی وہ پہلے ہی دے چکے تھے، شاید یہ بھی کر گزرے ہوں گے۔ دراصل رسالوں کا خسارہ یا تو اشتہاروں سے پورا کیا جاتا ہے۔ یا کتابوں کی فروخت سے۔ مولانا نے ان دونوں مدوں کی طرف توجہ کی تھی۔ سستی کتابوں کا جو تجربہ انہوں نے کیا تھا وہ کامیاب ہو چکا تھا۔ اشتہارات حاصل کرنے کا بھی انہیں کافی تجربہ تھا کیونکہ "ادبی دنیا" خریدنے سے پہلے مولانا نے ایک اشتہارات مہیا کرنے والی کمپنی قائم کی تھی۔ پھر ایف ایم۔ ساقی جیسا اشتہارات کا کام کرنے والا آدمی انہیں "ادبی دنیا" کے ساتھ مل گیا تھا۔ یہ مسٹر ساقی جب مجھ سے دلی میں پہلی دفعہ ملے تھے تو میں نے

ان سے پوچھا تھا کہ آپ کو تنخواہ کیا ملتی ہے اور آپ اپنے رسالے کے لئے اشتہارات کتنے کے مہیا کرتے ہیں۔ مسٹر ساقی نے بتایا تھا کہ انہیں تین سو روپے تنخواہ ملتی ہے اور وہ ایک ہزار کے اشتہارات لا کر دیتے ہیں۔ اور جب ادبی دنیا کا خاص نمبر چھپا تو اس میں تین ہزار کے اشتہارات تھے۔ یہ اُس سستے زمانے کا ذکر ہے جب سفید کاغذ کا رِم چار روپے کا تھا اب ستائیس روپے کا ملتا ہے، گویا آج کل کے حساب سے، ۲۰ ہزار کے اس میں اشتہارات تھے۔ خیر، تو مولانا کو اشتہارات کا بھی تجربہ تھا اور اب کتابوں کا تجربہ بھی ہو گیا تھا۔ لہٰذا انہوں نے اس نئے اور سستے "ادبی دنیا" کے لئے واقعی اتنے اشتہارات حاصل کر لئے کہ اُردو کے کسی اور رسالے کو میسّر نہ آسکے۔ مگر میرا اندازہ یہی ہے کہ اشتہارات کی اِس کثرت کے باوجود مولانا کو نقصان ہی رہتا ہوگا۔ کیونکہ پرچے کی مانگ روز افزوں تھی اور صورتِ حال یہ پیدا ہو گئی تھی کہ پرچہ جتنا زیادہ چھپے گا، نقصان اُتنا ہی زیادہ ہوگا۔ ہاں اگر عمر وفا کرتی تو مولانا مزید اشتہارات حاصل کر کے اس نقصان کی تلافی کرنے میں بھی ضرور کامیاب ہو جاتے۔ وہ دُھن کے پکّے آدمی تھے۔ اور اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے روزانہ محنت کرتے تھے۔ گھر بار کے فکر سے وہ بے نیاز ہو چکے تھے۔ اُن کے دو بچّے ماشاءاللہ سی۔ ایس۔ پی افسر ہو گئے تھے۔ اور چھوٹے صاحبزادے میاں فصیح الدین احمد بھی ایم اے پاس کر چکے تھے۔ لہٰذا کام مولانا پہ پڑا ہوا تھا اور مولانا کام پہ پلے ہوئے تھے لکھنے پڑھنے کے علاوہ اُن کا اور کوئی مشغلہ نہیں تھا۔

قیامِ پاکستان سے پہلے مولانا نے بہت کم لکھا، مولانا کلاسیکی اردو ادب پر بہت گہری نظر رکھتے تھے۔ شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کی تحریروں سے اُنہیں والہانہ شیفتگی ہو گئی تھی۔ اور یہ شاید پروفیسر آزاد کا فیضِ روحانی ہی تھا کہ مولانا بھی اپنے قلم سے آبِ حیات ٹپکانے لگے تھے۔ اب وہ دور آ چکا تھا کہ لاہور میں کوئی سربرآوردہ ادیب باقی نہیں رہا تھا مولانا مردے از غیب بن کر سامنے آئے اور ادب کے مطلع پر چھا گئے۔ ادبی تقریبوں اور ادبی جلسوں کی صدارت کے لئے مولانا سے زیادہ موزوں شخصیت اب کوئی اور نہیں ملتی تھی۔ مولانا نے سر عبدالقادر کی یاد تازہ کر دی۔ اب ادب کے ساتھ ساتھ قوم اور ملک کا درد بھی ان کے دل میں بیدار ہو گیا تھا اور انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسوں میں بھی مولانا کی طلب ہونے لگی تھی۔ مگر مولانا عین اُس وقت میں ہم سے جُدا ہو گئے جب ہمیں اُن کی ضرورت سب سے زیادہ تھی۔

آخر میں میں وہی کچھ دُہرانا چاہتا ہوں جو میں نے ساقی میں لکھا تھا کہ:۔

"مولانا صلاح الدین احمد، مدیر "ادبی دنیا" کا ہم سے رخصت ہو جانا اُردو کی بدنصیبی اور ادبار کی علامت ہے۔ مولانا تے جب سے ہوش سنبھالا اُردو کی خدمت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ موت کے بے رحم ہاتھ نے اُن سے قلم چھین لیا۔ مولوی عبدالحق کے بعد اُردو صلاح الدین احمد ہی کے سایۂ عاطفت میں آ گئی تھی۔ مولانا ہی اس کے گیسو سنوارتے تھے اور مولانا ہی اُردو کی حمایت میں سینہ سپر ہو جایا کرتے تھے۔ انہوں نے اُردو کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور اُردو کے لئے اپنا گھر لُٹا دیا تھا۔ ہماری طرح زبانی نہیں بلکہ واقعی۔ جب مولانا نے ایک روپے میں تین سو صفحے کا "ادبی دنیا" دینا شروع کیا تھا تو استفسار کرنے پر مولانا نے فرمایا تھا کہ میرے پاس اب صرف ایک گھر رہ گیا ہے۔ میں اسے بھی بیچ کر اس آخری تجربے پر لگا دوں گا۔

"آخری" کا لفظ مجھے اُسی وقت کھٹکا تھا۔ مولانا کو اس کا یقین ہو گیا تھا کہ انہیں اب دو تین سال سے زیادہ جینا نہیں ہے۔ شاید اللہ کے نیک بندوں کو موت کا سایہ نظر آنے لگتا ہے۔ مولانا واقعی دو تین سال بعد اچانک ہم سے رخصت ہو گئے۔ ان کی طبیعت ناساز تھی مگر اُردو ہی کے کام سے منٹگمری انہیں جانا پڑا اور وہیں موت نے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا۔ مولانا کیا گئے کہ ان کے ساتھ ایک بہت بڑی روایت بھی ختم ہو گئی۔ اُردو کے لئے ایسے بے لوث اور بے غرض کام کرنے والے اب کہاں؟ مولانا صلاح الدین احمد کے بعد اُردو یتیم و یسیر ہو گئی۔ اور ایک ایک کا منہ تکا کرے گی۔ ایسا جانباز اور شفیق سرپرست اُسے اب کہاں نصیب ہوگا۔ ؎

وہ بات کوہکن کی گئی کوہکن کے ساتھ

رشتہ چادر کا (بسلسلہ ص۵۶)

اصل خوشی تمہاری ہے. اگر تم انہیں پسند کرتی ہو تو میں تمہیں طلاق دے دوں. لیکن اس طرح بھاگنا بہت بُرا ہے. تمہارے لئے بھی اور میرے لئے بھی!"

اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ جانے لگا.

پروفیسر صاحب نے چند کاغذات اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "تم نے مجھ سے پوچھا تھا. اس گھر میں تمہاری ملکیت کیا ہے سلمیٰ! یہ جو کچھ ہے. وہ سب تمہارا ہے. کوٹھیاں. باغات. کاریں نقد اور جائیداد. کم و بیش دو کروڑ کی مالیت. میرا کون تھا. جس پر خرچ ہوتا. اب یہ سب کچھ تم رکھ لو. جب تم ہی جا رہی ہو تو یہ میں رکھ کر کیا کروں گا ؟!"

"نہیں نہیں" اس نے کہنا چاہا. مگر حلق میں تو کسی چیز کے پھندے پڑ گئے تھے.

"میں خود اُن سے تمہارا نکاح کرا دوں گا. ایک تجربہ یہ بھی سہی لیکن سلمیٰ. اگر وہ تم سے بدسلوکی کریں. تو تم میرے پاس آجانا. نہ شرمانا نہ گھبرانا. ایک چھوٹی بہن بن کر. بیٹی بن کر. یہ گھر تمہارا ہے. میں تمہارا ہوں!"

"خدا حافظ!"

خدا حافظ کا گھونسہ ایسا پڑا کہ اس کا دل دہل گیا. جھل مل کرتی آنکھیں اوپر اُٹھائیں. وہ بھی رو رہے تھے. جانے اُن آنسوؤں میں کیا تھا. یک بیک اُن کی عظمت کے آگے اس کے دل میں ایستادہ قطب مینار منہدم ہو گیا. خود بخود وہ اپنے مطالبات سے دستبردار ہو گئی.

"میں آپ کے بغیر نہیں جی سکتی. مجھے کچھ نہیں چاہیئے!"

اور پہلی بار اور آخری بار اُسے محسوس ہوا یہی ساتھ سچا تھا. اٹل اور ابدی. پھر اس نے اُن کے ہاتھ سے کروڑوں کی مالیت کے کاغذات چھین لئے اور اُن کے پرزے پرزے کر ڈالے!!!

ہم اپنے ملک کی حفاظت کیلئے مرمٹیں گے

(الطاف گوہر)

حکیم محمد یوسف حسن صاحب ایڈیٹر "نیرنگ خیال" کی صدارت میں راولپنڈی کے ادیبوں اور شاعروں کا اجتماع ۱۳ ستمبر کو پاکستان کاؤنسل ہال میں ہوا۔ وزارتِ اطلاعات و نشریات کے سکریٹری جناب الطاف گوہر نے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"آج ساری قوم چٹان کی طرح متحد ہوگئی ہے۔ لوگوں کے دلوں میں ملک و قوم کے لئے مرمٹنے کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، مگر ادیب اور مصنف حضرات اس جذبہ کو اور اجاگر کرسکتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ جس روز بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تھا۔ اس روز میں مشرقی پاکستان میں تھا۔ وہاں مجھے یوں محسوس ہورہا تھا کہ ہر فرد ملک کے لئے قربان ہوجانے کو تیار ہے۔ وہاں کے مصنفین دل و جان سے چاہتے تھے کہ انہیں بھی لاہور کے سرفروشوں کی طرح وطن عزیز کے لئے جان قربان کرنے کا موقع ملے۔ مسٹر الطاف گوہر نے اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل اوتھان کی جنگ بندی کے سلسلے میں کوششوں پر کڑی نکتہ چینی کی اور کہا کہ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کی حیثیت سے ان کا یہ فرض تھا کہ کشمیری عوام کو حق خود ارادیت دلانے اور آزاد کرانے میں اقوام متحدہ کی بتائی ہوئی راہوں پر چلتے۔ جن پر دونوں ملکوں کا اتفاق تھا۔ مگر وہ جنگ بندی لائن کے ٹھیکیدار بن کر ہمارے ملک میں آئے ہیں اور اب ہمیں سمجھا رہے ہیں کہ دنگا فساد نہ کرو۔ اور اس لکیر کو نہ مٹاؤ۔ آپ نے کہا کہ جب بھارت نے جنگ بندی لائن کو توڑ کر کرگل، ٹیٹوال اور حاجی پیر پر قبضہ کیا تھا تو اس وقت اس لکیر کے ٹھیکیدار کہاں تھے؟ پاکستان نے آزاد کشمیر کی فوجوں کی مدد کرتے ہوئے جونہی چھمب سیکٹر علاقہ میں پیش قدمی کی تو یہ ناصح بن کر آگئے۔ مسٹر الطاف گوہر نے مزید کہا کہ لاہور پر حملہ کے بعد غیر ملکی اخباری نمائندوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ اگر پاکستان جنگ ہار گیا تو کیا ہوگا۔ میرا ان کو یہی جواب تھا کہ اگر خدانخواستہ ہم جنگ ہار گئے تو ہم زندہ نہیں ہوں گے۔ ہم ملک کی حفاظت کے لئے مرمٹیں گے۔ اور اگر ہم بھی نہ رہے تو ہماری نسلیں یہ ذمہ داری اٹھائیں گی۔"


ریحانی
خوشرنگ و خوش ذائقہ اور عام
مشروب ہے
بیحد مفرح اور نشاط انگیز ہے



تجربہ شاہد ہے

آپ کے دانت اور مسوڑھے آبگینوں
کی طرح نازک ہوتے ہیں۔ ذرا سی
لاپروائی اُن میں کیڑا لگنے اور پائریا
جیسی بیماریوں میں مبتلا ہوجانے کا
سبب بن سکتی ہے۔ اِس حقیقت سے
کبھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ دانت
کی معمولی صفائی اور خالی خولی چمک
اُن کو گلنے سڑنے سے نہیں بچا سکتی۔ اس کا تو
ایک ہی علاج ہے' وہ یہ کہ مسوڑھوں کو برابر طاقتور اور
صحت مند رکھا جائے اور مُنہ میں پرورش پانے والے ان زہریلے
عناصر کا قلع قمع کیا جائے جو دانتوں کے جوہر کے لئے سمِ قاتل ہیں۔ اس غرض
کے لئے ہمدرد منجن استعمال کیجئے جسے ہمدرد دواخانے نے سالہا سال کے تجربوں
کے بعد مکمل کیا ہے۔ یہ دانتوں کی مضبوطی اور مسوڑھوں کی صحت کے لئے اکسیر ہے۔
ہمدرد منجن دانتوں کو قدرتی طور پر چمکاتا ہے اور اُن تیزابی مادّوں کو ختم کردیتا ہے جن سے
زہریلے جراثیم مُنہ میں پرورش پاتے ہیں۔



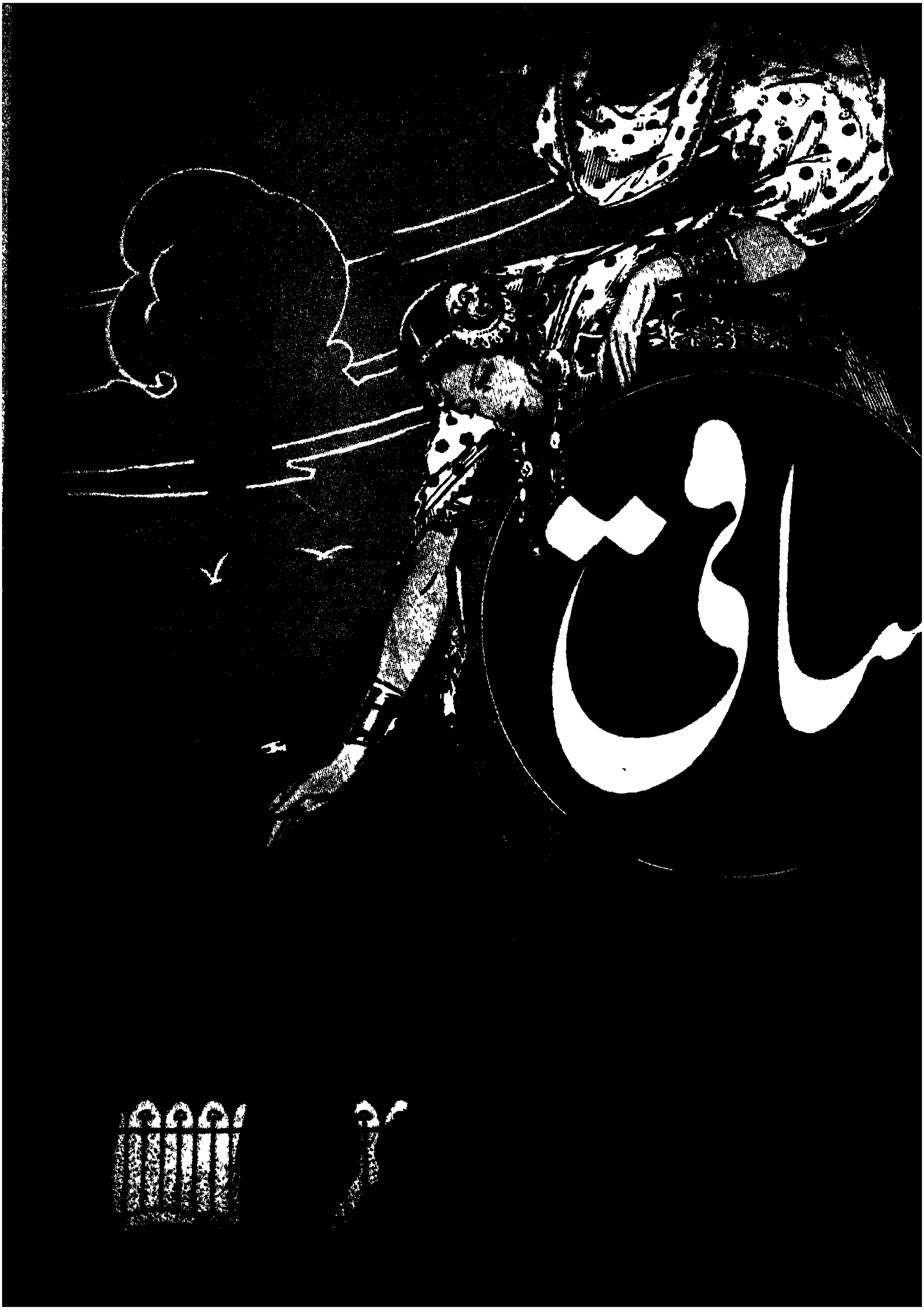
ہمدرد منجن

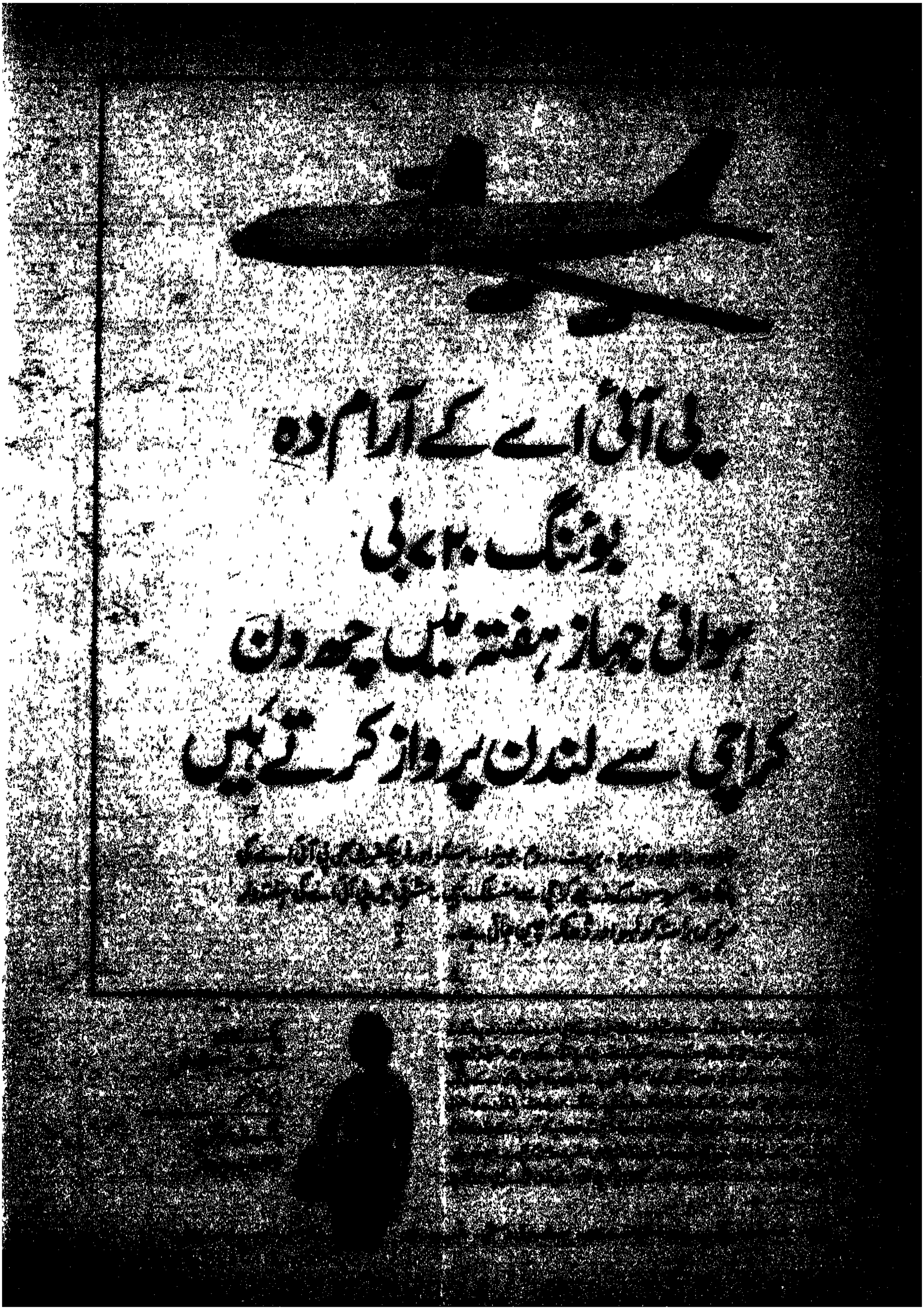
مسکراہٹ میں کشش اور دانتوں میں سچے موتیوں کی چمک پیدا کرتا ہے

ہمدرد

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان

کراچی۔ لاہور۔ ڈھاکہ۔ چٹاگانگ


ساقی


پی آئی اے کے آرام دہ
بوئنگ ۲۰ بی
ہوائی جہاز ہفتہ میں چھ دن
کراچی سے لندن پرواز کرتے ہیں

مدیر | بسم اللہ الرحمن الرحیم | سالانہ چندہ

(رکن انجمن ادبی رسائل پاکستان)

شاہد احمد دہلوی

معاون

عاصمہ بیگم

جُرعات

مع خاص نمبر

پاک و ہند چھ روپے

قیمت فی پرچہ ۵۰ پیسے

جلد ۷۲ | ساقی، کراچی. بابت دسمبر ۱۹۶۵ء | نمبر ۶

ناشر عاصمہ بیگم نے ضیاء ہمدمی پریس میں چھپوا کر پی، آئی، بی کالونی (۵) سے شائع کیا

شاہد احمد دہلوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

ہنگامی حالات میں ادیب کا حصّہ

ہنگامی ادب ہنگامی حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ ہنگامی حالات خصوصیت کے ساتھ اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ملک کی سالمیت اور اقتدارِ اعلیٰ خطرہ میں پڑ گئے ہوں۔ ادیب چونکہ اپنے معاشرہ، اپنی قوم اور اپنے ملک کیلئے لکھتا ہے اس لئے ہنگامی حالات میں اس کا بنیادی کام یہ ہو جاتا ہے کہ وہ ملک کی سالمیت اور اقتدارِ اعلیٰ کی بقا کے لئے جدوجہد کرے اور اپنے قلم سے وہ کام لے جو اس مقصد کو آگے بڑھائے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ادیب اپنے معاشرہ کیلئے لکھتا ہے تو اس سے مُراد یہ ہوتی ہے کہ بنیادی طور پر انسانیت کا وسیع تصور بھی اس کے اپنے معاشرے کے توسط سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ وہ ادیب جس کا اپنی قوم، اپنے معاشرے سے رشتہ ناتا باقی نہ رہے وہ کوئی ایسا ادب پیدا نہیں کر سکتا جسے ہم وسیع معنی میں آفاقی ادب کہہ سکیں۔ وہ رجل ہو یا ہومر، شیکسپیئر ہو یا سعدی، غالب ہو یا اقبال، یہ سب اسی لئے بڑے آفاقی اور ہر دور کے ادیب ہیں کہ انہوں نے اپنا رشتہ اپنے معاشرہ سے گہرا اور مستحکم بنیادوں پر قائم رکھا ہے اور سارے عالمِ انسانیت، ان کے احساس، جذبہ، طرزِ فکر و عمل کو اپنے معاشرے کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ایسا ادیب جو ہوا میں گرہ لگاتا ہے جو اپنے عوام، اپنے معاشرے کے فکر و احساس سے منقطع ہو کر ادب تخلیق کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی گیلی لکڑیوں سے آگ جلانے کی کوشش کرے۔ بنیادی چیز قوم، معاشرہ، عوام اور اس زبان کے بولنے والے ہیں جس میں وہ ادیب اپنے خیال، احساس و جذبہ کا اظہار کرتا ہے۔ ایک ایسے دور میں جب ملک کی سالمیت خطرے میں ہو، ادیب کا کام صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ عام معاشرے کی خواہشات میں خود شریک ہو جائے اور ملک کی بقا و سالمیت کے لئے ایسی تخلیقات پیش کرے جن سے ملک کو براہِ راست فائدہ پہونچے، دشمن کے خلاف اپنے قلم کو تلوار بنائے، فوجوں کا حوصلہ بڑھائے، عوام کے دلوں میں زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے عزائم کو بلند رکھے۔ جو چیز دل سے نکلے گی وہ دل پر اثر کرے گی۔ اگر ادیب کے اندر یہ جذبہ سچا اور زندہ ہے اور اس کا دل ملک کی سالمیت کو برقرار رکھنے کیلئے مضطرب ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی ہنگامی تحریروں میں بیان کا جادو، جذبہ کا جوش، احساس کی شدت وہ قوت پیدا نہ کر دے کہ ہنگامی حالات کے بادل چھٹنے کے بعد بھی اس کی تحریر دلچسپی سے پڑھی جا سکے۔ ہنگامی حالات اس معنی میں تخلیق کے لئے بھی سازگار ماحول پیدا کرتے ہیں۔ یہاں بھی ایک ادیب کا قلم صحافی کے قلم سے مختلف ہوگا۔ اس میں ادبیت بھی باقی رہے گی اور زندہ تحریر کی جادو بیانی بھی۔

ایک ایسے دور میں ادیب کی خاموشی سب سے بڑا اخلاقی جُرم ہے۔ کوئی ادیب صرف اس بنا پر کہ جنگ بُری چیز ہے، کبھی بھی اپنے ملک کو دشمن کے حوالے کر دینے کی حمایت نہیں کر سکتا۔ ملک اور معاشرہ اس کی تہذیب کا مسکن، اس کی ثقافت کے عملی مظہر ہیں۔ خود اس کی تخلیقی زندگی بھی اس کے اپنے ملک کی بقا و سالمیت سے وابستہ ہے۔ اس لئے ملک و قوم کی بقا ایک ادیب کے لئے بھی اتنی ہی اہم ہو جاتی ہے جتنی خود اس کی اپنی زندگی اور اس کی اپنی تہذیب۔ ہم ملک، قوم اور ادیب کو الگ الگ نہیں کر سکتے، یہ سب مل کر ایک اکائی بناتے ہیں، اور یہ اکائی اپنے سب اعضا کی نشو و نما کرتی ہے اور اس کے سب اعضا، الگ الگ اور مل کر اس اکائی کی سالمیت کو برقرار رکھتے ہیں۔ عام حالات میں یہ سب اعضا اپنے اپنے طور پر کام کرتے رہتے ہیں، لیکن ہنگامی حالات میں ہر عضو دوہرا کام کرتا ہے۔ ادیب اپنا تخلیقی عمل بھی جاری رکھتا ہے اور ملک و قوم کی سالمیت کو باقی رکھنے کی جدوجہد میں بھی پیش پیش ہوتا ہے۔ اس جدوجہد کام میں ممکن ہے کہ کچھ ادب کا رنگ بحیثیت ادب کے پھیکا پڑ جائے، لیکن حُب الوطنی کا شدید جذبہ، قوم و ملک کی سالمیت کا گہرا احساس اس کی تحریروں میں ایک ایسی چمک ضرور پیدا کر دے۔ ہے کہ ادب کا پھیکا پن نظروں سے محو ہو جاتا ہے، اور ادیب کی آواز قوم کی آواز بن کر جو عوام میں پیدا کر دیتی ہے اور عام آدمی کو قوم کی آزادی خود اپنی زندگی سے بھی عزیز ہو جاتی ہے۔ قومیں ادیب کی آواز سے زندہ رہتی ہیں۔ ہنگامی حالات میں ادیب کا یہی کام ہے کہ وہ خود احساس و فکر کی سطح پر زندہ رہے اور ساری قوم کو اس میں شریک کر کے ملک کی بقا و سالمیت کے جذبہ کو زندہ رکھے۔

حکیم احمد شجاع ساحر
(ستارۂ امتیاز)

جہاد

معرکۂ تبوک کا ایک واقعہ

کعب ابن مالک کی سرگزشت سے ماخوذ
(جس کی طرف سورۃ التوبہ کی ۱۱۸ویں آیت میں اشارہ ہے)

وہ راہِ مہر و وفا کا سالک وہ شیر دل کعب ابن مالک
عرب کا وہ جنگجو مجاہد، خدا کا وہ سربکف سپاہی
وہ جس کی آنکھوں میں نورِ عرفاں وہ جس کے دل میں سرورِ ایماں
وہ جس کے ہاتھوں میں خطِ ماہی وہ جس کے پاؤں میں چترِ شاہی

وہ جس کی شمشیرِ خوں فشاں نے اُحُد میں دشمن سے داد پائی
وہ جس کی ہمت کا کارنامہ ہے غزوۂ بدر کی کہانی
وہ دشمنانِ خدا کا دشمن وہ حامیانِ نبیؐ کا حامی
وہ جس کی تقدیر میں لکھی تھی حریمِ کعبہ کی پاسبانی

وفورِ دولت سے اُس کے ایماں پہ لیکن ایسا زوال آیا
خدا کو اس نے بھلا دیا اور اپنی ملت کا ساتھ چھوڑا
مدینے سے دور جا کے اس نے زمیں خریدی مکاں بنائے
شرورِ باطل کا ہاتھ پکڑا رسولِ برحق کا ہاتھ چھوڑا

تھے وقف لہو و لعب کے بیکار مشغلوں کے لئے سراسر
وہ روز و شب جو گزر رہے تھے خدا کے بندوں کی صحبتوں میں
خدا کو چھوڑا تو اس نے بھی کعب ابن مالک کا ساتھ چھوڑا
نہ اب مزا تھا عبادتوں میں نہ لطف کوئی ریاضتوں میں

اِدھر خدا کے وہ نیک بندے تجاہلِ کفر سے پریشاں
اُدھر یہ حرص و ہوا کا بندہ قتیلِ ابرو شہیدِ گیسو
اِدھر جنودِ خدا کے دل میں تبوک کے معرکے کی ہلچل
اُدھر یہ عشرت کدے میں اپنے خرام انداز چہرہ آہو

غرض مدینے کی وادیوں میں صدائے تکبیر گونج اٹھی
حجاز کے جاں فروش غازی قطار اندر قطار آئے
اِدھر یہ درماندۂ تغافل اسی تردّد کی کشمکش میں
کنارہ کش ہو جہاد سے یا رسولؐ کے ہمرکاب جائے

عدو جو اس کی نگاہ میں مثلِ کاہ کم وزن و بے گہر تھے
مثالِ کوہِ گراں نظر آرہے تھے اب تنگیِ نظر سے
وہ دل جو آغوشِ عشقِ ملت میں پل کے شیروں سے کھیلتا تھا
وہ مہدِ عشرت میں سو کے ڈرنے لگا پرندوں کے بال و پر سے

زوالِ ایماں نے لوٹ لی وہ متاعِ کمیاب و بیش قیمت
فروغِ افراد اور ملت کی گرم بازاریاں ہیں جس سے
ہوا و حرص و ہوس نے وہ گھن لگا دیا اس کی قوتوں کو
عمل کی دنیا میں ملتوں کی تمام بیماریاں ہیں جس سے

وہ ضیغمِ بیشۂ عمل زاویہ گزیں ہو کے بیٹھ جائے
یہ عیش و عشرت کی برکتیں تھیں یہ مال و زر کی کرامتیں تھیں
حدودِ محدودِ ذات ہی کو حصارِ امن و اماں وہ سمجھا
نہ جانتا تھا کہ اس میں پوشیدہ کیسی کیسی قباحتیں تھیں

ابھی اسی سوچ میں پڑا تھا کہ ناگہاں اک نقیب لایا
تبوک کے معرکے میں شرکت کی بارگاہِ نبیؐ سے دعوت
اِدھر ہوس اور خود پرستی اُدھر خطر میں وقارِ ہستی
خودی کچھ ایسی سمائی سر میں کہ بھول بیٹھا مفادِ ملت

لکھا کہ خادم ہزار جاں سے نثار آقائے دو جہاں ہے
حضور پر ہے یہ خوب روشن کہ جان کا مجھ کو غم نہیں ہے
مکاں بہت سے ہیں زیرِ تعمیر کھیتیاں قابلِ درو ہیں
یہ چند مجبوریاں ہیں ایسی کہ پائے ہمت میں دم نہیں ہے

یہ مخمصے میں ذرا مٹا لوں یہ دغدغے دل سے میں ہٹا لوں
تو آؤں گا چل کے سر کے بل خود ہی عتبۂ خاتمُ الرسل پر
نہ جانتا تھا کہ اس کو جُل دے رہا ہے ان حیلہ کاریوں سے
کہ علم جس کا محیط ہے کائناتِ عالم کے جزو و کل پر

حضور کی بارگاہ میں جب یہ پاسخ ناصواب پہنچا
کہا کہ "اللہ کے حوالے امورِ ملت کی عاقبت کے
معاملہ کعب ابن مالک کا میں نے اپنے خدا پر چھوڑا
کہ وہ سمیع و بصیر ہی جانتا ہے راز اپنی مصلحت کے"

غرض اسی طرح آج کل میں نکل گئے دن محاربے کے
خبر اُڑی آرہے ہیں حضرت جہاد میں کامیاب ہو کر
مدینے سے ایک شور اٹھا کہ "دیکھو وہ چمک رہے ہیں
خدا کے انوار خاکِ یثرب کے ذرّوں میں بے حجاب ہو کر"

یہ سُن کے اس طرح کعب کے دل میں زندگی کا شرار چمکا
کہ جس طرح کوئی اخترِ خفتہ تو ظلمت میں جاگ اٹھے
ہوئی درخشاں پھر اس کے سینے میں اس طرح نور کی تجلّی
کہ جیسے کوئی اسیرِ کابوس دورِ غفلت میں جاگ اٹھے

شفیعِ خیر الامم کے قدموں پہ آگرا کعب ابن مالک
کسک سے دردِ فراق کی لب پہ آہ آنکھوں میں اشک غلطاں
کہا کہ "ملت کے روبرو پیش ہے یہ بھاگا ہوا سپاہی
ہجومِ حسرت سے خاک برسر و فرطِ خجلت سے چاک داماں"

ہوا یہ ارشاد کعب تیرا معاملہ ہے خدا کے بس میں
کہ اس کی ملّت کو تو نے اپنے مقابلے میں حقیر جانا
تجھے نہیں واسطہ جو ہم سے تو ہم کو بھی تجھ سے واسطہ کیا
مفادِ ملت کے دشمنوں کا نہ یاں ٹھکانا نہ واں ٹھکانا"

غرض وہ دَر دَر کی ٹھوکریں کھا کے بارگاہ نبیؐ پہ آیا
کہا پشیمان ہوں سرکشی پر بہت پریشان ہوں بیکسی سے
جو ٹوٹنا ہے عذاب ٹوٹے مگر نہ ملّت کا ساتھ چھوٹے
کہ میں بہت تنگ آگیا ہوں حضور اب ایسی زندگی سے"

زبانِ پیغمبرِ خدا سے یہ فیصلہ سُن کے کانپ اٹھا !
وہ کعب جس کو گھمنڈ تھا اپنے مال و زر منصب و حشم پر
وہ راندۂ بارگاہِ ملت، جہانِ اسلام کا وہ مجرم
خدا کے گھر سے نکل کے بھاگا تو ٹھوکریں تھیں قدم قدم پر

نگاہ اُس کی طرف سے حضرتؐ نے پھیر لی اور کہا "یہاں بھی
دعائیں جاری ہیں اور حکم خدا کا ہے انتظار ہم کو
کسے یہ طاقت کہ اُس کو بخشے جسے خدا بخشنا نہ چاہے
کہ اس کے مجرم کو بخشنے کا نہیں کوئی اختیار ہم کو"

نہ کوئی اس کا سلام مانے نہ کوئی اس کی زبان جانے
نہ کوئی اس کو کرے مخاطب نہ کوئی ہو ہمکلام اس سے
وہ گھر میں ناخواندہ مہمان تھا وہ دوستوں کو وبالِ جاں تھا
نہ اس کی بیوی کو اس سے مطلب نہ اس کے بچّوں کو کام اس سے

یہ سُن کے خاموش ہو گیا اس طرح وہ سرگشتۂ تباہی
کہ جس طرح سازِ سے جدا ہو کے تارِ شکستہ بےصدا ہو
وہ اپنی ملت سے ٹوٹ کر اس طرح ہوا بےنشاں جہاں میں
کہ جیسے کوئی شہابِ ثاقب نگاہِ انجم سے گر گیا ہو

وہی زمین اور آسمان تھے وہی مکیں تھے وہی مکاں تھے
مگر کچھ ایسا سیاہ و خاموش ہو گیا تھا جہان اس کا
جسے بھی دیکھے جنم کا بیری جہاں بھی جائے وہیں پرائے
زمین کا ذرّہ ذرّہ دشمن عدوئے جان آسمان اس کا

سُن اے گرفتارِ خود پرستی بتاؤں میں تجھ کو رازِ ہستی
قرارِ ملت سے ہے جہاں میں وقارِ ملت کے مرد و زن کا
نہ کی وفا قوم سے جو تو نے تو ہوگا تو بھی ذلیل ایسا
گرا ہوا پھول جس طرح سے غبارِ خاطر ہوا چمن کا

ملا واحدی

مرزا محمد سعید دہلوی

کوچۂ چیلان، دلّی کا وہ عظیم الشان مکان ابھی بہتوں کو یاد ہوگا۔ جس میں دلّی کے دار السلطنت بنتے ہی مولانا محمد علی جوہر آبسے تھے اور رامپوری کی بجائے دلّی والے ہوگئے تھے۔ انگریزی کا ہفت نامہ کامریڈ کلکتے سے ساتھ لائے تھے۔ یہاں روزنامہ ہمدرد اور نکالا۔ اور اس مکان میں اتنی کشش پیدا کردی کہ صبح سے شام تک ہندو مسلمان لیڈروں کا تانتا بندھا رہتا تھا اور ہندو مسلم عوام کا میلہ لگا رہتا تھا۔ یہ وہ مکان ہے جہاں جواہر لال نہرو مولانا محمد علی جوہر کے سکریٹری کی حیثیت سے آتے تھے، اور جہاں گاندھی جی نے اپنا سب سے طویل اور تاریخی اکیس روزہ برت رکھا تھا۔ اس مکان سے مجھے دلی تعلق ہے۔ یہ میرے بچپن میں میرے سامنے تعمیر ہوا تھا۔ حاجی عبدالغفار مالک فرم حاجی علی جان نے تارکشی کے کارخانے کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ کارخانہ نہیں چلا تو مدتوں ویران پڑا رہا۔ اس مکان کی یہ خصوصیت ہے کہ آباد ہوتا ہے تو میلے لگتے ہیں اور خالی ہوتا ہے تو سائیں سائیں کرتا ہے۔ وحشت برستی ہے۔ دوسرے یا تیسرے کرایہ دار شیخ عبدالقادر، ایڈیٹر مخزن تھے، جو بعد میں سر عبدالقادر کہلائے۔ ہائی کورٹ کے جج اور خدا جانے کیا کیا رہے۔ مکان شیخ محمد اکرام کے قبضے میں تھا۔ وہ رسالہ مخزن کے جوائنٹ ایڈیٹر تھے۔ دفتر مخزن اسی مکان میں تھا۔ شیخ عبدالقادر نے نئی نئی بیرسٹری شروع کی تھی۔ ان کا قیام کشمیری دروازے، کچہری کے قریب تھا۔ لیکن شام کے وقت دفتر مخزن ضرور پہنچتے تھے اور رات گئے تک ٹھہرتے تھے۔ ان کے گرد ادیبوں اور شاعروں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ منشی ذکاء اللہ اور ڈپٹی نذیر احمد اور میر ناصر علی، مدیر صلائے عام کے سوا دلّی کے سب بوڑھے اور جوان ادیب اور شاعر روزانہ شیخ عبدالقادر کے ساتھ شام گزارتے تھے۔ مجھے اور آصف علی اور ضیاء الدین برنی کو بھی ہم محلّہ ہونے کے سبب حاضری کی اجازت تھی۔ ایک صاحب کبھی کبھی دکھائی دیتے تھے، جن کی عمر تو مجھ سے اور آصف علی سے دو تین برس ہی زیادہ ہوگی۔ لیکن انہیں شیخ عبدالقادر کی مجلس میں برابری کا درجہ حاصل تھا۔ آصف علی ایف اے (فرسٹ ایر) کے طالب علم تھے۔ اور میں انٹرنس کے کاوے کاٹ رہا تھا۔ ان صاحب کی بابت سُنا کہ ایم اے کرچکے ہیں اور ایم اے او کالج، علی گڑھ میں پروفیسر یا لکچرار ہیں۔ ایک ناول "خواب ہستی" کے مصنف ہیں اور مخزن جیسے بلند پایہ رسالے کے مضمون نگار۔ نام ہے مرزا محمد سعید۔ سر سید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں کی نواسی کے بیٹے ہیں اور سید محمد علی اسیشن جج کے بھانجے۔ میرے دل پر مرزا صاحب کا اتنا رعب بیٹھا کہ میری اور مرزا صاحب کی خوب نبھی۔

مرزا صاحب بے حد سادہ، منکسر اور شرمیلی طبیعت کے انسان تھے۔ انسانیت اور شرافت کا مجسمہ۔ اکڑفوں نہیں جانتے تھے، مگر علمی گفتگو میں کوئی ڈوڈن کی لیتا تھا تو پھر تکلف برطرف کرکے فوراً اُس کی غلطی بتاتے تھے۔ اور وہ غلطی تسلیم نہ کرتا تھا تو انہیں احساس ہوتا تھا کہ جہل مرکب اور نادان ہے۔ ایسے شخص سے بگڑ جاتے تھے۔ میں اپنی کم علمی اور کم دانشی سے واقف ہوں۔ اُن کے ہر ملنے والے کو اُن سے صرف اس نوع کی خفگی کی شکایت تھی۔ لیکن الحمد للہ میں نے مرزا صاحب کو کبھی خفا نہیں کیا۔

مرزا صاحب کی ملازمت کے زمانے میں میرا مرزا صاحب سے ملنا جلنا بالکل سرسری رہا۔ مرزا صاحب نے انیس سال کی عمر میں ایم۔ اے پاس کیا تھا اور پاس ہوتے ہی ایم۔ اے۔ او کالج میں پروفیسر مقرر کر دیئے گئے تھے۔ وہاں سے گورنمنٹ کالج، لاہور پہنچے اور انگریزی ادب سکھانے پر مامور کئے گئے۔ کئی برس گورنمنٹ آف انڈیا کے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں بحیثیت انڈر سکریٹری کام کیا۔ آخر میں رہتک کالج کے پرنسپل تھے کہ یکایک کیمبل پور کالج کا تبادلہ ہو گیا۔ اس تبادلے کو مرزا صاحب نے نہیں مانا اور قبل از وقت پنشن لے لی۔ یہ غالباً ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۳ء کا واقعہ ہے۔

مرزا صاحب کے نانا میر محمد بر علی میری پہلی بیوی کے تایا تھے۔ مگر میری پہلی بیوی اور میرے پہلے خسر میر محمد سید حسین، دونوں کے انتقال کو عرصہ ہو چکا تھا۔ اس رشتے کی وجہ سے نہیں، پنشن لینے کے بعد ویسے ہی مرزا صاحب نے مجھے نوازا۔ میرا اور مرزا صاحب کا مکان قریب قریب تھا۔ میرے اور مرزا صاحب کے مکانوں کے درمیان اسی سڑک پر مسٹر آصف علی رہتے تھے۔ دن میں مرزا صاحب کی آمد و رفت میرے ہاں ہوتی تھی اور رات کو مرزا صاحب آصف صاحب کے ہاں تشریف لے جاتے تھے۔ بس یہی دو گھر تھے جن سے پنشن لینے کے بعد مرزا صاحب کا غیر معمولی تعلق رہا۔ مرزا صاحب کی تین بیٹیوں کے نکاح آصف صاحب کے مکان میں ہوئے، آصف صاحب کے مکان میں یا باہر کی بیٹھک میں میرے ہمراہ مرزا صاحب بلاناغہ شام کی ہوا خوری کرنے بھی جاتے تھے۔ ہماری ہوا خوری کے تیسرے مستقل ساتھی مسٹر رضا اللہ (انجینیئر) ابن شمس العلماء خان بہادر منشی ذکاء اللہ تھے۔ مسٹر آصف علی کے ہاں کی مجلس میں مرزا صاحب کے علاوہ سید احمد شاہ بخاری (پطرس) ڈائرکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ احمد شاہ بخاری مرزا صاحب کے شاگرد بھی تھے اور دوست بھی۔ یہ مجلس کبھی کبھی آصف صاحب کی بجائے بخاری صاحب کے ہاں بھی جمتی تھی۔

بخاری صاحب مرزا صاحب سے عمر میں خاصے چھوٹے تھے۔ میں نے مرزا صاحب کے شاگرد مرزا صاحب سے بڑی عمر کے بھی دیکھے ہیں۔ شام کی ہوا خوری میں کئی ہندو بوڑھے ملا کرتے تھے، جو مرزا صاحب کو جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ میں پوچھتا تھا تو مرزا صاحب بتاتے تھے کہ انہوں نے لاہور میں مجھ سے پڑھا تھا۔ جج تھے یا مجسٹریٹ تھے۔ اب پنشن پاتے ہیں۔ علی گڑھ کے دور پروفیسری میں حسین شہید (وزیر اعظم پاکستان) کے برادر کلاں حسن شہید سہروردی مرزا صاحب کے شاگرد رہے تھے، وہ مرزا صاحب سے زیادہ عمر کے تھے۔ حسن شہید سہروردی اور احمد شاہ بخاری جیسے نہ معلوم کتنے بڑے آدمی مرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ بین الاقوامی عدالت کے جج چودھری سر ظفر اللہ خاں مرزا صاحب کے شاگرد ہیں۔

خیر ذکر مرزا صاحب، بخاری صاحب اور آصف صاحب کے تعلقات کا تھا۔ بخاری صاحب تو باوجود علم و فضل اور ذہانت و طباعی کے مرزا صاحب کا استاد ہونا نہیں بھولتے تھے، مگر آصف علی صاحب مرزا صاحب سے اکثر الجھ جاتے تھے، اور پھر مرزا صاحب آصف صاحب کے علم و فضل اور ذہانت و طباعی اور جملہ عظمتوں کو بھلا دیتے تھے۔ بخاری صاحب اور آصف صاحب یقیناً اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے لیکن جائے استاد خالی است۔ بخاری صاحب اور آصف صاحب کو دنیا کے اور دھندے بھی تو نمٹانے ہوتے تھے، مرزا صاحب کا شغل صرف مطالعۂ کتب تھا۔ کتاب کے مرزا صاحب کیڑے تھے، پڑھنے سے اس قدر دلچسپی تھی کہ لکھنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ میں نے ایک دفعہ کہا، مرزا صاحب! آپ کا پڑھنا لکھنا یہیں رہ جائے گا، کچھ یادگار بھی چھوڑیئے۔ فرمایا، میں فطرتاً نقاد ہوں۔ دوسروں کی تحریروں کا تجزیہ کرتے کرتے اپنی تحریروں کا تجزیہ کرنے لگتا ہوں، اسے پرکھتا ہوں، پرکھنے میں میری تحریر میرے معیار پر نہیں اترتی۔ لہٰذا پھاڑ کر پھینک دیتا ہوں۔ باایں ہمہ مرزا صاحب نے چند کتابیں تصنیف کی تھیں۔ مگر کتابیں اوروں کے نام سے شائع کر دیا۔ شہرت کے بھوکے نہیں تھے۔ ... (قادیان) ابتدائے عمر کی تصانیف ہیں۔

مرزا صاحب کی معلومات کا حد و حساب نہیں تھا، ہر مضمون پر وہ اِس وثوق سے بولتے تھے، گویا اُسی مضمون کے ماہر ہیں، دوسرا مضمون نہیں جانتے۔

مطالعہ کتب کے بعد ہلکی سی دلچسپی سیاست سے لیتے تھے۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح کے دور کی مسلم لیگ کا کوئی عہدہ بھی قبول کر لیا تھا، لیکن اُس عہدے سے جلد استعفیٰ دیدیا، سیاست کے جوڑ توڑ سے گھبراتے تھے۔ بس اصول کی حد تک سیاسی تھے۔ سنٹرل اسمبلی کی سیٹ کے لیے سر آصف علی اور شیخ محمد عثمان آزاد (مالک روزنامہ انجام) کا مقابلہ ہوا۔ آصف علی انڈین نیشنل کانگریس کے ٹکٹ پر امیدوار تھے اور عثمان آزاد مسلم لیگ کے ٹکٹ پر۔ مرزا صاحب نے آصف صاحب کی دوستی کو بالائے طاق رکھا اور عثمان آزاد کو ووٹ دیا۔

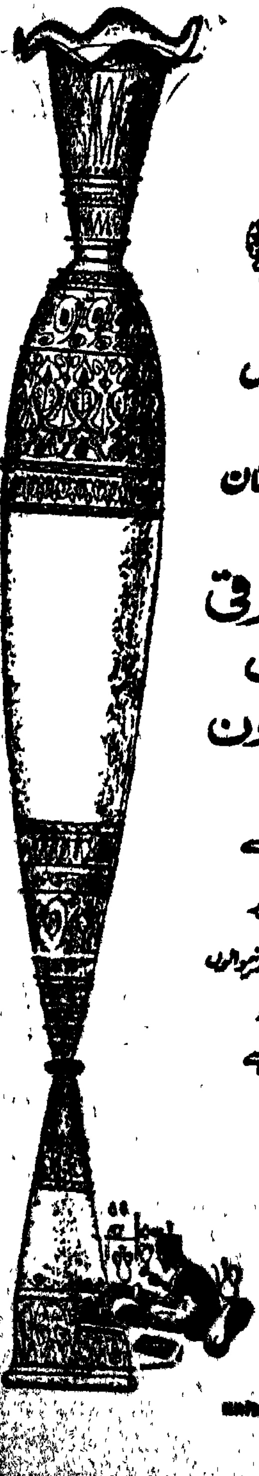
مرزا صاحب اپنے خیالات میں نہایت پختہ اور کھرے تھے۔ اُن کے خیالات اوپری اور سطحی اور دودھ کا اُبال نہیں ہوتے تھے۔ مرزا صاحب کا سارا خاندان سُنّی تھا۔ دور دور تک کہیں شیعہ کا پتہ نہیں تھا۔ اتفاق سے دماغ میں یہ بات سما گئی کہ شیعہ مشرب سچا ہے۔ مرزا صاحب نے شیعہ مشرب اختیار کر لیا۔ مگر نماز اگر مسجد میں پڑھتے تھے تو سُنّی اور شیعہ کی تفریق نہیں برتتے تھے۔ بلکہ عموماً سُنّیوں ہی کی مساجد میں، اور سُنّیوں ہی کی طرح ہاتھ باندھ کر پڑھتے تھے۔ عقائد کے اعتبار سے شیعہ تھے، عمل کے اعتبار سے سُنّی۔ اُن کے اِس طرز نے دلّی کے مسلمانوں کو نقصان بھی پہنچایا۔ دلّی میں مسلمانوں کا فقط ایک ڈگری کالج تھا، اینگلو عربک کالج۔ اُس کی مجلس منتظمہ میں شیعہ بھی تھے اور سُنّی بھی۔ سُنّی مرزا صاحب کو شیعہ کہتے رہے اور شیعہ مرزا صاحب کو سُنّی کہتے رہے۔ اور کسی نے انہیں سُنّی یا شیعہ سیٹ نہیں دی، اور اینگلو عربک کالج، دلّی مرزا صاحب کے قیمتی مشوروں سے محروم ہی رہا۔ مرزا صاحب معمولی ماہرِ تعلیم نہیں تھے۔ آئی۔ ای۔ ایس تھے۔

میرے بھانجے، سید احمد حسین کا رشتہ مرزا صاحب کی بڑی لڑکی کے لئے گیا۔ میرے بہنوئی خان صاحب سید احمد سے بھی مرزا صاحب کی قرابت داری تھی۔ مگر انہیں مرزا صاحب کی شیعیت کا علم نہیں تھا۔ علم ہوا تو میرے پاس آئے۔ مرزا صاحب شیعیت کو نہ چھپاتے تھے۔ اور نہ ڈھنڈورا پیٹتے پھرتے تھے کہ میں شیعہ ہو گیا ہوں۔ میں نے سید احمد صاحب سے کہا کہ میری بجائے مرزا صاحب سے دریافت کیجئے۔ وہ جواب دینے میں ہچکچائیں گے نہیں۔ چنانچہ سید احمد گئے اور مرزا صاحب نے صاف صاف بتا دیا۔ سید احمد صاحب نے پوچھا، صاحبزادی شیعہ ہیں یا سُنّی۔ فرمایا، اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ میں نے گھر والوں کو شیعہ ہونے پر مجبور نہیں کیا ہے۔ مرزا صاحب کی اِن صاحبزادی کا رشتہ احمد حسین سے تو ٹوٹ گیا، مگر بیاہی گئیں وہ ایک سُنّی ہی سے یعنی مرزا مسعود بیگ سے جو مرزا داؤد بیگ کے بیٹے ہیں۔ اور ہندوستان کی کسی ایمبیسی میں فرسٹ یا سکنڈ سکریٹری ہیں۔ باقی دو صاحبزادیوں کے شوہر شیعہ ہیں اور دونوں پاکستان میں ہیں۔ ایک مسٹر سبط حیدر، جوائنٹ سکریٹری حکومت پاکستان، اور دوسرے مسٹر طیب حسین مصر میں پاکستان کے سفیر۔

میں مرزا محمد سعید صاحب کی علمی قابلیت کو تول کر دکھا دینے کا اہل نہیں ہوں۔ وہ جانتے تقریباً سب علوم تھے، مغربی بھی اور مشرقی بھی، مگر انہیں کمال مغربی علوم میں حاصل تھا۔ اُن کے اس کمال کو وہی شخص بیان کر سکتا ہے جسے خود مغربی علوم میں درک ہو۔ مرزا صاحب اگرچہ دہلوی تھے لیکن اُن کی زندگی کا بیشتر حصہ پنجاب میں بسر ہوا تھا۔ پنجاب میں اب بھی اُن کے ایسے شاگرد ضرور مل جائیں گے جو اپنے اُستاد کی علمی شان کی تصویر کھینچ سکتے ہیں۔ دلّی میں تو مرزا صاحب نے ریٹائرمنٹ کے بعد زندگی گزاری تھی۔ میں بہت سے بہت یہ کہہ سکتا ہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ جب بھی مرزا صاحب کے ہاں گیا، انہیں کتابوں میں مستغرق پایا۔ یاد ہے دلّی میں ممتاز گورنمنٹ پنشنروں نے ایک انجمن قائم کر رکھی تھی، مرزا صاحب بھی اُس کے ممبر تھے۔ سب ممبر مرزا صاحب کا لوہا مانتے تھے۔

میں نے مرزا صاحب کو صرف بحیثیت انسان برتا۔ سو بحیثیت انسان وہ اعلیٰ خوبیوں اور بلند کردار کے انسان تھے۔ اُن کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ اُن کی نیت ہمیشہ بخیر رہی۔ مردم آزار و دل آزار ہرگز نہیں تھے۔ دوسروں کے کام آتے تھے اور دوسرا کوئی اُن کا کام کر دیتا تھا تو اُس کا احسان اُن کے دل پر نقش ہو جاتا تھا۔ شستگی اور شائستگی اُن پر ختم تھی۔ مشہور شاعر، اسد ملتانی نے اُن کا ایک فقرہ مجھے سنایا تھا۔ کہتے تھے کہ ہم شاگردوں میں سے کسی نے کلاس روم کا دروازہ زور سے بند کیا۔ مرزا صاحب نے فرمایا بیٹے پیارے بچّے، اشراف کے اعصاب کمزور ہوتے ہیں، یعنی دھڑ سے بند کرنے کو برداشت نہیں کرتے۔ وہ ملنے والوں سے جھک کے ملتے تھے، خود تکبر

(بقیہ صفحہ ۶۳ پر)




ریحانی
خوشرنگ وخوش ذائقہ اور عام طاقت بخش
مشروب ہے
بیحد مفرح اور نشاط انگیز ہے
دل کی دھڑکن وحشت اور گھبراہٹ کو دور کرتا ہے
قوت ہاضمہ کو حیرت انگیز طور پر بڑھاتا ہے بدن میں
خون صالح پیدا کرتا ہے۔ نقاہت زدہ مریضوں کمزور و
ناتوانوں کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے
ریحانی
خوشرنگ
و
خوش ذائقہ
مشروب
نظامی دواخانہ
کراچی
UNIVERSAL BLOCK
نظامی دواخانہ
فریئر روڈ کراچی پاکستان
فون
۵۲۷۳۸

ایم۔ اسلم

آہیں اور آنسو

ضلع سیالکوٹ کی سرحد پر ایک گاؤں تھا اس کا نام براہمنا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کسی زمانے میں یہاں برہمن آباد ہوں گے۔ گاؤں کے لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ گو سرحد قریب ہونے کی وجہ سے بھارتی فوج آئے دن کچھ گڑبڑ کرتی رہتی تھی۔ لیکن گاؤں والے ان باتوں کے عادی ہو چکے تھے۔ زندگی امن چین سے گزر رہی تھی۔ ستمبر کا مہینہ تھا۔ ستمبر کی سات کا دن رخصت ہو رہا تھا اور شام نیلے نیلے آسمان کی اداس اداس فضاؤں میں خاموشی اور سکون کا پیغام دینے چلی آ رہی تھی۔ کسان دن بھر کے کام کاج کے بعد اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ کوئی مویشی ہانکے لا رہا تھا۔ کوئی سر پر چارے کا گٹھا اٹھائے جا رہا تھا۔ کوئی چھکڑا ہانکتا چلا آ رہا تھا۔ کہیں بھیڑ بکریوں کا ریوڑ گرد و غبار کے بادل اڑاتا گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ کبھی کہیں دور سے مرغ کی مست اور درد میں ڈوبی ہوئی آواز بھی سنائی دینے لگی تھی۔ گاؤں میں اکثر مکانوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ جو آسمان کی گدلی گدلی فضاؤں میں چکر بنا تا پھیل رہا تھا۔ گھر والیوں نے چولہے گرم کر رکھے تھے۔ کسی نے ہنڈیا چڑھا رکھی تھی۔ کوئی آٹا گوندھ رہی تھی۔ کسی نے صحن میں گھر والے کے لئے چارپائی بچھا رکھی تھی۔ گاؤں کے لڑکے بالے چوک میں کبڈی کھیل رہے تھے۔ کوّے دن بھر کی کائیں کائیں کے بعد آبادی سے رخصت ہو چکے تھے۔ چڑیاں دن بھر کی چڑ چوں کے بعد اپنے گھونسلوں میں چھپ چلی تھیں۔ گھر والیوں نے مرغیوں کو ڈربوں میں بند کر دیا تھا۔ کہیں کہیں دو دو ایک مرغ اور مرغیاں کوٹھوں کی منڈیر پر بیٹھے بھی نظر آتے تھے۔ گائے بھینس کھرلیوں پر بندھی چارا کھا رہی تھیں۔ کبھی مالک کی طرف بھی دیکھ لیتیں کہ کب انہیں دوہا جائے گا۔ عشا کی نماز کے بعد جب نمازی مسجد سے باہر نکلے تو ایک زمیندار نے ایک بوڑھے آدمی سے جو لباس سے خوشحال آدمی معلوم ہوتا تھا پوچھا

"چوہدری محمد دین! تم شہر سے کب واپس آئے؟"

"عصر کی نماز اپنے گاؤں میں پڑھی تھی۔" محمد دین نے جواب دیا۔

"کوئی نئی خبر؟"

"بھارت نے لاہور پر حملہ کر دیا ہے؟"

"لاہور پر بھارت نے حملہ کر دیا ہے؟" کسی اور نے حیرت سے پوچھا۔ "کب؟"

"چھ تاریخ کو۔" محمد دین نے جواب دیا۔

"چھ تاریخ کو۔" وہی بولا۔ "تمہارا مطلب ہے کل جو گزر گیا ہے؟"

"ہاں کل۔"

"کسی نے ہوائی اڑائی ہوگی۔" نمبردار نے ذرا ہنس کر کہا۔ "لڑائی چپ چپاتے نہیں ہوا کرتی۔"

"میں تو جو کچھ سن کر آیا ہوں وہی تمہیں بتا رہا ہوں۔" چوہدری محمد دین نے جواب دیا۔ "سانپ اور ہندو ایک کردار کے ہوتے ہیں۔"

"کس سے سُنا تھا تم نے؟" نمبردار نے پوچھا۔

"سیالکوٹ میں ہر شخص کی زبان پر یہی چرچا تھا۔" محمد دین نے جواب دیا۔

"خدا خیر کرے۔" ایک اور نے کہا۔

"حملہ کہاں ہوا؟" نمبردار نے پوچھا۔

"کہیں واہگہ کے آس پاس۔" محمد دین نے جواب دیا۔ "لیکن اللہ کا شکر ہے پاکستان کے جوانوں نے بھارتی فوج کو روک دیا ہے۔"

"کئی روز سے ہماری سرحد پر تو بالکل خاموشی نظر آتی ہے۔" کسی اور نے کہا۔

"اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔" کسی نے جواب دیا۔ "جو لکھا لڑائی کون لڑتا ہے۔ اب ساری توجہ لاہور کی جانب ہوگی۔"

کچھ اسی قسم کی باتیں کرتے کرتے لوگ گھروں کو چلے گئے۔ لیکن یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ موت کا خوفناک سانپ کسی زہریلے سانپ کی طرح گاؤں کی طرف چپکے چپکے رینگتا چلا آرہا ہے۔ نماز کے بعد گاؤں پر مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کچھ اپنے کوٹھے پر کھاٹ ڈالے سو رہے تھے۔ بعض صحن میں میٹھی نیند کے مزے لے رہے تھے۔ لیکن تاروں بھری رات کے حُسن کی بہار دیکھنے والی اسی گاؤں کی ایک بڑھیا بیگم بی بی تھی۔ اس کے گھر والے اس کے آس پاس کھاٹ ڈالے سو رہے تھے۔ نہ جانے آج اس کی آنکھ نیند سے کیوں نا آشنا تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کے گھر کا کتا کسی کسی وقت کچھ ایسی آوازیں نکالتا تھا جیسے کوئی درد سے رو رہا ہو۔ کتے کے رونے کو عموماً گاؤں والے منحوس ہی سمجھا کرتے ہیں۔ نجانے پہلا پہر تھا یا پہر رات گزر چکی تھی۔ اچانک ایک زور کا دھماکا ہوا۔ بیگم بی بی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دوسرے بھی بیدار ہو گئے۔

"یہ آواز کہاں سے آئی؟" کسی نے پوچھا۔

"توپ کی آواز تھی۔" پاس سے کسی اور نے کہا۔

"یہ شور و غل کیسا ہے؟"

"گاؤں میں کہیں گولا پھٹا ہے"۔

کوٹھے پر چڑھ کر دیکھوں۔" بیگم بی بی کے عزیزوں میں سے کسی نے کہا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ اٹھے توپ چلنے کی پھر آواز آئی اور آواز کے بعد پھر وہی پہلے کی طرح چیخ و پکار کا شور سنائی دینے لگا۔ سب سہمے بیٹھے تھے۔ اور توپ چلنے کی آواز تھوڑے تھوڑے وقفہ بعد آرہی تھی۔ گولے گاؤں پر پڑ رہے تھے۔ سب خوف سے کوٹھریوں میں گھس گئے۔

چوہدری محمد دین اور اس کا گبھرو جوان بیٹا اپنے مکان کے صحن میں سو رہے تھے۔ وہ بھی توپوں کی گھن گرج سے جاگ پڑے تھے۔ لڑکا جلدی جلدی جوتا پہن کر جو دروازے کی طرف چلا تو باپ نے پوچھا۔

"ارے تم کہاں چلے؟"

"ذرا دیکھتا ہوں۔" لڑکے نے جواب دیا۔

"کیا دیکھو گے۔" باپ نے کہا۔ "ہمارے گاؤں پر گولے پڑ رہے ہیں۔"

"چاچا!" لڑکا بولا۔ "تم سے کہا بھی تھا مجھے بھی ایک بندوق لے دو۔"

"بندوق ہوتی تو پھر کیا ہوتا۔" محمد دین نے پوچھا۔ "موت کا مقابلہ کون کرسکتا ہے۔"

"موت کا مقابلہ تو واقعی نہیں ہو سکتا۔ لیکن مرنے کا مزا تب ہے جو ایک دو کو مار کر مرے۔" بیٹے نے جواب دیا۔ "دیکھوں میری کلہاڑی

ا ہے۔"

ایک گولہ ساتھ کے مکان پر پڑا۔ اور ساتھ ہی عورتوں اور بچوں کے چیخنے چلانے کی آواز آنے لگی۔

"اللہ تیرا رحم"۔ محمد دین نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ رات بھر تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد گاؤں پر گولے پڑتے رہے۔ چیخ رکی آواز جیسی ابتدا میں سنائی دیتی تھی، اب بہت کم ہو چکی تھی۔ سپیدہ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ محمد دین اس انتظار میں تھا کہ اذان کی آواز آئے۔ رده جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے مسجد میں جائے۔ لیکن نماز کا وقت گزر گیا اور اذان کی آواز نہ آئی۔ محمد دین اور اس کے بیٹے نے وضو کر کے ہیں ہی نماز پڑھ لی۔ لیکن جب دن چڑھا تو وہ اپنے دامن میں بے گناہوں کے لئے نئے نئے مصائب بھی لایا۔ بھارتی فوج نے گاؤں کو چاروں طرف گھیر لیا۔ لیکن اب اسے گاؤں کہنا گاؤں کا مذاق اڑانا تھا۔ بس ملبہ کا ایک ڈھیر تھا۔ جہاں ہر ڈھیر کے نیچے اور آس پاس لاشیں پڑی تھیں بوڑھوں لاشیں، جوانوں کی لاشیں، عورتوں کی لاشیں، بچوں کی لاشیں، اور ادھر گاؤں والوں کے مویشیوں کی لاشیں تھیں جن میں سے اکثر بے زبان اپنے الد پر ہی بندھے پڑے تھے۔ گاؤں والوں میں سے جو زخمی تھے وہ کراہ رہے تھے اور جو زندہ بچ گئے تھے وہ موت کا انتظار کر رہے تھے۔ بھارتی ج نے حکم دیا کہ سب باہر میدان میں آجائیں۔ ان میں سے جو جوان تھے یا وہ جن کی ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ ان کو دوسروں سے الگ کر کے قطار میں کھڑا کر دیا۔ چوہدری محمد دین کا جوان اکلوتا لڑکا بھی انہی میں تھا۔ محمد دین نے کسی بھارتی سے پوچھا۔

" ان بے گناہوں کو دوسروں سے الگ کیوں کھڑا کر دیا ہے تم نے۔"

" تمہیں تماشہ دکھائیں گے۔" افسر نے جواب دیا۔

" مجھ پر رحم کرو۔" محمد دین ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "میں بوڑھا ہوں۔ یہ میرا اکلوتا لڑکا میری زندگی کا سہارا ہے۔ اس کی ماں مر چکی ہے۔ اسے ڑ دو۔"

" فکر مت کرو۔" افسر ہنس کر بولا۔ "جہاں دوسرے جائیں گے تمہارا بیٹا بھی ان کے ساتھ ہی جائے گا۔"

" اگر تم اسے لے جاؤ گے تو میں بھی ساتھ جاؤں گا۔" محمد دین نے کہا اور بھاگ کر بیٹے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

" بوڑھے!" افسر بولا۔ "ہٹ جاؤ یہاں سے۔ ورنہ ان کے ساتھ تم بھی مارے جاؤ گے۔"

" میں بیٹے کو نہیں چھوڑ سکتا۔" محمد دین نے بیٹے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ "مجھے بھی گولی مار دو۔ اگر یہ مر گیا تو مجھے زندہ رہ کر کیا لینا ہے۔ میں کے ساتھ ہی مروں گا۔"

" بہت اچھا۔" افسر بولا۔ "تم بوڑھے ہو اس لئے میں تمہاری بات رد نہیں کر سکتا۔"

پھر اس نے اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ تڑاتڑ گولیاں چلیں اور گاؤں کے سب جوان مرد جن میں صرف ایک بوڑھا محمد دین بھی تھا خاک ین تڑپنے لگے۔ یہ خوفناک نظارہ دیکھ کر گاؤں کے بچے کھچے لوگ خوفزدہ ہو کر پھر گاؤں کی طرف بھاگ گئے۔ اور دشمن کے خوف سے کسی کو جگہ ملی وہیں گھس گیا۔ اس خوفناک قتل و خون کے بعد بھارتی سپاہی بھی ان کے پیچھے پیچھے آ گئے۔ اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر جوان لڑکیوں کو لا پھر ان کی چوٹیاں ایک دوسری سے باندھ کر اپنے کیمپ کی طرف لے گئے۔ ان مظلوموں پر کیا گزری یہ ان کے خدا ہی کو معلوم ہو گا۔

بوڑھی بیگم نے بھی یہ خونی اور بزدلانہ تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جن کو گولی ماری گئی تھی، ان میں اس کے بھی عزیز تھے۔ اس کا شوہر ر رات گولہ پھٹنے سے اپنے مکان میں ہی مارا گیا تھا۔ وہ ایک مکان کی دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ اتنے میں فضا میں گڑگڑاہٹ کی ر آواز پیدا ہوئی۔ اور بیگم کے دیکھتے دیکھتے آسمان پر سے بم برسنے لگے۔ یہ پاکستان کی فضائیہ فوج کے ہوائی جہاز تھے جو قضائے مبرم کی طرح فوج کے سروں پر منڈلا رہے تھے۔ پاکستانی فضائیہ کے جہاز دیکھتے ہی بھارتی فوج کے سپاہی منہ کے بل زمین پر لیٹ گئے۔ کچھ بھاگ کر

تباہ شدہ گاؤں کے کھنڈرات میں گھس گئے۔ جہاں بم گرتا اس کے پھٹنے کے ساتھ ایک دل ہلا دینے والی کڑک پیدا ہوتی اور گرد و غبار کے بادل زمین سے اٹھ کر فضا میں پھیل جاتے۔ بھارت کے بزدل سپاہی جو ابھی ابھی بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگ چکے تھے ان میں کبھی کچھ اس کے پاس سے بھی گزرتے۔ لیکن ان بزدلوں پر خوف و ہراس کچھ اس طرح چھایا ہوا تھا کہ کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ بوڑھی بیگم وہاں سے ہٹ کر بلا ارادہ ہی چلتے چلتے کھیتوں میں پہنچ گئی۔ لیکن وہ یہاں اکیلی نہیں تھی۔ اس کے گاؤں کے کچھ اور لوگ بھی یہاں چھپے ہوئے تھے۔ فضا میں پاکستان کے شاہین صفت ہوا باز پرواز کر رہے تھے اور بھارتی فوج پر بم برسا رہے تھے۔ جگہ جگہ بھارت کے اکثر ٹینک جو رات بھر گاؤں پر قیامت برپا کرتے رہے تھے ٹوٹے پڑے ہوئے تھے۔ ان کے آس پاس ٹینکوں کے چلانے والے بھی مرے پڑے تھے۔ لیکن بھارت کے سپاہی کہیں نظر نہ آتے۔ بیگم نے اپنے گاؤں کی طرف، اس گاؤں کی طرف جہاں وہ پیدا ہوئی تھی، جہاں وہ پروان چڑھی تھی، جہاں جوان ہونے پر اس کی شادی ہوئی تھی۔ جہاں اس کے شوہر کے کھیت تھے جہاں اس کا گھر تھا۔ اس کا کنبہ تھا۔ ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی، جہاں گاؤں تھا اب وہاں ٹوٹے ہوئے مکانوں کا ملبہ تھا۔ اور گاؤں سے باہر میدان میں جدھر نگاہ اٹھتی، لاشیں ہی لاشیں نظر آ رہی تھیں۔ آخر اسی گھن گرج اور گرد و غبار کے بادلوں کے پردے میں وہ شہر کی طرف چل پڑی۔ دن بھر کے سفر کے بعد وہ ایک امدادی کیمپ میں پہنچ گئی۔ جہاں لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کسی نے پوچھا "اماں کچھ اپنی بھی کہو کہاں سے آئی ہو"۔ بیگم نے ایک گہری سانس لے کر جواب دیا۔

"بیٹا! کیا کہوں۔ میرے پاس تو صرف آہیں اور آنسو ہیں"۔

پھر کندھے پر لٹکا ہوا ایک قرآن مجید جو جزدان میں لپٹا ہوا تھا دکھا کر "یہی میری دولت ہے۔ اور یہی میرا ایمان ہے۔ دیکھ لو۔ اس کے سوا میں کچھ نہیں لائی"۔

اور پھر پہلے کی طرح ایک دلخراش آہ اور آنکھوں میں آنسو!

بقیہ: سہاگ (سلسلہ صفحہ ۳۹)

سیالکوٹ سیکٹر میں کالونی کے آٹھ نوجوان شہید ہوئے ہیں اور پانچ چھ زخمی ہیں۔ یہ پتہ نہیں چل سکا کہ کون کون شہید ہوئے ہیں اور دوسرے محاذوں پر جو لوگ شہید ہوئے ہیں۔ محمد انوار خان کے علاوہ اور کسی کا پتہ نہیں چلا ہے۔ البتہ یہ سنا ہے کہ کانپور کے آدمی زیادہ شہید ہوئے ہیں۔ عائشہ بولی خدا کا شکر ہے ہماری قربانیاں رائیگاں نہیں گئیں اور دشمن نے سامراج کے عزائم خاک میں ملا دئے۔ ہماری بہنوں کے جو سہاگ لٹے ہیں اور جو بچے یتیم ہوئے ہیں وہ ہمارے آہنی ارادوں کی بے مثال جرأت اور اپنی آزادی کی خاطر برہمن سامراج کا سر توڑنے کی راہ میں سرفروشی کی لازوال نشانیاں ہیں۔

بقیہ: ورندر عجائب خانہ (سلسلہ صفحہ ۲)

۱۹۴۷ء میں اس میوزیم کو خاصا نقصان پہنچا۔ اس کے منتظمین یہاں سے ہندوستان چلے گئے، کچھ دنوں تک یہ بند رہا، مگر آزادی کے بعد ۱۹۴۹ء میں پھر سے اس کی باضابطہ تنظیم کی گئی۔ اور اس میں نوادرات کا اضافہ کیا جانے لگا۔ آج تک برابر اس میں نوادرات کا اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ بلاشبہ ورندر عجائب خانہ اس وقت نہ صرف مشرقی پاکستان بلکہ پورے پاکستان میں اپنی نوعیت کا ایک نہایت ہی اہم عجائب گھر ہے۔ حکومت پاکستان اور حکومت مشرقی پاکستان اس کی ترقی کے لئے بہت کوشاں ہے۔ اس لئے امید کی جاتی ہے کہ مشرقی پاکستان ہی نہیں بلکہ پورے پاکستان کے لئے یہ ادارہ بہت بڑا تحقیقاتی ادارہ بن جائے گا۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

حسرت، سندباد جہازی اور شیرازہ

ایک چینی شاعر لکھتا ہے۔

محفل برخاست ہو چکی۔

سازندے جا چکے۔

مگر امن کے دو سفید سفید پھول۔

جنہیں میزبان نے سبز بلور کے خوش نما گلدانوں میں رکھ دیا تھا۔

چنگ ورباب کی جانب جھکے ہوئے،

ابھی تک محوِ نغمہ معلوم ہوتے ہیں۔

آج جب شعر وادب اور صحافت کی پرانی بساط الٹ چکی ہے۔ اور وہ فن کار ہماری آنکھ سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو چکے ہیں جو مدتوں ہمارے دلوں کو گرماتے اور تڑپاتے رہے ہیں، ہم ان کی یادوں کے چراغ جلا کر، اُن کی مدھم لَو میں اُن راہوں اور پگڈنڈیوں کو ڈھونڈتے ہیں۔ جن پر چل کر نہ صرف ان کی سحر کاریوں سے لذت اندوز ہوتے ہیں۔ بلکہ نئی راہیں بھی معین کر لیتے ہیں۔ اور یہی فکرِ انسانی کے ارتقا کی پہلی ریت ہے۔

چراغ حسن حسرت انہی فن کاروں میں ایک نمایاں حیثیت کے حامل تھے، اُن کی تخلیقات قدیم وجدید کا ایک ایسا امتزاج پیش کرتی ہیں، جو قدرتی عمل کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔ انہوں نے عربی اور فارسی سے رشتہ نہ توڑا۔ کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔ اور اس سے روشنی حاصل کی۔ نئے تقاضوں اور نئی ضرورتوں کو محسوس کیا۔ نئے تجربے کئے۔ اور اس طرح ایک ایسے ادب اور ایک ایسی روایت کو جنم دیا۔ جو آنے والی نسلوں کے لئے کلاسیکی ادب اور کلاسیکی روایت کا کام دیں گے۔ انہوں نے زبان اور اسلوبِ نگارش میں نئے تجربے کئے۔ "پربت کی بیٹی" کی زبان اور اسلوب پر انہیں ناز تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ زبان اُردو اور ہندی، دونوں کے قدردانوں کو مرغوب ہوگی۔ انہوں نے شخصیت نگاری کے فن کی نئی قدروں کو اپنایا۔ اور انہی کی روشنی میں اپنے زمانے کی نامور شخصیتوں کو "مردم دیدہ" میں کچھ ایسی ادا کے ساتھ پیش کیا، کہ قاری کو یہ احساس ہوتا ہے۔ جیسے وہ مدتوں ان کی محفل میں بیٹھا ہے۔ چراغ حسن حسرت نے کبھی یہ کوشش نہ کی، کہ وہ سرسید احمد خاں بن جائیں یا ابوالکلام آزاد کی جانشینی کا فخر حاصل کریں۔ یا مولانا ظفر علی خاں کا تتبع کریں، کیونکہ وہ جانتے تھے، کہ ایسی کوشش جمودِ فکر کی مظہر ہے۔ لیکن انہوں نے خوشہ چینی ضرور کی، غالب سے اُس کے مکاتیب کی بے ساختگی لی۔ سرسید سے سادگی اور سلاست اخذ کی، رتن ناتھ سرشار سے شگفتگی اور مزاح کے عناصر حاصل کئے۔ ابوالکلام آزاد کی نثر کے حسن وجمال سے اثر قبول کیا۔ اور مولانا ظفر علی خاں کے اسلوبِ بیان سے شکوہ حاصل کیا۔ اور ذوقِ رسا کی مدد سے ان سب کا ایک ایسا امتزاج پیش کیا۔ جو بذاتِ خود ایک نیا اسلوبِ نگارش ہے۔

لیکن حسرت کی جدت پسند طبیعت کو کہیں قیام نہیں تھا۔ ان نے میدانِ صحافت میں بھی طرحِ نو کا آغاز کیا۔ اردو صحافت کی تمام صحت مند روایتوں اور قدروں کو اپنایا۔ اور برطانوی صحافت کے اصولوں کو ان قدروں میں سمو کر امروز کے رُوپ میں ایک نئی

صحافت کی طرح ڈالی۔ اور پھر دیپ سے دیپ جلے۔ اور آج ہمارے
نوجوان صحافیوں کی اولوالعزمی اور جدت پسندی کے طفیل ایوانِ صحافت
نت نئی روشنیوں سے جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔

چراغ حسن حسرت جس زمانے کی پیداوار تھے، وہ غلامی کا
زمانہ تھا۔ سامراج کے ہاتھوں کٹی پٹی انسانیت ایک اداس ماحول
میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس اداسی کو توڑنے اور نئی نسل میں زندہ
دلی پیدا کرنے کی غرض سے پہلی عالمی جنگ کے بعد اردو صحافت
میں مزاحیہ کالم نویسی کو ایک مستقل صورت حاصل ہوئی۔ اسی زمانے
میں چراغ حسن حسرت "سندباد جہازی" کے روپ میں منظر عام پر
آئے۔ اور اپنے بے محابا طنز سے ہر کسی کو چونکا دیا۔ انہوں نے معاشرے
کے بعض پہلوؤں کو اپنے اصلی رنگ میں پیش کیا۔ سیاسی زندگی کی
ہر ناہمواری کو تیر و نشتر کا نشانہ بنایا۔ وہ الفاظ کے الٹ پھیر سے
مزاح پیدا کرتے تھے۔ اور اس میں شاذ ہی آورد اور تصنع کو دخل
ہوا، کیونکہ وسیع مطالعہ اور بالخصوص فسانۂ آزاد کے گہرے مطالعہ
کی بدولت اُن کے پاس الفاظ کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود تھا کہ ختم ہونے
میں نہ آتا تھا، زبان اور اسلوب پر بے پناہ قابو نے سونے پر سہاگے
کا کام دیا اور چاروں اور "سندباد جہازی" کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔

میں کہہ چکا ہوں، کہ سندباد جہازی کی جدت پسند طبیعت
قرار نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۳۱ء کے آغاز میں "شیرازہ"
جاری کیا۔ جو ایک ادبی اور فکاہی ہفت روزہ تھا۔ اور اُردو
صحافت میں ایک منفرد حیثیت کا مالک تھا۔ مزاحیہ صحافت برِعظیم
میں کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے، کہ جتنے مزاحیہ اخبار
برِعظیم میں جاری ہوئے، اتنے دُنیا کے کسی مُلک میں نہیں نکلے۔ مزاحیہ
صحافت کا آغاز ۱۸۵۸ء میں ہوا، لیکن بیس سال بعد "اودھ پنچ"
کے اجراء سے اس نے ایک باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کر لی،
سارے برِعظیم میں پنچ اخبار برسات کی کھمبیوں کی طرح نکل
آئے۔ جہاں اودھ پنچ نے مزاحیہ صحافت کو نہایت شوخ انداز میں
پیش کیا۔ کارٹونوں کا حربہ باقاعدگی سے استعمال کیا۔ اور سیاسی اور
مشرقی مسائل اور بین الاقوامی سیاست پر تیز و تند اور بے باک
انداز میں تبصرہ کیا، وہاں اس سے اردو صحافت کو نقصان بھی پہنچا۔
کیونکہ اس نے مزاح میں ابتذال اور پھکڑپن کو فروغ دیا اور جو اخبار
اس کی تقلید میں نکلے۔ اُنہوں نے اسے فحش نگاری تک پہنچا دیا۔ یہاں تک
کہ یہ ابتذال اور پھکڑپن سنجیدہ صحافت میں بھی منعکس ہوا۔ سندباد
جہازی کا "شیرازہ" حقیقت میں پنچ صحافت کے خلاف ایک عظیم ردِ عمل
تھا، کیونکہ اس نے مزاح میں پاکیزگی اور شائستگی کا دامن نہ چھوڑا۔
اُس زمانے میں، آج کی طرح، ادبی ہفت روزے بھی نہ ہونے کے
برابر تھے، بالخصوص ایسے ہفت روزہ اخبار جو قارئین کو ادب
کے قدیم و جدید دونوں رجحانات سے باخبر رکھ سکیں۔ اس خلا
کو بھی شیرازہ نے پورا کیا۔ اور چونکہ اس کے مالک و مدیر مولانا
چراغ حسن حسرت ایک طرف اعلیٰ پائے کے مزاح نگار اور طنز نگار
اور دوسری طرف ایک بلند مرتبت ادیب اور شاعر بھی تھے، اس
لیے "شیرازہ" برِعظیم کا واحد ادبی اور فکاہی ہفت روزہ تھا،
جو قارئین کے دونوں قسم کے ذوق کی آسودگی کا سامان بہم پہنچاتا
تھا۔

"شیرازہ" فل سکیپ سائز کے بیس صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔
سرورق پر ابتدائی دَور میں آرٹ کا کوئی شہپارہ دیا جاتا تھا، اس
کے بعد دو تین مستقل عنوانات تھے۔ زیادہ تر "اشارات" کے عنوان
سے اور بعض اوقات "باغ و بہار" کے عنوان سے "سندباد جہازی"
مزاحیہ پارے پیش کرتے تھے۔ "حوادث و افکار" کے مستقل عنوان کے
تحت سندباد جہازی کے دوست مولانا عبدالمجید سالک ایک مزاحیہ
کالم لکھتے تھے۔ جو "افکار و حوادث" ہی کی طرح کا کالم تھا۔ دو تین مزاحیہ
خاکے ہوتے تھے۔ ایک آدھ مضمون کسی سنجیدہ اور معلوماتی موضوع
پر دیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی حالاتِ حاضرہ پر غیر جانبدارانہ تبصرے شائع
کئے جاتے تھے۔ کلاسیکی شعراء اور ادباء پر ایسے ہلکے پھلکے انداز میں
مختصر مقالے دیئے جاتے تھے جنہیں عام لوگ بھی پڑھ سکتے تھے۔ ایک
آدھ مزاحیہ نظم، دو ایک اعلیٰ غزلیں، کلاسیکی شعراء کے کلام کا انتخاب
اور خالی جگہوں میں تازہ ترین طنز و لطائف درج ہوتے تھے۔ حسرت
کی مشہور کتاب "مردم دیدہ" پہلے "شیرازہ" ہی میں بالاقساط چھپی۔ ان کے

مشہور سیاسی جغرافیہ کی اشاعت بھی اسی پرچے میں ہوئی، یوں تو اس ہفت روزہ کی چار سالہ زندگی میں بے شمار ادیبوں نے اسے اپنے رشحاتِ قلم سے نوازا لیکن فائل کے مطالعہ سے یہ نام زیادہ نظر آتے ہیں: "حاجی لق لق، حفیظ ہوشیارپوری، عطاء اللہ سجاد، ضمیر جعفری، غلام عباس (جزیرۂ سخنوراں والے) بدرالدین بدر، فیض احمد فیض، حفیظ جاوید، کرشن چندر، محمد فاضل، میرا جی، احمد ندیم قاسمی، بری چند اختر، محمد حسین بی کام، خضر تمیمی، ڈاکٹر تاثیر، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، وقار انبالوی، عابد علی عابد، باری، خلیل صحافی، محمود نظامی،" میں اب صرف حسرت کے چند نثر پارے نمونے کے طور پر پیش کرتا ہوں:

قرضِ حسنہ

اخبار "زمیندار" نے اپنے خریداروں سے قرضِ حسنہ مانگا ہے۔ سنا گیا ہے کہ اس قرضِ حسنہ سے اخبار کی ضخامت میں اضافہ کیا جائے گا۔ ہمیں اس وقت "زمیندار" یا اس کی ضخامت سے بحث نہیں بلکہ صرف قرضِ حسنہ کی اصطلاح سے سروکار ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں قرضِ حسنہ ایسے قرض کو کہتے ہیں۔ جس کی ادائی کا مطالبہ کیا جائے۔ تو مقروض دانت نکال کر کہہ دے "اجی حضرت ابھی جلدی کیا ہے۔ پھر دیجئے گا" گویا اس قرض کی خصوصیت ہنسنا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ صرف قرض لینے والے کو ہنسنا پڑتا ہے۔

اگر کوئی صاحب ہمیں قرضِ حسنہ یا "قرضِ ہنسنا" دے سکیں، تو ہم انہیں یقین دلاتے ہیں کہ ہم سے ہنسنے میں کوتاہی نہ ہوگی کیونکہ ہمارے پھیپھڑوں کی حالت بہت اچھی ہے۔ اور ہم گھنٹوں تک مسلسل ہنس سکتے ہیں۔ (۲۰ر اپریل، ۱۹۳۸ء)

کونسی گولی

پچھلے دنوں بعض مسلمان لیڈروں نے اپنی تقریروں میں کہا تھا کہ اگر ہندوستان سے فلسطین کو فوج بھیجی گئی، تو ہم سب سے پہلے گولی کھائیں گے۔ قصور میں مجلسِ احرار کی جو کانفرنس ہوئی، اس میں اس واقعہ کا بھی ذکر آیا۔ ایک صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ جو شخص اٹھتا ہے، کہتا ہے۔ گولی کھائیں گے۔ گولی کھائیں گے۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتاتا کونسی گولی؟

پاس سے آواز آئی: کونین کی! (یکم نومبر ۱۹۳۸ء)

چھوٹو رام

مشہور لوگوں کے ناموں پر رسالے اور اخبار نکالنے کا رواج عام ہو رہا ہے۔ جسٹس شاہ دین مرحوم کا تخلص "ہمایوں" تھا ان کے نام پر "ہمایوں" نکالا گیا۔ پھر امرتسر سے "غالب"، راولپنڈی سے "سالک" اور الہ آباد سے "اکبر" نکلا۔ ہمارے ایک دوست نے جو استاد ذوق کے بہت مداح تھے، کلکتہ سے "ذوق" نامی ایک اخبار نکالا تھا۔ جو تھوڑے دن چل کر بند ہو گیا۔ پنجاب میں سر سکندر کو جو قبولِ عام حاصل ہو رہا ہے۔ اس کا اقتضا یہ ہے کہ آئندہ جو روزانہ اخبار نکلے۔ اس کا نام سکندر ہو۔ ادبی رسالے کے لئے دولتانہ بہت موزوں نام ہے۔

کل ایک صاحب پوچھ رہے تھے کہ بچوں کے لئے کوئی رسالہ نکالا جائے، تو اس کے لئے کیا نام موزوں ہوگا۔ میں نے عرض کیا "چھوٹو رام"۔ (۲ر دسمبر ۱۹۳۶ء)

ضمیر غائب

ضمیر جعفری صاحب جو کچھ عرصے میرے ساتھ شیرازہ کی ترتیب میں حصّہ لے رہے تھے بیس پچیس دن سے غائب ہیں، اور ان کا مرجع معلوم نہیں، ان کے بعض خاص احباب سے بس اتنا معلوم ہوا ہے کہ وہ پنجاب کے کسی گوشے میں شیرازۂ حواس کو مجتمع کرنے میں مصروف ہیں، اور غالباً اپنا غذائی شیرازہ کی ترتیب میں حصّہ نہ لے سکیں۔ بہرحال اُن کی تحلیل صرفی ملاحظہ ہو۔

ضمیر واحد غائب۔ بحالت فاعلی مرجع نامعلوم۔

اُن کے جو احباب اُنہیں خط لکھنا چاہیں۔ پتہ یاد رکھیں۔

(۱۶ر مارچ ۱۹۳۹ء)

مسیح لائل پور میں

پچھلے دنوں لائل پور کی کسی عدالت میں ایک عیسائی لڑکا جس کی عمر کوئی بارہ سال کی تھی، شہادت دینے پیش ہوا مجسٹریٹ نے اس سے پوچھا۔ کیا تم جناب مسیح کی قسم کھا کے کہتے ہو، کہ تم جو کچھ کہو گے، سچ سچ کہو گے۔

لڑکے نے کہا "جی ہاں"

مجسٹریٹ نے پوچھا "تم حضرت مسیح کو جانتے ہو؟"

لڑکے نے کہا "جی ہاں، وہ تو یہیں ہیں"

مجسٹریٹ نے پوچھا "کہاں"

لڑکا بولا "وہ اس وقت عدالت کے باہر کھڑے ہیں"

مجسٹریٹ نے کہا "تو انہیں جا کر لے آؤ"

لڑکا گیا۔ اور اپنے گاؤں کے پٹواری کو لے آیا۔ پھر کہنے لگا "میرے مسیح یہی ہیں"

شاعروں نے محبوب کو مسیحا بنایا ہے۔ اور اس کی مسیحائی کے متعلق بہت مبالغہ کیا ہے۔ لیکن لائل پور کا یہ عیسائی لڑکا جس نے اپنے گاؤں کے پٹواری کو مسیحائی کے لئے منتخب کر لیا ہے۔ ان سے بہت بڑھ گیا۔ پٹواری مسیحا نفس نہ سہی۔ بہر حال "جمجندری" کے فن میں تو مہارت رکھتا ہے، اور یہ کیا کم ہے! اس کے علاوہ ہم نے یہ بھی سنا ہے، پٹواری "خسرہ" کا علاج بھی خوب کرتے ہیں۔

(یکم جولائی ۴۳ء)

خواجہ دل محمد

پچھلے دنوں لاہور سے ایک صاحب تشریف لائے تھے۔ انہوں نے اسلامیہ کالج کے طلبہ کی ہڑتال اور خواجہ دل محمد صاحب پر پروفیسروں کی یورش کے متعلق ایسی ایسی باتیں سنائیں کہ عقل چکر میں آ گئی۔ اللہ اللہ ؎

"دل" نے دنیا نئی بنا ڈالی!

اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی

خواجہ صاحب نے جب کالج کی پرنسپلی سنبھالی تھی، تو ہم نے اسی وقت عرض کر دیا تھا کہ حضرت سلامت، یہ نہ میونسپل کمیٹی کی ممبری ہے، نہ ریاضی کی پروفیسری، بلکہ پرنسپلی ہے، پرنسپلی، ہمیں ڈر ہے، کہ کہیں کالج کے لڑکے آپ کو کسر اعشاریہ نہ بنا ڈالیں، آپ سمجھے بیٹھے ہیں، کہ کالج کا پرنسپل بننا عادِ اعظم بن جانا ہے، اور ہمارے خیال میں اس سے کہیں اچھا ہے، کہ ذو اضعافِ اقل ہی بنے رہتے اور خدا کا شکر کیجئے۔

افسوس، کہ خواجہ صاحب نے ہماری نصیحت نہ سنی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کبھی اُن پر الجبرا کا مسئلہ لگایا جاتا ہے۔ کبھی "وقت اور کام" کا قاعدہ آزمایا جاتا ہے، کبھی یہ خواہش کی جاتی ہے کہ وہ کسی طرح کسر مسلسل بن جائیں، کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ خواجہ صاحب تو محض صفر ہیں، غرض پرنسپلی کا ہر دن ان کے لئے یوم حساب اور روز شمار بن گیا ہے۔

ہمیں خود ان دنوں خواجہ صاحب کی زیارت کا شرف حاصل نہیں ہوا لیکن جن لوگوں نے انہیں دیکھا ہے، اُن کا بیان ہے کہ جب سے ہڑتال کی مصیبت سے دوچار ہیں۔ تین چوتھائی بھی نہیں رہے۔ زندگی اس کشمکش و پیچ میں گزر رہی ہے۔ کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں؟ اس عالم میں جب کچھ نہیں سوجھتا تو غالب کا یہ شعر پڑھ کے چپکے ہو رہتے ہیں ؎

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

(۱۲ دسمبر ۴۲ء)

نجات المومنین اور احوال الآخرہ

"شیرازہ" میں حکیم فقیر محمد مرحوم کا ایک لطیفہ بر روایت مولانا عبد المجید سالک چھپا ہے۔ لطیفہ یہ ہے۔ کہ ایک دفعہ سالک صاحب حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اتفاق سے لاہور کی ایک طوائف بھی، جو ان دنوں حکیم صاحب سے علاج کرا رہی تھی، مطب میں موجود تھی۔ حکیم صاحب نے مولانا سالک کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ انہیں جانتی ہو؟ انقلاب کے ایڈیٹر سالک صاحب ہیں الملک

(بقیہ صفحہ ۴۴ پر)

پروین سرور

"جیوا"

وہ پاگل ہو رہا تھا۔

دو دن سے اُس نے نہ کچھ کھایا تھا نہ پیا تھا۔ یہاں تک کہ سگریٹ کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اگرچہ وہ کچھ کھائے پیئے بغیر دو چار دن تو گزار سکتا تھا مگر بھکاری ہونے کے باوجود سگریٹ سے کبھی لمحہ بھر کو جدا نہیں ہوا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک انتہائی گھریلو قسم کا آدمی اپنے گھر اور بیوی بچّوں سے ایک دن بھی جدا ہونا پسند نہیں کرتا۔

وہ پیدائشی بھکاری نہیں تھا۔ صرف اپنے حالات سے مجبور تھا۔

وہ پاگل بھی نہیں تھا۔ وہ بیحد حساس اور سمجھدار تھا اور اس سارے علاقے میں اس سے زیادہ سوجھ بوجھ کا مالک شاید ہی کوئی اور ہوگا۔

وہ ان پڑھ بھی نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اردو پڑھ سکتا تھا۔ پڑھے لکھے لوگوں کے انداز میں بات چیت کر سکتا تھا۔

اِن تمام خوبیوں کے باوجود وہ بھکاری تھا۔ اور بھکاری ہونے کی حیثیت سے اسے زندگی میں قدم قدم پر نفرت و حقارت ملی تھی۔

راستہ چلتے۔ کھاتے پیتے۔ مہذب و شائستہ لوگ اُسے حقیر سمجھتے تھے۔ جب وہ سر جھکائے اپنے فٹ پاتھ پر چُپ چاپ بیٹھا ہوتا تو کالج اور اسکول جانے والی شاداب لڑکیاں نظر بچا کر اُس کے قریب سے گزر جاتیں۔ بے فکرے نوجوان یوں دبے پاؤں اُس کے قریب سے گزرتے جیسے وہ پلیگ کا مہلک جرثومہ تھا۔

وہ پلیگ کا جرثومہ ہو نہ ہو۔ حسین سماج کا دشمن جرثومہ ضرور تھا۔ غربت اور بے چارگی کا ایسا مرکز جس کے سامنے کروٹ بدلتی ہوئی تہذیب اور اُونچی اُٹھتی ہوئی سوسائٹی کی شکل یوں بگڑ گئی تھی۔ جیسے کوئی سیاہ رنگ کا برُش اس کی اُجلی رنگت پر پھیر رہا ہو۔

لیکن اس وقت اسے ان باتوں کا مطلق احساس نہیں تھا۔ اُسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ اُس نے دو دن سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔ نہ اسے سگریٹ کی طلب تھی۔ وہ تو صرف پاگل ہو رہا تھا۔ بالکل جنونی۔

سگریٹ کے ایک لمبے کش میں اُس کی دُنیا آباد تھی۔ اُسے فٹ پاتھ پر بیٹھے بیٹھے ہی وہ سب کچھ مل جاتا تھا جو بہت سے لوگوں کو دوڑ دھوپ کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اُس کی دُنیا میں بڑا سکون ہوتا۔ اُس کی بھاماں بڑے اطمینان سے اس کے کپڑوں کی مرمت کر رہی ہوتی۔ ننھا اسحٰق پلنگڑی میں میٹھی نیند سویا ہوتا۔ اس کے ہونٹوں پر لگے ہوئے دودھ کے قطروں پر ایک مکھی بار بار منڈلا رہی ہوتی۔ گھر کے آنگن میں مرغیاں چُگ رہی ہوتیں۔ بھوری بھینس کے ڈکرانے کی آواز بار بار اونچی ہوتی جاتی۔

بھاماں کے گورے گالوں پر سیاہ پلکوں کا گھنیرا سایہ چھا جاتا۔ اُس کے خوبصورت ہونٹوں پر ایک معصوم سا تبسم بکھر جاتا۔ وہ چُپکے چُپکے بہت سی باتیں کئے جاتی۔

" اناج جمع ہوگیا ہے۔ ابکے فصل اچھی تھی۔ اللہ نے چاہا تو ایک کوٹھا اور کھڑا کرلیں گے۔ بھوری بھینس بک جائے گی تو ننھے کا نیا پلنگ بن جائے گا۔"

وہ اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہتا "اس گھر کی ایک چیز بھی نہیں بکے گی پھاماں — چاہے کچھ بھی ہوجائے"۔

" مگر اتنی بھینسوں کی ہمیں ضرورت بھی کیا ہے — ابھی پار سال ہی دو بھینسیں بیاہی تھیں — کھونٹے پر تو چار چار کھڑی ہیں"۔

" کھڑی رہنے دے — تجھے کیا۔ تو ننھے کا پلنگ بنوالے۔ کوئی منع کرتا ہے"۔

" مگر — اتنی سارے ڈھور ڈنگر کروگے بھی کیا"۔

" تجھے اب کون سمجھائے پھاماں — ڈھور ڈنگر تو انسان کے دکھ سکھ کا ساتھی ہے — جتنا بھی ہو — سب خدا کی رحمت ہے"۔

پھاماں اس کا منہ تکنے جاتی — گھٹنوں پر اُس کا کرتہ پھیلائے وہ دانتوں میں سوئی دبائے گم سُم سی رہ جاتی — سگریٹ کے اس کش میں وہ کہیں سے کہیں نکل جاتا۔ اُس کا فٹ پاتھ جس پر وہ اٹھارہ برس سے سوتا جاگتا چلا آیا تھا اس کا عالیشان دو منزلہ — بلکہ سہ منزلہ مکان بن جاتا — پھاماں کی آنکھوں میں جگنو ٹمٹماتے رہتے — بچے بڑے ہوتے جاتے — دو لڑکیاں — تین لڑکے — یا چار بیٹیاں اور پانچ بیٹے — ایک سے ایک خوبصورت — ایک سے ایک جوان اور سجیلے —

پھاماں وہیں بیٹھے بیٹھے بیاہ شادیوں کی تاریخیں پکی کرتی۔ بہوؤں کی ڈولیاں اُترتیں — بیٹیاں سسرال سدھارتیں۔ براتیں چڑھتیں۔ دھوم دھڑکے ہوتے — نواسے پوتے آنگن بھرتے رہتے۔

سگریٹ کے ایک ہی کش میں تو اُس کا سب کچھ تھا اگرچہ اس بھری دُنیا میں وہ ایک چراغ کی طرح تنہا تھا۔ جس کے اُجالے میں دُنیا سمٹ آتی ہے — مگر جس کے نصیب میں اندھیرے اور تنہائی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

لیکن ان دو دنوں میں وہ اپنی دُنیا سے بالکل الگ ہوچکا تھا۔ سگریٹ کے ایک کش کی جدائی نے اٹھارہ برس کا طویل فاصلہ ایک اونچی دیوار کی طرح اس کے تصور اور حقیقت کے درمیان لا کھڑا کیا تھا۔ اب نہ اس کی کوئی پھاماں تھی — نہ اسحٰق تھا — نہ اُس کی بیٹیاں — پوتے اور نواسے تھے — وہ صرف ایک مہاجر تھا۔ ایک بھکاری تھا — اٹھارہ برس کا مہاجر جس کی حسین بیوی اس کی موجودگی میں اغوا کرلی گئی تھی۔ جس کا پھول سا ننھا بچہ اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک خونی سکھ کی کرپان کی نوک پر ایک دشمن کے پرچم کی طرح اچھالا اور ٹکڑے ٹکڑے کردیا گیا تھا۔ اور وہ خود اسی ہنگامے میں ایک ٹانگ — اور ایک ہاتھ سے محروم کردیا گیا تھا۔

اب وہ ایک معذور بھکاری تھا —

یہ داستان تو بہت پُرانی ہے۔ مگر اُس مہاجر کی داستان ہے جو اٹھارہ برس کی مسافت طے کرتے کرتے یہاں تک آنکلا تھا۔ اس کو دُہرانے سے کچھ فائدہ بھی نہیں۔ مگر ان دو دنوں میں اُس پر ایک جنون کی کیفیت طاری تھی — وہ پاگل ہو رہا تھا۔ اُسے کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ اُس کے ذہن میں نہ پُرانی داستان تھی — نہ کوئی ادھوری کہانی تھی — نہ کوئی حکایت تھی۔ وہ تو جیتی جاگتی حقیقت کی دُنیا میں سانس لے رہا تھا۔ اور ایک نئی کہانی کو جنم دے رہا تھا —

اُس کے گرد تماشائیوں کا ہجوم تھا — سرکاری ہسپتال کی سُرخ عمارت کے سامنے کھلے میدان میں اس نے کچی پکی اینٹوں کا مورچہ بنا رکھا تھا۔ آمنے سامنے چھوٹی بڑی اینٹیں یوں کھڑی تھیں جیسے پاکستان اور بھارت کی فوجیں ڈٹی کھڑی ہوں —

دو دن میں اُس نے شہر کے کونے کونے سے صرف اینٹیں ہی جمع کی تھیں — نہ کسی سے بھیک مانگی تھی۔ نہ گڑگڑا کر دو روٹی کا سوال کیا تھا — نہ دُنیا کی نفرت و لعنت کا بار اپنے دل پر محسوس کیا تھا۔ وہ اپنے اس کام میں اتنا مصروف رہا تھا کہ اسے خود اپنی بھی خبر نہیں رہی تھی — اس کام میں اُسے صرف یہ تجربہ ہوا تھا کہ اتنی بڑی دُنیا میں کئی کئی دن تک دوسروں سے بات کئے بغیر بھی گزارا ہوسکتا ہے —

دونوں مورچے تیار تھے ــ وہ مجنونوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ "یہ دیکھو ــ یہ رہا بھارت یہ گیدڑوں کا مورچہ ــ یہ بھارت ہے ــ بھارت ایک لنگوٹی کا بھارت"۔

اِردگرد کھڑے ہوئے ہجوم نے تمسخر آمیز نظروں سے اُس کی طرف ٹکٹکی لگائی ــ چلتی ہوئی سائیکلیں رک گئیں۔ سوار اُتر پڑے ــ اسکوٹروں کے شور میں آہستگی سی آگئی۔ اِدھر اُدھر کے لوگ یوں بھاگے جیسے سرکس کا شو نکلا جا رہا ہو۔

کُھلے میدان میں سورج کی شفاف روشنی پھیل چکی تھی ــ صبح کی تازہ ہوا کے جھونکے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر پوری طاقت سے چلّایا ــ

"یہ میرا شیر جوان ــ پاکستان"ــ اُس نے سیدھی کھڑی ہوئی سُرخ اینٹوں کی طرف اشارہ کیا ــ جن کی رنگت کی سُرخی سے ظاہر ہوتا تھا جیسے اُسی وقت بھٹے میں سے باہر نکال لی گئی ہوں۔

ہا ہا ــ ہا ہا ــ اُس نے اپنے جبڑے کھول کر ایک قہقہہ لگایا ــ گیدڑ گھات لگانے آیا تھا ــ بُزدل ــ ہونہہ ــ نیا زمانہ آیا ــ یارو ــ نیا زمانہ ــ ہا ہا ــ ہا ہا ــ ہا ہا ــ

وہ دیوانوں کی طرح قہقہے لگا رہا تھا۔ اُس کی کٹی ہوئی ٹانگ اپنے لکڑی کے غلیل نما فریم میں سے نکل نکل پڑتی تھی ــ وہ منہ کے بل گرتے گرتے سنبھلتا ــ اُس کے سر پر رکھی ہوئی پچکی سی فیلٹ اُچھل اُچھل کر دور جا گرتی ــ وہ لپک کر اسے اٹھاتا ــ اس کے جیکٹ کپڑوں کی دھجیاں ہوا میں بکھر رہی تھیں۔ اور بڑھی ہوئی داڑھی میں غلیظ کف کی پھوار برس رہی تھی۔

"پاگل ہوگیا ہے بے چارہ ــ ہا"۔ کھڑے ہوئے لوگوں میں سے ایک نے ہمدردی سے کہا۔

"میں پاگل نہیں ہوں"۔ وہ طیش میں آکر دھاڑا ــ کون کہتا ہے کہ میں پاگل ہوں"۔ اُس کی آواز ایکدم دردناک ہو کر پھٹ گئی ــ "جنگ ہو رہی ہے ــ ہندوستان پاکستان کی ــ گیدڑ شیر کو للکارنے آیا ہے ــ حرامزادہ منہ کی کھائے گا"۔

تماشائی بڑے شوق سے اگلے واقعہ کا انتظار کرنے لگے۔

"لو ــ اس نے ایک بڑے بازیگر کی طرح پورے اعتماد سے لکڑی کے فریم پر ڈٹ کر پاکستان کے مورچے کو بھرپور طاقت سے اپنی دوسری ٹانگ سے لڑھکا دیا"۔ آیا میرا شیر جوان ــ آگیا ــ آگیا"۔ پھر وہ اچھل کر للکارا ــ "گیدڑ کے بچے بھاگ ــ بھاگ جا ــ چھپ جا ماں کی گود میں"۔

پکّی اینٹیں کھڑکھڑاتی ہوئی بڑے زوروں میں ایک دوسری پر گریں ــ جیسے سچ مچ فوجوں کی یلغار ہو رہی ہو ــ کچھ اینٹوں کا بھارتی مورچہ چشم زدن میں ڈھیر ہو گیا۔

جیوا قہقہے لگا رہا تھا ــ آسمان سر پر اٹھا رہا تھا ــ جب ہنستے ہنستے اور کھانستے کھانستے بے حال ہو گیا تو اُس نے بڑے ادب سے اپنے سر پر رکھی ہوئی پُرانی فیلٹ اتار کر پاکستانی مورچے کو جھک کر سلام کیا ــ اور زور زور سے بے سُری اڑانے لگا ــ

"فوج کو سلام ــ پاک فوج کو سلام"ــ

اس کی آواز میں ساری محبت ــ سارا خلوص اُمنڈ آیا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان تین لفظوں میں وہ ڈوب کر اُبھر رہا ہے ــ اُس کی زندگی ــ اُس کی کائنات ــ اُس کی دُنیا اور خود اُس کا وجود اِن ہی لفظوں میں سمٹ کر رہ گیا ہے ــ

وہ ناچ رہا تھا ــ سلیوٹ پہ سلیوٹ کر رہا تھا ــ ایک ٹانگ پر اُچھل رہا تھا۔ تماشائیوں میں جوش اُمنڈ آیا۔ ایک گونجتی ہوئی آواز کُھلے میدان کے کناروں سے ٹکرائی ــ

نعرۂ ــ تکبیر ــ

اللہ اکبر ــ

نعرۂ ــ حیدری ــ

یا علی ــ

دور دور تک تکبیر اور توحید کے نعروں کی گونج کُھلے سمندر کی شوریدہ سر چٹانوں کی طرح سربلند ہوتی رہی ــ

جیوا پل بھر کو ہوش میں آیا ــ اپنے گرد کھڑے ہوئے ہجوم کو دیکھ کر حیران رہ گیا ــ یہ سب کیا تھا؟ ــ کیوں تھا ــ؟ کس لئے تھا؟ ہندوستان ــ پاکستان کی لڑائی ہو رہی تھی ــ پھر ــ؟

تماشائی نعرے لگاتے ہوئے ایک ایک کر کے بکھرنے لگے تو وہ پکار کر کہنے لگا "رک جاؤ — میرے پیارو — ذرا دم لو — تم نے ابھی سیالکوٹ کا محاذ تو دیکھا ہی نہیں۔"

لوگوں نے قدم روک لئے —

"ابھی جنگ ختم نہیں ہوئی — دو دو ہاتھ پھر سے ہوں گے۔"

اِس کے بعد وہ اینٹوں پر پل پڑا — اُس نے پختہ اینٹوں کے نیچے سے خستہ اینٹوں کو نکالا — اُنہیں ایک ایک کر کے پوری طاقت سے کوٹ کوٹ کر ریں بجری بنا دیا جیسے وہ اٹھارہ برس کا انتقام ایک ہی سانس میں لئے جا رہا ہو —

"یہ لے — اور لے — منہ کی کھا — کھا لے — آیا تھا دعوا بولنے — سالا کا یار۔"

اُس کے کٹے ہوئے ہاتھ کی کلائی لہولہان ہو رہی تھی — چربی اُدھڑ آئی تھی۔ اور وہ دانت بیس بیس کر بے قابو ہوا جا رہا تھا۔

تماشائیوں کے دل بڑھ گئے تھے۔ ایک بار پھر سب کے قدم جم چکے تھے۔ اس کھیل میں ایک انوکھا لطف — ایک عجیب سکون چھپا ہوا تھا۔ پاکستانی مورچے کی اینٹیں پھر سے جم کر کھڑی ہو چکی تھیں۔ بھارت کے زخمی بزدل چن چن کر دور میدان کے باہر کٹی ہوئی لاشوں کی طرح ڈھیر ہو رہے تھے۔ جیوا ہر کنکر کو بڑی نفرت سے دور اچھالتا۔ ایک قہقہہ لگاتا — اُس کی کلائی کے خون سے ہر اینٹ رنگی جا رہی تھی — جس کی اُس کو مطلق پروا نہ تھی۔ ذرا سی دیر میں وہ سینہ تان کر کھڑا ہو گیا — اس نے سر سے ہیٹ اُتار کر سیلوٹ کیا — پاکستانی مورچے کے قریب تعظیم سے جھکا — پھر ایک بھرپور لات جما کر ریلا دیتے ہوئے چلایا —

"آ گئے — میرے شیر جوان — ہو گیا — ہو گیا — بھارت کا دھڑن تختہ۔"

ایک ایک کر کے کچی اینٹوں کا صفایا ہو رہا تھا —

"چلو یار — چلتے ہیں۔" ایک نے سائیکل سنبھالی —

تماشائیوں میں سے ایک نے جماہی لی — "پاگل ہو گیا ہے۔ کمبخت ..."

"پاگل نہیں — جذبہ ہے — جذبہ۔"

چھن — چھنا — چھن — ٹھن — جیوا کے المونیم کے کٹورے میں ہجوم کی طرف سے ریزگاری برس رہی تھی۔

"بابو صاحب — بابو جی — بس کرو — بس۔" اُس نے اپنا کٹا ہوا بازو ہوا میں لہرایا۔ "میں آج خیرات نہیں لوں گا۔ بھائی صاحب — مجھے کچھ نہیں چاہئے۔"

اس نے اپنا ہاتھ نیچے گرا دیا۔

"آج میں بھکاری نہیں ہوں — آپ کے جیسا ہی ایک مسلمان ہوں — جو اپنے حق کے لئے لڑے گا۔"

لوگ اُس کی بات پر ہنس دیئے — کچھ منہ پھیر کر چل دیئے

اُس نے بڑی شان سے اپنے سر پر فیلٹ رکھ لی — دھوپ تیز ہو رہی تھی — دیکھتے ہی دیکھتے صبح کا سورج اُونچا ہو چلا تھا۔ اُس کے پیروں تلے زمین بھی گرم ہو رہی تھی — اُس کے بدن پر پسینے کی ننھی ننھی چیونٹیاں رینگ رہی تھیں — اُس نے اپنا پیالہ اٹھایا۔ انکار کے باوجود اُس میں ریزگاری جمع ہو چکی تھی — لکڑی کے ٹانگ کے سہارے گرتا پڑتا وہ اپنے نٹ پاتھ کی طرف چل دیا — راستے میں سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر اس نے اپنے ڈھیلے ڈھالے کُرتے کا دامن پھاڑ کر اپنی رِستی ہوئی کلائی پر پٹی باندھی — نل کی ہلکی بہتی ہوئی دھار سے ہتھیلیاں بھگو کر اپنے منہ کو صاف کیا — ان اٹھارہ برس میں اس نے کبھی ڈھنگ سے مُنہ بھی نہیں دھویا تھا — نہ آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کا چھینٹا دیا تھا —

اُسی غلیظ دامن سے وہ اپنا مُنہ پونچھ کر آگے بڑھا —

شہر میں معمول کے مطابق بڑی رونق تھی — گلی کوچوں میں غیر معمولی گہما گہمی تھی — حلوائیوں کے یہاں زور شور سے مٹھائیوں کے تھال سجتے تھے — پھل والوں کے یہاں جیسے خوانچوں میں باڑھ لگی تھی تازہ پھلوں کی — من چلوں کی ٹولیاں اِدھر سے اُدھر منڈلاتی پھرتی تھیں — کچھ دنوں سے اُس نے یہ محسوس کیا تھا جیسے ہر شخص جوان ہو گیا ہے۔ نہ بچے اب بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں — نہ بوڑھے اپنے بڑھاپے کی شکایت سُناتے ہیں — جنگ اور توپوں کے دھماکوں کے باوجود

ہر دل میں ایک نیا جوش ہے ــ نیا ولولہ ہے ــ اور بات بات میں سبھی فولاد ہوئے جا رہے ہیں ــ

" ہندو کی ماں تو یوں ہی مرے گی ــ یہ بھی اچھا ہے "

اُس نے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے سوچا ــ

" چُپ رہو تو سالا سر چڑھتا ہے ــ چٹکی سے جھاڑ کر مسل دو تو ــ راکھ ہے ــ نری راکھ " ــ

" جیوا ــ اے جیوا ــ جیوا خاں " پھولوں والی گلی کے نکڑ سے عاشق اپنا پان سگریٹ کا خوانچہ چھوڑ کر بھاگا آیا ــ

" صبح سے کہاں رہے " ؟

" ایں ؟ " وہ چونک گیا ــ

عاشق اپنا کان سہلاتے ہوئے مسکرایا " آج تو ڈھیر لگ گئے بھارت کی کٹی پتنگوں کے ــ پر سالا اب بھی رٹ لگا رہا ہے ــ کشمیر کی "

" کتے کی دم ہے ــ حرامی "

" لے ــ سگریٹ لے " عاشق نے ڈبیہ جیب میں سے آگے بڑھائی ــ

" نہیں ــ یار ــ رہنے دے "

" کیوں "

" آج میں سگریٹ نہیں پیوں گا "

" آخر کیوں "

" بس ــ یونہی " وہ اپنے حسابوں مجاہد ہو رہا تھا ــ سگریٹ کے ہلکے کش میں چھپے ہوئے پاکستان اور راستی کے وجود کو اپنے ذہن میں مسلط کرنے سے اُس کا گریز وطن دوستی کا اظہار تھا ــ

" اچھا ــ تیری مرضی " عاشق نے دھواں اپنے ہونٹوں سے پھونک کر اُڑایا ــ اُس کے نتھنے پھڑک رہے تھے ــ " جان سے جلے گا ــ پر کشمیر نہیں چھوڑے گا "

" اُس کا باپ بھی چھوڑے گا " جیوا نے فضا میں دیکھتے ہوئے کہا ــ

اِن دنوں فٹ پاتھ پر کشمیر کا مسئلہ روشترک بنا ہوا تھا اتنی سیاسی بیداری تو الیکشن کے ہنگاموں میں بھی کبھی نہیں آئی تھی فجے قصائی کا لڑکا روز ڈھائی آنے کا اخبار خرید کر اونچی آواز سے پڑھتا تھا۔ اُس کے گرد اُس سڑک کا ہر بچہ اور رجبان موجود ہوتا ــ بڑی بڑی خبروں کی تفصیل کے ساتھ ساتھ وہ سینما کے اشتہار ــ زنانہ اور مردانہ بیماریوں کے تذکرے ــ اور تلاش گمشدہ کے اعلان بھی بڑی اہمیت سے سنا تا تھا ــ دن میں پانچ چھ مرتبہ رمضانی حلوائی کے تھڑے پر رکھے ہوئے ریڈیو کی کھڑکھڑاہٹ میں خبروں کی سرگرمی دور دور سے راہگیروں کو کھینچ لاتی تھی ــ موتی مسجد کے امام صاحب ہر جمعے کو جہاد کا بیان لاؤڈ اسپیکر میں چنگھاڑتے تھے۔ جناب حجام کا بلیٹن قینچی کی کھٹا کھٹ میں ملتا تھا ــ فٹ پاتھ کے تبصروں کی دُنیا سب سے الگ تھی ــ بلیک آؤٹ کے اوقات میں اپنے سر کے نیچے غلیل نما لکڑی کا فریم تکئے کی طرح رکھ کر وہ بہت کچھ سوچا کرتا تھا ــ کشمیر اور مسلمانوں کی جدوجہد کے تانے بانے جوڑتا رہتا تھا۔ اندھیرے ہی میں لاکھوں ہندوؤں کی فوج گاجر مولی کی طرح کٹ کر رہ جاتی تھی ــ اور جب وہ صبح کو سو کر اٹھتا تھا تو وہ اٹھارہ برس پہلے کا جیوا نہ ہوتا تھا ــ وہ فولاد کے دریا میں ڈوب کر نکلنے والا فولادی جیوا ہوتا ــ جو اپنی ایک ٹانگ اور ایک بازو سے اپنے وطن کے سارے دکھ درد دور کرنے کا عزم رکھتا تھا ــ

" اِتنی دیر سے میں تجھے ڈھونڈ رہا تھا ــ اور جب ملا تو پھر کھو گیا " عاشق نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا ــ " کیا سوچ رہا ہے ــ کشمیر فتح کر رہا ہے ــ ؟ "

" نہیں نہیں " ــ وہ جھینپ کر ہنسا ــ پھر آہستہ سے بولا ــ " جی تو یہی چاہتا ہے کہ ایک پھونک میں ہندو کی فوج اُڑا دوں "

" پر اپنی فوج نے کیا کم اُڑائی ہے " ؟

فوج کا نام سنتے ہی جیوا نے بے اختیار سر پر رکھی ہوئی ٹوپی اُتار کر سلیوٹ کیا ــ اور پھر زور سے خوش ہو کر بولا " فوج کو سلام ــ پاک فوج کو سلام " ــ

عاشق کے دل میں گدگدی سی اٹھی ــ ایک عظمت کے احساس سے جیسے اس کا دل بھر گیا ــ پھر وہ اچانک جیوا کا ہاتھ

دبا کر بولا — "اپنے وہ ہیں نا — ماسٹر معصوم دین"

"ہاں"

"اُن کے یہاں آج بڑا جلسہ ہو رہا ہے — بس جلدی چل۔ میں جب بھی تو تجھے سویرے سے ڈھونڈھ رہا تھا"

"تو نے پہلے کیوں نہ بتایا"

"تو اب جو بتا رہا ہوں"

"چل — پھر — آ"

جیوا نے وہیں کھڑے کھڑے ریزگاری اپنی ہتھیلی پر اُلٹ کر گن لی — سوا روپیہ بنا تھا۔ عاشق کے خوانچے کے قریب جا کر وہ کہنے لگا "بڑھیا سگریٹ ہوں گے تیرے پاس"

"آں — ہاں"

"سوا روپے والے" — بگلا اور لال بتی کے سگریٹ تو وہ روز ہی پیتا تھا — آٹھ دس آنے سے آگے کبھی نہیں بڑھا تھا — اس لئے عاشق حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگا۔

"عیاشی کرے گا؟"

"نہیں بس — تو مجھے سوا روپے والی ڈبیہ ہی دیدے"

وہ بے صبری سے بولا۔ اور ایک جھٹکے میں اپنی ساری ریزگاری اُس کے خوانچے پر اُلٹ کر اپنی کلائی پر بندھی پٹی کو نوچنے لگا جو خون سے بھر چکی تھی۔

"یہ کیا کر لیا تو نے؟" عاشق گھبرا گیا۔

ہندو کو ٹھکانے لگا کے آیا ہوں —

عاشق نے بے وقوفوں کی طرح اُس کی طرف دیکھا۔ "کہاں مل گیا تجھے ہندو کا دانہ"

"ملتا کہاں — یہیں آیا تھا چوری کرنے — سو دیکھ — میں نے دو دو ہاتھ دیئے کہ حلوہ ہو گیا —

جیوا نے ایک فاتحانہ انداز سے عاشق کو بتایا۔ پھر اُس کی انگلیوں میں رکی ہوئی کیپسٹن کی ڈبیہ اُچک کر اپنے سینے سے لگی جیب میں اڑستے ہوئے بولا —

"یار — اگر ایک بار مجھے فوج میں کوئی بلالے تو اپنے سارے ارمان پورے کر لوں"

"تو جائے گا — فوج میں؟" عاشق اُس کی کٹی ہوئی ٹانگ کو دیکھ کر تمسخر سے مسکرایا۔ "ارے چھوڑ"

"نہیں یار — خدا قسم — اگر ضرورت پڑی تو دیکھ — جیوا یہاں گولی کھائے گا — یہاں" اُس نے اپنے سینے پر انگلی رکھی — "ہندو سالے کے مقابلے میں اگر مسلمان کو جیوا کی ایک ٹانگ اور ایک بازو کی بھی بازی چاہئے ہوگی تو وہ دے گا — ضرور دے گا"

عاشق ایک دم جوش میں آگیا "میں تیرے ساتھ ہوں گا جیوا — تیرے دم کے ساتھ" — جیوا نے گہری نظر سے اُس کی طرف دیکھا — پھر بے اختیار چلایا "ڈھے — ہند — ڈھے — ہند — ڈھے — ہند"

چیختے چیختے اس کا گلا بیٹھ گیا — لمحہ بھر کو اُس نے سوچا — کہیں وہ پاگل تو نہیں ہو گیا۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط نکلا — وہ اپنے حواس میں تھا — اُس کے دل کے زخم اندر ہی اندر پھوٹ نکلے تھے جن کے زور سے وہ اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے اپنے چھپے ہوئے درد کی تازگی سے کرتا ہے — اگر اٹھارہ برس پہلے اُسے ہندو کی بربریت کا سامنا نہ ہوتا تو شاید پاکستان پر ہندوستان کے بزدلانہ حملے کی واردات پر اُس کا ردِ عمل اپنی شدت کا اظہار کسی اور صورت میں کرتا —

اُس نے اپنی لکڑی کی ٹانگ سنبھالی — اچھلتا لنگڑاتا پھولوں والی گلی کی تنگ و تاریک نم آلود فضا میں سے گزر کر پرائمری اسکول کے احاطے میں جا کھڑا ہوا —

احاطے میں رنگ برنگ جھنڈیاں لگی تھیں — زرد اور سرخ بانات کے سائبان تلے دری بچھی تھی جس پر نوجوان بیٹھے تھے — دری کے آخری کنارے سے کرسیوں کی قطاریں شروع ہو جاتی تھیں۔ پنڈال کے دائیں طرف پیپل کے پھیلے ہوئے درخت کے سائے میں کچھ کاروباری قسم کے لوگ کھڑے تھے۔ اردگرد کی دو منزلہ اور سہ منزلہ عمارتوں کی کھڑکیوں میں عورتیں اور جوان لڑکیاں پردہ گرائے کھڑی تھیں — جلسہ بہت دیر ہوئی شروع ہو چکا تھا — ماسٹر معصوم دین لکڑی

کے اسٹیج پر کرسی میز رکھے ۔۔ ایک تختۂ سیاہ پر ہندوستان پاکستان کا نقشہ لٹکائے ۔ اچکن کے بٹن کھولے بڑی مستعدی سے ہانپ رہے تھے ۔۔

جیوا نے دور سے اُن کے تمتمائے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ پھر بڑے عزم سے آگے بڑھا۔ اور کرسیوں کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

"میرے عزیز ہم وطنو" ماسٹر معصوم دین نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے نوجوانوں کو اُس ہانپتی کانپتی مگر جوش سے بھری ہوئی آواز میں مخاطب کیا۔ "میں نے ابھی آپ کو بتایا ہے کہ ۔ گولیوں سے آزادی کی آواز گھٹ نہیں سکتی ۔ کشمیر ۔۔ ہماری زندگی اور موت کا مسئلہ ہے ۔۔ ہم متحد ہو کر اپنے کشمیری بھائیوں کی آزادی کے لئے ہر قسم کی قربانی دیں گے"۔

"بے شک ۔۔ بے شک"۔

"ضرور ضرور" سامعین نے اتحاد کا اعلان بیک زبان ہو کر کیا۔

"ہم حق پر ہیں ۔۔ اور حق کا سدا بول بالا ہوا ہے" ماسٹر معصوم دین اتنی اونچی آواز میں گرجے کہ اُن کی آواز پھٹ کر دو رنگی ہو گئی ۔

"سچ کہتے ہو پیارے" ۔ ایک منچلا ہلکی سی آواز میں بولا ۔

ماسٹر معصوم دین اسی آواز پر چونکے ۔ انہوں نے گھور کر اُس کی طرف دیکھا ۔ وہ یوں لڑھکتے لڑھکتے رُکے تھے جیسے تیز رفتار گاڑی کو بریک لگائے گئے ہوں ۔ وہ اپنی حالت پر ذرا سا مسکرائے اور کھکارے تو مجمع میں بے اختیار ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا۔

جیوا نے آخری صف میں سے ایک آہنی فصیل کی طرح کھڑے کھڑے بھری آواز میں نعرہ بلند کیا ۔۔

نعرۂ ۔ تکبیر ۔

اللہ ۔ اکبر ۔

نعرۂ ۔ حیدری ۔

یا ۔ علی ۔

سامعین جوش میں آگئے ۔ سارے کا سارا احاطہ نعروں سے گونج اٹھا ۔ جلسے کی فضا سنبھل چکی تھی ۔ ماسٹر معصوم دین نے جیوا کی طرف رشک بھری نظروں سے دیکھا ۔ پھر اپنے بھاری بدن کو جھٹک کر پینترا بدلتے ہوئے کارروائی کرنے لگے ۔

"ظلم سے کبھی کوئی انصاف کا خون نہیں کر سکتا ۔ دیکھئے ۔ یہاں دیکھئے ۔ تاریخ گواہ ہے کہ ظلم کی ٹہنی کبھی پھل پھول نہیں سکی ۔ دنیا میں انصاف کا نام کبھی مٹ نہیں سکتا ۔

"بالکل ۔ بالکل" ۔

"سچ ہے" ۔

"آج ۔ اگر ہمارے سامنے تاریکی ہے تو انشاء اللہ کل نور کا اُجالا بھی ہوگا ۔ یہ قدرت کا قانون ہے ۔ ہر غم کے بعد راحت ہے ۔ ہر دُکھ کے بعد سُکھ ہے" ۔

جیوا نے چٹان کی طرح اٹل کھڑے کھڑے اس مسئلے کی تائید میں سر ہلایا ۔ پھر اُس کو یقین ہو گیا کہ قدرت نے اُس کے دکھ دور کرنے کا سامان فراہم کیا ہے ۔ آج اُس ہنگامی دور میں وہ اٹھارہ برس کے بعد اپنا انتقام لے گا ۔

اُس کے پیٹ میں ایک ہلکا سا بل پڑا ۔ بھوک کی جنگ ہو رہی تھی ۔ اس کے دل میں سگریٹ کے ایک لمبے کش کی طلب موجزن تھی ۔

اُس نے ایک عزم کے ساتھ اپنے بدلتے ہوئے خیالات کو جھٹک کر ذہن سے گرا دیا ۔ اُس کے وطن کو محض تخیلی پہلوانوں اور اسٹیج کی مطلق ضرورت نہیں تھی ۔ اگر ضرورت تھی تو جیوا کی ۔ اُس کے اکلوتے بازو ۔ اور ٹانگ کی ۔ اُس نے اپنے کان اسٹیج کی طرف لگا دیئے ۔

ماسٹر معصوم دین اب سہ رنگی آواز میں چیخ رہے تھے ۔ ایک زوردار مکا اپنی میز پر مار کر وہ چلائے "خدا کے یہاں دیر ہے ۔ اندھیر نہیں ۔ مایوسی بہت بڑا گناہ ہے ۔ حق کا بول بالا ہوگا ۔ ضرور ہوگا" ۔

"انشاء اللہ" نوجوان بیک زبان بولے ۔

"اسلام کی فتح ہوگی ۔ ضرور ہوگی ۔ مگر اس فتح کے لئے ہمیں اپنی قوم کو تیار کرنا ہوگا ۔ آگ میں کود پڑنے کے لئے ہر ایک کو کمربستہ

رہتا ہو گا۔

نعرۂ تکبیر —

اللہ اکبر — ایک زوردار ہر گونج اٹھی — اور جیوا کی آواز سب سے اونچی تھی —

ماسٹر معصوم دین نے بڑے فخر سے سر اونچا کیا۔ اُن کی نظروں میں بڑا زبردست چیلنج تھا "ہم ظلم سہیں گے — ہم اپنے لہو کا آخری قطرہ تک اپنے وطن کی سرزمین پر نچھاور کر دیں گے کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ اس ظلم کے پیچھے کیا ہے — انعام ہے میرے پیارے بھائیو — اور عزیز ہم وطنو" اُن کی آواز ایک تاثر بکھیرتی ہوئی مدھم پڑ گئی — ماتھے پر تفکرانہ انداز میں شکنیں نمودار ہوئیں۔ وہ اپنے پھیلتے ہوئے ہونٹوں کو سکیڑتے ہوئے بولے —

"اور وہ انعام کیا ہے؟ — میں پوچھتا ہوں کہ وہ انعام کیا ہے —؟"

ایک اور زوردار گھونسہ میز پر پڑا — وہ پوری آواز میں دہاڑے "وہ انعام کشمیر ہے — ہمارا کشمیر — ہم سب کا کشمیر — میرا آپ کا — ہمارے آباؤ اجداد کا کشمیر"۔

"سرزمین کشمیر" — مجمع میں کوئی بے تابانہ چلایا —

زندہ — باد —

پاکستان —

پائندہ — باد —

مجمع میں زبردست ہلچل ہوئی۔

ماسٹر معصوم دین نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے — "عوام کو بے چین ہونے سے روک کر وہ پھر سے اپنی آواز کے زیر و بم میں اُچھلے" آج ہماری فوجوں نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ ایک آہنی فصیل ہے — دُنیا کی کوئی طاقت اس کے مقابلے پر ٹھہر نہیں سکتی"

"پاک فوج"

"زندہ — باد"

"پاک فوج"

"پائندہ — باد"

سامنے کا سارا احاطہ بے تاب ہو کر گونج رہا تھا۔ پیپل پر رُکے ہوئے پرندے ایک ایک کرکے اُڑ گئے — مکانوں کے چھجوں اور بالکنیوں میں کھڑی ہوئی عورتیں اور لڑکیاں خوش ہو رہی تھیں — حوصلے بڑھ رہے تھے — ولولہ تازہ تھے — عزم جوان تھے —

جیوا کا دل جوش سے بھر گیا — اُس نے جھٹ اپنی فیلٹ سر سے اتار کر ایک سیلوٹ کیا۔ وہ کھڑے کھڑے تھک گیا تھا۔ وہ بیٹھنا بھی نہیں چاہتا تھا — اس لئے وہ اونچی آواز میں "پاک فوج کو سلام — پاک فوج کو سلام" گاتا ہوا گلی سے باہر نکل آیا —

ایک ٹانگ کے سہارے گرتا پڑتا جب وہ اسٹیشن پر پہنچا تو شام ہو رہی تھی۔ اُس کے کانوں میں ماسٹر معصوم دین کا ایک ایک لفظ گونج رہا تھا —

"آزادی خون مانگتی ہے"

"آج کشمیر جلیانوالہ باغ ہو گیا ہے"

"اپنے وطن عزیز کی خاطر ہم اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے"

"ہمیں اپنی زمین کے ایک ایک ذرّے سے محبت ہے"

"یہاں کی ہواؤں — یہاں کے اونچے پیڑوں — یہاں تک کہ ملبے کے ڈھیروں سے عشق ہے —"

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی بھٹی میں سے تپ کر نکلا ہو — اس کا سانس پھیپھڑوں میں رک رہا تھا۔ موٹروں — جیپوں — گاڑیوں اور ٹرکوں کی روانی کا اُسے سڑک پر بھی احساس نہیں ہوا تھا — اُس کی نظروں میں ماسٹر معصوم دین تھا — اور کانوں میں اُس کی پاٹ دار آواز تھی —

نعروں اور تکبیروں کی گونج سے جھلکتا ہوا وہ ایک بار پھر معصوم دین کی آواز سے اُلجھ کر ٹکرایا۔

"ہمیں اپنی جان — اپنے مال — اپنی عزیز ترین متاع کی قربانی دے کر اپنی شاندار روایات اور وقار کو برقرار رکھنا ہو گا"

"ہم جہاد کریں گے — جہاد — اسلام کے لئے"

"کشمیر کے لیے"۔

"اسلام ــــ زندہ باد"۔

ایکدم جیسے جیوا کی آنکھ کھل گئی۔ گاڑی پلیٹ فارم پر آچکی تھی۔ سانولی شام کی ہلکی ہلکی ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی۔ دائیں بائیں ڈھلتی ہوئی دھوپ کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ اِس چھوٹے سے اسٹیشن پر وہ اٹھارہ برس سے بلا ناغہ آتا تھا۔ رات ڈھلے تک یہاں کے بکنگ آفس کے سامنے چکنے اور ہموار فرش پر بیٹھا رہتا تھا۔ گاڑیاں آتی تھیں۔ جاتی تھیں۔ مسافر اُترتے چڑھتے رہتے تھے۔ مگر اُس کو کسی سے کوئی غرض نہ تھی۔ کبھی کبھار کوئی مسافر اُس کے ڈبے میں دو چار آنے پھینک جاتا تو وہ اُسی کو غنیمت سمجھ کر اٹھا لیتا۔ اُس نے گڑگڑا کر کبھی سوال نہیں کیا تھا۔ کسی سے کچھ مانگا نہیں تھا۔

لیکن اُس چھوٹے سے اسٹیشن اور معمولی سے پلیٹ فارم پر ڈولتے لنگڑاتے اچانک اُس کے ذہن میں یہ سوال اُبھرا۔ "وہ یہاں کیوں آیا ہے"؟

وہ کسی کو رخصت کرنے یا کسی کا استقبال کرنے نہیں آیا تھا۔ اُسے کہیں جانا نہیں تھا۔ مگر پھر بھی۔ ایک لگن اسے وہاں روزانہ کھینچ کر لے آتی تھی۔ وہ یہاں آنے کے لئے مجبور تھا۔ ایک موہوم سی امید اُسے یہاں آنے پر اکساتی تھی ــــ کیا خبر۔ کبھی بھاماں ان ظالموں کے چنگل سے بچ کر ادھر آنکلے۔ وہ اُسے ایک نظر میں پہچان لے۔ اپنی آنسو بھری مسکراہٹوں سے اُس کی ویران دُنیا میں ایک بار پھر رنگین بہاروں کو سجا دے ــــ

لیکن بھاماں کبھی نہیں آئی ــــ وہ روزانہ وہاں آتا تھا۔ اور یہاں آنا اس کا معمول بن چکا تھا۔

اب دو دن سے اسے اس بات کا شدید احساس تھا کہ جنگ زوروں پر ہے ــــ فوجیوں کی گاڑیاں اسی اسٹیشن پر آتی ہیں ــــ یہیں سے جاتی ہیں۔ ان فوجیوں میں بہت سے اسکے ہوتے ہیں۔ اُس کی بھاماں جیسی ماؤں کے لال ہوتے ہیں ــــ جن کے بازوؤں میں بجلی اور سینوں میں ایمان کی دولت بھری ہوتی ہے۔ وہ دشمن سے کبھی نہیں ڈرتے۔ گولی کھاتے بھی ہیں تو اپنی کڑیل چھاتی کے فولاد پر۔

پلیٹ فارم پر روز کی طرح ریڑھیاں تھیں ــــ خوانچے تھے۔ چائے والے تھے۔ سوڈا لیمن بیچنے والوں کی آوازیں تھیں ــــ وہ اضطراب کے عالم میں ہر شخص کے قریب جا کھڑا ہوتا ــــ ہر چہرے کو غور سے دیکھتا ــــ کوئی اس کی طرف سے بے نیاز کھڑا رہتا ــــ کوئی اس کو متوقع جواب "جاؤ بابا ــــ معاف کرو" کہکر اپنا منہ پھیر لیتا ــــ لیکن اسے کسی بات کی بھی پروا نہیں تھی ــــ بار بار اُس کے دل میں سگریٹ کا ایک زوردار کش لگانے کی خواہش مچل اٹھتی۔ پیٹ میں زور سے بل بھی اٹھتا ــــ لیکن وہ ایک انوکھے جذبے میں ڈوبا ہر راہگیر کے ساتھ تھوڑی دور تک چلتا ــــ اس سے بات کہنے ــــ کچھ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ــــ مگر پھر ناکام ہو کر واپس آجاتا ــــ

انجن کی سائیں سائیں تیز تر ہو رہی تھی۔ سفید وردی اور سبز جھنڈی والا گارڈ ایک ڈبے میں سے کود کر اترا ــــ اُس نے پلیٹ فارم پر کھڑے ٹکٹ کلکٹر سے جھک کر سرگوشی میں کچھ کہا ــــ پھر دونوں دور تک ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے پلیٹ فارم پر دور تک نکل گئے ــــ

"چائے والا"۔ فوجیوں سے بھرے ہوئے ڈبے میں سے کسی نے آواز دی۔ جیوا کے پاؤں بندھ گئے ــــ وہ جہاں کھڑا تھا وہیں رک گیا ــــ اس کا بے اختیار جی چاہا کہ اس آواز پر قربان ہو جائے۔ پلیٹ فارم پر اپنے کندھے پر ٹرے سجائے ایک بیرا آواز سُنے بغیر دوسرے فوجی ڈبوں کی طرف چلا گیا۔ اس نے شاید یہ آواز سنی نہیں ــــ

"دو چائے"۔ ایک فوجی دھم سے پلیٹ فارم پر کود گیا ــــ اس کے ساتھیوں نے اُس سے کھڑکی میں کھڑے ہو کر کچھ کہا ــــ پھر دھم ــــ دھم ــــ تین چار فوجی باہر نکل آئے ــــ

جیوا انہیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ اُسے ایکدم محسوس ہوا جیسے اس کی منزل قریب آگئی ہے۔

چائے کا آرڈر دینے کے بعد فوجی جب واپس اپنے ڈبے کی طرف بڑھا تو وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس کے سینے میں زبردست ہلچل سی ہو رہی تھی۔ وہ جلدی سے اُچھل کر اس کے قریب پہنچا۔

" بابوجی ۔۔ اے بابوجی "

فوجی نے ایک قدم گاڑی کے پائدان پر رکھا۔ پھر اُسے گہری نظر سے دیکھا۔

" بابوجی ۔۔ ایک بات ۔ صرف ایک بات سُن لو "

فوجی نے جلدی سے اپنی جیب ٹٹولی تو وہ بے اختیار منّت بھری آواز میں گڑگڑایا " میں آج خیرات نہیں لوں گا۔ میں آپ سے کچھ بھی نہیں لوں گا "

جوان نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ گھبراہٹ اور اضطراب کے عالم میں اپنے سینے سے لگی جیب پر ہاتھ مارتے ہوئے کچھ نکالنے لگا۔ اُس نے ایک نظر فوجی کے ماتھے پر دیکھا "آپ لام پر جاؤ گے بابوجی" ؟

فوجی نے اُسے پاگل سمجھ کر نیچے سے اوپر تک تیز نظروں سے دیکھا۔

جیوا کا دل غم سے بھر آیا۔ کون جانے اس بابوجی کا بھی ننھا سا آسٹی پلنگڑی میں سویا ہوگا۔ اس کی بھاماں کھڑکی میں کھڑی اُداس نظروں سے راہ تکتی ہوگی۔ سگریٹ کے ایک بے کش میں برستے گولوں اور توپ کے دھماکوں میں بابوجی کے لئے بھی گھر کا سہانا وجود سمایا ہوگا۔

" یہ لیجئے ۔ اسے اپنے پاس رکھ لیجئے۔ بابوجی۔ خدا کے لئے ۔ رسول کے لئے " ۔ جیوا کا سارا خلوص ۔ ساری محبت اس کی آواز میں سمٹ آئی۔

فوجی کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر کیپسٹن کی ڈبیہ ایک لمحے گراکر وہ ایک منٹ کی دیر کئے بغیر اپنی لکڑی کی ٹانگ پر اُچھلا ۔ اُس نے اپنے سر سے پھٹی ہوئی ہیٹ اتار کر زبردست سلیوٹ کیا۔

گارڈ کی سیٹی کی زوردار گونج فضا کو چیرتی ہوئی نکل گئی ۔ گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ ڈبے کو ذرا سا جھٹکا لگا تو فوجی ایک فاتحانہ انداز میں لپک کر سوار ہوا پھر کھڑکی میں سے جھانک کر اُسے دیکھتے ہوئے زور سے ہنسا۔

وہ ایک نظر جیوا کے دل کو گرما گئی ۔ وہ مارے خوشی کے پاگل ہو گیا۔ جیسے اسے اپنی منزل کا پتہ مل گیا ہو۔ اس نے بھارت کا مورچہ ایک ہاتھ سے اکھیڑ پھینکا ہو ۔ اور کشمیر پر پاکستانی پرچم لہرا رہا ہو۔

بڑی ترنگ میں آکر وہ پورے جوش میں اُونچی آواز سے گانے لگا:

فوج کو سلام ۔ پاک فوج کو سلام "

لیکن وہ پاگل نہیں تھا۔

بقیہ: حوا (بسلسلہ صـ ۱۹)

تھا۔ اس نے حوا کو خنجر دے کر کہا کہ ابھی ہمارے سامنے نادیا ٹھاکر کو مار ڈال۔ حوا نے خنجر اٹھا کر اپنے ہی سینے میں گھونپ لیا اور وہیں ڈھیر ہو گئی۔ ہومڑا کا جوش انتقام اور بڑھ گیا۔ اور اس نے ایک ہی وار میں نادیا ٹھاکر کی گردن اڑا دی۔ اس طرح دو محبت کرنے والی روحیں بیک وقت فضا میں پرواز کر گئیں۔ ہومڑا اور اس کے ساتھی اپنی نادانی پر پچھتائے، مگر مہر و وفا کے یہ پیکر دنیاوی بندھنوں سے آزاد ہو چکے تھے۔

حوا کی داستان محبت کے اندوہناک انجام کو صدیاں بیت گئیں۔ مگر آج بھی پڑھنے والے اپنے آنسوؤں کے سیلاب کو مشکل سے ضبط کر سکتے ہیں۔

رستم علی خاں

سُہاگ

۲۳ر فروری ۱۹۶۳ء کو جب میں ملتان سے جہانیاں پہنچا تو میری بیوی نے سوال کیا "ڈاکٹر نے کیا مرض تشخیص کیا ہے۔؟"

"ایک ڈاکٹر کی رائے ہے کہ ہائی بلیڈ پریشر ہے۔ دوسرے ڈاکٹر نے کہا ہے کہ یہ ایک ذہنی عارضہ ہے۔ آپ کو کسی ذہنی امراض کے ماہر سے رجوع کرنا چاہیئے۔"

"آپ دیر نہ کیجئے کل ہی لاہور یا کراچی"۔۔۔ میری بیوی کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن میں نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "میں نے ایک خط محترم شاہد احمد صاحب مدیر ساقی کو کراچی لکھا ہے۔ اُس خط کا جواب آنے کے بعد میں اپنے جانے کا کوئی فیصلہ کروں گا۔۔۔۔"

۳ر مارچ ۱۹۶۳ء کو جب میں بیٹھک سے گھر پہنچا تو میری بیوی نے مجھے ایک خط دیتے ہوئے کہا "لیجئے شاہد احمد صاحب کا خط آگیا ہے، وہ ذہنی امراض کے ماہر کا پتہ چلانے کے بعد پھر آپ کو لکھیں گے۔ اب آپ جلد لاہور جائیے، دیر نہ کیجئے"۔ میں نے اپنی بیوی کی بات اَن سُنی کرکے شاہد احمد صاحب کا خط پڑھنا شروع کر دیا۔ خط میں لکھا تھا:

"آپ کا ۲۳ر فروری کا خط ملا آپ کی علالت کی کیفیت سُنکر بیحد رنج ہوا۔ یقیناً یہ ایک ذہنی بیماری ہے۔ ذہنی امراض کا ماہر یہاں یا لاہور میں ضرور کوئی نہ کوئی ہوگا میں یہاں کسی کا پتہ چلانے کی کوشش کروں گا پھر آپ کو لکھوں گا اللہ کے فضل سے آپ اچھے ہو جائیں گے یہ کوئی ناقابل علاج مرض نہیں ہے"۔

"خط وکتابت کو رہنے دیجئے، خدا کے لئے آپ جلدی لاہور یا کراچی جائیے گا۔ آپ محسوس نہیں کرتے۔ میں جانتی ہوں کہ جس وقت آپ کی طبیعت بگڑتی ہے اُس وقت آپ کا کتنا بُرا حال ہوتا ہے"۔۔ میں شاہد احمد صاحب کا نصف خط پڑھنے پایا تھا کہ میری بیوی نے یہ الفاظ کہہ کر اُس خط سے میری توجہ ہٹا دی۔ "اگر میرا وقت آگیا ہے تو کیا لاہور کراچی کے ڈاکٹر مجھے موت کے مُنہ سے بچا لیں گے؟" میرے یہ الفاظ سُنکر میری بیوی رونے لگی۔ اُس کے رُخساروں پر آنسو بُری طرح بہہ رہے تھے "یاد رکھنا عائشہ میں عورت کے آنسو زیادہ دیر دیکھنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ عورت کے آنسو میری سب سے بڑی کمزوری ہیں"۔

"خدا کے لئے آپ اپنا دِل میلا نہ کریں کیونکہ آپ بیحد حسّاس اور اعصابی مریض ہیں۔ میں آپ کی بات پر نہیں روتی مجھے تو اِس وقت اچانک اپنی سہیلی جمیلہ کے سہاگ اُجڑنے کا غیر معمولی واقعہ یاد آگیا اُس المناک واقعہ کی یاد سے میرا دل پھٹا جاتا ہے۔ میں اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہتی ہوں۔ مجھے جی بھر کر رو لینے دیجئے"۔ یہ الفاظ عائشہ نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہے۔

"نہیں میں تمہیں رونے نہیں دوں گا۔ تم جمیلہ کے سہاگ اُجڑنے کا وہ غیر معمولی واقعہ بیان کرو جو اِس وقت میری موت کے تصور سے تمہارے ذہن میں اُبھر رہا ہے۔ اس واقعہ کے اظہار سے یقیناً تمہیں قلبی سکون حاصل ہوگا"۔ عائشہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر جمیلہ کے سُہاگ اُجڑنے کا قصّہ یوں بیان کیا، "ہمارے مکان کے قریب ہی جمیلہ کا مکان تھا۔ میں عمر میں جمیلہ سے کئی سال چھوٹی ہوں۔ لیکن جمیلہ

چائے کا آرڈر دینے کے بعد فوجی جب واپس اپنے ڈبے کی طرف بڑھا تو وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس کے سینے میں زبردست ہلچل سی ہو رہی تھی۔ وہ جلدی سے اُچھل کر اس کے قریب پہنچا۔

"بابو جی ۔۔ اے بابو جی"۔

فوجی نے ایک قدم گاڑی کے پائدان پر رکھا۔ پھر اُسے گہری نظر سے دیکھا۔

"بابو جی ۔۔ ایک بات ۔ صرف ایک بات سُن لو"۔

فوجی نے جلدی سے اپنی جیب ٹٹولی تو وہ بے اختیار منّت بھری آواز میں گڑگڑایا۔ "میں آج خیرات نہیں لوں گا۔ میں آپ سے کچھ بھی نہیں لوں گا"۔

جوان نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا ۔۔ وہ گھبراہٹ اور اضطراب کے عالم میں اپنے سینے سے لگی جیب پر ہاتھ مارتے ہوئے کچھ نکالنے لگا۔ اُس نے ایک نظر فوجی کے ماتھے پر دیکھا "آپ لام پر جاؤ گے بابو جی"؟

فوجی نے اُسے پاگل سمجھ کر نیچے سے اوپر تک تیز نظروں سے دیکھا ۔۔

جیوا کا دل غم سے بھر آیا۔ کون جانے اس بابو جی کا بھی ننھا سا اسّی پلنگڑی میں سویا ہوگا ۔۔ اس کی بھاماں کھڑکی میں کھڑی اُداس نظروں سے راہ تکتی ہوگی ۔ سگریٹ کے ایک لمبے کش میں برستے گولوں اور توپ کے دھاکوں میں بابو جی کے لئے بھی گھر کا سہانا وجود سمایا ہوگا۔

" یہ لیجئے ۔ اسے اپنے پاس رکھ لیجئے۔ بابو جی۔ خدا کے لئے ۔ رسول کے لئے"۔ جیوا کا سارا خلوص ۔ ساری محبت اس کی آواز میں سمٹ آئی۔

فوجی کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر کیپسٹن کی ڈبیہ ایک ثانیے کو آکر وہ ایک منٹ کی دیر کئے بغیر اپنی لکڑی کی ٹانگ پر اُچھلا ۔۔ اُس نے اپنے سر سے جھکی ہوئی ہیٹ اُتار کر زبردست سلیوٹ کیا۔

گارڈ کی سیٹی کی زوردار گونج فضا کو چیرتی ہوئی نکل گئی ۔ گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ ڈبے کو ذرا سا جھٹکا لگا تو فوجی ایک فاتحانہ انداز میں لپک کر سوار ہوا۔ پھر کھڑکی میں سے جھانک کر اُسے دیکھتے ہوئے زور سے ہنسا ۔۔

وہ ایک نظر جیوا کے دل کو گرما گئی ۔ وہ مارے خوشی کے پاگل ہو گیا۔ جیسے اسے اپنی منزل کا پتہ مل گیا ہو۔ اس نے بھارت کا مورچہ ایک ہاتھ سے اکھیڑ پھینکا ہو ۔۔ اور کشمیر پر پاکستانی پرچم لہرا رہا ہو۔

بڑی ترنگ میں آکر وہ پورے جوش میں اُونچی آواز سے گانے لگا:

فوج کو سلام ۔۔ پاک فوج کو سلام"۔

لیکن وہ پاگل نہیں تھا۔

بقیہ: مہوا (سلسلہ صـ ۱۹)

تھا۔ اس نے مہوا کو خنجر دے کر کہا کہ ابھی ہمارے سامنے نادیا ٹھاکر کو مار ڈال۔ مہوا نے خنجر اٹھا کر اپنے ہی سینے میں گھونپ لیا اور وہیں ڈھیر ہو گئی۔ مہوڑا کا جوش انتقام اور بڑھ گیا۔ اور اس نے ایک ہی وار میں نادیا ٹھاکر کی گردن اڑا دی۔ اس طرح دو محبت کرنے والی روحیں بیک وقت فضا میں پرواز کر گئیں۔ مہوڑا اور اس کے ساتھی اپنی نادانی پر پچھتائے، مگر مہر و وفا کے یہ پیکر دنیاوی بندھنوں سے آزاد ہو چکے تھے۔

مہوا کی داستانِ محبت کے اندوہناک انجام کو صدیاں بیت گئیں۔ مگر آج بھی پڑھنے والے اپنے آنسوؤں کے سیلاب کو مشکل سے ضبط کر سکتے ہیں۔

رستم علی خاں

سُہاگ

۲۳ر فروری ۱۹۶۳ء کو جب میں ملتان سے جہانیاں پہنچا تو میری بیوی نے سوال کیا۔ "ڈاکٹر نے کیا مرض تشخیص کیا ہے۔؟"
"ایک ڈاکٹر کی رائے ہے کہ ہائی بلیڈ پریشر ہے۔ دوسرے ڈاکٹر نے کہا ہے کہ یہ ایک ذہنی عارضہ ہے۔ آپ کو کسی ذہنی امراض کے ماہر سے رجوع کرنا چاہیئے۔"

"آپ دیر نہ کیجیئے کل ہی لاہور یا کراچی"۔۔۔ میری بیوی کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "میں نے ایک خط محترم شاہد احمد صاحب مدیر ساقی کو کراچی لکھا ہے۔ اُس خط کا جواب آنے کے بعد میں اپنے جانے کا کوئی فیصلہ کروں گا۔۔۔۔"

۴ر مارچ ۱۹۶۳ء کو جب میں بیٹھک سے گھر پہنچا تو میری بیوی نے مجھے ایک خط دیتے ہوئے کہا "لیجئے شاہد احمد صاحب کا خط آگیا ہے، وہ ذہنی امراض کے ماہر کا پتہ چلانے کے بعد پھر آپ کو لکھیں گے۔ اب آپ جلد لاہور جائیے، دیر نہ کیجئے"۔ میں نے اپنی بیوی کی بات ان سُنی کرکے شاہد احمد صاحب کا خط پڑھنا شروع کردیا۔ خط میں لکھا تھا:

"آپ کا ۲۳ر فروری کا خط ملا آپ کی علالت کی کیفیت سُنکر بیحد رنج ہوا۔ یقیناً یہ ایک ذہنی بیماری ہے۔ ذہنی امراض کا ماہر یہاں یا لاہور میں ضرور کوئی نہ کوئی ہوگا۔ میں یہاں کسی کا پتہ چلانے کی کوشش کروں گا۔ پھر آپ کو لکھوں گا۔ اللہ کے فضل سے آپ اچھے ہوجائیں گے یہ کوئی ناقابل علاج مرض نہیں ہے"۔

"خط و کتابت کو رہنے دیجئے، خدا کے لئے آپ جلدی لاہور یا کراچی جائیے گا۔ آپ محسوس نہیں کرتے۔ میں جانتی ہوں کہ جس وقت آپ کی طبیعت بگڑتی ہے اُس وقت آپ کا کتنا بُرا حال ہوتا ہے۔"۔۔ میں شاہد احمد صاحب کا نصف خط پڑھنے پایا تھا کہ میری بیوی نے یہ الفاظ کہہ کر اُس خط سے میری توجہ ہٹادی۔ "اگر میرا وقت آگیا ہے تو کیا لاہور و کراچی کے ڈاکٹر مجھے موت کے مُنہ سے بچالیں گے؟" میرے یہ الفاظ سُنکر میری بیوی رونے لگی۔ اُس کے رُخساروں پر آنسو بُری طرح بہہ رہے تھے۔ "یاد رکھنا عائشہ میں عورت کے آنسو زیادہ دیر دیکھنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ عورت کے آنسو میری سب سے بڑی کمزوری ہیں"۔

"خدا کے لئے آپ اپنا دل میلا نہ کریں کیونکہ آپ بیحد حسّاس اور اعصابی مریض ہیں۔ میں آپ کی بات پر نہیں روتی مجھے تو اس وقت اچانک اپنی سہیلی جمیلہ کے سہاگ اُجڑنے کا غیر معمولی واقعہ یاد آگیا۔ اُس المناک واقعہ کی یاد سے میرا دل پھٹا جاتا ہے۔ میں اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہتی ہوں۔ مجھے جی بھر کر رو لینے دیجئے"۔ یہ الفاظ عائشہ نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہے۔

"نہیں میں تمہیں رونے نہیں دوں گا۔ تم جمیلہ کے سہاگ اُجڑنے کا وہ غیر معمولی واقعہ بیان کرو جو اس وقت میری موت کے تصوّر سے تمہارے ذہن میں اُبھر رہا ہے۔ اس واقعہ کے اظہار سے یقیناً تمہیں قلبی سکون حاصل ہوگا۔" عائشہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر جمیلہ کے سُہاگ اُجڑنے کا قصہ یوں بیان کیا: "ہمارے مکان کے قریب ہی جمیلہ کا مکان تھا۔ میں عمر میں جمیلہ سے کئی سال چھوٹی ہوں۔ لیکن جمیلہ

میری جیتی سہیلی تھی۔ جمیلہ کی شادی عالمی جنگ کے زمانے میں سلیمان نامی ایک نوجوان سے ہوئی تھی۔ سلیمان فوج میں ملازم تھا۔ شادی کے ایک ماہ بعد سلیمان کی رجمنٹ جرمن فوجوں کے مقابلہ میں لبیا کے فرنٹ پر بھیجدی گئی۔ اب میں جمیلہ سے محض سلیمان ہی کا ذکر سنتی تھی۔ اس ذکر کے سوا اُس کے پاس اور کوئی بات نہ تھی۔ جمیلہ کے دل میں سلیمان کی یاد بُری طرح سمائی ہوئی تھی۔ فراق کی آگ نے اُس کے قلب و دماغ کو کچھ ایسا ماؤف کیا تھا کہ اُسے ہر لمحہ سلیمان کے گرد انجانی موت کے بھیانک سائے رقصاں نظر آتے تھے۔ "کاش، عائشہ! اُن پر آنے والی آفت ٹل جائے"۔ اِن الفاظ کے ساتھ ہی جمیلہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"جمیلہ اسے محبت نہیں کہتے کہ اپنے رفیقِ حیات کے بارے میں بلاوجہ بُرے شگون لئے جائیں۔ دوسرے ہمارے سماج میں اپنے شریکِ حیات کے لئے عورت کو رونے کی اجازت کب ہے؟ ہمارے قصبہ کے ہزاروں نوجوان محاذِ جنگ پر ہیں۔ اگر اُن سب کی بیویاں تمہاری طرح رونا شروع کر دیں تو پھر قصبہ میں ایک کہرام مچ جائے"۔ میرے یہ الفاظ سُن کر جمیلہ شربت کے گھونٹ کی طرح آنسو پی گئی اور میرے آگے ندامت سے اُس کا سر جھک گیا۔ اب وہ مجھے ملتی تو اکثر خاموش رہتی کیونکہ اُس کے پاس سلیمان کی پُراسرار ہمدردی کے سوا اور کوئی الفاظ نہ تھے اور میں نے اُن الفاظ کو طنز کا نشتر چبھو کر اُس کے سینہ میں دفن کر دیا تھا۔ ایک روز صبح کے وقت جمیلہ میرے پاس آئی۔ اُس صبح وہ بہت زیادہ مغموم تھی۔ وہ گھنٹوں میرے سامنے مظلومیت کی تصویر بنی بیٹھی رہی۔ مجھے خیال گزرا کہ دیکھو قدرت کے کھیل بلاوجہ کے تفکرات اور بدگمانی نے جمیلہ کے چہرے کی شگفتگی اور رعنائی کیسے چھین لی۔ بے ساختہ میرے مُنہ سے نکلا "جمیلہ تو ولی نہیں ہے جو تجھے مستقبل کا حال معلوم ہو، یہ محض تیرے خیالات ہیں جنہوں نے تجھے اس قدر پریشان کر رکھا ہے"۔ "عائشہ تو کم عمر اور غیر شادی شدہ ہے، تو نہیں جانتی کہ شادی شدہ لڑکی کو اپنے سُہاگ سے کس قدر پیار ہوتا ہے۔ مانو نہ مانو عنقریب میرا سہاگ لٹنے والا ہے۔ پیاری بہن اِس دُنیا میں تنہا ایک تو میری رازدار ہے لیکن ایک بات ایسی ہے کہ اُس بات کو تمہارے سامنے کہتے ہوئے کبھی میرا کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ ایک روز صبح صادق کے وقت میں نے ایک ایسا بھیانک خواب دیکھا کہ اُس ہیبت ناک خواب کو میں بیان کرنے کی جرأت نہیں رکھتی۔ کاش مجھے وہ خواب نظر نہ آتا"۔ اتنا کہنے کے بعد جمیلہ کی آنکھوں میں اُمڈے ہوئے آنسو چھلک پڑے۔

"بس اتنی سی بات تھی جس کو تو نے رائی کا پہاڑ بنا دیا۔ خوابوں کو حقیقت کا رُوپ دینا اس سے بڑی دیوانگی اور کیا ہو سکتی ہے؟" میں کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن جمیلہ نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "عائشہ اسے خواب نہ کہو جس نے میرے دل کی گہرائیوں میں گھس کر اور مجھے اندر ہی اندر جلا کر کوئلہ بنا دیا ہے"۔ یہ الفاظ کہہ کر جمیلہ حزن و ملال کا مجسمہ بنی ہوئی میرے پاس سے اُٹھ کر اپنے گھر چلی گئی۔ میں دیر تک سوچتی رہی کہ جمیلہ کی اس پُراسرار پریشانی کا سبب کیا ہے، ورنہ خواب و خیال تو دن رات آتے ہی رہتے ہیں۔ اگر خواب و خیال کو اہمیت دی جائے تو انسانی زندگی اجیرن ہو جائے۔ وقت گزرتا گیا اور جمیلہ اندر ہی اندر سُلگتی رہی۔ ایک روز میں کچھ مغموم تھی کیونکہ عرصہ سے میرے بڑے بھائی کرنل لیاقت علی خاں، جو اُن دنوں کپتان تھے اور سمندر پار محاذِ جنگ پر گئے ہوئے تھے، وہاں سے اُن کا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ ہمارے بزرگوں نے بھی عجیب پیشہ اختیار کیا ہے۔ اپنے وطن اور اپنے مذہب کے لئے نہیں بلکہ محض فرنگیوں کے لئے دُنیا کے میدانوں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ ساتھ ہی مجھے جمیلہ اور سلیمان کا خیال آیا۔ اُسی لمحہ باہر سے ایک لڑکی نے آکر مجھے بتایا کہ میدانِ جنگ سے سلیمان کا خط آیا ہے۔ سلیمان اور ترقی کر گیا ہے۔ یہ فرحت بخش خبر سُن کر مبارک باد پیش کرنے میں جمیلہ کے گھر گئی۔ جمیلہ کی ماں بعید مسرور تھیں لیکن جمیلہ پر حسبِ معمول وہی موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے ہنس کر اُسے مبارک باد پیش کی۔ مجھے ہنستے دیکھ کر وہ مصنوعی طور پر مسکرائی اور پھر اُس مسکراہٹ کے ساتھ ہی اُس کی آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے بھر گئے۔

"پگلی کہیں کی۔ خوشی کے دن بھی روتی ہے؟" میں نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"عائشہ جو خواب میں نے دیکھا تھا یہ اُس کا آغاز ہے، انجام ابھی باقی ہے۔" اتنا کہنے کے بعد جمیلہ کی آنکھوں کے آنسوؤں سے بھرے ہوئے کٹورے چھلک پڑے۔ اُسے روتا دیکھ کر میں بھی رو پڑی اور پھر میں شکستہ دل اپنے گھر چلی آئی۔ اُس رات سوچوں نے میرے ذہن کی چولیں ہلا ڈالیں، کبھی خیال آتا کیا واقعی سلیمان کے دشمنوں کو کچھ ہو جائے گا؟ نہیں خدا نہ کرے ایسا ہو۔ جمیلہ احساسِ محبت سے اعصاب زدگی کا شکار ہو چکی ہے۔ اُس کے ذہن کا معقول علاج ہونا چاہئے۔ وقت گزرتا گیا مگر جمیلہ اندر ہی اندر سُلگتی رہی۔ میں مطمئن تھی کہ اور کچھ نہیں ہے محض، جمیلہ کے قلب و جگر سلیمان کی محبت سے معمور ہیں، وہ آجائے گا تو یہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔ یہ فقط سلیمان کے فراق میں دیوانی ہو گئی ہے۔ اُف خدایا! اتنے عرصہ بعد آج بھی جب مجھے جون ۱۹۴۴ء کی ایک دوپہر کا وقت یاد آتا ہے تو میں کانپ اٹھتی ہوں۔ اُس تپتی دوپہر میں اچانک میرے کانوں نے یہ روح فرسا خبر سُنی کہ محاذِ جنگ پر ریل کی پٹڑی کے نیچے جرمنوں نے بم چھپا دیئے اور جب اتحادیوں کی گاڑی آئی تو ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ گاڑی کے دو ڈبے چکنا چور ہو گئے۔ اس المناک حادثہ میں اتحادیوں کے اسّی فوجی ہلاک اور دس جوان زخمی ہوئے۔ اُن زخمیوں کی فہرست جمیلہ کے رفیقِ حیات سلیمان کا نام بھی درج ہے۔ سلیمان کی دائیں ران کی ہڈی گاڑی کے ملبے تلے دب کر چکنا چور ہو گئی ہے۔ یہ سُن کر میں پسینہ میں شرابور ہو گئی۔ میرا تمام جسم برف کی مانند سرد پڑ گیا۔ جس خواب کی تفصیلات جمیلہ مجھے بتلانے کی ہمت نہ رکھتی تھی اب اُس خواب کے خوف سے میرا تمام بدن لرز رہا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جن انسانوں میں زیادہ پیار ہوتا ہے۔ انہیں قدرت خواب کے ذریعہ اُن کے مستقبل سے آگاہ کر دیتی ہے یا یہ اتفاق ہے۔ بے ساختہ میرے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے۔ میں جمیلہ کے گھر نہ گئی کیونکہ جمیلہ کو دیکھنے کی اب مجھ میں تاب نہ تھی اور میں نے اپنی ماں سے صاف کہہ دیا کہ خدارا میرے سامنے جمیلہ کے متعلق اب کوئی کسی قسم کی بات نہ کرے۔ کاش میں جمیلہ کو صبر سے کام لینے کی تلقین کر سکتی۔ وقت بیتتا گیا مگر میں اور جمیلہ کئی ماہ تک نہ مل سکے۔ کیونکہ اس حادثہ کے بعد اُس کی زندگی میں کچھ ایسی شکر رنجی اور تلخیاں پیدا ہو گئی تھیں کہ میں محض جمیلہ کو ایک نظر دیکھنے کے خیال تک سے لرز اٹھتی تھی۔ پھر ایک روز سُنا کہ سلیمان صحت یاب ہو کر سمندر پار سے آگیا ہے۔ لیکن اُس کی داہنی ٹانگ بے کار ہو چکی ہے اور اب وہ لکڑی کی بیساکھی کے سہارے چلتا پھرتا ہے۔ جانے کیوں اب جمیلہ سے ملنے کی میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی۔ پھر ایک روز میں ڈرتی ڈرتی جمیلہ کے گھر گئی۔ اُس وقت کمرے میں جمیلہ چارپائی پر اور سُلیمان کُرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہیں کُرسی کے سہارے لکڑی کی بیساکھی رکھی تھی۔ جب میں جمیلہ کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی تو سلیمان بھیّا نے کہا۔ "عائشہ بہن، جمیلہ کو سمجھاؤ کہ خدا کی مرضی پر صبر سے کام لے۔ یہ دُکھ سے بھری دُنیا ہے۔ اِس دنیا میں ہزاروں انسان ہم سے بھی زیادہ دُکھی ہیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے آپ کی جاں بخشی کر دی۔ اب دھیرے دھیرے جمیلہ کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔" یہ الفاظ کہتے وقت میری نگاہ سلیمان بھیّا کی بیساکھی پر پڑی۔ اور پھر میری آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔ جمیلہ پہلے ہی آبدیدہ تھی۔

"عائشہ بہن میں ٹھیک ہوں، بس عنقریب میری ٹانگ کاٹی جائے گی کیونکہ میری ران کی ہڈی کی کرچیوں میں پیپ پڑ گئی ہے۔ ٹانگ کٹنے کے بعد میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔ کیا ایک ٹانگ کے انسان کے لئے دُنیا اپنے دروازے بند کر دے گی؟ اِس دنیا میں بغیر ٹانگ بغیر ہاتھ اور بغیر آنکھوں کے انسان بھی لاکھوں ہیں۔" سلیمان بھیّا کے اِن الفاظ نے کانوں سے گزر کر میرے دل میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ اُس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے سینے میں تیز آندھی نے گھُس کر میرے قلب و جگر کو معطل کر دیا ہے۔ پھر میں وہاں نہ رُک سکی اور اپنے گھر آگئی۔ میں سوچ رہی تھی کہ جمیلہ کی کہانی کس قدر دردناک اور ڈرامائی منظر سے گزر رہی ہے، اور دیکھئے آئندہ اس المناک کہانی کا انجام کیا ہوگا۔ پھر میں کئی روز جمیلہ سے نہ مل سکی اور پھر ایک دن یہ سُنا کہ سلیمان بھیّا اپنی رجمنٹ کے انگریز کرنل کے حکم سے دہلی ملٹری ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ میں ہمت کر کے جمیلہ کے پاس گئی اور اُسے تسلی تشفی دی لیکن داغدار دل میں کب سکون ہوتا ہے؟ وہ رو پڑی اور پھر سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔

"عائشہ، میں بڑی بدقسمت ہوں۔ کاش ٹانگ کٹنے کے بعد وہ زندہ رہیں" جمیلہ کے یہ فیصلہ کن الفاظ سُنکر میں لرز گئی۔ کیونکہ [illegible] کے نزدیک سلیمان بھیا کی موت یقینی تھی۔ پھر دس روز بعد خبر آئی کہ سلیمان بھیا کی ٹانگ کٹ گئی ہے اور وہ خوش وخرم ہیں۔ پھر اگلا دن۔ اُف توبہ اس دن کو میں کبھی نہ بھولوں گی۔ شام کا وقت تھا۔ میں اور جمیلہ صحن میں بیٹھے تھے۔ سورج دھیرے دھیرے مغرب میں اُترتا جارہا تھا۔ یکایک آندھی آگئی۔ اُس آندھی کو غروب ہوتے ہوئے سورج کی شفق نے لہو کا سا رنگ دیدیا تھا۔ اُس سُرخ رنگ نے فضا میں عجیب وحشت پیدا کردی۔ آندھی کے شور کے ساتھ یکلخت دروازے پر موٹر کے ہارن کی آواز سُنائی دی، ساتھ ہی بہت سے لوگوں کے آپس میں باتیں کرنے کا شور سُنائی دیا۔ اور جمیلہ کے باپ کے پیچھے فوجی وردی میں ملبوس کچھ لوگ ایک لکڑی کے صندوق کو اپنے کندھوں پر اُٹھائے دروازے میں داخل ہوئے۔ "یہ کیا ہے؟" شدید گھبراہٹ میں جمیلہ کی ماں نے پوچھا۔

"سلیمان کی لاش ہے۔ آج صبح اچانک ہارٹ فیل ہوکر یہ اپنے خدا سے جاملا ہے"۔ اتنا کہہ کر جمیلہ کے باپ نے اپنی آنکھوں کو رومال سے چھپالیا۔ ساتھ ہی جمیلہ کے ہاتھوں کی چوڑیاں توڑدی گئیں۔ اُس کا سہاگ لُٹ گیا اور اُس کی حسرتیں پامال ہوگئیں۔ اب وہ ایک میلی سی چادر میں لپٹی ہوئی ناکامی ومحرومی، پژمردگی وافسردگی کی دل ہلادینے والی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ مجھ میں اُس تصویر کو زیادہ دیر دیکھنے کی تاب نہ تھی۔ میں اس ماتم کدہ میں حسرت وآرزو کے مدفن کو رونے کی دردناک چیخ پُکار کے بیچ تنہا چھوڑ کر اپنے گھر آگئی۔ میں اُس کا ساتھ نہ دے سکی۔ کاش وہ خواب حقیقت کا روپ دھار کر ایک صنفِ نازک کے کلیجے کو ریزہ ریزہ نہ کرتا"۔

یہ داستانِ حقیقت ختم کرکے عائشہ میرے سامنے بلک بلک کر رونے لگی۔ جمیلہ کے سوز وگداز بے کسی اور بے بسی کی یہ المناک داستان سُنکر میں بھی آبدیدہ ہوگیا۔ انسانی زندگی گوناگوں صفات کی حامل ہے۔ غم آتا ہے۔ خوشی چلی جاتی ہے، پھر خوشی آتی ہے تو غم چلا جاتا ہے، پھر غم آتا ہے تو دل کے تمام پرانے زخم ہرے ہوجاتے ہیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ جمیلہ کی یہ دردناک کہانی سُنکر میرے دل کا زخم ہرا ہوجائے گا۔ یکلخت خیالات کے ملبے تلے سے نکل کر میرے ذہن میں ایک تصویر اُبھری۔ ساون کا مہینہ تھا۔ آسمان پر اُودی اُودی سی گھٹائیں چھا رہی تھیں اور من موہنی ہوا کے ساتھ ہلکی ہلکی پھواریں پڑ رہی تھیں، ان ہلکی پھواروں میں میرے چچا کے گھر جھولا پڑا ہوا تھا، پکوان اُتر رہا تھا، اور محلے کی تمام لڑکیاں جھول رہی تھیں۔ ساون کی یہ تقریب میری چچیری بہن زبیدہ کی آمد کے سلسلے میں تھی۔ زبیدہ کی شادی کو چار ماہ گزرے تھے اب وہ سُسرال سے اپنے گھر آئی ہوئی تھیں۔ اُن دنوں میری عمر دس سال کے لگ بھگ تھی۔ گیتوں کی لَے پر لڑکیاں جھول رہی تھیں اور میں اور میرا چچیرا بھائی باورچی خانہ کے دروازے میں کھڑے گرم گرم کچوریاں کھارہے تھے۔ عجیب خوشی تھی، کمال شادمانی تھی۔ یکایک رنگ میں بھنگ پڑگیا۔ خوشی اور شادمانی دلدوز چیخ پکار میں بدل گئی۔ ہم دالان میں پہونچے، وہاں بہن زبیدہ کے ہاتھ کی چوڑیاں پھوڑی جارہی تھیں۔ عجیب کربناک منظر تھا۔ "یہ کیا ہوا؟" رونے کی آواز سُنکر آنے والی عورتوں نے پوچھا۔ موضع منڈا ور ریاست الور سے ابھی ایک آدمی آیا ہے، وہ کہتا ہے کہ رسالدار راؤ محمد آباد خاں کا لڑکا بابو یعنی بہن زبیدہ کا شریکِ حیات گولی لگنے سے ہلاک ہوگیا ہے۔ بابو مردانہ وجاہت کا نمونہ اور سیر وشکار کا بڑا رسیا تھا۔ وہ اپنے چند فوجی دوستوں کے ہمراہ منڈاور کے پہاڑوں میں شکار کھیلنے گیا اور وہاں دو ہرن شکار کرنے کے بعد کسی معمولی بات پر اُن دوستوں کے درمیان جھگڑا ہوگیا۔ پھر گولیاں چل گئیں۔ بابو اور ایک نوجوان وہیں موقع پر ہلاک ہوگئے۔ خون میں لت پت پھر دونوں کی لاشیں منڈاور لائی گئیں۔ یہ تمام زخم ہرے تھے کہ دھیرے دھیرے وقت گزرتا گیا اور پھر ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کا دن آگیا۔ اُس دن بغیر اعلان جنگ کئے چور اُچکوں کی طرح بھارتی حکومت نے پاکستان پر حملہ کردیا۔ بھارت کے چیف آف اسٹاف جنرل چودھری نے جس نے حیدرآباد دکن اور گوا کے نہتے عوام پر پولیس ایکشن کرکے اُن معصوموں کا خون بہایا تھا اس مرتبہ پاکستان کو فتح کرنے کے ارادہ سے خاموشی کے ساتھ حد بندی لائن کو توڑ دیا اور اسی لمحے بھارتی وزیر دفاع چوان نے پارلیمنٹ میں لاہور فتح ہونے کا اعلان کردیا، لیکن جب

پاکستان کی جانباز اور بہادر فوجوں نے جنرل چودھری کی پیش قدمی کو روکا تو انہیں چھٹی کا دودھ یاد آگیا اور لاہور فتح کرنے کا خیال محض خیالی پلاؤ نظر آنے لگا۔ برہمن سامراج نے بغیر اعلان جنگ کئے جو پاکستان پر حملہ کیا یہ دُنیا کی واحد مثال ہے۔ کیونکہ کسی ملک کا حریف ملک پہ چوری چھپے حملہ کرنا بزدلی اور بیحد باعث شرم ہے۔ جنگ جاری تھی، ہمارے جانباز ہر محاذ پر دشمن کو ناک چنے چبوا رہے تھے مجھے اپنا چچازاد بھائی عبدالرشید بہت یاد آیا کاش وہ اب بھارتی سامراجیوں کے مقابلہ میں لڑکر شہید ہوتا، مگر افسوس تین سال پہلے وہ ایک دن اپنا ٹینک صاف کر رہا تھا اُس کے کپڑے پٹرول میں بھیگ گئے۔ اور جب وہ آگ کے پاس سے گزرا تو کپڑوں میں آگ لگ گئی اور وہ آگ جان لیوا ثابت ہوئی۔ پھر فوجی گاڑی میں اُس کی لاش ہمارے گھر آئی۔ .. ..

.. .لاش کے ساتھ اُس کی شریک حیات بھی تھی جس کا سُہاگ لُٹ گیا اور وہ ہمارے خاندان ہی کی لڑکی ہے۔ اب وہ لڑکی میرے سامنے آتی ہے تو دِل پر دھکا سا لگتا ہے اور وہ منحوس دن آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتا ہے جس دن رشید کی لاش کے ساتھ اپنے لٹے ہوئے سُہاگ کو لئے ہوئے وہ بدقسمت لڑکی فوجی گاڑی سے اُتری تھی۔ کاش عبدالرشید کو پہلے موت نہ آتی اور اب ہمیں تار ملتا کہ رشید نے فلاں محاذ پر دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کرلیا ہے۔ ۱۹ ستمبر ۱۹۶۵ء کا دن بھی ہمارے لئے بہت اذیت ناک تھا۔ اُس روز صبح کے وقت جب میں گھر پہنچا تو تالا لگا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد عائشہ آئی مسلسل رونے سے اُس کی آنکھوں کے حلقے سیاہ پڑ گئے تھے۔ "یہ کیا ہوگیا؟" دُکھ اور درد میں ڈوبی ہوئی اُس کے مُنہ سے ہلکی سی آواز آئی۔

"شادی کو صرف چار مہینے ہوئے تھے۔ آہ۔ آج رات جمیل کی بیوی کا سہاگ لُٹ گیا" یہ الفاظ سُنکر میرے قلب پر ہتھوڑے کی سی ضرب لگی۔ سر چکرا گیا، رات کو میں جنگل میں پہرے پر تھا، مجھے کیا پتہ کہ جمیل احمد کی بیوی کا سہاگ کس طرح لُٹ گیا۔ جمیل احمد میری برادری کا ایک خوش اخلاق، کم گو اور ہر دلعزیز شخصیت کا مالک نوجوان تھا۔ میں نے اپنی ڈائری میں اُس کی غیرمعمولی صفات کا ذکر کیا تھا۔ وہ اخلاق اور بلند کردار میں اپنی مثال آپ تھا اور موجودہ دور میں جمیل احمد کی طرح جو نوجوان فحاشی اور اوباشی سے کنارہ کش رہے ہیں اُسے انسان نہیں بلکہ آسمان سے اُترا ہوا فرشتہ تصوّر کرتا ہوں۔ شکستہ دل کے ساتھ میں جمیل احمد کے گھر پہنچا، بڑا کرب ناک سین تھا۔ زخموں سے چور جمیل احمد کی لاش کو موٹر سے اُتارا جا رہا تھا۔ اُس وقت اُسے دیکھنے کی مجھ میں ہمّت نہ تھی۔ کاش میں حساس نہ ہوتا اور دوسرے لوگوں کی طرح جمیل احمد کے چہرے کا آخری دیدار کر سکتا۔ کاش میں اُس کی زندگی میں کبھی اُسے بتاتا کہ میں تمہیں اس شہر میں سب سے اچھا سمجھتا ہوں، اور کیریکٹر کے لحاظ سے تم بہت بلند اور عظیم ہو، لیکن عظیم لوگ اپنی تعریف سُنکر کب خوش ہوتے ہیں اور اپنی تعریف سُنکر خوش ہونے والے بلند کردار نہیں ہوتے۔ لاش کے ساتھ رسالدار عزیزالدین خاں صاحب جب موٹر سے اُترے تو میں نے اُن سے پوچھا۔ یہ اچانک کیا ہوگیا؟ رسالدار صاحب نے دُکھ میں رندھی ہوئی آواز سے بتایا۔ "رات کو جمیل احمد اور اُس کا عزیز ترین دوست اسلام بھٹی بذریعہ کار لاہور سے آ رہے تھے۔ اُس وقت بلیک آوٹ تھا۔ عارف والا اور ریونڈ والا کے درمیان اُن کی کار ایک جیپ سے ٹکرا گئی۔ جمیل احمد موقع پر ہی خدا کو پیارا ہوا اور اسلام شدید زخمی ہے، اُس کا ایک بازو اور ایک ٹانگ ٹوٹ گئی ہے لیکن وہ اپنے دُکھ اور زخموں سے بے نیاز رو رو کر یہ پکارتا ہے کہ قدرت نے میرے ساتھ وفا نہیں کی۔ اللہ نے میرے دوست کے ساتھ مجھے بھی اٹھا لیا ہوتا۔" یہ الفاظ سُنکر میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔ "آفرین ہے اس بے لوث محبّت پر۔ اسلام بھٹی اور جمیل احمد بچپن کے ساتھی تھے، موت کے آہنی ہاتھ نے سچی محبّت کے رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ جمیل احمد کے باپ اور بھائیوں کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی تھی اور وہ تمام دلدوز مناظر میرا قلم لکھنے سے قاصر ہے۔ تمام محاذوں پر گھمسان کی جنگ جاری تھی، سیالکوٹ سیکٹر پر تو اتنا شدید رن پڑا جس کی مثال ملنی مشکل ہے، ایک غیرملکی مبصّر نے بتایا کہ میں چھبیس سالہ جنگی مبصر ہوں، جنگ عالمگیر کے بعد

ایک دن میں چھ سو ٹینکوں کی جنگ ہوئی۔ جنگ سیالکوٹ سیکٹر کے سوا میں نے اور کہیں نہیں دیکھی۔ محاذِ جنگ اس قدر وحشت ناک اور پرہول تھا کہ غیر معمولی دھماکوں سے کانوں کے پردے پھٹنے لگے اور دل لرز رہے تھے۔ بس آگ اور خون کا ایک وسیع سمندر تھا۔ آفرین ہے اُن بہادر جوانوں پر جو دشمن سے کم تعداد میں ہوتے ہوئے اپنے وطن کی خاطر اس آگ اور خون کے سمندر میں زندگی و موت اور عزت و آبرو کی بازی میں مصروف تھے۔ یہ تو ایک غیر ملکی مبصر کے تاثرات ہیں ورنہ تمام محاذوں پر ہمارے جانبازوں نے جس حُبّ الوطنی اور جوانمردی کا ثبوت دیا اُس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ دشمن کی وہ پٹائی کی کہ اُن کے لاہور اور سیالکوٹ فتح کرنے کے ناپاک ارادے خاک میں مل گئے۔ عائشہ کہتی کہ "شاستری نے بغیر اعلان جنگ کئے پاکستان پر حملہ کیا تو کہا تھا کہ ہمارے ساتھ کوئی نہیں ہے۔ اور اُس وقت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے یہ الفاظ تھے کہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ جب خدا ہمارے ساتھ ہے تو دُنیا کی کوئی شیطانی قوت ہمیں شکست نہیں دے سکتی"۔ عائشہ نماز پڑھ کر اُٹھتی تو یہ الفاظ ضرور دُہراتی اور خدا کے سامنے سجدہ ریز ہو کر وہ دن میں کئی بار روتی۔ اُسے پریشان اور مغموم دیکھ کر میں کہتا "تم بلا وجہ اداس کیوں ہو؟ ہماری فوجیں دشمن کو ہر محاذ پر پسپا کر رہی ہیں۔ جب خدا ہمارے ساتھ ہے تو پھر تمہیں کیا ڈر ہے؟" وہ کہتی کہ "ہم گنہگار ہیں۔ خدا اپنے محبوب کے صدقہ سے ہم گنہگاروں کی مدد کرے اور مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ ظالم اور مغرور دشمن کے ٹینک ہماری سڑکوں پر دندناتے پھریں۔" میں نے کہا "جب تمہیں یہ یقین ہے تو کیوں فکر کرتی ہو؟ کیا تمہیں عزت کی موت مرنے سے ڈر لگتا ہے؟" "خدا جانتا ہے میں بُزدل ہوں لیکن وطن کے لئے مرنے سے نہیں ڈرتی اور مجھے پورا یقین ہے کہ اگر ضرورت پڑی تو ہم پاکستان کے دس کروڑ باشندے اپنی آزادی اور وطن کی آن پر قربان ہو جائیں گے اور پھر دنیا والے یہ کہیں گے کہ پاکستان کے عوام بڑے غیور تھے جنہوں نے غلامی اور شکست قبول نہ کی اور اپنے وطن کی ناموس پر قربان ہو گئے۔" میں نے کہا "عائشہ مرد اور عورت میں یہی تو فرق ہے۔ تم اپنے ختم ہونے کی سوچتی ہو اور میں کہتا ہوں کہ سو فی صدی فتح ہماری ہے اور ہم بھارتی سامراجیوں کے پرخچے اڑا دیں گے۔" شرم سے عائشہ کا سر جھک گیا اور پھر وہ کچھ دیر بعد بولی "فتح تو یقیناً ہماری ہے، میں نے تو اپنے عزم کا اظہار کیا ہے۔" پھر وہ خاموش ہو گئی اور چند لمحہ بعد کہنے لگی۔

"میں نے گھر خط لکھا تھا کہ بھائی صاحب کرنل لیاقت علی خاں عزیز اقرار احمد اور خورشید احمد اور بڑی بھابی کے بھائی کرنل حضور احمد خاں اور میجر علی احمد خاں اور چھوٹی بھابی کے چچا لفٹننٹ کرنل یٰسین خاں اور بھابی کے چھوٹے بھائی کیپٹن سعید اور تمام متعلقین کی خیریت کی اطلاع دیں مگر گھر والوں نے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا۔ آپ بھی عزیز مہدی حسن خاں اور بھائی صاحب راؤ داؤد خاں صاحب کو خط لکھیں کہ وہ بھائی صاحب میجر راؤ تجمل حسین خاں کی خیریت سے مطلع کریں۔ بھائی تجمل حسین خاں تو جنگ سے پہلے سے سیالکوٹ میں ہیں۔ محاذ جنگ سے عزیز صلاح الدین اور عزیز علی مرتضیٰ خاں کا کوئی خط نہیں آیا۔" میں نے کہا "تم پگلی ہو۔ ہم کس کس کو خط لکھیں؟ قوم کے تمام نوجوان محاذِ جنگ پر ہیں اور وہاں لاشوں سے اٹے ہوئے خاک و خون کے سمندر میں بھلا کسے خط لکھنے کی فرصت ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ پاکستان کی تمام فوجیں اپنے خاندان والوں کی طرح ہمیں بیحد عزیز ہیں۔ ہماری تمام فوجیں خدا کے سپرد ہیں وہ جسے چاہے غازی بنائے اور جسے چاہے شہادت دے ہر حال میں ہم اُس کا شکر ادا کریں گے۔" عائشہ بولی "آپ کا فرمان درست ہے خدا گواہ ہے پاکستان کا ہر سپاہی مجھے اپنے حقیقی بھائیوں کی طرح عزیز ہے اور میں بارگاہِ ایزدی میں سب کے لئے یکساں دعا مانگتی ہوں۔ صدر پاکستان نے پاک فضائیہ کے ۱۴ جانبازوں کو ہلال جرأت اور ستارۂ جرأت کے اعزازات دیئے ہیں۔ ہماری فضائیہ نے شجاعت ہمت اور دلیری کا وہ کردار ادا کیا ہے کہ اُن کی تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں مسلح افواج کے کمانڈر میجر جنرل اختر حسین ملک کو ہلالِ جرأت کا اعزاز ملا ہے ۲۱ ۹/۶۵ کو شام کے وقت جب میں گھر پہنچا تو

تو عائشہ نے کہا "مبارک ہو ابھی ریڈیو سے پتہ چلا ہے. بھائی صاحب میجر راؤ تجمل حسین خاں کو ستارہ جرأت کا اعزاز دیا گیا ہے یہ الفاظ سُنکر میں نے خدا کا شکر ادا کیا. جنگ عالمگیر میں کلانور کے جمعدار راؤ عبدالحفیظ خاں نے برطانوی حکومت کا سب سے بڑا تمغہ وکٹوریہ کراس حاصل کیا تھا لیکن وہ تمغہ برطانوی سامراج کی جنگی خدمت کا آئینہ دار تھا. راؤ عبدالحفیظ خاں نے امپھل کے مقام پر غیر معمولی شجاعت جرأت اور جوانمردی کا مظاہرہ کر کے جو اعلیٰ ترین اعزاز حاصل کیا وہ اپنے مذہب اور ملک وملت کی خدمت نہ تھی بلکہ غیر ملکی سامراج کی اطاعت اور خدمت تھی. اس میں شک نہیں کہ راؤ عبدالحفیظ خاں نے اپنی جان پر کھیل کر کلانور کی سابقہ جنگی روایات کو زندہ رکھا مگر اس کے برعکس آج جو ہمارے جانباز بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کر کے اعزازات حاصل کر رہے ہیں وہ اپنے مذہب کے وقار اور اپنے وطن کی آزادی پر مٹنے والے پروانوں کا نذرانہ حقیر ہے. مجھے بہت خوشی ہوئی. زیادہ خوشی اِس لئے ہوئی کہ ہزاروں سال سے کلانور والوں کا پیشہ میدانِ کارزار میں لڑائی لڑنا ہے. کلانور والوں کے آباد اجداد سب سپاہی تھے اور وہ سپاہی سامراجیوں کے لئے جنگی ایندھن کا کام دیتے تھے. لیکن تجمل حسین خاں نے اپنے مذہب اور وطن کی عزت و ناموس کے لئے غیر معمولی جرأت اور شجاعت کا مظاہرہ کیا اور اپنے خاندان کی سپاہیانہ روایات کو برقرار رکھا ہے. عائشہ بولی "صدر پاکستان نے بری فوج کے ۴۲ افراد کو اعزازات دیئے ہیں. میجر جنرل اختر حسین ملک اور بریگیڈیر عبدالعلی ملک دونوں حقیقی اور نامور بھائی ہیں. دونوں بھائیوں کو اُن کے شاندار کارناموں پر ہلالِ جرأت کا اعزاز دیا گیا ہے میجر جنرل ابرار حسین اور بریگیڈیر امجد علی خاں چودھری نے بھی اعلیٰ قیادت کا مظاہرہ کیا. انہیں بھی ہلال جرأت کا اعزاز ملا ہے. کرنل محمد صدیق خاں اور کرنل محمد بشیر خاں اور کرنل محمد شیر بہت سے نام میں بھول گئی جنہیں شجاعت اور دلیری کا مظاہرہ کرنے پر ستارۂ جرأت کا تمغہ ملا ہے. کچھ جانبازوں کو تمغہ جرأت دیا گیا ہے" میں بولا "لفٹنٹ کرنل محمد صدیق خاں موضع الکھ پورہ کے ہیں انہوں نے ابتدائی تعلیم کلانور راجپوت ہائی اسکول میں حاصل کی ہے. اور وہ رسالدار راؤ شیر خاں کے رشتہ دار ہیں. سچ تو یہ ہے کہ بری فوج کے کمانڈر انچیف جنرل محمد موسیٰ خاں فضائیہ کے کمانڈر انچیف ایر مارشل نور خاں اور بحری افواج کے کمانڈر انچیف اے. آر خاں مبارک باد کے مستحق ہیں" عائشہ کہنے لگی "مجھے زیادہ افسوس اس بات پر ہے کہ اعزازات حاصل کرنے والے ہمارے بہت سے جانباز شہید ہو چکے ہیں" یہ الفاظ کہتے وقت عائشہ کی آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے بھر گئے. میں نے کہا "شہادت کی موت پر دوتی وہ زندہ ہیں" میرے یہ الفاظ سُنکر اُس نے اپنے دل کو تھام لیا اور پھر اُس کی آنکھوں کے آنسو بہے نہیں، پلکوں پر لرزنے لگے. اُس کے خیال کو بدلنے کے لئے میں بولا "گلزاری لال نندہ اور اندرا گاندھی نے میدان جنگ کا معائنہ کیا ہے" یہ سُنکر وہ اِس قدر ہنسی کہ اُس کے پیٹ میں بل پڑ گئے. پھر وہ ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولی. کہ "بنیا مرد اور برہمن عورتیں محاذِ جنگ کا معائنہ کرنے لگیں ہیں" تب ہی تو شاستری نے یقین کر لیا کہ بھارتی سیناؤں نے لاہور فتح کر لیا ہے. اِس طرح خیالی طور پر شاستری جی دن میں کئی بار چین پاکستان اور ایشیا کے دوسرے ممالک فتح کرتے ہوں گے. اور جب پاکستان کی بہادر فوجوں کے ہاتھوں اپنی سیناؤں کی شرمناک شکست کا حال سنیں گے تو پھر اُن کے دل کے تمام خیالی رنگ محل ڈھے جائیں گے" میں بولا "شاستری کو پتہ ہے کہ اُن کی فوجوں کا پتلا حال ہے. وہ فتح کی مصنوعی خبریں سُنا کر صرف بھارتی عوام کو بیوقوف بنا رہے ہیں" ۲۲ ستمبر ۱۹۶۵ء کو میں کھانا کھانے لگا تو عائشہ نے گلو گیر آواز میں کہا "ابھی تار آیا ہے. سیالکوٹ سیکٹر میں چونڈہ کے مقام پر ستمبر ۱۹۶۵ء کے معرکہ میں علی مرتضیٰ خاں شہید ہو گیا ہے. آہ. بہن بشیرا بیگم کا سہاگ لٹ گیا" اس کے بعد وہ آبدیدہ ہو گئی. بشیرا بیگم میری چچا زاد بہن ہے. علی مرتضیٰ خاں شہید اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا. چھ مہینے پہلے ٹینک کے حادثہ میں وہ شدید زخمی ہوا تھا اور اُس کی جان بچنے پر ہم نے خدا کا شکر ادا کیا تھا. اُس کے والد راؤ محمد عمر خاں جنگ عالمگیر میں چار سال جرمنوں کی قید میں رہ چکے ہیں. برلن سے محمد عمر خاں کا گھر کوئی خط نہیں آیا. اُن کے چار بیٹے پہلے مر چکے تھے. اور کوئی نرینہ اولاد نہ تھی. بس گھر بند ہو گیا تھا. اور خیال یہ تھا کہ وہ جنگ میں کام آ چکے ہیں. جنگ

کے خاتمے پر دوسرے جنگی قیدیوں کے ساتھ جب وہ گلا نورا آئے تو بڑی خوشی منائی گئی۔ اور پھر ایک سال بعد جب علی مرتضیٰ خاں پیدا ہوا تو مسرت اور شادمانی دوچند ہوگئی۔ اب خدا نے وطن کی آزادی کی قیمت میں اُس کی قربانی قبول کر لی۔ اللہ نے وطن عزیز پر اس قبیل کے جوانوں کی کتنی قربانیاں قبول کی ہوں گی۔" اتنا کہنے کے بعد میں نے عائشہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا "پگلی تو شہید کی موت پر آنسو بہاتی ہے؟" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "میں موت پر نہیں روتی، یہ موت تو بہت بلند ہے۔ لیکن دُکھ ہے تو یہ ہے کہ تھوڑی سی عمر میں آپ کی بہن کا سُہاگ لُٹ گیا اور دوسرے وہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا اور اپنی بہن کا اکیلا بھائی تھا" اس کے بعد وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ میں نے اُسے تسلی و تشفی دے کر چُپ کیا اور پھر اُس سے کہا "تو روتی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ لوگ ہمیں مبارک باد پیش کریں۔ علی مرتضیٰ خاں خوش قسمت تھا جو اُسے شہادت نصیب ہوئی۔ تو خدا سے دعا کیا کر میں بھی وطن عزیز کی خاطر شہید ہو جاؤں اور تیرا سُہاگ لُٹ جائے۔ اپنی جان سے زیادہ میں اپنے وطن سے محبت کرتا ہوں۔ اور یہ کہنے میں مجھے کوئی باک نہیں کہ ایک مارشل قوم میں پیدا ہونے کے باوجود میں دلیر آدمی نہیں ہوں۔ میں بہت حساس ہوں اور مجھے جنگ سے نفرت ہے۔ کیونکہ جنگ انسانیت کی بربادی اور تباہی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ لیکن ایسی مقدس جنگ جو اہنسا کے نام نہاد پجاریوں اور جعلی عدم تشدد کا پرچار کرنے والے مہاشوں نے ہم پر مسلط کی ہے۔ کاش اس جنگ میں میں بھی حصہ لوں۔ عائشہ سہاگنوں کے لٹے ہوئے سُہاگ اور نوجوانوں کے گاڑھے لہو سے آج پاکستان کی بنیادیں مستحکم ہوئی ہیں۔ دشمن جو ہمارے مُلک کو پکا ہوا پھل سمجھتا تھا اب جان گیا ہے۔ یعنی جنرل چودھری اچھی طرح سمجھ گیا ہے کہ پاکستان کو فتح کرنا اُس کے بس کا روگ نہیں ہے۔ اپنے ملک اور اپنی آزادی کی حفاظت میں زندگی تج دینے والی قومیں دنیا اور بارگاہِ ایزدی میں سُرخرو ہو جاتی ہیں۔ اور پھر دُنیا کی بڑی بڑی سامراجی قوتیں اُن قوموں کی آزادی پر ضرب لگانے کے خیال سے لرز اٹھتی ہیں۔ باعزت اور غیرت مند قوم کی بہو بیٹیاں یہ کبھی نہیں گوارا کرتیں کہ اُن کے وطن کے جانباز اپنی جان بچانے کی خاطر ہتھیار ڈال کر شکست قبول کر لیں۔ اور پھر اُن کے ملک کی سڑکوں پر دشمن ملک کے فوجی دندناتے پھریں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے جسے اپنی غیرت اور اپنا وطن عزیز نہیں، اُس میں ایمان کا شائبہ تک نہیں ہے۔ عائشہ تمہارا گھر شروع سے پاکستان میں ہے جو ہجرت کر کے پاکستان میں آئے ہیں وہ ہم سے پوچھو، جب ملک آزاد ہوا تو برہمن سامراج نے اپنی فوجوں کی مدد سے ہمیں ہمارے گھروں سے نکال دیا اور پھر پاکستان کو ہم نے اپنا وطن بنایا تو برہمن سامراج نے ہمیں غلام بنانے کی خاطر اب پاکستان پر حملہ کر دیا۔ ہمیں ایشیا میں اُبھرتے ہوئے اس سامراج سے انتقام لینا ہے۔ ہم اس کے تمام منصوبے خاک میں ملا کر دم لیں گے۔ عائشہ تجھے خدا پر اور اپنی فوجوں پر اعتماد نہیں ہے، اس لئے تو ڈرتی ہے۔" "میں اب نہیں، لیکن یہ مجھے اعتراف ہے کہ میں ۵ اور ۶ ستمبر کو بہت خوفزدہ رہی ہوں۔ ۵ ستمبر کی رات کو میں نے بہت بھیانک خواب دیکھا۔ اس ڈراؤنے خواب نے مجھے بُری طرح ڈرایا۔ میں نے دیکھا کہ ہر طرف خون کا سمندر بھرا ہوا ہے۔ اور دریا کی ہلکی لہروں کی طرح اُس سمندر کا لہو دھیرے دھیرے میری طرف بڑھ رہا ہے۔ پھر تمام در و دیوار مجھے خون میں لتھڑے ہوئے نظر آنے لگے۔ آنکھ کھلی تو میرا بدن بُری طرح کانپ رہا تھا۔ ۶ ستمبر کا دن نکلا یہ بہت اُداس دن تھا۔ خلاف معمول فضا میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ڈراؤنے خواب کی یاد اور ان جانی اُداسی نے میرے دل کے سکون کو ملیامیٹ کر دیا۔ دل کو لاکھ سمجھایا لیکن قلبی ہراس طوفانی آندھی کے جھونکوں کی طرح بڑھتا ہی گیا۔ پھر کچھ دیر بعد سُن لیا کہ آج صبح بھارتی فوج نے پاکستان میں لاہور کے محاذ پر حملہ کر دیا ہے۔ اور گھمسان کی جنگ جاری ہے بے ساختہ میرے مُنہ سے نکلا۔ میں نے جو خواب میں دیکھا ہے۔ وہ یہ خون کا سمندر ہے۔ اے خدا اس خون کے سمندر میں تو ہمارے دشمنوں کو ڈبو دے۔ ہم بے قصور اور حق پر ہیں۔ کیا تو ظالموں اور سفاکوں کو کیفر کردار کو نہ پہنچائے گا؟ مجھے امید ہے تو بھارتی فوجوں کی زیادتی اور اُس کے اسلحہ کے گھمنڈ کو ضرور توڑے گا۔ تو نے دُنیا میں ظالموں اور مغروروں کا ہمیشہ سر کچلا ہے۔ میں تمام دن خدا کے حضور میں گڑگڑاتی رہی، رات آئی، وہ رات بہت ہیبت ناک تھی۔ چاند چمک رہا تھا، لیکن اُس چاندنی میں لہو کا سا عکس جھلک رہا تھا۔ ستارے اس قدر اُداس اور مغموم

تھے کہ اُن کی طرف دیکھتے ہوئے میرا دل دھڑکتا تھا۔ ایک تارا ٹوٹتا اور خون کی سی لکیر بناتا ہوا آسمان سے زمین کی طرف چلا گیا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے تارے ٹوٹتے رہے۔ اور لہو کی لکیریں بنتی رہیں۔ بڑی بھیانک اور ڈراؤنی رات تھی۔ چاندنی روشنی کے دامن میں لپٹی ہوئی ایسی اُداس اور پریشان رات اس سے قبل میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس مہیب اور خوفناک رات کے سناٹے میں ایسا لگتا تھا جیسے ہماری خوشیاں چھیننے لاکھوں کی تعداد میں سفاک ڈاکو ہمارے گھروں کی طرف بڑھ رہے ہیں اور اُن ڈاکوؤں کے مقابلہ میں ہمارے چند ہزار سرفروش آہنی دیوار بنے کھڑے ہیں۔ اُس دیوار کے پاس خون کا تالاب ہے اور اُس تالاب میں لاشیں تیر رہی ہیں۔ میرے پاس اُن ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے کے لئے دعا کے سوا اور کیا تھا۔ چارپائی پر لیٹے لیٹے میں خدا کے حضور میں زار و قطار رونے لگی۔ اے اللہ ہمارے چھوٹے سے ملک کی تھوڑی سی فوج ۵۴ کروڑ آبادی کے بڑے ملک کی زیادہ فوجوں سے کس طرح نپٹے گی؟! اے اللہ ہمارے جانبازوں کو ہمت اور حوصلہ دے۔ ہم حق پر ہیں۔ تو نے حق پر لڑنے والوں کی ہمیشہ مدد کی ہے۔ زمانہ سلف کے مسلمانوں کی طرح ہماری بھی مدد کر، اُن مسلمانوں کی طرح ہم زیادہ قوتِ ایمانی کے مالک تو نہیں ہیں۔ ہاں البتہ تیرے نام لیوا ضرور ہیں۔ تو بھارت کے عتاب، قہر اور زعم کو توڑ دے۔ بھارتی حکمران انسان نہیں ہیں بلکہ بزدل قسم کے درندے ہیں۔ تو ہمارے ہاتھوں ان کی درندگی ختم کر دے، تو سب کچھ کر سکتا ہے۔ بھارت غاصب ہے، وہ اپنے آپ کو جمہوریت کا علمبردار کہتا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ وہ مظلوم کشمیریوں کو حق خود ارادی دینے سے منکر ہے۔ اے میرے خدا! کیا کشمیری انسان نہیں ہیں جو ڈوگروں کے بعد اٹھارہ برس سے بھارت اُن کی آزادی کو غصب کئے ہوئے ہے۔ کیا یہی وہ جمہوریت ہے جسے ایشیا میں جمہوریت کا علمبردار سمجھ کر امریکہ نے اربوں روپے کا سامان جنگ بھارت کو دے دیا ہے۔ کیا کشمیری اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنے کا حق نہیں رکھتے! ہم چاہتے ہیں کہ کشمیریوں کو حق خود اختیاری دیا جائے تاکہ وہ اپنی تقدیر کا خود فیصلہ کریں۔ اس جرم کی پاداش میں بغیر اعلانِ جنگ کے چور اُچکوں کی طرح آج بھارت نے ہم پر حملہ کر دیا ہے۔ ہم کشمیری عوام کی غلامی کی زنجیریں توڑنے اور اپنی آزادی کو بچانے کے لئے آخری سانس تک لڑیں گے۔ لیکن اے اللہ فتح و شکست تیرے ہاتھ میں ہے۔ تو بھارت کی قوت کو ریزہ ریزہ کر دے۔ بھارت کے بنئے برہمن لیڈر انسانی ہمدردی اور جذبات سے عاری ہیں۔ آدمیت کو باعزت دیکھنے کے اُن میں قطعاً احساسات نہیں ہیں۔ اگر تو نے اُن سفاکوں کو ہم پر فتح دیدی تو زمانہ نازی ازم اور چنگیزیت کو بھول جائے گا۔ بنئے برہمنوں نے جو فوجیں تیار کی ہیں اُنہیں جنگی آداب و اخلاق کا قطعاً پاس نہیں ہے ۱۹۴۷ء میں ان فوجوں کی بربریت کا مشاہدہ کیا جا چکا ہے۔ اور ان فوجوں کے سپاہی اٹھارہ سال سے بھارت کی نہتی اقلیت پر ستم توڑ رہے ہیں۔ وہ خونی بھیڑیے ہیں جن کا کام کمزوروں کو چیر پھاڑ کر پھینکنا اور رشیوں کی طرح سنگسار ہوجانا ہے۔ اے اللہ تو ہمارے فوجیوں کو چیتے کا جگر اور شیر کی سی گرج دے، جو بے چین انسانیت کو بھارتی بھیڑیئے سے محفوظ رکھ سکیں۔۔۔ اے اللہ پاکستانی عورتوں کی اُداسی اور یاسیت کو ختم کر دے۔ ہمارے فوجی تیرے نام کو قائم رکھنے اور ہماری عورتوں کے لئے لڑ رہے ہیں، وہ اپنا خون اپنے وطن کی ناموس بچانے کے لئے بہا رہے ہیں۔ وہ اپنے دیس کے معصوم بچوں کو دشمن کے نیزوں پر لٹکتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے وطن کے بوڑھوں کے سینے دشمن کی برین گنوں کی گولیوں سے چھلنی کرانے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ اپنے کھیتوں کو اجڑتے ہوئے اور اپنی بستیوں کو آگ کے تیز شعلوں کی لپیٹ میں دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ وہ شہر کے بازاروں میں ہنستی کھیلتی زندگیوں کی حفاظت کے لئے دشمن کی توپوں کے گولے اپنے سینہ کے لہو کے سمندر میں ٹھنڈا کرنے کا ارادہ لے کر دشمن کے مقابلہ میں گئے ہیں۔ اے خدا تو ان کی مدد کر۔ آسمان سے ستارے ٹوٹتے رہے، خون کی لکیریں بنتی رہیں اور میں رو رو کر خدا کے حضور میں دعائیں کرتی رہی۔ اس رات خدا کے سامنے میں اس قدر روئی کہ میرے دل کا تمام خوف نکل گیا اور میں ایسی مطمئن ہو گئی کہ جیسے کسی اَن جانی قوت نے مجھے یقین دلا دیا کہ روؤ نہیں، اور خدا پر بھروسہ رکھو، کیونکہ خدا نے دُنیا کی

بڑی بڑی طاقتوں کو معمولی طاقتوں سے بار بار نیچا دکھایا ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے اُس نے ہمارے خوفناک ترین دشمن کو بھی نیچا دکھا دیا ہے۔" اتنا کہنے کے بعد عائشہ خاموش ہوگئی۔ اور فضا پر مکمل سکوت طاری ہوگیا۔ میں نے اُس سکوت کو توڑا "عائشہ تو نے خدا کے سامنے رو رو کر دعا مانگتے وقت بہت جذباتی انداز اختیار کیا۔ اُس رات کی تیری بے قراریاں سُن سُن کر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا ہے۔ میں تجھے معمولی پڑھی لکھی بھولی بھالی سیدھی سادی عورت سمجھتا تھا۔ مجھے آج پتہ چلا کہ اپنے وطن کے لئے تیرے پہلو میں کس قدر درد مند دل ہے۔ لیکن یہ ضرور رکھوں گا کہ تو دیر نہیں ہے۔ لے سُن میں تجھے ایک بہادر عورت کی داستان سناؤں۔ جمیل احمد خاں اپنی ماں کا سُہاگ لُٹنے کے چھ ماہ بعد اپنے نانا کے گھر موضع بلیالی ضلع حصار میں پیدا ہوا۔ اُس کی پیدائش کے ڈیڑھ سال بعد ملک تقسیم ہوگیا۔ اور پھر برہمن سامراج نے مشرقی پنجاب کے اور لاکھوں مسلمانوں کے ساتھ انہیں بھی ان کے وطن سے نکال دیا۔ جمیل احمد خاں کی ماں ہجرت کر کے چک بیدی ضلع منٹگمری میں آکر آباد ہوگئی۔ اُس کی ماں نے اپنا خون جگر پلا پلا کر اپنے اکلوتے بچے کو پرورش کیا۔ اُس کے کانٹا لگتا تو وہ تڑپ اُٹھتی۔ کیونکہ وہ بچہ اُس کی زندگی کا سہارا اور آرزوؤں کا مسکن تھا۔ دھیرے دھیرے جمیل احمد پروان چڑھ گیا۔ آدمیوں کی کمی کی ماری ہوئی اور ممتا کی ستائی ہوئی نے فوراً اُس کی شادی کر دی۔ ایک سُہاگن کی آمد سے اُنیس سال بعد اُس کے گھر کے در و دیوار چمک اُٹھے۔ صحن پر نکلی ہوئی بالکونی پہ شوخ سُرخ و سبز رنگ کے دوپٹے لہرانے لگے اور وہ مدت بعد اب اپنے لٹے ہوئے سُہاگ کے غم کو بھول گئی۔ بس ایک تمنا باقی تھی کہ جمیل احمد خاں کو اُس کے آبا و اجداد کی طرح فوجی وردی میں ملبوس دیکھے۔ شادی کے ایک ہفتہ بعد خدا نے اُس کی ماں کی وہ تمنا بھی پوری کر دی اور جمیل احمد خاں راجپوتی پیشہ کے مطابق فوج میں بھرتی ہوگیا۔ اب اُس کی ماں کے دل میں ایک آرزو اور اُبھری کہ جمیل احمد خاں جلد رخصت پر آئے اور پھر محلہ کی عورتیں جمیل احمد خاں کے پہلی رخصت پہ آنے پر مبارکباد دینے اُن کے گھر آئیں۔ چھ مہینہ بعد فوج سے جمیل احمد خاں کا خط آیا کہ اگلے ہفتہ ایک مہینہ کی رخصت پر گھر آ رہا ہوں۔ دوسرے دن اُس کا ایک خط اور ملا۔ اُس میں لکھا تھا کہ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے اب میں گھر رخصت پر آنے کی بجائے میدان جنگ میں جا رہا ہوں۔ اماں اللہ سے دعا کرنا کہ ہمیں فتح و کامرانی نصیب ہو۔ اور مجھے خدا سینہ میں گولی کھانے کی ہمت دے۔ یہ خط پڑھ کر اُس کی ماں کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا۔ ماضی کی یادیں فلم کی ریل کی طرح آنکھوں کے سامنے گھوم گئیں۔ جنگ عالمگیر میں اُن کے گاؤں بلیالی کے ہزاروں جوانوں نے حصہ لیا تھا۔ اور اُس لڑائی میں اُن کے بہت سے آدمی کام آئے۔ اپنے آدمیوں کی موت کے تار آنے پر وہ بھی روئی تھی۔ لیکن اب اُس نے اپنے دل میں عہد کیا کہ اگر جمیل احمد خاں شہید ہوا تو میں ہرگز نہیں روؤں گی۔ وہ ہمارے آدمی سمندر پار جا کر سامراجیوں کے لئے مرے تھے۔ اور اب جمیل احمد خاں اپنے مذہب اور اپنے وطن کے لئے شہید ہوگا اور وہ اُن سے انتقام لے گا جن لوگوں نے ہمیں ہمارے گھروں سے نکالا تھا۔ جو عورت جمیل احمد خاں کے گھر آتی، اُس کی ماں اُس عورت سے بڑے فخر سے کہتی، میرا لال یعنی میرا بیٹا محاذ جنگ پر ہے۔ جمیل احمد کے جنگ پر جانے کی اُسے بیحد مسرت تھی۔ ابھی تو جمیل احمد خاں محاذ جنگ پر گیا ہی تھا۔ لیکن اُس کی ماں کو پورا یقین تھا کہ جمیل احمد خاں ضرور شہید ہوگا۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ۸ ستمبر کو اُس کی ماں کو تار ملا کہ بھارتی ٹینکوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جمیل احمد خاں شہید ہوگیا ہے۔ آنگن پر نکلی ہوئی بالکونی پر سُرخ و سبز دوپٹے غائب ہوگئے۔ جمیل احمد خاں کی بیوی کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں اور اُس کا سُہاگ لُٹ گیا اور پہلے کی طرح گھر میں ویرانی چھا گئی۔ در و دیوار رونے لگے۔ کنبہ اور محلہ کی عورتیں بین کرتی ہوئی صحن میں آ دھمکیں۔ عورتوں کی چیخ و پکار اور رونے کی آواز نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ مگر جمیل احمد خاں کی ماں کی آنکھوں میں ایک آنسو نہ آیا۔ اور وہ شیرنی کی طرح گرجی کہ اگر تمہیں رونا ہے تو اپنے اپنے گھر جا کر رو۔ روتی ہوئی عورتیں خاموش ہوگئیں اور وہ دم بخود کہ یہ کیسی ماں ہے جو اپنے لال کے ختم ہونے پر آہ تک نہیں بھرتی۔ جمیل احمد خاں کی

ماں بولی کہ میری محنت راس آگئی۔ تنگی اور مصیبت سے پالا ہوا میرا بیٹا وطن پر نثار ہوگیا۔ میں بہت خوش ہوں۔ جنہوں نے ہمیں ہمارے گھروں سے نکالا تھا۔ جمیل احمد اُن کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوا ہے۔" تیسرے دن جمیل احمد خاں کی رجمنٹ کے رسالدار کا خط اُس کی ماں کے نام آیا۔ خط میں لکھا تھا کہ میں اور میرے چار بیٹے محاذِ جنگ پر ہیں۔ میری بہن اگر میرے تین بیٹے شہید ہو جاتے تو میں اتنا غم نہ کرتا، جتنا غم مجھے جمیل احمد خاں کی شہادت سے ہوا ہے۔ میں جانتا ہوں بہن تو دکھیا عورت ہے۔ تو نے بہت مصیبت سے جمیل احمد خاں کو پالا اور ابھی اُس کی شادی ہوئی تھی۔ انیس سال پہلے تمہارا سُہاگ لُٹا تھا اور یہ کس قدر دردناک منظر ہے کہ اب تمہارے بیٹے کی بہو کا بھی سُہاگ لُٹ گیا ہے۔ کاش میں اپنی زندگی دے کر جمیل احمد خاں کو بچا سکتا۔ یہ مانا کہ جمیل احمد خاں خوش قسمت تھا۔ اور اُس کی موت بہت بلند ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ موت بے حد دردناک ہے۔ یہ دلسوز خط پڑھ کر بھی جمیل احمد خاں کی ماں کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ اُبھرا۔ پھر اُس نے وہی الفاظ دُہرائے۔ میری محنت راس آگئی۔ میں بہت خوش قسمت ہوں۔ میں ایک شہید کی ماں ہوں۔ جمیل احمد خاں کی بیوی بڑی بھاگوان ہے۔ یہ ایک شہید کی بیوی ہے۔ یہ رونے کی بات نہیں بلکہ خوش ہونے کا مقام ہے۔" یہ داستانِ حقیقت ختم کر کے میں بولا کہ "عائشہ ایک بوڑھی عورت کی ہمت کی داستان اور سُن۔ رائے ونڈ کے قریب ایک چک میں کانپور ضلع روہتک کے راجپوت مہاجر آباد ہیں۔ اُس چک کی ایک مہاجر خاتون کے چھ بیٹے محاذِ جنگ پر تھے۔ تین دن کے اندر اُس کے چھ کے چھ بیٹے شہید ہوگئے۔ بوڑھی ماں نے چھ بیٹوں کی شہادت کی خبر سُن کر خداوند کریم کا شکر ادا کیا۔ اور اُس کی آنکھوں سے ایک آنسو تک نہ ٹپکا۔ وہ بہت خوش ہوئی کہ اُس کے چھ بیٹے اپنے وطن کی حرمت بچانے کی خاطر قربان ہوگئے۔" یہ دو واقعات سُن کر عائشہ نے کہا "آفریں ہے ایسی ماؤں پر جو اپنی تمام پونجی وطن پر نچھاور کر کے خوش ہوتی ہیں۔ یہی تو وہ جذبہ ہے جس جذبہ نے برہمن سامراج کے جارحانہ عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ اُس نے ہوسِ ملک گیری کی خاطر ہم پر حملہ کیا۔ خدا کرے بنیا برہمن سامراج کا ستیاناس جائے۔" عائشہ کی زبان سے ستیاناس کا لفظ سُن کر مجھے ضلع روہتک ہریانہ کی زبان کا ایک شعر یاد آگیا۔ جنگ عالمگیر کے دنوں میں ضلع روہتک میں عورتیں یہ گیت گایا کرتی تھیں۔

جرمن تیرا جائیو ستیاناس آج نہیں ترٹ کے
تو نے مارے برانے پوت جنگ کر کے

گیت کا یہ ایک شعر پڑھ کر میں بولا کہ "اُس وقت نازی جرمنوں کا تو ستیاناس ہو گیا تھا۔ اور خدا سے امید ہے کہ بھارت کے بنیا برہمن جنگ بازوں کا بھی ضرور ستیاناس جائے گا۔" عائشہ بولی کہ "ان بنیا برہمن جنگ بازوں کو کیا فکر ہے۔ اُن کا بیٹا یا بھائی بھتیجا مرتا تو انہیں دُکھ ہوتا۔ بنیا برہمن فوجیں تو لُٹے پاؤں بھاگ جاتی ہیں۔ برہمن سامراج نے پاکستان پر حملہ کر کے جو بھارت کے ہزاروں آدمی ختم کرائے۔ مجھے تو اُن پر بھی ترس آرہا ہے۔ وہ بھی اپنی ماؤں کے لال تھے۔ اور وہ کون ہے خوشی سے پاکستان سے لڑنے آئے تھے؟ میں جانتی ہوں ہمارے مقابلہ میں مرنے والے سکھ، ہندو راجپوت، جاٹ اور گورکھے تھے۔ ورنہ بنیا برہمن میں تو جان دینے کی بھی ہمت نہیں ہے۔ جان دینا بھی بہت مشکل کام ہے۔ غلام ابن غلام اور کتنے بے وقوف ہیں یہ لوگ جو ہماری فوجوں سے ٹکرا کر مفت میں جانیں دے رہے ہیں۔ ورنہ برہمن سامراج نے سب سے پہلے راجپوتوں، سکھوں اور جاٹوں کی پانچ سو ریاستوں کو فتح کیا۔ حیرت ہے ان جنگجو قوموں کی ریاستوں کو اُن بنیے برہمنوں نے محض باتوں سے فتح کر لیا۔ جو آج بھی چڑیا کا خون دیکھ کر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ ہندو، سکھ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ انہیں پنجابی صوبہ ملے گا۔ سکھ کان کھول کر سُن لیں کہ بنیا برہمنوں کی چھری بے شک چلے۔ لیکن ورڈی چھوڑتے وقت یہ ہارٹ فیل ہو کر مر جائیں گے۔ اگر پنجابی صوبہ لینا ہے تو ان کا ہارٹ فیل کرنے کی کوشش کریں۔ اب رہا ہندو راجپوتوں اور جاٹوں کا معاملہ۔ انہوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ ماضی میں جن راجپوتوں اور جاٹوں نے

برہمن دیوتاؤں پر حکومت کی وہ پاپی تھے۔ اب بلاوجہ خون ہم دیں گے اور ہم پر راج بنیا برہمن کریں گے۔ میں کہہ رہی تھی کہ آزادی ملنے کے بعد برہمنوں نے پہلے سکھ راجپوت اور جاٹ ریاستیں فتح کیں۔ پھر جوناگڈھ حیدرآباد گوا فتح کیا۔ پھر ناگا عیسائیوں کو تباہ کرنا شروع کیا۔ اور کشمیر کو ہڑپ کر لیا۔ لیکن اب کشمیر برہمن سامراج کے ہضم نہیں ہو رہا ہے۔ اُسے پتہ ہے کہ دس کروڑ پاکستانیوں نے عہد کر لیا ہے کہ ہم کشمیریوں کو اُن کا فطری حق دلا کر دم لیں گے۔ بقول وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کہ ہم کشمیر کے لئے ایک ہزار سال تک لڑتے رہیں گے۔" میں نے عائشہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "مجھے آج پتہ چلا تو سیاست پر بھی بول سکتی ہے" میرے منہ سے وہ اپنی تعریف سُنکر کچھ جھینپ گئی۔ میں باہر گیا تو میرے چچازاد بھائی ارشاد علی خاں نے بتایا کہ خبر آئی ہے۔ بھائی صاحب راؤ محمد زماں خاں کے جو دو لڑکے محاذ جنگ پر تھے۔ چھوٹا لڑکا لاہور کے محاذ پر شدید مجروح ہو گیا ہے۔ اس کی ٹانگ میں بم کا ٹکڑا لگا ہے۔ اور سینہ پر گولی کا زخم ہے۔ میں نے کہا اگر زندگی ہے تو کوئی ڈر نہیں۔ کلانور کے جنرل راؤ امراؤ خاں کے چھوٹے بھائی صوبیدار راؤ شیر محمد خاں جنگ عالمگیر میں شدید زخمی ہوئے تھے۔ بم کے ٹکڑوں اور گولیوں سے اُن کا سینہ چھلنی ہو گیا تھا۔ خدا کی قدرت ہے۔ وہ اب تک صحت مند اور خوش وخرم ہیں۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں رسالدار راؤ محمد یوسف خاں کے سینہ اور پیشانی میں پانچ گولیاں لگی تھیں۔ وہ اب تک صحت مند اور زندہ ہیں۔ دوسرے دن ۲۳ ستمبر کی صبح کے تین بجے جنگ بند ہو گئی۔ ۲۸ ستمبر کو میں نے عائشہ کو بتایا کہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے پاکستان کی افواج کے افسروں اور دیگر فوجیوں کو جرأت اور شجاعت کے ۹۴ اعزازات اور دیئے ہیں۔ شجاعت اور جرأت کا اعلیٰ ترین اعزاز نشانِ حیدر میجر راجہ عزیز بھٹی شہید کو دیا گیا ہے۔ ناموس وطن اور آزادی کے تحفظ کے لئے راجہ عزیز بھٹی نے انتہائی شجاعت اور جرأت سے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا ہے۔ میجر بھٹی نے جان پر کھیل کر دشمن کے ٹینکوں، توپ خانہ اور بکتر بند ڈویژن کی پیشقدمی روک دی۔ جنرل سرفراز خاں اور جنرل یحییٰ خاں کو ہلال جرأت کا اعزاز دیا گیا۔ میجر شفقت بلوچ اور میجر خادم حسین اور ایک انجینئر نے بھی غیر معمولی جوانمردی اور دلیری کا مظاہرہ کیا ہے۔ انہیں ستارۂ جرأت کے اعزازات دیئے گئے ہیں۔ اور بہت سے افسروں اور فوجیوں کو ہلالِ جرأت ستارہ جرأت اور تمغۂ جرأت کے اعزازات دیئے گئے ہیں۔ اعزاز پانے والے بہت سے جانبازوں نے جام شہادت نوش کیا ہے۔ وہ قوم کے ہیرو تھے۔ خدا انہیں جوار رحمت میں جگہ دے آمین۔" عائشہ نے ایک سرد آہ بھری میں بولا۔ "دیکھنا رونا نہیں۔ شہادت کی موت پر آنسو بہانا بہت بڑا گناہ ہے۔" "نہیں میں روتی نہیں۔ اب میں بزدل نہیں ہوں۔ خدا کی قسم میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی اپنے وطن پر قربان ہو جاؤں۔" ۲۹ ستمبر کو ہمیں اطلاع ملی کہ ۲۱ ستمبر کے معرکہ میں لاہور محاذ پر عزیزم محمد انوار خاں شہید ہو گیا ہے۔ عائشہ نے پھر ٹھنڈی سانس بھری۔ لیکن وہ روئی نہیں اور پھر درد بھرے لہجہ میں بولی۔ "انوار کی شادی ہونے والی تھی۔ بہت اچھا ہوا اس کی شادی نہیں ہوئی۔ ورنہ آج اس کی بیوی کا بھی سہاگ لٹ جاتا۔" میں بولا "اللہ تعالیٰ ہمیں صبر وسکون اور استقامت دے۔ اور ہم آئندہ اس سے بھی بڑی قربانی دے کر سامراج کے پرخچے اڑا دیں۔ ہم برہمن سامراج کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ جب چاہے، ہم پر حملہ کرے۔ ہم ہر محاذ پر اُسے خاک وخون میں نہلا دیں گے۔ چچا صاحب راؤ عبدالوحید خاں کو جب اُن کے نوجوان فرزند محمد انوار خاں کی شہادت کی اطلاع ملی تو انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور اُن کے منہ سے جو فقرہ نکلا وہ یہ تھا "میری خواہش ہے میرے دو بیٹے وطن کے لئے اور شہید ہوں۔ بھلا شہادت سے بڑا اعزاز اور کیا ہو سکتا ہے۔" ۳۰ ستمبر کو عزیزم راؤ صداقت علی خاں کے نام خط آیا کہ چھمب کے محاذ پر منڈا ور کے دفعدار رستم خاں شہید ہو گئے ہیں۔ ہم سب نے اُن کے حق میں خدا سے دعا کی اور اُس کا شکر ادا کیا۔ ۲ اکتوبر کو عائشہ نے بتایا کہ میں نے آج یہ سنا ہے کہ میجر راؤ دوست محمد خاں کا پوتا یعنی صوبیدار راؤ محمد شفیع خاں کا لڑکا سردار خاں اور رسالدار راؤ عبداللہ خاں کا لڑکا یہ دونوں شہید ہو گئے ہیں۔ میں بولا ابھی صحیح پتہ نہیں چلا ہے سنا ہے

(باقی صفحہ ۱۲۰ پر)

سید وحید قیصر ندوی

ورندرا عجائب خانہ

راجشاہی اور اس کے آس پاس کے علاقے کا پرانا نام "ورندرا" تھا۔ اسی پرانے نام کی مناسبت سے ۱۹۱۰ء میں پرنس سرت کمار رائے نے یہاں ایک تحقیقاتی مرکز اور عجائب گھر قائم کرنے کا پروگرام بنایا۔ ان کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی اس لئے ان کے اس شوق میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوئی۔ چونکہ پرنس سرت کمار رائے دیگھا پتیا کے راجہ تھے، جہاں ہر طرف خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ تھا اس لئے انہوں نے اپنے اس خیال کو پورا کرنے کے لئے اپریل ۱۹۱۰ء میں بنگال کے تین مشہور تاریخ دانوں کو تبادلۂ خیالات کی دعوت دی۔ ان تینوں مورخوں کے نام رائے بہادر رام پرشاد چند، اکھے کمار متر اور رستیش دھر رائے تھا۔ ان تینوں کے مشورے اور پرنس سرت رائے کی سرپرستی میں ۱۹۱۰ء میں "ورندرا ریسرچ سوسائٹی اور میوزیم" کے نام سے ایک ادارہ وجود میں آگیا۔ اس ادارے کے قیام کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ آس پاس کے نوجوانوں اور پڑھے لکھے لوگوں کو علمی تحقیقات اور سائنسی معلومات کی طرف مائل کیا جاسکے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں ایسے عالم اور فاضل پیدا کئے جائیں جو بنگال کے رہنے والوں کے رہن سہن، معاشرت، زبان اور ثقافت وغیرہ کے بارے میں تحقیقات کرکے علمی خزانوں میں قیمتی اضافے کریں۔ اس سوسائٹی نے ایک خاص شعبہ اس کام کے لئے کھولا جس میں شمالی بنگال خاص طور سے سرزمین ورندرا کی قدیم تاریخ تہذیب کے بارے میں اطلاعات فراہم کی جانے لگیں۔

سوسائٹی کو باضابطہ چلانے کے لئے جون ۱۹۱۰ء میں ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کے مطابق سوسائٹی کے ایک صدر ایک ناظم اور سوسائٹی کے ماتحت نکلنے والے رسالے کے ایک ایڈیٹر مقرر کئے گئے۔ اس سوسائٹی کے پہلے صدر دیگھا پتیا کے راجہ پرنس کمار رائے بہادر تھے۔

ستمبر ۱۹۱۰ء میں ایک مجلس عاملہ بنائی گئی جس میں مقامی تعلیمی ماہروں، مورخوں، جغرافیہ دانوں اور سائنس دانوں کو شامل کیا گیا۔ اس مجلس عاملہ نے بڑی سرگرمی سے کام شروع کر دیا۔ اس دوران میں اس سوسائٹی کے اصول وضوابط وغیرہ مرتب کئے گئے۔ سوسائٹی نے جہاں اور بہت سے علمی کام اپنے ذمہ لئے رہیں، ایک سب سے اہم ذمہ داری یہ سنبھالی کہ اس سوسائٹی کے ماتحت ایک عجائب خانہ قائم کیا جائے جس میں بنگال اور ہندوستان کے دوسرے شہروں کی نادر چیزیں لاکر جمع کی جائیں، تاکہ تحقیقات کرنے والوں کو ان کے کاموں میں آسانی ہو۔ چنانچہ "راجشاہی میوزیم" کے نام سے ایک عجائب خانہ قائم کر دیا گیا۔ پرنس سرت رائے نے اس کا خرچ چلانے کے لئے دو سو روپے مہینہ پابندی سے دینا شروع کیا۔ اس کے علاوہ اس سے دلچسپی رکھنے والوں سے چندہ کی وصولی کا بھی سلسلہ شروع ہوا۔

۱۹۱۶ء تک اس میں نوادرات کا بڑا اچھا ذخیرہ جمع ہوگیا۔ اس زمانے کے محکمۂ تعلیم کے ایک افسر نے سوسائٹی کا معائنہ کیا اور وہ سوسائٹی کے کام سے بہت خوش ہوا جس کے بعد حکومت بنگال نے ایک سو روپیہ ماہانہ عطیہ مقرر کر دیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اب یہ میوزیم اور سوسائٹی پہلے سے زیادہ تیزی سے ترقی کرے گی مگر اسی زمانے میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی اور کمار سرت رائے نے اپنی توجہ جنگی امور کی طرف منتقل کر دی اور اسی سبب سے انہوں نے دو سو روپے کی امداد روک کر صرف پچاس روپے ماہانہ سوسائٹی کو دینا شروع کیا۔

اس اقدام سے سوسائٹی اور عجائب خانہ کو بڑا دھکا لگا۔ لیکن تھوڑے دنوں کے بعد ہی اعلیٰ سرپرستی یا بدنامی کے ڈر سے انہوں نے پھر اس میں دلچسپی لینی شروع کی، اس وقت تک سوسائٹی کے پاس بے شمار اور بڑے قیمتی نوادرات جمع ہو چکے تھے جو ادھر ادھر مختلف لوگوں کے گھروں میں پھیلے ہوئے تھے۔ پرنس سرت رائے نے یہ تحریک کی کہ اب اس کی اپنی عمارت ہونی چاہئے۔ چنانچہ اس کے لئے انہوں نے بھاگ دوڑ شروع کی۔ ان کے دو بھائیوں نے اس کے لئے بڑی قیمتی زمین عطا کی، اور سرت کمار رائے نے اپنے پاس سے ستر ہزار روپے خرچ کر کے ایک نہایت ہی خوبصورت اور وسیع عمارت بنوادی۔ جب عمارت مکمل ہو گئی تو تمام نوادرات قاعدے اور خوبصورتی کے ساتھ اس عمارت میں رکھ دیئے گئے۔

نومبر ۱۹۱۹ء میں لارڈ رونالڈشے نے اس عمارت کا افتتاح کیا اس تقریب کے موقع پر راجشاہی کے بہت سے پرانے خاندانوں نے عجائب گھر کو بے شمار چیزیں بطور عطیہ کے دیدیں۔

۱۹۲۳ء میں ورندرا سوسائٹی نے حکومت سے درخواست کی کہ وہ اسے اپنی ذمہ داری میں لے لے، اسے پبلک میوزیم کے طور پر چلائے۔ سوسائٹی کے افسروں نے اس سلسلے میں اپنے کچھ حقوق پہلے ہی سے محفوظ کرائے تھے۔ جس کے رو سے ورندرا سوسائٹی کے بانیوں کو کچھ خصوصی مراعات حاصل تھیں، جب حکومت نے اس عجائب گھر کو چلانے کی ذمہ داری سنبھال لی تو حکومت کی طرف سے عام فنڈ کی اپیل کی گئی، سرت کمار کی خاندانی جائداد سے تینتیس ہزار روپے کا عطیہ دیا گیا اور عام لوگوں نے بھی اس میں دل کھول کر چندہ دیا۔ جس کے بعد اس عجائب خانہ کا شمار برصغیر کے اہم عجائب گھروں میں ہونے لگا۔

چونکہ اس عجائب گھر کے بانی پڑھے لکھے لوگ تھے اس لئے اس میں زیادہ زور کتابوں اور مخطوطات پر دیا گیا تھا، چنانچہ اس وقت مشرقی پاکستان میں بنگال کی تاریخ سے متعلق سب سے اچھا ذخیرہ ورندرا میوزیم کے پاس ہے۔ اس کی لائبریری کے اندر چھ ہزار قیمتی کتابیں اور مخطوطات ہیں۔ ان کتابوں میں بنگال میں ..... مسلمانوں کی آمد سے پہلے اور بعد کے زمانوں کے بارے میں معلومات کا بڑا اچھا قابل دید اور نادر ذخیرہ ہے، پاک و ہند کی تاریخ سے متعلق اس عجائب خانہ میں چار ہزار ایسے میگزین ہیں جن کی لوگوں نے اب تک صورت بھی نہ دیکھی ہوگی۔

عجائب خانہ میں زمانہ قدیم کی تاریخ و تہذیب کی بہت سی یادگاریں خاص طور سے بنگال کے مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت سے متعلق بے شمار چیزیں ہیں۔

سکّوں کی فراہمی کے سلسلہ میں بھی اس عجائب گھر کی خدمات قابل قدر ہیں، بنگال اور دلّی کے سلاطین نیز سلطنت مغلیہ کے عہد کے سکّوں کی بنا پر عجائب گھر کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ مثلاً سلاطین مثال کے طور پر سلطان ضمیر الدین محمود شاہ، سلطان غیاث الدین بلبن اور سلطان معز الدین کیقباد کے زمانہ کے سکّے اس میں موجود ہیں۔ عہد مغلیہ کے چند نقرئی اور طلائی سکّے خاص طور سے قابل ذکر ہیں، تاریخی مورتیوں کی تلاش اور کھدائی میں ورندرا سوسائٹی نے خاص طور سے نام پیدا کیا ہے۔ چنانچہ اس وقت ہندو دیوی دیوتاؤں اور مہاتما بدھ وغیرہ کے بہت سے قیمتی مجسّمے میوزیم کی زینت ہیں۔

بہت سے تاریخی مقام کی کھدائی میں بھی اس سوسائٹی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۱۹۱۱ء میں ورندرا سوسائٹی نے کمار پور کے ایک بالائی حصہ میں کھدائی کی ۱۹۱۶ء میں اس سوسائٹی نے بالو گھاٹ کے نزدیک ہی سنتوش میں کھدائی کے بعد ایک پرانی مسجد کے کھنڈر کا پتہ لگایا، سوسائٹی کے ممبروں کی کوششوں اور سرت رائے کی مالی امداد سے ۱۹۲۳ء میں پہاڑپور وغیرہ کے علاقہ میں کھدائی کا کام شروع ہوا، جس میں کلکتہ یونیورسٹی کے طلباء اور پروفیسروں نے بھی حصہ لیا۔ اس کھدائی میں بے شمار تاریخی مورتیں سکّے، برتن اور دوسری چیزیں حاصل ہوئیں جو اب تک ورندرا میوزیم کی زینت ہیں۔

(باقی صفحہ پر)

دلشاد انجم

"کوئی غمگسار ہوتا ....."

ابھی وہ دروازہ بند کر کے بستر پر آ کر ہی بیٹھا تھا کہ کسی نے زور زور سے کواڑ پیٹ ڈالے۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے سعید کھڑا تھا۔

"سنو آج آرڈر آ گئے ہیں۔ صبح ہمیں ڈیوٹی پر پہنچنا ہے۔"

"مجھے بھی اطلاع مل چکی ہے... مگر میں نہیں جاؤں گا۔" عارف نے لاپروائی سے جواب دیا۔ اس کے جواب پر سعید بری طرح چونک پڑا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ یہ کیسے ممکن ہے؟"

عارف خاموش رہا۔ تب سعید خود ہی دوبارہ بولا۔ "تم نے اس کا انجام بھی سوچا ہے؟"

"سب کچھ سوچ لیا ہے، میں اپنے افعال کا خود ذمے دار ہوں۔" عارف نے اندر آ کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ سعید بھی اس کے پیچھے اندر چلا آیا۔ "لیکن اس خیال کی کوئی وجہ بھی تو ہوگی۔"

"شاید میں تمہارے ہر سوال کا جواب دینے کے لئے مجبور نہیں ہوں۔" عارف نے بیزاری سے کہا۔ دس منٹ کمرے میں خاموشی چھائی رہی، آخر کچھ دیر بعد سعید خود ہی بولا۔ "بہتر ہوتا اگر تم اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کر لیتے۔"

عارف چند لمحوں تک ویران نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور پھر بہت آہستہ سے کہا۔ "خدا کے لئے مجھے تنہا چھوڑ دو، میرے پاس تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں ہے۔ میں کچھ سوچنا غور کرنا نہیں چاہتا، مجھے تنہائی چاہئے۔ سکون اور تنہائی۔" اور اس نے آنکھیں بند کر کے کروٹ بدل لی۔ سعید چند لمحوں تک حیرت سے اسے دیکھتا رہا اور پھر کچھ سوچ کر خاموشی سے باہر چلا گیا۔

عارف نہ معلوم کب تک اسی حالت میں چارپائی پر پڑا رہا۔ جب اس نے اٹھ کر کمرے سے باہر نگاہ ڈالی تو شام ہو چکی تھی۔ ہر سمت اندھیرا چھا گیا تھا اور اس تاریکی نے اس کے اضمحلال اور سوگواری میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ اس کا تمام جسم بخار میں تپ رہا تھا۔ درد سے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اس نے بے دلی سے ایک انگڑائی لی اور چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کسی کی ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز سن کر وہ چونک پڑا۔ اس نے غور کیا آواز اس کے برابر والے مکان سے آ رہی تھی۔ اس نے دیوار سے کان لگا دیئے۔ سسکیوں کے درمیان ایک زنانہ آواز کسی سے کہہ رہی تھی "تمہارے سوا ہمارا اس دنیا میں کون ہے بیٹے۔ اگر تم کو خدا نہ کرے کچھ ہو گیا تو؟"

"ماں خدا پر بھروسہ رکھو، اکیلی میری ہی جان تو قیمتی نہیں ہے، نہ معلوم کس کس کے لخت جگر کل موت سے نبرد آزما ہوں گے۔ وطن کی حفاظت کے لئے لڑنا ہر محب وطن کا فرض ہے۔"

"لیکن جنگ بہت بے رحم ہوتی ہے بچا۔ یہ کسی کے جذبات نہیں دیکھتی ... میں کیا کروں ... میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" اور سسکیاں تیز ہو گئیں۔

عارف نے جھنجھلا کر اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ محبت... ملمتا... شفقت... اس کی زندگی میں کوئی بھی تو نہیں۔ اسے چاہنے والا کوئی نہیں، کوئی ایسا نہیں جسے وہ اپنا کہہ سکے۔ جو اس کے دکھ درد پر آنسو بہا سکے۔ اس کی پریشانیوں میں ہمدردی بھرے کلمات کہہ سکے جس کے قرب سے وہ اپنی ذہنی اذیتوں سے نجات پا سکے۔ محبت... خلوص... اپنائیت... کوئی جذبہ بھی تو وہ نہ پا سکا۔ کتنا بدقسمت ہے وہ کیا اس کی زندگی ایسے ہی نامرادیوں، ناکامیوں، حسرتوں کی نذر ہو جائے گی؟ اس کا ریزار حیات میں خلوص کا کوئی چشمہ اس کے سوکھے لبوں کی پیاس نہیں بجھا سکے گا۔ حسرتیں... مایوسیاں... تشنگی... پیار کی... خلوص اور اپنائیت کی... یہ ایک مضافاتی بستی تھی۔ جس میں زیادہ تر مفلوک الحال خاندان آباد تھے۔ جنگ کی تباہ کاریوں نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ نوجوان فوج میں بھرتی ہو رہے تھے۔ اس بستی سے بھی نہ جانے کتنے ہی نوجوان فوج میں چلے گئے تھے۔ اور عارف بھی انہی میں سے ایک تھا۔ وہ دنیا میں بالکل اکیلا تھا۔ اس کا کوئی عزیز، دوست و غم گسار نہ تھا۔ اور تنہائی کا یہ احساس اس کی رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا۔

شام کی تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ بدصورت اور کریہہ اندھیرے نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے عارف کو خیال آیا کہ وہ اُٹھ کر شمع روشن کر دے، تاکہ اس اندھیرے سے فرار حاصل ہو سکے۔ مگر اچانک ہی اس نے اس خیال کو اپنے ذہن سے باہر جھٹک دیا۔ اسے اپنے اوپر ہنسی آ گئی۔ بھلا کمرے کی روشنی اس کے ذہن پر چھائی ہوئی تاریکی کو کیسے دور کر سکے گی۔ یہ ظاہری اندھیرا روح کی تاریکی سے زیادہ بھیانک تو نہیں۔ اس کا ذہن جامد ہو گیا تھا۔ وہ کھڑکی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

شام کے اس سناٹے میں کسی قریب کے مکان سے باتوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ کوئی زنانہ آواز بھرائے ہوئے گلے سے کہہ رہی تھی "میرے دل کی جو حالت ہے اسے کسی کے الفاظ ادا نہیں کر سکتے۔ مگر مجھے فخر ہے کہ آج میں اپنی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ مادرِ وطن کو سونپ رہی ہوں۔"

"تمہاری بلند نظری اور ہمت نے ہمیشہ میرا حوصلہ بڑھایا ہے۔ اور تمہارے جذبات کے لئے آج بھی میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ مجھے معلوم ہے میرے بعد تمہارا دنیا میں کوئی اور نہیں ہے... مگر تمہاری عظمت، ہمت اور وفا سے مجھ کو یقین ہے کہ میرے بعد بھی تم باعزت زندگی گزارو گی اور مجھے ہمیشہ یاد رکھو گی۔"

"ایسا نہ کہو... خدا کے لئے ایسا نہ کہو... یہ الفاظ سننے کی مجھ میں تاب نہیں ہے... میں خدا سے دعا کروں گی کہ وہ تمہیں میرے واسطے جنگ سے کامران واپس لائے۔" اور سسکیاں تیز ہو گئیں۔

عارف کا تمام جسم کانپ کر رہ گیا۔ چہرے کی رگیں تن گئیں۔ جھلا کر اس نے اپنے سر کے بال نوچ ڈالے۔ اس کا جی چاہا وہ پاگل ہو جائے اس کی دماغی صلاحیتیں مفلوج ہو جائیں تاکہ وہ سب کچھ بھول جائے۔ غم دوراں کا ہر تلخی کا احساس اس کے دل سے مٹ جائے۔ وہ کچھ بھی نہ سوچ سکے، کچھ بھی نہ سمجھ سکے، ورنہ تنہائی کا یہ احساس مار ڈالے گا۔ اکیلے پن بے کیف زندگی اسے خودکشی پر مجبور کر دے گا۔ خودکشی... زندگی کی تاریکیوں کے درمیان روشنی کی ایک کرن جیسی... ہر غم سے نجات کا ذریعہ... ہر الجھن کا حل... موت...!

مگر پھر خود ہی جھنجھلا کر اس نے اس خیال کو ذہن سے باہر جھٹک دیا۔ وہ خودکشی کیوں کرے؟ وہ مرنے کی دعا کیوں مانگے؟ اس کی موت بھی تو اس زندگی کی طرح بے کیف ہو گی۔ موت بھی تو سوگواری اور تنہائی کے اس احساس کا بار اس کے ذہن سے نہ چھین سکے گی۔ جیتے جی اسے کس طرح سکون نصیب ہو گا۔ ایسی تلخ موت سے حاصل بھی کیا؟... کتنا سکون ہوتا ہے اس موت میں۔ جب مرنے والے کو یہ احساس ہو کہ اس کی موت کے بعد بھی لوگ اسے یاد رکھیں گے، اس کے اقربا اسے یاد کر کے روئیں گے، اس کی یاد زندگی بھر لوگوں کے دلوں پر مسلط رہے گی۔ زندگی بھر پیار کی جو دولت ملی ہے مرنے کے بعد بھی اس میں کمی نہ ہو گی۔

لیکن وہ... وہ کس کے لئے زندہ رہے.... اور کس کے لئے موت مانگے.... اس کی تو موت بھی اس کی زندگی کی طرح گمنام ہوگی۔ کوئی اس کی موت پر آنسو نہیں بہائے گا.... کوئی اس کے لئے مرثیے نہیں پڑھے گا.... کوئی اس کی قبر پر پھول چڑھانے نہیں آئے گا.... اس کی یاد کسی کے لئے بھی تڑپ کا باعث نہ بنے گی.... وقتی طور پر بھی کوئی اس کے لئے افسردہ نہ ہوگا.... مرنے سے پہلے کسی کے کانپتے لب.... آنسوؤں سے ڈبڈبائی آنکھیں.... سوگوار چہرہ اسے الوداع نہیں کہے گا.... کتنی بے کیف موت ہوگی اس کی۔

آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے اس کے گالوں پر ڈھلک آئے۔ زندگی کی یہ بے کیفی کہیں اس کی جان نہ لے لے۔ اس نے کرب سے سوچا۔

کھڑکی سے باہر اندھیرے نے ہر شئے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اسے احساس ہوا جیسے وہ بھی اسی تاریکی کا ایک حصّہ ہے۔ جسے تاریکی نے جنم دیا۔ فٹ پاتھ نے پروان چڑھایا اور حالات نے زندگی کی دور کی اس دہلیز پر لا پٹکا.... اور اب وہ محض ایک بے جان لاش ہے.... بے جان اور منجمد سرد لاش۔ جس کی زندگی میں کوئی ولولہ کوئی امنگ نہیں.... ایسا کوئی طوفان نہیں جس کی موجیں اُسے اُٹھا کر کسی ساحل پر پٹک دیں۔

اس کی زندگی کسی کھڈ میں پڑے ہوئے پتھر کی طرح بے معنی اور بے مصرف ہے۔ وہ جنگل میں کھلا ہوا اکیلا پھول ہے جس کی رعنائی کسی کی نظروں کو سکون نہیں بخشتی جس کی دلفریبی کسی کا دل نہیں بھاتی اور جو حسین ہونے کے باوجود کسی کے بالوں کی زینت نہیں بن پاتا۔

اسے کھڑکی میں اسی طرح کھڑے نہ معلوم کتنے گھنٹے گزر گئے۔ رات آدھی کے قریب ڈھل چکی تھی۔ اور وہ یونہی غیر ارادی طور پر ہتھیلی پر گال رکھے باہر کے نظاروں میں منہمک تھا۔ ہلکے ہلکے اندھیرے کے درمیان بستی کی ہر شئے عجیب خوابناک سا ماحول پیش کر رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے کچے مکانوں کے درمیان گلیوں میں بازاری کتے ٹانگیں پھیلائے سو رہے تھے۔ فضا میں جھینگروں کی بازگشت تھی ورنہ عجیب سا سناٹا اور سہانی سی فضا۔ اچانک اس سناٹے میں زندگی کی حرارت پیدا ہوئی اور عارف نے دیکھا تاریکی کا لبادہ اوڑھے کوئی سایہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک دوسری گلی کے موڑ سے ایک سایہ آگے بڑھا اور قریب پہنچ کر پہلے والے سائے کا ہاتھ تھام لیا اور خاموش فضا میں سرگوشی ابھری "تم نے بہت انتظار کرایا نیما۔" "مجھے اس کا افسوس ہے لیکن میں کیا کرتی۔ بابا جاگ رہے تھے۔ آج ان کی نیند کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ ابھی ابھی ان کی آنکھ لگی ہے تو گھر سے نکل چلی۔"

"تم کتنی اچھی ہو نیما۔ کس قدر پُر خلوص.... مگر میں بہت بدقسمت ہوں کہ تم جیسی حسین اور چاہنے والی محبوبہ کا قرب بہت مختصر عرصے کے لئے پا سکا...."

"یہ نہ کہو سعید۔ میں ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتی۔" نیما سعید کے کاندھے پر سر رکھ کر سسک کر رو پڑی۔

"روؤ نہیں نیما.... مجھے کشمکش میں مبتلا مت کرو۔ میرا فرض مجھے پکار رہا ہے۔ کہیں تمہاری محبت میرے عزم میں کمزوری نہ پیدا کر دے.... ویسے ہی نہ معلوم کیوں میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں آج تمہیں آخری بار دیکھ رہا ہوں۔" سعید کی آواز بھرا گئی۔ "نہیں سعید نہیں.... میں تمہارے بغیر نہ جی سکوں گی۔ تمہیں میرے واسطے زندہ رہنا ہے.... تمہیں یاد ہے تم نے کہا تھا ہمارا چھوٹا سا گھر ہوگا جس کے آنگن میں پھولوں کے پودے ہوں گے۔ جہاں بہار کے موسم میں میں پیار بھرے نغمے گاؤں گی۔ اور تم میرے زانو پر سر رکھے آنکھیں بند کئے فضائی وادیوں میں کھو گئے۔"

"شاید یہ خواب اب کبھی پورا نہ ہو سکے۔ جنگ بہت ہولناک صورت اختیار کر چکی ہے اور میں جنگ کی تباہ کاریوں کے درمیان ایک حقیر سا ذرّہ۔ کون جانے کل کی یہ رات بھی دیکھ سکوں یا نہیں۔" سعید کی آواز کانپ گئی اور نیما اس کے کندھے سے لگی سسک سسک کر

رو پڑی۔ عارف کو اپنے تمام جسم میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہو رہی تھیں اور وہ کھڑکی میں باہر نظریں جمائے کھڑا تھا۔

سعید بینا سے کہہ رہا تھا "ایک سپاہی کی زندگی کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنے خون سے اپنے وطن کی سرحدوں کی حفاظت کرتا ہے۔ میری زندگی کا وہ لمحہ بھی نزدیک ہی ہے۔ . . . مجھے بھولنا نہیں بینا . . . بہار کی خوشگوار شاموں میں تم میری قبر پر آکر وہی نغمہ گایا کرنا جسے سننے کے لئے میں گھنٹوں تمہارے کمرے کی کھڑکی کے نیچے کھڑا رہتا تھا، وہی نغمہ جو بہار کی شاموں میں تم اپنی چھت پر بیٹھ کر گایا کرتی تھیں اور میں اسے سُنکر مدہوش ہو جاتا تھا۔"

اس کی بات کے جواب میں بینا کی سسکیاں تیز ہو گئیں اور اس نے بھرآئی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھ سے اتنی بے رحمی کی باتیں نہ کرو سعید۔ میرے دل میں اتنی غم انگیز باتوں کی تاب نہیں ہے۔ . . کہیں میں اس بھیانک تصور کی تاب نہ لاکر اپنی جان نہ دے دوں۔ . . ."

" سعید اپنی ہی رو میں کہے جا رہا تھا "تم میرے لئے روزانہ پھولوں کا گلدستہ بنایا کرنا۔ ایسا ہی گلدستہ جیسا کہ تم ہر روز بنا کر اپنی کھڑکی میں میرے واسطے رکھ دیا کرتی تھیں اور میں ہر شام وہ گلدستہ لینے کے لئے تمہاری کھڑکی کے نیچے سے گزرا کرتا تھا۔ . ."

"سعید . . . "بینا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

عارف کو اپنے چہرے کی رگیں پھٹتی محسوس ہوئیں۔ اعصاب کا تناؤ بڑھ گیا۔ سب چیزیں اسے اپنے گرد گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کا ذہن بے قابو ہوتا جا رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا بستر کی جانب بڑھا اور بے جان سا ہو کر چارپائی پر گر پڑا۔

اسے احساس ہوا۔ جیسے دُنیا میں صرف وہ ہی ایک واحد فرد ہے جس کا کوئی ہمدم کوئی غمگسار نہیں۔ ہر سعید کی بینا ہے، ہر ایک کی ماں ہے، بہن ہے، بیوی ہے، لیکن میں ہی ایسا بدقسمت انسان ہوں جو کسی بھی رشتے سے منسلک نہیں کسی جذبے سے آشنا نہیں۔ اس کی زندگی تلخیوں اور ناکامیوں کی ایک داستان ہے، ایک ادھوری اور بدمزہ داستان جس میں کوئی کشش نہیں، جس کی کوئی اہمیت نہیں۔ . . . اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔ صبح اسے بھی ڈیوٹی پر پہنچنے کا آرڈر آگیا ہے۔ مگر اس کے لئے آج کسی کی آنکھ نم نہیں ہے۔ کوئی وفادار ہستی آج اسے تسلی دینے کے لئے نہیں ہے۔ کوئی بینا اس کے لئے افسردہ نہیں ہے۔ کوئی ایسا نہیں ہے جو جنگ کی تباہ کاریوں کے درمیان اس کی زندگی کے لئے دعا مانگے۔ . . جو اس کا لوٹ آنے تک انتظار کرے۔ . . . اور اگر وہ اپنے ملک کے دفاع کے لئے لڑتا ہوا شہید ہو جائے تو غمزدہ دل اور فخر کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اسے ہمیشہ یاد رکھے۔ . . . اس کی زندگی کسی کے لئے اہم نہیں ہے۔ . . .

اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ نہ معلوم یہ کونسا احساس تھا جو اس کی آنکھوں سے آنسو بن کر بہہ نکلا تھا۔

صبح کا ہلکا ہلکا اُجالا پھیل رہا تھا۔ فضا میں زندگی کی حرارت پیدا ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ کسی نے دھیرے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ عارف نے اُٹھ کر کواڑ کھولے، سامنے بوڑھی نوراں کھڑی تھی۔ یہ بوڑھی گوالن ایک مخلص عورت تھی، اور یہاں سے بیس میل دور گاؤں میں رہتی تھی۔ کچھ عرصے پہلے جب عارف اس گاؤں میں رہا کرتے تھے تو بوڑھی نوراں اسے دودھ دینے آیا کرتی تھی۔ اس کا جوان بیٹا جنگ میں کام آچکا تھا۔ اور وہ گاؤں کے ہر سپاہی کو اپنے بیٹے کی طرح چاہتی تھی۔ خصوصاً عارف پر تو وہ بہت مہربان تھی۔ . . . لیکن جب وہ اس بستی میں آکر آباد ہوا تو اور باتوں کی طرح نوراں اس کے ذہن سے نکل گئی، اور آج وہ ایک عرصے بعد اس کے دروازے پر آئی تھی "کیسے آنا ہوا نوراں" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد نوراں نے سوال کیا۔

" میں نے سُنا تھا کہ آج تم جا رہے ہو۔ . . . سوچا اپنے بیٹے کو خدا حافظ کہہ آؤں"۔ نوراں کی آواز فرط جذبات سے کانپ رہی تھی۔

(بقیہ صفحہ ۱۴۸ پر)

ڈاکٹر معزّالدین

مہُوّا

مشرقی پاکستان کو نکھارنے اور سنوارنے میں قدرت نے بڑی فیاضی سے کام لیا ہے۔ آسمان پر کالے کالے بادل، زمین پر بل کھاتی ہوئی ندیاں، دھان کے سبز سبز کھیت، پان اور سپاری کے باغات، جہاں ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہو اور جہاں اودے اودے نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن کی فراوانی ہو اور مرغ چمن مستقل نغمے پہ اکساتے ہوں تو ایسی جنت بداماں جگہ میں گیت اور پریت کے سوا اور انسان سوچ ہی کیا سکتا ہے۔ رومان اور عشق یہاں کے خمیر میں ہے۔ اس حسن کا اصلی روپ دیکھنا ہو تو یہاں کے دیہاتوں کو دیکھئے جہاں حسن و عشق کا جادو ہر دور میں چلتا رہا ہے۔ رومان و محبت کی کتنی ہی دلدوز داستانیں، دردانگیز گیت، المناک نوحے اور پُردرد لوک کہانیاں یہاں کا تہذیبی سرمایہ ہیں۔

ایک زمانے میں شاہ محمد صغیر کی "یوسف زلیخا" زین الدین کی "رسول وجے" سبریدخاں کی "ودیا سندر" دونا غازی کی "سیف الملک بدیع الجمال" بہرام خاں کی "لیلیٰ مجنوں" اور محمد کبیر کی "مدھومالتی" جیسی منظوم داستانیں عوام میں بے حد مقبول تھیں۔ یہ وہ داستانیں ہیں جن میں یہاں کی زندگی اور یہاں کے ماحول کی اصلی روح جلوہ گر ہے۔ ان پر اس وقت برہمنی تہذیب کی چھاپ نہیں پڑی تھی۔ یہ کہانیاں چند صدی پہلے مشرقی پاکستان کے مختلف علاقوں میں بڑے شوق سے پڑھی اور سنی جاتی تھیں۔ بعض اوقات پڑھنے والے ان داستانوں کو اس انداز سے پڑھتے تھے کہ پڑھنے والے اور سننے والے دونوں پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔ سماں سا بندھ جاتا۔ آنکھیں آنسوؤں سے تر اور دل جذبات سے پُر ہو جاتے۔

اس باب میں ضلع میمن سنگھ کا مشرقی علاقہ خصوصیت کے ساتھ اس لئے قابل ذکر ہے کہ یہ حصّہ سیاسی جھگڑوں سے الگ اپنی کچھ آزادی رکھتا تھا۔ ایک زمانے میں یہاں "مہوّا" "ملوا" "کملا" "کنچن مالا" "چندراوتی" وغیرہ دل ہلا دینے والی منظوم داستانیں عوام میں بہت مقبول تھیں۔

یہ لوک کہانیاں مشرقی پاکستان کا تہذیبی ورثہ ہیں۔ ان میں ایک ایسی شاعری، ایک ایسا رس ہے جو یہاں کی زندگی کا سچا ترجمان ہے۔ ان میں بلا کی روانی اور غضب کا درد ہے۔ ان میں بنگال کا دل دھڑکتا ہے۔

بعد میں برہمن مذہب نے دیہی ادب کے ان انمول موتیوں کو الگ کر دیا۔ کیونکہ وہاں محبت کا جو عنصر ان منظوم داستانوں میں تھا وہ کٹر ہندو مذہب کے مزاج کے خلاف تھا۔ لیکن صدیوں تک میمن سنگھ کے مشرقی حصے میں ان داستانوں کو بڑا فروغ حاصل رہا۔ بعد میں مہوّا اور ملوا، جیسی مشہور داستانوں کی جگہ سیتا ساوتری، پرہلاد دھروا اور نل دمنتی نے لے لیں۔ کیونکہ یہاں جب برہمنی عقائد کا پرچار ہوا اور بھگتی پر زیادہ زور دیا جانے لگا تو ان کہانیوں کو جگہ نہ مل سکی۔ آگے چل کر ان داستانوں کی باضابطہ ترتیب و تنظیم ہوئی اور ان کی ہاجی اور تاریخی اہمیت کو محسوس کیا گیا کیونکہ ان میں اُس وقت کے ماحول، معاشرے اور خاندان کا سچّا عکس موجود ہے۔

میمن سنگھ کے مشرقی علاقے میں جو عوامی کہانیاں مقبول تھیں وہ اپنے مزاج اور آہنگ کے اعتبار سے مشرقی پاکستان کی دوسری علاقائی

کہانیوں سے مختلف تھیں۔ اسی لئے انہیں مین سنگھ گیتی کا کے نام سے علیحدہ ترتیب دیا گیا۔ ان کہانیوں میں درد انگیزی اور جادو بیانی کے لحاظ سے مہوا، کا جواب نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ مہوا، کا مصنف دیجو کنائی برہمن ہے۔ لیکن اندرونی شہادتوں کی بنا پر خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا مصنف کوئی مسلمان ہے۔ اس کی ابتدا حمد سے ہوتی ہے جس سے اس خیال کو اور بھی تقویت پہنچی ہے۔ مہوا، کا مسلمانی نام مہتہ اور ہومڑا کا نام "امرا" بتایا جاتا ہے۔ بہرحال اس کی اثر انگیزی پر کوئی فرق نہیں پڑتا

کہانی کی ہیروئن مہوا کا تعلق ایک نچلے طبقے سے ہے جس کی محرومی، ناداری اور نامرادی نے اس کہانی کی المناکی کو اور بڑھا دیا ہے۔ اب آئیے میں آپ کو مہوا کی المناک داستان سناؤں۔

گارو پہاڑی کی ترائی میں ہومڑا نام کا ایک خانہ بدوش رہتا تھا۔ وہ قریب کے گاؤں میں ڈاکے ڈالتا اور کسی طرح اپنے کنبے کی پرورش کرتا تھا۔ ایک دن ہومڑا لوٹ مار کرتا ہوا کنچن پور کے گاؤں میں پہنچ گیا۔ اس گاؤں کے برہمن کی ایک نہایت خوبصورت چھ ماہ کی بچی کو ہومڑا لے بھاگا۔ اس نے اس کو اپنی بیٹی کی طرح پالا۔ جب وہ جوان ہوئی تو غضب کی حسین نکلی۔ اس کے حسن و شباب کا چرچا گاؤں گاؤں میں پھیلا۔ وہ مہوا کے نام سے مشہور تھی۔ ہومڑا نے اسے نٹ کے کرتب سکھائے۔ وہ مہوا کو ساتھ لے کر گاؤں گاؤں پھرتا۔ مہوا نٹوں کے کھیل دکھاتی۔ اور ہومڑا پیسے بٹورتا۔ ایک روز ہومڑا کے ساتھ مہوا ایک گاؤں میں کھیل دکھا رہی تھی۔ بانسوں کے سہارے تنے ہوئے رسّے پر کچھ اس ادا سے وہ اپنے کرتب دکھا رہی تھی کہ گاؤں کا نوجوان برہمن "نادیا ٹھاکر" اس کے جمال جہاں سوز کی تاب نہ لاسکا اور اپنا دل دے بیٹھا۔ اس نے ہومڑا کو انعام میں ایک گاؤں دے دیا۔ ہومڑا اپنے خاندان کے ساتھ یہیں رہنے لگا۔ شام کو مہوا، ندی سے پانی لانے جاتی اور نادیا ٹھاکر اس کی راہ دیکھتا۔ عشق و محبت کی پینگیں بڑھنے لگیں اور عہد و پیمان کئے جانے لگے۔ ہومڑا کو اس کی خبر لگ گئی۔ اس نے مہوا کو پانی لانے سے روک دیا۔ وہ تنہائی میں آنسو بہاتی، لیکن کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس کی ایک سہیلی مونس تنہائی تھی وہی ڈھارس بندھاتی۔ اچانک ہومڑا وہاں سے اپنے کنبے کے ساتھ دوسری جگہ چلا گیا۔ نادیا ٹھاکر کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ بیقرار ہو گیا۔ ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ اور عالم بیقراری میں مہوا کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ وہ جنگل جنگل مارا پھرا۔ آخر کئی مہینے کے بعد کنکشائے ندی کے کنارے ہومڑا کا قافلہ ملا۔ موقعہ پاکر نادیا ٹھاکر اور مہوا گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ نکلے۔ ہومڑا کو جب معلوم ہوا تو فوراً ان کے پیچھے دوڑا۔ بھاگتے بھاگتے نادیا ٹھاکر اور مہوا ایک دریا کے کنارے پہنچے۔ مگر دریا کو پار کرنا محال تھا۔ اتفاق سے اسی وقت سادھو ماجھی اپنی ناؤ لے کر ادھر سے گزرا۔ یہ دونوں اس کی ناؤ میں بیٹھ گئے۔ لیکن جب ناؤ بیچ ندی میں پہنچی تو مہوا کی بھرپور جوانی دیکھ کر ماجھی کی نیت خراب ہو گئی۔ اس نے نادیا ٹھاکر کو دریا میں دھکیل دیا۔ مہوا کے ہوش اڑ گئے۔ سادھو ماجھی نے اس سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ مہوا کو اچانک خیال آیا کہ اس کے جوڑے میں سانپ کے زہر کی تھیلی ہے۔ اس نے سادھو ماجھی اور اس کے ساتھیوں سے کہا کہ پہلے پان کھلاؤ، تب باتیں ہوں گی۔ مہوا نے چالاکی سے پان میں سانپ کا زہر ملا کر سب کو کھلا دیا۔ آن کی آن میں سب کا کام تمام ہو گیا۔ وہ کشتی سے کود کر دریا کے کنارے کنارے نادیا ٹھاکر کی کھوج میں دوڑی۔ نادیا ٹھاکر دریا کے کنارے ایک جنگل میں مل گیا۔ بھوک سے وہ بے جان ہو گیا تھا۔ مگر اس جنگل میں کھانا کہاں۔ اتفاق سے ایک سنیاسی نظر آیا۔ وہ بھی بڑا پاپی تھا۔ اس نے کھانے کے عوض مہوا کی جوانی طلب کی۔ مہوا نے سادھو کو دھتکار دیا۔ اور نیم مردہ ٹھاکر کو اپنی کمزور پیٹھ پر لاد کر آگے چلی۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسی جگہ پہنچی۔ جہاں درختوں میں طرح طرح کے پھل لدے ہوئے تھے۔ وہ دونوں اسی پرفضا جگہ میں رہنے لگے۔ درختوں کے پھل کھاتے۔ دریا کا پانی پیتے اور پریم کے گیت گاتے۔ ایک دن اچانک مہوا نے بانسری کی آواز سنی۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ نادیا ٹھاکر نے گھبرا کر پوچھا کیا بات ہے۔ مہوا نے بتایا کہ بانسری کی یہ آواز اس کی سہیلی کی ہے۔ وہ اسے ہوشیار کر رہی ہے کہ ہومڑا اب قریب ہے۔ یہ دونوں بھاگنا ہی چاہتے تھے کہ ہومڑا اور اس کے ساتھیوں نے انہیں گھیر لیا۔ ہومڑا انتقام کی آگ میں جل رہا

(بقیہ ص ۲۶ پر)

شبیر افضل جعفری

غزل

داغ مہتاب نما ہوتے ہیں
زینتِ عرشِ علا ہوتے ہیں

دلفگارانِ تبسم پیشہ
قبلۂ کرب و بلا ہوتے ہیں

غمِ دلبر بھی، غمِ دوراں بھی
دلِ زندہ کی غذا ہوتے ہیں

تو فقیروں کو حقارت سے نہ دیکھ
ان میں کچھ لوگ ہُما ہوتے ہیں

راس آئے اگر انساں ہونا
پھر تو بندے بھی خدا ہوتے ہیں

سرِ نیزہ پہ ذبیحانِ وفا
جھوم کر نغمہ سرا ہوتے ہیں

زہر کا جام چڑھا کر افضل
ہم عناں گیرِ قضا ہوتے ہیں

تصدق رسول

غزل

بل کھاتا ہوا بر سرِ محفل جو رواں تھا
وہ دل کا دھواں تھا کہ چراغوں کا دھواں تھا

مت پوچھئے اُمیدِ دلِ زار کا عالم
اِس شاخِ تمنّا کا ہر اک پھول جواں تھا

اِس خون کی گردش کے سبب ہو گیا ظاہر
اِحساسِ غمِ عشق جو سینے میں نہاں تھا

سرسبز کیا ہم نے رہِ مُلکِ سُخن کو
اِس رہگزرِ شوق پہ سنسان سماں تھا

ہموار کیا جادۂ ہستی کو بمشکل !
اِس راہِ سفر میں کبھی اندیشۂ جاں تھا

اُمیدِ سُخن تھی کہ سرِ طور گئے ہم
منزل کی طرح ورنہ ہر اک سنگ نشاں تھا

بقیہ: حسرت، سندباد جہازی اور "شیرازہ" (بسلسلہ ص ۱۶)

دعائیں لو کہ یہ بڑے مستجاب الدعوات ہیں، پھر سالک صاحب سے کہنے لگے یہ لاہور کی مشہور طوائف بگو ہیں، اور ان کا پورا نام نجات المومنین ہے،

راقم الحروف کو یہ لطیفہ سالک صاحب نے حکیم صاحب کے مطب ہی میں سنایا تھا۔ سالک صاحب لطیفہ سُنا چکے تو میں نے کہا۔ آپ نے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ نجات المومنین ہیں تو مجھے احوال الآخرۃ کہیئے۔ (۱۶ مئی ۱۹۵۱ء)

یہ ہے "شیرازہ" کا ایک مختصر جائزہ، جو میں نے اس کے فائلوں کی سرسری ورق گردانی سے مرتب کیا ہے۔

ہمارا سندباد جہازی ایک طویل سفر پر روانہ ہو چکا ہے۔ جہاں سے وہ کبھی واپس نہ آئے گا۔ آج مجھے مصر قدیم کے بندرگاہ کے پاس وہ تاریخی دیوار یاد آتی ہے، صدیوں پہلے جس کے سہارے لگ کر ملاحوں کی بیویاں زار و قطار روتی تھیں کہ جانے ان کے شوہر طویل سفر سے کب واپس ہوں اور تب بھی ہوں یا نہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ساری دیوار ان کے آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھی۔ آج ہمارے دیس میں ادب اور صحافت کی دیوار بھی سندباد جہازی کے فراق میں بہائے ہوئے آنسوؤں سے تر ہے۔ لیکن اس میں حوصلہ ہارنے کی کوئی بات نہیں کیونکہ نئے ملاح اور نئے سفینے سمندر کے سینے پر رواں دواں رہیں گے۔ شخصیات کی یادگار رسالے وقت یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ زمانہ نہ کبھی پہلے بانجھ ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا۔ اور اس کے بطن سے نئی شخصیتوں کا جنم ایک تاریخی تقاضا ہے، جو پورا ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔

بقیہ: ...کوئی غمگسار ہوتا (بسلسلہ ص ۴۲)

عارف کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے جسم میں گرم گرم آگ بھر دی ہو شدت جذبات سے اس کی آنکھیں پُر نم ہو گئیں اور اس کی زبان سے صرف یہی نکل سکا "ماں!" اور وہ ایک کٹی ہوئی شاخ کی طرح نوراں کے بازوؤں میں جا گرا۔

دوسری صبح جب سعید اسے دیکھنے آیا تو اس نے دیکھا عارف وردی پہنے جوتوں کے فیتے باندھ رہا تھا۔

"کیا تم ڈیوٹی پر چل رہے ہو؟" سعید نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں"، عارف نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"مگر"، سعید کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا

"اگر مگر کچھ نہیں۔ آؤ چلیں ورنہ پہنچنے میں دیر ہو جائے گی" اور وہ سعید کا ہاتھ تھامے گھر سے باہر نکل گیا۔

بقیہ: غالب (بسلسلہ ص ۶۴)

بھی پوری طرح سمجھ جاتے تھے۔ اللہ نے ایک خاص وصف انہیں بخشا تھا۔ اُن کی کتابوں کی زبان اس وقت میرے پیش نظر نہیں ہے۔ دعا گو و احمد اس خط کو آپ نے پڑھا۔ جناب واحدی صاحب نے یہ خط اپنے خاص انداز اور لب و لہجہ میں لکھا ہے۔ اب باقی باتیں مولانا کی بابت پھر سنئے گا اور میر صاحب کو دعا دیجئے۔ کیا خوب فرما گئے ہیں۔

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنئے گا
پڑھتے کسی کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا

واقعی معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شاید یہ شعر میر مرزا کے متعلق ہی کہہ گئے ہیں۔ جی ہاں، غالب غالب تھے۔

بقیہ: مرزا محمد سعید دہلوی (بسلسلہ ص ۸)

نام کو نہ تھا۔ دُبلے پتلے، میانہ قد، گورا رنگ، اچھا ناک نقشہ، جامہ زیب، ریٹائرڈ لائف میں بجز جیسٹر کے انہوں نے انگریزی لباس نہیں پہنا۔ دُبلے ہونے کے باوجود شیروانی اُن کے جسم پر بھلی لگتی تھی۔

ژاں پال سارتر

ترجمہ شاہد احمد دہلوی

دیوار

انہوں نے ہمیں ایک بڑے سے سفید رنگ کے کمرے میں دھکیل دیا۔ میری آنکھیں چندھیانے لگیں۔ روشنی ان میں چکاچوند ہو رہی تھی۔ جب آنکھیں ذرا ٹھیک ہوئیں تو مجھے ایک میز نظر آئی۔ اس کے چاروں طرف چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ آدمی فوجی نہیں تھے۔ سب کے سب کچھ کاغذات دیکھ رہے تھے۔ دوسرے قیدیوں کو پیچھے کی طرف کھڑا کیا گیا تھا۔ اور ان تک پہنچنے کے لئے ہمیں پورے کمرے میں سے گزرنا پڑا۔ ان میں سے کئی ایسے تھے جنہیں میں جانتا تھا۔ باقی نہ جانے کون تھے۔ میرے سامنے جو دو قیدی تھے ان کے رنگ اُجلے اور سر گول تھے۔ ایک دوسرے سے بہت مشابہ۔ غالباً یہ فرانسیسی تھے۔ ان میں جو چھوٹا تھا، بار بار گھبرا کر اپنا پاجامہ اُوپر کو کھینچتا تھا۔

تین گھنٹے تک کارروائی ہوتی رہی۔ میں بے دم ہو رہا تھا۔ اور میرا سر خالی خالی سا ہو گیا تھا۔ یہ کمرہ خوب گرم تھا اور مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ کیونکہ پچھلے چوبیس گھنٹے ہم سردی سے کانپتے رہے تھے۔

قیدیوں کے نگراں ایک ایک کرکے قیدی کو میز کے آگے لاتے تھے۔ وہ چاروں آدمی ان کا نام اور کام پوچھتے۔ کام کم اور وقت زیادہ ضائع ہو رہا تھا۔ کبھی کچھ پوچھ لیا کبھی کچھ: "کیا کبھی تم نے کسی اسلحہ خانے کو برباد کیا؟" "نو تاریخ کی صبح کو تم کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے؟"

[illegible]

لکھنے لگتے۔ ٹام سے انہوں نے پوچھا "تم نے بین الاقوامی [illegible] میں شرکت کی ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟" ٹام اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ تلاشی کے وقت اس کی جیب سے کاغذات برآمد ہو چکے تھے۔ جوآن سے انہوں نے کچھ بھی دریافت نہیں کیا۔ [illegible] پکارنے کے بعد وہ دیر تک لکھتے رہے۔

جوآن بولا "وہ میرا بھائی جوزے ہے جو انارکسٹ ہے۔ آپ کو بخوبی علم ہے کہ وہ یہاں اب نہیں ہے۔ میں کسی [illegible] تعلق نہیں رکھتا۔ مجھے سیاسیات سے کبھی دلچسپی نہیں [illegible]" انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جوآن نے پھر بولنا شروع کیا "میں نے کچھ نہیں کیا۔ دوسروں کی سزا میں بھگتنا نہیں چاہتا۔"

اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ ایک محافظ نے [illegible]

اب میری باری آئی۔

"تمہارا نام پابلو ابی ای ٹا ہے؟"

میں نے کہا "جی ہاں۔"

اس شخص نے کاغذات کو دیکھا اور پھر مجھ سے پوچھا "رامون گرِس کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"تم نے [illegible] رکھا۔"

"جی نہیں۔"

پھر انہوں نے کچھ لکھا اور محافظ مجھے [illegible]

ہم سب مل کر چل پڑے۔

شام نے ان میں سے ایک سے پوچھا۔ "اب کیا ہوگا؟"

محافظ نے پوچھا "کیا؟"

"یہ کوئی تحقیقات تھی یا مقدمہ؟"

محافظ نے کہا "یہ مقدمہ تھا۔"

"ہمارا اب کیا ہوگا؟"

محافظ نے رکھائی سے جواب دیا۔ "اپنی اپنی کوٹھری میں تمہیں تمہارا فیصلہ سنا دیا جائے گا۔"

ہماری جو کوٹھری تھی وہ دراصل ایک ہسپتال کا تہہ خانہ تھا۔ یہاں بڑی سردی تھی۔ اور سرد ہوا کے جھونکے اس میں بہت آتے تھے۔ ساری رات ہم کانپتے رہے۔ دن کو بھی سردی کم نہ ہوئی۔ ہم نے پچھلے پانچ دن ایک گرجے کے تہہ خانے میں گزارے تھے یہ ایک طرح کا حبس تھا پرانے زمانے کا۔ وہاں قیدی بہت سارے تھے اور جگہ کم تھی۔ اس لئے جہاں جگہ ہوتی وہیں انہیں بند کر دیا جاتا تھا۔ مجھے اس میں قید ہونے کا غم نہیں تھا۔ سردی نے مجھ پر زیادہ اثر نہیں کیا تھا۔ مگر تنہائی نے مار دیا تھا۔ گلبارا لمبا اور راجیہ تھا۔ اس تہہ خانے میں ساتھی بھی تھے۔ جوان کو تو چپ لگ گئی تھی۔ وہ سہما ہوا تھا اور ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی جو آگے کچھ کہتا سنتا ہوتا۔ مگر ٹام اچھا ساتھی تھا اور ہسپانوی زبان خوب بولتا تھا۔

تہہ خانے میں ایک بنچ تھی اور چار چٹائیاں۔ جب ہمیں یہاں واپس لایا گیا تو ہم خاموشی سے بیٹھ کر انتظار کرتے رہے۔

چند لمحے بعد ٹام بولا۔ "ہم سب تو ختم ہوئے۔"

میں نے کہا "مجھے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ بچے کے ساتھ کچھ نہیں ہوگا۔"

ٹام بولا "اس کے خلاف تو کوئی بات ہے نہیں۔ بس یہی ہے کہ وہ ایک فوجی کا بھائی ہے۔"

میں نے جوان کی طرف دیکھا۔ وہ اس طرح بیٹھا تھا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔

ٹام نے پھر کہا "تمہیں معلوم ہے سارا گوسا میں [illegible]

کر رہے ہیں؟ قیدیوں کو سڑکوں پر لٹا کر ان پر لاریاں چلاتے ہیں۔ یہ بات ایک مراقشی فراری نے بتائی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس میں گولہ بارود کی کفایت رہتی ہے۔"

مجھے ٹام کی یہ بات کچھ بری لگی۔ ایسی بات کہنے کا کیا موقع تھا؟ میں نے جل کر کہا۔ "مگر پٹرول کی بچت تو نہیں ہوتی۔"

ٹام نے پھر کہنا شروع کر دیا۔ "وہاں سڑکوں پر اس کام کی نگرانی کے لئے افسر منہ میں سگریٹ دبائے اور جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے رہتے ہیں۔ تم سوچتے ہو گے کہ جو قیدی زندہ رہ جاتے ہیں انہیں یہ افسر مار ڈالتے ہوں گے۔ نہیں ایسا نہیں ہوتا۔ زخمیوں کو یونہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ گھنٹوں وہ پڑے چیخا کرتے ہیں۔ مراقشی کہہ رہا تھا جب میں نے پہلی دفعہ یہ بات دیکھی تو میری ہمت نے جواب دے دیا۔"

میں نے کہا۔ "مگر یہ حرکت وہ یہاں نہیں کریں گے۔ اگر گولہ بارود ہی کم ہو تو اور بات ہے۔"

تہہ خانے میں روشنی چار موکھوں میں سے آتی تھی اور بائیں طرف چھت میں ایک گول روشندان تھا جس میں سے آسمان نظر آتا تھا۔ اس پر ایک تختہ لگا ہوا تھا۔ یہ اصل میں کوئلہ اندر ڈالنے کی کھڑکی تھی۔ عین اس کھڑکی کے نیچے کوئلے کی خاک کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس کوئلے کا مقصد اصل میں ہسپتال کو گرم رکھنا تھا۔ مگر جب سے لڑائی چھڑی تھی، مریض یہاں سے ہٹا دیئے گئے تھے۔ کوئلہ یونہی پڑا رہ گیا۔ کھڑکی کھلی رہ گئی۔ اور بارش کے ساتھ اندر پانی بھی آتا رہا اور کوئلہ بھیگتا رہا۔

ٹام نے کانپنا شروع کر دیا۔ بولا۔ "یا اللہ! میں تو جما جا رہا ہوں۔ سردی نے پھر کھانا شروع کر دیا۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ پاؤں ہلانے کی ورزش کرنے لگا۔ ہاتھ کے ہر جھٹکے کے ساتھ سفید بال بھرے سینے پر سے اس کی قمیص کھل جاتی۔ پھر وہ چت لیٹ گیا۔ اور ٹانگیں اونچی کر کے قینچی کی ورزش کرنے لگا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ ٹام مضبوط آدمی تھا مگر موٹا بہت تھا۔ [illegible]

اگر وہ دکھا ہوتا تو شاید مجھے اتنا شدید احساس نہ ہوتا۔

سردی سے میں جما تو نہیں تھا مگر نہ تو اپنے کندھے ہلا سکتا تھا اور نہ ہاتھ۔ رہ رہ کر مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میرا کچھ کھو گیا ہے۔ اور میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی کہ میرا کوٹ کہاں ہے؟ اور پھر یکایک خیال آیا کہ انہوں نے ہمیں کوٹ دیا ہی کب تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ انہوں نے ہمارے کپڑے لے کر اپنے فوجیوں کو دے دیئے تھے۔ ہمارے پاس صرف اپنی قمیضیں تھیں۔ یا وہ سوتی پاجامے جو مریضوں کو گرمیوں میں پہنائے جاتے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد ٹام اٹھ کر بیٹھ گیا اور میرے پاس آکر ہانپنے لگا۔

"کچھ گرمی آئی؟"

"یا اللہ! کچھ بھی نہیں۔ سانس الگ بے قابو ہو گیا۔"

شام کو کوئی آٹھ بجے ایک افسر آیا اور اس کے ساتھ دو اور کوئی آدمی تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ پہرہ دار سے اس نے پوچھا "ان تینوں کے کیا نام ہیں؟"

پہرہ دار نے کہا "ابیتن باک، ابی ای ٹا، اور میربل۔"

افسر نے آنکھ سے چشمہ لگایا اور فہرست دیکھنے لگا۔

"ابیتن باک، ابیتن باک۔ یہ رہا۔ تمہیں موت کی سزا دی گئی ہے۔ کل صبح تمہیں گولی مار دی جائے گی۔"

یہ کہہ کر اس نے پھر فہرست دیکھنی شروع کر دی۔ اور بولا "باقی دونوں کو بھی۔"

جوآن نے گھبرا کر کہا "یہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے نہیں۔"

افسر نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہارا کیا نام ہے؟"

"جوآن میربل۔"

افسر نے کہا "ٹھیک ہے۔ تمہارا نام بھی ہے۔ تمہیں موت کی سزا ملی ہے۔"

جوآن نے کہا "مگر میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔"

افسر نے کندھے اچکائے۔ اور ٹام اور میری طرف پلٹ کر [illegible]

"باسک کوئی نہیں ہے؟"

افسر کو تاؤ آگیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا "کیا یہاں [illegible] باسک ہیں۔ ان کے پیچھے کہاں کہاں بھاگتا پھروں؟ تو ظاہر ہے کہ [illegible] کی ضرورت نہیں ہو گی؟"

ہم نے اسے جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ [illegible] ایک بلجین تھوڑی دیر میں آئے گا۔ اسے اجازت دی گئی ہے کہ [illegible] تمہارے ساتھ گزارے۔" افسر نے فوجی سلام مارا اور باہر چلا گیا۔

ٹام بولا "دیکھا، میں نے تم سے کیا کہا تھا؟ نرم دل ہیں یہ لوگ۔"

میں نے کہا "ہاں۔ مگر بچے کے لئے بہت برا ہوا۔"

میں نے یہ بات ازراہ انصاف کہی تھی۔ بچے سے مجھے محبت نہیں تھی۔ اس کا چہرہ بہت سکڑا ہوا، نقش بگڑے تڑے اور خوف اور اذیت سے بدنما ہو گئے تھے۔ ابھی تین دن پہلے وہ بچہ سا تھا اور بچوں ہی جیسی باتوں سے بہلایا کرتا تھا۔ مگر اب تو ستر ابتر نظر آتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ کمسن کبھی نہ دکھائی دے گا چاہے اسے چھوڑ ہی کیوں نہ دیا جائے۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے اس پر ترس آئے لیکن ترس کھانے سے مجھے نفرت ہوتی ہے۔ مجھے ترس کھانے سے ڈر لگتا ہے۔ وہ اور کچھ نہ بولا۔ بس سفید پڑ گیا۔ اس کے ہاتھ اور چہرہ دھوئے کپڑے کی طرح سفید پڑ گئے۔ وہ پھر بیٹھ گیا اور پھٹے دیدوں سے زمین کو گھورنے لگا۔ ٹام سلیقے کا آدمی تھا۔ اس نے بچے کا بازو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا تو اس نے زور سے جھٹک دیا اور عجیب طرح کا منہ بنایا۔

میں نے چپکے سے کہا "رہنے دو اسے۔ دیکھتے نہیں وہ پھوٹنے ہی والا ہے۔"

ٹام نے بادل ناخواستہ علیحدگی اختیار کی۔ وہ تو چاہتا تھا کہ بچے کو دلاسا دے۔ اس طرح اس کا اپنا بھی وقت گزر جاتا اور اپنی نازک حالت پر غور کرنے کی بجائے [illegible] وقت ہو رہا تھی [illegible]

تھام نے بولنا شروع کر دیا۔ مجھ سے پوچھنے لگا "تم نے بھی کسی کو قتل کیا ہے؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس نے مجھے بتانا شروع کر دیا: "جب سے گشت شروع ہوئی ہے میں نے چھ آدمی مارے ہیں۔" یہ تو مجھے ٹھیک یاد نہیں رہا تھا کہ کس کس جگہ۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے خود کبھی اس کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔ شاید بڑی اذیت ہوتی ہے۔ مجھے گولیوں کا خیال آیا اور اس جلتی ہوئی بوچھاڑ کا جو میرے جسم کو توڑ کر گزر جائے گی۔ یہ سب باتیں اصل سوال کے دائرے سے خارج تھیں۔ مجھے سکون سا تھا سوچنے سمجھنے کے لئے ہمارے پاس ساری رات باقی تھی۔ تھام نے بولنا بند کر دیا۔ میں نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا تو دیکھا کہ وہ بھی سفید پڑ گیا ہے، اور بڑا بے قرار دکھائی دے رہا ہے۔ دل میں میں نے کہا "شروع ہو گیا کام"

اب رات ہو چکی تھی اور سوراخوں میں سے جو روشنی آ رہی تھی کہ گئے کے ڈھیر سے مل کر کالا چکتا بنا رہی تھی۔ چھت کی کھڑکی میں سے مجھے ایک تارا بھی دکھائی دیا۔ رات صاف اور جما دینے والی ہوگی۔ دروازہ کھلا اور دو پہرہ دار اندر آ گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک اُجلے رنگ کا آدمی گلابی خاکی وردی پہنے ہوئے تھا۔ انہوں نے سلام کیا۔

وہ بولا "میں ڈاکٹر ہوں۔ ان تکلیف دہ حالات میں مجھے اختیار دیا گیا ہے کہ آپ کی اذیت کم کرنے میں مدد دوں۔" اس کی آواز خوشگوار اور شائستہ تھی۔

میں نے اس سے پوچھا "آپ یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟"

"میں ہر طرح آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ ان آخری ساعتوں کی اذیت کو آپ کے لئے کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

"آپ ہمارے پاس کیوں آئے ہیں؟ بے شمار اور آدمی پڑے ہیں [illegible]"

[illegible]

یہاں بیٹھا ہے۔ پھر جلدی سے کہنے لگا: "اچھا تم سگریٹ پینا چاہتے ہو؟ میرے پاس سگریٹ ہیں بلکہ سگار بھی ہیں۔"

اس نے ہمیں انگریزی سگریٹ دیئے اور سگار بھی مگر ہم نے لینے سے انکار کر دیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔

میں نے اس سے کہا "آپ یہاں ترس کھا کر تو آئے نہیں ہیں اس کے علاوہ میں آپ کو جانتا بھی ہوں۔ جس دن میں گرفتار ہوا بارکوں کے آگے صحن میں آپ کو میں نے فاشسٹوں کے ساتھ دیکھا تھا۔" میں ابھی بولے جا رہا تھا کہ ایکا ایکی کچھ ایسی بات ہوئی کہ جس نے مجھے متعجب کر دیا۔ اس ڈاکٹر کی موجودگی سے میری دلچسپی ایک دم ختم ہو گئی۔ بالعموم جب میں کسی کے سر ہو جاتا ہوں تو پھر مشکل ہی سے اس کا پیچھا چھوڑتا ہوں۔ بہرحال اس وقت بات کرنے کی خواہش بالکل معدوم ہو چکی تھی۔ میں نے کندھوں کو اچکا کر دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد پھر ادھر دیکھا تو ڈاکٹر میری طرف عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پہرہ دار ایک چٹائی پر بیٹھ گئے دُبلا، پیڈرو اپنے انگوٹھوں کو گھما رہا تھا۔ دوسرا پہرہ دار بار بار اپنے سر کو جھٹکا دیتا تھا کہ کہیں نیند نہ آ جائے۔

پیڈرو نے ڈاکٹر سے پوچھا "کیا آپ کے لئے روشنی لاؤں؟"

اس نے سر ہلا دیا۔ میں جانتا تھا وہ نرا کاٹھ کا اُلو ہے لیکن بد فطرت نہیں ہے۔ اس کی ابلی ہوئی نیلی آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ بھی برائی کرتا ہے محض عقل کی کمی کی وجہ سے کرتا ہے۔

پیڈرو باہر گیا۔ اور ایک تیل کا لیمپ لئے واپس آیا۔ لیمپ اس نے بنچ کے سرے پر رکھ دیا۔ روشنی تو وہ کچھ دیتا نہ تھا مگر نہ ہونے سے بہتر تھا۔ کل ساری رات ہم اندھیرے میں پڑے رہے تھے۔

میں کچھ دیر تک چھت میں روشنی کے اس حلقے کو دیکھتا رہا جو لیمپ کی چمنی نے بنایا تھا۔ مجھے بڑا لطف آیا۔ پھر ایکا ایکی [illegible] روشنی کا حلقہ غائب ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھ پر بڑا بھاری وزن رکھا ہوا ہے۔ [illegible]

گال جل رہے تھے اور سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو بدقت جنبش دی اور اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ثام اپنے دونوں ہاتھوں میں سر چھپائے ہوئے تھا۔ مجھے صرف اس کی سفید موٹی گدی دکھائی دے رہی تھی۔ چھوٹا جوآن زیادہ بدحال تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور نتھنے پھڑک رہے تھے۔ ڈاکٹر اس کے پاس گیا اور اُسے تسلی دینے کے لئے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ مگر اس کی آنکھیں ویسی کی ویسی ہی سرد رہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ بلجین کا ہاتھ آہستہ آہستہ جوآن کے کندھے پر سے پھسل کر بانہہ پر آیا اور پھر کلائی پر۔ بیچارہ جوآن نے کوئی توجہ نہ کی اور چپکا ہی رہا۔ جلدی سے ڈاکٹر نے تین انگلیاں اس کی کلائی پر جمائیں، پھر ذرا سا پیچھے ہٹا تاکہ میری طرف اس کی پیٹھ ہو جائے۔ لیکن میں نے آگے جھک کر دیکھا کہ اس نے جیب میں سے گھڑی نکال کر دیکھی اور پھر بچے کی کلائی کو چھوڑ دیا۔

بے جان ہاتھ چھوڑ کر وہ پھر دیوار سے جا لگا۔ پھر جیسے اُسے کوئی بڑی ضروری بات ایکا ایکی یاد آ گئی ہو۔ اس نے اپنی نوٹ بک نکالی اور اس میں کچھ لکھ لیا۔

مجھے بڑا غصہ آیا۔ حرامزادہ! اگر میری نبض دیکھنے آیا تو ایسا گھونسہ رسید کروں گا کہ یاد رکھے گا۔

وہ میرے نزدیک آیا تو نہیں مگر مجھے محسوس ہوتا رہا کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔

میں نے نظریں اٹھا کر سیدھی اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ غیر انسانی سی آواز میں اس نے کہا: "تمہیں سردی نہیں لگ رہی؟"

اُسے سردی لگ رہی تھی اور اُس کا رنگ نیلا ہو رہا تھا۔

میں نے کہا: "نہیں، مجھے سردی نہیں لگ رہی۔"

اس نے میری طرف دیکھنا بند نہیں کیا۔ میں جلد ہی سمجھ گیا اور میں نے اپنا چہرہ [illegible] ہاتھوں میں چھپا لیا۔ میں پسینہ میں شرابور تھا [illegible] [illegible] میں پھیلا ہوا اُس کے [illegible] پسینہ آ رہا تھا۔ میں نے سر کے بالوں میں انگلیاں

دونوں کنپٹیوں پر پسینے سے بال گیلے ہو رہے تھے۔ اسی وقت [illegible] کہ میری قمیض بھیگ کر جسم سے چپک گئی ہے۔ کم از کم ایک گھنٹے سے پسینہ نچڑ رہا تھا اور مجھے کچھ بھی خبر نہ تھی۔ لیکن اُس بلجین [illegible] خوب تاڑ لیا تھا۔ اُس نے میرے گالوں پر قطرے ڈھلکتے دیکھے اور سوچا ہو گا کہ یہ تو انتہائی خوف کی علامت ہے [illegible] سردی لگ رہی تھی جو صحت اور تندرستی کی علامت [illegible] ڈاکٹر کو بڑا ناز اور فخر ہوا ہو گا۔ جی میں آئی کہ اُٹھ کر اس [illegible] دوں، مگر میں نے اس ارادے سے ابھی حرکت بھی نہیں کی تھی [illegible] خفت اور غصہ دونوں غائب ہو گئے۔ میں بینچ پر بے توجہی سے پھر بیٹھ گیا اور اپنی گردن پر سے رومال سے پسینہ پونچھنے لگا۔ کیونکہ [illegible] اب بالوں میں بہہ بہہ کر گدی پر آ رہا تھا اور بڑا گھناؤنا معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے پونچھنا بند کر دیا۔ کیونکہ بیکار ثابت ہو رہا تھا۔ میرے [illegible] پر بھی پسینہ بہہ رہا تھا اور بیچارہ بینچ سے چپک رہا تھا۔

کم عمر جوآن ایکدم سے بولا۔ "کیا تم ڈاکٹر ہو؟"

بلجین نے کہا "ہاں"۔

"کیا بہت ..... بہت دیر تک تکلیف ہوتی ہے؟"

بلجین نے بڑی شفقت سے پوچھا "کب؟ ... نہیں جلد ہی ختم ہو جاتی ہے۔"

ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی بیمار کو دلاسا دے رہا ہو۔

"مگر مجھے ..... مجھے کسی نے بتایا تھا ... بعض دفعہ [illegible] مارنی پڑتی ہے۔"

بلجین نے کندھے اُچکا کر کہا "کبھی کبھی۔ ایسا ہوتا ہے [illegible] دفعہ کہ پہلی باڑھ میں سارے اعضائے رئیسہ بچ جائیں [illegible] ہو سے۔"

جوآن نے کہا: "تو وہ [illegible] بھرتے ہوں گے [illegible] پھر نشانہ لگاتے ہوں گے؟" [illegible] [illegible] اس [illegible] کچھ دیر لگتی ہو گی؟"

اُسے [illegible] [illegible] [illegible]
اُسے [illegible] احساس [illegible] [illegible]

خوف کا یہ خیال نہیں تھا اور یہ کوئی خوف کی وجہ نہیں تھی کہ مجھے پسینہ آ رہا تھا۔

میں اٹھا اور کوئلے کی خاک کے ڈھیر تک چل کر گیا۔ ثام جھکا اور اس نے مجھے نفرت کی نگاہوں سے دیکھا۔ میرا ہوتا چہرا تھا۔ اس لئے مجھے طیش آیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں میرا چہرہ بھی ایسا ہی خوف زدہ تو نہیں ہو رہا جیسا کہ ثام کا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے بھی پسینے چھوٹ رہے تھے۔ آسمان بالکل صاف پڑا تھا۔ اس کونے میں روشنی بالکل نہیں آتی تھی۔ ذرا سر اوپر کو اٹھایا۔ اور سات ستاروں کا جھمکا دکھائی دیا۔ لیکن یہ اب ویسا نہیں دکھائی دیتا تھا اور ہر گھڑی بھولی بسری باتیں یاد آتی رہتی تھیں۔ جب صبح ہوئی اور آسمان نیلا اور سخت نظر آنے لگا تو مجھے اٹلانٹک کے ساحل یاد آئے۔ دوپہر کو میں نے سورج دیکھا اور مجھے سیتول کا ایک میکدہ یاد آیا جہاں میں نے "مانزا نیلا" پی اور زیتون کے پھل کھائے تھے۔ تیسرے پہر کو میں گہرے سائے میں تھا اور مجھے ان اندھیرے سایوں کا خیال آیا جو روم کے اکھاڑوں پر اس طرح چھا جاتے ہیں کہ آدھے تو اندھیرے میں چھپ جاتے ہیں اور آدھے دھوپ میں جگمگاتے رہتے ہیں۔ ساری دنیا کو اس طرح آسمان میں منعکس دیکھنا خاصا تکلیف دہ ثابت ہوا۔ مگر اب میں جتنا بھی چاہوں، آسمان کو تکتا رہوں۔ میرے لئے آسمان کے کوئی معنی نہیں رہے تھے۔ اس حالت میں ہی آسمان بہتر تھا۔ میں جا کر ثام کے قریب بیٹھ گیا... تھوڑا سا وقت اور گذر گیا۔

ثام نے بھی آواز میں بولنا شروع کیا۔ اسے ہمیشہ ہی بولنا پڑتا تھا ورنہ اس کے خیالات تمام گڈمڈ ہو جاتے تھے۔ میں سمجھا کہ مجھ سے کہہ رہا ہے۔ مگر وہ میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ یقیناً وہ مجھ سے ڈر رہا تھا کہ کہیں مجھے دیکھ نہ لے۔ کیونکہ میرا رنگ سفید پڑ گیا تھا اور پسینے بہہ رہے تھے۔ ہم سب ایک جیسے تھے۔ اور سب خبطی کہلانے میں آئینہ سے بھی بدتر تھے۔ اس نے بلجیئن کی طرف دیکھا کیونکہ وہی تو ایک شخص زندہ تھا۔

"کیا تمہاری سمجھ میں کچھ آتا ہے؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔"

میں نے بھی چپکے چپکے بولنا شروع کر دیا۔ پھر بلجیئن کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے؟"

"ہمارے ساتھ کچھ ہونے والا ہے کیا ہوگا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

ثام کے پاس سے ایک عجیب طرح کی بو آ رہی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میری قوتِ شامہ اتنی تیز کبھی بھی نہیں تھی جتنی کہ اس وقت۔ میں نے نفرت سے ناک چڑھائی۔

"تمہیں جلدی ہی معلوم ہو جائے گا۔"

ثام نے ضدی پنے سے کہا۔ "کچھ صاف سمجھ میں نہیں آتا۔ میں ساتھ سے بہادر بن سکتا ہوں مگر مجھے آخر معلوم تو ہو۔ سنو، وہ ہمیں احاطے میں لے جائیں گے۔ چلو ٹھیک ہے۔ وہ لوگ ہمارے سامنے قطار بنا کر کھڑے ہو جائیں گے۔ کتنے ہوں گے وہ؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ پانچ یا آٹھ ہوں گے۔ زیادہ نہیں ہوں گے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ آٹھ ہوں گے۔ ان سے کہا جائے گا 'نشانہ لو'۔ اور میں دیکھوں گا کہ آٹھ رائفلیں میری طرف اٹھ گئیں۔ سوچتا ہوں اس وقت جی یہی چاہے گا کہ دیوار پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ میں اپنی پوری طاقت سے دیوار میں سما جانے کی کوشش کروں گا۔ اور دیوار ایک کابوس کی طرح مجھے بے بس کر دے گی۔ یہ سب کچھ تو میرے تصور میں آتا ہے۔ کاش تم جان سکو کہ یہ سب باتیں کس آسانی سے میرے تصور میں آ جاتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "بس بھائی بس۔ تصور ہمارے پاس بھی ہے۔"

"بڑی سخت تکلیف ہوتی ہوگی۔ معلوم ہے تمہیں، شکل و صورت بگاڑنے کے لئے وہ آنکھوں اور منہ کا نشانہ لیتے ہیں۔"

مجھے زخموں کی موجودگی ابھی سے معلوم ہو رہی تھی۔ ایک گھنٹے سے میرے سر اور گردن میں درد ہو رہا تھا۔ سچ مچ کا درد نہیں۔ اس سے بھی بدتر۔ ایسا درد جس کو میں اگلے دن بھی محسوس کرتا رہا۔ "اور اس کے بعد؟"

میں خوب سمجھ رہا تھا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ مگر میں ظاہر کر رہا تھا کہ جیسے کچھ بھی نہیں سمجھ رہا۔ رہا درد کا سوال، تو میرے جسم میں جگہ جگہ درد تھا، جیسے چھوٹے چھوٹے زخموں کا ڈھیر لگا ہوا ہو۔ اس کا کوئی مداوا میرے پاس نہیں تھا۔ لیکن ثام کی طرح میں نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

ہیں نے جھک کر کہا۔ اس کے بعد لالہ دکھ اگلیں گے۔"

اُس نے پھر آپ ہی آپ بولنا شروع کر دیا۔ اُس کی نظریں بھی پرہی ہی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر معلوم ہوتا تھا کہ سُن ہی نہیں رہا۔ مجھے معلوم تھا وہ کیا کرنے آیا ہے۔ کوئی نہ کوئی ایسی بات جس کا ہمیں خیال بھی نہیں ہوگا اس کی دلچسپی کا باعث بن جائے گی۔ وہ ہمارے جسموں کو دیکھنے آیا تھا۔ ان جسموں کو جو زندہ عذاب میں مُبتلا تھے۔

ٹام نے کہا "یہ سب ایک کابوس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کسی بات کو سوچوں، احساس ہوتا ہے کہ میں نے اُسے سوچ سمجھ لیا ہے اور اس کی حقیقت واضح ہو گئی ہے۔ اور اتنے ہی میں وہ گرفت سے نکل جاتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا بعد میں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ کبھی کبھی وہ لمحے بھی آجاتے ہیں جب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس کی تہ کو اب پہنچا کہ اب پہنچا... مگر وہ اتنے ہی میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ میں نے پھر تکلیف اور گولیوں اور دھماکوں پر غور کرنا شروع کر دیا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں مادہ پرست ہوں، میں دیوانہ نہیں ہونے کا۔ مگر کوئی کل بگڑی ہوئی ضرور ہے۔ میں اپنی لاش کو دیکھتا ہوں۔ یہ کوئی دشوار امر نہیں ہے۔ مگر یہ میں ہوں جو دیکھتا ہوں۔ خود اپنی آنکھوں سے۔ مجھے یہ سوچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یہ سوچنے کی کہ میں کوئی چیز بھی پھر نہیں دیکھ سکوں گا۔ کوئی بات پھر نہیں سُن سکوں گا۔ لیکن دنیا کا کارخانہ دوسروں کے لئے اسی طرح چلتا رہے گا۔ کسی کو اس ڈھنگ سے نہیں بتایا گیا کہ وہ اس طرح سوچے پابلو۔ تم میرا یقین کرو۔ ایسا پہلے بھی ہو چکا ہے۔ ساری کی ساری رات جاگ کر، کسی چیز کے انتظار میں۔ مگر وہ چیز اس کی طرح نہیں تھی۔ اس نے تو ہماری قوت ہی سلب کر لی پابلو۔ اور ہم اپنے آپ کو تیار بھی نہیں کر سکے۔"

میں نے اس سے پوچھا "میں تمہارے لئے کسی پادری کو بلوا دوں تاکہ تم اپنے گناہوں کا اقرار کر کے پاک ہو جاؤ۔"

اُس نے مجھے جواب نہیں دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ دلیوں کی طرح بے رنگ آواز میں بار بار میرا نام لینا چاہتا تھا۔ میں نے اس کا [illegible] خیال نہیں کیا۔ ہم سب آرٹسٹ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مجھے کچھ موہوم سا خیال تھا کہ اس کے پاس سے [illegible] حقیقتاً میں مجھے ٹام کے ساتھ کچھ زیادہ ہمدردی [illegible] ہونے کی کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی تھی کیونکہ ہم دونوں کو [illegible] مرنا تھا۔ اور لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرنے کی نوعیت دوسری ہے۔ مثلاً رامن گرس کے ساتھ۔ مگر ٹام اور جوآن کے ساتھ [illegible] میں اکیلا تھا۔ میں تنہائی کو ترجیح بھی دیتا تھا۔ رامن گرس کے ساتھ [illegible] سے پیش آتا۔ لیکن اس وقت میں نہایت سنگ دل [illegible] دل ہی رہنا چاہتا تھا۔

وہ بے سوچے سمجھے بڑبڑاتا رہا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس [illegible] جا رہا تھا کہ سوچنے سے بچا رہے۔ فطری طور پر مجھے اُس سے [illegible] جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہی میں بھی کہہ سکتا تھا۔ یوں مرنا فطری امر نہیں تھا مگر چونکہ مجھے اب مرنا تھا اس لئے کوئی چیز بھی مجھے فطری نہیں معلوم ہوتی تھی۔ کوئلے [illegible] نان کا ڈھیر، بنچ، پیڈرو کا گندہ چہرہ [illegible] اس بات سے چڑ ہو رہی تھی کہ مجھے بھی وہی سوچنا پڑ رہا تھا جو ٹام سوچ رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ رات بھر ہر پانچ منٹ بعد ہم ایک [illegible] سوچتے رہیں گے، ایک ہی وقت میں، اور ایک ہی ساتھ [illegible] چھوٹیں گے۔ اور ہم کانپتے رہیں گے۔ میں نے کن انکھیوں سے [illegible] طرف دیکھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس میں تبدیلی دکھائی دی [illegible] اُس کے منہ پر لکھی ہوئی تھی۔ میری خودداری کو ٹھیس لگی۔ ٹام کے ساتھ میں چوبیس گھنٹے سے تھا میں نے اس کی باتیں سُنی تھیں اُس سے [illegible] کی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ ہم دونوں میں کوئی مماثلت نہیں [illegible] اب ہم دونوں بالکل ایسے تھے جیسے جڑواں بھائی۔ محض اس وجہ سے کہ ہم دونوں کو ایک ساتھ مرنا تھا۔ ٹام نے میری طرف دیکھے بغیر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"پابلو، معلوم نہیں... معلوم نہیں وجود بالکل ہی ختم ہو جاتا ہے یا نہیں۔"

میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کہا "ابے سُوّر، ذرا اپنے نیچے تو دیکھ۔"

اس کے دونوں پاؤں کے بیچ میں تالاب سا بنا ہوا تھا

[illegible] سے [illegible] رہے تھے۔

بلجین قریب آیا اور بناوٹی توجہ سے پوچھنے لگا "کیا آپ کی [illegible] خراب ہے؟"

شام نے بدمزاجی سے کہا "میں نہیں جانتا یہ کیا ہے، مگر مجھے [illegible] رہا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں مجھے ڈر نہیں لگ رہا۔"

بلجین نے اپنی کاپی میں کچھ لکھ لیا۔ ہم اُسے دیکھتے رہے۔ [illegible] جوان بھی اُسے دیکھتا رہا۔ ہم تینوں اُس کی طرف اس لئے دیکھ رہے تھے کہ وہ زندہ تھا۔ اُس کی حرکات و سکنات سب زندہ آدمیوں کی سی تھیں۔ تفکرات زندہ آدمیوں جیسے تھے۔ اس تہ خانے میں وہ اسی طرح کانپ رہا تھا جس طرح زندہ حل کو کانپنا چاہئے۔ اس کا جسم [illegible] تھا اور پوری طرح اُس کے اختیار میں تھا۔ ہم تینوں ـــــ [illegible] اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہا تھا۔ یا کم از کم اس حد تک جس حد تک بلجین کو تھا۔ میں بھی اپنے پائجامے کو ٹٹولنا چاہتا تھا مگر میری ہمت نہ پڑی۔ میں نے بلجین کو اپنی ٹانگیں جھکاتے دیکھا۔ اپنے رگ پٹھوں پر اُسے کامل اختیار تھا ـــ اور وہ یہ بھی سوچ سکتا تھا کہ کل کیا ہوگا۔ ہم تینوں بے خون کے بھوت، اُسے تک رہے تھے اور رخفاشوں کی طرح اُس کا خون چوس رہے تھے۔

بلجین نے اس سلسلے کو یوں توڑا کہ کم سن جوان کے قریب گیا۔ کیا کسی طبی وجہ سے وہ جوان کی گردن چھو رہا تھا یا یہ کوئی ہمدردی کا جذبہ جو دکھا رہا تھا؟ اگر یہ مہربانی تھی تو ساری رات میں پہلی مرتبہ ظاہر ہوئی تھی۔ اُس کے ہاتھ نے جوان کے سر اور گلے کو چھوا۔ جوان اُسے ویسے ہی گھورتے گیا اور کچھ نہ بولا۔ پھر ایک دم سے اُس نے بلجین کا ہاتھ اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ ان سفید بڑے کھنسے پنجوں میں ایک موٹے چربیلے ہاتھ کا پھنسنا اسی کوئی دلچسپ چیز نہیں تھی۔ میں منتظر رہا کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے، اور تام بھی یہی سوچ رہا ہوگا لیکن بلجین اس کا کوئی مطلب نہیں نکال سکا۔ وہ مشفقانہ انداز سے مسکراتا رہا۔

ذرا سی دیر بعد جوان نے اس موٹے چربیلے ہاتھ کو اپنے منہ کی طرف کھینچا اور اُسے کاٹنا چاہا۔ بلجین نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور [illegible] پیچھے ہٹ کر پھر دیوار سے جا لگا۔ ایک لمحہ کیلئے

اُس نے ہم سب کی طرف خوف سے دیکھا۔ اُسے یقیناً خیال آیا ہوگا کہ ہم اُس کی طرح کے آدمی نہیں ہیں۔ میں نے ہنسنا شروع کیا اور ایک محافظ چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرا اسی طرح سوتا رہا۔ اُس کی آنکھیں کھلی تھیں اور سفید سفید پپوٹے دکھائی دے رہے تھے۔

ایک ہی وقت میں میں تھکا ہوا بھی تھا اور گھبرایا ہوا بھی۔ صبح کیا ہونے والا ہے یا مرنے کے بارے میں کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں نکل سکتا تھا۔ ذہن میں الفاظ ہی الفاظ یا خلا ہی خلا آئے گا۔ کسی اور بات پر خیال جاتا تو مجھے بندوق کی نالیں یا رائفلیں اپنی طرف لگی ہوئی دکھائی دیتیں۔ بیسیوں ہی دفعہ میں نے اپنے آپ کو مرتے دیکھا اور ایک دفعہ تو ایسا معلوم ہوا کہ واقعی مجھے مار دیا گیا ہے۔ شاید میری آنکھ لگ گئی ہوگی۔ وہ مجھے دیوار کی جانب گھسیٹ کر لے جا رہے تھے۔ اور میں ان سے کشمکش کر رہا تھا۔ میں اُن سے معافی مانگ رہا تھا۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور میں نے بلجین کی طرف دیکھا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ میں سوتے میں چیخنے لگا ہوں؟ مگر وہ کھڑا اپنی مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا ـــ اس نے کوئی غیر معمولی بات نہیں دیکھی تھی۔ اگر میں چاہتا تو شاید تھوڑی دیر کے لئے سو جاتا۔ میں اڑتالیس گھنٹے سے جاگ رہا تھا۔ میرا پلیتھن نکل چکا تھا۔ زندگی کے دو گھنٹے کیوں ضائع کئے جائیں۔ صبح جب وہ مجھے آکر جگائیں گے تو نیند کے خمار میں مجھے ان کے پیچھے پیچھے گھسٹنا پڑے گا۔ اور میں چوں کئے بغیر ڈھیر ہو جاؤں گا۔ یہ میں نہیں چاہتا تھا۔ کسی بے زبان جانور کی طرح میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں سمجھنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے خوف تھا کہ سوتے میں کابوس کے دورے نہ پڑ جائیں۔ میں نے اُٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ دماغ کے خلا کو بھرنے کے لئے میں نے اپنی ساری زندگی کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ پچھلی باتیں جوق در جوق اُبل پڑیں۔ اچھی بھی اور بری بھی ـــ یا شاید آج پہلی دفعہ مجھے ان کی تخصیص پیدا ہوئی تھی۔ چہرے ہی چہرے یا کہانیاں ہی کہانیاں۔ ایک نئے بھرتی ہوئے نوجوان کا چہرہ دوبارہ دیکھا، جو ولنشیا میں مارا گیا تھا۔ ماموں کا چہرہ بھی [illegible] کہانیاں یاد آئیں۔ [illegible] ۱۹۲۶ء میں کس طرح میں بیکار پھرتا رہا [illegible]

میں بھوک سے مر جاؤں۔ وہ رات یاد آئی جو میں نے غرناطہ کے ساحل پر گزاری تھی۔ میں نے تین دن سے کھانا نہیں کھایا تھا اور مجھے سخت طیش آ رہا تھا۔ میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس پر مجھے ہنسی آئی تھی شدت سے میں مسرتوں، عورتوں اور آزادی کے پیچھے دوڑتا تھا! کیوں؟ میں ہسپانیہ کو آزاد کرانا چاہتا تھا۔ میں انقلابیوں کی جماعت میں شریک ہو گیا تھا۔ جگہ جگہ تقریریں کرتا پھرتا تھا۔ میں نے اس سب کچھ کو دین و ایمان سمجھ رکھا تھا۔ اور اپنے کو سمجھ لیا تھا کہ غیر فانی ہوں۔

اس لمحے میں مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری ساری زندگی میرے سامنے آ گئی ہے اور میں نے دل میں کہا "یہ سب جھوٹ ہے" اس کی قدر و قیمت ہی کیا ہے۔ یہ تو ختم ہو گئی۔ تعجب ہوتا تھا کہ میں کیسے آوارہ پھرتا تھا۔ اور لڑکیوں سے کیسے مذاق کرتا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں اس طرح مروں گا تو اٹھ کر کچھ بھی نہ چھوڑتا۔ میری زندگی میرے سامنے تھی، ختم شدہ ــــ جیسے تھیلے میں بند ہو لیکن اس کے اندر کی ہر چیز ناتمام تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے میں نے اسے جانچنا چاہا۔ میں کہنا چاہتا تھا "آہ! کیسی حسین زندگی ہے" مگر اسے جانچا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ یہ تو صرف ایک ہیولیٰ تھا۔ ابدیت کی شاہراہ پر اپنے نشانِ راہ بنانے ہی میں میں نے اپنی ساری زندگی صرف کر دی تھی اور خاک بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا ــــ مجھے کسی بات کا افسوس نہیں تھا ــــ بے شمار چیزیں تھیں جن کا افسوس کیا جا سکتا تھا۔ مثلاً شراب نوشی میں میرا منزا نیلا پینے کا ذوق، یا قرطبہ کے قریب ایک چھوٹی سی کھاڑی میں نہانا۔ مگر موت نے سب کو غارت کر دیا تھا۔

بلجین کے دماغ میں ایک دم سے ایک خوشگوار تجویز آئی، اور وہ ہم سے کہنے لگا "میرے دوستو! میں یقین دلاتا ہوں ــــ بشرطیکہ فوجی منتظمین اجازت دیں ــــ کہ اگر تم اپنے کسی پیارے کو چٹھی لکھو تو میں اُسے پہنچا دوں گا"

ٹام نے کراہتے ہوئے کہا "میرا کوئی نہیں ہے"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ٹام تھوڑی دیر منتظر رہا پھر تعجب سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"کیا کونشا کو کوئی پیغام نہیں بھیجو گے؟"

"نہیں"

مجھے اس اشارے پر نفرت ہونے لگی۔ یہ میرا قصور تھا۔ میں نے کل رات کو کونشا کا ذکر کیا تھا۔ مجھے کرنا نہیں چاہئے تھا۔ میں اس کے ساتھ ایک سال تک رہا۔ ایک دن پہلے اگر پانچ منٹ بھی اس کے ساتھ گزارنے کی مجھے اجازت مل جاتی تو میں معاوضے میں اپنا ہاتھ تک کٹوا ڈالتا۔ یہی شدت تھی جس کی وجہ سے میں نے اس کا تذکرہ کر دیا۔ میں بے قابو ہو گیا تھا۔ لیکن اب تو میں اُسے دیکھنا تک گوارا نہیں کر سکتا تھا ــــ اس سے مجھے کچھ نہیں کہنا تھا۔ میں اُسے اپنی آغوش تک میں لینے کو تیار نہیں تھا۔ مجھے اپنے جسم سے خوف لگ رہا تھا۔ کیونکہ وہ سفید پڑ گیا تھا۔ اور پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر شاید اس سے بھی ایسی ہی نفرت ہو جاتی جیسی کہ اپنے آپ سے۔ کونشا جب میری موت کی خبر سنے گی تو روئے گی۔ مہینوں اپنی زندگی پر موت کو ترجیح دے گی۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ مرنا تو مجھے ہے۔ مجھے اس کی حسین ملائم آنکھوں کا خیال آیا۔ جب وہ میری طرف دیکھتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی چیز اس میں سے نکل کر مجھ میں آ گئی ہے۔ مگر اب تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ اگر وہ مجھے اب دیکھے تو اس کی نظر بھی اس کی آنکھوں ہی میں رہ جائے گی مجھ تک نہیں پہنچے گی ــــ میں اکیلا تھا۔

ٹام بھی اکیلا تھا۔ مگر اس طرح کا اکیلا نہیں۔ وہ بنچ پر پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا۔ اُس نے بنچ کو مسکرا کر دیکھا۔ اُسے حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بنچ کو بڑی احتیاط سے چھوا۔ اُس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کانپنے لگا۔ اگر میں ٹام ہوتا تو بنچ کو اس طرح چھوتا بھی پسند نہ آتا۔ یہ تو کچھ تماشے کی سی بات ہوئی۔ ہاں یہ میں نے بھی محسوس کیا کہ تمام چیزیں پرانی دکھائی دے رہی تھیں، دھندلی اور کچھ کھلی ہوئی۔ میرے لئے یہی کافی تھا کہ بنچ، لیمپ، کوئلے کی خاک کے ڈھیر کو دیکھوں اور محسوس کروں کہ میں مرنے والا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میں موت کے بارے میں واضح طور پر نہیں سوچ سکتا تھا۔ لیکن میں اسے ہر جگہ دیکھ سکتا تھا۔ چیزوں میں، چیزوں کی تبدیلیٔ ہیئت میں، اس طرح جیسے کسی مرنے والے کی بالین پر چپکے چپکے باتیں کی جاتی ہیں۔ یہ اس کی

...موت تھی جسے ٹام نے پنچ پر چڑھا تھا۔

جس حالت میں میں اب تھا اگر کوئی مجھ سے آکر یہ کہتا کہ میری جاں بخشی ہوگئی ہے اور میں اپنے گھر جا سکتا ہوں تب بھی میں ایسا ہی سرد رہتا۔ کئی گھنٹے انتظار کرنا یا کئی سال انتظار کرنا بات ایک ہی ہے۔ جب یہ فریب زائل ہو جائے کہ ہم کبھی نہیں مرینگے ایک طرح سے تب مجھے کسی بات کی پروا نہیں رہی تھی۔ مجھے سکون تھا مگر کس قیامت کا سکون! جسمانی طور پر میں ان آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، ان کانوں سے سُن رہا تھا۔ مگر میں میں نہیں تھا۔ پسینے از خود چھوٹ رہے تھے اور کپکپی تھی کہ خود بخود لگ رہی تھی۔ میں اپنے جسم کو اب خود بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔ مجھے اسے دیکھنا پڑتا تھا، یہ جاننے کے لئے کہ اس کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ میرا جسم ایسا ہو گیا تھا جیسے کسی اور کا جسم ہو۔ بعض دفعہ ایسا معلوم ہوتا کہ ایک بوجھ ہے، جو مجھے دبا رہا ہے۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ مجھے بہت بڑے کپڑے سے باندھ دیا گیا ہے۔ ایک دفعہ میں نے اپنے پاجامے کو چھوا، وہ گیلا تھا۔ نہیں نہیں، یہ پسینے سے گیلا ہوا تھا یا پیشاب سے؟ احتیاطاً میں نے جا کر کوئلے کی خاک کے ڈھیر پر پیشاب کیا۔

بلجیئن نے اپنی گھڑی نکال کر دیکھی اور بولا "ساڑھے تین بجے ہیں۔"

بدمعاش کہیں کا، جان کراس نے وقت بتایا تھا۔ ٹام اچھل پڑا۔ اب تک ہم نے سوچا نہیں تھا کہ وقت گزرا جا رہا ہے۔ کالی رات نے ہم کو گھیر رکھا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں تھا، کہ رات کب اور کیسے شروع ہوئی تھی۔

کمسن جوآن نے رونا شروع کر دیا۔ وہ اپنے ہاتھ مل مل کر اور گڑگڑا کر کہنے لگا "میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔" وہ ہاتھ اٹھائے اِدھر اُدھر بھاگتا پھرا۔ پھر ایک چٹائی پر گر پڑا اور روتا رہا۔

ٹام نے اُسے دیکھ کر افسوس کیا۔ وہ جوآن کی تسلی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بات بھی یہی تھی کہ اس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ وہ ہم سے زیادہ شور مچا رہا تھا مگر وہ ہم سے کم متاثر تھا۔ وہ اس مریض کی طرح تھا جو اپنی بیماری کا مقابلہ بخار سے کرتا ہے۔ جب بخار نہیں ہوتا تو اس کی حالت زیادہ مخدوش ہوتی ہے۔

وہ روتا رہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اُسے اپنے اوپر ترس آ رہا تھا اُسے موت کا خیال نہیں ستا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میں اپنے اوپر ترس کھا کر رونا چاہتا تھا۔ مگر ہوا اس کا اُلٹا۔ میں نے لڑکے کی طرف دیکھا۔ میں نے اس کے دُبلے، جھکولے کھاتے کندھے دیکھے۔ اور میری انسانیت ختم ہو گئی۔ اب نہ تو مجھے اپنے اوپر ترس آ رہا تھا اور نہ دوسروں پر۔ میں نے دل میں کہا "میں کم ہمتوں کی طرح نہیں مروں گا۔"

ٹام اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ گول روشن دان کے عین نیچے جا کھڑا ہوا اور صبح کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے ضد سوار تھی۔ مجھے مرد آسا وار مرنا تھا اور بس یہی خیال تھا۔ اس سب پر، چونکہ ڈاکٹر نے وقت بتا دیا تھا اس لئے لمحے پھسلتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ جیسے قطرہ قطرہ ہو کر پانی بہہ رہا ہو۔

ابھی اندھیرا ہی تھا کہ ٹام کی آواز سنائی "تم" اُن کی آواز سن رہے ہو؟"

" ہاں۔"

احاطے میں لوگ چل پھر رہے تھے۔ "کم بخت کر کیا رہے ہیں؟ اندھیرے میں تو گولی نہیں چلا سکتے۔"

کچھ دیر بعد پھر خاموشی ہو گئی۔ میں نے ٹام سے کہا "پو پھٹ رہی ہے۔"

پیڈرو نے اٹھ کر لیمپ بجھا دیا اور اپنے ساتھی سے کہنے لگا "میں تو مر گیا سردی سے۔"

تہہ خانے میں مدھم روشنی ہو گئی تھی۔ دُور سے ہمیں دھماکوں کی آواز آ رہی تھی۔

میں نے ٹام سے کہا "کام شروع ہو گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے پیچھے احاطے میں ہیں۔"

ٹام نے ڈاکٹر سے سگریٹ مانگا۔ مجھے سگریٹ یا شراب کی ضرورت نہیں تھی۔ اب بس بار بار پیشاب لگی رہے گی۔

ٹام نے کہا "تم بھی؟" وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر چپکا ہو رہا

اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھلا اور ایک لفٹنٹ اور چار سپاہی اندر آئے۔ ٹام کا سگریٹ گر پڑا۔

"اسٹین باک؟"

ٹام نے جواب نہیں دیا۔ پیڈرو نے ٹام کی طرف اشارہ کیا۔

"جوان میربل؟"

"وہ ہے چٹائی پر۔"

لفٹنٹ نے کہا "اٹھو۔" جوان ہلا تک نہیں۔ دو فوجیوں نے اُس کے کندھے پکڑ کر کھڑا کیا مگر ان کے چھوڑتے ہی وہ پھر چٹائی پر ڈھیر ہو گیا۔

سپاہی سوچ میں پڑ گئے۔

لفٹنٹ نے کہا "یہ کوئی پہلا آدمی نہیں ہے جس کی یہ حالت ہوئی ہے۔ تم دونوں اسے اٹھا لو۔ وہ سب کام وہاں ٹھیک کر لیں گے۔"

ٹام کی طرف پلٹ کر بولا "چلو، ادھر آؤ۔"

ٹام دو سپاہیوں کے بیچ میں ہو کر چل پڑا۔ دو سپاہی ان کے پیچھے پیچھے لڑکے کو اٹھائے روانہ ہوئے۔ وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ جب میں بھی باہر نکلنے کو مڑا تو لفٹنٹ نے مجھے روک دیا۔

"تم ابی ایٹا ہو؟"

"ہاں۔"

"تم یہیں ٹھہرو۔ ابھی تھوڑی دیر میں وہ تمہیں بلوائیں گے۔"

وہ سب باہر نکل گئے۔ بیلجین اور دونوں پہرہ دار بھی چلے گئے۔ میں اکیلا رہ گیا۔ مجھے نہیں معلوم میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے ... ہونا ہے جلدی ہو جائے۔ باڑھ مارنے کی آواز مقررہ وقفوں سے آ رہی تھی۔ ہر آواز پر میں لرزنے لگتا۔ میں چیخنا اور اپنے بال کھسوٹنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اپنے ہاتھ جیبوں میں ٹھونس لئے کیونکہ میں ڈھنگ سے مرنا چاہتا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ آئے اور ایک چھوٹے کمرے میں لے گئے۔ کمرے میں سگار کی ... بسی ہوئی تھی اور اس میں گرمی ناقابل برداشت تھی۔ یہاں دو افسر بیٹھے سگار پی رہے تھے۔ کاغذات ان کے گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھے۔

"کیا تمہارا نام ابی ایٹا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"رامن گرس کہاں ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں۔"

جو مجھ سے سوال کر رہا تھا پستہ قد اور موٹا تھا۔ عینک میں سے اس کی آنکھیں سخت دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے مجھ سے کہا "ادھر آؤ۔"

میں اس کے قریب گیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے میرا بازو پکڑ کر کچھ اس طرح مجھے دیکھنے لگا کہ میں زمین میں دھنس جانا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پوری طاقت سے میرے چٹکیاں لیں۔ یہ مجھے تکلیف دینے کے لئے نہیں کیا جا رہا تھا۔ بلکہ مجھ پر داؤں مارا جا رہا تھا۔ وہ مجھ پر چھا جانا چاہتا تھا۔ اس نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ اپنا گندہ سانس میرے منہ پر چھوڑے۔ ہم اسی طرح ایک لمحہ کے لئے کھڑے رہے اور مجھے ہنسی آنی شروع ہوئی۔ بھلا ان باتوں کا اثر اس پر کیا ہو سکتا ہے جو مرنے کو کھڑا ہو۔ سب بے کار ثابت ہوا۔ اس نے مجھے زور سے دھکیل دیا اور پھر بیٹھ گیا۔ بولا۔ "اس کی جان پر تمہاری جان کی بازی لگی ہے۔ اگر تم ہمیں بتا دو کہ وہ کہاں ہے تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔"

یہ دونوں آدمی، بجے سجائے ہاتھوں میں چھڑی، پیروں میں لمبے جوتے پہنے، یہ دونوں بھی مرنے والے تھے، مگر اتنی جلدی نہیں جتنی جلدی کہ میں مرنے والا تھا۔ ان کا کام یہ تھا کہ ذہنوں میں نام چھانٹتے رہیں۔ لوگوں کو قید کرنے اور انہیں مروانے میں اپنا سارا وقت صرف کرتے رہیں۔ اسپین کے مستقبل کے بارے میں ان کی اپنی رائے تھی اور دوسرے معاملوں میں بھی ذاتی رائے چلاتے تھے۔ ان کی حرکتیں مضحکہ خیز اور نفرت انگیز تھیں۔ ان کا نقطۂ نظر مجھے ترچھا نظر آتا اور وہ خاصے سڑی سودائی معلوم ہوتے تھے۔

ننھا آدمی مجھے گھورتا رہا۔ اور اپنے جوتے پر چھڑی مارتا رہا

کی ہر حرکت سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بڑا خونخوار جانور ہے۔

"کہو۔ سمجھ میں آیا؟"

"مجھے نہیں معلوم گرس کہاں ہے۔ وہ تو غالباً میڈرڈ میں ہے۔"

دوسرے افسر نے بھدا سفید ہاتھ سُستی سے اٹھایا۔ یہ سُستی بھی بناوٹی تھی اور ساختہ۔ میں ان کی ایک ایک بات کو تاڑ رہا تھا۔ اور مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ ایسے بھی آدمی ہوں گے جو اُن کی حماقت آمیز باتوں میں آجاتے ہوں گے۔

اُس نے آہستہ سے کہا "تمہیں سوچنے کے لئے پاؤ گھنٹہ دیا جاتا ہے۔ لے جاؤ اسے مال خانہ میں۔ پاؤ گھنٹے کے بعد واپس لانا۔ اگر پھر بھی یہ انکار ہی کرتا رہا تو ہم اسے فوراً گولی سے اڑا دیں گے۔"

انہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ میں نے رات بھر انتظار کیا تھا۔ اس کے بعد جب وہ ٹام اور رجوآن کو بار مار رہے تھے تو ایک گھنٹہ اور میں نے تہہ خانے میں انتظار کیا تھا۔ اور اب وہ مجھے مال خانے میں بند کر رہے تھے۔ یہ سب انہوں نے کل شام ہی طے کر لیا ہوگا۔ انہیں یقین ہوگا کہ بالآخر میرے اعصاب جواب دے جائیں گے۔ اور پھر وہ مجھ سے سب کچھ اگلوا لیں گے۔

مگر وہ غلطی پر تھے۔ مال خانے میں میں ایک اسٹول پر بیٹھ گیا کیونکہ میں بہت کمزور ہو گیا تھا اور میں نے سوچنا شروع کر دیا۔ مگر ان کی تجویز پر نہیں۔ حقیقتاً مجھے معلوم تھا کہ گرس کہاں ہے۔ شہر سے چار کلو میٹر کے فاصلے پر وہ اپنے ایک رشتہ کے بھائی کے ہاں چھپا ہوا تھا۔ یہ بھی میں جانتا تھا کہ جب تک یہ مجھے اذیتیں نہیں پہنچائیں گے اس وقت تک تو میں بھید دینے کا نہیں (مگر معلوم ہوتا تھا کہ انہیں اذیت رسانی کا خیال ہی نہیں آیا) باقی سب کچھ میرا خوب سوچا سمجھا ہوا تھا اور مجھے اس سے کوئی دلچسپی بھی نہیں رہی تھی۔ یہاں میں اپنے اس طرز عمل کی وجہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ گرس کا پتہ دینے کی بجائے میں مرجانا چاہتا تھا۔ کیوں؟ رامن گرس کی مجھے واقعی اب کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ صبح ہونے سے ذرا پہلے اس کی دوستی میرے دل میں مر چکی تھی، اسی وقت کونشا کی محبت نے بھی دم توڑا تھا اسی وقت میری زندہ رہنے کی آرزو بھی مٹ چکی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ میں اس کی عزت اب بھی کرتا تھا۔ وہ مضبوط تھا۔ مگر یہ وجہ تو ایسی نہیں تھی کہ میں اُس کے بدلے مرنے کو تیار تھا۔ اس کی زندگی کی قیمت میری زندگی سے زیادہ نہیں تھی۔ کسی زندگی کی کچھ بھی قیمت نہیں تھی۔ دیوار سے ایک آدمی کو لگا کر وہ اس پر اتنی گولیاں چلانا چاہتے تھے کہ وہ مر جائے، چاہے میں ہوں یا گرس ہو یا کوئی اور، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ اسپین کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ مگر مجھے اسپین یا انقلاب کی ذرہ بھر بھی پروا نہیں تھی۔ خیر کچھ بھی ہو۔ میں گرس کا پتہ دے کر اپنی جان بچا سکتا تھا۔ اور میں یہ ہرگز کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ یہ فیصلہ کچھ مسخرا پن بھی معلوم ہوتا تھا۔ پھر خیال آیا کہ یہ میری ضد ہے، اور کچھ نہیں۔ کیا میں اس قدر موٹی عقل کا ہو گیا ہوں؟

مجھ پر ایک عجیب طرح کی مسرت چھا گئی۔ وہ مجھے لینے آگئے اور دونوں افسروں کے سامنے لے گئے۔ ایک چوہا ہمارے پیروں میں سے ہو کر بھاگا اور مجھے ہنسی آئی۔ میں نے ایک محافظ کی طرف پلٹ کر کہا۔ "دیکھا تم نے چوہا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بڑا بھیانک بنا ہوا تھا۔ اور شاید سنجیدگی کو ضرورت سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ میں ہنسنا چاہتا تھا مگر میں نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ اس خوف سے کہ اگر ہنسنا شروع ہوا تو پھر ختم نہیں ہوگا۔ محافظ نے اپنی مونچھ کو مروڑی دی۔

میں نے کہا۔ "تمہیں اپنی مونچھیں کاٹ ڈالنی چاہئیں۔"

مجھے کچھ عجیب سا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ زندہ بھی ہے اور اپنے چہرے پر بالوں کو اُگنے بھی دیتا ہے۔ اس نے ایک ہلکی سی لات میرے رسید کی اور میں چپکا ہو گیا۔

افسر نے کہا "ہاں جی! تم نے سوچ لیا؟"

میں نے اُن کی طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ کوئی عجیب و غریب کیڑے ہوں۔ میں نے کہا "میں جانتا ہوں وہ کہاں ہے۔ وہ قبرستان کی کسی قبر میں ہوگا یا گورکن کی جھونپڑی میں چھپا ہوا ہوگا۔" میں نے از راہ تمسخر یہ بات کہی تھی۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ گھبرا کر اٹھیں، اپنی پیٹیاں کسیں اور حکم احکام کا شور مچا دیں۔

"چلو موکو۔ لفٹنٹ تو پیز نے بیندہ آدمی ہو۔ اگر تم سچ بولے ہو تو بس میرا ایک لفظ کہنا کافی ہے اور اگر تم نے ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہے تو تمہیں سخت سزا بھگتنی پڑے گی۔"

وہ سب جلدی جلدی نکل گئے اور میں آرام سے ایک محافظ دستے کی نگرانی میں بیٹھا رہا۔ جب مجھے خیال آتا کہ وہ کیسی کیسی حماقتیں کریں گے تو اپنی مسکراہٹ کو روک نہیں سکتا تھا۔ میرا دماغ معطل ہو رہا تھا۔ مجھ میں گراوٹ آ رہی تھی اور ضد پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے تصور میں دیکھا کہ وہ ڈھئی ہوئی قبریں کھول رہے ہیں، اور ایک ایک کرکے اُن تہہ خانوں کے دروازے کھولتے پھر رہے ہیں۔ جن میں تابوت رکھے جاتے ہیں۔ میں نے اس منظر کو اس طرح دیکھا جیسے میں کوئی اور ہوں۔ اس ڈرامے میں قیدی نے گویا تہیہ کر لیا تھا ہیرو کا پارٹ ادا کرے گا۔ فوجی سپاہی بڑی بڑی مونچھیں لگائے اور افسر وردیاں پہنے قبروں میں دوڑتے پھر رہے تھے۔ بڑا پر لطف ر بیہ تھا۔

آدھ گھنٹے کے بعد موٹا افسر اکیلا واپس آیا۔ میں نے سمجھا کہ مجھے گولی سے اڑانے کا حکم دینے واپس آیا ہے۔ باقی آدمی قبرستان میں ہوں گے۔

افسر نے میری طرف دیکھا۔ وہ بد دل یا مایوس قطعی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اس نے کہا۔ "اسے بڑے احاطے میں لے جاؤ جہاں اور قیدی بھی ہیں۔ فوجی نقل و حرکت سے فارغ ہونے کے بعد کوئی مناسب عدالت اس کی قسمت کا فیصلہ کرے گا۔"

میں سمجھا کہ میں نے ٹھیک نہیں سُنا۔ میں نے اس سے کہا۔ "تو کیا وہ مجھے ابھی گولی سے نہیں اڑا رہے؟"

"بہرحال ابھی تو نہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے پھر میری طرف نہیں دیکھا۔

"میں اب بھی نہیں سمجھا۔ لیکن کیوں؟"

اس نے کندھے اچکائے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ سپاہی مجھے لے گئے۔ بڑے احاطے میں قیدیوں کی خاصی تعداد تھی۔ عورتیں، بچے اور چند بڈھے۔ میں نے بیچ میں پھر پھر کر چکر کاٹنے شروع کر دیئے۔ میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔

دوپہر کو انہوں نے ہمیں طعام خانے میں کچھ کھانا دیا۔ کئی آدمیوں نے مجھ سے سوال کئے لیکن میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے ان لوگوں کو جاننا چاہئے تھا، مگر مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں۔

شام ہوتے ہوتے انہوں نے دس اور قیدی احاطے میں داخل کر دیئے۔ میں نے گریشا نانبائی کو پہچانا۔ وہ بولا۔ "یا اللہ تم زندہ ہو؟"

میں نے کہا۔ "انہوں نے مجھے سزائے موت دی تھی۔ اور پھر اپنی رائے بدل ڈالی۔ مجھے نہیں معلوم کیوں۔"

گریشیا نے کہا۔ "انہوں نے مجھے دو بجے گرفتار کیا ہے۔"

"کیوں؟" گریشیا کو سیاسیات سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

اُس نے کہا۔ "نہ جانے کیوں۔ جو ذرا بھی ان کی طرح نہیں سوچتا اُسے پکڑ لیتے ہیں۔" پھر نیچی آواز میں بولا۔ "انہوں نے گرس کو پکڑ لیا ہے۔"

میں نے کانپنا شروع کر دیا۔ "کب؟"

"آج صبح۔ اُس نے بڑا احمق پن کیا۔ منگل کو وہ اپنے رشتے کے بھائی کے ہاں سے چلا گیا۔ اُس سے کچھ چخ پخ ہو گئی تھی۔ اور بہت سے آدمی تھے جو اُسے چھپائے رکھتے۔ مگر وہ کسی کا احسان نہیں اُٹھانا چاہتا تھا۔ وہ کہنے لگا۔ "اگر میں چھپتا تو آئی ایبٹ کے مکان میں چھپتا۔ مگر وہ گرفتار ہو چکا ہے اس لئے میں قبرستان میں جا کر چھپتا ہوں۔"

"قبرستان میں؟"

"ہاں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا حماقت ہو سکتی تھی؟ ظاہر ہے کہ وہ وہاں پہنچ گئے۔ آج صبح یہ تو ہونا ہی تھا۔ گورکن کی جھونپڑی میں جا کر انہوں نے اُسے پکڑ لیا۔ اُس نے اُن پر گولی بھی چلائی مگر انہوں نے دھر لیا۔"

"قبرستان میں؟"

تمام چیزیں میرے سر میں گھومنے لگیں اور میں نے اپنے آپ کو زمین پر بیٹھا پایا۔ میں اس قدر ہنس رہا تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے تھے۔

سید اوصاف علی دہلوی

غالب

مرزا غالب مرحوم اپنے متعلق خود کیا خوب فرما گئے ہیں۔ ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

سبحان اللہ کیا کہنے ہیں کہنے کو تو یہ بات غالب مرحوم نے اپنے مخصوص رنگ کلام کی بابت کہی ہے۔ مگر یقین مانئے تو اللہ بخشے یہ ایک نمایاں وصف اللہ تعالیٰ نے اُن کی تحریر میں بس بخشا تھا۔ میرا اشارہ اُن کی خطوط نگاری کی طرف ہے۔ ہاں فرق صرف اتنا ہے کہ اُن کی شاعری میں جتنی رنگینی و پُرکاری ہے۔ اتنی ہی اُن کی انشاپردازی میں سادگی و سلاست اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ اور یہ ایک بڑی خوبی کی بات ہے۔

اصل میں بات یہ ہے کہ مرزا غالب بڑے زندہ دل اور باغ و بہار انسان تھے۔ شوخ و ظریف مزاج۔ مگر بالکل سادہ اور بے تکلف طبیعت کے مالک۔ اہل تکلف کی بھی کیا مجال تھی کہ اُن کے سامنے تکلف برتنے کی کوشش کرتے۔ پھر خود بھی مرزا اپنے مخصوص طنز و مزاح، لطافت و شگفتگی بیان، بذلہ سنجی اور جادو بیانی سے بہت جلد اہل تکلف کو بے تکلف اور اپنے سے ہم کنار کر لیا کرتے تھے۔ یہ واقعی اُن کا کمال تھا، جو انہیں پر اللہ نے ختم کر دیا۔ اُن کا خطوط میں بھی خاص انداز تھا۔ مکالماتی اور اپنی عجیب و غریب طرز تحریر ہے۔ اُن کے خطوں کو پڑھیئے گا تو اپنے ہم کلام پائیے گا۔

لیکن مرزا عام طور پر بحیثیت ایک صاحب طرز انشاپرداز کے ذرا کم ہی مشہور ہیں۔ حالانکہ وہ انشاپردازی اول درجے کے ہیں۔ مگر چونکہ عام لوگ کم شناسا ہیں اس لئے میں اُن کا ایک نثر نویس کی حیثیت سے ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

اگر سچ پوچھئے تو اُن کی شہرت و مقبولیت کا دارومدار اُن کے کلام پر ہے۔ جس میں اُن کے خطوط ہی سرفہرست ہیں۔ اس لئے وہ اس لائق ہیں کہ اُن کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔ یہ مرزا غالب کا واقعی احسانِ عظیم تھا کہ انہوں نے خطوط نویسی کو ایک باضابطہ اور پُرکشش شے بنا کر پیش کیا اور اس کی حقیقت و اہمیت ہم پر روشن یا اُجاگر کر دی۔ کیونکہ اس سے پہلے ہم خط لکھنے کے طریقے سے بھی نا آشنا تھے۔ انہوں نے آشنا کرایا۔ ویسے تو مرزا غالب سے پہلے بھی خطوط لکھے جاتے تھے۔ لیکن وہ خطوط انہیں کچھ اور ہی ہوا کرتے تھے۔ اُن میں تکلف و تصنع ہوتا تھا۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مشکل پسندی اور عبارت آرائی عام تھی۔ اللہ بخشے مرزا غالب کو، انہوں نے پُرتکلف اور مرصع نگاری کو ختم کیا۔ گویا اس کے خلاف جہاد کیا اور ایسا سادہ و پاکیزہ اور بے تکلف طرز ایجاد کیا جس کا جواب نہیں۔ کہنا یہ چاہئے کہ رنگ ایسا بدلا کہ دنیائے ادب کی کایا پلٹ ہو گئی۔ پھر طرزِ بیان ایسا آسان جسے سہل ممتنع کہا جا سکتا ہے۔

مرزا غالب نے اپنے طرز انشا کے متعلق کیا خوب کہا ہے۔ "میرا طریقہ یہ ہے کہ جب خط لکھنے کے لئے قلم و کاغذ اٹھاتا ہوں تو مکتوب الیہ کو کسی ایسے لفظ کے جو اس کی حالت کے موافق ہوتا ہے پکارتا ہوں اور اس کے بعد ہی مطلب شروع کر دیتا ہوں۔ القاب و آداب کا پُرانا طریقہ اور شکر شکوہ و شادی و غم کا قدیم ردیف میں نے بالکل اٹھا دیا۔" واقعی مرزا غالب نے بہت جامع رائے اپنی بابت لکھی ہے۔ اور اس شان کے متعدد نمونے آپ کو خطوطِ غالب میں مل سکتے ہیں۔ ایک نمونہ سناتا ہوں۔ مرزا کی طرز تحریر اور طرز بیان پر غور کیجئے۔ تحریر میں کیا بانکپن، سادگی و بے تکلفی اور شوخی و سلاست ہے۔

"صاحب! کل تمہارے خط میں دو جا بہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلّی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان! یہ دلّی

جس میں تم پیدا ہوئے ہو، وہ دلّی نہیں ہے، جس میں تم نے تحصیل علم کیا. وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے، وہ دلّی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں. ایک کیمپ ہے...."

اصل یہ ہے کہ مرزا غالب کے خطوط اردو نثر کا بہت ہی دلکش اور اعلیٰ نمونے پیش کرتے ہیں. اس لئے اُن کے خطوط کو اردو ادب میں ایک ادبی و تاریخی حیثیت حاصل ہے کیونکہ ان میں فن کاری، مصوّری ہے اور ادبی شان و عظمت پائی جاتی ہے. مگر مرزا کی تحریر میں تصنع و تکلّف کا کیا کام. ہاں بے تکلفی ہے، شوخی و سلاست ہے. لیکن اُن کی شوخی میں بھی شرافت پائی جاتی ہے. اور انداز بیان دل موہ لینے والا۔ نمونہ تحریر ملاحظہ فرمائیے.

" آہا ہا میرا پیارا مہدی آیا. آؤ بھائی! مزاج تو اچھا ہے بیٹھو یہ رام پور ہے دارالسرور ہے جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے". ایک ایسی شان کا خط اور سنئے:

آؤ میاں سیّد زادہ آزادہ دلّی کے عاشق دلدادہ ڈھئے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے..." ایک اور خط کے چند فقرے اور سُن لیجئے:

" برخوردار نور چشم میر مہدی کو بعد دعا حیات و صحت یاب کے معلوم ہو کہ بھائی تم نے بخار کو کیوں آنے دیا تپ کو کیوں چڑھنے دیا، کیا بخار میرن صاحب کی صورت میں آیا تھا کہ تم مانع نہ آئے..." چلئے دو فقرے اور پڑھ لیجئے:

" میری جان تو کیا کہہ رہا ہے. سینے سے سیا نا سود دیوانا صبر و تسلیم ترقی در رضا شیوہ صوفیہ کا ہے. مجھ سے زیادہ ان کو کون سمجھے گا". ایسا طرز بیان کوئی کہاں سے لائے گا.

کہتے ہیں انسان کا طرزِ گفتگو اس کی سیرت کا آئینہ ہوتا ہے. اور اصل میں شخصیت سیرت ہی کا دوسرا نام ہے. مرزا کے خطوط چونکہ باتوں کا مزہ دیتے ہیں. اس لئے ان سے اُن کے سچے و پاکیزہ جذبات و احساسات، خیالات اور ذاتی رجحانات کا علم ہوتا ہے. اس کے علاوہ اُن کے اخلاق و اطوار، اس عہد کی تہذیب و معاشرت، حادثات و واقعات اور مخصوص حالات کی تصویریں ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہیں.

ایک خوبی ان خطوط کی یہ بھی ہے کہ چونکہ مرزا نے خود کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے. اس لئے اُن کی شخصیت کا کافی اندازہ ہو جاتا ہے. اور بے تکلف کہنا پڑتا ہے کہ خطوط میں اگر سادگی و بے تکلفی کی شان ہو تو، وہ انسان کی شخصیت کا واقعی آئینہ ہوتے ہیں. بہرحال مرزا غالب کے بعض خطوط کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنا سارا زورِ قلم صرف کر دیا ہے اور تحریر کو جاندار اور سادگی کو پُرکار بنا دیا ہے. گویا کمال صناعی دکھایا ہے مضمون اجازت نہیں دیتا ورنہ کچھ اور نمونے پیش کرتا. خیر بہرحال، ان کی زبان اور طرزِ بیان ایسا پاکیزہ و سادہ اور دلکش نثر میں ہے جسے سہل ممتنع کہا جا سکتا ہے.

مرزا صاحب کا کمال ایک یہ بھی تھا کہ وہ معمولی سی بات کو غیر معمولی بنا دیا کرتے تھے. اصل میں اُن کا مطالعہ اور علم بہت وسیع تھا پھر قوت مشاہدہ بڑی اچھی تھی. اور میں سمجھتا ہوں یہ سب خدا کی دین تھی. اُن کے اس نرالے طرز کی نہ جانے کتنے حضرات نے تقلید کرنے کی کوشش کی۔ صاحب ذوق حضرات جانتے ہیں کہ وہ منہ سے زیادہ نہ چڑھا سکے. کیونکہ ان کا رنگ ناقابل تقلید ہے. اُن کا سا شوخ و ظریفانہ قلم اور انداز بیان کوئی کہاں سے لا سکتا تھا. وہ جس رنگ میں لکھتے تھے وہ اُن ہی پر ختم ہو گیا اور ہمارے لئے ایک مستقل دلچسپی کا سامان چھوڑ گیا جن کا لطف کبھی کم نہ ہوگا پھر بڑھے ہی گا.

عرصہ ہوتا ہے میرے محترم و مشفق نانا جناب حضرت مُلّا واحدی صاحب نے مجھے سادہ نویسی کے سلسلے میں لکھا تھا چونکہ یہ خط دلچسپ ہے. اس لئے خط نقل کرتا ہوں:-

"عزیزم! ٹھیک ہے، نثر سادہ لکھنی سب سے پہلے مرزا غالب نے شروع کی تھی۔ اُن کے بعد اُن ہی کے شاگرد مولانا حالی نے یہ سادگی جاری رکھی۔ حالی سرسید سے بہتر سادہ نویس ہیں۔ ہمارے خواجہ صاحب نے سادگی کو چار چاند لگا دیئے۔ پھر بھی خواجہ صاحب کے ساتھ نصف صدی رہنے کا تھوڑا بہت اثر ہے۔ تمہیں میرا کون سا مضمون مل گیا؟ دعاگو — واحدی

اس خط میں خواجہ صاحب سے مراد خواجہ حسن نظامی مرحوم ہیں، اُن کی تحریر واقعی سادگی و پُرکاری کا اعلیٰ مرقع ہے۔ اور واحدی صاحب قبلہ پر بھی اُن کی ہم نشینی کا اثر پڑا ہے۔ خواجہ صاحب کی تحریر تو لاجواب ہونی ہی چاہیئے تھی۔ مگر اُن کے خطوط بھی بے مثال ہوتے تھے۔ میں نے اُن کے خطوط کا مطالعہ تو نہیں کیا ہے۔ البتہ تعریف سنی ہے۔ مگر اس بات کا یقین مجھے اُس وقت جب حضرت واحدی صاحب نے مجھے اُن کے خط کا ایک فقرہ سنایا۔ سنئے فقرہ یہ تھا: "دل کے دیس میں بسنے والے پردیسی واحدی کو عید مبارک۔"

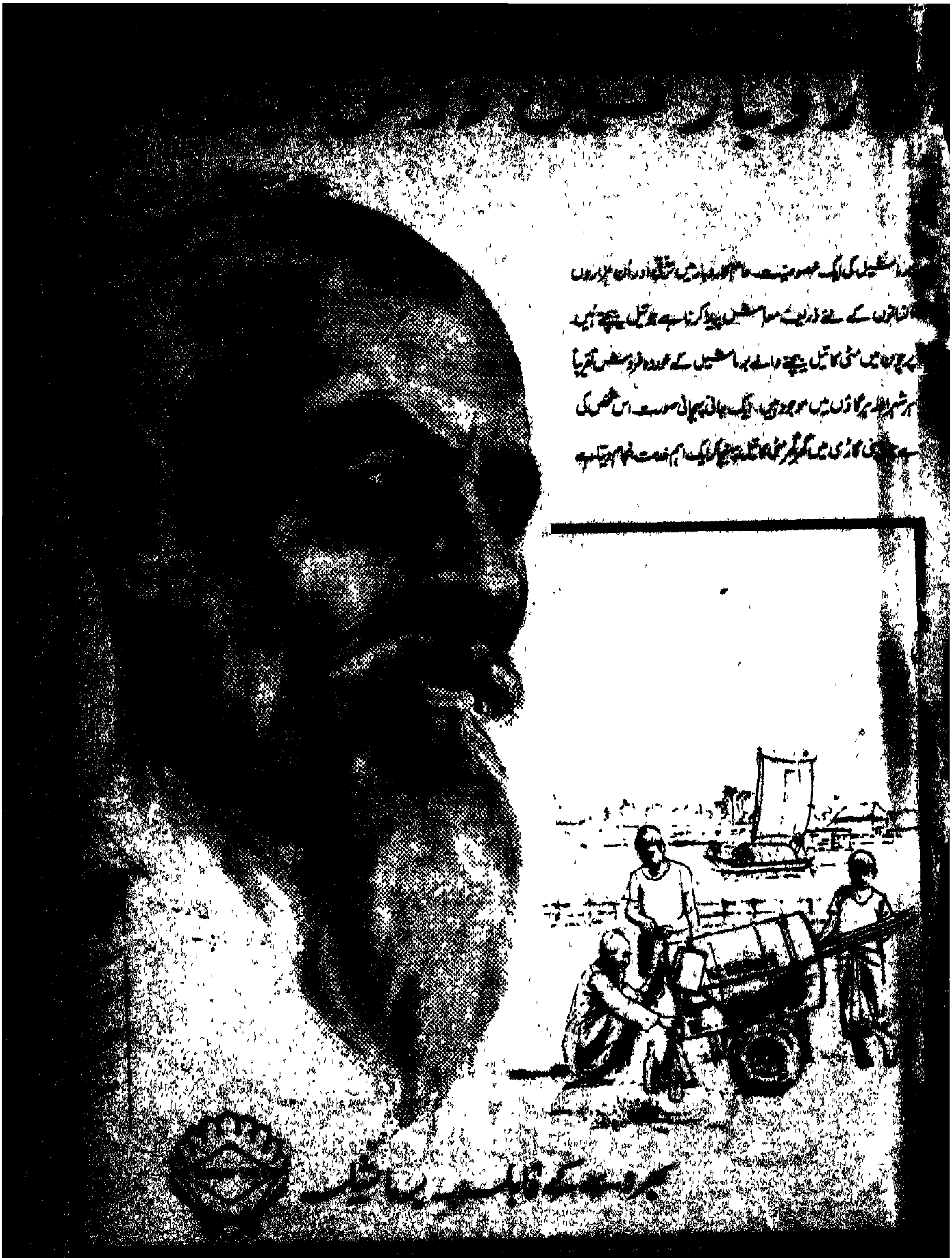
ایسے جملے یا فقرے مشہور ہونے کے بعد کلاسیکل ہو جایا کرتے ہیں۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ غالب نے ایک نیا اور کارآمد طرز نکالا جو مشہور و مقبول ہے۔ اُن کے نثر و نظم دونوں ہی میں قادر الکلام ہونے میں کوئی کلام ہے نہ گنجائش۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ بات یہ ہے کہ یہ بات خداداد ہوتی ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ قبول خاطر و لطف سخن خداداد است۔ پھر اختصار بھی ایک بڑی خوبی کی بات ہے۔ اس سے ظرافت و متانت پیدا ہوتی ہے اسی واسطے کلام میں اختصار کو گفتگو کی جان بتایا گیا ہے۔

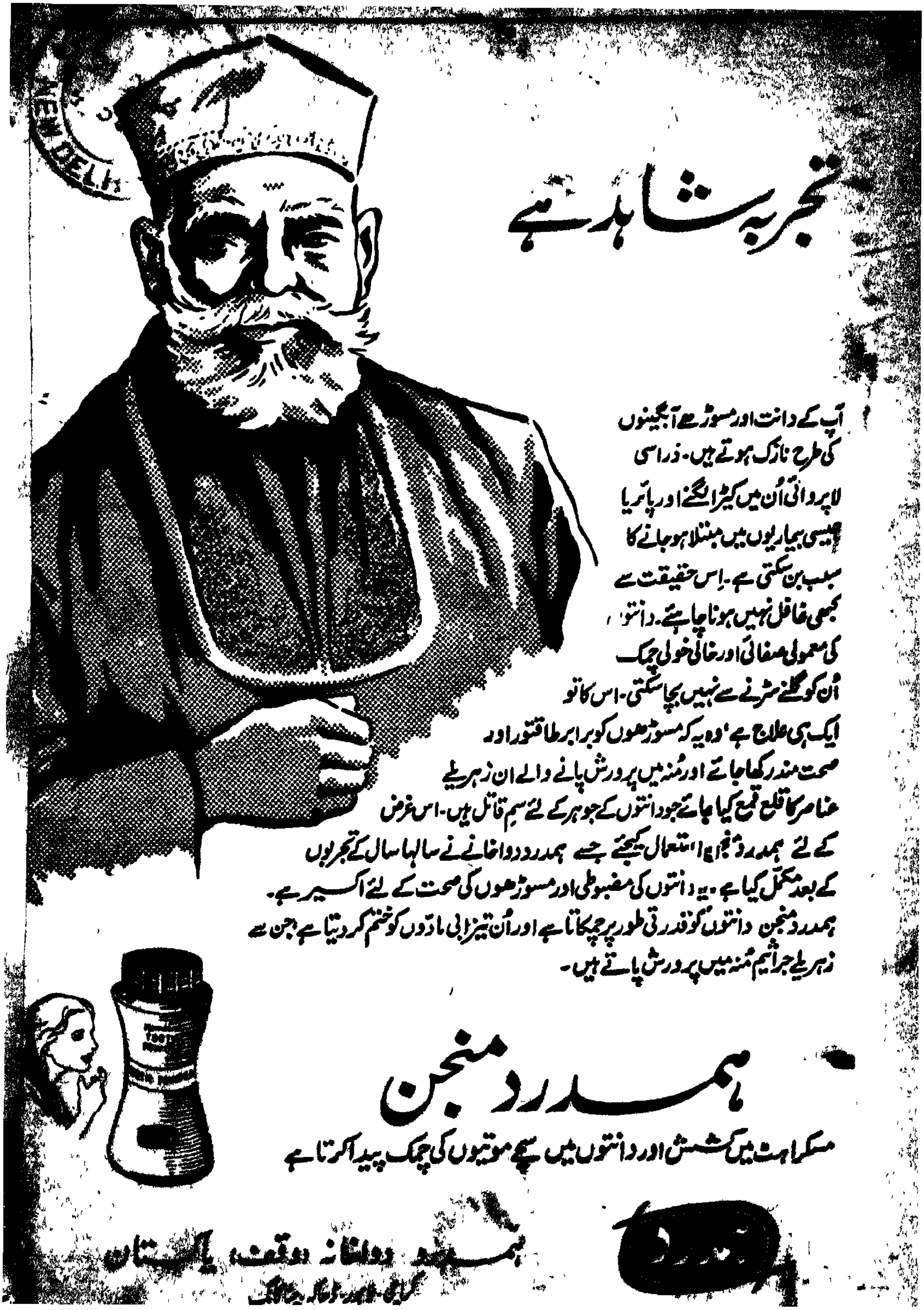
مرزا غالب کے ہاں آپ کو ظرافت و شوخی بھی ملے گی اور بے تکلفی بھی مگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا ان کی شوخی میں بھی شرافت اور بے تکلفی میں بھی تہذیبی پہلو محفوظ اور معیار برقرار رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی طبیعت میں شرافت اور بڑا پاس و ادب تھا۔ اور وہ شستہ و شائستہ انسان بھی تھے۔ اس کے علاوہ ان میں دوستی کا پاس بھی حد سے زیادہ تھا۔ اور بڑے فنکار شریف ہی ہوا کرتے ہیں۔ وہ کوئی معمولی لکھنے والے تو تھے نہیں، غیر معمولی لکھنے والے تھے۔ بلکہ راقم الحروف تو کہتا ہے کہ غالب غالب تھے۔ انہوں نے ایسا لکھا کہ ذرہ کو آفتاب بنا دیا۔ گویا اُن کا اُردو ادب خصوصاً خطوط پر کرم احسان ہے۔

سنئے اُن خطوں کو پڑھ کر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ گویا مرزا غالب ہمارے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور ہم مرزا کے سامنے بیٹھے بڑی دلچسپی سے باتیں سُن رہے ہیں۔ گویا اُن کی گفتگو سے بہت ہی لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ جس شخص کی تحریر میں یہ شان ہو، اس کا کلام کبھی نہیں مٹ سکتا۔ اور اسی خصوصیت کی بدولت مرزا غالب ہمیشہ زندہ اور اُن کے مکاتیب سدا سلامت رہیں گے۔

کچھ ایسا ہی وصف اللہ بخشے مولانا احمد سعید میں بھی تھا۔ آپ سمجھ گئے ہیں کن بزرگ کا ذکر کر رہا ہوں۔ یہ مولانا دلی کے مشہور عالم اور نامور خوش گلو خطیب ہوئے ہیں۔ تقریر کی طرح اُن کی تحریر بھی بڑی دلکش و دلچسپ ہوتی تھی۔ صاحب ذوق، صاحب علم و فضل تھے۔ اور بلا شبہ صاحب طرز انشا پرداز۔ مولانا کے متعدد خطوط میں نے پڑھے ہیں۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا میری نظر سے گزرے تھے۔ کیا عرض کروں اور کیسی عمدہ اور دلکش زبان ہے۔ اُن کے خطوط میں زبان کا چٹخارہ اور بے تکلفی نمایاں خوبی ہے۔ پھر دلی کی ٹھیٹ زبان لکھی ہے۔ خود دلی والے تھے اور دلی والے کے نام یہ خطوط ہیں — حضرت مُلّا واحدی صاحب کے نام — اچھا اب آگے سنئے۔ بہر حال چونکہ میں مولانا کے مکاتیب پڑھ کر بہت متاثر ہوا تو سوچا کہ مولانا کے بارے میں جناب مُلّا واحدی قبلہ سے کچھ دریافت کروں۔ آپ نے اپنی طبیعت کے مطابق فوراً جواب سے یوں سرفراز فرمایا۔ خط چونکہ معلوماتی اور ادبی ہے اس لئے آپ کے حوالہ کرتا ہوں۔

عزیزم! خطوں میں باتیں سی کرنا مولانا احمد سعید ہی کا حصّہ تھا۔ تم نے پوچھا ہے کہ مولانا میں نمایاں خصوصیت کیا تھی۔ بس یہ نمایاں خصوصیت تھی کہ خط لکھتے تھے تو معلوم ہوتا تھا سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اور تقریر کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا [illegible] کر رہے ہیں۔ پھر باتیں بڑی دلچسپ کرتے تھے اور بڑے دلچسپ انداز سے کرتے تھے، اور ایسی زبان میں کہتے تھے کہ [illegible]


انسانوں کے لئے ذریعہ معاش پیدا کرنا ہے جو تیل بیچتے ہیں
ہر شہر اور ہر گاؤں میں موجود ہیں۔ ایک جانی پہچانی صورت اس شخص کی



تجربہ شاہد ہے
آپ کے دانت اور مسوڑھے آبگینوں کی طرح نازک ہوتے ہیں۔ ذرا سی لاپروائی اُن میں کیڑا لگنے اور پائریا جیسی بیماریوں میں مبتلا ہوجانے کا سبب بن سکتی ہے۔ اِس حقیقت سے کبھی غافل نہیں ہونا چاہیئے۔ دانتوں کی معمولی صفائی اور خالی خولی چمک اُن کو گلنے سڑنے سے نہیں بچا سکتی۔ اس کا تو ایک ہی علاج ہے، وہ یہ کہ مسوڑھوں کو برابر طاقتور اور صحت مند رکھا جائے اور مُنہ میں پرورش پانے والے ان زہریلے عناصر کا قلع قمع کیا جائے جو دانتوں کے جوہر کے لئے سمِ قاتل ہیں۔ اس غرض کے لئے ہمدرد منجن استعمال کیجئے جسے ہمدرد دواخانے نے سالہا سال کے تجربوں کے بعد مکمل کیا ہے۔ یہ دانتوں کی مضبوطی اور مسوڑھوں کی صحت کے لئے اکسیر ہے۔ ہمدرد منجن دانتوں کو قدرتی طور پر چمکاتا ہے اور اُن تیزابی مادّوں کو ختم کر دیتا ہے جن سے زہریلے جراثیم مُنہ میں پرورش پاتے ہیں۔
ہمدرد منجن
مسکراہٹ میں کشش اور دانتوں میں سچے موتیوں کی چمک پیدا کرتا ہے
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
NEW DELHI